مطالب القرآن

فی

دروس الفرقان

سورۂ آل عمران (جلد نمبر 1)

علامہ غلام احمد پرویزؒ کے دیے گئے دروسِ قرآن

قرآنِ مجید کی تفسیر خود قرآنِ مجید سے

مدیر: پروفیسر ڈاکٹر منظور الحق

ادارہ طلوعِ اسلام رجسٹرڈ 25 بی گلبرگ 2 لاہور

مطالب القرآن

فی

دروس الفرقان

سورۂ آل عمران (جلد نمبر 1)

علامہ غلام احمد پرویزؒ کے دیے گئے دروسِ قرآن

قرآنِ مجید کی تفسیر خود قرآنِ مجید سے

ادارہ طلوع اسلام رجسٹرڈ 25 بی گلبرگ 2 لاہور

جملہ حقوق محفوظ ہیں

نام کتاب		مطالب القرآن فی دروس الفرقان (سورۂ آل عمران)
دروس		از: جناب غلام احمد پرویز رحمۃ اللہ علیہ
ناشر		بزمِ طلوع اسلام، لاہور
زیر اہتمام		ادارہ طلوع اسلام 25بی 2 گلبرگ، لاہور
		فون نمبر 5714546-5753666
ایڈیشن اول		دسمبر 2016ء
مطبع		باقریونس پرنٹنگ پریس، لاہور

ادارہ طلوع اسلام رجسٹرڈ کی طرف سے شائع کردہ لٹریچر کی جملہ آمدنی قرآنی فکر کو عام کرنے پر صرف ہوتی ہے۔

سرٹیفیکیٹ تصحیح

انتساب

رسالت مآب خاتم النبیین ﷺ کے نام

جو کافۃ للناس اور رحمۃ للعالمین بن کر آیا اور اپنے ساتھ وہ نظامِ عدل وحریت لایا جو انسان کو دنیا بھر کی غلامی سے آزادی دلانے کا کفیل تھا۔ یہ پیغام کوئی انوکھا پیغام اور یہ تعلیم کوئی نئی تعلیم نہ تھی۔ صداقت جہاں کہیں بھی تھی اُسی کتاب مبین کا کوئی نہ کوئی ورق تھی جو محمد ﷺ کی وساطت سے دنیا کو ملی۔ روشنی جس مقام میں بھی تھی وہ اسی قندیلِ آسمانی کی کوئی نہ کوئی کرن تھی جو قلبِ نبوی ﷺ میں اتاری گئی۔ شامِ جاں نواز نے جہاں کہیں بھی عطر بیزی وعنبر فشانی کی وہ لالہ و یاسمین کی ان ہی پتیوں کی رہینِ منت تھی جن کا گلدستہ اس نبی آخر الزمان ﷺ کے مقدس ہاتھوں محرابِ کعبہ میں رکھا گیا۔ پیغامِ محمدی ﷺ کیا ہے؟ ان ہی اوراق کی شیرازہ بندی جنہیں حوادثِ ارضی وسماوی کی تیز آندھیوں نے صحنِ کائنات میں اِدھر اُدھر بکھیر دیا تھا۔ اور مقامِ محمدی ﷺ کیا ہے؟ ان ہی درخشندہ وتابندہ ذراتِ نادرہ کا پیکرِ حُسن وزیبائی جن کی حقیقی آب وتاب کو ان کے ستائش گروں کی غلو آمیز عقیدت کی رنگینیوں نے مستور کر رکھا تھا۔ وہاں یہ جو ہر الگ الگ پڑے تھے' یہاں یہ پیکرِ جلال و جمال ان سب کا حسین مجموعہ تھا۔ وہاں یہ الفاظ بکھرے ہوئے تھے' یہاں ایک ایسے عدیم النظیر مصرعہ میں آب وتاب سے موزوں ہوگئے تھے جو ضمیرِ کائنات میں قرنہا قرن سے پہلو بدل رہا تھا۔ وہ موتی تھے' یہ مالا تھی۔ وہ پتیاں تھیں' یہ پھول تھا۔ وہ ذرے تھے' یہ چٹان تھی۔ وہ قطرے تھے' یہ سمندر تھا۔ وہ ستارے تھے' یہ کہکشاں تھی۔ وہ افراد تھے' یہ ملت تھی۔ وہ نقطے تھے' یہ خطِ مستقیم تھا۔ وہ ابتداء تھی' یہ انتہا تھا۔

خلق و تقدیر و ہدایت ابتداست
رحمۃ للعالمینیؐ انتہا ست

خدائے جلیل نے اپنے بندوں سے جو کچھ کہنا تھا آخری مرتبہ کہہ دیا۔ شرفِ انسانیت کی تکمیل کے لیے جو قوانین دیئے جانے تھے وہ اپنی انتہائی شکل میں دیدیئے گئے۔ اس کے بعد انسان کو اپنی منزلِ مقصود تک پہنچنے کے لیے کسی دوسری مشعلِ راہ کی ضرورت اور کسی اور ہادیٔ طریقت کی احتیاج نہ رہی۔ اب انسانیت کے مقام بلند تک پہنچنے کے لیے وہی ایک صراطِ مستقیم ہے جس پر اس ذاتِ اقدس واعظم ﷺ کے نقوشِ قدم جگمگ جگمگ کر رہے ہیں اور جنہیں دیکھ کر ہر دیدہ ور پکار اٹھتا ہے کہ

مقامِ خویش اگر خواہی دریں دیر
بحق' دل بند و راہ مصطفیؐ رو

[معراجِ انسانیت ص ۴۷ از۔ علامہ پرویز رحمۃ اللہ علیہ]

اسوۂ حسنہ

ہمارا ایمان ہے کہ جو شخص رسول اللہ ﷺ کے کسی ارشاد یا حضور ﷺ کے کسی عمل کی صداقت سے اِنکار کرتا ہے، ہمارے نزدیک وہ مسلمان ہی نہیں کہلا سکتا، اِس لیے کہ حضور ﷺ کے ارشادات و اعمالِ حیات سے تو وہ ماڈل ترتیب پاتا ہے جسے خدا نے ''اسوۂ حسنہ'' قرار دیا ہے۔

اِس اسوۂ حسنہ سے انکار، نہ صرف انکارِ رسالت ہے، بلکہ ارشادِ خداوندی سے انکار ہے۔اس انکار کے بعد، کوئی شخص مسلمان کیسے رہ سکتا ہے؟ اِسی بنا پر اللہ تعالیٰ نے اس اسوۂ حسنہ کو خود قرآن میں محفوظ کر دیا ہے۔

[طلوعِ اسلام۔اگست ۱۹۸۱ء]

قیصر و کسریٰ کے استبداد اور احبار و رھبان کی زنجیروں میں جکڑی ہوئی انسانیت کو آزادی سے ہم کنار کرنے والے قائدِ انسانیت ﷺ تجھ پہ لاکھوں سلام

خلق و تقدیر و ہدایت ابتدا ست
رحمۃ للعالمینی انتہا ست

[محمد اشرف ظفر]

مجھے اپنے فہمِ قرآن کے متعلق کبھی یہ دعویٰ نہیں ہوسکتا کہ وہ سہو وخطا سے منزہ ہے۔ یہ قرآن فہمی کی ایک انسانی کوشش ہے اور ہر انسانی کوشش کی طرح اس میں غلطیوں کا امکان ہے۔لہٰذا! میری تحریر میں جو کچھ آپ کو صحیح نظر آئے، وہ نورِ قرآنی کا تصدق ہے اور جہاں کہیں سہو وخطا دکھائی دے، وہ میرے ذہن کی نارسائی۔ (پرویز۔۔معراجِ انسانیت)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

فہرست مشمولات **سورہ آل عمران** (جلد نمبر 1)
مطالب القرآن فی دروس الفرقان

پہلا باب: **سورۃ آلِ عمران** (آیات 1 تا 8)

حروفِ مقطعات کی بنیادی خصوصیت ________ 31

آزاد انسانوں کی معاشرتی زندگی میں الہٰ کی طرف سے کنٹرول اور اقدار کی اہمیت ________ 32

مادی شعبۂ زندگی میں ذاتِ انسانی کی نشوونما کے لیے حق کا قیام ضروری ہے ________ 33

آج کرۂ ارض پر انسانوں کے لیے وحی کی خصوصی تعلیمؒ قرآنِ حکیم کے سوا کسی جگہ موجود نہیں ________ 33

قرآنِ حکیم نے اپنے ہاں تصریفِ آیات کا انداز ایک خاص تدریسی مصلحت کے تحت اپنایا ہے ________ 34

لغت کے تحت لفظ مصدق یا تصدیق کا قرآنی مفہوم ________ 35

دیگر مذاہب والوں کے نزدیک کسی ایک آنے والے کا تصور اور اس کی حقیقت ________ 35

ہمارے ہاں کسی آنے والے کے متعلق پایا جانے والا تصور اور پھر اس کا نتیجہ ________ 36

ختم نبوت کی حقیقت تو کسی بھی صورت کسی آنے والے کے تصور کو قبول ہی نہیں کرتی ________ 37

ذاتِ رسول ہو یا ذاتِ نبوتؒ کتاب لانے کی تو دونوں ہی حامل ہوتی ہیں ________ 37

تورات کے علاوہ حضرت عیسیٰؑ کے سلسلہ میں موجودہ انجیل کی وضاحت ________ 38

قرآنِ حکیم کی خصوصیت الفرقان بیان کی گئی ہے ________ 38

قرآنِ حکیم کو سمجھنے کا طریق۔ اور کافر اور عذاب کے الفاظ کا مفہوم ________ 39

قرآنِ حکیم کے نزدیک تو ٹارچر کا تصور ہی نہیں ہے ________ 40

قوانینِ خداوندی سے سرکشی کا نام صرف انکار ہی نہیں بلکہ کفر بھی کہلاتا ہے ________ 40

لفظ عزیز کا قرآنی مفہوم ________ 40

لفظ عذاب کے بعد لفظ انتقام کے قرآنی مفہوم کے تحت خدا کی ذات کسی سے انتقام نہیں لیتی ________ 40

رحمِ مادر میں انسان کی پرورش کا سارا سامان قانون کی زنجیروں میں جکڑ رکھا ہے ________ 41

ہمارے ہاں قرآنی الفاظؒ متشابہات اور محکمات کے متعلق پائے جانے والے تصورات کی حقیقت ________ 42

قرآنِ حکیم کی روشنی میں ان مجرد حقائق کو سمجھانے کا طریق ________ 44

ہمارے ہاں کی پیش کردہ تفسیروں میں عرش کی وضاحت

اور اس کا استعمال ____ 45
ہماری اس بدقسمتی کی بنیادی وجہ ____ 46
متشابہات وتشبیہات کے تحت قرآنی آیات پر غور وفکر کرنے
کی دعوت ____ 47
تشبیہات کا محکمات کی طرف سفر کا آغاز ____ 48
دلوں کی نفسیاتی بیماری انسان کو صحیح راستے پر راغب ہونے
ہی نہیں دیتی ____ 49
لفظ تاویل کے حقیقی مفہوم کا پس منظر قابلِ غور ہے ____ 50
راسخ عقیدہ حضرات کی بجائے کسی معاملہ کی تہہ تک پہنچنا
صاحبانِ اولی الالباب کے لیے زیادہ مشکل نہ رہے گا ____ 51
قرآنِ حکیم نے تو اپنے ایک لفظ پر غور وفکر کی دعوت دے
رکھی ہے ____ 52
لفظ وہاب کا لغوی مفہوم اور پھر وہبی طور پر سامانِ نشو ونما
کا عطا کرنا رحمت ہے ____ 53
تنہا عقلِ انسانی اور وحی میں زمین وآسمان کا فرق ہے ____ 54
وحی تو انسانیت کے بوجھ کو ہلکا کر دیتی ہے ____ 54

دوسرا باب: **سورۃ آلِ عمران** (آیات 8 تا 15)

محکمات اور متشابہات وغیرہ کے سلسلہ میں سابقہ درس کا ملخص 56
اضداد کی بنا پر قرآنی الفاظ کا مفہوم متعین کرنے کا اصول ____ 57
عربی زبان میں مرادفات کی نوعیت اور ان کی اہمیت ____ 58
قرآنِ حکیم کی ہر آیت اپنے اپنے مقام پر محکم تصور کی
جائے گی ____ 59
ارشادِ خداوندی ہے کہ آخر کار پوری انسانیت ایک نقطے
پر جمع ہوگی ____ 59
آسمانِ عالم پر آنے والا دورِ عالم گیریت کے اجتماعی تصور
کی نوید ثابت ہوگا ____ 60
قرآنِ حکیم کی وارث قوم کا فریضہ اور اس کے برعکس اس کی
ذہنی پستی کی نوعیت ____ 60
کائناتی قانون تو ہر آن اپنی رفتار سے اسی مرکزی نقطہ کی
طرف رواں دواں ہے ____ 61
معاشرتی طور پر باہمی سرکشی کی حقیقی وجہ ____ 62
جہاں جگہ جگہ مساجد الگ الگ فرقوں کے نام پر تعمیر ہو رہی
ہوں وہاں امتِ واحدہ کی عظیم سجدہ گاہ کا خواب کیسے پورا ہوگا؟
____ 62
جہنم کے ایندھن کے متعلق علامہ اقبال کی تشویش ____ 63
جہنم کی آگ تو وہ آگ ہے جو جسموں کی بجائے دلوں کو
لپیٹتی ہے ____ 64
فرعون کا سب سے بڑا جرم قوم کو گروہوں اور فرقوں میں
تقسیم کرنا تھا ____ 64
ذنب' قرآنِ کریم کی ایک بڑی جامع اصطلاح ہے جس
کے معنی گناہ نہیں بلکہ عواقب ہے ____ 65
قرآنِ حکیم کے ساتھ سب سے بڑی سازش یہ ہوئی کہ
الفاظ کے حقیقی مفہوم کو بدل دیا گیا ____ 66
جنت اور جہنم کی زندگی تو اسی زندگی سے شروع ہو جاتا ہے ____ 67
لفظ فی سبیل اللہ کا لغوی اور قرآنی مفہوم ہی یہ ہے کہ انسان
خالصتاً انسانیت کی بہبود کے لیے عمل پیرا ہو ____ 68
قرآنِ حکیم میدانِ جنگ میں قوتِ ارادی کی بجائے تیغ وتفنگ
کو اہمیت نہیں دیتا ____ 69

لفظ مَنۡ یَّشَآءُ (3:13) کے حقیقی مفہوم کے بالمقابل ہماری فریب کاری کا عکس ______ 70

محاذِ جنگ کے جاں نثاروں کے متعلق ہماری کوتاہ نظری کے افسانے ______ 71

65 میں میدانِ جنگ میں فتح کا بگل مایہ ناز مجاہدین کی ثابت قدمی اور بلند کرداری کا ثمر تھی ______ 72

میدانِ جنگ میں اطاعت کے فریضے کی نگاہ بانی احکامِ الٰہی کی نشاندہی کا ثبوت ہے ______ 73

لفظ عبرۃ کا مفہوم ______ 73

زندگی بسر کرنے کے لیے ابدی حقائق کو نظر انداز کرنا خودکشی سے کم نہیں ہوتا ______ 73

دینِ خداوندی زینت کی چیزوں کو کسی شکل میں بھی نظر انداز نہیں کرتا ______ 74

قرآنِ حکیم نے زینت کی چیزوں کا ایک مقام بھی متعین کر رکھا ہے ______ 75

قرآنِ حکیم قدرت کی طرف سے ملنے والی تمام نعماء کو نوعِ انسانی کی نشو و نما کے لیے زادِ رہ قرار دیتا ہے ______ 75

لفظ فاسق کا لغوی و قرآنی مفہوم ______ 76

قرآنِ حکیم کی رو سے رہبانیت کی زندگی سراسر فسق ہے 77

مادی اسباب و ذرائع کو ہی مقصود بالذات سمجھ لینا فکرِ قرآنی سے اس کا کوئی واسطہ نہیں ______ 78

قرآنِ حکیم نے جنت کو مثال کی شکل میں ہی پیش کیا ہے ___ 78

اہلِ جنت کی باہمی زندگی کو قرآنِ حکیم نے ازواج کے مفہوم میں بیان کیا ہے ______ 79

تیسرا باب: **سورۃ آلِ عمران** (آیات 15 تا 18)

لفظ رضوان کا حقیقی مفہوم نیز اسلامی اور غیر اسلامی کا معیار _ 80

لفظ رضوان کی قرآنی اصطلاح کا مفہوم خدا کو راضی یا خوش کرنا صحیح نہیں ______ 80

راضی ہونا یا ناراض ہونا تو انسانی جذبات ہیں، خدا کی صفات نہیں ______ 81

ہمارے ہاں خدا کے متعلق پایا جانے والا تصور ایک زمینی بادشاہ کا تصور ہے ______ 82

خدا تعالیٰ نے خود اپنے اوپر ایک پابندی کو واجب کر لیا کہ وہ کسی کی خاطر قوانین میں تبدیلی نہیں کرے گا ______ 83

جو لوگ سِوا کہلاتے ہیں اُن کی سِوا مشکل ہوتی ہے ______ 83

انسان کے اچھے اور بُرے اعمال سے خدا خوش یا ناراض نہیں ہوتا بلکہ انسان کی اپنی ذات پر اس کا اثر پڑتا ہے ______ 84

خدا کی ذات انسان کے اچھے کاموں کی محتاج نہیں ہوتی ___ 85

خدا انسانوں کے اس قسم کے سطحی جذبات سے بہت بلند ہے 86

خدا کی مرضی یا خدا کی رضا کے غلط مفہوم نے ہماری سوچ ہی بدل دی ہے ______ 86

عارفوں کے یہاں مرضیٔ مولا کی اہمیت کے متعلق حضرت موہانی کا فلسفہ ______ 87

انسان کی ہر مصیبت اس کے اپنے ہاتھوں کی لائی ہوئی ہوتی ہے ______ 88

اس مجسم بے عمل قوم کے خلاف متبد اور EXPLOITATION کرنے والے گروہوں کی سازش ______ 88

خوشنودی کے غیر قرآنی مفہوم کے بعد رضی یا رضوان کا حقیقی

مفہوم ______ 89
ہمارے ہاں قدم قدم پر انتشار اور خلفشار کی بنیادی وجہ الفاظ
کے بنیادی مفہوم کو مبہم اور غیر واضح رکھا جانا ہے ______ 90
رضوان کا حقیقی مفہوم کتاب اللہ کا اتباع کرنا ہے تا کہ تم
سیدھی اور متوازن راہ پر چلتے جاؤ ______ 90
انسانیت کے لیے قرآنِ حکیم کی طرف سے دینِ خداوندی
کا تعین ______ 91
مکافاتِ عمل کے ظہور پذیر ہونے کی کیفیت ______ 92
رَضِیَ اللّٰہُ عَنۡھُمۡ وَ رَضُوۡا عَنۡہُ (98:8) کا مفہوم خدا
کی صفات کو حدودِ بشریت کے اندر رہتے ہوئے اپنی ذات
میں منعکس کرنا ہے ______ 92
لفظ مغفرت کا مفہوم انسان کو تخریبی اعمال کے مضرت
رساں نتائج سے محفوظ رکھنا ہے ______ 93
لفظ صابرین کے بعد لفظ قانتین کا مفہوم یعنی اپنی صلاحیتوں
کو ٹھیک ٹھیک مقام پر پوری دل جمعی کے ساتھ استعمال
کرنے والے ______ 94
اَسۡتَغۡفِرُ اللّٰہَ ، اِنۡشَآءَ اللّٰہُ ، مَاشَآءَ اللّٰہُ کے بنیادی مفہوم
کے برعکس ہماری سوچ ______ 95
ہم نے عبادت کے عملی مفہوم کو پرستش کی سوچ میں
بدل دیا ہے ______ 95
لَآ اِلٰہَ اِلَّا ھُوَ (3:18) کا حقیقی مفہوم تو انسانیت کو
ایک فلک بوس عمارت کی نوید دیتا ہے ______ 96
دینِ خداوندی میں قرآنی نظامِ حیات اور خدا کا حقیقی تصور
ایک خاص اہمیت کا حامل ہے ______ 96
خدا تعالیٰ کا منزہ اور حقیقی تصور صرف اور صرف قرآنِ حکیم
میں بیان کردہ خدائی صفات ہی سے سمجھا جا سکتا ہے ______ 97
خدا تعالیٰ کے صحیح تصور کے تحت کلمۂ شہادت کا قرآنی مفہوم 97
خدا تعالیٰ کے صحیح تصورات کے سلسلہ میں ملائکہ کی قرآنی
شہادت ______ 98
ہمارے ہاں ملائکہ کے متعلق پایا جانے والا تصور اور سائنس
کی شہادت ______ 99
تمام کائنات میں وحدتِ قانون
(LAW OF UNIFORMITY OF NATURE)
کارفرما ہے ______ 100
قرآنِ حکیم کے نزدیک علماء وہ ہیں جو ہر آن اٹھتے بیٹھتے چلتے
پھرتے کائنات کی بلندیوں اور پستیوں پر غور و فکر کرتے ہیں وہ
اس بات کی شہادت دیں گے کہ لَآ اِلٰہَ اِلَّا ھُوَ (3:18) ______ 100
پوری کائنات کا خالق اور مالک ہونے کے باوجود
العزیز ہونے کے باوجود وہ الحکیم بھی ہے یعنی اس کا
اقتدار حکمت پر مبنی ہے ______ 101
ہزار سال سے ملتِ اسلامیہ میں ہر قوم پر غیر اسلامی اور
مبہم بحثوں کا سبب اُن کی نوعیت اور انکا علاج ______ 102

چوتھا باب: **سورۃ آلِ عمران** (آیات 19 تا 25)

قرآنِ حکیم نے شروع سے انسانی زندگی کے علاوہ خارجی
کائنات میں وحدتِ قانون کا نام الاسلام تجویز کیا ہے ______ 104
دیگر مذاہب کی طرح اسلام کے ماننے والوں کی ناگفتہ بہ
حالت کی بنیادی وجہ اور پھر اس کا شافی علاج ______ 105
مذہبی دنیا میں ہر مذہبی فرقہ اس بات پر مگن ہوتا ہے کہ وہ حق

پر ہے اور باقی سب جھوٹے ہیں ______ 106
دلی میں ایک مفتی اعظم کے سلسلہ میں فاتحِ اعظم کے جشن کی
روائیداد بزبانِ علامہ پرویزؒ ______ 107
فرقہ پرستی میں ہر فرقہ ایک دوسرے پہ چڑھ دوڑتا ہے جو کہ
قرآن کی رو سے کفر ہے ______ 107
قرآنِ حکیم نے فرقہ بندی کے عمل کو شرک قرار دیا ہے جو
سب سے بڑا جرم ہے ______ 108
وحی کے بغیر دنیا بھر میں اہلِ مذاہب کی حالت ______ 108
اگر مسلمانوں کے تمام فرقے سنّت کے ایک مفہوم پر متفق
ہوجائیں تو تمام اختلافات ختم ہوسکتے ہیں ______ 109
نبی اکرم ﷺ کی ذات کسی فرقے کی حامل نہ تھی ______ 110
مقلّد اور غیر مقلّد حضرات کے ہاں پایا جانے والا تصور ______ 110
نبی اکرم ﷺ کا مسلک لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ (3:18) ہے ______ 110
مسلمانوں کو ساتھ ملا کر اہلِ یورپ کی طرف سے روس اور چین
کی مخالفت دراصل نظامِ سرمایہ داری کی جاذبیت کو بحال رکھنے
کی ایک گہری مذہبی چال تھی ______ 112
قرآنِ حکیم کے نزدیک تو خدا پرستی کا ایک اپنا معیار ہے ______ 113
حضرت مسیحؑ اور عزیر کے ابن اللہ ماننے کے متعلق عیسائیوں
اور یہودیوں کے اس عقیدہ پر قرآنِ حکیم کا فرمان ______ 113
جو اپنے علماء اور مشائخ کو بھی خدا کی جگہ اپنا اللہ بنا لیتے ہیں
ان کے متعلق خدا کا حکم ______ 114
قرآنِ حکیم کی روشنی میں ایمان کی بنیادی تعریف دینِ حق
یعنی قرآن کا دین اختیار کرنا ہے ______ 115
مولانا آزاد مرحوم کے نزدیک دینِ اسلام کی ایک خطرناک
تاویل اور اس پر طلوعِ اسلام کا کیا جانے والا احتجاج ______ 115
دیگر آسمانی کتابوں کے مقابلے میں قرآنِ حکیم کی
انفرادی خصوصیت اور اسکا مطالبہ ______ 116
دینِ خداوندی پر عمل پیرا ہونے والوں اور انکار کرنے
والوں کے مابین فرق کی وضاحت ______ 117
یہود اور نصاریٰ کی عورتوں کے ساتھ شادی کے سلسلہ میں
اجازت کی نوعیت اور حضرت علیؓ کا فیصلہ ______ 118
کسی عمل کے رائیگاں ہوجانے کے معنی دراصل مطلوبہ نتائج
حاصل نہ ہونے کے ہوتے ہیں ______ 119
خود امتِ مسلمہ کے اعمال رائیگاں ہوجانے کی محسوس شکل یہ
ہے کہ قرآنِ کریم نے کہا تھا کہ ایمان و اعمالِ صالحہ والوں پر
کفار غالب نہیں آسکتے جبکہ آج بالواسطہ یا بلاواسطہ ہمارے
اوپر انہی کا غلبہ ہے۔ ______ 119
اعراض برتنے والی ذہنیت کے متعلق قرآنِ حکیم کا ارشاد ______ 120
جو لوگ خدا کی کتاب سے مطابق فیصلے نہیں لیتے، انہی کو
کافر کہا جاتا ہے ______ 121
یہودیوں کا عقیدہ یہ ہے کہ ہم اپنی بداعمالیوں کے بدلے میں
چند دن کے لیے جہنم میں جائیں گے پھر ہمارے شفاعت
کرانے والے بزرگ ہمیں جنت میں پہنچا دیں گے ______ 122
جنت میں داخل ہونے کے سلسلہ میں اہلِ شریعت اور اہلِ
طریقت کے تصورات ______ 122
نبی اکرم ﷺ کا فرمانِ اقدس قرآنِ حکیم کے الفاظ میں ______ 123
ہمارے ہاں خود فریبی کی بنیادی وجہ وضعی روایات ہیں ______ 124
لفظ کسب کا لغوی اور قرآنی مفہوم ''کسی کی گئی محنت کے

پورے پورے معاوضے کا ملنا ہے'' ____ 124
یوم کا لغوی مفہوم دن کی بجائے مدت' میعاد' وقفہ یا لمحہ
کے ہوتے ہیں ____ 125

پانچواں باب: **سورۃ آلِ عمران** (آیات 26 تا 27)

لفظ ''مَنۡ یَّشَآءُ'' (16:93) کا واضح تر انداز میں بیان
کردہ مفہوم اور خیر و شر کے مسئلے کا حل ____ 127
ہمارے ہاں کے تراجم میں لفظ مَنۡ یَّشَآءُ (16:93) کا معنی
''چاہتا ہے'' کیا جاتا ہے جو کہ غلط ہے ____ 127
عربی زبان کے قاعدے کے مطابق من یشآء کا صحیح مفہوم ___ 128
انسان کے لیے اس کے اختیار و ارادہ کی اہمیت اور خدا کے
قانون کی وضاحت ____ 129
خدا تو یہ چاہتا ہی نہیں کہ کوئی انسان شرک کا مرتکب ہو ___ 130
قرآنِ حکیم کی تعلیم کے خلاف سوچ رکھنے والے لوگوں کی
طرف سے اعتراض ____ 130
انسانوں کے علاوہ اختیار و ارادہ نہ ہونے کے باعث تمام
حیوانات کی ہر نوع میں کوئی ذہنی اختلاج نہیں پایا جاتا ___ 131
انسان کی تخلیق کے لیے قانونِ مشیت کا ایک اہم پہلو اختیار و
ارادہ کا ملنا ہے ____ 131
قدرت نے انسان کو دیگر مخلوق کی طرح مجبور پیدا ہی نہیں کیا 132
کائنات کا خالق اور مالک ہونے کے باوجود انسان سے
زبردستی اپنا حکم نہیں منواتا ____ 133
خدائے علیم نے ہر دور میں انسان کو صحیح راستے کی پوری پوری
نشاندہی کر دی تھی اور کر رکھی ہے ____ 133
انسان کے لیے شرفِ انسانیت کا راز اس کے اختیار کے صحیح
استعمال میں مضمر ہے ____ 134
آسمانوں پر خدا کی مشیت اور زمین پر انسان کے اختیار و ارادہ
کی حکمرانی ____ 135
خدا کی مشیت کے معنی خدا کا وہ قانون ہے جو اس نے عالمِ
امر میں کائنات کی ہر شے کے لیے بنا رکھا ہے ____ 136
انسانوں میں باہمی اختلافات کی بنیادی وجہ ضد کی بنا پر ایک
دوسرے پر غلبہ حاصل کرنا ہوتا ہے ____ 136
خدا تعالیٰ سے انسان کو اپنی مرضی سے ہدایت لینا ہوگا ___ 137
کل اختیارات کا مالک خدا اپنے قانون کے مطابق انسان
کو عزت دیتا ہے اور پھر ذلت بھی انسان کو قانون کے ہی
مطابق ملتی ہے ____ 137
لفظ فراوانی کا حقیقی مفہوم اور خدا کی طرف سے اس کی غایت ___ 139
مَنۡ یَّشَآءُ (2247) کا ترجمہ ''خدا کا قانونِ مشیت'' ہے ___ 139
ہمارے دورِ ملوکیت میں ہونے والے قرآنی تراجم کے اثرات
اور قوم بنی اسرائیل کا ذکر جس کو خدا کے قانونِ مشیت کے
مطابق مملکت اور بادشاہت ملی ____ 140
استخلاف فی الارض کا حصول بھی قانونِ خداوندی کے تابع یقینِ
محکم اور عملِ پیہم سے مشروط ہے ____ 141
باہر کی دنیا کا تغیر خواہ وہ تعمیری ہو یا تخریبی انسانی اعمال کا ہی
پرتو ہوتا ہے' عکس ہوتا ہے ____ 142
عزت کا حصول صحیح نظریۂ زندگی کے تسلیم کرنے اور پھر اس پر
عمل کرنے میں ہی مضمر ہے ____ 143
انسانوں کے لیے عزت آستانوں پر جھکنے میں نہیں' قدرت کی
طرف سے عطا ہونے والے قانون کے سامنے جھکنے میں ہے 144

خداتعالیٰ کی مشیت تو بڑی فراخدلی واقع ہوئی ہے لیکن قانون کے دائرے کے اندر ___ 145

خدا کا قانونِ مشیّت ہمارے حساب وشمار سے کہیں زیادہ رزق دینے کی صلاحیتیں رکھتا ہے ___ 145

زراعت کے قانون کے مطابق عمل کرنے کا نتیجہ کفر اور ایمان میں کوئی فرق پیدا نہیں کرتا ___ 146

نَشَآءُ (17:18) اور نُرِیۡدُ (17:18) کا بنیادی مفہوم اور پھر رزق کے سلسلہ میں اقوامِ عالم کی حالت ___ 147

ہمارے ہاں لفظ توکل علی اللہ کا مفہوم اور اس کا استعمال _ 148

من یشآء اور نشآء کا بڑا واضح تر مفہوم، خدا کا قانونِ مشیت ہی ہے ___ 149

خدا کے قانون کی روشن اور عملی مثال طبعی قوانین اور خارجی کائنات کا ایک ایک ذرہ بسیط اور زندہ شہادت کا ترجمان ہے 149

خداتعالیٰ کے قانون کو نظرانداز کرنے کا نتیجہ اور اعمال کے رائیگاں ہو جانے کے سلسلہ میں تاریخی شہادت ___ 150

قرآنی تعلیم کے برعکس عملِ انسانی کے کرشمے ___ 151

انسانی زندگی کی ابتدا کے متعلق قرآنِ حکیم کے انکشافات عقلِ انسانی کو جلا بخشتے ہیں ___ 151

قدرت نے کائنات کے ذرے ذرے کو قانون کی زنجیروں میں جکڑا ہی اسی لیے ہے کہ انسانیت اپنے معراج تک پہنچنے میں کوئی دشواری محسوس ہی نہ کرے ___ 152

چھٹا باب: **سورۃ آلِ عمران** (آیات 27 تا 28)

انسانوں کی ابتدائی زندگی میں باہمی روابط میں اتحاد و تفریق کی کیفیت ___ 153

قرآنِ حکیم کے نزدیک تفریق کا معیار خالصتاً مستقل اقدارِ خداوندی کو قرار دیا گیا ہے ___ 154

قرآنِ حکیم کے نزدیک نوعِ انسانی صرف دو گروہوں میں تقسیم ہے ___ 155

دوقومی نظریہ کے پیشِ نظر 06-1905ء میں علامہ اقبالؒ کا فرمان اور تحریکِ پاکستان کی بنیادی خصوصیت ___ 155

مومن کی آئیڈیالوجی تو عالم گیر سطح پر صرف انسانیت کا تصور اپنے دامن میں لیے ہوتی ہے ___ 156

انسانیت کے لحاظ سے قرآنی آئیڈیالوجی کے مخالفین کے ساتھ حسنِ سلوک کا تعلیمی معیار ___ 157

فرقہ بندی پیدا کرنے والوں کے متعلق قرآنِ حکیم کی وارننگ 157

غیر مسلموں کے ساتھ باہمی تعلقات کے سلسلہ میں قرآنی حدود کا تعین اور ہماری اپنی حالتِ زار ___ 158

تقسیم سے پہلے ہندو ذہنیت کی کہانی علامہ پرویزؒ کی زبانی _ 158

خلافت موومنٹ کے سلسلہ میں ہندوؤں کی چال اور سوچ 06-1905ء میں علامہ اقبالؒ کی آذان یعنی وطن کی بنیاد پر قوم کے وجود کی مخالفت ___ 159

ملتِ اسلامیہ کے آسماں پر عظمتِ کردار کا ایک روشن ستارہ قائداعظمؒ اور اس کی مخالفت ___ 160

تحریکِ پاکستان میں طلوعِ اسلام کا کردار اور اس کی سعی و کاوش ___ 161

مسلمانوں کے خلاف کفار کی یا ہندوؤں کی مخالفانہ ذہنیت کا عکس ___ 162

عزت اور ذلت کا مدار قانونِ خداوندی سے ہی وابستہ ہوتا ہے 162

عزت وتکریم کا بلند ترین مینار نبی اکرم ﷺ کا اسوۂ حسنہ ہے
جسے قرآنِ کریم کی دفتین میں محفوظ کر دیا گیا ہے ______ 163
غیروں سے تعلقات قرآنِ حکیم کے پیش کردہ احکام کے
مطابق استوار کرنا ہونگے ______ 164
ماں باپ کی اطاعت کے سلسلہ میں حضرت ابراہیمؑ کا
اسوۂ حسنہ اور اس کے خدوخال ______ 164
حضرت ابراہیمؑ کا اپنے باپ سے یہ کہنا کہ ''میں چلا اپنے
رب کی طرف'' بڑا ہی قابلِ غور قول ہے ______ 166
لفظ توحید کی ترجمانی محمد علیؒ جوہر کی زبانی ______ 167
صلیبی جنگوں کے موقع پر مسلمانوں کے خلاف دنیا بھر کے
عیسائیوں اور یہودیوں کا گٹھ جوڑ اور ہماری اپنی کیفیت ______ 167
یہودیوں اور عیسائیوں کی باہمی مخالفت کی کیفیت ______ 168
کویت کی طرف سے جاری ہونے والا ایک فتویٰ ______ 169
پاکستان کے آئین میں ایک بنیادی کمزوری جو شروع سے
چلی آرہی ہے ______ 170
حضرت عمرؓ کے دور کا ایک اہم واقعہ ______ 170
قرآنِ حکیم کے نزدیک تعلقات قائم کرنے کا معاملہ اور
تمدنی رشتوں کی حقیقت اور ان کی قدر و قیمت ______ 172
انسانیت کے پیشِ نظر باہمی تعلقات میں کشادہ نگہی اور حسنِ
سلوک کے فروغ کی ترغیب ______ 173
مسلم ہو یا غیر مسلم اس کو رزق بہم پہنچانے کی ذمہ داری
اسلامی مملکت کے سر ہوگی ______ 174
ساتواں باب: **سورۃ آلِ عمران** (آیات 28 تا 32)
تمدنی زندگی میں باہمی تعلقات کا معیار اور دل و دماغ کی باہمی رفاقت
کی قدر و منزلت ______ 176
سابقہ درس کی یاد دہانی ______ 176
کسی کی طرف سے نقصان پہنچانے کے ڈر کی بنیاد پر دوستانہ
تعلقات قائم رکھنا قرآنی تعلیم کے ہی منافی ہے ______ 177
قرآنِ حکیم نے انسانوں کو تین گروہوں میں تقسیم کیا ہے ______ 178
قرآنِ حکیم نے منافق کا لفظ غیر مسلموں کی بجائے مسلمانوں
کے ایک گروہ کے لیے استعمال کیا ہے ______ 179
شدید ترین عذاب کافر کے لیے نہیں بلکہ وہ تو منافق کے
لیے ہے ______ 180
قرآنِ حکیم نے کذب کے سلسلہ میں تو ایک سورۃ کا نام ہی
منافقون رکھا ہے ______ 181
منافق اپنے دل میں چھپی باتوں کی حفاظت کے لیے قسموں
کو ڈھال بناتا ہے ______ 182
فرعون کے دربار میں حق کی اذان بلند کرنے والوں کی حیثیت 183
فرعون کی دربار میں کفار کا ایک منٹ کا سچ قرآنِ حکیم میں
حیاتِ جاوید سے ہم کنار ہو گیا ______ 183
قرآنِ حکیم کے الفاظ میں حضرت ابراہیمؑ کے اسوۂ حسنہ کی
صداقت کی گواہی ______ 184
قرآنِ حکیم میں حضرت ابراہیمؑ کو صادق کی بجائے صدیق
کے لفظ سے نوازا گیا ہے ______ 185
نبی اپنی نبوت کے ثبوت میں اپنے صدیق ہونے کا دعویٰ پیش
کرتا ہے جبکہ وضعی روایات اس کے برعکس ہیں ______ 185
حضرت ابراہیمؑ کے سلسلہ میں اپنی خفت سے بچنے کے لیے
ایک وکیلانہ حربہ ______ 187

مئی 1958ء کے ترجمان القرآن کے مطابق اہم تقاضوں
کے تحت جھوٹ بولنا واجب ہو جاتا ہے ____ 187
نبی اکرم ﷺ کی ذاتِ اقدس کے متعلق بخاری شریف میں
کعب بن اشرف کا قصہ ____ 188
قرآنِ حکیم کے مطابق مومنوں کے لیے دوست داری کا
معیار اور محتاط رہنے کی تاکید ____ 190
انسانوں سے ڈرنے کی بجائے خدا کے قانونِ مکافات کو
سامنے رکھنے کی تاکید ____ 190
قرآنِ حکیم کی طرف سے آ گاہی اپنے اندر شفقت اور
عاطفت دونوں کی حامل ہوتی ہے ____ 191
قرآنِ حکیم کو سمجھنے میں ہمارے ہاں کے تراجم نے ہمیشہ حقائق
کو نظر انداز کیا ہے ____ 192
خدا تعالیٰ کی غیر مرئی ذات کسی بھی شکل میں کسی پہلو سے
محسوس پیکر میں دیکھی ہی نہیں جا سکتی ____ 193
تصوف کی دنیا میں ذاتِ خداوندی کا تصور اور اس کی نوعیت
اور عیسائیوں کے ہاں نز کا کردار ____ 193
خدا کا بیٹا ہونے کے تصور کے سلسلہ میں قرآنِ حکیم کا جواب 194
لفظ تُحِبُّوْنَ (3:31) کا لغوی مفہوم اور خدا سے محبت ہونے
کی تفصیلی وضاحت ____ 194
صلوٰۃ کا لفظ تمام انسانوں کو ایک اجتماعی نظام کی ترغیب دیتا
ہے ____ 195
قرآنِ حکیم کا پیش کردہ نظامِ حیات پوری انسانیت کی
حفاظت کے لیے زادِ راہ مہیا کرے گا ____ 196
نبی اکرم ﷺ کی زندگی کے بعد قرآنِ حکیم کے پیش کردہ
اجتماعی نظام کی خاطر خلافت علیٰ منہاجِ نبوت کا فریضہ ____ 197
صدیوں سے ہمارے ہاں مختلف مذہبی فرقوں کا یہ وجود آخر
ہمیں کیا ترغیب دیتا ہے ____ 198
امت میں وحدت پیدا کرنے کا آخری علاج ____ 199

آٹھواں باب: **سورۃ آلِ عمران** (آیات 33 تا 37)

حضرت مریمؑ کی جرأت مندانہ زندگی کے خدوخال ____ 200
قرآنی حقائق سے ہٹ کر تاریخی طور پر حضرت عیسیٰؑ کے
کوائفِ حیات کو افراط اور تفریط کا شکار بنا رکھنے کی روئیداد ____ 200
مختلف انبیائے کرامؑ کی نسبت سے خدا تعالیٰ کی طرف سے
ملنے والا دین ایک ہی نوعیت کا مظہر تھا ____ 201
دینِ خداوندی کی وسیع ظرفی کے مقابلے میں مذہب کی تنگ
نظری کی کیفیت اور انبیاء کی بعثت کی نوعیت ____ 202
قرآنِ حکیم تباہ ہونے والی قوموں کی علت کی
وضاحت کرتا ہے ____ 203
قصۂ آدم اپنے اندر تمثیلی انداز لیے ہوئے ہے ____ 204
آدمؑ نوحؑ ابراہیمؑ اور عمران کے چار ادوار کی تمدنی زندگی
کی نوعیت ____ 204
حضرت مریمؑ کے متعلق لفظ اصطفٰی کا مفہوم ____ 205
قرآنِ حکیم میں حضرت مریمؑ کے علاوہ فرعون کی بیوی کے
لیے تحسین کے الفاظ ____ 205
قرآنِ حکیم میں عصمت کی حفاظت کی بنا پر اقوامِ عالم میں
حضرت مریمؑ کی عظمت کا ذکر ____ 206
مسلمانوں کے نزدیک بھی حضرت عیسیٰؑ کی وجۂ فضیلت
بن باپ پیدا ہونا سمجھا جاتا ہے ____ 206

مودودیؒ کی طرف سے تفہیم القرآن میں حضرت مریمؑ کے
ہاں بچے کی پیدائش کے معاملے کی تفصیل قابلِ غور ہے ___ 207
قرآنِ حکیم نے تو قدم قدم پر سوچنے کی تاکید کی ہے _____ 209
آخر معجزات کی نوعیت بھی ٹھوس اور محسوس شے کی رہینِ منت
ہوتی ہے _______________ 209
قدرت کی طرف سے کائنات کی ہر شے کے لیے ایک
قانون مقرر کر دیا گیا ہے _______________ 210
خدا کی تو کوئی بیوی ہی نہیں تو پھر بیٹا کہاں سے آ گیا؟ ____ 211
خدا تعالیٰ کی ذات بھی اپنے بنائے ہوئے قوانین کو نظر
انداز نہیں کرتی _______________ 211
خدا تعالیٰ کے مقرر کردہ قوانین کے خلاف جنم لینے والے
غیر فطرتی نظریاتی عقائد کا نتیجہ _______________ 212
حضرت مریمؑ کی طرف سے ہیکل میں رہبانیت کے پیدا کردہ
غیر فطرتی عقائد و نظریات کے خلاف اعلانِ جنگ کی روئیداد 213
ہیکل کے اندر احبار کی طرف سے اختیار کردہ قبیح شکل کی
فحاشیوں سے بھرپور داستان _______________ 213
احبار و رہبان کی خود ساختہ آہنی زنجیروں سے بھرپور شریعت
کے خلاف حضرت مریمؑ کی بغاوت کے صبر آزما پہلو _____ 214
حضرت مریمؑ کی جرأت اور پاکدامنی کو ہزاروں سلام ____ 215
حضرت مسیحؑ جیسی انقلابی شخصیت کا ایک حقیقت کشا وعظ اور
پھر اس کا نتیجہ _______________ 217
گھروں میں قدامت پرستی کا مقابلہ کرنے کے لیے
حضرت مریمؑ کی زندگی اپنی مثال آپ ہے _______ 217
آزادانہ سوچ اور غور و فکر کی عادت تو انسان میں ایک انقلاب
پیدا کر دیتی ہے _______________ 218
حضرت مریمؑ کا ہیکل کے ماحول میں پروان چڑھنے کے
دوران ماں کے دل کی کیفیت _______________ 219
حضرت مریمؑ کے سلسلہ میں حضرت زکریاؑ کی طرف سے
دیکھ بھال کا عمل _______________ 220
ہمارے ہاں قرآن _______________ 221
کائنات کی ہر شے کو خدا اپنی طرف ہی منسوب کرتا ہے لہٰذا رزق
کی تلاش میں خدا کے قانون کے مطابق حاصل ہوتی ہے _ 222

نواں باب: **سورۃ آل عمران** (آیات 38 تا 51)

حضرت مریمؑ کے کوائفِ حیات اور حضرت عیسیٰؑ کی انقلاب
آفریں زندگی کے خدوخال _______________ 225
قرآنِ حکیم خونی رشتے کی بجائے اپنے ہاں آئیڈیالوجی کی
بنیاد مہیا کرتا ہے _______________ 225
بحیثیت بزرگ حضرت زکریاؑ کی حضرت مریمؑ سے گفتگو اور
پھر خدا تعالیٰ کی بارگاہ میں اولاد کے لیے اظہارِ تمنا ______ 226
لفظ محراب کا لغوی مفہوم اور ہمارے ہاں پایا جانے والا غلط تصور 227
نبیوں پر وحی کس طرح نازل ہوتی تھی کوئی غیر از نبی اسے سمجھ
ہی نہیں سکتا _______________ 227
حضرت زکریاؑ کو بچے کی پیدائش کی خوشخبری لیکن بیوی کے
بانجھ پن کی وجہ سے پریشانی اور اس کا حل _________ 228
قرآنِ حکیم کو سمجھنے کے لیے تصریفِ آیات کو پیش رکھنا
ضروری ہے _______________ 230

حضرت زکریاؑ کی بیوی کا شفایاب ہونا ہی بچے کی پیدائش
کا سبب تھا ___ 230
حضرت مریمؑ کے سلسلہ میں سابقہ درس کی یاد دہانی کے طور پر
کچھ سطور ___ 231
ہیکل کے اندر شریعت کے اجارہ داروں کی ذلّت آمیز داستان _ 232
ماں کی نظریاتی پسماندگی اور مذہبی پیشوائیت کی گرفت میں
حضرت مریمؑ کی معصوم زندگی کی جرأت آمیز داستان ___ 233
شادی کے سلسلہ میں مرد اور عورت کی رضامندی یکساں
مدارج کے حامل ہوتے ہیں ___ 233
اپنے ہاں معاشرتی اور تمدنی طور پر غلط رسومات کو اپنائے رکھنا
خود اپنے گلے میں موت کا پھندہ ڈالنے کے مترادف ہے _ 234
ایک غریب بڑھئی سے شادی کا معاملہ تو حضرت مریمؑ کے لیے
اپنے اندر جرأت اور عظمتوں کی داستان لیے ہوئے ہے __ 235
ملائکہ کے نزول کا معاملہ اور اس کی نوعیت اور ماہیت ___ 235
یہ الفاظ کہ میرا رب اللہ ہے اپنے اندر ایک ایسا لامحدود پروگرام
لیے ہوئے ہیں جو پوری کائنات پر محیط ہے ___ 236
میدانِ بدر میں ملائکہ کا نزول اور ان کی طرف سے معاونت
کی شکل و صورت ___ 237
حضرت مریمؑ کی ساری کی ساری تگ و تاز سراپا استقامت
پر مبنی تھی ___ 237
حضرت مریمؑ کی پاکدامنی پر ہزاروں سلام ___ 238
قرآنی الفاظ کے سلسلہ میں قرآنِ حکیم کا اعجاز ___ 238
قرآنِ حکیم نے اپنے ہاں تجرد یا انفرادیت کی بجائے ہمیشہ
اجتماعی عمل کو اولیت دی ہے ___ 239
تورات اور اناجیل کا قرآنِ حکیم کے مابین تقابلی جائزہ __ 239
قرآنِ حکیم میں حضرت مریمؑ کی پاکیزہ دامنی کی شہادت __ 240
حضرت عیسیٰؑ کو ابنِ مریم کے نام سے پکارنے کی وجہ جواز
اور حضرت مریمؑ کی ایک خلش ___ 240
انسان کے دل و دماغ اور اس کی شخصیت پر عقیدے کا اثر __ 241
اولاد کے سلسلہ میں حضرت مریمؑ کے دلی خدشات اور خدا تعالیٰ
کی طرف سے اس کی تردید ___ 242
ہمارے ہاں لفظ کُن کے غلط مفہوم کے برعکس قرآنِ حکیم کی
عقل و فکر سے بھرپور تعلیم ___ 243
تورات اور انجیل کا بنیادی تعارف ___ 244
مروجہ تراجم کے مطابق حضرت عیسیٰؑ کی طرف منسوب کردہ
باتیں اور قرآنِ حکیم ___ 245
انجیل کے بیان کے مطابق حضرت عیسیٰؑ کا اندازِ بیان ہمیشہ
تمثیلات اور استعاروں پر مبنی ہوتا تھا ___ 246
قرآنِ حکیم کی تعلیم کا اعجاز فکرِ انسانی کو جہانِ نو سے متعارف
کراتی ہے ___ 247
تمثیلات اور استعارے زبان کی خوبصورتی اور وسعت کو بلند
درجہ عطا کر دیتی ہیں۔ حضرت عیسیٰؑ کی تعلیم کے چند ایک نقوش _ 248
حلال اور حرام کا تعین صرف اور صرف خدا تعالیٰ کو حاصل ہے 250
دسواں باب: **سورۃ آل عمران** (آیات 52 تا 58)
احبار و رہبان کی بیان بازی کے باعث اپنے خاوند اور بچے
کے ساتھ مصر کی طرف ہجرت اور پھر واپسی ___ 252

دین اور مذہب کی تعلیم میں بنیادی فرق کے ساتھ حضرت عیسیٰؑ کے کوائفِ حیات کی نوعیت ___ 253
یہودیوں جیسی پس ماندہ قوم میں حضرت عیسیٰؑ کی اذان تو ایک انقلاب آفریں نقارۂ خدا تھی ___ 255
حضرت عیسیٰؑ کا بنیادی جرم اس وقت کی سلطنت کے خلاف اعلانِ بغاوت تھا مشہور مؤرخ سیسل راک کا اعتراف ___ 255
سازش کرنے والوں نے ہمارے دین کو بھی اسی طرح مذہب میں بدل دیا ___ 257
حضرت عیسیٰؑ کا اپنے ساتھیوں کے لیے پیغام ___ 257
حضرت عیسیٰؑ کے اپنے شاگردوں اور وہاں کے احبار و رہبان اور مشائخ کو انقلاب آفریں وعظ ___ 258
مذہبی پیشوائیت کے اختیارات کی وسعتوں کا نتیجہ اور ہماری تاریخ ___ 260
انجیل برنباس کی تاریخی اہمیت اور اس کے مندرجات کی نوعیت 260
دینِ خداوندی کے مقابل میں مذہب کی حیثیت ہمیشہ پروفیشن کی بنیاد پر استوار ہوتی ہے ___ 261
قرآنی نظام میں مذہبی پیشوائیت کا الگ وجود باقی ہی نہیں رہتا 262
مذہب کی دنیا نے تو حضرت عیسیٰؑ جیسی انقلابی شخصیت کے خدوخال ہی بدل دیے ہیں ___ 263
حضرت عیسیٰؑ کی طرف سے اٹھنے والی ایک انقلابی آواز ___ 263
قرآنِ حکیم کی وسعتِ قلبی کہ ہر نبی کا احترام فرض ہے ___ 264
حضرت عیسیٰؑ کے بارہ حواریوں کے متعلق اناجیل کا متضاد بیان 264
حضرت عیسیٰؑ کے بارہ حواریوں میں سے سینٹ پیٹر یا پطرس کا مقام اور پھر ان کا کردار ___ 265
پطرس کے علاوہ گیارہ حواریوں کا حضرت عیسیٰؑ سے کیا جانے والا وعدہ ___ 266
انجیل کے برعکس حضرت عیسیٰؑ کے ساتھ حواریوں کے حسنِ سلوک کی قرآنی شہادت ___ 267
مذہب کا سارا دارومدار تاریخ کی سند پر ہوتا ہے ___ 268
بخاری کی حدیث کے مطابق روزِ قیامت خدا سے نبی اکرم ﷺ کی اپنے صحابہؓ کے متعلق پکار؟ اور کفر کے فتوؤں کی حقیقت ___ 268
علامہ غلام احمد پرویزؒ پر کفر کے فتوؤں کی نوعیت اور ان کی ماہیت ___ 270
قرآنِ حکیم کے الفاظ کا مفہوم اردو زبان میں پورا نہیں اترتا لہٰذا قرآنِ حکیم کو قرآنِ حکیم کے الفاظ میں ہی سمجھنا ہوگا ___ 270
نبی اکرم ﷺ کی طرح حضرت عیسیٰؑ بھی دوسری طرف ہجرت کر گئے ___ 271
یہودیوں اور عیسائیوں کے مابین انتقام کی بنیادی وجہ ___ 272
نبی اکرم ﷺ کے مقامِ بلند کے بالمقابل عیسائیوں کا حضرت عیسیٰؑ کے متعلق پایا جانے والا تصور ___ 272
حضرت عیسیٰؑ کے متعلق آسمانوں پر زندہ اٹھا لینے کے عقیدہ کی نوعیت اور اس کی حقیقت ___ 273
عیسائیوں کے ہاتھوں یہودیوں کی تباہی کی داستانِ عبرت ___ 274
گیارہواں باب: **سورۃ آلِ عمران** (آیات 59 تا 63)
قرآنِ حکیم کے مطابق ہر کسی رسول کے خلاف کہی ہوئی غلط بات کی تردید کرنا ہمارا فرض ہے ___ 276

انسانی زندگی کے تحفظ کو الزام تراشی اتنا نقصان نہیں پہنچاتی
جتنا غلو اور مبالغہ گوئی پہنچاتی ہے ______ 277
روم کے ایک گرجے میں حضرت عیسیٰؑ کی تصویر اور عقیدت
کی موم بتیوں کا دھواں ______ 278
عیسائیوں کی تمام تر تعلیم کا تمام تر تصور حضرت عیسیٰؑ کے
بن باپ پیدا ہونے پر ہے ______ 278
حضرت عیسیٰؑ کے متعلق مسلم دنیا میں پائے جانے والے تصور
کی بنیاد اور پھر شدتِ جذبات کی کیفیت ______ 279
صدیوں سے ہمارے ہاں حیات و وفاتِ مسیحؑ کے مسئلہ پر
مخاصمت کی نوعیت اور مناظرے ______ 280
قرآنی حقائق تو انسانی جذبات کی شدت کو مبالغے کی
حدود میں داخل ہونے ہی نہیں دیتے ______ 280
قرآنِ حکیم کی طرف سے حضرت عیسیٰؑ کے متعلق پائے جانے
والے عقائد کی تردیدی وضاحت نیز آدمؑ کی پیدائش کا معاملہ 282
ذہنِ انسانی بتدریج ارتقائی سفر کی پیداوار ہے ______ 283
معتقدات کی گرفت بڑی سخت گیر ہوتی ہے قصۂ آدم کسی
فردِ واحد کا قصہ نہیں بلکہ نوعِ انسانی کو خطاب ہے ______ 285
قرآنِ حکیم نے قصۂ آدم کی پیدائش میں بشر۔ الناس اور
آدم کے الفاظ بھی استعمال کیے ہیں ______ 286
خدا کی ذات تو اپنی ہر اسکیم کا آغاز عالم امر میں لفظ کُنْ فَیَکُوْنُ
سے کرتی ہے ______ 286
تخلیق کے سلسلہ میں خدا کے ہاں ارتقائی مراحل کا ایک ایک دن
ہمارے ہزار ہزار سال، پچاس پچاس ہزار سال کے برابر ہوتا ہے 287
سائنس ایجاد تک پہنچ ہی نہیں سکتی، وہ صرف رموز کو
Discover کرتی ہے ______ 288
قرآنِ حکیم کو مَس کرنے سے پہلے ذہنوں کے بُت خانوں
سے چھٹکارا حاصل کرنا ہوگا ______ 289
ہمارے ہاں لکھی گئی تمام تفاسیر روایات پر مبنی ہیں ______ 290
قرآنِ حکیم کی واضح تعلیم کے بعد روایات کے مطابق
نبی اکرم ﷺ کا دوسروں سے مباہلہ کسی صورت بھی حقائق
پر مبنی نہیں ہو سکتا ______ 290
لفظ مباہلہ یا ملاعنہ کا مروجہ مفہوم اور اس کے استعمال کی صورت 291
مباہلہ کے سلسلہ میں پیش کی جانے والی شہادتیں اور پھر لفظ
مباہلہ کا قرآنی اور لغوی مفہوم ______ 292
دلیل و براہین کے میدان میں ناکام رہنے والے آخر پر
اکثر استہزا پر اتر آتے ہیں ______ 293
قرآنِ حکیم کے ہاں الجھے ہوئے مسائل کا حل اور لفظ نَبْتَهِلْ
کا لغوی مفہوم ______ 293
قیامت کا تصور برحق لیکن زندگی خود بھی تو گناہوں
کی سزا دیتی ہے ______ 294
لعنت کے معنی تو خوشگواریوں سے محروم ہو جانے کے ہیں ______ 295
فرعون کے دربار میں حضرت موسیٰؑ کا اندازِ گفتگو ______ 295
وحی کی ہر بات حکمت پر مبنی ہوتی ہے وہاں دھاندلی نہیں ہوتی ______ 297
وحی کا طریق عقائد پرستی کی بجائے صرف حقائق پر مبنی ہوتا ہے 297
ہماری زبوں حالی اور قدم قدم پر ذہنی انتشار کی بنیادی وجہ
صرف متضاد خیالی ہے ______ 298

مذہبی پیشوائیت کی طرف سے اٹھارویں صدی میں فسادات
کی آگ کا منظر _______________ 298
پاکستان کی یہ پوری تاریخ آخر کس چیز کی عکاسی کر رہی ہے؟
علامہ غلام احمد پرویزؒ کی چیخ و پکار _________ 299
اس خاک نشینی کا انجام اور اس سے بچنے کا طریق _____ 299

بارھواں باب: سورة آل عمران (آیات 64 تا 70)

قرآنِ حکیم کی طرف سے پیش کردہ دینِ خداوندی کا منتہا _ 301
دین اور مذہب کی نظریاتی سوچ اور کیفیت میں مماثلت
باقی ہی نہیں رہتی _______________ 302
نتائج اگر مطلوبہ شکل اختیار نہ کریں تو جذبات کا عمل
بے سود ہو جاتا ہے _______________ 303
قرآنِ حکیم کی پیش کردہ تعلیم کے مطابق دنیا میں سب سے
خسارے میں وہ لوگ ہیں جن کے اعمال رائیگاں جائیں _ 304
مسلمانوں کے ہاں نماز و روزہ و قربانی و حج کی ادائیگی کی
نوعیت اور نتیجتاً اس کا ماحصل _________ 305
اقبالؒ کے الفاظ میں مسلمانوں کو مذہبی طور پر الجھائے رکھنے
کی شیطانی چال کی وضاحت _________ 306
نبی اکرم ﷺ کے دربار میں یہودی اور نصاریٰ کی حاضری
کا مقصد اور پھر آپ ﷺ کی راہنمائی _________ 307
مسلمانوں کے مابین جذبات پر اختلافات کی نوعیت اور
ایک خطرناک گھاٹی کی نشاندہی _________ 307
انسانوں کو خدا بنا لینے کے عمل کی نوعیت اور اس کا مفہوم __ 309
احبار و رہبان کو اپنا خدا بنا لینے کے سلسلہ میں نبی اکرم ﷺ
کی ایک روایت _______________ 309
حلال کو حلال اور حرام کو حرام قرار دینے کا حق صرف خدا
کو حاصل ہے، کسی نبی کو بھی نہیں _________ 310
خدا کی حاکمیت تو اپنے اندر ایک عظیم مفہوم اور نظم و ضبط لیے
ہوئے ہے _______________ 310
انسانوں کی آزادی اور پابندی کے متعلق قائدِ اعظمؒ کے
الفاظ بڑے غور طلب ہیں _________ 311
قرآنِ حکیم کے نزدیک حلال و حرام کے فتوؤں سے انسانوں
کو محکوم بنانا جرم ہے _______________ 311
دنیا بھر میں سوائے قرآنِ کریم کے کوئی آسمانی کتاب کوئی
قوم بھی اپنے پاس رکھنے کا دعویٰ نہیں کر سکتی _______ 312
دین کا پیش کردہ نظامِ حیات ہی قدرِ مشترک قرار پا سکتا ہے
نہ کہ مذہبی فرقوں کا مختلف وجود _________ 313
تمام مذہبی فرقوں سے ایک اہم سوال کہ کیا نبی اکرم ﷺ شیعہ
تھے یا سنی؟ _______________ 313
یہاں تو مذہبی گروہ بندی سے ہٹ کر اپنے نام کا تعارف کرانا
بھی مشکل ہے _______________ 314
کیا کسی مسلمان کے لیے کسی کا مقلد ہونا ضروری ہے ___ 315
قرآنِ حکیم کے نزدیک فرقہ بندی تو شرک ہے ______ 316
ہر فرقے کی سند ایک الگ اتھارٹی ہوتی ہے جبکہ خدا تعالیٰ
کے نزدیک اس کی کتاب ہی اتھارٹی ہے _________ 316
دین میں نسلی نسبتیں کوئی معنی نہیں رکھتیں _______ 317
توحید کے اس صراطِ مستقیم میں کسی قسم کی کوئی مفاہمت نہیں ہوتی _ 318

شرک کے مقابلے میں حق ہمیشہ لاشریک ہوتا ہے ______ 318
الفاظ تو قرآن کے وہی رکھے لیکن اس کی تعلیم کو چیستاں
بنا دیا گیا ______ 319
قرآنِ حکیم کے متعلق نبی اکرم ﷺ کا ارشاد ______ 320
نبوت اور رسالت کے بلند ترین مقام پر فائز ہستی کا
قانونِ خداوندی کے متعلق فرمان اور ہم ______ 320
قانون سازی کے سلسلہ میں مغربی جمہوریت کی حقیقی شکل
وصورت اور اسلامی آئین کا مقام ______ 321
مغربی جمہوریت کی پیدا کردہ مفاد پرستیوں کی یہ گریس انسان
کو کہیں ٹکنے ہی نہیں دیتی ______ 322
تیرھواں باب: **سورة آل عمران** (آیات 71 تا 78)
قرآنِ حکیم کی طرف سے احبار و رہبان کی پیش کردہ تصور
دراصل ہر دور اور ہر قوم کے احبار و رہبان کی ترجمان ہے ______ 324
ہمیں قرآنِ حکیم کی طرف سے عطا کردہ نظامِ حیات کو مذہب
کی متضاد خیالی سے محفوظ رکھنا ہوگا ______ 324
عربی زبان میں قرآنِ حکیم کی تاریخی حیثیت اور روایات
کی نوعیت ______ 325
روایات کی بنیاد پر لکھی گئی تفسیروں کی نوعیت اور معیار ______ 326
تفسیر کے سلسلہ میں اپنی اپنی رائے کو نبی اکرم ﷺ کی تفسیر
قرار دے دیا گیا ______ 327
تیرہ سو سال میں لکھی گئی تفسیریں ایک ہی تفسیر "تفسیر طبری"
کی طرح غزلیں ہیں ______ 327
قرآنی الفاظ کے صحیح مفہوم تک پہنچنے کا وہ طریق جسے قرآنِ حکیم
نے خود متعین کیا ہے ______ 328
قرآنِ حکیم کی تفسیر بیان کرنے والے کا فریضہ ______ 329
ہمارے ہاں کتمانِ حق کے سلسلہ میں بخاری شریف کی ایک
روایت اور تصوف کی بنیاد ______ 329
تصوف کی تعلیم کا ماحصل اور مولانا رومؒ کا ایک شعر ______ 330
شیخ اکبر ابنِ عربیؒ تصوف کے سرخیل کی طرف سے باطنی معنی پر
مبنی سو جلدوں پر پھیلی قرآنی تفسیر میں فتوحات مکیہ یا فصوص الحکم 330
فتوحاتِ مکہ اور یہودیوں کے تصور کے مطابق تورات کے
معنی میں مماثلت ______ 331
ہمارے ہاں لکھی جانے والی تاریخ مسلمانوں کی تاریخ ہے
نہ کہ اسلام کی ______ 332
ہمارے ہاں مروجہ اسلام کی اکثر بنیاد غیر قرآنی اور غیر
اسلامی نظریات کی رہینِ منت ہے ______ 333
حق پر قائم رہنے کے لیے باطل کی مختلف چالوں سے محفوظ
رہنے کی تلقین ______ 334
بہتر فرقوں کے تصور کا تجزیہ غور و فکر کا متقاضی ہے ______ 334
فرقہ بندی کی موجودگی میں "رکوع کرو رکوع کرنے
والوں کے ساتھ" کا قرآنی حکم کب اور کہاں پورا ہوگا؟ ___ 334
دنیا بھر کے انسانوں کے اختلافات کا حل خدا کی آخری کتاب
"القرآن" کو الھدیٰ تسلیم کرنے میں ہے ______ 336
بنی اسرائیل یعنی یہودیوں کا دعوائے نبوت جو نسلی قرار پا
گیا اس کا نتیجہ ______ 336
خدا تعالیٰ کی طرف سے حضرت ابراہیمؑ کا پیغام الناس

کے لیے تھا ____ 337
ختمِ نبوت کے بعد قرآنِ حکیم نے ہر کسی آنے والے کے
انتظار کو ہمیشہ کے لیے خیر باد کہہ دیا ہے ____ 337
نبوت کا انتخاب خدا کی مشیت کے مطابق سرانجام پاتا تھا ____ 338
کسی ذاتی خوبی کو پرائیویٹ کرنے کا نتیجہ ____ 339
بعض اوقات ذاتی منفعت کے لیے جھوٹ بولنا جائز ہی نہیں
بلکہ واجب ہو جانے کے فتوے کا تجزیہ ____ 339
قرآنِ حکیم تمام انسانیت کے لیے ایک ہی ضابطۂ اخلاق
پیش کرتا ہے ____ 340
یونیورسل قانون کا بنیادی مفہوم پوری کائنات کے نظم و نسق
کا ترجمان ہے ____ 341
قدرت کی طرف سے متعین کردہ انسانی اقدار کے مقابلے
میں پوری کائنات کی متاعِ ثمنِ قلیل کا درجہ رکھتی ہے ____ 342
دُور اندیشی کا لفظ اپنے اندر عالمگیر انسانیت کا مفاد لیے
ہوتا ہے جبکہ حیوان کو اس کا اندازہ ہی نہیں ہوتا ____ 343
مفادِ عاجلہ کے مفہوم کے لیے حضرت عمرؓ کی زندگی کا ایک
تاریخی فیصلہ اور آخرت کا مفہوم ____ 344
وہ دور جس میں انسانیت نظامِ ربوبیت کے لیے اپنے پاؤں
پہ کھڑی ہو جائے گی ____ 345
لفظ ''یَلْوُنَ (3:78)'' کا لغوی مفہوم اور چرب زبانی
کرنے والوں کی کیفیت ____ 345
یہودیوں کے مطابق وحی کی دو قسمیں ہیں یعنی وحی متلو اور وحی خفی ____ 346
صدیوں سے ہمارے ہاں پایا جانے والا یہی تصور نہایت
ہی غور و فکر کا متقاضی ہے ____ 346
امام بخاریؒ کے بعد اسماء الرجال کی طرف سے چھانٹ پھٹک
کے عمل کا نتیجہ ____ 347
ہر حدیث کے آخر میں لکھے گئے الفاظ ''یا جیسے رسولؐ نے کہا ہو'' 348

چودھواں باب: **سورۃ آل عمران** (آیات 79 تا 85)

دین کی غرض و غایت اور اس کا ملخص خدا تعالیٰ کی
حکومت اختیار کرنا ہے ____ 349
تمدنی لحاظ سے انسانی زندگی کے نشیب و فراز اور پھر جمہوریت
کا فریب اور مذہبی پیشوائیت کی غلامی ____ 350
انسانیت کی سطح پر آئین سازی کے سلسلہ میں خدائے علیم و خبیر
کا اعلان ____ 351
ربوبیتِ عامہ کے لیے لفظ ربانی کی جامعیت کی وضاحت
خود قرآنِ حکیم کے الفاظ میں ____ 352
ربانی بننے کی خاطر قرآنی تعلیم کی خاطر دروس کے طریقِ کار
کی ضرورت اور اس کی اہمیت ____ 352
قائدِ اعظمؒ کی بصیرتِ قرآنی خود ان کے اپنے الفاظ میں ____ 353
تحریکِ پاکستان کے سلسلہ میں ہمارے دانشوروں کی
بھانت بھانت کی بولیاں ____ 354
رسول کی اطاعت کے معنی خدا کے قانون کی اطاعت ہے
نہ کہ رسول کی ذات کی ____ 355
مذہب میں اطاعت انفرادی ہوتی ہے جبکہ دین
کی اطاعت اجتماعی ____ 355
ہر آنے والے نبی نے پہلے نبی کے دین کی تجدید کی لیکن

اس میں برابر آمیزش ہوتی رہی ______ 356
دنیا بھر میں مختلف مذاہب کے وجود کی وجۂ جواز ______ 356
لفظ فُسق کا لغوی مفہوم ______ 357
کوئی نبی بھی ایسا نہیں گزرا جس کو خدا نے کتاب نہ دی ہو یا
فیصلہ کرنے کا اختیار نہ دیا ہو ______ 358
انبیائے کرامؑ کا ہجرت کرنا اپنے اندر ایک عظیم مقصد لیے
ہوئے ہوتا تھا ______ 360
وحی تو ہو مگر خدا کی کتاب کے مطابق قوتِ فیصلہ ناپید ہو جائے
تو قوم صرف وعظ کہنے والی بن کر رہ جاتی ہے ______ 361
غیروں کی حکومت میں دین پر عمل ہو ہی نہیں سکتا ______ 362
خارجی کائنات میں قانونِ خداوندی کی حکمرانی اور اس کی
افادیت اور نوعیت ______ 363
خارجی کائنات کی ہر شے قانونِ خداوندی کی اطاعت طوعاً
کر رہی ہے ______ 364
قانون کی اطاعت کرنے کے سلسلہ میں انسان کی کیفیت
اور قانونِ مکافات ______ 365
صراطِ مستقیم کو قبول کرنے والوں میں قومِ مسلم کی حالت ___ 366
حقائق پر مبنی قانون کو نہ ماننے والوں کی حالتِ زار ______ 367
قرآنِ حکیم کی آیت (33:72) کے غلط تراجم کی نوعیت
اور پھر اس کا صحیح مفہوم ______ 368

پندرھواں باب: **سورۃ آل عمران** (آیات 86 تا 97)

قرآن فہمی کے دوران علامہ پرویزؒ کی ذہنی کیفیت ______ 373
کسی مریض کے لیے نسخے پر مطمئن ہونا ہی ضروری نہیں بلکہ
اس نسخے کے مطابق علاج لینا بھی ضروری ہے ______ 373
نوعِ انسانی کے لیے عظیم ترین نظامِ حیات کو پامال کرنے
والی قوم کی زبوں حالی پر قرآنِ حکیم کی آہ و فغاں ______ 374
قرآنی حقائق کی نہایت شدت کے ساتھ وضاحت کو قبول
نہ کرنے پر ''کَیْفَ'' کے لفظ کا استعمال قابلِ غور ہی
نہیں قابلِ ندامت بھی ہے ______ 375
ملوکیت کو ختم کرنے والی قوم خود ہی ملوکیت کے تخت پر
صدیوں سے جلوہ افروز ہے ______ 375
ملوکیت کو دوام بخشنے کے لیے احبار و رہبان کا کردار قوموں پر
سب سے زیادہ اثر انداز ہوتا ہے ______ 376
احبار و رہبان کے بعد قارونیت یعنی نظامِ سرمایہ داری کا تانا
بانا اور اس کی گرفت کے خد و خال ______ 377
مذہب پرست قومیں خالص عقل کی راہنمائی کے تابع چلنے
والی قوموں کا مقابلہ کر ہی نہیں سکتی ______ 377
جہاں مذہب کی حکمرانی ہوگی وہاں زندگی کا کوئی شعبہ بھی
اپنے مقام پر دکھائی نہیں دے گا ______ 378
نظامِ دین کے سلسلہ میں رسول اکرم ﷺ اور خلافتِ راشدہ
کے دور کی جلوہ گری کی شہادت ______ 378
دین کے برعکس مذہبی حکمرانی میں حرماں نصیبی کی کیفیت کا نتیجہ 379
دنیا کی کوئی قوم بغیر کسی وجہ کے ذلت کے سمندر میں غرق
نہیں ہوتی ______ 380
صدیوں سے گرفتار ہماری کسمپرسی کا شافی علاج زندگی کی
قدر و قیمت کو جاننے میں مضمر ہے ______ 381

لفظ تاب توانسان کو مایوس ہونے ہی نہیں دیتا ______ 381
تباہی اور بربادی کے مایوس کن حالات میں ایک آنے والے
کا غلط تصور اور اس کی نوعیت ______ 382
زوال انگیز قوم کی کیفیت اور 1965ء کی جنگ کا ماجرا ___ 383
قرآنِ حکیم کو محفوظ رکھنے کا مقصد ______ 383
صدیوں سے غلط راستے کو بدلے بغیر آج ساری مسلم قوم
مرثیہ پڑھتے ہوئے دکھائی دیتی ہے ______ 384
توبہ کی قبولیت توعمل کے ساتھ مشروط ہے ______ 385
الم انگیز عذاب کی بنیادی وجہ دولت کے ڈھیر کو اپنی ذات تک
محدود رکھنا ہے ______ 385
تباہ حال قوموں کے نفوس تو باقی رہتے ہیں لیکن ان کے
ہاں وقار کی کوئی چیز باقی نہیں رہتی ______ 386
قرآنِ حکیم انسانیت کو ابدی مایوسی سے ہمیشہ کے لیے محفوظ
رکھنے کا طریق تجویز کرتا ہے ______ 386
ضروریاتِ زندگی کو احسن طریق سے پورا کرنے کی بجائے
نمود و نمائش کی جاذبیتوں کو دعوت دینا جہنم کو دعوت دینا ہے 387
فردوسِ گم گشتہ کو پالینے کا طریق ______ 388
قرآنی نظامِ حکومت کی ابتدا لفظ انفاق کے فارمولے کو عملی
شکل دینے سے ہوگی نہ کہ کفر اور اسلام کی آمیزش سے ___ 389
تحریکِ پاکستان کی بنیاد اسلام کے احیا کے لیے تھی نہ کہ یہ
کہ اسلام ایک چلا ہوا کارتوس ہے ______ 389
قرآنِ حکیم نے اپنے معاشی نظام کی بنیاد اڑھائی پرسنٹ
کی بجائے قُلِ الْعَفْوَ (2:219) پر رکھی ہے ______ 390
امتوں کے مرضِ کہن کا چارہ ______ 391
میکیاولی سیاست میں کبھی کوئی بات متعین طور پر نہیں کی جاتی 391
زندگی کے ہر شعبہ میں قرآن ایک متعین بات کرتا ہے ___ 392
قرآنِ حکیم انسان کی ہر پہلو سے ہر سو راہنمائی کرتا ہے ___ 393
دینِ خداوندی کی سب سے زیادہ مخالفت مشرکین کی بجائے
اہلِ کتاب کی طرف سے ہوئی ______ 394
انسانیت کے لیے قرآنِ حکیم نے حلال وحرام کی حدود خود
متعین کردی ہیں ______ 395
بزرگ قوم کا طرزِ زندگی پوری قوم کو متاثر کرتا ہے ______ 396
عالمگیر انسانیت کے لیے ملتِ ابراہیمیؑ کی اہمیت ______ 397
مکہ میں کعبہ کی اہمیت ایک سمبل کی ہے جہاں سے انسانیت
کی نشو و نما اور اس کے استحکام کا درس ملتا ہے ______ 398

سولھواں باب: **سورۃ آل عمران** (آیات 98 تا 104)

قرآنِ حکیم کے ہاں سابقہ اقوام کے تاریخی واقعات کو بیان
کرنے کا مقصد، اہلِ کتاب کی نوعیت اور اپنی حالتِ زار کا ذکر 400
دنیا بھر میں اہلِ مذاہب کے نزدیک سب سے بڑا جرم کتاب
اللہ کی طرف دعوت دینا ہے ______ 401
وضعی روایات اپنے آئینہ میں ______ 402
خدا کے راستے میں سنگِ گراں بن جانے والوں کی شورشوں کا
ذکر اور لفظ عَوج اور عِوج کا مفہوم ______ 403
اہلِ کتاب یا اہلِ مذہب کی تکنیک ______ 403
ہمارا رخ تو قبلے کی طرف رہا لیکن دین کی غرض و غایت کو بڑا
مفقود کر دیا ______ 404

اہلِ ایمان کو اہلِ کتاب والوں کی طرف سے لاتعلق
رہنے کی تلقین ______ 404
آج ہر فرقہ اپنی اپنی مساجد میں اپنے اپنے فرقے کی
تعلیم دینے میں مصروفِ کار ہے ______ 405
اُمتِ واحدہ کی خاطر ہر فرد کو دینِ خداوندی پر اسی طرح
ایمان لانا ہوگا جس طرح قرآنِ حکیم نے تجویز کیا ہے ______ 406
دین کے تصور کے برعکس مذہب میں ہر فرد انفرادی طور پر
اپنی نجات کی فکر میں مبتلا ہوتا ہے ______ 407
زندگی کے اجتماعی نظام میں رسول کی شخصیت کا مقام اور کردار ______ 407
نبی اکرم ﷺ کی وفات کے فوراً بعد اسی وقت
حضرت صدیق اکبرؓ کا ایک اہم خطاب ______ 408
مملکت اسلامیہ پاکستان میں اپنے اپنے فرقے کی
رجسٹریشن کی کوشش ______ 409
دین باقی نہ رہے تو پھر ہر فرد کا مذہب الگ الگ ہو جاتا ہے 410
وظیفوں کی بنیاد پر نبی اکرم ﷺ کے دیدار کی خواہش اور
اس کا انجام (بزبانِ پرویزؒ) ______ 411
عقیدہ یہ ہے کہ حدیث قرآنِ حکیم کی آیت کو منسوخ کر سکتی ہے 411
حیات النبی ﷺ کے متعلق بریلوی حضرات کا عقیدہ ______ 412
اجتماعی طور پر دین کے مطابق نظامِ حکومت قائم کرنے
کے مسئلہ کا حل ______ 412
خدا تعالیٰ کا دین نہ تو مذہبی فرقوں کے وجود کو تسلیم کرتا ہے
اور نہ ہی سیکولرازم کو ______ 413
قرآنِ حکیم تو اُمت کے کسی سیاسی اجتماع میں بھی اپوزیشن
کی شکل کو برداشت نہیں کرتا ______ 414
اقامتِ صلوٰۃ کا تو بنیادی مقصد ہی ہر قسم کی مذہبی اور سیاسی
فرقہ بندی کو ختم کرنا تھا ______ 415
قرآنِ حکیم کی واضح، لاریب، نور، سہل اور آسان تعلیم
میں اختلاف کی تو کوئی گنجائش ہی نہیں ہے ______ 416
فرقہ بندی کے مرض کی وجۂ جواز ایک دوسرے سے بڑھ
جانے کی ہوس ہے (42:14) ______ 416
الصراط المستقیم جیسی عظیم نعمت کی نوعیت اور لفظ عدو اور پھر
لفظ الفت کا لغوی مفہوم ______ 417
قرآنِ حکیم کی پیش کردہ آئیڈیالوجی کے بغیر کوئی معاشرہ
بھی الفت کے ثمرات سے لطف اندوز ہو ہی نہیں سکتا ______ 417
لفظ اخوان کا لغوی مفہوم اور نبی اکرم ﷺ کا فرمان ______ 418
جہنم کے کنارے سے واپس جنتِ ارضی کی طرف لوٹ
آنے کی نوید ______ 419
قرآنِ حکیم کے غلط تراجم نے کتاب اللہ کی پوری تعلیم کو ہی
بدل کر رکھ دیا ہے ______ 419
بھلائی کی طرف بلانے اور منکر سے روکنے ______ 420
وعظ کرنے والا صرف وعظ تک ہی محدود ہوتا ہے وہ حکم نہیں
دے سکتا ______ 420
تمکن فی الارض کی اہمیت اور پوری ملت کا فریضہ ______ 421
قرآنِ حکیم خود کو کسی ایک مخصوص گروہ تک محدود نہیں رکھتا ______ 422
قرآنِ حکیم میں لفظ منکم کے استعمال کی وضاحت ______ 422
مذہب پرست گروہ کی طرف سے مغالطہ آمیزی کا پیدا کردہ

اثر گروہ بندی کو پروان چڑھانے کے مترادف ہے ______ 423

سترھواں باب: **سورۃ آل عمران** (آیات 105 تا 115)

فرقہ بندی کو قائم دائم رکھتے ہوئے کوئی فرقہ بھی خود کو
قرآنی تعلیم سے منطبق نہیں کر سکتا ______ 425
مملکتِ اسلامیہ میں آئینی سطح پر مسلمہ مذہبی فرقوں کو تحفظ
فراہم کرنا چہ معنی؟ ______ 426
فرعون کا سب سے بڑا جرم قوم کو پارٹیوں میں تقسیم کرنا تھا ______ 427
اُمت میں باہمی اختلاف تو قرآنی تعلیم کے ہی خلاف ہے
تو وہ پھر باعثِ رحمت کیسے ہو سکتا ہے ______ 428
امت میں گروہ بندی تو عذابِ عظیم کا موجب ہوتی ہے ______ 428
کرۂ ارض پر مراکو سے انڈونیشیا تک جغرافیائی اور تمدنی طور پر
مرکزی پوزیشن کی حامل قوم آخر اس قدر عذاب میں کیوں مبتلا ہے ______ 429
کیا خدائے رحیم انسان کو دنیا بھر کے عذابِ عظیم میں مبتلا
کر کے آزمائش کرتا ہے؟ ______ 430
عذابِ الیم میں مبتلا ہونے کو رحمت تصور کرنے والی قوم
کا کیا علاج؟ ______ 430
ملتِ اسلامیہ کے غم میں علامہ پرویزؒ کی آہ و فغاں ______ 431
انسان کو صاحبِ اختیار و ارادہ بنانے کی حکمت کا اظہار ______ 432
انسانی زندگی کی حقیقت کو سمجھنے کے لیے' کچھ تعمیری پہلوؤں
کی وضاحت کے لیے وحی کی ضرورت ______ 433
قرآنی الفاظ کے سلسلہ میں وجد آفریں انتخاب کا ذکر اور
ان کی اہمیت ______ 434
قرآنی راہنمائی کا انداز' اس کا ماحصل اور اس کے
استعمال کا طریق ______ 435
جو قوم خود روٹی کے چند ٹکڑوں تک کی محتاج ہو وہ کسی کے کیا
کام آئے گی ______ 436
اہلِ کتاب کا طرزِ زندگی اور ہماری ذہنی کیفیت ______ 436
ہماری پس ماندگی کا شافی علاج خدا کی آخری کتاب
میں محفوظ ہے ______ 437
مسلمان امت سے قرآنِ حکیم کا آج پھر مطالبہ ہے ______ 438
جنگِ بدر کے تین سو تیرہ السابقون الاولون کا عظمتِ کردار ______ 439
دل و دماغ کو جلا بخشنے والی مردِ مومن کی شخصیت تو ہر آن
ایک نئی شان کی حامل ہوتی ہے ______ 440
بخشیش میں حاصل کردہ جنت کی کوئی معیاد ہی نہیں رہتی ______ 440
قرآنِ حکیم کے مطابق جنت ہو یا جہنم وہ تو انسان کے
اعمال کا ہی اجر ہوتی ہے ______ 441
مذہب اور روٹی کے چند ٹکڑوں کی آڑ میں کمیونزم کے خلاف
سرمایہ دار سلطنتوں کا اجتماع ______ 442
مستقل اقدار کی منزل کو نظر انداز کرنے کا نتیجہ ہمیشہ ذلت
و مسکنت کے عذاب کے سوا کچھ اور نہیں ہوتا ______ 442
مختلف مذہبی فرقوں کی آبیاری کرنے والوں کے مقابلے میں
خالص فکرِ قرآنی کو عام کرنے والوں کے ساتھ ہونے والا سلوک ______ 443
قانونِ مکافاتِ عمل کی لاٹھی ہر باطل تصور کو بتدریج ختم
کر دے گی ______ 444
ہندوستان میں مختلف قوموں کا حشر' مسلمانوں کی پوزیشن ______ 445
ہندو کی دسترس سے مسلمان قوم کو بچانے کی خاطر سر سیدؒ کی

جواں مردی اور بلند نگہی کام آ گئی ______ 446
سر سیدؒ کے بعد حضرت علامہ اقبالؒ کی طرف سے 1908ء
کا اعلانِ عظیم ______ 446
ملتِ اسلامیہ کے ایک روشن چراغ قائدِ اعظمؒ کی رفاقت کا
ثمر مملکتِ پاکستان کا حصول ______ 447
گاندھی کے دل میں مچلنے والی واردا کی تعلیمی سکیم اور ڈاکٹر ذاکر
حسینؒ شیخ الجامعہ کے صدر اور مولانا آزاد امام الہند کی خدمات _ 447
مولانا آزاد امام الہند کی قرآنی تفسیر کے خلاف تحریک طلوعِ
اسلام کے کردار کی اہمیت ______ 447
قرآنِ حکیم کے ہاں قرآن پر ایمان والوں کی تعریف
اور نشاندہی ______ 448
مذہب قدم قدم پر فرقہ بندی کی آبیاری کرتا ہے جبکہ دین
امتِ واحدہ کی ترغیب دیتا ہے ______ 449
قرآنِ حکیم کی طرف سے پیش کردہ دین تو عالمگیر صفات
کا حامل ہے ______ 449
ابوالکلام آزاد کی زندگی کے آخری الفاظ کہ ''دین ایک
چلا ہوا کارتوس ہے'' ______ 450
اٹھارھواں باب: **سورۃ آل عمران** (آیات 116 تا 120)
مذہب کے تصورات اور دین کی طرف سے مستقل اقدار
میں بنیادی فرق ہے ______ 452
غور و فکر اور تحقیق کے بغیر کسی چیز کو تسلیم کر لینا اندھی تقلید
تو کہلا سکتا ہے، ایمان نہیں ______ 453
مذہب کے نام پر بے تحاشا خرچ لیکن نتیجہ صفر لہٰذا ہر سو تباہی
ہر سُو موت ______ 453
زندہ قومیں فطرت کی طرف سے رونما ہونے والے حوادث
کی فکر کو بھی پیشِ نظر رکھتی ہیں ______ 454
قدرت کسی پر ظلم نہیں کرتی ______ 455
عقلِ خود بیں کی جگہ قرآنِ حکیم کی تعلیم تو پوری انسانیت کو
ایک عالمگیر برادری کا تصور پیش کرتی ہے ______ 456
قرآنِ حکیم انسانوں کے لاتعداد گروہوں کو صرف دو حصوں
میں تقسیم کرتا ہے ______ 456
انسانی دنیا میں آئیڈیالوجی کی بنیاد پر ایک قوم کی تشکیل
کا نظریہ قرآنِ حکیم کا ہی عطا کردہ ہے ______ 457
ایک اسلامی مملکت میں غیر مسلم افراد کی قانونی حیثیت کا تعین 458
ہمارے ہاں تمام تر ذہنی انتشار کی بنیادی وجہ اور اس کا علاج _ 459
ابوالکلام آزاد جیسا قلم کا بادشاہ لیکن متضاد خیالی میں الجھی
ہوئی حامل شخصیت ______ 460
انگریز کی کھینچی ہوئی لکیریں علاقائی زبان پر مختلف قوموں
کا روپ اختیار کر گئیں ______ 461
کسی غیر مسلم کو اپنے رازوں میں رازدان بنانا، دو قومی
نظریہ کی نفی ہے ______ 461
قرآنِ حکیم کی آیت (3:119) کے صحیح مفہوم کے لیے
جنگِ بدر کے میدان کو پیشِ نظر رکھنا ہوگا ______ 462
قرآنِ حکیم کے بیان کردہ نظریۂ زندگی کو تسلیم کرنے والوں
کا اندازِ زیست ______ 463
دوستی کا معاملہ ہو یا الفت کا یا احترام کا اِن تمام کا انحصار نظریاتی

ہم آہنگی سے وابستہ ہے ________ 464
حضرت ابراہیمؑ کے علاوہ نبی اکرمﷺ کی زندگی کو
قرآنِ حکیم نے انسانیت کے لیے اسوۂ حسنہ قرار دیا ہے __ 465
قرآنِ حکیم اپنے ہاں آئیڈیالوجی کے اس قدر فرق کے
باوجود کسی انسان کے احترام میں امتیاز پیدا نہیں کرتا ____ 466
قرآنِ حکیم پر مبنی نظریات رکھنے والوں کی اندرونی چپقلش
کی کیفیت ________ 467
مسلم قوم کی نسبت کی بنا پر یہود اور نصاریٰ کی مخالفت کی
سازشیں اور پھر صلیبی جنگوں کا کردار ________ 468
یہودیوں کی طرف سے حضرت عیسیٰؑ کو صلیب پہ چڑھانے
کا دعویٰ ________ 469
فلم Ben Hur کی نمائش میں پیش کیے جانے
والے مناظر ________ 469
ہمارے ہاں دو قومی نظریہ کو پامال کرنے کے مختلف حربے
اور جناحؒ اور علامہ اقبالؒ کو فراموش کرنے کا نتیجہ ____ 470
فرمانِ قائدِ اعظمؒ: ''پاکستان کی پہلی اینٹ تو اس روز رکھ دی
گئی تھی جس روز ایک غیر مسلم نے مسلمان ہونے کا اعلان کیا تھا'' _ 470
ہمارے ہاں ایک دوسرے کو کافر کہے جانے کا معیار ____ 471
حسین احمد مدنی کے فتویٰ کے خلاف علامہ اقبالؒ کی پکار اور
دینِ خداوندی کی تعلیم ________ 472
نظریاتی زندگی کے بغیر گھریلو زندگی بھی حیوانی زندگی بن کر
رہ جاتی ہے ________ 473
اگر گھریلو زندگی میں میاں بیوی کی نظریاتی رفاقت نہ ہو تو وہ
گھر نہیں ہوتا، جہنم ہوتا ہے ________ 473
خدا کے لشکر کی بنیادی خصوصیات اور ان کی ترجیحات ____ 474
مملکتِ اسلامیہ کی تشکیل کے سلسلہ میں حضرت عمرؓ کے عہد کی
ایک مثال ________ 475
غیر مسلموں کے ساتھ باہمی روابط قائم رکھنے کے لیے
قرآنی راہنمائی اور میکیاولی سیاست کا فرق ________ 476
غیروں کی سازشوں سے محفوظ رہنے کا طریق ________ 477

پہلا باب: سورۃ آل عمران (آیات 1 تا 8)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

عزیزانِ من! آج ستمبر 1969ء کی 14 تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز سورۃ الِ عمران (تیسری سورۃ) کی پہلی آیت سے ہوتا ہے۔

حروفِ مقطعات کی بنیادی خصوصیت

الٓمٓ ۔ اللّٰہُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۙ الۡحَیُّ الۡقَیُّوۡمُ ((2-3:1۔ الٓمٓ ہی سے سورۃ بقرہ کی بھی ابتدا ہوئی تھی اور حروفِ مقطعات کے سلسلے میں جیسا کہ اب آپ کو معلوم ہے میری بصیرتِ قرآنی کے مطابق یہ اللہ تعالیٰ کی صفات ہی کی ABRIVIATION کے الفاظ ہیں۔ جیسا کہ میں نے شروع میں تفصیل سے عرض کیا تھا عربوں کے ہاں یہ قاعدہ تھا اور دوسری زبانوں میں بھی یہ ہے کہ وہ لفظوں کا ایک حرف لے کر اس حرف سے پورے لفظ کا مطلب لے لیتے ہیں۔ یہ RSVP وغیرہ آپ کے ہاں انگریزی میں اس طرح بولتے ہیں۔ یہ بالکل وہی چیز ہے۔ عبرانی زبان میں بھی یہ انداز تھا عربی زبان میں بھی یہ انداز تھا۔ اور قرآن تو لسانِ عربیٍ مبین میں نازل ہوا ہے' اس لیے قرآنِ کریم کو سمجھتے وقت اس چیز کو نظر انداز نہ کیجیے کہ عربی زبان کا جو اندازِ بیان تھا وہی اندازِ بیان قرآن میں بھی ملحوظ رکھا گیا ہے۔ اور یہ ان کے ہاں کی ایک چیز تھی۔ الٓمٓ (3:1): یعنی خدائے علیم و حکیم۔ اور یہ ضروری نہیں کہ یہ

پہلا ہی حرف ضرور لیتے تھے بلکہ اس میں کوئی حرف لے لیتے تھے لیکن وہ ایسا ہوتا تھا کہ جس سے ذہن فوراً اسی طرف منتقل ہوجا 8 47 **آلِ عمران** تھا۔ الٓمّٓ: خدائے علیم وحکیم کا ارشاد ہے۔ یہ جو آیت ہے اللّٰہُ لَآ اِلٰہَ اِلَّا ھُوَ لا الْحَیُّ الْقَیُّوْمُ (3:2) سورۃ بقرہ میں بھی آ چکی ہے۔ (2:255) میں یہی الفاظ ہیں اور لَآ اِلٰہَ اِلَّا ھُوَ یا اِلاَّ اللّٰہُ یہ تو بنیاد ہے قرآن کی پوری تعلیم کی یعنی اس کائنات میں کوئی صاحب اقتدار نہیں، کسی کا قانون نہیں چل سکتا۔ یہ نفی ہے جس میں ہر قسم کے اقتدار کی تردید کی گئی ہے۔

آزاد انسانوں کی معاشرتی زندگی میں الٰہ کی طرف سے کنٹرول اور اقدار کی اہمیت

آپ سوچیے کہ اس سے انسان کو کتنی عظیم آزادی حاصل ہوتی ہے کہ کسی شخص کا اقتدار کسی شخص کے اوپر نہیں۔ یَوْمِ الدِّیْنِ (1:3) کے متعلق جیسا قرآن میں یہ کہا ہے کہ یَوْمَ لَا تَمْلِکُ نَفْسٌ لِّنَفْسٍ شَیْئًا (82:19) کہ جس دور میں کسی شخص کا کسی دوسرے کے اوپر کسی قسم کا کوئی دباؤ نہیں ہوگا۔ لیکن اگر اتنی سی چیز ہوتو یہ تو منفیانہ (NEGATIVE) انداز ہے۔ یہ تو انکار کی ہے، اس سے تو کام نہیں چل سکتا۔ اس لیے اگلی چیز اس کے ساتھ ہی وہ اضافہ کر کے اس کی تکمیل کی یعنی اِلاَّ اللّٰہُ۔ وہی جو آیت میں نے ابھی تلاوت کی اس کا ٹکڑا جو ہے کہ اس دور میں کوئی کسی کا دبیل نہیں ہوگا۔ اس کے آگے ہے وَ الْاَمْرُ یَوْمَئِذٍ لِّلّٰہِ (82:19)۔ یہ نہیں کہ وہاں انارکی ہوگی، کسی قسم کا قاعدہ ہی نہیں ہوگا، قانون ہی نہیں ہوگا بلکہ انسانوں کا کوئی اقتدار کسی دوسرے انسان پر نہیں ہوگا۔ وَ الْاَمْرُ یَوْمَئِذٍ لِّلّٰہِ (82:19) اس دور میں تمام امور کے فیصلے خدا کے قوانین کے مطابق ہونگے۔ یہی وہ چیز ہے کہ جو لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ کے اندر پوشیدہ ہے یعنی کوئی صاحبِ اقتدار نہیں لیکن LAWLESSNESS بھی نہیں۔ ایک صاحبِ اقتدار، ایک قانون دینے والا، اسی کے قانون کی اطاعت ہوگی۔ اور وہ انسانوں سے بالاتر ہستی ہے۔ اللّٰہُ لَآ اِلٰہَ اِلَّا ھُوَ لا الْحَیُّ الْقَیُّوْمُ (3:2) حَیُّ کے معنی ہیں ''زندہ اور زندگی عطا کرنے والا''۔ قَیُّوْمُ کے معنی ہیں ''جو خود اپنے قیام کے لیے، اپنے وجود کے لیے، اپنی EXISTENCE کے لیے کسی دوسرے کا محتاج نہ ہو، اور ہر ایک کے قیام کا ذمہ دار ہو، ہر شے اس کی وجہ سے وجود کوش ہو یا وجود پذیر ہو، اور وہ خود اپنی ذات کے لیے، اپنے وجود کے لیے کسی کا محتاج نہ ہو''۔ جیسا کہ میں نے عرض کیا تھا عربی زبان ایسی جامع ہے کہ اس میں ذرا سا باب بدل دیا جائے تو اس باب میں ایک نئی قسم کی جامعیت آ جاتی ہے۔ الْحَیُّ الْقَیُّوْمُ (3:2)۔ زندگی اور اس کے بعد قیام بڑی ضروری چیزیں ہیں۔ زندگی اس نے عطا کی۔ یہ جو قیام ہے یعنی خارجی کائنات میں خدا کا جو قانون جاری و ساری ہے اس کے مطابق ہر شے کا قیام ہے، اس کی EXISTENCE ہے، وہ موجود ہے، وہ باقی رہتی ہے۔ انسانوں کی دنیا کے اندر بھی اس قانون کی ضرورت تھی۔ انسان کی طبعی زندگی کے لیے تو وہی قوانین ہیں جو خارجی کائنات میں کارفرما ہیں۔

انہی کے تابع اس کی طبعی زندگی (PHYSICAL LIFE) چلتی ہے لیکن اس نے انسان کو حیوانی سطح سے اونچا لے جا کر اس کی ایک انسانی زندگی بھی بتائی ہے۔ وہ انسانی زندگی کہ جس میں اس نے متمدن زندگی بسر کرنی ہے۔

مادی شعبۂ زندگی میں ذاتِ انسانی کی نشوونما کے لیے حق کا قیام ضروری ہے

متمدن زندگی میں ایک انسان کا دوسرے انسان کے ساتھ واسطہ پڑتا ہے۔ اس میں ایسے قوانین ہونے چاہئیں کہ جن سے اتنا ہی نہیں کہ مدنیت کی زندگی میں آپس میں ٹکراؤ نہ ہو' تصادم نہ ہو بلکہ باہمی تعلقات سے ہر فرد کی ذات کی نشوونما بھی ہوتی چلی جائے۔ یہ ہے انسانی سطح زندگی اور اس کے لیے جو قوانین اس نے عطا کیے' وہ وحی کے ذریعے' خصوصیت سے' انسانوں کے لیے عطا کیے۔ اس لیے جب اس نے **الْحَیُّ الْقَیُّوْمُ** (3:2) کہا یعنی زندگی اور EXISTENCE قائم رہنے کی صفت بیان کی تو سطح حیوانی سے بلند ہو کر' انسانوں کو انسان کی سطح پہ خطاب کرتے ہوئے کہا کہ اس مقصد کے لیے **نَزَّلَ عَلَیْکَ الْکِتٰبَ بِالْحَقِّ** (3:3) اے رسول! ہم نے تیری طرف یہ کتاب بتدریج' حق کے ساتھ نازل کی۔ جیسا کہ آپ کو اب معلوم ہے کہ حق' قرآن کی بڑی جامع اصطلاح ہے۔ حق یعنی ٹھوس حقیقتیں (THE TRUTH)۔ ایک ذہنی یا قیاسی چیز نہیں' یونہی ABSTRACT (مجرد) نہیں۔ اس کے لیے بنیادی طور پہ محسوس ٹھوس حقیقتوں کا ہونا اور دوسری چیز ان حقیقتوں کا زمانے کے تقاضوں کے مطابق جن ضرورتوں کے لیے وہ چیزیں دی جاتی ہیں' ان میں FIT IN ہو جانا ہے۔ آج سے پہلے' دروازے میں ایک چول ہوتی تھی' اس کے نیچے ایک ساکٹ ہوتا تھا۔ یہ جس طرح سے کہ وہ اس کی چُول' اس ساکٹ کے اندر فٹ ہوتی ہے لیکن جامد طور پہ فٹ نہیں ہوتی۔ ایک تو یہ کہ جیسے آپ کوئی چیز گاڑ دیتے ہیں تو وہ بھی فٹ ہوتی ہے لیکن اس میں جمود ہوتا ہے۔ ایسی چیز کہ جو کسی دوسرے میں فٹ تو آ گئی ہو لیکن اس کی حرکت کے راستے میں وہ مزاحم نہ ہو پائے' اسے **الْحَقِّ** (3:3) کہتے ہیں۔ دیکھتے ہیں ان عربوں کی یہ زبان کیا تھی! دروازے کی موومنٹ بھی پوری پوری رہتی ہے اور وہ اپنے مقام سے ہل بھی نہیں سکتا۔ ذرا سا اس مقام سے اس کو ہلا دیجیے' دروازہ دروازہ نہیں رہتا۔ اگر جامد ہو جائے تو بھی نہیں رہتا۔ یا وہاں سے اگر ذرا ادھر اُدھر ہٹ جائے' پھر بھی وہ دروازہ نہیں رہتا۔

آج کرۂ ارض پر انسانوں کے لیے وحی کی خصوصی تعلیم' قرآنِ حکیم کے سوا کسی جگہ موجود نہیں

نَزَّلَ عَلَیْکَ الْکِتٰبَ بِالْحَقِّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَیْنَ یَدَیْهِ (3:3) عزیزانِ من! یہ قرآن ہی کی عظمت ہے۔ ' قرآن ہی کی' میں نے اس لیے کہا کہ زمانۂ نزولِ قرآن میں اور اس کے بعد بھی' اس سے پہلے جتنی کتابیں آسمانی آئی تھیں' وہ اپنی اصلی شکل میں

باقی نہیں رہی تھیں۔اس لیے جب ہم یہ کہتے ہیں کہ فلاں خصوصیت صرف قرآن ہی کی ہے تو اس کے یہ معنی نہیں ہوتے کہ یہ بات 478 آلِ عمران

خدا نے پہلی دفعہ' اس میں کہی ہے۔اس سے پیشتر حضراتِ انبیائے کرامؑ کی وساطت سے جو خدا کی تعلیم آتی رہی وہ اساسی طور پر' اصولاً وہی تھی جو قرآن کے اندر ہے لیکن وہ اپنی اصلی شکل میں باقی نہ رہی۔اس لیے جب ہم کہتے ہیں کہ قرآن ہی کی خصوصیت ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ اب یہ خصوصیت کسی اور جگہ نہیں ملتی۔اور وہ خصوصیت جس کی طرف میں اشارہ کر رہا تھا' وہ یہ کہ دنیا میں آپ دیکھیں گے کہ ہر اہلِ مذہب یہ کہتا ہے کہ سچائی صرف ہماری طرف آئی تھی' کسی اور کی طرف نہیں آئی تھی۔اور یہ قرآن ہے جس نے یہ کہا کہ دنیا کی ہر قوم میں' ہر زمانے میں' ہماری طرف سے رسول آتے رہے اور وہ ہماری طرف سے وہی تعلیم لاتے رہے جو تعلیم اب اصولی طور پر قرآن کے اندر تمہیں ملے گی۔اور اسی لیے اس نے یہ کہا کہ محمد رسول اللہ ﷺ پر ایمان لانے سے پہلے ضروری ہے کہ تم تمام انبیاؑ کے اوپر ایمان لاؤ جو ان سے پہلے آ چکے ہیں۔اور اس حیثیت سے ایمان لاؤ کہ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِهٖ قف (2:285) ان کے رسول ہونے کی حیثیت سے ہم ایک دوسرے میں قطعاً کوئی تفریق نہیں کرتے۔آپ دیکھتے ہیں کہ دیگر اہلِ مذاہب کے بانیوں کی تعظیم وتکریم واحترام پر بھی ایمان ضروری ہے۔میں نے کہا تھا کہ یہ بات قرآن کے باہر کہیں نہیں ملے گی۔کس قدر وسعتِ ظرف ہے' کس قدر کشادگیٔ نگاہ ہے۔اور یہ نہیں کہ کسی پر احسان رکھ رہے ہیں بلکہ ایسا کہنے سے خدا کی طرف سے ایک حقیقت کا اظہار ہے کہ جب ہماری ہی طرف سے یہ تمام انبیاؑ آئے تھے اور اس سلسلے کی آخری کڑی یہ محمد رسول اللہ ﷺ ہیں۔تو پھر تو ہر نبیؑ کو نبی ماننا ہوگا' تمام رسولوں پہ ایمان لانا ہوگا' اس حیثیت سے کہ کسی رسول کی رسالت کے منصب میں تم کسی قسم کا فرق نہ کرو۔لہٰذا ان کی طرف جو کتابیں نازل ہوئیں ان کو بھی ماننا ہوگا کہ وہ اپنے اپنے وقت میں خدا کی طرف سے آئی تھیں۔

قرآنِ حکیم نے اپنے ہاں تصریفِ آیات کا انداز ایک خاص تدریسی مصلحت کے تحت اپنایا ہے

اب یہاں کہا ہے کہ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ (3:3)۔یہ بات پہلے بھی آ چکی ہے لیکن چونکہ درس میں نئے نئے احباب بعد میں بھی آتے ہیں اس لیے جب بھی اس قسم کی چیزیں آتی ہیں میں انہیں پھر دہرا دیا کرتا ہوں۔جو پہلی دفعہ تشریف لاتے ہیں ان کے لیے یہ بات پہلی دفعہ سامنے آتی ہے۔جو التزاماً تشریف لا رہے ہیں ان کے لیے یہ بات مکرر ہو جائے گی۔قرآن نے تو خود اپنا انداز' تصریفِ آیات کہا ہے یعنی وہ بار بار' لوٹا لوٹا کر باتیں بیان کرتا ہے۔جیسا میں نے کہا تھا درس تو کہتے ہی اسی کو ہیں کہ وہ جو اناج کو گاہنا ہوتا ہے۔بیل بار بار چلائے جاتے ہیں تا آنکہ وہ دانہ سٹوں سے یا خوشوں سے نکل کر باہر آ جائے۔اس لیے اگر یہ چیزیں دہرائی جائیں تو یہ طریق قرآن کے عین مطابق ہوتا ہے۔

لغت کے تحت لفظ مصدق یا تصدیق کا قرآنی مفہوم

ہمارے ہاں مُصَدِّقًا لِّمَا بَیۡنَ یَدَیۡهِ (3:3) کا ترجمہ یہ کیا جاتا ہے کہ ''یہ تصدیق کرتی ہے ان کتابوں کی جو ان لوگوں کے پاس ہیں''۔ آپ سوچیے کہ یہ لفظِ تصدیق عربی زبان میں ہو تو پھر تو بات سمجھ میں آ جاتی ہے۔ ہمارے ہاں تصدیق کے معنی ہوتے ہیں ''کسی چیز کو CONFIRM کر دینا' اس کو APPROVE کر لینا''۔ جیسے عام طور پر کہا جاتا ہے کہ اس کی تصدیق کر دینا کہ یہ بات ٹھیک ہے' سچی ہے۔ اور اس زمانے میں کم از کم ان عربوں کے سامنے تو یہی دو کتابیں (تورات و انجیل) تھیں۔ ان میں تحریف کے متعلق خود قرآنِ کریم بار بار یہ کہتا ہے کہ وہ اپنی اصلی شکل میں نہیں رہیں۔ اب آپ سوچیے کہ جو چیز قرآن کے نزول کے وقت اپنی حقیقی شکل میں نہیں تھی اس کے متعلق اگر ہم یہ کہیں کہ قرآن ان کے سچے ہونے کی تصدیق کرتا ہے تو یہ چیز تو SELF CONTRADICTORY ہو جائے گی۔ یہ تو قرآن خود اپنی تردید کر رہا ہوگا کہ ایک طرف ان کو محرف کہہ رہا ہے اور دوسری طرف انہی کتابوں کی سچائی کی تصدیق کر رہا ہے۔ مصدق یا تصدیق کرنے کے معنی ہوتا ہے کسی بات کو سچ کر دکھانا۔ یعنی ان کتابوں کے جو دعاوی تھے' ان کتابوں کی جو تعلیم تھی' اب یہ قرآن اور اس کا لانے والا ان دعاوی کو سچ کر دکھائے گا۔ کم از کم ایک چیز تو تورات اور انجیل کیا دنیا کی ہر کتاب میں موجود ہے اور وہ یہ کہ ایک دور بہرحال آنے والا ہے جس میں حق کا نظام قائم ہوگا' باطل مغلوب ہوگا۔ دنیا کے ہر اہلِ مذہب کے ہاں ان کی کتابوں میں یہ چیز موجود ہے اور اس کے لیے وہ انتظار کر رہے ہیں کسی آنے والے کا کہ ایک آنے والا آئے گا اور وہ ان دعاوی کو سچ کر دکھائے گا جو ان پہلی کتابوں میں تھے۔ اور یہ دعویٰ تو بنیادی ہے۔ اور میں کہتا ہوں کہ دعویٰ ہی یہی ہے کہ دنیا میں جو غلط نظام ہے اس کی جگہ حق کا نظام قائم کیا جائے۔ ان کے ہاں کتابوں میں یہ چیز تھی لیکن وہ کتابیں یہ نہیں بتاتی تھیں کہ یہ کس طرح سے کیا جائے گا۔ اس کے لیے انہوں نے یہ عقیدہ وضع کیا تھا کہ ایک آنے والا آئے گا اور وہ کر دکھائے گا۔

دیگر مذاہب والوں کے نزدیک کسی ایک آنے والے کا تصور اور اس کی حقیقت

یہ جو چیز تھی کہ جس تعلیم کو عملاً متشکل کرنے کے لیے یہ لوگ ایک آنے والے کا انتظار کر رہے ہیں' وہ آنے والا اب آ گیا ہے۔ یہ قرآن آیا اور قرآن کا لانے والا آ گیا۔ اب یہ ان کے ان دعاوی کو' جس کے انتظار میں وہ اتنا عرصہ سے چلے آ رہے ہیں' یہ اپنے ہاتھوں سے اس کو سچ کر دکھائے گا۔ یہ ہے ان چیزوں کا مصدق ہونا۔ وہ آنے والا آیا اور اس نے فی الحقیقت ان چیزوں کو

سچ کر دکھایا۔ اب یہ ان اہلِ مذہب کی تنگ نظری تھی کہ اس کے باوجود انہوں نے اس آنے والے کو وہ آنے والا نہ سمجھا۔ اور یہ تنگ نظری حضور ﷺ کے سلسلے میں ہی پیدا نہیں ہوئی بلکہ حضرتِ عیسٰیؑ کے سلسلے میں بھی ہوئی جو کہ بنی اسرائیل میں سے تھے۔ اور بنی اسرائیل انتظار کر رہے تھے ایک آنے والے مسیح کا کہ جس کے ہاتھوں وہ نظام قائم ہوگا۔ وہ آنے والا' مسیح آیا۔ اس نے ان سے آ کر کہا کہ جن باتوں کا تم انتظار کر رہے ہو' میں انہیں سچ کر کے دکھاؤں گا۔ اور انہوں نے نہ صرف یہ کہ ان کی تائید نہیں کی بلکہ ان کی جان تک کے لاگو ہو گئے۔ یہ ہے وہ تنگ نظری۔ یہ بات ذرا لمبی ہے کہ پھر یہ اس طرح سے آنے والے کا انتظار بھی کرتے ہیں اور آنے والے کی تردید اور مخالفت کیوں کرتے ہیں؟ ایک فقرے میں یہ دیکھیے کہ انتظار تو یہ مذہبی پیشوائیت والے کراتے ہیں جو اگر یہ تسلیم کر لیں کہ وہ آ گیا ہے جس کے ہاتھوں سے ہوگا تو ان کی چوہدراہٹ ختم ہو جاتی ہے۔ یہ کبھی نہیں مان کے دیں گے۔ آنے والے کے انتظار کے عقیدے سے دوسری طرف نہیں جانے دیں گے۔ کہیں گے کہ وہ تمہارے ہاں ہی آنا ہے اور جب وہ آتا ہے تو آنے والے کو مان کے نہیں دیں گے کہ خود ختم ہوتے ہیں۔ یہی چیز نبی اکرم ﷺ کے زمانے میں ہوئی۔ بہرحال یہ بات دوسری ہے۔

ہمارے ہاں کسی آنے والے کے متعلق پایا جانے والا تصور اور پھر اس کا نتیجہ

ضمناً یہ کہ وہ آنے والا آ بھی گیا' آخری کتاب لے آیا۔ آخری رسول بھی آ گیا اب آنے والے کا تو سوال ہی نہیں تھا۔ لیکن اس قوم نے بھی پھر تھوڑے عرصے کے بعد وہی تصور قائم کر لیا جو پہلے چلا آ رہا تھا کہ اب ایک اور آنے والا آئے گا۔ اب اس میں پھر ایک آنے والا ان کے ہاں بھی آئے گا! اللہ اکبر!! یعنی جو کچھ پہلی قوموں نے' کیا حرفاً حرفاً وہی کچھ اس قوم نے کیا۔ ہم الزام دیتے ہیں یہود کو کہ آنے والا مسیح ان کے ہاں آیا اور انہوں نے اس کی مخالفت کی اور آنے والا کا انتظار کر رہے ہیں۔ ہم الزام دیتے ہیں عیسائیوں کو کہ ان کے ہاں یہ آنے والے کا عقیدہ موجود ہے۔ آنے والا محمد رسول اللہ ﷺ کی شکل میں آیا اور انہوں نے اس کی مخالفت کی اور آنے والا کا انتظار کر رہے ہیں۔ اور ہماری اپنی یہ حالت ہے کہ خود جسے ہم کہتے ہیں کہ وہ یہودیوں اور عیسائیوں کے نزدیک جو آنے والا تھا وہ آ گیا اور اس ﷺ کے آ جانے کے باوجود بھی ہم آج بھی ایک آنے والے کا انتظار کر رہے ہیں۔ عجیب بات ہے۔ کہیں نزولِ مسیح کی شکل میں' کہیں کوئی نبوت کی شکل میں' کہیں مجددوں کی شکل میں' آنے والے کا انتظار کر رہے ہیں کہ وہ آئے گا اور سچ کر کے دکھائے گا۔ قوم بیٹھی ہے ہاتھ پہ ہاتھ دھر کے۔ جتنی انتظار کرنے والی قومیں تھیں انہوں نے دنیا میں کچھ نہ کر کے دکھایا۔ یہ جو انتظار ہے وہ تو یہ ہے کہ اس نے آ کر کچھ کرنا ہے' ہم نے تو کچھ کرنا ہی نہیں ہے۔

ختم نبوت کی حقیقت تو کسی بھی صورت کسی آنے والے کے تصور کو قبول ہی نہیں کرتی

478آلِ عمران

ختمِ نبوت ﷺ کے معنی یہ تھے کہ ہر قسم کا انتظار جو ہے ختم کر دیا جائے۔ شخصیتوں کا دور ختم ہو گیا۔ ہم نے پھر سے

ز ذوقِ بندگی پروردگارے کردہ ام پیدا

وہ سارے عقیدے ان لوگوں سے مستعار لے لے کر اپنے ہاں بھی یہ سب کچھ لے آئے۔ اب بیٹھے انتظار کر رہے ہیں۔ کوئی سو سو برس کا انتظار کرتا ہے کہ مجدد آئے گا۔ کوئی آخری دور کا انتظار کر رہا ہے کہ مہدی آئے گا۔ کوئی آسمان سے اترنے والے کا انتظار کر رہے ہیں۔ آنے والا ﷺ آ گیا اور اس کے باوجود اس کی قوم پھر انتظار کر رہی ہے۔ دوسروں کو دوش دے رہی ہے کہ وہ تو آ گیا تھا جس کے تم انتظار میں تھے۔ اب تم کیوں انتظار کرتے ہو۔ تم کیوں کرتے ہو! ہمیں انتظار کرنے دو" اوتسی بہتیرا کر چکے ہیگے او "(تم بہت کر چکے ہو)۔ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ (3:3) یہ آ گیا وہ ضابطہٗ قانون۔ عزیزانِ من! قرآن کی عظمت میں کوئی شبہ نہیں کہ قرآن کا نظام انسانی ہاتھوں سے متشکل ہونا تھا۔ متشکل بھی انسانوں کے ہاتھوں سے ہوا یعنی محمد رسول اللہ ﷺ والذین معہٗ کے ہاتھوں سے۔ لیکن قرآن نے جہاں مصدق کی چیز کہی ہے وہ ضابطہٗ قانون ہی کو کہا ہے۔ یہ اس لیے کہ کہیں یہ نہ سمجھ لیا جائے کہ وہی تھے جنہوں نے یہ کر کے دکھا دیا جب وہ چلے گئے تو اس کے بعد پھر اب معاملہ ختم ہو گیا اور اب پھر کسی شخصیت کا انتظار کرو۔ ضابطہ موجود ہے جو بھی اٹھ کر اس ضابطے کے مطابق عمل کرے گا وہ اس نظام کو متشکل کر دے گا۔ انتظار کا سوال ہی نہیں ہے۔ سوال تو صرف عمل کرنے کا ہے۔ اور قرآن کی تو کیفیت یہ ہے کہ اس میں ازلی حقائق ہیں' جیسے بکھرے ہوئے موتی ہوتے ہیں۔ یہ ٹھیک ہے کہ اس کے لیے بھی ایک جماعت' ایک امت اٹھے گی تو پورے قرآن کو لے کر اٹھے گی۔ لیکن اگر دنیا کی کوئی بھی قوم قرآن کی حقیقتوں میں سے ان حقیقتوں کو الگ الگ لے کر اٹھے گی' اس پر عمل کرے گی' اس کو اس کے بھی نتائج ملیں گے۔ خدا اس قدر تنگ نظر نہیں واقع ہوا۔ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ (3:3)۔ اور اس سے پیشتر وَاَنْزَلَ التَّوْرٰةَ وَالْاِنْجِيْلَ۔ مِنْ قَبْلُ هُدًى لِّلنَّاسِ (3:3-4) کتنی کشادہ نگہی ہے کہ ہم نے اس سے پیشتر تورات نازل کی' انجیل نازل کی' نوعِ انسانی کے لیے اس میں بھی ہدایت تھی۔

ذاتِ رسول ہو یا ذاتِ نبوت' کتاب لانے کی تو دونوں ہی حامل ہوتی ہیں

تورات کے متعلق یہ عرض کر دوں کہ قرآنِ کریم میں یہ کہیں نہیں کہا گیا کہ تورات وہ کتاب تھی جو حضرتِ موسیٰؑ پر نازل ہوئی

ہے بلکہ کتابِ موسیٰؑ کا ذکر ہے۔ اور وہ کتاب بھی حضرت موسیٰؑ اور حضرت ہارونؑ دونوں کو ملی تھی۔ وہ جو ایک دلیل لایا کرتے ہیں کہ ''نبی بغیر کتاب کے''۔ اندازہ لگایے کیا کیا چیزیں ہمارے ہاں پیدا ہوگئی ہیں۔ کہتے ہیں کہ جی! رسول وہ ہوتا ہے جو کتاب لاتا ہے اور نبی وہ ہوتا ہے جو کتاب نہیں لاتا۔ تو وہ کیا کرنے آتا ہے سمجھ میں نہیں آتا۔ دلیل کیا ہے؟ کہ جی دیکھیے حضرت ہارونؑ نبی تو تھے کتاب نہیں لائے۔ قرآنِ کریم میں کم از کم دو مقامات پہ تو ایسا ہے جہاں حضرتِ موسیٰؑ اور ہارونؑ دونوں کا نام لے کر کہا ہے کہ ہم نے دونوں کو کتاب دی تھی (37:117)(89-6:84)۔ دعوے آسمانی علموں کے ہیں اور کیفیت یہ کہ قرآن کی دو آیتیں بھی سامنے نہیں ہیں جہاں سے یہ دیکھا جاسکے کہ قرآن نے خود بتا دیا۔ حالانکہ بظاہر نظر آ گیا کہ اس تصریح کی ضرورت نہیں تھی لیکن وہ تو خدائے علیم ہے وہ تو جانتا ہے کہ انہوں نے کس کس چور دروازے سے آنا ہے۔ بہر حال تورات اس کتاب کا نام نہیں جو حضرتِ موسیٰؑ کو ملی بلکہ یہ مجموعہ ہے ان کتابوں کا جو انبیائے بنی اسرائیل کو ملی تھیں۔ آج بھی OLD TESTAMENT کے نام سے جو آپ کے ہاں کتابوں کا مجموعہ ہے وہ سارا ان تمام کتابوں کا مجموعہ ہے۔ بس اتنا سا فرق ہے کہ قرآن نے ایک دو مقام پر حضرتِ داؤدؑ کی کتاب کا الگ ذکر کیا ہے کہ انہیں ہم نے کتاب دی تھی۔ زبور کتاب ہی کو کہتے ہیں۔

تورات کے علاوہ حضرت عیسیٰؑ کے سلسلہ میں موجودہ انجیل کی وضاحت

بہر حال انبیائے بنی اسرائیل پر جو کتابیں نازل ہوئی تھیں، تورات ان کا مجموعہ ہے۔ اور اس کے بعد انبیائے بنی اسرائیل میں سے جو آخری نبی حضرتِ عیسیٰؑ آئے ان کی کتاب (انجیل) چونکہ الگ ہمارے پاس موجود ہے۔ الانجیل کا ذکر الگ کیا۔ اور موجودہ انجیل بھی حضرتِ عیسیٰؑ پر نازل شدہ کتاب نہیں ہے۔ وہ تو حضرت عیسیٰؑ کی بائیوگرافی ہے، انؑ کی سیرت ہے، انؑ کے اقوال ہیں، جو ان کے حواریوں نے اور دوسرے لوگوں نے جمع کیے۔ اور اتنا ہی نہیں پھر اس کے بعد تو پولوس کے خطوط اور بہت سی چیزیں اس میں شامل ہیں۔ لیکن قرآن تو انجیل اُسے ہی کہے گا کہ جو حضرت عیسیٰؑ پر خدا کی طرف سے نازل ہوئی تھی۔

قرآنِ حکیم کی خصوصیت الفرقان بیان کی گئی ہے

مِنْ قَبْلُ هُدًى لِّلنَّاسِ وَ اَنْزَلَ الْفُرْقَانَ ((3:4 اور آخر الامر الفرقان بھی آ گیا۔ حق اور باطل میں اس طرح تمیز کر دینے والا۔ جیسا میں نے آپ سے کہا تھا کہ فرقان سے ہی لفظ فرق ہے۔ اور اس کے معنی ہوتے ہیں کہ جیسے بالوں کی مانگ نکالی جاتی ہے، مانگ میں سے ایک بال بھی اِدھر کا اُدھر ہو جائے تو مانگ ٹیڑھی ہو جاتی ہے۔ اس طرح نکھار کر، حق اور باطل میں تمیز

کرنے والا' جیسے بال بال الگ ہوجائیں۔ یہ قرآن کی خصوصیت بتائی ہے' ایک صفت بتائی ہے۔((25:1 میں یہ کہا گیا ہے خدا نے الفرقان نازل کیا ہے۔ یہاں بھی وَ اَنۡزَلَ الۡفُرۡقَانَ (3:4) ہے۔اب الفرقان جو ہے وہ صرف قرآن ہے۔حق اور باطل میں تمیز کرنے والا۔ یاد رکھیے! بنیادی طور پہ حق اور باطل میں تمیز کرنے والا صرف قرآن ہے۔اِنَّ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا بِاٰیٰتِ اللّٰہِ لَھُمۡ عَذَابٌ شَدِیۡدٌ ((3:4 اس کا عام ترجمہ یہ ہے کہ ''جو لوگ قوانینِ خداوندی سے انکار کرتے ہیں ان کے لیے عذابِ شدید ہے''۔

قرآنِ حکیم کو سمجھنے کا طریق۔اور کافر اور عذاب کے الفاظ کا مفہوم

میں نے گذارش کیا ہے کہ قرآن کو سمجھنے کے لیے اس کی TECHNICAL TERMS اور CONCEPTS کا مفہوم متعین کرنا بڑا ضروری ہے۔اِنَّ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا (3:4) کے الفاظ ہم نے کہے اور ذہن میں آ گیا جی! ''جو کافر ہیں''۔اور پھر ہمارے ذہنوں میں ہمارے سوا باقی سب کافر ہیں۔اب اس کی تو جرأت کوئی نہیں کرتا کہ اگر ہم نے قرآن سے کفر کے معنی متعین کیے تو سب سے بڑے کافر کہیں خود ہی نہ نکلیں۔کبوتر کی طرح آنکھیں بند کر لیتے ہیں لیکن آنکھیں بند کرنے سے تو کچھ نہیں ہوتا۔یہ تو قانون ہے۔کہیے کہ آگ نہیں جلاتی اور اس میں انگلی ڈال لیے۔کہتے چلے جایے کہ نہیں جلاتی لیکن آپ کے کہنے سے کیا ہوتا ہے۔جو بھی قوانینِ خداوندی کا انکار کرے گا اس کا نتیجہ بھگتے گا۔پھر آیات اللہ کے معنی ''قرآن کی آیتیں'' ہی صرف لے لیا' آیات اللہ تو قوانینِ خداوندی ہیں۔جو بھی قوانینِ خداوندی کی صداقت کا انکار کرے گا جو بھی یہ کہے گا کہ نہیں! سنکھیا ہلاکت نہیں کرتا اور پھانک لے گا لَھُمۡ عَذَابٌ شَدِیۡدٌ (3:4) ہلاکت کے عذاب میں مبتلا کر دیا جائے گا۔اب ہمارے ہاں اگلی چیز عذاب کی آ گئی۔جونہی قرآن میں عذاب کا لفظ آتا ہے تو نظر آتا ہے کہ اللہ میاں کی طرف سے بس وہ کوئی ہنٹر والے مقرر ہیں کہ کسی نے قرآن کی آیتوں کا انکار کیا یعنی اس پہ ایمان نہ لایا اور وہ وہاں سے ہنٹر برسانے والے' مار مار کر کھال ادھیڑ دینے والے' آ گئے۔ہمارے ہاں اردو میں عذاب کا ترجمہ تو سزا کیا جاتا ہے لیکن آپ دیکھیے اس میں ٹارچر کا مفہوم ہوتا ہے۔صاحب! اس کو اس قدر عذاب دیا توبہ توبہ توبہ! ''عذاب کی زندگی''۔آپ دیکھ رہے ہیں کہ اس میں کیا مفہوم ہوتا ہے یعنی خالی سزا ہی نہیں ٹارچر بھی ہوتا ہے۔اور پھر عذابِ شدید' عذابِ الیم کہا جائے تو خدا کے متعلق یہ تصور آتا ہے تو آدمی کانپ جاتا ہے۔

قرآنِ حکیم کے نزدیک تو ٹارچر کا تصور ہی نہیں ہے

مذہبی پیشوائیت کا مقصد ہی یہ ہوتا ہے کہ ان کو کپکپا دیا جائے' ڈرا دیا جائے تاکہ اس کے بعد' اس کے بعد وہی کہ جو اس ٹارچر سے چھوٹنے کے لیے کیا جاتا ہے کہ ''دے پیسے''۔ آپ دیکھتے ہیں کہ ہر رلا دینے والی وعظ کے بعد ''دے پیسے! ہوندا اے'' (پیسے دو! ہوتا ہے)۔ عزیزانِ من! قرآن کے CONCEPTS (تصورات) کو سمجھیے۔ خدا کی طرف سے ٹارچر کی بات نہیں ہے۔ خدا' یہ نہیں کہ وہ بیٹھا ہوا ہے' اس کو غصہ آ رہا ہے کہ او! میری آیت سے تُو نے انکار کیا! ان کو پکڑ لو' مار مار کے بھر کس نکال دو۔ قرآن تو اللہ کا تصور یہ دیتا ہے کہ جس نے بھی قانون کی صداقت سے انکار کیا اس کے نتائج نہایت تلخ تباہ کن اور نقصاں رساں اٹھائے گا۔ بات ختم ہو گئی۔ عذاب تو نتائج ہیں' قانونِ خداوندی کی خلاف ورزی کرنے کے ضرر رساں نتائج۔ کوئی آج کر کے دیکھ لے تو یہاں وہ عذاب سامنے نظر آ جائے گا۔ عزیزانِ من! وہ کوئی پولیس کانسٹیبل حوالات میں لے جا کر عذاب نہیں دے رہا بلکہ وہ اس عمل کا فطری نتیجہ ہے۔ اسے کہتے ہیں قانون سے سرکشی انکار کرنے کا نقصان رساں نتیجہ۔

قوانینِ خداوندی سے سرکشی کا نام صرف انکار ہی نہیں بلکہ کفر بھی کہلاتا ہے

کفر کے معنی زبانی انکار ہی نہیں ہوتے بلکہ اس کے معنی سرکشی ہوتا ہے۔ قانون سے سرکشی برتو گے تو اس کا فطری نتیجہ یہ ہوگا کہ نہایت تباہ کن' نہایت نقصان رساں' تباہیاں اور ہلاکتیں آ جائیں گی۔ جو بھی یہ کرے گا اِنَّ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا (3:4) جو بھی ایسا کرے گا لَھُمْ عَذَابٌ شَدِیْدٌ ط وَاللّٰہُ عَزِیْزٌ ذُو انْتِقَامٍ (3:4)۔

لفظ عزیز کا قرآنی مفہوم

قانون کے پیچھے جب تک POWERFUL AUTHORITY نہ ہو' کوئی قوتِ نافذہ نہ ہو تو قانون وعظ بن کر رہ جاتا ہے۔ قانون کو ENFORCE کرنے والی جو اتھارٹی ہے وہ عزیز ہونی چاہیے۔ عزیز کے معنی ہی ہیں غلبے کا مالک' قوت کا مالک۔ اب آپ نے عزیز کے معنی دیکھ لیے یعنی قانون کے پیچھے ایک ایسی اتھارٹی جو قانون کو قانون بنا کر رکھ دے وعظ بنا کر نہ رکھے۔ عَزِیْزٌ ذُو انْتِقَامٍ (3:4)

لفظ عذاب کے بعد لفظ انتقام کے قرآنی مفہوم کے تحت خدا کی ذات کسی سے انتقام نہیں لیتی

لیجیے! لفظ انتقام آ گیا۔ اب ہمارے ہاں وہ عذاب ہی کا ہم رو رہے تھے کہ اب اور بات آ گئی۔ آپ سوچیے تو سہی کہ

ہمارے ہاں تو منتقم المزاج جس کو کہتے ہیں اس کا کیا تصور ذہن میں آتا ہے۔ ''انتقام لینے والا'' کبھی اچھی صفت نہیں گنی جاتی
اور انتقام تو ہوتا ہی ایسے ہے جیسے کسی کو پکڑ کر گھونٹ دیا جائے۔ خدا انتقام لے رہا ہے۔ دیکھیے قرآن میں **انتقام** لکھا ہوا ہے۔ خدا کے متعلق کیا تصور قائم کیا؟ عزیزانِ من! بنیادی بات سن رکھیے' ان چیزوں کو کہیں لکھ رکھیے۔ دین کو سمجھنے کے لیے خدا کے متعلق صحیح تصور آپ کے سامنے آنا چاہیے۔ یہ تصور (CONCEPT) صحیح ہو جائے تو سارا دین سمجھ میں آ جاتا ہے۔ قرآن نے جو صحیح تصور دیا ہے اس سے بات سمجھ میں آتی ہے۔ **ذُو انْتِقَامٍ** (3:4) کے معنی ہوتے ہیں کہ کبھی آپ نے چرواہے کو دیکھا ہے اس نے بھیڑوں بکریوں کو سڑک کے اوپر لے جانا ہو۔ کوئی بھیڑ بکری ادھر نکل جائے گی' ایک اُدھر نکل جائے گی' وہ جلدی سے بڑھتا ہے اور پھر اس کو ادھر لاتا ہے پھر دوسری کو اُدھر سے لاتا ہے۔ وہ جو ایک درمیانی راستہ ہوتا ہے جس پہ اس نے چلانا ہوتا ہے' اس کا کام یہ ہے کہ ان کو ادھر اُدھر سے اس پر لائے۔ وہ آواز دے کر لاتا ہے' آواز سے نہیں آتیں تو پھر لٹھ لے کر بھی ان کے پیچھے جاتا ہے۔ کاہے کے لیے؟ تاکہ وہ راستے کے درمیان درمیان میں چلیں اِدھر اُدھر نہ ہٹ جائیں۔ اسے انتقام کہتے ہیں کہ کسی کو راستے کے درمیان میں اس طرح سے چلانا کہ ادھر اُدھر نہ چلا جائے۔ کیا بات ہے! اس کا غلبہ' اس کی قوت صرف اس لیے ہوتی ہے کہ انسان کو درمیان میں راستے پہ چلانا تاکہ وہ ادھر اُدھر نہ ہٹ جائیں۔ چلانے والا اور قانون دینے والا!

اِنَّ اللّٰهَ لَا يَخْفٰى عَلَيْهِ شَيْءٌ فِي الْاَرْضِ وَ لَا فِي السَّمَآءِ (3:5) کوئی شے پستیوں اور بلندیوں میں ایسی نہیں ہے کہ جس کا اسے علم نہ ہو۔ اس چیز کا خالی علم ہونا کہ وہ وہاں رکھی ہے' وہ وہاں رکھی ہے اس کے تو کچھ معنی نہیں۔ علم کے اندر تو بڑی وسعتیں ہیں۔ اور یہاں تو اگلی آیت میں بتا دیا کہ علم کے معنی یہ ہیں کہ وہ جانتا ہے کہ کس شے کو اپنی نشوونما کے لیے کس چیز کی ضرورت ہے۔ وہ جانتا ہے کہ یہ راستے سے اِدھر اُدھر ہٹ جائیں تو اس کا انجام کیا ہوگا۔ وہ جانتا ہے کہ پرورش کے لیے' تربیت کے لیے' نشوونما کے لیے' ارتقا کے لیے DEVELOPMENT کے لیے' کیا کیا تقاضے ہیں۔ اور اس کے قانون نے ان تقاضوں کو کس طرح سے پورا کرنا ہے۔

رحمِ مادر میں انسان کی پرورش کا سارا سامان قانون کی زنجیروں میں جکڑ رکھا ہے

ان تقاضوں کی کیفیت یہ ہے کہ انسانوں کی زندگی میں **هُوَ الَّذِيْ يُصَوِّرُكُمْ فِي الْاَرْحَامِ كَيْفَ يَشَآءُ** (3:6) تم تو ابھی وجود پذیر ہو کر باہر دنیا میں بھی نہیں آئے تھے کہ اس نے رحمِ مادر کے اندر تمہارے لیے یہ قانون مقرر کر دیا ہوا تھا۔ وہاں جب وہ اپنے قانونِ مشیت کے مطابق تمہیں ایک پیکر عطا کر رہا تھا' وہاں بھی اس کا یہ قانون کارفرما تھا۔ اور یہ قانون بھی قانونِ مکافاتِ

عمل ہے۔ عزیزانِ من! رحمِ مادر میں بچے کی تشکیل الل ٹپ نہیں ہوتی' اس کے لیے بھی اس کے قانون مقرر ہیں۔ جن قوموں نے ان قوانینِ خداوندی کو سمجھ لیا ہے تو آپ کو معلوم ہے کہ ان کا ایک ایک بچہ صحت' حسن اور شگفتگی کا پیکر بن کر باہر آ تا ہے۔ جن قوموں نے ان قوانین سے کفر برتا ہے تو ان کے بچوں کو دیکھیے۔ بچے کی پیدائش کے بعد ایک مصیبت آ جاتی ہے' صبح شام ٹیں ٹیں روں روں' بچے کا ایک عذاب۔ کیا ہے یہ؟ یہ آیات اللہ سے کفر ہے۔ اس کا انجام کیا ہے؟ **عذاب شدید**۔ بچے کی پیدائش پہ تو ہم جشن مناتے ہیں' ٹھیک ہے لیکن خدا کے قانون کے انکار کا نتیجہ' عذابِ شدید' سارا گھر بھگت رہا ہوتا ہے۔ بعض چیزیں قانون کے تابع نسلاً بعد نسلٍ چلی آتی ہیں۔ قانونِ خداوندی پر ایمان لانے سے روکی جاسکتی ہیں۔ رحمِ مادر کے اندر بچے کو EXAMINE کرتے چلے جاتے ہیں۔ وہاں اس بچے کو اس قسم کی مناسب پرورش' مناسب چیزیں دے رہے ہیں۔ اور ابھی تو یہ علم آگے بڑھ رہا ہے۔ یہ ہے خدا کا قانونِ مشیت جو رحمِ مادر سے ہی شروع ہو جاتا ہے۔ تو جو وہاں سے اس کے تقاضوں کے متعلق یہ سارا سامان کر رہا ہے' اس کی پیدائش کے بعد جس **الْحَیُّ** (3:2) نے زندگی دی ہے تو کیا وہ اس کو **الْقَیُّوْمُ** (3:2) بنانے کے لیے' اس کو قائم رکھنے کے لیے کوئی قانون نہیں دے گا۔ اس نے قانون دیے' احکام دیے' حقائق دیے' تصورات دیے۔ اب آیا قرآن۔ کہا کہ اس میں دو قسم کے حقائق آپ کو ملیں گے۔

ہمارے ہاں قرآنی الفاظ' متشابہات اور محکمات کے متعلق پائے جانے والے تصورات کی حقیقت

عزیزانِ من! بہت اہم آیت آ رہی ہے۔ جب میں اہم کہتا ہوں تو اس کے یہ معنی نہیں کہ معاذ اللہ قرآن کی اور آیات اہم نہیں ہیں۔ یہ آیت موضوع کے اعتبار سے خاص IMPORTANCE رکھتی ہے۔ اور اس لیے بھی اہم ہے کہ اس کا غلط مفہوم کہیں سے کہیں لے جاتا ہے۔ بڑی اہم آیت آتی ہے۔ قرآن کے نسخے سامنے ہیں تو غور سے دیکھیے۔ **هُوَ الَّذِیْٓ اَنْزَلَ عَلَیْکَ الْکِتٰبَ مِنْهُ اٰیٰتٌ مُّحْکَمٰتٌ هُنَّ اُمُّ الْکِتٰبِ وَ اُخَرُ مُتَشٰبِهٰتٌ** (3:7) یہ الکتاب نازل کی۔ اس میں کچھ قوانین تو ایسے ہیں جو محکمات ہیں۔ یہ وہ ہیں جو **اُمُّ الْکِتَاب** ہیں (میں الفاظ ابھی یہی استعمال کر رہا ہوں) اور دوسرے وہ ہیں جو متشابہات ہیں۔ یہ آپ کے ہاں محکم اور متشابہات کا جو مسئلہ ہے یہ بڑی اہمیت اختیار کیے چلا آ رہا ہے۔ اور پھر وہی بات کہ ایک لفظ کے غلط مفہوم نے بات وہاں پہنچا دی ہے کہ اگر اس پہ غور کیا جائے تو آدمی کانپ اٹھے۔ لیکن چلا آ رہا ہے' دھڑلے سے چلا آ رہا ہے اور دھڑلے سے کہا جا رہا ہے۔ محکمات کہتے ہیں کہ وہ آیتیں جن کے معنی محکم' بالکل صاف' واضح' متعین ہیں۔ ٹھیک ہے۔ متشابہات کہتے ہیں کہ جن کے معنوں میں شبہ ہے۔ تفسیروں کے متعلق تو میں عرض کر چکا ہوں کہ یہ تو طرح طرح غزلیں ہیں جو لکھی جا رہی ہیں۔ امام طبری

نے ایک مصرعۂ طرح دیا ہوا ہے' اس پہ چلے آ رہے ہیں۔ اس سے ہٹ سکتے نہیں کہ اسلاف کے راستے سے ہٹنا سب سے بڑا گناہ ہے۔ چنانچہ آپ کے ہاں جو آج بھی LATEST تفسیر لکھی جا رہی ہے' میں اشخاص سے بحث نہیں کیا کرتا' بات واضح کرنے کے لیے وہ کہیں مقطع میں سخن گسترانہ بات آ جاتی ہے۔ آپ کے ہاں جو LATEST تفسیر ہے وہ مودودی صاحب کا ''تفہیم القرآن'' ہے۔ میں نے اتفاقاً دیکھا کہ وہاں کیا چیز ہے۔ اس میں بھی متشابہات کے متعلق یہ لکھا ہے کہ وہ آیات جن کے مفہوم میں اشتباہ کی گنجائش ہے۔ آپ سوچیے کہ قرآن کا پہلا لفظ یہ ہے کہ ذٰلِکَ الْکِتٰبُ لَا رَیْبَ فِیْهِ (2:2) جس میں کوئی چیز شک و شبہ والی نہیں ہے۔ اور یہ کہتے ہیں کہ آیاتِ متشابہات وہ ہیں جن کے مفہوم میں اشتباہ کی گنجائش ہے۔ کیا بات ہوئی صاحب قرآن کی! تو گویا اس میں کچھ تو محکمات ہیں ان کے تو مفہوم میں اشتباہ کی گنجائش نہیں۔ اور پھر جو باقی ہیں ان میں اشتباہ کی گنجائش ہے۔

می نہ سزد خدائے را

میں کسی پہ الزام نہیں دیتا۔ اگر خود ان کے متعلق کہا جائے کہ آپ نے فلاں فلاں جو لکھا ہے اس کا مفہوم واضح نہیں' اس میں تو کچھ اشتباہ کی گنجائش ہے تو لٹھ لے کر پیچھے پڑ جاتے ہیں کہ ہماری کتاب کے بارے میں ایسا کہتے ہو! کہتے ہیں کہ ہماری کتاب میں ایسا نہیں ہوسکتا۔ یہ ایسا ہوگا تو خدا کی کتاب میں ہوگا۔ ٹھیک ہے جی ''غریب کی جورو سب کی بھابھی'' جس کے جی میں آئے اس کے متعلق کہہ لے۔ کوئی یہ کہنے والا نہیں ہے کہ یہ تصور کتنا ANTI ISLAMIC ہے کہ خدا کی کتاب میں ایسی آیات ہیں جن کے مفہوم میں اشتباہ کی گنجائش ہے۔ عزیزانِ من! بات بڑی صاف تھی۔ وہ شعر پھر بار بار یاد آ جاتا ہے کہ

میرے ساقی نے عطا کی ہے مے بے دُرد و صاف

رنگ جو کچھ دیکھتے ہو میرے پیمانے کا ہے

یہ تو ان کے پیمانوں کے رنگ ہیں جن سے اس بے دُرد و صاف مئ ازل کو رنگین بنا کر پیش کر دیا جاتا ہے۔ محکمات تو ٹھیک ہے محکم' اصولی چیزیں۔ اس نے بنیادی چیز کہہ دی کہ ام الکتاب کی اصل و بنیاد احکام و قوانین ہیں۔ لیکن قرآنِ کریم میں احکام و قوانین ہی تو نہیں ہیں بلکہ انہیں سمجھانے کے لیے کہیں اممِ سابقہ کی تاریخی داستانیں بھی ہیں ۔ وہ بھی چھوڑ دیجیے ۔ بہت سے ABSTRACT TRUTHS ہیں' مجرد حقائق ہیں۔ خود خدا کا تصور کوئی محسوس شے نہیں ہے۔ حیاتِ آخرت کوئی محسوس شے نہیں ہے۔ خود انسان کی ذات محسوس شے نہیں ہے۔ جسے آپ روح کہتے ہیں یا نفس کہتے ہیں وہ کوئی محسوس شے نہیں ہے۔ خود یہ صداقتیں جو قرآنِ کریم نے دی ہوئی ہیں' اصولی طور پہ بھی وہ محسوس نہیں ہیں۔

قرآنِ حکیم کی روشنی میں ان مجرد حقائق کو سمجھانے کا طریق

478آلِ عمران

اور یہ پھر سمجھ لیجیے کہ جن کو ABSTRACT TRUTHS (مجرد یا بسیط حقائق) کہتے ہیں کہ حقیقت تو وہ ہو لیکن وہ اس طرح سے' ٹھوس طور پر' محسوس طور پر' تمہارے سامنے نہ آئے۔ جیسا میں نے عرض کیا ہے کہ خود خدا اس کی سب سے بین مثال ہے۔ وہ ایک حقیقت ہے اور میں کہتا ہوں ایک حقیقت نہیں بلکہ THE TRUTH ہے' THE REALITY ہے لیکن وہ محسوس نہیں ہے۔ اسے ABSTRACT کہتے ہیں۔ اب غیر محسوس حقائق کو لوگوں کو سمجھانا ہو تو کیسے سمجھایا جائے؟ انہیں ہمیشہ تشبیہاً سمجھایا جاتا ہے۔ متشابہات کے معنی ہیں وہ جنہیں تشبیہاً سمجھایا گیا ہے۔ اس کے لیے استعارہ لایا جاتا ہے' تشبیہات لائی جاتی ہیں' مثالیں پیش کی جاتی ہیں' SYMBOLICALLY (علامتی طور پر) سمجھایا جاتا ہے۔ ایک تو وہ ہوتا ہے جس کے معنی LITERALLY لیتے ہیں۔ ایک لفظ ہے اور وہی اس کے معنی ہیں۔ اور دوسرا ہوتا ہے کہ لفظ تو وہ بہر حال ہماری ہی زبان کا ہوگا لیکن اسے تشبیہ کے طور پر' استعارتاً' تمثیلاً استعمال کیا ہوگا۔ قرآن میں جہاں جنت کا ذکر آتا ہے تو وہاں قرآن کہتا ہے کہ مَثَلُ الْجَنَّةِ الَّتِیْ (13:35) ''اس جنت کی مثال یوں سمجھو''۔ یہ اس لیے کہ مرنے کے بعد کی زندگی تو ہماری موجودہ سطح کے اوپر ایک مجرد حقیقت ہے لیکن اسے سمجھانے کے لیے تو ہمارے ہی الفاظ استعمال ہوں گے۔ یعنی بہترین آسائش کی چیزیں' باغات' سایے' لحمِ طیور' بہتی ہوئی ندیاں' ان کے کنارے لبِ جُوسبزہ' پھول۔ یہ سب ہماری زبان کے الفاظ ہیں۔ لیکن کہہ دیا کہ مَثَلُ الْجَنَّةِ الَّتِیْ (13:35) یہ مثالیں دے کر ہم نے سمجھایا ہے کیونکہ آگے کہہ دیا کہ کوئی شخص یہ نہیں جان سکتا کہ اس کی آنکھوں کی ٹھنڈک کا جو سامان ہم نے وہاں رکھا ہے وہ کیسا ہے۔ لیکن مثال کے طور پر تو سمجھانا پڑتا ہے۔ یہ دقت تو یہاں ہر ایک کو پیش آتی ہے۔ آپ کے ہاں اتنے بڑے شاعر غالب کو پیش آئی کہ جو اپنے دور کا EXPRESSION کا بادشاہ تھا۔ وہ بھی چِلا اٹھا کہ

ہر چند کہ ہو مشاہدۂ حق کی گفتگو
بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر

وہ کہتا ہے کہ یہ ''بادہ وساغر'' استعارے ہیں' بات مشاہدۂ حق کی ہے۔ آپ دیکھ رہے ہیں کہ یہاں اس نے کیا لفظ استعمال کیا ہے۔ یہ ABSTRACTREALITY ہے۔ بنتی نہیں ہے بادہ وساغر کہے بغیر۔ تشبیہات۔ مثال کے طور پر یہیں لیجیے کہ قرآنِ کریم نے ایک جگہ کہا ہے کہ حُرِّمَتْ عَلَيْكُمْ اُمَّهٰتُكُمْ (4:23) تم پر تمہاری مائیں نکاح کے لیے حرام قرار دیں۔ اب

یہاں واضح ہے کہ اُمّ کے معنی وہ ماں ہے جو بچے کو جنتی ہے۔ دوسرے معنی ہی نہیں ہیں۔ بالکل صاف، واضح۔ اس لیے کہ قانون کی بات ہو رہی ہے، زندگی کا ایک LAW دیا جا رہا ہے۔ وہاں ام کے معنی تشبیہی نہیں ہیں وہاں حقیقی معنی ہیں۔ اسے حقیقی معنی کہتے ہیں۔ عربی زبان میں ایک دوسرے معنی، مجازی ہوتے ہیں۔ اُمُّ الْکِتٰبِ (3:7 وہی لفظ اُمّ یہاں آیا ہے۔ وہ اُمُّ الْکِتٰبِ (3:7) ہیں۔ اب یہاں LITERARY معنی تو آپ اس کے لے نہیں سکتے کہ ''کتاب کی ماں''۔ کتاب کے اندر تو وہ آیتیں ہیں، وہ کتاب کی ماں کیسے ہوئے۔ نظر آیا کہ یہاں اُمّ کا جو لفظ ہے یہ ''اصل و بنیاد'' کے معنی میں تشبیہاً استعمال کیا گیا ہے۔ اسے مجازی معنی کہتے ہیں۔ ہر زبان میں یہ LITERARY MEANING, METAPHORICIAL MEANING ہوتا ہے۔ اُمُّ الْکِتٰبِ (3:7) محکمات ہیں۔ اس لیے کہ قانون کو ہونا ہی ایسا چاہیے کہ متعین لفظی معنی اس کے وہی ہوں۔ ورنہ اگر ''تم پہ مائیں حرام قرار دی گئی ہیں'' آپ استعارتاً، تشبیہاً لے لیں تو چلیے کسی کورٹ میں اور وہاں جا کر شاعری کیجیے پھر دیکھیے اس کا کیا نتیجہ ہوتا ہے۔ وہاں شاعری نہیں چلتی یا تشبیہات، استعارات کی بات نہیں ہے۔ محکمات ہے۔ ایک ہی مثال سے میں سمجھتا ہوں آپ سمجھ گئے ہوں گے کہ اس کے معنی کیا ہیں۔

ہمارے ہاں کی پیش کردہ تفسیروں میں عرش کی وضاحت اور اس کا استعمال

قرآنِ کریم میں یہ جو ABSTRACT حقیقتیں، مجرد حقیقتیں، غیر محسوس، غیر مرئی, INVISIBLE IMPERCEPTIBLE ہیں۔ جن کا آج ہم تصور بھی حقیقت میں نہیں کر سکتے۔ الفاظ ہمارے ہیں کہ خدا نے کائنات کو پیدا کیا ثُمَّ اسْتَوٰی عَلَی الْعَرْشِ (7:54) پھر وہ عرش پہ مستوی ہو گیا۔ استوٰی کے معنی ہوتا ہے ''غالب آ جانا، جم کے بیٹھ جانا، اپنے آپ کو کسی جگہ ESTABLISH کر لینا''۔ عرش تو تخت پوش کو کہتے ہیں، تختے کو کہتے ہیں، تختِ حکومت کو کہتے ہیں، وہ جو لکڑی کا بنا ہوا خواہ وہ تختِ طاؤس کیوں نہ ہو کروڑوں روپے کا بنا ہوا کوئی بھی ہو گا، اس کو عرش کہا جائے گا۔ پھر وہ عرش پہ بیٹھ گیا۔ اب ظاہر ہے کہ جب خدا کا تصور یہ ہے کہ وَهُوَ مَعَكُمْ أَيْنَ مَا كُنتُمْ (57:4) تم جہاں بھی ہو وہ تمہارے ساتھ ہے وہ تمہاری شہ رگ سے بھی قریب ہے تو کوئی لکڑی کا یا اس قسم کا تخت تو نہیں ہو گا خواہ وہ تختِ طاؤس ہی کیوں نہ ہو کہ وہ کسی مقام میں رکھا ہے اور اس کے اوپر خدا بیٹھا ہے۔ یہ تو معنی ہو نہیں سکتے۔ سیدھی سی بات ہے کہ جب آپ تختِ حکومت کہتے ہیں، جب آپ THRONE کہتے ہیں تو آج بھی انگریزی میں اس سے مطلب آپ کا سچ مچ کا وہ تخت نہیں ہوتا جو کسی زمانے میں ہوتا تھا۔ اس کا مطلب ''اقتدار'' ہوتا ہے۔ اسی طرح آپ CROWN (تاج) کہتے ہیں۔ اب وہ سچ مچ کا تاج کہیں کہیں رہ گیا ہے

وہ بھی فضا میں اڑتا چلا جا رہا ہے کیونکہ غیر فطری چیز تھی۔ اس کا مفہوم آپ سمجھتے ہیں کہ جب آپ کہتے ہیں کہ تختہ الٹ کر رکھ دیا تو نہیں ہوتا کہ اس کی دوکان کے سامنے ایک تخت پوش پڑا تھا ''اوہنوں ایووں کر دتا'' آپ سمجھتے ہیں ان کے کیا معنی کیا ہیں۔ ثُمَّ اسْتَوٰی عَلَی الْعَرْشِ (7:54) اس نے کائنات کو تخلیق کیا اور اس کا مرکزی کنٹرول اپنے ہاتھ میں رکھ لیا۔ بات صاف ہوگئی۔ لیکن ہمارے ہاں والے چلے۔ آپ کو شاید علم نہیں کہ اس عرش کی پیمائشیں بھی ہمارے ہاں دی ہوئی ہیں۔ آگے چلے۔ قرآن نے کہہ دیا کہ وَ کَانَ عَرْشُهٗ عَلَی الْمَآءِ (11:7) اس کا عرش پانیوں پر ہے۔ ماء کے معنی بھی پانی لیا اور عرش تو پھر وہ تھا ہی تختہ۔ وہ تو غنیمت ہے لکڑی کا تھا۔ عرش پانیوں پر ہے۔ اب پانی تو یہاں ہوتا ہے کیا کیا جائے صاحب! اس کے بعد یہ تفسیر کرتے ہیں۔ اور جیسا میں نے عرض کیا ہے کہ اس امت کی بدبختی اور بدقسمتی ہے کہ ان لوگوں نے اپنے ذہن سے جو مفہوم متعین کیا اور اس میں میں نے کہا ہے اور بار بار کہتا ہوں، میں نے کئی دفعہ لکھا ہے کہ میں ان کو ACCUSE نہیں کرتا معاذ اللہ کہ کوئی چیزیں بدنیتی سے کیں۔ اس دور کی علمی سطح ہی اتنی تھی، انسان کی ذہنی سطح ہی اتنی تھی۔ جنہوں نے یہ کچھ لکھا ہے ہم اس دور میں ہوتے تو شاید ہم بھی یہی کچھ لکھتے۔ یہ کچھ ہماری کاری گری نہیں ہے کہ ہم اتنا آگے بڑھ گئے بلکہ علمِ انسانی اتنا آگے بڑھ گیا جس کی بنا پہ ہم ان سے بہتر سوچ سکتے ہیں۔ وہ اب جب یہ ہوا کہ اس کا عرش پانیوں پر ہے تو اب ''پانی'' کیا کیا جائے۔ یہاں تو سارے پانی دیکھ لیے یہاں تو کوئی عرش تیرتا نہیں تھا۔

ہماری اس بدقسمتی کی بنیادی وجہ

میں نے کہا ہے کہ ہماری بدقسمتی یہ ہے کہ انہوں نے تفسیریں اپنے ذہن سے لکھیں اور اسے نبی اکرم ﷺ سے منسوب کر دیا۔ اب جتنے بھی غیر مسلم ہیں وہ ان چیزوں کو لیتے ہیں تو اس کے بعد کہتے ہیں کہ یہ تمہارے رسول ﷺ تھے! یہ تھا قرآن جو وہ سمجھاتے تھے! اور غیر تو پہلے کہتے تھے۔ اب تو ہماری اگلی نسل خود کہنے لگ گئی ہے۔ ان بے چاروں کا بھی دوش نہیں ہے۔ دیکھیے! کیا تفسیر دی گئی ہے۔ یہ تفسیر، روایت یعنی حدیث کی رو سے ہے۔ انہوں نے کہا کہ اس زمین سے، پہلے آسمان کا راستہ پانچ سو میل کا، پھر ایک آسمان سے دوسرے کا اتنا فاصلہ۔ وہ تو میں آپ کو بتا چکا ہوں کہ ان کے نزدیک یہ آسمان ایک دو تین چار اس طرح سے ایک دوسرے کے اوپر ہیں۔ کہا کہ پانچ سو میل کا فاصلہ، پھر اس کے بعد پانچ سو میل کا فاصلہ۔ پھر ساتویں آسمان کے اوپر ایک سمندر ہے۔ پانی لانا ہے! اس سمندر میں اب اگر تیرتا ہوا تخت رکھا جائے تو وہ تو پتہ نہیں کہیں ہو جائے ڈگمگا جائے۔ قرآن نے استوٰی کہا ہے کہ جم کر بیٹھ گیا تو جما کر کیسے بٹھایا جائے! اس سمندر میں آٹھ پہاڑی بکرے ہیں۔ عزیزانِ من!

سنیے! اس کو رسول اللہ ﷺ کی طرف یہ کہہ کر منسوب کیا جاتا ہے کہ یہ حدیث ہے۔ آٹھ پہاڑی بکرے ہیں' سمندر کی گہرائی پانچ سو میل کے سفر کے مطابق ہے لیکن وہ بکرے اتنے بڑے ہیں کہ ان کے گھٹنوں تک وہ پانی آتا ہے۔ اور ان بکروں کے سینگوں پر خدا کا تخت ہے اس پہ خدا بیٹھا ہے۔ عزیزانِ من! غور کیجیے! میں نے کہا کہ یہاں تک تو خیر تھی کہ کسی امام طبری نے' کسی ابنِ کثیر نے' یہ چیز لکھی۔ ہم کہہ سکتے تھے کہ ان کے دور میں علمی سطح کم تھی اور وہ یہی سمجھے۔ ٹھپ کر کے رکھ دیجیے۔ ہمارے لیے کوئی الزام نہیں' کوئی حجت نہیں۔ لیکن جب وہ یہ کہہ دیں کہ حضورِ نبی اکرم ﷺ نے یہ بیان فرمایا ہے تو پھر اس سے انکار کے بعد آپ تو جانتے ہیں کہ جو میرا حشر ہو رہا ہے' وہ آپ کو بھی معلوم ہے۔

متشابہات وتشبیہات کے تحت قرآنی آیات پر غور وفکر کرنے کی دعوت

متشابہات۔ تشبیہاً بات بیان کی۔ تمام کائنات پر کنٹرول ہے۔ یہاں کہا تھا کہ وہ الحی ہے' زندگی دینے والا ہے۔ اور سب سے بڑا کنٹرول جو ہے وہ زندگی کے اوپر کنٹرول ہونا چاہیے۔ الحی سے تو ہماری بات شروع ہوئی تھی۔ یہاں کہا کہ وَ كَانَ عَرْشُهٗ عَلَى الْمَآءِ (11:7) ماء پر بھی اس کا کنٹرول ہے۔ اور دوسری جگہ کہا ہے کہ وَ جَعَلْنَا مِنَ الْمَآءِ كُلَّ شَيْءٍ حَيٍّ ؕ (21:30) اور جو زندہ شے ہے اس کو ہم نے پانی سے زندگی عطا کی۔ پانی پہ خدا کا کنٹرول ہوا اس لیے وہ الحی ہے۔ وَ جَعَلْنَا مِنَ الْمَآءِ كُلَّ شَيْءٍ حَيٍّ ؕ (21:30)۔ کتنی عظیم حقیقت' چودہ سو سال پیشتر بتائی جاتی ہے۔ یہ سائنسدان نئے PLANETS پہ بھی جاتے ہیں تو وہاں یہ دیکھنا ہوتا ہے کہ زندگی ہے یا نہیں۔ یہ وہاں یہ دیکھتے ہیں کہ نمی ہے یا نہیں۔ جب اس مشتِ خاک میں جو وہاں سے چاند سے لائے ہیں انہوں نے کہا کہ وہ ہمیں کچھ نم آلود نظر آئی تو یہاں کے سائنٹسٹ' بائیالوجسٹ' نے کہا کہ امید بندھ گئی ہے کہ چاند میں زندگی ہے اس لیے کہ اس کی راکھ میں پانی کی نمی کے آثار نظر آتے ہیں۔ چودہ سو سال پہلے قرآن کہتا ہے کہ وَ جَعَلْنَا مِنَ الْمَآءِ كُلَّ شَيْءٍ حَيٍّ ؕ (21:30) زندگی کی نمود پانی سے ہوتی ہے۔ زندگی کی نمود پانی سے' پانی کے اوپر خدا کا کنٹرول یعنی خدا کا عرش۔ تو جو اصلِ حیات ہے جس کے بغیر زندگی نہیں ہو سکتی INORGANIC MATTER کے اندر' اس پہ بھی اسی کے قانون کا کنٹرول ہے۔ ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ (7:54) یوں وہ ساری کائنات کے مرکزی کنٹرول کو اپنے ہاتھ میں لے کر بیٹھا ہوا ہے۔ عزیزانِ من! متشابہات' تشبیہاً باتیں کرنی ہوتی تھیں۔ لیکن یہ متشابہات کس طرح سے محکمات بنیں گی؟ آپ دیکھ رہے ہیں متشابہات' محکمات کی صف میں آتی چلی جا رہی ہیں۔ جب وہ تشبیہ کی بات سمجھ میں آ جائے تو معنی متعین ہو جاتے ہیں۔ یہی چیزیں وَ كُلٌّ فِيْ فَلَكٍ يَّسْبَحُوْنَ (36:40) وہ جو اجرامِ فلکی ہیں ان میں سے ہر ایک اپنے فلک کے

اندر یَسۡبَحُوۡنَ (36:40) تیر رہا ہے۔تفاسیر والوں نے ستاروں کے متعلق تو کہا کہ یہ نیچے کے آسمان کے اندر ہیروں کی طرح جڑے ہوئے ہیں ۔قرآن تو کہتا ہے کہ یَسۡبَحُوۡنَ (36:40) یعنی حرکت کر رہے ہیں۔تفاسیر کی رو سے تو پھر آگے حرکت کی بات تو نہیں رہی۔انہوں نے اس کے معنی کیے کہ وہ خدا کی تسبیح کرتے ہیں۔ٹھیک ہے وہ وہیں تک پہنچ سکتے تھے جبکہ ہمارے دور میں علم الافلاک اتنا آگے چلا گیا ہے۔ہمیں معلوم ہے۔اب یہ جو قرآنِ کریم کا لفظ ہے عربی زبان میں اس کے معنی ہیں کہ ہر کرۂ آسمانی اپنے اپنے مدار میں تیرتا پھر رہا ہے۔بات متعین ہوگئی۔

تشبیہات کا محکمات کی طرف سفر کا آغاز

میں نے ابھی عرض کیا ہے کہ یہ کس طرح سے متعین ہوتی ہیں ۔ یہ تشبیہات سے بیان کی ہوئی بات محکم بنتی ہے' الحق بنتی ہے۔ سَنُرِیۡهِمۡ اٰیٰتِنَا فِی الۡاٰفَاقِ وَفِیۡۤ اَنۡفُسِهِمۡ حَتّٰی یَتَبَیَّنَ لَهُمۡ اَنَّهُ الۡحَقُّ ((41:53 ہم تمہیں تمہارے عالمِ انفس میں' انسانوں کی اپنی دنیا میں' تمہاری اپنی زندگی میں اور عالمِ آفاق میں' خارجی کائنات میں اپنی نشانیاں دکھاتے چلے جائیں گے۔ تا آنکہ یہ بات واضح ہوجائے کہ قرآن کا ایک ایک لفظ حق ہے۔عزیزانِ من! آیاتِ متشابہات' محکمات میں یوں داخل ہونگی ۔جس وقت بھی اس کائنات کے پردوں کے اندر چھپی ہوئی کسی حقیقت کا انسان کے متجسس' متلاشی ہاتھ سے ذرا سا بھی پردہ اٹھے گا۔ جسے DISCOVER کرنا کہتے ہیں۔یوں پردہ اٹھے گا تو عروسِ حقیقت مسکراتی ہوئی سامنے آئے گی۔قرآن کی ایک متشابہ آیت محکم بن جائے گی۔عزیزانِ من! اس طرح سے یہ چیزیں بنتی چلی جارہی ہیں' بنتی چلی جائیں گی حَتّٰی یَتَبَیَّنَ لَهُمۡ اَنَّهُ الۡحَقُّ (41:53) تا آنکہ یہ بات سمجھ میں آجائے گی کہ یہ حق ہے۔اس میں شبہ نہیں کہ بعض حقیقتیں جن کا تعلق اس زندگی' اس کائنات سے ماوراء ہے' وہ METAPHYSICS ہے' وہ اس طرح سے محسوس شکل میں تو سامنے نہیں آئیں گی لیکن انسانی علم اس طرح سے آگے بڑھتا ہوا چلا جارہا ہے کہ غیر مرئی حقیقتوں کے متعلق بھی بات بڑی وضاحت سے سمجھ میں آتی چلی جارہی ہے۔جس PSYCHE کے متعلق ہم پچاس برس پیشتر کچھ نہیں جانتے تھے۔ جسے انسانی سائیکولوجی کا علم کہتے ہیں۔انسانی ذات یا مائنڈ کہتے ہیں۔آج سائیکولوجی نے اس کے متعلق بھی کتنے پردے اٹھا دیے ہیں۔اور ابھی تو علمِ انسانی اپنے بچپن میں ہے' ابھی تو گھٹنوں چلنے لگا ہے۔اسے آگے بڑھنے دیجیے۔یہ جتنے میٹا فزکس کے بھی حقائق ہیں' محسوس شکل میں تو سامنے نہیں آئیں گے لیکن علمِ انسانی اتنا آگے بڑھے گا اور ذہنِ انسانی اتنا DEVELOP ہوگا کہ وہ جو تشبیہات ہیں ان کے بڑے نکھرے ہوئے مفہوم سامنے آتے چلے جائیں گے۔متشابہات جو ہیں وہ یوں محکمات بنتی چلی جائیں گی۔

دلوں کی نفسیاتی بیماری انسان کو صحیح راستے پر راغب ہونے ہی نہیں دیتی

قرآن کہتا ہے کہ فَاَمَّا الَّذِیۡنَ فِیۡ قُلُوۡبِهِمۡ زَیۡغٌ فَیَتَّبِعُوۡنَ مَا تَشَابَهَ مِنۡهُ ابۡتِغَآءَ الۡفِتۡنَةِ وَ ابۡتِغَآءَ تَاۡوِیۡلِهٖ (3:7) کچھ لوگ وہ ہیں کہ جو بالکل صحیح راستے کے اوپر' سیدھے سیدھے راستے کے اوپر چلے جانا چاہتے ہیں۔ کچھ وہ ہیں کہ جن کے دلوں میں کچھ ٹیڑھ ہوتی ہے' سیدھی بات کو بھی ٹیڑھا کرنا چاہتے ہیں۔ وہ کیا کرتے ہیں؟ کہا کہ ان کی کیفیت یہ ہے کہ فَیَتَّبِعُوۡنَ مَا تَشَابَهَ مِنۡهُ (3:7) قرآن نے جن باتوں سے تشبیہ دی تھی انہی کو اصل سمجھ کر ان کے پیچھے لگ جاتے ہیں۔ جیسا میں نے عرض کیا ہے کہ خدا کے عرش کی پیمائش' حوضِ کوثر کے آب خوروں کی تعداد۔ خدا نے کہا ہے کہ تم ہماری آنکھوں کے سامنے یہ کرو۔ خدا کی آنکھوں کے متعلق تفصیل شروع کر دی۔ اس نے کہا ہے کہ ہمارا ہاتھ تمہارے ہاتھ پہ تھا۔ خدا کے ہاتھ کی تفصیل شروع کر دی۔ یعنی یہ کہ جب وہ آنکھ' ہاتھ' سمیع سننے والا' بصیر' کہتا ہے تو انہوں نے اس کے کان' اس کی آنکھیں' اس کے ہاتھ' وہ سارا کچھ جو یہی ہوسکتا تھا کہ وہ ہمارا اتنا سا لمبا ہے تو انہوں خدا کا ہاتھ پچاس گز کا بنایا۔ ہمارے کان اتنے اتنے ہیں تو اُس کے کان بہت بڑے بڑے بنا دیے۔ کیا ہوا؟ مَا تَشَابَهَ مِنۡهُ (3:7) جن چیزوں سے اس نے تشبیہ دی تھی یہ ان کے پیچھے چل پڑے۔ اب اس سے فتنہ پیدا ہوا۔ یہ جو ٹکراؤ آپ کے ہاں قدیم وجدید کا اس دور میں ہو رہا ہے یہ فتنہ آپ کو پتہ ہے کہ یہ کیوں ہو رہا ہے؟ مَا تَشَابَهَ مِنۡهُ (3:7) کے پیچھے چلنے کی وجہ سے۔ یہ یہ چیزیں انہوں نے اپنے ہاں متعین کر کے لکھ لیں۔ اب جو کوئی بھی ان سے ہٹ کر' ان تشبیہات کو تشبیہی انداز میں سمجھ کر' ان کے متعلق کوئی اور تصور دیتا ہے تو اس کا نام ANTI ISLAMIC ہو جاتا ہے۔ اس کو پکڑیو ماریو کا شور اٹھتا ہے۔ کیا ہوا ہے؟ فَیَتَّبِعُوۡنَ مَا تَشَابَهَ مِنۡهُ (3:7) تشبیہات کے پیچھے چل پڑے۔ اس کی دلیل یہ دی کہ اسلاف یہ کچھ کہتے چلے آ رہے ہیں۔ اسلاف سے آگے وہی دلیل کہ یہ رسول اللہ ﷺ کی حدیث میں آیا ہے۔ بس وہاں آ کر تو معاملہ ختم ہو جاتا ہے۔ عزیزانِ من! یہ ٹھیک ہے کہ اس قسم کے ہنگاموں سے آپ زبانیں روک سکیں گے لیکن دلوں کے اندر پیدا ہونے والے شبہات کو آپ نہیں روک سکتے۔ اور جب دلوں کے اندر یہ چیزیں پیدا ہوتی ہیں اور زبانیں بند کر دی جاتی ہیں

پری رو تابِ مستوری نہ دارند
چو در بندی ز روزن سر برارند

اگر آپ ان ابھرنے والے شکوک پر دروازے بند کر دیں گے تو وہ روشن دانوں سے نکل کے باہر آ جائیں گے۔ دلوں کے اندر پیدا ہونے والے شکوک کا علاج یہ نہیں ہے کہ آپ لاحول کی ایک دھمکی سے ڈرا دیں۔ اس کی تو تسکین کا سامان پیدا کرنا

ہوگا' صحیح طریقے سے آپ نکلنے نہیں دیں گے تو PERVERTION کے ذریعے سے پھر وہ سرکشی بنے گی' طوفان بنے گا سیلاب بنے گا۔ اور جب سیلاب بنے گا تو قرآن کہتا ہے کہ اس فتنے سے ڈرو کہ جو پھر اپنے بہاؤ میں صرف ظالمین کو ہی لے کے نہیں جایا کرتا (8:25)

نہ کہ درا منزلت باشد نہ مہ درا

اس کے اندر پھر سب بہا کرتے ہیں۔ کیا ہو رہا ہے؟ مَاتَشَابَہَ مِنۡہُ ابۡتِغَآءَ الۡفِتۡنَۃِ وَ ابۡتِغَآءَ تَاۡوِیۡلِہٖ (3:7) جو چیز تشبیہاً بیان کی تھی اس کے متعلق یہ کہ یہ اصل ہے' یہ حقیقت ہے' خود اس کی یہ تاویل کرتے ہیں۔

لفظ تاویل کے حقیقی مفہوم کا پس منظر قابلِ غور ہے

ایک اور لفظ تاویل آ گیا۔ عزیزانِ من! وقت بڑی تیزی سے جا رہا ہے اور بات بڑی اہم آ رہی ہے۔ تاویل تو آپ کو معلوم ہے کہ آپ کے ہاں اس کے کیا معنی ہوتے ہیں۔ ''او عجیب جئی تاویل کر دتی اوہنے جی اوتھے مجمع اچ''۔ ''وہ تاویل کر دی'' ہمیشہ برے معنوں میں یہ آتا ہے یعنی اس کے معنی ایسی بات لے لینا کہ جو اس کے اندر ہو ہی نہیں' اس کی تاویل کی جاتی ہے۔ تاویل کے معنی اس کے مادے کے اعتبار سے ''انجامِ کار'' ہے۔ تاویل الاحادیث یہ آیت حضرت یوسفؑ کے متعلق ہے کہ انہیں علم دیا گیا تھا۔ اس میں یہ چیز ہے کہ انہیں ہم نے ایسی بصیرت عطا کی ایسی فراست انہیں ملی تھی کہ جو چیز آج ابھی سامنے یوں آ رہی ہے اور بہت دور جا کر اس کا نتیجہ نکلنا ہے وہ آج کے ان واقعات پہ غور کر کے اس کے انجام کے متعلق اندازہ لگا لیتے تھے کہ یہ چیز اس طرح سے ہوگی۔ اقبالؒ کے الفاظ میں کہ مومن کی نگاہ پھر یہ ہو جاتی ہے کہ

خارے دید و احوالِ چمن گفت

کانٹے کو دیکھ کر پورے باغ کی کیفیت بیان کر دیتا ہے۔

حادثہ وہ جو ابھی پردۂ افلاک میں ہے
عکس اس کا میرے آئینۂ ادراک میں ہے

اسے تاویل کہتے ہیں کہ مآلِ کار' انجامِ کار' آخرالامر' جہاں آ کر کسی چیز نے ٹھہرنا ہوتا ہے۔ ''آ تاویل نئیں جیہڑ یاں روز کہندے او تاویلاں کردا پھردا ہیگا اے''۔ وَ مَا یَعۡلَمُ تَاۡوِیۡلَہٗۤ اِلَّا اللّٰہُ (3:7) اس کے یہ معنی ہیں کہ جن کو تشبیہات کے ذریعے بیان کیا ہے ULTIMATELY اس کا کیا مفہوم ہے؟ پہلی چیز تو یہ ہے کہ خدا ہی جانتا ہے جس نے یہ چیزیں دی ہیں۔ اب اس

کے بعد آ گے چلیے۔ ہمارے ہاں یہ کہا گیا کہ قرآنِ کریم میں یہاں فل سٹاپ ہے۔صاحب! اس کے متعلق تو صرف خدا ہی جانتا ہے۔ ہو گئے دروازے بند۔ آ گے ہے وَ الرّٰسِخُوۡنَ فِی الۡعِلۡمِ یَقُوۡلُوۡنَ اٰمَنَّا بِہٖ ۙ کُلٌّ مِّنۡ عِنۡدِ رَبِّنَا (3:7) اور الرّٰسِخُوۡنَ فِی الۡعِلۡمِ (3:7) جو لوگ علم میں محکم ہیں وہ یہ کہتے ہیں کہ ہم تو ان چیزوں کے اوپر ایمان لائے کہ خدا نے جو کہا ہے ٹھیک ہی کہا ہوگا۔

راسخ عقیدہ حضرات کی بجائے کسی معاملہ کی تہہ تک پہنچنا صاحبانِ اولی الالباب کے لیے زیادہ مشکل نہ رہے گا

سوال یہ ہے کہ یہ بات تو عوام کہہ سکتے تھے کہ یہ ٹھیک ہے کہ ہماری سمجھ میں تو بات نہیں آئی لیکن ہمارا ایمان یہ ہے کہ جو خدا نے کہا ہے ٹھیک ہے۔ یہ الرّٰسِخُوۡنَ فِی الۡعِلۡمِ (3:7) جو ہیں کیا ان کا بھی یہی مسلک ہوگا؟ تو یہ جو قرآن نے اس چیز پہ بار بار زور دیا ہے کہ عقل وفکر سے کام لو۔اور یہ تو قرآن ہے کہیں دور جا کر زور نہیں دیا' یہ آیت ختم نہیں ہوئی اس کے اگلے لفظ ہیں کہ وَ مَا یَذَّکَّرُ اِلَّاۤ اُولُوا الۡاَلۡبَابِ (3:7) صحیح حقیقت ان کے سامنے آئے گی جو اولوالالباب ہیں' جو صاحبانِ عقل وبصیرت ہیں۔ صاحبانِ عقل وبصیرت کا تو یہ مقام ہے۔اس لیے آیت یہ ہے کہ وَ مَا یَعۡلَمُ تَاۡوِیۡلَہٗۤ اِلَّا اللّٰہُ (3:7) جس خدا نے بنیادی طور پر ان چیزوں کو تشبیہاً بیان کیا ہے وہ جانتا ہے کہ انجامِ کار (ULTIMATELY) ان کا مفہوم کیا ہے۔ الرّٰسِخُوۡنَ فِی الۡعِلۡمِ (3:7) اور وہ لوگ جو علم میں راسخ ہوتے چلے جاتے ہیں ''ایویں لے بچ نئیں ہوندے''۔ یہ عجیب چیز ہے۔ الرّٰسِخُوۡنَ فِی الۡعِلۡمِ (3:7) نہایت محکمیت سے' TRUTH کے پیچھے چلنے والے' حقائق کے متلاشی' ان چیزوں پہ پہنچنے والے۔ راسخ صرف متلاشی نہیں ہوتا بلکہ کسی چیز پہ پہنچ کر اس پہ جم کر کھڑے ہو جانے والا ہوتا ہے۔ان چیزوں کی جو حقیقی تاویل ہے وہ بنیادی طور پر خدا کے ہاں ہے۔علمِ انسانی جتنا بڑھتا چلا جائے گا اس کی نسبت سے جتنے لوگ بھی اس علم کے اندر اپنے آپ کو محکم کرتے چلے جائیں گے وہ بھی ان کی تاویل کے متعلق معلوم کرتے چلے جائیں گے کہ اس کا مفہوم کیا ہے۔لیکن یہ تو کسی ایک دور کی بات نہیں ہے اور نہ ہی کسی فرد کی زندگی میں ایک ہی دفعہ یہ چیز ہو سکتی ہے یہ تو بتدریج سامنے آئے گی۔ وہی آیت جو میں نے ابھی تلاوت کی ہے کہ سَنُرِیۡہِمۡ اٰیٰتِنَا فِی الۡاٰفَاقِ وَ فِیۡۤ اَنۡفُسِہِمۡ (41:53) ہم یہ چیزیں انفس وآفاق میں دکھاتے چلے جائیں گے۔ ہو سکتا ہے کہ ایک دور میں ابھی کچھ چیزیں ایسی ہوں کہ جو متشابہات کے ضمن میں محکمات کی صف میں نہ آئی ہوں۔ وہ کہتا ہے کہ یہ لوگ یہ جانتے ہیں لیکن ان کا مسلک یہ ہوتا ہے کہ یَقُوۡلُوۡنَ اٰمَنَّا بِہٖ ۙ کُلٌّ مِّنۡ عِنۡدِ رَبِّنَا (3:7) کہ جو کچھ بھی اس قرآن میں کہا گیا ہے وہ

سب کا سب ہمارے خدا کی طرف سے ہے اور ہم اس کی سچائی پر ایمان رکھتے ہیں۔ اس ایمان کے بعد اس تلاش میں پھر وہ لگتے ہیں کہ یہ جو تشبیہات ہیں ان کے پیچھے جو حقیقتیں چھپی ہوئی ہیں ان پر سے پردہ اٹھایا جائے۔ اور جس حد تک انسان کا علم جا سکتا ہے وہاں تک جا کر وہ اس حقیقت سے پردہ اٹھا کر اس کو محکمات میں لے آتے ہیں۔ تو ان کا یہی جو ایمان ہے یہ یقین میں بدلتا چلا جاتا ہے۔ لیکن یہاں تک پہنچے ہوں یا نہ پہنچے ہوں ان کا ایمان یہی ہوتا ہے کہ کُلٌّ مِّنۡ عِنۡدِ رَبِّنَا (3:7) پورا قرآن جتنا بھی ہے وہ ہمارے خدا کی طرف سے ہے۔ قرآن میں ہر حقیقت جو بیان کی گئی ہے وہ حقیقت ہے، REALITY ہے، TRUTH ہے۔ پھر اس کے بعد اس REALITY کے اوپر پڑے ہوئے پردے کو DISCOVER کرنے کے لیے آگے جاتے ہیں۔

قرآنِ حکیم نے تو اپنے ایک لفظ پر غور و فکر کی دعوت دے رکھی ہے

وَ مَا یَذَّکَّرُ اِلَّاۤ اُولُوا الۡاَلۡبَابِ (3:7) جو صاحبانِ عقل و بصیرت ہیں وہ یہ کام کر سکتے ہیں۔ تو اگر جو ارباب بصیرت ہیں، جو صاحبانِ عقل و بصیرت ہیں ان کا بھی یہی مسلک ہو کہ نہیں صاحب! قرآن میں جو کچھ لکھا ہے اس پر تو آنکھیں بند کر کے ایمان لانا چاہیے تو وہ جو پہلا مفہوم ہے اس کا کیا ہوگا۔ ہمارے ہاں یُؤۡمِنُوۡنَ بِالۡغَیۡبِ (2:3) کے معنی ہی یہ لیے جاتے ہیں کہ کوئی چیز تحقیق، تصدیق، تفتیش اور علم وغیرہ کی رو سے نہیں ہے آنکھیں بند کیے ہوئے ایمان لے آنا ہے۔ تو یہ اولوالالباب کا ہے کے لیے، صاحبانِ عقل و بصیرت کا ہے کے لیے! وَ مَا یَذَّکَّرُ اِلَّاۤ اُولُوا الۡاَلۡبَابِ (3:7) اس کا طریقہ کیا ہوگا، یہ ہے اہم چیز۔ اس کا طریقہ یہ ہے کہ قرآن کے اندر محکمات آیت واضح طور پر متعین مفہوم والی ہیں۔ جو کچھ باقی کہا گیا ہے اس کا کوئی مفہوم ایسا نہیں ہو سکتا کہ جو محکمات کے خلاف جائے۔ اس لیے کہ قرآن کا دعویٰ یہ ہے کہ میرے اندر کسی قسم کا اختلاف اور تضاد نہیں ہے۔ لہٰذا متشابہ آیت وہی محکم کا درجہ حاصل کرے گی جس کا مفہوم اس کے محکمات کے خلاف نہ جا رہا ہو۔ اگر خلاف جا رہا ہے تو ہمیں رکنا ہوگا کہ ابھی ہماری تحقیق حقیقت تک نہیں پہنچ سکی، ہمیں مزید کوشش کرنی چاہیے۔ اس کے لیے آپ کو راہنمائی کہاں سے ملے گی؟ یہ دیکھیے آیت رَبَّنَا (3:8) یہ اولی الالباب حقیقت کی تلاش میں، علم کی وادیوں میں نکلتے ہیں۔ دل میں یہ آرزوئیں مچلتی ہیں کہ اے ہمارے نشوونما دینے والے! لَا تُزِغۡ قُلُوۡبَنَا بَعۡدَ اِذۡ هَدَیۡتَنَا (3:8) جب تو نے ہمیں قرآن کے ذریعے سے صحیح راستہ دکھا دیا ہے تو پھر کہیں ایسا نہ ہو جائے کہ اس کے بعد ہمارے دلوں میں کسی قسم کی کج روی پیدا ہو جائے۔ تُزِغۡ یا زیغ کے معنی ہوتے ہیں کہ ''صحیح راستے سے اِدھر اُدھر ہٹ جانا''۔ ہمارے ہاں ایسا نہ ہو جائے کہ ہم ایک مجرد حقیقت کو، ABSTRACT TRUTH کو، ایک ایسی شکل میں دیکھنے کے لیے چلے تو ہیں جو محسوس نہیں تو کم از کم محسوس طور پہ سمجھ میں آ جائے اور اس کا نتیجہ

کہیں یہ نہ ہو کہ ہم اصلِ حقیقت سے ہٹ کر کسی اور ہی طرف چل نکلیں۔ آگے قرآن نے اس کا طریقہ بتایا ہے کہ قلوب میں کج روی پیدا نہ ہو۔

لفظ وہاب کا لغوی مفہوم اور پھر وہبی طور پر سامانِ نشوونما کا عطا کرنا رحمت ہے

برادرانِ عزیز! وَهَبْ لَنَا مِنْ لَّدُنْكَ رَحْمَةً (3:8) اللہ تعالیٰ نے قرآنِ کریم کو' وحی کو' رحمت کہا ہے۔ اس لیے کہ انسانیت کی جو صحیح نشوونما ہے وہ اسی کے ذریعے سے ہوسکتی ہے۔ اپنے آپ کو وہاب کہا ہے۔ وہاب کے معنی ہوتا ہے کہ ''بغیر کسی معاوضے اور صلے کے کوئی چیز عطا کر دینے والا''۔ وحی کسی معاوضے اور صلے سے نہیں ملتی۔ مزد بھی نہیں ہے' انسانی محنت کا ماحصل بھی نہیں ہے' فکرِ انسانی کی تخلیق بھی نہیں ہے بلکہ وہبی طور پر خدا کی طرف سے ملی ہے۔ اس نے اس رحمت کو' سامانِ نشوونما کو وہبی طور پر اپنی طرف سے عطا کیا ہے۔ اس لیے کہا ہے کہ یہ جو ہے کہ ہمارے قلوب میں کسی قسم کی کج روی پیدا نہ ہو تو اس کا طریقہ یہ ہے کہ ہر دوراہے پہ جہاں ہم کھڑے ہوں ایسا کر کہ تیری طرف سے یہ جو ہدایت ملی ہے وہ ابھر کر ہمارے سامنے آجائے۔ وَهَبْ لَنَا مِنْ لَّدُنْكَ (3:8) الفاظ دیکھیے! کہا کہ ہم اپنی فکر کے پیچھے چلے جا رہے ہیں لیکن جہاں زندگی کا دوراہا آئے گا وہاں ہمیں فیصلہ کرنا ہوگا کہ کس طرف کو مڑا جائے۔ ہوسکتا ہے کہ ہم اپنی فکرِ خام کی رو سے یا وہ DATA جو ابھی مکمل نہیں ہوا اور اس وقت تک جتنی انفرمیشن ہمارے پاس آئی ہے اس کی رو سے ہم یقینی طور پر سمجھ لیں کہ ہمیں ادھر جانا چاہیے اور اُدھر جا نکلیں۔ اور اُدھر جا نکلنے سے کیا ہوگا؟ عزیزانِ من! میں یہ بھی سمجھا دوں اِدھر اُدھر جا نکلنے سے انسان کی محنت' وقت اور توانائی زیادہ صرف ہوتی ہے۔ یہ اِدھر اُدھر نکلنے والے جو راستے ہیں' TRIAL & ERROR کی رو سے' فکر اور علمِ انسانی کی محنت اسے آخر میں جا کر صراطِ مستقیم پر لے جاتا ہے۔ قرآن نے کہا ہے کہ جو ہمارے بارے میں محنت کرتا ہے ہم اس کو سُبُلَنَا اپنے سبل دکھاتے ہیں (29:69)۔ عزیزانِ من! عجیب چیزیں ہیں کیا عرض کروں! اور وقت کی کیفیت یہ ہے کہ وہ میری لگام کھینچ رہا ہے۔ ہم انہیں اپنے سبل دکھا دیتے ہیں۔ سبل ان پگڈنڈیوں کو کہتے ہیں کہ جو آخرالامر جا کر ہائی وے روڈ میں مل جائیں۔ جو ہمارے بارے میں جہد جدوجہد کرتے ہیں ہم ان کو سبل دکھاتے ہیں۔ اور یہ سبل پھر جا کر آخرالامر وہیں جا ملتے ہیں۔ ایک دور آنا ہے کہ جہاں فکرِ انسانی' علمِ انسانی' اپنی محنت' کاوش' تجسس' تجربات' مشاہدات' مطالعات کے بعد ان حقائق تک پہنچ جائے گا جو وحی نے عطا کیے تھے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ اس نے چودہ سو سال پہلے عطا کیے تاکہ انسان کی محنت بچ جائے جبکہ یہ لاکھوں سال کی محنت کے بعد' ہڈیاں تڑوا کر' آگ اور خون کی ندیاں پار کر کے' کئی کئی عظیم جنگوں کے بعد' کسی ایک

حقیقت کے اوپر پہنچے گا۔ پہنچے گا ضرور۔ اللہ نے اس شخص (اقبالؒ) کو کیا خوب انداز دیا تھا بات سمجھنے کا اور کہنے کا! 478آلِ عمران

ہر دو امیرِ کارواں ہر دو بمنزلے رواں
عقل بہ حیلہ می برد عشق برد کشاں کشاں

تنہا عقلِ انسانی اور وحی میں زمین و آسمان کا فرق ہے

عقل اور وحی دونوں امیرِ کارواں ہیں، دونوں منزل کی طرف جا رہے ہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ یہ اسباب، ذرائع، TRIAL & ERROR کے طریقے سے لے جاتی ہے اور عشق کھینچ کر لے جاتا ہے۔

عشق کی اک جست نے طے کر دیے قصے تمام
اس زمین و آسمان کو بے کراں سمجھا تھا میں

صاحب! وحی یہ کرتی ہے۔ حضرتِ موسیٰؑ کو جو وہاں وحی کی آواز آئی ہے تو وہاں یہ کہا تھا کہ موسیٰؑ! فَاخْلَعْ نَعْلَيْكَ ج اِنَّكَ بِالْوَادِ الْمُقَدَّسِ طُوًى (20:12) موسیٰؑ! اب اپنی جوتیاں اتار دے، تیری مسافتیں اب سمٹ کر طے ہوگئی ہیں۔ وحی کے ذریعے سے وہ حقائق لے جن کی تلاش میں مارا مارا پھر رہا تھا۔ اب تمہیں صحرانوردیوں کی ضرورت نہیں ہے۔ قرآنِ کریم نے حضور ﷺ کے متعلق فرمایا کہ وَوَجَدَكَ ضَآلًّا فَهَدٰى (93:7) ہم نے تجھے تلاشِ حقیقت میں سرگرداں پایا، لیجیے! حقیقت تمہارے سامنے آ گئی۔

وحی تو انسانیت کے بوجھ کو ہلکا کر دیتی ہے

اقبالؒ کے الفاظ میں REVELATION یا وحی IT ECONOMISES HUMAN EFFORTS (یہ انسانی جدوجہد کو اکانومائز کرتی ہے)۔ اس لیے اس مقام پر اولی الالباب یہ کہتے ہیں کہ اگر غلط قدم اٹھ گیا تو پتہ نہیں ہم کہاں نکل جائیں گے۔ ہمیں صحیح راستے کے اوپر آنے کے لیے کتنی صدیاں لگ جائیں گی۔ تو کیوں خوامخوہ کے لیے اتنا وقت اور توانائیاں ضائع کی جائیں۔ وَهَبْ لَنَا مِنْ لَّدُنْكَ رَحْمَةً (3:8) تم نے اپنی طرف سے جو ہدایت کا سامان بھیجا ہے وہ ہمیں اس مقام کے اوپر عطا کر دے۔ عزیزانِ من! یہ جو سامانِ ہدایت عطا ہوا تھا زمانے کی آنکھ نے اس کی ایک جھلک دیکھی ہے۔ اگر اسی ہدایت کے اوپر یہ کارواں، جسے امتِ محمدیہ ﷺ کہتے ہیں یہ چلتا رہتا تو معلوم نہیں آج انسانیت کہاں ہوتی۔ ہم دو انسانوں کے

ایک چاند کے اوپر پہنچنے پر جشن منا رہے ہیں۔ معلوم نہیں کہ یہ ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں' وہاں تک آج انسانیت کا کارواں پہنچا ہوا ہوتا۔ یہ انسانیت کے خلاف جو جرم ہے اس کے مجرم ہم ہیں جنہوں نے کتاب کا وارث ہونے کا دعویٰ کیا ہوا ہے۔ وَ هَبۡ لَنَا مِنۡ لَّدُنۡکَ ج رَحۡمَةً اِنَّکَ اَنۡتَ الۡوَهَّابُ (3:8) یہ جو ہدایت ہے جو یوں بجلی کی چمک کی طرح سے راستے کو روشن کرنے والی ہے یہ تُو ہی دے سکتا ہے۔ ہم اپنی فکر کے راستے سے اگر چلے تو راہیں بڑی لمبی ہوں گی بڑے سامانِ ہلاکت راستے میں آئیں گے۔ پھر کہیں جا کر معلوم نہیں کہ آج کا چلا ہوا انسان کب وہاں پہنچے گا۔ اور تُو اگر یہاں ایک جھلک اپنے نور کی قرآن کے ذریعے سے دیدے گا تو قدم صحیح راستے پہ اٹھ جائے گا۔ وہی منزل جو صدیوں میں طے ہونی تھی دِنوں کے اندر طے ہو جائے گی۔

عزیزانِ من! ہم سورۃ آلِ عمران کی آیت 8 تک آ گئے۔ وقت ہو گیا ورنہ بات تو ابھی اور آگے چلنی تھی۔ بہر حال اگلے درس میں بھی میں دو ایک لفظ اسی کے متعلق عرض کروں گا ابھی دو ایک چیزیں باقی ہیں۔ پورے قرآن نے اپنے آپ کو محکمات کہا ہے' متشابہات بھی دوسری جگہ کہا ہے۔ میں عرض کروں گا کہ ان کے معنی کیا ہیں۔

رَبَّنَا تَقَبَّلۡ مِنَّا ؕ اِنَّکَ اَنۡتَ السَّمِيۡعُ الۡعَلِيۡمُ (2:127)

❀...❀...❀

دوسرا باب: **سورۃ آلِ عمران** (آیات 8 تا 15)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عزیزانِ من! آج ستمبر 1969ء کی 21 تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ مجید کا آغاز سورۃ آلِ عمران کی آٹھویں آیت سے ہوتا ہے:((3:8۔

محکمات اور متشابہات وغیرہ کے سلسلہ میں سابقہ درس کا ملخص

آپ کو یاد ہوگا کہ سابقہ درس میں مرکزی موضوع ''محکمات اور متشابہات آیات'' تھا۔ دہرانے کی ضرورت نہیں۔ میں ملخص عرض کردوں کہ میں نے بتایا یہ تھا کہ قرآنِ کریم میں کچھ تو قوانین اور اصول ہیں جنہیں قانون کی زبان میں بیان کیا گیا ہے۔ اور قانون کی زبان متعین ہوتی ہے یعنی الفاظ کے LITERAL معنی جسے کہتے ہیں وہ ہوتے ہیں۔ جیسا کہ میں نے کہا تھا کہ اگر اُمّ کہا گیا ہے تو قانون میں تو اس کے معنی ''ماں'' کے ہوں گے۔ حتیٰ کہ قرآن نے تو ام میں اور باپ کی منکوحہ میں بھی فرق کیا ہے۔ جسے آپ سوتیلی ماں کہتے ہیں۔ قانون کی زبان ایسی ہی ہونی چاہیے۔ لیکن اس کے ساتھ اس میں ما بعد الطبیعات (METAPHYSICAL) جسے آپ ABSTRACT TRUTH (بسیط حقائق) کہتے ہیں۔ خدا کے متعلق' اس کے علم کے متعلق' اس کے اقتدار کے متعلق' حیاتِ آخرت کے متعلق' جو بھی چیزیں اس میں آئی ہیں۔ اور ظاہر ہے کہ یہ چیزیں تشبیہاً ALLEGORICAL, METAPHORICAL ہی بیان کی جاسکتی ہیں۔ تو یہ حقائق جو تشبیہاً بیان کیے گئے ہیں وہ

آیاتِ متشابہات ہیں۔ اور جن کو قانون کی زبان میں اصول وقوانین کیا گیا ہے وہ محکمات ہیں۔ پھر یہ متشابہات ایسی ہیں کہ جوں 478 **آل عمران** جوں علمِ انسانی آگے بڑھتا چلا جائے گا، تشبیہیں زیادہ واضح طور پر سمجھ میں آتی چلی جائیں گی۔ اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ پھر علمِ انسانی کی وسعت اور رفعت سے ایک دن ایک متشابہ چیز محکم درجہ حاصل کرلے، ہمیں متعین طور پہ بات سمجھ میں آ جائے کہ اس کے کیا معنی ہیں۔ جیسا کہ میں نے عرض کیا تھا کہ قرآن میں یہ آیا ہے کہ یہ اجرامِ فلکی جو تمہیں نظر آتے ہیں كُلٌّ فِىْ فَلَكٍ يَّسْبَحُوْنَ (36:40) ہر ایک اپنے اپنے فلک میں تیر رہا ہے۔ علم الافلاک کے آگے جانے سے اس کے معنی متعین ہوجاتے ہیں کہ قرآن نے یہ کیا بات کہی ہے۔ تو اس طرح سے جوں جوں علمِ انسانی بلند ہوتا چلا جائے گا، کائنات کے حقائق پر پڑے ہوئے پردے اٹھتے چلے جائیں گے۔ اور یہ متشابہ آیات بھی علمِ انسانی کی حد کے اندر رہتے ہوئے محکم ہوتی چلی جائیں گی۔ میں نے عرض کیا تھا کہ اس سلسلے میں دو ایک باتیں ابھی رہ گئی ہیں اور سابقہ درس میں وقت ختم ہو گیا تھا۔ ان کا سامنے لانا بھی ضروری ہے۔ قرآنِ کریم نے ایک جگہ اپنی تمام آیات کے متعلق کہا ہے کہ كِتٰبٌ اُحْكِمَتْ اٰيٰتُهٗ (11:1) وہ کتاب کہ جس کی آیات کو محکم بنایا گیا ہے۔ تو اس کے معنی یہ ہیں کہ یہ جو میں نے کہا تھا کہ سائنٹفک طریق یہ ہے کہ جو چیزیں تشبیہاً، استعارتاً بیان کی گئی ہیں۔ آہستہ آہستہ علمِ انسانی کی وسعت کے ساتھ وہ محکمات کی شق میں فہرست میں داخل ہوتی چلی جائیں گی۔ یوں قرآن کی ہر آیت محکم بنتی چلی جائے گی۔ اس لیے اس نے اپنی آیات کے متعلق کہا کہ انہیں محکم بنایا گیا ہے۔ لیکن ایک اور مقام پر انہیں متشابہات بھی کہا گیا ہے اَللّٰهُ نَزَّلَ اَحْسَنَ الْحَدِيْثِ كِتٰبًا مُّتَشَابِهًا مَّثَانِيَ (39:23) یہاں وہ عجیب چیز سامنے لایا ہے۔ کتاب کی یہ خصوصیت بتائی ہے کہ وہ مُّتَشَابِهًا مَّثَانِيَ (39:23) ہے۔

اضداد کی بنا پر قرآنی الفاظ کا مفہوم متعین کرنے کا اصول

آپ دیکھیے کہ سورۃ آلِ عمران میں آیات کو دو کیٹگریز میں تقسیم کیا ہے یعنی محکمات اور متشابہات۔ سورۃ ھود کی جو پہلی آیت میں نے ابھی ابھی پیش کی ہے اس میں کہا ہے کہ اُحْكِمَتْ اٰيٰتُهٗ (11:1)۔ یہاں کہا گیا ہے كِتٰبًا مُّتَشَابِهًا مَّثَانِيَ (39:23) یہاں مُّتَشَابِهًا (39:23)، مثانی کے مقابلے میں آیا ہے۔ وہاں محکمات کے مقابل میں متشابہات آیا تھا۔ یوں قرآن کی آیات کے معنی متعین ہوتے ہیں۔ یہاں مثانی کے سامنے متشابہ آیا ہے۔ مثانی کے معنی ہوتا ہے کہ ''دو متضاد چیزوں کو آمنے سامنے لانا''۔ بات کو سمجھانے کا ایک طریقہ یہ ہوتا ہے کہ اس چیز کی ضد کو سامنے لایا جائے تو وہ چیز خود سمجھ میں آ جاتی ہے۔ سچ کے مقابلے میں جھوٹ، جھوٹ کے مقابلے میں سچ۔ جوں جوں آپ جھوٹ کے نقصانات بیان کرتے جائیں گے سچ کے فوائد خود بخود

سامنے آتے چلے جائیں گے۔ قرآنِ کریم نے اپنے مطالب کو واضح کرنے کے لیے ایک تو یہ طریقہ اختیار کیا ہے کہ اضداد کے ذریعے سے معنی متعین کیے ہیں۔ نور و ظُلمت آپ دیکھیں گے کہ قرآن میں روشنی اور اندھیرا' ظل و حرور دھوپ اور سایہ' اندھا اور آنکھوں والا' بہرہ اور سننے والا' جاہل اور عالم' ایک دوسرے کے سامنے اضداد سے لا کر یوں وہ معنی کو واضح کرتا ہے۔ یہ تو مثانی ہو جاتے ہیں۔ اور ان کے مقابلے میں ایسے الفاظ مرادفات لاتا ہے مثلاً کِتٰبٌ نُّوْرٌ وَّ هُدًى کتاب نور ہے' ہدایت ہے' کتابِ مبین ہے۔ ایک ہی چیز ہے لیکن اس سے ملتے جلتے ہوئے الفاظ وہ اور اور لاتا ہے۔

عربی زبان میں مرادفات کی نوعیت اور ان کی اہمیت

مرادف کے معنی یہ نہیں ہیں کہ ایک ہی معنی کے لیے دو لفظ۔ جو زبان جامع ہوتی ہے' مکمل ہوتی ہے' اس میں مرادف یعنی ایک ہی معنی کے لیے دو لفظ ہو ہی نہیں سکتے۔ اگر آپ اس زبان کی تہ تک پہنچیں گے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ عربی زبان میں جنہیں مرادفات کہا جاتا ہے کہ اس کے اندر شیڈ کا ایک فرق ضرور ہوتا ہے۔ EXACTLY ایک ہی معنی کے لیے دو لفظ تو زبان کا نقص ہوتا ہے۔ عربی زبان کی تو کیفیت یہ ہے کہ ایک اونٹ کے لیے ہزار لفظ ہیں۔ تلوار کے لیے قریباً سات سو لفظ ہیں۔ تو آپ یہ کہیں گے کہ پھر یہ مرادف نہیں تو کیا ہے۔ لیکن زبان جاننے والے جانتے ہیں کہ ان میں سے دو لفظ بھی ان معنوں میں مرادف نہیں ہیں کہ ان کے معنی میں کوئی فرق نہ ہو۔ ان کے معنی میں بڑا باریک سا فرق ہوتا ہے۔ اور اسی لیے عربی ادب پر جن کو عبور ہے وہ اس چیز کو جانتے ہیں کہ یہ جو ذرا سا فرق ان میں ہوتا ہے وہ بات کہاں سے کہاں لے جاتا ہے۔ یہ قوم یونہی شاعری کرنے والی نہیں تھی۔ شاعری کے اندر تو محض وزنِ بیت کے لیے' کافیہ کے لیے ردیف کے لیے ضرورت پڑتی ہے۔ اگر شعر کا وزن ایک لفظ سے پورا نہیں ہوتا تو کوئی دوسرا لفظ ہونا چاہیے کہ جس سے وہ وزن پورا ہو جائے۔ معنی وہی کے وہی ہوں۔ فارسی میں تو ہو سکتا ہے کہ شہد اور انگبیں کے ایک ہی معنی ہوں۔ عربی زبان میں تو یہ نہیں ہو سکتا یہاں تو ان دونوں کے اندر فرق ہوگا۔ اس لیے قرآن نے مرادف نہیں کہا' متشابہاً کہا ہے یعنی ملتے جلتے ہوئے الفاظ۔ جیسا میں نے ابھی عرض کیا ہے کہ قرآن کو کتابِ مبین کہا' نور کہا' ہدایت کہا۔ الفاظ ملتے جلتے ہیں لیکن جب آپ ROOTS کے اعتبار سے معنی پر غور کریں گے تو ان میں کچھ شیڈ کا فرق نظر آئے گا۔ بڑا لطیف اور حسین فرق۔ تو کہا یہ کہ ہم نے یہ کتاب نازل کی۔ اس کے مطالب کو سمجھانے کے لیے کبھی تو ہم ایسے الفاظ لائے کہ جو ایک دوسرے سے ملتے جلتے تھے۔ ان سے ہم نے معنی واضح کیے۔ اور عربی زبان میں تو ایک اور خصوصیت ہے کہ 'وَ' جس کے معنی 'اور' ہوتے ہیں' 'AND' ہوتے ہے۔ عربی زبان میں اس 'وَ' کے یہ بھی معنی ہوتے ہیں کہ جس کو عطف کہتے ہیں'

اور آلِ عمران 478 آتی ہے یعنی درمیان میں یہ 'وٗ' آتی ہے اور اس 'وٗ' کے ایک معنی تفسیری اسے کہا جاتا ہے یعنی درمیان میں یہ 'وٗ' CONJUNCTION کہتے ہیں۔ اور اس 'وٗ' کے ایک معنی تفسیری اسے کہا جاتا ہے جوفقرہ ہوتا ہے وہ پہلے فقرے کی تفسیر کر رہا ہوتا ہے۔ متشابہات یہ بھی ہیں کہ ملتے جلتے ہوئے الفاظ میں معنی کی وضاحت کرنا اور متضاد الفاظ لاکر معنی کونکھار کر سامنے لانا۔ یہ دونوں طریقے مطالب کے واضح کرنے کے لیے ہوتے ہیں۔

قرآنِ حکیم کی ہر آیت اپنے اپنے مقام پر محکم تصور کی جائے گی

یہاں یہ کہا گیا ہے کہ کِتٰبًا مُّتَشَابِهًا مَّثَانِیَ (39:23) تو یہاں مُتَشَابِهاً (39:23)' مثانی کے مقابل میں آیا ہے۔ اس لیے یہاں اس کے یہ معنی ہوں گے کہ وہاں متشابہ' محکمات کے مقابل میں آیا ہے اس لیے وہاں وہ معنی اس کے ہوں گے۔ اور جہاں قرآن نے کہا ہے کہ اُحْکِمَتْ اٰیٰتُهٗ (11:1) اس کی تمام آیات کو ہم نے محکم بنایا ہے تو وہ اپنے اپنے مقام پہ ہر آیت محکم ہے خواہ آج ان میں سے کوئی آیت متشابہ کی فہرست میں کیوں نہ داخل ہو۔ علمِ انسانی جوں جوں بڑھتا چلا جائے گا تو ہوسکتا ہے کہ یہ متشابہات' محکمات کی صف میں آتی چلی جائیں گی۔ اور یوں جیسا قرآن نے کہا تھا کہ ہم اپنی نشانیاں تمہیں عالم انفس و آفاق میں دکھاتے جائیں گے حَتّٰی یَتَبَیَّنَ لَهُمْ اَنَّهُ الْحَقُّ (41:53) تا آنکہ یہ حقیقت نکھر کر سامنے آجائے کہ قرآن کا ایک ایک لفظ حقیقت پر مبنی ہے' حق ہے۔ یہ قرآن سمجھنے کے طریقے قرآنِ کریم نے خود بتائے ہیں۔ یہ جو پچھلا موضوع تھا یہ کچھ میں نے اس کے تسلسل میں عرض کیا ہے۔

ارشادِ خداوندی ہے کہ آخر کار پوری انسانیت ایک نقطے پر جمع ہوگی

رَبَّنَآ اِنَّکَ جَامِعُ النَّاسِ لِیَوْمٍ لَّا رَیْبَ فِیْهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا یُخْلِفُ الْمِیْعَادَ (3:9) اے ہمارے نشوونما دینے والے! تو یقینا انسانیت کو ایک نقطے پر جمع کرے گا۔ تیرا یہ وعدہ ہے اور تیرے وعدے کبھی جھوٹے نہیں ہوتے۔ قرآن کی تعلیم کی بنیاد یہ ہے کہ یہ پوری انسانیت کے لیے ہے' نوعِ انسانی کے لیے ہے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو للناس کہا ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم پوری انسانیت کی طرف آئے ہیں۔ قرآن کو ذکر للعالمین کہا ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو رحمت للعالمین کہا ہے۔ خدا کو رب العالمین کہا ہے۔ یہ انسانیت جو گروہوں میں بٹی ہوئی ہے' طبقات میں تقسیم ہوئی ہوئی ہے' نسلوں کے اعتبار سے اس میں امتیازات کیے گئے ہیں' وطنوں کے اعتبارات سے اس میں خصوصیات برتی گئی ہیں۔ یہ تمام چیزیں انسان کی خود پیدا کردہ ہیں۔ یہ تفرقے' یہ امتیازات کہ جس کی بنا پر

ہوس نے ٹکڑے ٹکڑے کر دیا نوعِ انسان کو

یہ مفاد پرستیاں ہیں جنہوں نے کہ انسانیت کو اس طرح ٹکڑوں میں بانٹ دیا ہے۔

آسمانِ عالم پر آنے والا دور عالم گیریت کے اجتماعی تصور کی نوید ثابت ہوگا

قرآنِ کریم پوری نوعِ انسانی کو ایک خاندان اور ایک شجر کی شاخیں قرار دیتا ہے۔ اس کی تعلیم کا منتہا یہ ہے کہ آہستہ آہستہ ان تفرقوں کو مٹا کر انسانیت کو ایک نقطے پر جمع کر دیا جائے اور اس کی ایک عالمگیر برادری بنا دی جائے۔ میں کہتا ہوں کہ آج ہم نے خوامخواہ کے لیے ذہنوں کے اندر یہ جو قوموں کے ایک امتیازی خطوط کھینچ رکھے ہوئے ہیں اگر یہ امتیازی خطوط مٹ جائیں تو آپ دیکھیے کہ دنیا میں کتنا امن قائم ہو جاتا ہے۔ کسی سے پوچھا جائے کہ یہ قوم کی تفریق کی بنیاد کیا ہے تو وہ بتا نہیں سکتا۔ لیکن اس قسم کی ایک موہوم سی بنیاد یا محض ذہن میں کھینچی ہوئی لکیر کا عملی نتیجہ یہ ہے کہ قوم جہنم بنی ہوتی ہے۔ دو قومیں ایک دوسرے کے سامنے بھیڑیوں کی طرح سالوں سال کھڑی رہتی ہیں۔ انسان کی کتنی بڑی توانائی' وقت' صلاحیتیں محض اس لیے بے کار جا رہی ہیں' بے کار نہیں جا رہیں بلکہ تخریبی نتائج پیدا کر رہی ہیں کہ اس نے اپنے ذہن کے اندر انسان اور انسان میں فرق کرنے کے لیے خوامخواہ تفریقات کی لکیریں کھینچ رکھی ہیں۔ قرآن کی رو سے اس قسم کی کوئی تفریق نہیں۔ تفریق ایک ہی ہے کہ شریف انسان اور بدمعاش انسان۔ وہ تفریق بھی کوئی مستقل طور پہ لکیر نہیں کھینچ دیتا۔ ان کے BEHAVIOUR , ATTITUDE' ان کے اعمال' ان کے کردار کے اعتبار سے وہ ان میں لکیر کھینچتا ہے۔ اور یہ لکیر تو کھینچنی پڑتی ہے کیونکہ وہ ان لوگوں کی اصلاح کی کوشش کرتا ہے کہ جو قانون کو توڑتے ہیں۔ ان کو آہستہ آہستہ شرفا کی حد میں لے آتا ہے۔ اور وہ نوعِ انسانی کو ایک مرکز پہ جمع کر دے گا۔ اسی لیے اس کے قوانین' اس کے اصول' عالمگیر ہیں۔ کسی ایک قوم کے لیے نہیں' کسی ایک نسل کے لیے نہیں۔ جَامِعُ النَّاسِ لِيَوْمٍ لَّا رَيْبَ فِيْهِ (3:9) یہ بڑی یقینی چیز ہے کہ یہ دور آنا ہے کہ جس میں کوئی شک وشبہ نہیں۔

قرآنِ حکیم کی وارث قوم کا فریضہ اور اس کے برعکس اس کی ذہنی پستی کی نوعیت

جیسا کہ میں بار بار عرض کیا کرتا ہوں کہ ہماری ایک بھول تو یہ ہے کہ ہم ہر اس قسم کی آیت جو قرآن میں آتی ہے اسے ہم مرنے کے بعد کی قیامت تک اٹھا رکھتے ہیں۔ اور پھر جیسا کہ میں بار بار دہرایا کرتا ہوں کہ مرنے کے بعد کی زندگی ہمارا جزوِ ایمان ہے۔ لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ ہر ایسی بات کو ہم وہاں پر اٹھا رکھیں۔ یہ ہم نے اس لیے وہاں پر اٹھا رکھی تھی کہ یہ اس کے لیے بڑا آسان طریقہ تھا کہ یہاں کچھ نہیں کرنا پڑتا۔ اس کے لیے اگر کہیں کہ یہاں یہ ہونا ہے تو اس کے لیے وہ قوم کہ جو اس کتاب کے وارث ہونے کی ذمہ دار بنتی ہے اس پہ بڑی ذمہ داریاں عائد ہو جاتی ہیں۔ یہ ان ذمہ داریوں سے گریز کی راہیں تراشنا ہے کہ ہم

ہر ایسے پروگرام کو کہ جس کے نتائج یہاں مرتب ہونے ہیں' ان کو قیامت پہ اٹھا رکھتے ہیں کہ وہ اللہ میاں خود مرتب کرتا چلا جائے گا۔478 آلِ عمران
۔جس نے الناس کے لیے کہا ہے کہ جَامِعُ النَّاسِ (3:9) وہ انسانیت کو نقطے پہ جمع کرتا ہے۔ وہ قوم جو اس کتاب کی وارث ہے اس کی اپنی کیفیت یہ ہے کہ کہنے کو بہتّر اور فی الحقیقت بہتّر ہزار فرقوں میں بٹی ہوئی ہے۔ میں نے یہ شاعری نہیں کی کہ جو بہتر ہزار کہا ہے بلکہ آپ ٹٹول کر دیکھیے گا کہ یہاں دو مسلمانوں کا جو اسلام ہے اس کا تصور ایک نہیں ہوتا۔ گروہ بندی اور بات ہے۔ ان گروہوں کے اندر بھی جو لوگ متصل ہیں ان کو بھی الگ بلا کر دیکھیے' اِن الگ الگ ذہنوں کے اندر خدا کا تصور ایک نہیں ہے۔ اس قوم کے اندر تفرقوں کی تو یہ کیفیت ہے کہ ان کے ہاں یہ نہیں بتا سکے کہ یہ لوگ مسلمان کسے کہتے ہیں۔ آپ کو معلوم ہے کہ منیر انکوائری کمیٹی کی رپوٹ چھپی ہوئی رکھی ہے۔ سارے ملک کے علمائے کرام سے یہ سوال ہو رہا تھا' جہلا سے نہیں وہ پوچھ رہے تھے' کہ مسلمان کسے کہتے ہیں؟ وہ رپورٹ اٹھا کر دیکھیے' متعدد تو وہ تھے کہ جنہوں نے جواب ہی نہیں دیا۔ کہنے لگے کہ صاحب! یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں' یہ کس قسم کا QUESTION آپ نے کر دیا۔ اس کے لیے تو ہمیں نوٹس ملنا چاہیے۔ یہ اس رپورٹ میں لکھا ہے۔ جنہوں نے جواب بیان کیا ہے تو ان میں سے کسی ایک کا جواب دوسرے کے ساتھ نہیں ملتا۔ اس سے بڑی قیامت بھی کسی قوم کی ہوگی کہ اس کے وہ لوگ جو عالم ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں وہ یہ نہ بتا سکیں کہ مسلمان کسے کہتے ہیں۔ اور جب یہ نہ بتا سکیں تو پھر تو سیدھی سی بات ہے' یہ کیا بتائیں گے کہ ''اسلام کسے کہتے ہیں''۔ اور یہی وجہ ہے کہ صبح سے شام تک جتنی بار اسلام اسلام کا نام دہرایا جاتا ہے' کم ہی کوئی اور لفظ ہوگا جو اتنا استعمال کیا جاتا ہو۔ اور اس کا مفہوم اتنا مبہم ہے کہ اس کا کوئی نظام ایسا نہیں' کوئی قانون ایسا نہیں' جسے آپ متفق علیہ کہہ سکیں۔

کائناتی قانون تو ہر آن اپنی رفتار سے اسی مرکزی نقطہ کی طرف رواں دواں ہے

میں کہہ یہ رہا تھا کہ جس قوم کے ذمے یہ تھا کہ وہ الناس کو ایک نقطے پر جمع کرتی' اس قوم کی اپنی حالت یہ ہے کہ ان میں کے دو فرد ایک نقطے کے اوپر جمع نہیں۔ لیکن سوال یہ نہیں کہ انہوں نے یہ کرنا ہے۔ اگر یہ کر دیتے تو یہ آسانی سے ہو جاتا اور انسانیت بہت سے نقصانات سے بچ جاتی۔ یہ نہیں کریں گے تو خدا کا کائناتی قانون اسے کرے گا۔ لیکن پھر وہ کائناتی قانون تو جھکڑ کی طرح آیا کرتا ہے' آندھی کی طرح آیا کرتا ہے۔ یہ ہو کر رہے گا اِنَّ اللّٰہَ لَا یُخۡلِفُ الۡمِیۡعَادَ (3:9)۔

معاشرتی طور پر باہمی سرکشی کی حقیقی وجہ

کیا کیا چیزیں اس کے راستے میں حائل ہوتی ہیں؟ اِنَّ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا لَنْ تُغْنِیَ عَنْهُمْ اَمْوَالُهُمْ وَ لَآ اَوْلَادُهُمْ مِّنَ اللّٰهِ 478 **آلِ عمران**
شَیْئًا((3:10 جو اس کی صداقت سے انکار کرے گا' جو اس کے راستے میں ٹھہرے گا' جو سرکشی برتے گا کہ انسانیت کو ایک نقطے کے اوپر جمع ہونا ہے۔ جو بھی اس راستے میں کھڑا ہوگا۔ کہا کہ وہ کیا جذبات ہیں کہ جن کی بنا پر وہ کھڑا ہوگا؟ اولاد۔ اولاد کے معنی صرف بیٹے بیٹیاں نہیں ہیں بلکہ یہ جو نسل پرستانہ گروہ بندی ہے یہ راستے میں ٹھہرتی ہے۔ اور دوسری جو بڑی چیز ہے وہ انفرادی مال کی ہوس انسانوں کو آپس میں ملنے نہیں دیتی۔ ہر شخص کی ذاتی جائیداد۔ باپ بیٹوں کو عاق کرتا ہے تو بیٹے باپ کو گولی مار دیتے ہیں۔ کبھی غریب آدمی کا بیٹا یہ نہیں کرتا۔ غریب باپ' بیٹے کے ساتھ یہ نہیں کرتا۔ ان میں بڑی محبت ہوتی ہے۔ یہ جو چیز بنیادی طور پہ ملنے نہیں دیتی' آپ اس کی تہ میں دیکھیے کہ قرآن کہتا کیا ہے۔ ایک تو گروہ بندی اولاد سے ہی شروع کر لیجیے۔ اپنی اولاد اور بھائی کی اولاد ''ایناں نوں تے شریکا کہندے نیں پنجابی اچ'' الفاظ کے معنی دیکھیے کیسے بدلتے ہیں۔ جنہوں نے ان کی محبت کے اندر ان کے خاندان میں شرکت کرنی تھی' اشتراک ہونا تھا' اس اشتراک کے لیے لفظ شریکا جو ہمارے ہاں USE ہوا ہے اس کے معنی سب سے بڑا دشمن ہوتا ہے یعنی ''او تے شریک ہو یا نا جی!'' (وہ تو شریک ہوا جی!)۔ اور پھر یہ شریک بھی اس قسم کا کہ ''اپنی بھاویں منہہ چلی جاوے شریک دا الکارا جیہڑا اے او چلا جاوے'' (اپنی خواہ بھینس چلی جائے لیکن اس شریک کا رسہ ضرور جائے)۔ الکارا کے معنی وہ رسہ جس میں بھینس باندھی ہوئی ہوتی ہے۔ اپنی خواہ بھینس چلی جائے لیکن وہ جو شریک ہے اس کا رسہ چلا جائے تو خوشی ہوتی ہے۔ شریک' شرکت' مشارکت' اشتراک' انگریزی میں کہوں گا تو کفر کا فتویٰ لگ جائے گا۔ اسے ہی تو SOCIAL کہتے ہیں' سوسائٹی بنتی اس سے ہیں۔

جہاں جگہ جگہ مساجد الگ الگ فرقوں کے نام پر تعمیر ہو رہی ہوں وہاں امتِ واحدہ کی عظیم سجدہ گاہ کا خواب کیسے پورا ہوگا؟

جہاں گھر کے افرادِ خاندان کی شراکت کو شریکا کہا جائے تو وہاں اس قسم کی سوسائٹی بنانے کو کفر کیوں نہ کہا جائے گا۔ ان کا تو ایمان ہی تفرقوں کے اوپر ہے' ان کی مسجدیں فرقوں کے اوپر ہیں۔ یہ قوم' انسانیت کو ایک نقطے پہ کیوں جمع کرے گی کہ جو نماز میں ایک نقطے پہ جمع نہیں ہو سکتی۔ عزیزانِ من! پبلک میٹنگ ہو رہی ہو اور اس کے اندر سارے ایک جگہ جمع ہوں تو کوئی تفرقہ نظر نہیں آتا۔ اذان ہوئی تو یہ جو سارے ایک جگہ بیٹھے ہوئے تھے' یہ سارے اٹھ کر ٹولوں میں بٹ گئے۔ کچھ اِس مسجد کی طرف' کچھ اُس

478 آلِ عمران

مسجد کی طرف‘ کوئی اِدھر کوئی اُدھر۔ اللہ نے انہیں خدا کے گھر میں جمع ہونے کے لیے بلایا تھا۔ یہاں بیٹھے ہوئے تھے تو عام انسان تھے۔ اب یہ متقی پرہیزگار بننے کے لیے اٹھے ہیں۔ سیکولرازم کی بنا پہ تو ایک مجمع میں اکٹھے ہیں اور یہ مذہب کی آواز کے اوپر یہی دس ٹولوں میں بٹ گئے ہیں۔ جس قرآن نے مدینے میں ایک مسجد کے اضافے کو کفر کہا تھا‘ ارشاد کیا کہ یہ خدا کے دشمنوں کے لیے کمیں گاہ ہے یہ مسجد نہیں ہے۔ کیوں؟ قرآن کہتا ہے کہ تَفْرِيقًا بَيْنَ الْمُؤْمِنِينَ (9:107) وہ مسجد جو مسلمانوں کو فرقوں میں بانٹ دے‘ تفریق کردے‘ کفر ہے۔ وہ مسجد نہیں وہ تو کمیں گاہ ہے‘ جس کے اندر دشمن چھپے بیٹھے ہوتے ہیں۔ یہ قوم انسانیت کو ایک نقطے کے اوپر جمع کرے گی! یہ تو ہوسکتا ہے کہ انسانیت فطرت کے قانون کے مطابق ان کو ایک نقطے پر لے آئے گی لیکن یہ خود نہیں اٹھیں گے۔

جہنم کے ایندھن کے متعلق علامہ اقبال کی تشویش

وَاُولٰٓئِكَ هُمْ وَقُوْدُ النَّارِ (3:10) کیا بات قرآن کہہ جاتا ہے! یہ لوگ جہنم کا ایندھن ہیں۔ یہ ایندھن والی بات بڑی اہم بات ہے اور غالباً اس سے پہلے بھی آچکی ہے۔ لیکن لفظ چونکہ اب آیا ہے تو پھر دہرا دوں۔ اقبالؒ نے اس کو اپنے بڑے حسین انداز میں بتایا ہے کہ یہ جو ایندھن ہے یہ بات کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ میں آسمان پر سیر کرنے کے لیے گیا‘ وہاں ایک گائیڈ فرشتہ ساتھ لے لیا‘ اُس نے سب کچھ وہاں دکھایا یعنی جنت اور حوریں اور عرش۔ اور یہ سارا کچھ جو کچھ بھی تھا میں دیکھتا چلا گیا‘ دیکھتا چلا گیا۔ اس نے کہا کہ اب واپس چلیے تو میرے ذہن میں یہ آیا کہ وہ جہنم تو میں نے دیکھا ہی نہیں۔ تو میں نے اسے کہا کہ بھئی! ایک جھلک ذرا اس جہنم کی بھی دکھلا دو۔ تو وہ کہنے لگے چلیے۔ میں ساتھ گیا تو بڑا اچنبا ہوا کہ اس کی لپٹ‘ اس کے شعلے‘ پتہ نہیں کہاں تک آئیں جیسے تندور میں سے بھڑکتے ہیں۔ وہ ساتھ لے گئے۔ وہاں جا کر اس نے کہا کہ یہ جہنم ہے۔ کہنے لگے میں نے دیکھا کہ بالکل یخ بستہ‘ ٹھنڈا‘ ایک تندور۔ میں نے کہا کہ اس کے متعلق تو ہم یہ سنتے آئے ہیں کہ یہاں بڑی آگ ہے‘ شعلے بھڑکتے ہیں اور تم یہ دکھا رہے ہو جو ٹھنڈا ہے تو اس کے شعلے کہاں ہیں؟ اس کی آگ کہاں ہے؟ اس نے کہا کہ یہ جہنم تو ٹھنڈا ہی ہے البتہ اہلِ دنیا یہاں جو آتے ہیں وہ اپنے اپنے انگار ساتھ لاتے ہیں۔ عزیزانِ من! بڑی عجیب چیز ہے کہ یہاں خدا نے کوئی آگ نہیں بھڑکا رکھی ہوئی بلکہ ہر آنے والا اپنے اعمال کے انگارے اپنے ساتھ لاتا ہے۔ جتنے اس میں داخل ہوتے جاتے ہیں انگارے بڑھتے چلے جاتے ہیں۔

عمل سے زندگی بنتی ہے جنت بھی جہنم بھی

یہ خا کی اپنی فطرت میں نہ نوری ہے نہ ناری ہے

جہنم کی آگ تو وہ آگ ہے جو جسموں کی بجائے دلوں کو لپیٹتی ہے

اہلِ دنیا جو یہاں آتے ہیں وہ اپنے انگار ساتھ لاتے ہیں۔عزیزانِ من! دیکھا وَقُوْدُ النَّارِ (3:10) کی بات کیسے سمجھ میں آئی یعنی جہنم کے ایندھن' اس کی آگ بھڑکانے والے۔اس کا کون سا منبع ہوتا ہے؟ یہ آگ کہاں سے بھڑکتی ہے؟ نَارُ اللّٰہِ الْمُوْقَدَۃُ الَّتِیْ تَطَّلِعُ عَلَی الْاَفْئِدَۃِ (104:6-7) خدا کی آگ جس کے شعلے دلوں کو لپیٹ لیتے ہیں۔جسموں کو جلانے والی بات نہیں' دلوں کو لپیٹے ہوئے ہوتے ہیں۔یہ جو چیزیں آپ کو ایک دوسرے کے پاس نہیں آنے دیتیں' یہ آپ کے سینے کے اندر نفرت کی' عداوت کی' بغض کی' کینے کی' آگ جل رہی ہوتی ہے۔ہم انتظار کر رہے ہیں کہ جہنم وہاں جا کر نظر آئے گا اقبالؒ کہتا ہے کہ

ہزار حیف نہ بینی قیامتِ موجود

جس قیامت میں ہر آن سانس لیتے ہو'اس کو نہیں دیکھتے۔انتظار کر رہے ہو۔اور جو انتظار کرتا جائے گا اس کی سمجھ میں بات نہیں آئے گی۔دیکھیے! یہ وَقُوْدُ النَّارِ (3:10) کہا ہے۔یہ جہنم کہاں ہے؟ کَدَاْبِ اٰلِ فِرْعَوْنَ لا وَ الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِھِمْ ((3:11 فرعون کی قوم کے انجام کی طرح' ان اقوام کے انجام کی طرح' کہ جنہوں نے ہمارے قوانین سے انکار کیا۔دیکھو! وہ یہیں اسی دنیا میں کس جہنم کے اندر جلے۔

فرعون کا سب سے بڑا جرم قوم کو گروہوں اور فرقوں میں تقسیم کرنا تھا

آپ نے دیکھا کہ قرآن نے کس طرح ساتھ ہی دوسری آیت میں معنی واضح کر دیے۔وَقُوْدُ النَّارِ (3:10) وہ نار کہاں ہے' وہ جہنم کہاں ہے؟ یہیں سے جنت اور جہنم شروع ہوجاتی ہے۔عزیزانِ من! زندگی تو ایک مسلسل ندی کا نام ہے اس کے ٹکڑے نہیں کیے جاسکتے' حصے بخرے نہیں کیے جاسکتے۔کَدَاْبِ اٰلِ فِرْعَوْنَ لا وَ الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِھِمْ((3:11 اقوام سابقہ کی تاریخ پر نگاہ ڈالو تو تمہیں پتہ چل جائے گا کہ جنہوں نے انسانیت میں تفرقے کرنے شروع کیے'ان کا انجام کیا ہوا۔قرآنِ کریم نے فرعون کا سب سے بڑا جرم یہ گنایا ہے کہ اِنَّ فِرْعَوْنَ عَلَا فِی الْاَرْضِ ((28:4 فرعون کا تو لفظ ہی ایک سرکشی اور بغاوت اور علو اور تکبر کی علامت بن چکا ہے۔عَلَا فِی الْاَرْضِ (28:4) اس نے بڑی سرکشی اختیار کی تھی۔اس نے وہ اتنا بڑا جرمِ عظیم کیا کیا تھا؟

عزیزانِ 478 آلِ عمران اللہ اکبر! پارٹیز میں تقسیم کر دیا تھا۔ **وَ جَعَلَ اَهْلَهَا شِيَعًا** (28:4) اس نے وہاں کی آبادی کو گروہوں میں، انسانیت میں تفریق پیدا کرنے سے بڑا جرم اور کیا ہوسکتا ہے۔ سب سے بڑے مفسدین کے متعلق سورۃ بقرہ میں یہی ہے کہ **وَ يَقْطَعُوْنَ مَآ اَمَرَ اللّٰهُ بِهٖٓ اَنْ يُّوْصَلَ** (2:27) جنہیں ملانے کا خدا نے حکم دیا تھا ان کو وہ ٹکڑے ٹکڑے کرتے ہیں۔ فرعون کا سب سے بڑا جرم یہ تھا **وَ جَعَلَ اَهْلَهَا شِيَعًا يَّسْتَضْعِفُ طَآئِفَةً مِّنْهُمْ** (28:4)۔ پھر یہ کیا کرتا رہتا ہے؟ کبھی ایک پارٹی کو کمزور کرتا ہے اور دوسری کو اوپر چڑھا دیتا ہے، پھر دوسری کو کمزور کرتا ہے پہلی کو اوپر چڑھا دیتا ہے۔ سیاستِ فرعونی کیا ہے، یہ کیسے ہوتا ہے؟ پارٹیاں کس طرح سے اوپر چڑھاتا یا نیچے گراتا ہے؟ اس کا کیا طریقہ ہے؟ وہ سیدھا سا ہے **يُذَبِّحُ اَبْنَآءَهُمْ وَ يَسْتَحْيٖ نِسَآءَهُمْ** (28:4) جسے نیچے گرانا ہوتا ہے وہ اس کے جو ابنائے قوم ہوتے ہیں جن میں ذرا ابھرنے کی وہ صلاحیت دیکھتا ہے، جن میں خودداریاں دیکھتا ہے، جن میں شرافتیں دیانتیں دیکھتا ہے، ان کو ذبح کر کے رکھ دیتا ہے۔ ان کی قوم کے جو زنخے ہوتے ہیں ان کو ابھار کر اوپر لے آتا ہے۔ قرآن نے کہا کہ فرعون یہ کرتا ہے۔ جاؤ اس کی طرف اس نے تباہی مچا رکھی ہے۔ ایک چھوڑ، دو دو پیغمبر اس کے لیے بھیجنے پڑے۔ کہا کہ انسانوں کے اندر تفریق پیدا کرتا ہے۔ **كَدَاْبِ اٰلِ فِرْعَوْنَ ۙ وَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ؕ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا ۚ** (3:11) انہوں نے اس بات کو جھٹلایا کہ انسانیت ایک ہے اور گروہ بندیاں نہیں ہونی چاہئیں۔ **فَاَخَذَهُمُ اللّٰهُ بِذُنُوْبِهِمْ ؕ** (3:11) خدا نے ان کو پکڑ لیا۔ وہ یونہی نہیں پکڑتا۔

ذنب، قرآنِ کریم کی ایک بڑی جامع اصطلاح ہے جس کے معنی گناہ نہیں بلکہ عواقب ہے

بِذُنُوْبِهِمْ (3:11): میں نے عرض کیا تھا کہ قرآنِ کریم میں یہ جو مختلف الفاظ آئے ہیں ان کا ترجمہ تو ہم گناہ کر دیتے ہیں۔ اور پھر گناہ کا تصور ہمارے ہاں جرم سے الگ ہے۔ جیسا میں نے کئی دفعہ دہرایا ہے کہ یہ بڑے فخر سے کہتے ہیں کہ بڑا گناہگار بندہ، عاصی پُر معاصی ہے۔ اس کا ترجمہ جرم ہے۔ عاصی پُر معاصی جرائم پیشہ کو کہتے ہیں۔ یہ جو بڑے فخر سے اپنے نام کے نیچے لکھا کرتے ہیں ان سے کہیے کہ صاحب! اپنی زبان میں بات کیجیے۔ سارا خط جو اردو میں لکھا ہے اس کے نیچے لکھیے کہ عبدالرحمن یا جو کچھ بھی ہے بجائے اس کے کہ وہاں مذنب لکھیں یا عاصی لکھیں عبدالرحمن لکھیے یا جرائم پیشہ لکھیے پھر دیکھیے آپ کس کیٹگری میں آتے ہیں۔ آپ نے دیکھا کہ انسان حقائق کی طرف سے کیسے آنکھیں بند کرتا ہے۔

قرآنِ حکیم کے ساتھ سب سے بڑی سازش یہ ہوئی کہ الفاظ کے حقیقی مفہوم کو بدل دیا گیا

تو میں نے کہا تھا کہ ان الفاظ کا ترجمہ ہم نے گناہ کیا۔ گناہ کہنے سے دل کے اوپر وہ اثر نہیں ہوتا جو جرم کہنے سے ہوتا ہے 478 **آلِ عمران**
عزیزانِ من! یہ الفاظ کا بدل دینا بڑی گہری نفسیاتی چیز ہوتی ہے۔ اور سارا پھیر ہی یہ ہے کہ الفاظ کو بدل دیجیے۔ عبادت کے معنی پرستش کر دیجیے معاملہ ختم۔ دو رکعت نماز فرض قصہ ختم۔ عبادت کے معنی قانون کی اطاعت کیجیے پھر دیکھیے کتنی ذمہ داریاں آتی ہیں۔ الفاظ یوں بدلے جاتے ہیں۔ بِذُنُوْبِهِمْ (3:11): یاد رکھیے! ذنب' عصیان' عدوان' اثم' جرم' کے الفاظ الگ الگ معنی لیے ہوئے ہیں۔ لیکن ان میں ذنب ایک جامع چیز ہے۔ بڑی عجیب چیز ہے۔ وہ چیز جو کسی کے پیچھے ایسے چپکی ہوئی ہو کہ وہ جہاں جائے وہ پیچھے ساتھ لگی ہوئی جائے۔ یہ جانور کی دم کو کہتے ہیں۔ ہر عمل جو آپ سے سرزد ہو اس کا نتیجہ آپ کے پیچھے چپکا ہوا ہے۔ جایئے کہاں جاتے ہیں۔ وہ دم پیچھا ہی نہیں چھوڑتی۔ کیا بات ہے قرآن کی! یہاں خاص لفظ کوئی عصیان' عدوان' اثم نہیں لایا۔ جامع چیز کہنی تھی اس لیے کہ انہوں نے مختلف نوعیت کے جرائم کیے تھے' ان کے انجام مختلف شکلوں میں سامنے آئے تھے۔ تو ایک بات نہیں کہی بلکہ اس نے بِذُنُوْبِهِمْ وَاللّٰهُ شَدِيْدُ الْعِقَابِ (3:11) یہاں کہا ہے یعنی ہر وہ قانون شکنی کا جرم جس کا نتیجہ یوں پیچھے لگا ہوا تھا جیسے جانور کے پیچھے دم لگی ہوئی ہوتی ہے۔ صاحب! جہاں جائے ساتھ چپکی ہوئی ہے۔ اور نتیجہ تو ہمیشہ عمل کے بعد آتا ہے۔ پہلے عمل ہوتا ہے اس کے پیچھے اس کا نتیجہ ہوتا ہے۔ یاد رکھیے! ایسے ہوتا ہے جیسے دم چمٹی ہوئی ہوتی ہے۔ اس طرح سے جو ایسے اعمال کے عواقب ہیں ان کے لیے ذنوب کا لفظ آتا ہے۔ اس میں وہ مختلف قسم کی تہمتیں' جھوٹے الزامات بھی شامل ہو جاتی ہیں جو دوسروں نے کسی کے ساتھ چپکائی ہوئی ہوں۔ وہ جو نبی اکرم ﷺ کے متعلق سورۃ فتح میں آتا ہے کہ لِيَغْفِرَ لَكَ اللّٰهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْۢبِكَ وَمَا تَاَخَّرَ (48:2) اس آیت کے معنوں کے اندر بھی پھر وہ ان کے ہاں پھیر پڑا اور ذنب کے معنی انہوں نے گناہ کیا۔ وہاں پھر یہ بات اٹھی کہ کیا پھر خدا رسول سے یہ کہتا ہے کہ تیرے اگلے اور پچھلے گناہوں کو معاف کر دے گا۔ رسول کے متعلق یہ عقیدہ بھی کہ وہ معصوم ہوتا ہے اور اس کے بعد پھر اس آیت کے معنی یہ کرنا کہ اگلے اور پچھلے گناہ خدا معاف کر دے گا!!! تو وہ یہ چیز ہے کہ معنی کے اندر ہم جاتے نہیں۔ اس آیت کے یہ معنی ہیں کہ ''ان دشمنوں نے جو آج تک تیرے خلاف اتہامات باندھے ہوئے ہیں' غلط الزامات لگائے ہوئے ہیں' بے حد برا پروپیگنڈہ کیا ہوا ہے' تمہیں اس سے حفاظت کا سامان مل جائے گا''۔ اور آپ جانتے ہیں اور آج تو ہم ان چیزوں کو سمجھ سکتے ہیں کہ یہ جو غلط پروپیگنڈہ ہے' یہ ایک شریف آدمی کا کیا حلیہ بگاڑتا ہے' وہ انسان چیخ اٹھتا ہے۔ کہا کہ یہ جو تمہیں مکے کی فتحِ عظیم حاصل ہو رہی ہے اس کا ایک نتیجہ یہ ہوگا کہ یہ اس قسم کے جھوٹے الزامات جو تیرے خلاف لگا کر انہوں نے اتنا پروپیگنڈہ کر رکھا تھا اس سے تمہیں حفاظت کا سامان مل جائے گا۔

جنت اور جہنم کی زندگی تو اسی زندگی سے شروع ہوجاتا ہے

478آلِ عمران

عزیزانِ من! گناہوں کی بخشش کا سوال نہیں تھا۔ گناہ کا لفظ ہی وہاں نہیں ہے۔ بات جب آئے گی تو میں پھر تفصیل سے عرض کروں گا۔ یہاں اس کے معنی ''عواقب'' ہیں۔ کَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا (3:11) تکذیبِ آیات کے جو نتائج اور عواقب ہیں انہوں نے ان کو پکڑا اور اس طرح سے انہوں نے اپنی آگ بھڑکائی جس میں خود جل کر بھسم ہو گئے۔ قُلْ لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوْا سَتُغْلَبُوْنَ وَ تُحْشَرُوْنَ اِلٰى جَهَنَّمَ ؕ وَ بِئْسَ الْمِهَادُ (3:12) ہاں! یہ جو تمہارے مخاطب اس قدر مخالفت کرنے والے سرکشی برتنے والے ہیں۔ کفر کے معنی صرف انکار کرنا ہی نہیں ہوتا بلکہ سرکشی برتنا بھی ہوتا ہے' مخالفت کرنا بھی ہوتا ہے۔ ان سے کہہ دو کہ اپنی قوت پہ اتنے نازاں نہ ہوں' اپنی دولت کے نشے میں بدمست نہ ہوں۔ آخر الامر فیصلہ اس طرح سے ہوتا ہے کہ کون سی جماعت خدا کے قوانین کے مطابق چل رہی ہے۔ زیادہ وقت نہیں لگے گا سَتُغْلَبُوْنَ (3:12) بہت جلدی تم دیکھو گے کہ کس طرح سے تم مغلوب ہوتے ہو۔ اور اس مغلوب ہونے کے بعد کہا کہ پھر تم کس طرح جہنم کے کنارے اکٹھے کیے جاتے ہو۔ یہ جو عربی زبان کا س ہے اس کے معنی ہیں کہ ''عنقریب یہ بات ہوجائے گی''۔ تو پھر یہ جہنم کے کنارے پہ اس کے گرد کھڑا ہونا ہے۔ وہ اس دنیا کا جہنم ہے' ذلت و خواریوں کا جہنم کہ جس میں یہ شکست کھائیں گے۔ جیسے بدر کے میدان میں' حنین اور احد کے میدانوں کے اندر یہ جو اتنے اتنے بڑے سرکش قریش تھے كَدَاْبِ اٰلِ فِرْعَوْنَ (3:12) ان بڑی بڑی قوموں کی طرح قوت والے۔ یہ اس طرح سے مغلوب ہوتے تھے۔ یہ ہے وہ جہنم جہاں وہ لا کر کھڑے کیے جاتے ہیں۔ وَ بِئْسَ الْمِهَادُ (3:12) پھر وہ رہنے کی' ٹھہرنے کی اتنی بری جگہ ہے۔ اب یہ جو میں نے عرض کیا ہے کہ سَتُغْلَبُوْنَ (3:12) کہا' تُحْشَرُوْنَ (3:12) کہا کہ یہ تو اسی دنیا کے اندر ان کی مغلوبیت تھی یہیں ان کا ذلیل و خوار ہونا تھا۔ اگلی ہی آیت میں بات واضح کردی کہ قَدْ كَانَ لَكُمْ اٰيَةٌ فِيْ فِئَتَيْنِ الْتَقَتَا (3:13) کل ہی بدر کے میدان میں جو جماعتیں آمنے سامنے ہوئی تھیں۔ کیا اس سے یہ بات واضح نہیں ہوگئی کہ خدا کے قوانین کی تکذیب کرنے والی جماعت کتنی بڑی کثرت کے باوجود' اتنی بڑی قوت کی فراوانیوں کے باوجود' ساز و سامان کی زیادتی کے باوجود' کس طرح سے ذلت آمیز شکست کے عذاب میں ماخوذ ہوئی تھی۔ کل ہی بدر کے میدان میں تم نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا تھا کہ کس طرح سے ہوتا ہے۔ عزیزانِ من! دیکھا! یہ جہنم یہاں کا جہنم ہے یہیں اس کے کنارے پہنچانے والی بات ہے۔ اگلی آیت میں ہی یہ بات واضح کردی ہے۔ کہا کہ فِئَتَيْنِ الْتَقَتَا (3:13) دو گروہ فِئَةٌ تُقَاتِلُ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ (3:13) ایک گروہ جو اللہ کی راہ میں جنگ کے لیے نکلا ہے۔ قریب قریب ہر درس میں یہ اصطلاح ''فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ (3:13) یعنی اللہ کے راستے میں'' آئے

گی اور آتی چلی آ رہی ہے۔

لفظ فی سبیل اللہ کا لغوی اور قرآنی مفہوم ہی یہ ہے کہ انسان خالصتاً انسانیت کی بہبود کے لیے عمل پیرا ہو

فی سبیل اللہ کا تو مفہوم ہمارے سامنے نہیں آتا۔ یہ خالی سبیل جو ہے وہ تو ہمیں پتہ ہے۔ وہ آگے چل کر سردی میں جب ٹھٹھرتی ہے تو ''چھبیل ہو جاندی اے فیراو''۔ قرآن میں آپ دیکھیے گا کہ مختلف مقامات پر یہ چیز آئی ہے کہ یہ جو فی سبیل اللہ جنگ کرتے ہیں۔ مدینے آ جانے والوں سے یہ کہا کہ مکے میں جو مسلمان رہ گئے ہیں' جنہیں وہاں اس قدر ستایا جا رہا ہے۔ تم سنتے نہیں ہو کہ وہ کس طرح سے دردانگیزی کی فریاد کر رہے ہیں کہ اے ہمارے نشوونما دینے والے! اے ہمارے رب! ہمیں اس بستی سے نکال جہاں کے رہنے والوں نے ظلم پر کمر باندھ رکھی ہے۔ اے ہمارے نشوونما دینے والے! اپنی طرف سے کوئی ہمارا حامی بھیج اپنی طرف سے کوئی ہمارا مددگار بھیج۔ یہ کہہ کر کہا کہ تم ان کی پکار نہیں سنتے ہو! حالانکہ وہ رَبَّنَا کہہ رہے ہیں۔ انہیں چاہیے تھا کہ کہہ دیتے کہ سرکار! وہ تو آپ کو بلا رہے ہیں ''تے تسی ساہڈے گل مُڈدے پئے ہو''۔ رَبَّنَا کہہ رہے ہیں اسے پکار رہے ہیں۔ رب ان سے کہہ رہا ہے کہ تم سن نہیں رہے کہ وہ ہمیں کس طرح سے دردانگیزی سے پکار رہے ہیں۔ تم فی سبیل اللہ جنگ کرنے کے لیے کیوں نہیں اٹھتے۔ اپنے مفادات کے لیے تو ہر ایک جنگ کرنے کے لیے اٹھتا ہے' اپنی قوم کے لیے ہر ایک جنگ کرنے کے لیے اٹھے گا' اپنے گروہ کے لیے بھی ہر ایک جنگ کرنے کے لیے اٹھے گا۔ مظلوم کی فریاد کے لیے سینہ سپر ہو کر کھڑے ہو جانا اور دشمن کی گولی اپنے سینے میں لے لینا اور اُسے محفوظ کر دینا یہ فی سبیل اللہ جنگ ہے۔ عزیزانِ من! دیکھتے ہیں اللہ کی راہ کے معنی کیا ہوتے ہیں۔ قرآن تو اس معاملے میں یہاں تک لے گیا ہے۔ آپ دیکھیں قرآن اصلاح کی طرف قدم کس طرح اٹھا رہا ہے۔ عربوں کے ہاں جنگ کا جذبۂ محرکہ مالِ غنیمت ہوتا تھا۔ ان کے ہاں کا رواج یہ تھا کہ میدانِ جنگ میں جو قوم غالب آئے پھر سپاہی جو لوٹ لیں وہ ان کا ہوتا تھا۔ حتٰی کہ انفرادی طور پہ جو کوئی لوٹ لے یعنی دشمن کے قیدی بھی ان کے غلام' ان کی عورتیں ان کی لونڈیاں۔ یہ لوٹ کا جذبہ تھا کہ جوان کو جنگ کے اوپر آمادہ کرتا تھا۔ جس نظام میں جنگ خدا کی راہ میں لڑنے کے لیے کہا ہو اس میں لوٹ کا جذبۂ محرکہ تو رہ ہی نہیں سکتا۔ آپ نے دیکھا کہ جو سورۃ توبہ' سورۃ انفال میں کہا ہے کہ یاد رکھو! مالِ غنیمت اللہ اور رسول کے لیے۔ انفرادی لوٹ ختم کی۔ عربوں کے ہاں جنگ کا ایک ہی جذبۂ محرکہ تھا یعنی غنیمت کا مال۔ جب یہ کہہ دیا کہ غنیمت کا مال تمہارا نہیں ہے وہ بھی تمہاری اجتماعی ملکیت ہے تو پھر انفرادی جذبہ تو کوئی بھی باقی نہ رہا۔ اور عزیزانِ من! جن کے دلوں سے یہ جذبے نکالے تو سات سال کے عرصہ میں کم از کم بیاسی جنگ اور چھوٹے چھوٹے سَریّے جو رسول اللہ ﷺ کی زندگی میں تھے تو

اس قوم نے یہ کیے۔ کس جذبے کے ماتحت یہ کیے تھے؟ جو آخری جذبہ ان کے ہاں غنیمت کا موجود تھا' وہ بھی نکال دیا گیا تھا۔
پھر یہ کون سا جذبہ تھا جس کے لیے یہ اس طرح سے مصروفِ جہاد رہتے تھے؟ یہ کہ مظلوم کی آواز جہاں سے آتی ہے' اس کے لیے
یہ جانیں دینے کے لیے اٹھ کھڑے ہوتے تھے۔ وہ سورۃ حج کی آیت کہ تمہیں جنگ کی اجازت دی جاتی ہے۔ اگر ہم سرکش
انسانوں کی دوسرے انسانوں کے ہاتھوں سے مدافعت نہ کریں تو یہودیوں کے صومعے' عیسائیوں کے گرجے' راہبوں کی
کوٹھڑیاں' ان میں سے کوئی دنیا میں باقی نہ رہے (22:40)۔ عزیزانِ من! غیر مسلموں کے معابد کو بچانے کے لیے جنگ بھی فی
سبیل اللہ جنگ ہے۔ عزیزانِ من! مظلوم کی آواز جہاں سے بھی آئے۔ تو آواز نہ مومن ہوتی ہے نہ کافر ہوتی ہے۔ آواز تو
صرف آواز ہوتی ہے۔ ظالم کی للکار ہوتی ہے' مظلوم کی پکار ہوتی ہے۔ مظلوم کی آواز کے اوپر اٹھنا' بلا امتیاز اس امر کے کہ
پکارنے والا مظلوم مومن ہے یا کافر' اپنوں میں سے ہے یا دوسروں میں سے ہے۔ اپنوں کے لیے تو ہر ایک اٹھتا ہے۔ تو جو کام
انسانیت کے مفاد کے لیے کیا جائے اسے قرآن کی اصطلاح میں فی سبیل اللہ کہتے ہیں۔ کہا یہ کہ ایک گروہ ان میں سے فی سبیل اللہ
لڑنے کے لیے اٹھا تھا۔ وَ اُخۡرٰی کَافِرَۃٌ (3:13) جامع چیز ہے' دوسرا گروہ یہ تھا جو اس تصور سے انکار کرتا تھا۔ کہتا تھا کہ واہ!
دوسروں کی خاطر اٹھ کر جنگ لڑنا عقل مندی تو نہیں ہے۔ آج بھی یہ کہتے ہیں کہ صاحب! دوسروں کی آگ کے اندر کودنا کون سی
عقل مندی ہے۔ لہٰذا یہ عقل مندی تو نہیں ہے بلکہ عقل مندی تو یہ ہے کہ دوسروں کو اپنی آگ میں جھونک دو۔ جی! یعنی اب ان
الفاظ کے لیے نئی ڈکشنریاں بننی چاہئیں۔ وَ اُخۡرٰی کَافِرَۃٌ (3:13) یہاں عجیب چیز قرآن نے کہی ہے۔

قرآنِ حکیم میدانِ جنگ میں قوتِ ارادی کی بجائے تیغ وتفنگ کو اہمیت نہیں دیتا

آگے چل کر سورۃ انفال میں جنگِ بدر کی تفاصیل آئیں گی۔ ''ہم باطل کے نظام کے اوپر غالب آئیں گے'' اس یقینِ محکم کا
نتیجہ یہ تھا کہ تعداد کے اعتبار سے کفار تین گنا تھے لیکن مومنین انہیں اپنے سے دوگنا سے زیادہ دیکھتے ہی نہیں تھے۔ کیا بات ہے
صاحب! یقینِ محکم۔ یَرَوۡنَهُمۡ مِّثۡلَيۡهِمۡ رَاۡیَ الۡعَيۡنِ (3:13) یہاں دیکھیے قرآن کیا کہتا ہے کہ سامنے کھڑے ہیں' گن سکتے
ہیں' ہزار ہوتا ہی کتنا ہے۔ وہ لشکر آ رہا تھا۔ ان کو معلوم تھا کہ کتنے آ رہے ہیں۔ یہ سب کچھ تھا لیکن وہ یقینِ محکم کہ ہم ان پر غالب آ
کر رہیں گے یہ یقین ان کی آنکھوں میں انہیں دوگنے سے زیادہ دکھا ہی نہیں رہا تھا۔ برادرانِ عزیز! یوں نگاہ کا فرق پڑ جاتا ہے۔
یہ جو ہے کہ تمہیں دوگنوں پہ کامیابی ہوجائے گی یہ سورۃ انفال (8:44) میں ہے۔ یہاں یہ چیز ہے کم دکھائی دینے لگے۔ وہاں
(8:44) میں قرآن نے کم دکھائی دینے والوں کی دونوعیتیں بیان کی ہیں۔ اور قرآن بڑی گہرائیوں میں جاتا ہے۔ کہتا ہے کہ ایک

تو اس یقینِ محکم کے مطابق کہ یہ کفار باطل کے نظام کے لیے اٹھے ہیں' انسانیت کی تخریب اور تباہی کے لیے کھڑے ہوئے ہیں جبکہ ہم حق کو لے کر کھڑے ہیں' اپنی خاطر نہیں لڑ رہے انسانیت کی خاطر لڑ رہے ہیں۔اس سے یہ جذبہ پیدا ہوتا ہے کہ جتنوں پر کامیابی حاصل ہونے کا یقین ہوتا ہے دشمن اس سے زیادہ نظر ہی نہیں آتا' اس سے حوصلے بڑھتے ہیں۔ وہ کہتا ہے کہ اس کے مقابلے میں وہ قریش تھے کہ انہیں یہ مومنین کم نظر آتے تھے۔ یہ تو کم ہی تھے لیکن اُن کے متعلق کہا ہے کہ نخوت اور تکبر اتنا تھا کہ وہ کہتے تھے کہ ہیں! یہ ہیں کیا۔قرآن کہتا ہے کہ نگاہ کا یہ فرق تھا کہ جب اس نگاہ سے آپ دشمن کے متعلق کہیں گے کہ ہیں! یہ ہیں کیا' مار مار کے ان کا بھرکس نکال دیا جائے گا' ہمارے پاس اتنا اسلحہ' ہمارے پاس اتنی قوتیں' اتنا ہمارا جتھہ۔ کہنے لگا کہ یہ چیز وجۂ شکست ہو جایا کرتی ہے۔لیکن یہ چیز کہ ہم حق پر ہیں اس لیے کوئی بات نہیں ہے کہ اگر وہ زیادہ ہیں۔ہم ان پہ ضرور غالب آ کر رہیں گے۔آپ دیکھیے کہ نگاہ کا جو فرق ہے وہ نتائج میں کیسے فرق پیدا کر دیتا ہے۔((8:44 میں یہ چیز کہی۔

لفظ مَنۡ یَّشَآءُ (3:13) کے حقیقی مفہوم کے بالمقابل ہماری فریب کاری کا عکس

یہاں کہا ہے کہ وَ اللّٰہُ یُؤَیِّدُ بِنَصۡرِہٖ مَنۡ یَّشَآءُ ((3:13 یہاں وہی چیز آ گئی کہ اس میں تو خدا کی نصرت شامل ہے۔اور مَنۡ یَّشَآءُ (3:13) کے وہی معنی جو میں نے کہا ہوا ہے کہ آپ نے جب بھی ذمہ داریوں سے گریز کیا اور مَنۡ یَّشَآءُ (3:13) کے معنی کیے کہ ''خدا جسے چاہتا ہے دے دیتا ہے'' تو شکست کھائی۔بھئی! کیوں جم کر کیوں نہیں لڑے؟ صاحب! اللہ نے کہا تھا کہ ہم اپنی نصرت جسے چاہتے ہیں دیتے ہیں' جسے چاہتے ہیں نہیں دیتے' اس نے نصرت نہیں دی اس لیے شکست ہو گئی۔ شکست بھی اپنا قصور نہیں۔اور اس کے لیے یہ ایک بڑی گہری سی بات ہے کہ اس مقام کے اوپر جا کر احساسِ ذمہ داری نہ ہو۔غور سے سننے کے قابل ہے۔اس کا غلط مفہوم نہ لیا جائے۔آگے چل کر یہ چیز کہ ایسے وقت میں ہم پر ذمہ داری نہ آ کر پڑے کہ شکست کیوں ہوئی تو اس کے لیے ایک بڑا معصوم سا' ایک بڑا مقدس سا حربہ ہوتا ہے کہ صاحب! یہ جو ہمیں کامیابی بھی ہوئی ہے تو صاحب! ہم نے تو اس میں کچھ نہیں کیا' خدا کا فضل تھا جس کی وجہ سے یہ ہو گیا۔آپ دیکھیں گے کہ بظاہر یہ بات بڑی VIRTUOUS سی نظر آتی ہے کہ ٹھیک ہے صاحب! اپنے لیے یہ چیز نہیں کہہ رہے ہیں بلکہ کہہ رہے ہیں کہ جو کچھ بھی ہوا خدا کے فضل سے ہوا۔ یہ اس لیے کہ کل کو جب شکست ہوتی ہے تو اس وقت یہ کہا جائے کہ یہ بھی خدا کی طرف سے ہوا ہے۔''اے اوس ویلھے واسطے رکھیا ہو یا اے ہتھیار'' کہ اس وقت تو پوچھا جائے گا۔ برادرانِ عزیز! عقلِ فریب کار کے بڑے دوررس نتائج ہوتے ہیں یہ دامِ ہم رنگِ زمیں ہوتا ہے۔آپ دیکھیے گا اس کے اندر کتنا تقویٰ اور نیکی

جھلکتی ہے کہ دیکھیے صاحب! اپنی فتح کا کریڈٹ ہی نہیں لیتے۔

محاذِ جنگ کے جانثاروں کے متعلق ہماری کوتاہ نظری کے افسانے

عزیزانِ من! یہ چیز تھی جو میں نے 65ء کی جنگ کے بعد کہی۔ اور مجھے پتہ ہے کہ بیگانے تو ایک طرف اپنے بھی جو نادان دوست تھے انہوں نے بھی مجھ سے یہ کہا کہ کیا کہہ رہے ہو۔ میں نے محاذِ جنگ کے اوپر ان زیارت گاہوں کی پھر خود جا کر زیارت کی۔ اور وہ آپ کی ایسی زیارت گاہیں ہیں کہ اس اہلِ پاکستان کے لیے کم از کم ہمیشہ ہمیشہ کے لیے مقدس زیارت گاہیں ہیں۔ ان خاک کے ذروں کی زیارتیں کیجیے جہاں یہ اللہ کی راہ میں لڑنے والے اٹھے تھے۔ وہاں میں نے جا کر دیکھا ہے کہ یہ خیال پھیلایا جا رہا تھا جو بظاہر' بڑا معصوم' بڑا مقدس' بڑا نیک' اس میں کوئی چیز قابلِ اعتراض نظر نہیں آتی تھی' کہ صاحب! یہ ہم نے تو کچھ نہیں کیا۔ آگے بڑھے تو وہی سفید گھوڑیوں والے' سبز عماموں والے افسانے آ گئے۔ یعنی ان جاں نثاروں نے' ان مجاہدین نے' جو اتنی تھوڑی تعداد کے باوجود اتنے بڑے دیوہیکل بھارت کے سامنے یوں جا کر کھڑے ہو گئے کہ سترہ دن تک انہوں نے دن رات ایک کر کے اس کو فتح کیا۔ کہا یہ کہ صاحب! اس کا تمہیں کریڈٹ حاصل ہی نہیں۔ کسی نے یہ افسانے گھڑے' کسی نے ایک جملہ بول دیا کہ یہ تو سارا خدا کے فضل سے ہوتا ہے۔ میں نے دیکھا ہے کہ خود ان جوانوں کے دلوں کے اندر یہ خیال راسخ ہو گیا کہ ہم نے یہ کچھ نہیں کیا۔ آپ دیکھیے گا کہ اس کا نتیجہ آخر کہاں جا کر نکلنا تھا۔ یہاں اگر خدانکردہ کسی مقام پہ شکست ہوئی تو وہی سپر جو یہاں ان کے لیے کام آ جائے گی۔ میں نے کہا کہ یہ سب ترجمہ غلط ہے کہ ''جس کو وہ چاہتا ہے اپنی نصرت دیتا ہے''۔ یہ جو قرآن نے کہا ہے کہ يُؤَيِّدُ بِنَصْرِهٖ مَنْ يَّشَآءُ (3:13) اس کا ترجمہ یہ ہے کہ ''جو اس کی مدد لینا چاہتا ہے وہ اس کو مدد اپنی دیتا ہے''۔ عزیزانِ من! یہ میرا ترجمہ نہیں ہے۔ اپنا ترجمہ کرنا تو قرآن کی رو سے شرک ہے۔ یہاں جو سورۃ انفال ہی کی آیت ''اپنے سے دوگنوں کے اوپر کامیابی کی'' اتفاق سے آیت سامنے آ گئی۔ کہا کہ ہم نے تمہیں وعدہ دے رکھا تھا تمہارا یقینِ محکم تھا کہ وہاں تگنے کو بھی دوگنے ہی دیکھ رہا تھا اور پھر وَ اللّٰهُ يُؤَيِّدُ بِنَصْرِهٖ مَنْ يَّشَآءُ (3:13) اب دیکھیے کہ نصرتِ خداوندی کن کو ملتی ہے! اور مَنْ يَّشَآءُ (3:13) کے معنی واضح ہو جاتے ہیں۔ سورۃ انفال کی آیت (8:45) سامنے لے آیے۔ (8:44) میں وہ بات ہے جس میں کہا ہے کہ تمہیں دوگنے دکھائی دیتے تھے اس سے زیادہ نہیں۔ تم یوں وہاں غالب اور منصور اور فاتح ہوئے۔ کہا کہ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اِذَا لَقِيْتُمْ فِئَةً (8:45) اے ایمان والو! جب دشمن کے مقابلے میں آؤ۔ دیکھیے! خدا کی نصرت کس طرح مل رہی ہے۔ جب دشمن کے مقابلے میں آؤ تو فَاثْبُتُوْا (8:45) جم کر کھڑے ہو جاؤ' استقامت سے کھڑے ہو جاؤ' تمہارے

پاؤں کے اندر ثبات ہونا چاہیے۔ دیکھ رہے ہیں کس کو نصرتِ خداوندی مل رہی ہے۔ وہ تو خود اپنی آیتوں کا ترجمہ کرتا ہے' خود اِن کا **آلِ عمران** 478 مفہوم دے رہا ہے۔

65 میں میدانِ جنگ میں فتح کا بگل مایہ ناز مجاہدین کی ثابت قدمی اور بلند کرداری کا ثمر تھی

ایک بات فَاثْبُتُوْا (8:45) اور دوسری بات وَ اذْكُرُوا اللّٰهَ كَثِيْرًا (8:45)۔ میں نے بتایا ہوا ہے کہ اب ہمارے ہاں جو ذکر آ گیا وہ تو آپ کو پتہ ہے کہ جنگ وہاں ہو رہی ہے اور ذکر حجرے کے اندر ہو رہا ہے۔ یہ بات نہیں ہے۔ ذکر کے تو معنی یہ ہیں کہ قانون اور قاعدے کو ہر وقت سامنے رکھنا۔ ذکر کے معنی ہیں کہ کسی چیز کو ہر وقت پیشِ نظر رکھنا' میدانِ جنگ میں بھی اوجھل نہ ہونے دو۔ یہ سب غلط ہے کہ EVERY THING IS FAIR IN LOVE & WAR۔ جنگ کا میدان جہاں یکسر جذبات ہی جذبات کام دیتے ہیں' وہ کہتا ہے کہ نہیں! وہاں بھی قانونِ خداوندی کو نگاہ سے اوجھل نہ ہونے دو۔ اور عزیزانِ من! اس جنگ میں ہمارے ان مایۂ ناز فرزندوں نے کس طرح سے قانونِ خداوندی کو نگاہوں سے اوجھل نہیں ہونے دیا تھا۔ میں کہتا ہوں کہ ان کی اور تفصیلیں تو چھوڑ دیجیے۔ جنگ میں ہمارے وہی نوجوان گئے ہوئے تھے جنہیں اس سے پیشتر ہم نے ٹیڈی بوائے ٹیڈی بوائے کہہ کر ان کے اندر کیڑے ڈال رکھے تھے۔ ان کی کیفیت یہ تھی کہ ایک تو یہ چھوڑ دیجیے کہ وہ میدانِ جنگ میں کس طرح سے لڑے اور ہم اس زمانے میں بھی حجروں سے باہر نہیں نکلے۔ یہ ٹیڈی بوائز' یہ نوجوان' یہ جن کے متعلق ہم نے مشہور کر رکھا تھا کہ دنیا بھر کے جتنے عیوب اور فواحش ہیں' یہ سب کا مرکب ہیں۔ انہوں نے میدانِ جنگ میں یہ شہر فتح کیے' ان شہروں کے اندر کی آبادیاں قبضے میں آئیں' ان کی عورتیں وہاں موجود تھیں۔ ہم سے نہ پوچھیے' جنگ کے بعد بھارت کے وزیرِ دفاع چوان نے وہاں کی پارلیمان میں یہ کہا تھا کہ اس سترہ دن میں پاکستان کی فوج کے کسی شخص نے ہماری کسی عورت کی طرف میلی نگاہ سے نہیں دیکھا۔ او! جیتے رہو۔ برادرانِ عزیز! ہمارا سر اونچا' ان میدانوں کی فتوحات سے نہیں ہوا' اس اعلان اور اس اعتراف سے ہوا ہے۔ وَ اذْكُرُوا اللّٰهَ كَثِيْرًا (8:45) کہا یوں تو عام طور پر بھی تم خدا کی ان احتیاطوں کو' خدا کی ان پابندیوں کو' ان قواعد کو' سامنے رکھتے ہو۔ کہا کہ جنگ میں اس کی بڑی ضرورت پڑ جائے گی۔ عزیزانِ من! دشمن کا مال و متاع تو ایک طرف' ان کی ہاتھ میں آئی ہوئی عورتوں تک کہ جن کا اس وقت محافظ نہ ہو اور یہاں تمہارے اوپر بھی کوئی دیکھنے والا نہ ہو' ساری فوج ہی ہوتی ہے۔ اس وقت خدا کے اس قانون کو سامنے رکھنا کہ ہندوؤں کی ہر عورت کی عصمت کی محافظت میرا فریضہ ہے۔ یہ ہے فَاثْبُتُوْا وَ اذْكُرُوا اللّٰهَ كَثِيْرًا (8:45) ثابت قدم رہو اور دیکھو خدا کے قوانین کو نگاہوں سے اوجھل نہ ہونے دو۔ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ (8:45) یوں تمہیں کامیابی

ملے گی۔ وَ اَطِیْعُوا اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ (8:46) اطاعت کرو اپنے نظام کی' اس کے مرکز کی' جو خدا نے تمہارے لیے قائم کیا ہے۔[478]آلِ عمران

میدانِ جنگ میں اطاعت کے فریضے کی نگاہ بانی احکامِ الٰہی کی نشاندہی کا ثبوت ہے

عزیزانِ من! جنگ کے دوران تو اطاعت اور بھی شدید ہو جاتی ہے۔ وَ لَا تَنَازَعُوْا (8:46) آپس میں کسی قسم کا ذرا بھی تنازع نہ کرو۔ فَتَفْشَلُوْا (8:46) یاد رکھو! شیرازہ بکھر جائے گا' وَ تَذْهَبَ رِیْحُكُمْ 8: (46 تمہاری ہوا اکھڑ جائے گی۔ وَ اصْبِرُوْا ط((8:46 استقامت سے رہو اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الصّٰبِرِیْنَ((8:46 ہم استقامت سے رہنے والوں کے ساتھ ہوا کرتے ہیں ۔عزیزانِ من! دیکھا! نصرت کیسے ملتی ہے۔ وَ اللّٰهُ یُؤَیِّدُ بِنَصْرِهٖ مَنْ یَّشَآءُ((3:13 کا ترجمہ آپ دیکھیے کہاں ہو جاتا ہے کہ انہیں نصرت ملتی ہے۔ بات ساری یوں ہو رہی تھی جیسے جذباتی ہو رہی ہو۔ کہا کہ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَعِبْرَةً لِّاُولِی الْاَبْصَارِ (3:13) یہ جو ہم نے بات کہی ہے بات تو کچھ جنگِ بدر کی سی تمہیں نظر آئے گی۔

لفظ عبرۃ کا مفہوم

یہ عربی زبان کا لفظِ عبرۃ عجیب ہے۔ عبرۃ پل کو کہتے ہیں۔ یہ کیا ہوتا ہے؟ ہماری منزل وہاں ہوتی ہے ادھر سے ابتدا کرتے ہیں۔ ہر وہ چیز کہ جس کے بعد نگاہ اس کے اوپر ٹھہری ہوئی ہو اور اگلا سرا مقصود ہو تو اسے عبرت کہتے ہیں۔ کہا بات جنگِ بدر کی ہو رہی ہے۔ اسے ہسٹری کے اندر ایک CRONICAL یا ایک NEWS کی حیثیت سے نہ پڑھ لیجیے کہ تیرہ سو سال پہلے جنگِ بدر میں یہ ہوا تھا۔

زندگی بسر کرنے کے لیے ابدی حقائق کو نظر انداز کرنا خودکشی سے کم نہیں ہوتا

یہ جو کچھ ہم آج کرتے ہیں ان سارے واقعات کے متعلق ہم سمجھتے ہیں کہ یہ اُس زمانے میں ہو گیا ہو گیا' آج ہمارے ساتھ اس کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ یہ تو وہ پل ہے جس کو عبور کر کے تم نے منزل پہ پہنچنا ہے۔ یہ کوئی کہانی نہیں کہ اس دور سے متعلق ہے اور تم سے اس کا تعلق ہی نہیں ہے۔ تم سے بھی اس کا تعلق ہے۔ یہ ابدی حقائق ہیں' یہ وقتی ہنگامی چیزیں نہیں ہیں۔ ان سے تم اپنے حالات کو سامنے رکھ کر نتیجے کے اوپر پہنچو۔ لیکن کون پہنچے گا؟ لِّاُولِی الْاَبْصَارِ ((3:13 صاحبانِ عقل و بصیرت ہی اس نتیجے کے اوپر پہنچ سکیں گے۔ اس راستے میں کیا چیز حائل ہو گی؟ عظیم چیزیں آ رہی ہیں۔ زُیِّنَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّهَوٰتِ مِنَ النِّسَآءِ وَ الْبَنِیْنَ وَ الْقَنَاطِیْرِ الْمُقَنْطَرَةِ مِنَ الذَّهَبِ وَ الْفِضَّةِ وَ الْخَیْلِ الْمُسَوَّمَةِ وَ الْاَنْعَامِ وَ الْحَرْثِ ط((3:14 یہ متاعِ

حیات، بیوی بچوں کی محبت، مال و دولت کے ڈھیر، اصطبل میں بندھے ہوئے گھوڑے، اَنعام، مویشیوں کے ریوڑ، کھیتی باڑی یہ تمام چیزیں مذہب کی دنیا سے پوچھو تو قابلِ نفرت دین ہیں۔ان سے پوچھو کہ قرآن نے تو زین یعنی وجہِ زینت کہا ہے۔

دینِ خداوندی زینت کی چیزوں کو کسی شکل میں بھی نظر انداز نہیں کرتا

عزیزانِ من! کیا فرق ہے مذہب اور دین کا؟ دنیا کے کسی اہلِ مذہب سے پوچھو تو دنیا کی ہر جاذبیت اور کشش کو وہ نفرت کی نگاہ سے دیکھیں گے۔ان کے نزدیک ترکِ دنیا، ترکِ لذائذ، ترکِ خواہشات، یہ اللہ والوں کی نشانیاں ہیں۔دین یہ ہے کہ زُيِّنَ لِلنَّاسِ (3:14) یہ ساری چیزیں قابلِ زینت ہیں۔دیکھیے! دین اس سے بھی زیادہ زوردار الفاظ میں مذہب کی جڑ کاٹ دیتا ہے۔کہا کہ قُلْ مَنْ حَرَّمَ زِيْنَةَ اللّٰهِ الَّتِىْٓ اَخْرَجَ لِعِبَادِهٖ وَ الطَّيِّبٰتِ مِنَ الرِّزْقِ (7:32) ان سے پوچھو کون ہے وہ کہ جن چیزوں کو ہم نے دنیا میں انسانوں کے لیے وجہِ زینت بنایا ہے، ان کو حرام قرار دے سکتا ہے۔اتنے دھڑلے سے یہ کہا کہ ان سے پوچھو کہ ہم جن کو وجہِ زینت قرار دیتے ہیں، کون ہے جو ان کو حرام قرار دیتا ہے؟ ہمارا مُلّا اٹھتا ہے اور کہتا ہے کہ جی! ہم حرام قرار دیتے ہیں، کرلو کیا کرتے ہو۔ ہر وجہِ زینت چیز حرام۔ ماتھے کے اوپر جفر کے نقشے باندھتے ہیں۔ یہ کیوں حرام قرار دیتے ہیں؟ INFERIORITY COMPLEX یعنی خود حاصل نہیں ہوتیں اور جنہیں حاصل ہوتی ہیں ان کو دیکھ کر جل رہے ہوتے ہیں۔''کھولین دی تے ہمت نئیں ہوندی، کمان دی سکت وی نئیں ہوندی'' اس کے بعد سوائے اس کے کہ گالیاں دیں اور کچھ نہیں کر سکتے۔اس کا طریقہ یہ ہوتا ہے کہ حرام قرار دیدیا۔قرآن کہتا ہے کہ قُلْ مَنْ حَرَّمَ زِيْنَةَ اللّٰهِ الَّتِىْٓ (7:32) بڑا عجیب انداز ہے کہنے کا! کہ کہو! کون ہے وہ جس کو یہ جرأت ہوسکتی ہے کہ ہم جنہیں وجہِ زینت بنائیں، انہیں وہ حرام قرار دے۔اور تماشا یہ کہ یہاں سونے کا، ریشم کا، ان تمام چیزوں کا استعمال قطعی حرام ہے۔اور جنت میں یہی چیزیں قرآن نے گنائی ہیں کہ سب ملیں گی۔ لو! یعنی سارا ہی حرام ملے گا۔سارے قرآن میں آپ دیکھیے جتنی تفاصیل دی ہوئی ہیں۔صاحب! یہاں تو یہ انگوٹھی تک کو حرام کہتا ہے۔قرآن کہتا ہے کہ وہاں یہ برتن سونے اور چاندی کے ہوں گے۔''ایتھے چاندی دے گلاس اچ پانی پی لو گلاس نال تے بہرحال جو کچھ ہونداائے، تہانوں تین واری نہاناں پیندااے''۔وہ کہتا ہے کہ جنت میں یہ تمام چیزیں وہاں ہونگی۔

قرآنِ حکیم نے زینت کی چیزوں کا ایک مقام بھی متعین کر رکھا ہے

عزیزانِ من! دیکھا کہ دین جب مذہب کی سطح پہ آتا ہے تو پھر کیا کیفیت ہوجاتی ہے۔ مَنْ حَرَّمَ زِيْنَةَ اللّٰهِ الَّتِىْٓ (7:32)۔

دیکھیے! بات آگے آئی کہ دین کہاں شروع ہوتا ہے۔ کہتا ہے کہ یہ سارا کچھ سمجھ لینے کے بعد کہ یہ چیزیں بڑی وجۂ زینت ہیں وجۂ 478 **آلِ عمران** کشش ہیں کہا کہ سن لو! ذٰلِكَ مَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا (3:14) یہ اسی دنیاوی زندگی کے لیے ساز و سامانِ حیات ہے۔ زندگی نے تو آگے بھی چلنا ہے اگر تم نے اسی کو منتہا اور مقصود سمجھ لیا تو پھر یہ چیزیں جن کو تم حلال سمجھتے ہو، وہ بھی حرام ہو گئیں۔ عزیزِ من! یہ منتہا و مقصود نہیں ہیں۔ گھوڑا مضبوط فربہ اچھا چلنے والا ہونا چاہیے۔ اصطبل میں باندھنے کے لیے نہیں' سفر کے لیے' سواری کے لیے' مقامِ مقصود پہ پہنچانے کے لیے۔ انہیں کو مقصود بالذات سمجھ لیا تو قرآن کہتا ہے کہ فِتْنَةٌ یہ تباہی کا موجب ہے۔ یہ مقصود بالذات نہیں بلکہ کسی مقصد تک پہنچانے کا ذریعہ ہیں۔ اور اگر یہ چیز اس مقصد تک پہنچانے کا ذریعہ بننے کی بجائے اس مقصد کے راستے میں سنگِ گراں بن کر حائل ہو جائے تو ان میں سے ہر چیز حرام اور حرامِ قطعی ہے۔ بات اتنی ہی ہے کہ جب ان چیزوں میں TIE آ کر پڑ جائے یعنی وہ چیزیں کہ جو وجۂ کشش ہیں اور وہ چیزیں کہ جو آپ کے لیے مستقل اقدارِ حیات اس نے گنائی ہیں۔ وہاں پہنچنے کے بعد صرف فیصلہ کرنا ہوتا ہے کہ کون سی چیز وہاں قربان کر دی جائے گی اور کون سی چیز باقی رکھی جائے گی۔ اگر ان زینت کی چیزوں کی کشش اور جاذبیت غالب آ گئی اور آپ نے کوئی مستقل قدر چھوڑ دی تو یہ ساری زینت کی چیزیں آپ کے اوپر حرام ہو گئیں۔ وہاں اگر آپ نے ان کو چھوڑا اور اُس کو برقرار رکھا تو یہ ساری چیزیں جتنی بھی ہیں یہ آپ کے اس مقصد کے حصول کا ذریعہ بن گئیں۔ پانی کشتی کو چلانے کا ذریعہ ہوتا ہے اس کے بغیر کشتی چل نہیں سکتی لیکن اگر وہی پانی غالب آ جائے تو وہی کشتی کو ڈوبا کر رکھ دیتا ہے۔

قرآنِ حکیم قدرت کی طرف سے ملنے والی تمام نعماء کو نوعِ انسانی کی نشوونما کے لیے زادِ رہ قرار دیتا ہے

دیکھیے! قرآن کس طرح سے CONTRAST پیش کرتا ہے۔ بال بچے' خویش و اقارب' مال و دولت' کاروبار' یہ سب چیزیں یہاں وجۂ زینت گنائی تھیں۔ لیجیے (9:24) اور گنتے چلے جایئے قُلْ اِنْ كَانَ اٰبَآؤُكُمْ وَ اَبْنَآؤُكُمْ وَ اِخْوَانُكُمْ وَ اَزْوَاجُكُمْ وَ عَشِيْرَتُكُمْ وَ اَمْوَالُ ۨاقْتَرَفْتُمُوْهَا وَ تِجَارَةٌ تَخْشَوْنَ كَسَادَهَا وَ مَسٰكِنُ تَرْضَوْنَهَآ (9:24) ان سے کہہ دو' اعلان کر دو کہ دل کے کان کھول کر سن رکھو! اگر تمہارے ماں باپ' تمہاری اولاد' تمہارے بہن بھائی' تمہاری بیویاں' بیویوں کے خاوند' تمہارے خویش و اقارب' یہ مال کہ جن کو تم اس طرح سے اکٹھا کرتے ہو' یہ سوداگری' یہ کاروبار کہ جن کے مندا پڑ

آلِ عمران 478 یہ تمام چیز جانے سے تم اس قدر گھبراتے ہو' یہ تمہارے رہنے کے بڑے بڑے محلات کہ جنہیں تم اس قدر پسند کرتے ہو' یہ تمام چیزیں جنہیں ہم نے یہاں کہا ہے کہ وجہِ زینت ہے۔ ان سے کہہ دو کہ اگر ان میں سے کوئی ایک چیز بھی اَحَبَّ اِلَيْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ وَ جِهَادٍ فِيْ سَبِيْلِهٖ ((9:24 اگر ان میں سے کوئی ایک چیز بھی خدا اور رسول اور اس کے راستے میں جہاد کرنے کی راہ میں مانع ہوگئی تو فَتَرَبَّصُوْا ((9:24 انتظار کرو حَتّٰى يَاْتِيَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ ؕ وَ اللّٰهُ (9:24) کہ خدا پھر اپنے فیصلے کو لے کر آ جائے گا۔ وہ فیصلہ اس نے دوسری جگہ کہا ہے کہ يَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ ثُمَّ لَا يَكُوْنُوْۤا اَمْثَالَكُمْ (47:38) پھر تمہاری جگہ ایک اور قوم آ جائے گی اور وہ پھر تمہارے جیسی نہیں ہوگی۔

لفظ فاسق کا لغوی و قرآنی مفہوم

برادرانِ عزیز! یہ تمام چیزیں جن کو یہاں وجہِ زینت گنایا گیا ہے۔ ان تمام چیزوں کو گنا کر کہا ہے کہ ٹھیک ہے وجہِ زینت ہیں لیکن اگر ان میں سے کوئی ایک چیز بھی اس راستے کے اندر حائل ہوگئی تو پھر یہی نہیں کہ یہ وجہِ زینت نہیں رہیں گی بلکہ پھر اس کے نتیجے کا انتظار کرو جب اس کے بعد تمہاری داستاں تک بھی نہ ہوگی داستانوں میں۔ استبدالِ قومی' استخلافِ قومی یعنی دوسری قوم آ جائے گی۔ اور پھر یہ کہہ کر کہ وہ پھر تمہارے جیسی نہیں ہوگی' یہ نہیں کہا کہ یونہی ایک قوم کی جگہ دوسری قوم آ جایا کرتی ہے۔ دوسری قوم وہ ہوا کرتی ہے جو ان سے بہرحال کسی نہ کسی نوع سے اونچی ہوا کرتی ہے۔ انتظار کرو پھر اس چیز کا۔ وَ اللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفٰسِقِيْنَ ((9:24 یہاں فاسقین کہہ کر کیا بات کہہ گیا ہے! کامیابی اور کشاد کی راہیں اس قوم کے سامنے نہیں کُھلا کرتیں جو فاسق ہوا کرتی ہے۔ میں نے آپ کو بتایا تھا کہ فسق کیا ہوتا ہے۔ یہ پھل مثلاً آم بڑا ہوتا چلا جاتا ہے' آخر تک وہ اسی طرح سے رہتا ہے' پھر پکتا ہے تو آپ اس کو اتارتے ہیں کھاتے ہیں۔ نہایت عمدہ لذیذ پکا ہوا پھل ہوتا ہے۔ کچھ آم وہ ہوتے ہیں کہ جو یہاں تک پہنچنے کے بعد پھٹ جاتے ہیں۔ ان کی اندر کا گٹھلی یا مادہ ایک طرف کو نکل جاتا ہے۔ کوئی چیز جو پکنے سے پہلے ہی اپنے PATTERN کو چھوڑ کر' بیچ میں سے دوسری طرف نکل جاتی ہے اسے عربی زبان میں فاسق کہتے ہیں۔ یہ پھلوں کے اندر ایسا کیوں ہوتا ہے؟ پھلوں کے اندر جو کچھ ہوتا ہے' اور ان کے اوپر جو چھلکا ہوتا ہے' اگر ان دونوں کی کی نشوونما برابر برابر ہو جیسے وہ اندر بڑھنا شروع ہو' ویسے ہی اوپر کا چھلکا مضبوط ہوتا چلا جائے' پھیلتا چلا جائے' اگر دونوں کی نشوونما یکساں طور پر ہو تو پھل اپنی آخری شکل تک پہنچ جاتا ہے' پک جاتا ہے۔ اور اگر ان دونوں کی نشوونما میں فرق پیدا ہو جائے یعنی اندر کی چیزیں زیادہ پھیلتی چلی جائیں اور باہر کا جو چھلکا ہے وہ کمزور رہ جائے تو وہ پھٹ جاتا ہے۔ اور اس کے بعد پھر اندر کی چیز دوسری طرف نکل

جاتی ہے وہ بھی بے کار ہو جاتی ہے۔

قرآنِ حکیم کی رو سے' رہبانیت کی زندگی سراسر فسق ہے

عزیزانِ من! مستقل اقدار اور طبعی زندگی کے ساز و سامان کے اندر اگر اس قسم کی PARALLEL نشوونما ہوتی ہے تو پھل پک جاتا ہے ۔ اور اگر ان کے اندر DISPARITY ہو جاتی ہے یعنی ایک زیادہ نشوونما پاتی ہے اور دوسری NEGLECT ہو جاتی ہے تو پھل کا چھلکا پھٹ جاتا ہے۔ اور اس کے بعد یہ پھل بے کار ہو کر رہ جاتا ہے۔ ان دونوں کے اندر جو توازن رکھنا ہے' یہ ہے جسے دین کہتے ہیں ۔ یہ پھل کے چھلکے بہت اچھے تھے یعنی یہ مال و متاع' زن و فرزند' یہ بڑے بڑے محلات' یہ تمام جاذبیت کی چیزیں ٹھیک تھیں ۔ ان کا ہونا ضروری تھا۔ سفر کے لیے گھوڑے کا ہونا ضروری ہے۔ لیکن اگر ان دونوں میں توازن نہ رہے اور ایک ان میں سے زیادہ طریقے کے اوپر چلا جائے تو یہ فسق ہے۔ اب آپ کہیں گے کہ صاحب! جسے ہم عبادت کہتے ہیں' جسے ہم اس قسم کی نیکی کہتے ہیں' وہ اگر زیادہ سے زیادہ ہو جائے تو وہ تو بہت اچھی بات ہونی چاہیے۔ اپنے دل سے نہ پوچھیے قرآن سے پوچھیے ۔ یہ جسے آپ زیادہ سے زیادہ عبادت کا تصور کہتے ہیں یہ یہی ہے کہ جسے رہبانیت کہتے ہیں ۔ وہ تو بالکل ہی دنیا کو ترک کر دیتے ہیں' ہمہ تن پوری زندگی' بزعمِ خویش' عبادت کے اندر جذب ہو جاتی ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ یہ تصورِ حیات ہمارا دیا ہوا نہیں ہے بلکہ انہوں نے اپنے ذہن سے وضع کیا ہے رَهْبَانِيَّةَ نِ ابْتَدَعُوْ هَا (57:27) انہوں نے خود اپنے ذہن سے یہ تصور پیدا کیا ہے جو کہ بالکل غلط ہے۔ اگر پھل پہ اوپر کا چھلکا نہیں ہے یا اگر چھلکا ہے اور وہ کمزور رہ گیا ہوا ہے تو پھل نہیں پک سکتا۔ قرآن کہتا ہے کہ یہ خانقاہیت اور راہبانیت کی زندگی ہے جو چھلکے کو ترک کر کے پھل کو پکانے کی ایک نہج ہے کہ جو نہیں چل سکتی۔ عزیزانِ من! اسی نہج کا نام ہمارے ہاں تصوف ہے کہ چھلکے کو چھوڑ کر پھل کو پکانا چاہتے ہیں۔ قرآن اس کو یہ اہمیت دیتا ہے اور اس کے ساتھ یہ چیز بتاتا ہے کہ اگر یہ چیزیں اس پھل کو پکانے کے لیے ذریعہ اور مقصد بنتی ہیں تب تو نہایت ضروری ہیں۔ اور اگر یہ اس کے راستے میں آ کر کھڑی ہو جاتی ہیں تو ان سے زیادہ تخریبی چیز کوئی اور نہیں ہے۔

مادی اسباب و ذرائع کو ہی مقصود بالذات سمجھ لینا فکرِ قرآنی سے اس کا کوئی واسطہ نہیں

ذٰلِکَ مَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا (3:14) ٹھیک ہے کہ یہ زندگی کے لیے متاعِ حیات ہے لیکن وَ اللّٰهُ عِنْدَهٗ حُسْنُ

الْمَاٰبِ((3:14 یاد رکھو! نظامِ خداوندی کے مطابق وہ مقام جہاں کوئی کارواں جا کر ستا تا ہے' جس درخت کے نیچے جا کر ٹھہرتا ہے' وہ ان سے بہت زیادہ بہتر ہے۔اس لیے جب ان دو چیزوں میں TIE پڑے تو اس وقت پھر تم یہ چیز دیکھ لو کہ کہیں یہ نہ ہو جائے کہ یہ سامان اور ساز جو اسباب اور ذرائع تھے' یہی مقصود بالذات بن جائیں اور مقصد نگاہوں سے اوجھل ہو جائے۔ یہ نہیں ہونا چاہیے۔ قُلْ اَؤُنَبِّئُكُمْ بِخَيْرٍ مِّنْ ذٰلِكُمْ((3:15 کہا آ ؤ تمہیں بتاؤں کہ اس وقت پھر ان میں سے کون سی چیز بہتر ہو جائے گی۔ یہ جنہیں تم نے اپنے ہاں سب سے بہتر قرار دیا ہے' آ ؤ تمہیں بتاؤں کہ ان سے بھی بہتر کیا چیز ہوگی۔ لِلَّذِيْنَ اتَّقَوْا ((3:15 وہ لوگ جو قوانینِ خداوندی کی نگہداشت کرتے ہیں عِنْدَ رَبِّهِمْ جَنّٰتٌ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا((3:15 خدا کے قانون کے مطابق ان کا نتیجہ جنت کی زندگی ہے۔ یہ خاص اصطلاح ہے۔اس ریگستان کی رہنے والی' دھوپ میں سڑ جانے والی' قوم کے لیے کہ جن کے ہاں تھوڑا سا جھاؤ اور بیری کے درخت کا سایہ بھی اتنے بڑے صحرا میں ان کے لیے بڑی نعما میں سے ہوتا تھا۔قرآن کا تمثیلی بیان ہے' یہ متشابہات کی آیات ہیں کہ متقین کے لیے' گھنے باغات کے سایے' ان کے نیچے ہر وقت آبِ رواں یعنی زندگی کی شادابیاں اور خوشگواریاں ہیں۔

قرآنِ حکیم نے جنت کو مثال کی شکل میں ہی پیش کیا ہے

یاد رکھیے گا یہ میں نہیں کہہ رہا بلکہ جہاں جنت کا بیان ہے وہاں قرآن نے خود کہا ہے کہ مَثَلُ الْجَنَّةِ الَّتِيْ(13:35) جس جنت کا ہم ذکر کر رہے ہیں اس کی مثال یوں سمجھو۔تو اگر یہ چیز ہو کہ سایہ اور ٹھنڈ اور ٹھنڈا پانی تو حضرت بل میں میں نے دیکھا ہے کہ سردیوں کے زمانے میں کشمیریوں کے ہاں جو واعظ وعظ کہہ رہا تھا اور برف پڑی ہوئی تھی' یخ بستہ۔ان غریب بے چاروں کے پاس اتنے کپڑے ہوتے ہی نہیں ہیں' وہاں ٹھٹھر رہے تھے۔اگر ان سے کہا جائے کہ جنت وہ ہوگی جہاں سایہ ہوگا' ٹھنڈا پانی ہوگا' سورج بالکل نظر نہیں آئے گا تو پوچھو نہیں ''او کہن گے ایہدے نالوں ساڈی اے کشمیر چنگی آ جیہدے اچ چار پتے پائے ہوندے نیں''(وہ کہیں گے کہ اس سے اچھی تو یہ ہماری کشمیر ہے جہاں چار کپڑے تو پہنے ہوئے ہیں)۔تو وہاں واعظ وعظ کہہ رہا تھا کہ جی! جنت میں گرم گرم چائے ملے گا' وہاں آگ تاپنے کے لیے ہوگا' اللہ میاں تم لوگوں کو بہت اچھا اچھا لحاف دے گا' سورج کی گرمی ہوگی۔ٹھیک ہے اس نے تو مثال سے بات واضح کرنی ہے یعنی زندگی کی خوشگواریاں اور شادابیاں ساری کی ساری اس میں ہونگی اور تم وہاں رہو گے۔وَ اَزْوَاجٌ مُّطَهَّرَةٌ((3:15 پھر وہ بات آ گئی۔ ہمارے ہاں زوج کا پھر وہی ترجمہ بیوی کیا۔ ہمارے ہاں میاں تو زوج ہوتا ہی نہیں' صرف زوجہ ہوتی ہے۔''اکو پہیے والی گڈی

لگی پھر دی ہیگی اے' لگی کتھے پھر دی ہیگی اے چورا ہے اچ ٹوٹی پئی ہوئی ہیگی اے'' (ایک ہی پہیے کی گاڑی چلتی جارہی ہے' چلتی کہاں جارہی ہے چوراہے میں ٹوٹی ہوئی پڑی ہے)۔

اہلِ جنت کی باہمی زندگی کو قرآنِ حکیم نے ازواج کے مفہوم میں بیان کیا ہے

عربی زبان ہی میں نہیں' قرآن نے خود بھی خاوند کے لیے زوج کا لفظ استعمال کیا ہے۔سورۃ مجادلہ میں کہا ہے کہ دیکھو وہ عورت جو آ کر اپنے زوج کے متعلق تم سے شکوہ شکایت کر رہی تھی' اپنی فریاد کر رہی تھی۔لفظ زوج کے معنی ہی رفیقِ حیات ہیں۔ اور رفاقت کی ایک شکل یہ بھی ہے جسے آپ میاں بیوی کی رفاقت کہتے ہیں۔عزیزانِ من! رفاقت کی دنیا کے اندر تو بے شمار شکلیں ہیں۔اور بہترین رفاقتیں تو وہ ہوتی ہیں جو ایک نظام' ایک گروہ' ایک جماعت' کے اندر ہم آہنگئ فکر و نظر سے پیدا ہو۔جنت میں جہاں ازواج کا ذکر آیا ہوا ہے وہ ہم آہنگ اور ہم رنگ رفقا ہیں۔وہاں عورتیں بھی ہوں گی مرد بھی ہوں گے۔صرف میاں بیوی کی بات نہیں۔میاں بیوی ہوجانا رفاقت کے لیے مانع نہیں ہے۔بہرحال اچھا یہی ہے کہ آگے بڑھ جایئے۔وَ اَزْوَاجٌ مُّطَهَّرَةٌ وَّرِضْوَانٌ مِّنَ اللّٰهِ ؕ وَ اللّٰهُ بَصِيْرٌۢ بِالْعِبَادِ (3:15) وقت تھوڑا رہ گیا ہے بات بہت بڑی آ گئی ہے کہ رِضْوَانٌ مِّنَ اللّٰهِ (3:15)۔ہمارے ہاں تو یہ چیز بھی زبان زدعام ہے کہ صاحب! اللہ کی خوشنودی کے لیے کرنا چاہیے' خوشنودئ باری تعالیٰ بہت بڑی چیز ہے۔اسی کا ترجمہ رضائے خداوندی ہے کہ اللہ کی خوشنودی یعنی اللہ کو خوش کرلو' اپنے مولا کو راضی کرلو۔سارا مقصد یہ ہے کہ اللہ کی خوشی کے لیے اللہ کو راضی کرلو۔گویا خدا روٹھ بھی جاتا ہے اور اسے راضی بھی کیا جاتا ہے' اس کی خوشنودی یعنی اس کو خوش کیا جاتا ہے۔یہ وہ سارا تصور ہے جو یہاں کے بادشاہ کا تھا۔برادرانِ عزیز! خوشنودی کا تصور نہیں ہے۔جسے قرآن نے دوسرے باب میں یہ رضا' رضوان کہا ہے یہ خوشنودی نہیں ہے۔یہ کیا ہے؟ آج وقت ہوگیا ہے' اسے اٹھا رکھنا چاہیے۔ بات ذرا غور طلب بھی ہے اور تفصیل طلب بھی' اسے ہم آئندہ پر اٹھا رکھتے ہیں۔

آج ہم سورۃ آلِ عمران کی 15ویں آیت تک آئے۔انشاءاللہ آئندہ ہم اس کو پھر لیں گے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا ؕ اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ (2:127)

❀...❀...❀

تیسرا باب: سورۃ آلِ عمران (آیات 15 تا 18)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

لفظ رضوان کا حقیقی مفہوم نیز اسلامی اور غیر اسلامی کا معیار

عزیزانِ من! آج ستمبر 1969ء کی 28 تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز سورۂ آلِ عمران کی آیت 15 سے ہو رہا ہے:((3:15۔

لفظ رضوان کی قرآنی اصطلاح کا مفہوم خدا کو راضی یا خوش کرنا صحیح نہیں

آپ کو یاد ہوگا کہ سابقہ درس میں آخری آیت((3:15 میں ایک لفظ رِضْوَانٌ آیا تھا اور میں نے یہ عرض کیا تھا کہ اس کا مفہوم تفصیل طلب ہے، وقت تھوڑا تھا اس لیے ہم نے اسے آج کے درس پر اٹھا رکھا تھا لہٰذا اگلی آیت تک پہنچنے سے پہلے میں ضروری سمجھتا ہوں کہ اس لفظ کی قرآنی تشریح سامنے آ جائے۔ وہ آیت یہ ہے کہ قُلْ اَؤُنَبِّئُكُمْ بِخَيْرٍ مِّنْ ذٰلِكُمْ ط لِلَّذِيْنَ اتَّقَوْا عِنْدَ رَبِّهِمْ جَنّٰتٌ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا وَ اَزْوَاجٌ مُّطَهَّرَةٌ وَّ رِضْوَانٌ مِّنَ اللّٰهِ ط((3:15 جو لوگ خدا کے قوانین کی نگہداشت کرتے ہیں، ان کے لیے جنت کی زندگی ہے۔ اور اس میں اگلا لفظ یہ وَرِضْوَانٌ مِّنَ اللّٰهِ (3:15) تھا "اللہ کی طرف سے رضوان"۔ یہ رضوان کا لفظ وہ لفظ ہے جس کے متعلق میں نے کہا تھا کہ یہ وضاحت چاہتا ہے۔ اس کا مفہوم اچھی طرح سے سمجھ لینا چاہیے۔ یہ لفظ نہیں قرآن کی اصطلاحات میں سے سمجھیے کہ ایک اصطلاح ہے اور بڑی اہم اصطلاح ہے۔ اس کا مادہ 'ر ض ی' ہے جہاں سے ہمارے ہاں قرآنِ کریم میں وہ ایک TERM رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ (98:8) ہے۔ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَ رَضُوْا عَنْهُ کا عام ترجمہ یہ کیا جاتا ہے کہ "اللہ ان سے راضی ہو گیا وہ اللہ سے راضی ہو گئے"۔ رِضْوَانٌ مِّنَ اللّٰهِ (3:15) کا ترجمہ بھی یہی کیا جائے گا۔ جنت کی زندگی بہت بڑی چیز ہے۔ یوں نظر آتا ہے کہ جیسے اعمالِ صالح کا تمام منتہا' آخری نتیجہ جنت کی زندگی ہے۔ لیکن اس کے بعد اس نے کہا ہے رِضْوَانٌ مِّنَ اللّٰهِ (3:15) تو اب یہ کیا بات ہے؟ عام تراجم میں آپ دیکھیں گے کہ اس کا ترجمہ" خوشنودیٔ باری تعالیٰ" کیا جاتا ہے۔ اب آپ اپنی زبان کی طرف آ جایئے۔ میں نے گذارش کیا تھا اور کئی مرتبہ اس کو دہرا چکا ہوں

کہ قرآنِ کریم کے سمجھنے میں بڑی دشواری یہ بھی عائد ہوتی ہے کہ الفاظ اور اصطلاحات تو قرآن کی ہوتی ہیں اور اس کا مفہوم ہم لفظوں سے لیتے ہیں جو ہمارے ہاں اردو میں رائج ہوتے ہیں بلکہ بعض اوقات پنجابی میں رائج ہوتے ہیں۔ ہمارے ہاں ''راضی کر لینا''، روزمرہ کا استعمال ہے۔ وہ مجھ سے راضی ہو گیا' رضا مندی' خدا کو راضی کر لو' اسے جا کر راضی کر لو' خوشنودی۔ اس کے برعکس خفگی' ناراضگی۔ اب ذہن میں اس مادے کا' اس لفظ کا یہ جو تصور ''رضا مندیٔ خداوندی' خوشنودیٔ باری تعالیٰ'' آیا اور پھر عام طور پر بولا جاتا ہے کہ اپنے مولا کو راضی کر لو۔ ''راضی کرنا'' سے آپ سوچیے کہ بات کیا ہوتی ہے؟ یعنی یہ سب کچھ جو کچھ ہم نے یہاں کرنا ہے یا جو کچھ ہم کرتے ہیں یہ اس لیے ہے کہ کسی طرح سے اللہ میاں خوش ہو جائے' وہ راضی ہو جائے۔ تو ''راضی'' سے پہلے تو چیز موجود ہے کہ ASSUMED ہے' راضی نہیں ہے' وہ روٹھا ہوا ہے۔ آپ روٹھے ہوئے کو ہی جا کر راضی کرتے ہیں۔ جو روٹھا ہوا نہ ہو اسے تو راضی کرنے کا سوال ہی نہیں۔ یا تو یہ صورت ہوئی کہ اسے کسی طرح سے راضی کر لیں یا زیادہ سے زیادہ یہ کہ اس کی خوشنودی کے لیے یہ چیز کرو۔ یعنی انبیائے کرامؑ کا آنا' ہدایت کا دینا' ایمان کا سلسلہ' اعمالِ صالحہ' یہ اتنا بڑا پروگرام کاہے کے لیے؟ اللہ کو خوش کرنے کے لیے؟

راضی ہونا یا ناراض ہونا تو انسانی جذبات ہیں' خدا کی صفات نہیں

آپ نے کبھی غور فرمایا ہے کہ اللہ کے متعلق یہ بات کیا ہے؟ یہ انسانی جذبات ہیں کہ وہ خوش بھی ہوتا ہے' وہ روٹھ بھی جاتا ہے' ناراض ہو جاتا ہے' خفگی میں آ جاتا ہے' خوش ہوتا ہے تو جنت بخش دیتا ہے' خفا ہو جاتا ہے تو جہنم میں جھونک دیتا ہے۔ یہ تصورات کہاں سے آئے ہیں؟ وہی بنیادی غلطی کہ جو میں کہا کرتا ہوں کہ ہم نے ایک فقرہ تو اپنے ہاں بادشاہوں کے لیے گھڑا کہ اَلسُّلْطَانُ الْعَادِلُ ظِلُّ اللّٰہِ عَلَی الْاَرْضِ بادشاہ زمین پر خدا کا سایہ۔ اور درحقیقت ہمارے ذہن نے خدا کو آسمان پر زمین کے بادشاہ کا ایک پرتو بنایا۔ یہاں جیسا کچھ ہمارا بادشاہ تھا' اُسی طرح کا ایک بادشاہ ہم نے بڑے پیمانے پر آسمان پر رکھا اور اسے خدا کہا۔ اب جو جو تضمنات' جو کچھ چیزیں اس بادشاہ اور بادشاہت سے متعلق ہیں' وہ ساری چیزیں ہم نے خدا کی طرف بڑے پیمانے پر منسوب کر دیں۔ یعنی بادشاہ ناراض ہوتا ہے تو ایک شخص کو پھانسی لگا دیتا ہے' اللہ ناراض ہوتا ہے ملک کے ملک کو تباہ کر دیتا ہے۔ بادشاہ کسی سے خوش ہوتا ہے تو یہاں کی جاگیر دے دیتا ہے' اللہ خوش ہوتا ہے تو جنت کی ابدی زندگی عطا کر دیتا ہے۔

ہمارے ہاں خدا کے متعلق پایا جانے والا تصور ایک زمینی بادشاہ کا تصور ہے

بادشاہتوں کے اندر' نہ کوئی قاعدہ' نہ کوئی قانون' نہ ضابطہ' نہ آئین' ہوتا ہے۔ساری چیز کا دارومدار بادشاہ کی خوشنودی اور ناراضگی پر ہوتا ہے۔وہ راضی ہوگیا تو راوی عیش لکھتا ہے' وہ ناراض ہوگیا تو تباہی آ گئی اور گاؤں کے گاؤں پر ہل پھروا دیے۔ کوئی معیار نہیں' کوئی مدار نہیں' کوئی قانون نہیں' کوئی اس کے نتائج نہیں' بس صرف ایک فرد کی خوشی ہے۔لہٰذا جتنے بھی' امرا' وزرا' درباری' رعایا' ہیں' ہر ایک کی یہ کوشش اور خواہش کہ کسی طرح سے بادشاہ کو راضی رکھا جائے' خوش کردیا جائے کیونکہ اس کی ناراضگی سے تو آپ دیکھتے ہیں کیا کچھ ہوتا ہے۔بعینہٖ یہی تصور ہم نے خدا کے متعلق قائم کیا اور اسے شہنشاہِ حقیقی کہا۔تو پھر جو چیزیں اس بادشاہ کے متعلق تھیں' وہی بڑے پیمانے پر اس کی طرف بھی منسوب کیں۔وہی بہت بڑا دربار' اس کے اوپر ایک تخت' تخت کے اوپر ایک کرسی' اس میں وہ براجمان ہے۔جیسے یہ سارا نقشہ یہاں کے بادشاہ کے دربار کا تھا کہ یہاں مصاحب' درباری' وزرا' امرا' سفارش کرنے والے' وہاں تک عرضیاں پہنچانے والے' راستے کے دربان' حاجب' نذرانے وصول کرنے والے۔وہاں جا کر اس کے حضور میں قصیدہ پڑھنا' کورنش بجالانا' اسے خوش رکھنا۔بالکل یہی نقشہ ہم نے بڑے پیمانے پر خدا کے متعلق قائم کیا۔اب جب یہی تصور یہاں بھی آیا کہ خدا کو راضی کرنا ہے تو اس میں آپ دیکھیے گا کہ قاعدہ قانون , LAW ' CAUSE & EFFECT کوئی چیز اس میں نہیں ہوتی۔بس صرف ایک فرد کی خوشنودی حاصل کرنی ہے۔اور ہم نے رِضْوَانٌ کا' رَضِیَ اللّٰہُ کا' مَرْضَاتِ اللّٰہِ (2:207) کا ترجمہ ''راضی ہونا'' کیا۔یہ جتنے الفاظ اس مادے سے نکلے ان کا ترجمہ ہم نے ''راضی کر لینا' اسے خوش کر دینا' خوشنودیٔ باری تعالیٰ'' کیا۔یعنی جتنے بھی ہمارے یہاں کے اب اعمال ہیں' جتنا کچھ بھی یہاں کیا جائے' نیک اعمال اچھے کام' تو کیا ان کا مقصود و منتہا صرف یہ کہ خدا کو خوش کر دیا جائے' اسے خوش رکھا جائے۔

می نہ سزد خدائے را

خدا انسان کے ان جذبات سے بلند ہستی ہے۔اگر وہاں بھی جذبات کی کیفیت ہو تو ساری کائنات تہس نہس ہو جائے۔

میں ایک بات اور عرض کروں کہ اعمال کے لفظ سے تو ہمارا ذہن دوسری طرف چلا جاتا ہے۔آپ دیکھتے ہیں کہ الفاظ کا گورکھ دھندہ کیسا ہے۔اگر ہم اچھے کام کہیں تو اس کے معنی کچھ اور ہوتے ہیں' اگر ہم نیک عمل کہیں تو آپ جانتے ہیں کہ اس کے معنی سمٹ کر رہ جاتے ہیں۔

خدا تعالیٰ نے خود اپنے اوپر ایک پابندی کو واجب کر لیا کہ وہ کسی کی خاطر قوانین میں تبدیلی نہیں

کرے گا

اتنی عظیم قوتوں کا مالک اور اس کے باوجود اس نے اس تمام کارگہ کائنات کو چلانے کے لیے اٹل قوانین بنا دیے۔ اور ان قوانین کے متعلق کہہ دیا کہ ان میں کبھی تبدیلی نہیں ہوسکتی۔ خود اپنی ذات پہ بھی اس نے کچھ پابندیاں از خود عائد کیں كَتَبَ عَلٰى نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ (6:12) ہم نے اپنے اوپر اس چیز کو واجب کر لیا۔ آپ دیکھتے ہیں کہ دوسرے تو ایک طرف رہے خود اپنی ذات کو بھی وہ اس قاعدے اور ضابطے کا پابند بنا رہا ہے کہ ''ہم نے اس چیز کو اپنے اوپر واجب کر لیا''۔ اور پھر ہم انسانوں کو تو اس کی اجازت ہے، اجازت ہی نہیں بلکہ ہمیں تو اس کی آزادی ہے کہ جو کچھ ہم نے اپنے اوپر واجب کیا ہے جی چاہے تو کبھی اس کو پورا کریں، جی چاہے تو نہ کریں۔ اور ہم روز ایسا کرتے ہیں۔ معاف رکھیے گا یہ لفظ میں INVERTED COMMAS میں لوں گا کہ اس کی مجبوری کا یہ عالم ہے کہ خدا نے جو اپنے اوپر واجب کیا ہے، کبھی اس کی خلاف ورزی نہیں کرتا۔ یہ ہے خدا کا تصور کہ ایک پابندی اپنے اوپر عائد کی ہے کہ کسی کی خاطر اپنے قانون میں کسی قسم کی تبدیلی نہیں کرتا۔ اس کے بعد آپ غور کیجیے کہ خود اپنی آزادی کو یوں سلب کر کے رکھ لینا کہ اس کے خلاف کبھی نہیں کروں گا! خدا ہونے کا حق اسی کو حاصل ہے کہ اتنے وسیع اختیارات کے باوجود اتنی بڑی پابندی اپنے اوپر عائد کرے۔

جو لوگ سِوا کہلاتے ہیں اُن کی سِوا مشکل ہوتی ہے

عزیزانِ من! خدا کی صفات کا مظہر بھی وہی ہوسکتا ہے کہ جتنے زیادہ اس کے اختیارات بڑھتے چلے جائیں اتنی زیادہ پابندیاں اپنے اوپر عائد کرتا چلا جائے۔ اور اس انداز سے کہ کبھی اس کی خلاف ورزی نہ کرے۔ یہ وہ صاحبِ اختیار ہوگا جو اس زمین پر خدا کا سایہ ہوگا۔ نہ یہ کہ وہ سعدی والا خدا کہ کبھی ان کو سلام کیجیے، پھانسی پہ لٹکا دیں اور کبھی گالی دیجیے، گاؤں بخش دیں۔ ارے کیوں؟ صاحب! سلطان کی خوشنودی ہے، مزاجِ شاہاں ہے۔ عزیزانِ من! ہم نے خدا کا یہ تصور قائم کر لیا ہوا ہے۔ قرآنِ کریم اس تصور کو ختم کر دیتا ہے۔ پہلی چیز تو یہ کہ کوئی انسان جتنے اچھے کام یا برے کام کرتا ہے تو اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس کے اچھے کام ہوئے، خدا خوش ہو گیا اور اس کے برے کام ہوئے خدا ناراض ہو گیا۔ قرآن کہتا ہے کہ تمہارے اس مفہوم کے اعتبار سے خدا نہ ان چیزوں سے خوش ہوتا ہے نہ ناراض ہوتا ہے بلکہ ہر کام جو انسان کرتا ہے۔ وہ خود اپنی ذات کے لیے کرتا ہے کسی کی ناراضگی اور خوشنودی کا اس میں تعلق نہیں ہے۔ یہ موضوع جسے مکافاتِ عمل کہتے ہیں، بڑا وسیع موضوع ہے۔ اگر میں اس پہ آ جاؤں

گا تو وہ تو ایک درس کیا پتہ نہیں کتنے درس اس کے لیے درکار ہوں گے۔ اس وقت میں صرف اس کی تائید میں دو چار آیتیں آپ **آلِ عمران** 478
کے سامنے پیش کروں گا۔

انسان کے اچھے اور بُرے اعمال سے خدا خوش یا ناراض نہیں ہوتا بلکہ انسان کی اپنی ذات پر اس کا اثر پڑتا ہے

جو شخص اچھے کام کرتا ہے' اپنی ذات کے لیے کرتا ہے۔ غلط کام کرتا ہے' خود نقصان اٹھاتا ہے۔ اگر ہم مقصود یہ لے لیں کہ اچھے کام کا میری ذات سے کوئی تعلق نہیں بلکہ خدا اس سے خوش ہوجاتا ہے اور برا کام کیا تو اس کا میری ذات سے تعلق نہیں بلکہ خدا ناراض ہوجاتا ہے تو یہ قرآن کے قانونِ مکافاتِ عمل کے تصور کے بالکل خلاف جاتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اچھے کام کا فائدہ بھی تمہیں' برے کام کا نقصان بھی تمہیں۔ خدا کا نہ تمہارے اچھے کاموں سے کچھ بنتا ہے نہ تمہارے برے کاموں سے بگڑتا ہے۔ خدا اسی قسم کا خدا اس وقت بھی تھا جب تم موجود ہی نہیں تھے اور آج بھی ساری دنیا اگر اس کے قانون کے خلاف غلط کام کرنا شروع کردے تو خدا کی خداوندی میں ایک ذرّہ برابر فرق نہیں آسکتا۔ اچھے کام کرو گے تو تمہارا ہی کچھ فائدہ ہوگا' غلط کام کرو گے' تمہارا ہی کچھ نقصان ہوگا۔ نہ تمہارے اچھے کاموں سے خدا کی خدائی بڑھے گی' نہ تمہارے غلط کاموں سے اس کی کبریائی میں کچھ فرق آجائے گا۔ قانونِ مکافاتِ عمل کی یہ دو چار آیتیں ہیں: قَدْ جَآءَكُمْ بَصَآئِرُ مِنْ رَّبِّكُمْ ج فَمَنْ اَبْصَرَ فَلِنَفْسِهٖ ج وَ مَنْ عَمِيَ فَعَلَيْهَا ط وَ مَآ اَنَا عَلَيْكُمْ بِحَفِيْظٍ (6:105) تمہاری طرف' تمہارے خدا کی طرف سے یہ بصائر آگئے' روشنیاں آگئیں' بصیرتیں آگئیں' آنکھیں کھولنے کا سامان آگیا۔ اب جو شخص آنکھیں کھول کر' دیکھ کر' چلتا ہے اس کا فائدہ اس کی اپنی ذات کو پہنچتا ہے۔ جو آنکھیں بند کرلیتا ہے اس کا نقصان اس کو پہنچتا ہے۔ ہم تمہارے اوپر داروغہ مقرر نہیں کیے گئے۔ ہمارا کام صرف یہ تھا کہ سورج پیدا کردیں اور تمہاری آنکھوں میں بینائی دے دیں۔ اب سورج کی روشنی میں بھی اگر کوئی شخص اپنی آنکھیں بند کرلیتا ہے تو سورج کی روشنی میں کوئی فرق نہیں آجاتا بلکہ تم خود ہی ٹھوکریں کھاتے ہو۔ آنکھیں کھول کر چلتے ہو تو صحیح راستے پر چلے جاتے ہو۔ آپ نے فَلِنَفْسِهٖ ط وَ مَنْ عَمِيَ فَعَلَيْهَا ط (6:105) میں دیکھا کہ کسی دوسرے کی خوشنودی اور خفگی کا سوال ہی نہیں ہے۔ اچھی غذا کھاتے ہو تو صحت اچھی ہوجاتی ہے' زہر پھانکتے ہو تو تمہاری ہلاکت ہوجاتی ہے۔ قُلْ يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَآءَكُمُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكُمْ (10:108) کہہ دو کہ اے نوعِ انسانی! تمہارے خدا کی طرف سے الحق (THE TRUTH) آگیا۔ فَمَنِ اهْتَدٰى فَاِنَّمَا

یَهْتَدِیْ لِنَفْسِہٖ (10:108) جو صحیح راستے کے اوپر چلے گا' اپنی ذات کے فائدے کے لیے ایسا کرے گا۔ وَ مَنْ ضَلَّ فَاِنَّمَا یَضِلُّ عَلَیْھَا ط (10:108) اور جو یہ صحیح راستہ چھوڑ کر غلط راستے پر چلے گا' وہ خود گمراہی میں پہنچ جائے گا اور غلط راستے پر چلنے سے منزلِ مقصود پر نہیں پہنچ سکے گا۔ یہ چیز تمہارے لیے ہے۔ آپ دیکھتے ہیں کہ ہر عمل کا نتیجہ انسان کی اپنی ذات پر مرتب ہو رہا ہے۔ کسی دوسرے کی خفگی یا خوشنودی کا اس میں کوئی واسطہ نہیں ہے' کوئی تعلق نہیں ہے۔ یہ تو ایک قانون ہے' قانون کی پابندی کا سوال ہے' اس سے سرکشی کا سوال ہے' اس کے اٹل نتائج کا سوال ہے۔ اِنْ اَحْسَنْتُمْ اَحْسَنْتُمْ لِاَنْفُسِکُمْ قف (17:7) عملِ حسنات کرو گے' حسنہ کرو گے' حسن بنانے والے اعمال کرو گے تو تمہاری اپنی زندگی حسین ہو جائے گی۔ وَ اِنْ اَسَاْتُمْ فَلَھَا ط (17:7) ناہمواریاں پیدا کرنے والے کام کرو گے تو تمہاری اپنی زندگی ناہموار ہو جائے گی۔

خدا کی ذات انسان کے اچھے کاموں کی محتاج نہیں ہوتی

آپ دیکھ رہے ہیں کہ کس طرح قرآنِ کریم نے اسے واضح کر دیا کہ تمہارے ہر عمل کا نتیجہ تمہاری اپنی ذات پر مرتب ہوتا ہے۔ اس میں خدا کے خوش ہو جانے یا ناراض ہو جانے کا کوئی سوال نہیں ہے۔ اور اس سے بھی واضح تر الفاظ میں ہے کہ مَا یَفْعَلُ اللّٰہُ بِعَذَابِکُمْ اِنْ شَکَرْتُمْ وَ اٰمَنْتُمْ (4:147) اگر تم اس قوانین کی صداقت پر ایمان لے آؤ' اس پر یقین رکھو اور پھر اس کو ACCEPT کر لو' اس کے مطابق یہ کام کرو' تو تم سوچو تو سہی کہ خدا نے تمہیں عذاب دے کر کیا لینا ہے۔ یعنی اس نے اس میں سے کیا حاصل کرنا ہے' اس نے اس میں کونسی اپنی کمائی کچھ کرنی ہے۔ دیکھا! کس طرح سے یہ چیز خود انسان کی ذات تک محدود کر کے رکھ دی گئی ہے۔ اگر تم یہ صحیح روش اختیار کرو تو اس نے تمہیں عذاب دے کر کیا کرنا ہے۔ اور دوسرے مقام پر کہا کہ وَ مَنْ جَاھَدَ فَاِنَّمَا یُجَاھِدُ لِنَفْسِہٖ ط (29:6) جو بھی جدوجہد کرتا ہے' محنت کرتا ہے' صحیح عمل کرتا ہے' لِنَفْسِہٖ اپنی ذات کے لیے کرتا ہے۔ اور اس کا اگلا ٹکڑا ہے کہ اِنَّ اللّٰہَ لَغَنِیٌّ عَنِ الْعٰلَمِیْنَ (29:6) اس ساری کائنات میں جو بھی ہے، ہم ان تمام سے مستغنی ہیں۔ خدا بھی اگر ہمارے اچھے اعمال کا محتاج ہو جائے تو ہم تو چوتھے دن اس کی خدائی کو ڈبا دیں۔ جو حکومتیں لوگوں کے اعمال کی محتاج ہو جاتی ہیں' آپ دیکھتے ہیں وہ کس طرح سے ڈوبتی ہیں۔ اگر اس کا پایۂ تخت' اس کے پائے' ہمارے اعمال پہ ٹکے ہوئے ہوں تو ہر وقت تھر تھر کانپتا رہے۔ ہمارا جب جی چاہے الٹ کر رکھ دیں

می نہ سزد خدائے را

خدا ہونا یہ ہے کہ اِنَّ اللّٰہَ لَغَنِیٌّ عَنِ الْعٰلَمِیْنَ (29:6) کیا چیز ہے صاحب!!! اور یہی چیز ہے کہ جس کو آپ خدا کا تقرب'

خدا کا سایہ کہتے ہیں تو اسے یہ ہونا چاہیے کہ اس کو آن میرٹ زندہ رہنے کا اور مستحکم ہونے کا حق پہنچتا ہو۔ کوئی نظام' کوئی فلسفۂ حیات' کوئی نظامِ حکومت' اگر اپنے میرٹ کے اوپر زندہ رہتا ہے تو اسے کہہ سکتے ہیں کہ وہ دوسروں سے مستغنی ہو گیا۔ اور اگر دوسروں کے اوپر ہی محتاجی ہے تو پھر تو آپ جانتے ہیں کہ ایک تو ہر روز ان کی خوشامد کتنی کرنی پڑے گی اور پھر جب بھی ان کا جی چاہے' الٹ کر رکھ دیں۔ خدا تو ایسا نہیں ہو سکتا لَغَنِیٌّ عَنِ الْعٰلَمِیْنَ (29:6)۔

خدا انسانوں کے اس قسم کے سطحی جذبات سے بہت بلند ہے

اور اگر کیفیت یہ ہو جو ہم نے اپنے ذہن میں قائم کر رکھی ہے کہ ہمارے اس قسم کے اعمال سے وہ خوش ہوتا ہے تو ہمارے لیے بڑا آسان ہے کہ اس کو ہمیشہ غصے میں رکھیں' ناراض رکھیں۔ یعنی اگر ہمارے اعمال کے اوپر اس کی خوشی کا دارومدار ہو تو اس کی قسمت میں خوشی نصیب ہی نہ ہو۔ اور اگر تاریخِ انسانیت لی جائے تو میں سمجھتا ہوں کہ خوشی کے لمحات تو اسے شاید کبھی عید کا چاند دیکھ کر بھی نہ نصیب ہوئے ہوں گے۔ اگر ہم نے اس کو ناراض رکھنا ہے اور ہمارے اوپر ہی اس کی خوشی کا دارومدار ہے تو اللہ میاں تو گئے۔ لَغَنِیٌّ عَنِ الْعٰلَمِیْنَ (29:6)۔ لہٰذا عزیزانِ من! یہ پہلا مفہوم جو رِضْوَانٌ مِّنَ اللّٰهِ (3:15) کا ہم جو ''رضا جوئی باری تعالیٰ'' لیتے ہیں' جسے ہم خوشنودیٔ باری تعالیٰ کہتے ہیں کہ خدا کو خوش رکھنا اس کو منا لینا تو یہ قرآن کے تصور کے خلاف ہے۔ اس کی خوشی اس کی خفگی کا مدار ہمارے اعمال پر نہیں ہے۔ وہ انسان کے اس قسم کے سطحی جذبات سے بلند ہے۔ اور جیسا کہ میں نے عرض کیا تھا کہ خدا ہو ہی وہ سکتا ہے جو ان جذبات سے بلند ہو۔ یہ ساری تباہیاں ہمارے ہاں اس وقت آتی ہیں جب ہم جذبات کے تابع ہو جاتے ہیں۔ قانون صحیح ہو اور پھر اس کو چلانے والے ذاتی جذبات کے اندر نہ آئیں' قانون کا اتباع کرائیں' قانون کا اتباع کریں' نظام کو قانون کے تابع چلنے دیں تو آپ دیکھیے کہ اس کے نتائج کتنے خوشگوار اور محکم نکلتے ہیں۔ تباہیاں تو اس وقت آتی ہیں جب ہم قانون کو اپنے جذبات کے تابع رکھ لیتے ہیں۔ اور اگر ہم نے خدا کا تصور بھی اسی قسم کا قائم کر لیا تو آپ سوچ لیجیے کہ جذباتی قسم کا خدا تو جب پھر ناراض ہو گا تو کیا تباہیاں نہیں لائے گا۔ اور خوش ہو گا تو کس کس کو کیا کیا نہیں بخش دے گا۔

خدا کی مرضی یا خدا کی رضا کے غلط مفہوم نے ہماری سوچ ہی بدل دی ہے

برادرانِ عزیز! خدا کا یہ قانون نہیں۔ لہٰذا خدا کے متعلق یہ پہلا تصور ہی غلط ہے۔ اور جب یہ تصور غلط ہے تو یہ جو ہم نے' رِضْوَانٌ (3:15) کا' مَرْضَاتِ اللّٰهِ (2:207) کا' رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ (98:8) کا' ترجمہ ''خدا کو خوش کرنے

والے' خوشنودیٔ باری تعالیٰ کی خاطر یہ کچھ کرنے والے'' کیا ہے۔ یہ ترجمہ غلط ہے۔ یہ مفہوم قرآن کے مطابق نہیں ہے۔ میں ابھی عرض کروں گا کہ صحیح مفہوم کیا ہے۔ ایک مفہوم تو ہمارے ہاں یہ ہے جو میں نے ابھی اوپر بیان کیا ہے۔ آگے ایک مفہوم اور آتا ہے اور وہ ان لوگوں کی طرف سے دیا جاتا ہے یا ان کا پیدا کردہ ہے جو بڑے زیادہ مقربینِ بارگاہِ خداوندی ہیں۔ وہ مفہوم یہ ہے کہ راضی برضا رہنا' رضائے خداوندی کے تابع رہنا۔ اس کے معنی کیا ہوتے ہیں؟ جو کچھ ہو رہا ہے اس کے خلاف کچھ نہ کرنا۔ یہ مولا کی مرضی سے ہو رہا ہے اور مولا کی مرضی کے خلاف کچھ کرنا۔۔۔ اللہ اکبر! صاحب سوال ہی نہیں ہے۔ یہ تصور آپ دیکھ رہے ہیں کہ عالمِ انسانیت کے اندر تمہارے اوپر جو مصیبتیں آتی ہیں اور جو تکلیفیں آتی ہیں' یہ مولا کی مرضی ہے۔ اور انسان کا کام یہ ہے کہ وہ ہر وقت راضی برضا رہے۔

سب کام اپنے کرنے تقدیر کے حوالے
نزدیک عارفوں کے تدبیر ہے تو یہ ہے

یہ تدبیر ملاحظہ فرماؤ!

عارفوں کے یہاں مرضیٔ مولا کی اہمیت کے متعلق حضرت موہانی کا فلسفہ

بات عارفوں کی ہو رہی ہے۔ آپ نے غور فرمایا۔ ان کے ہاں کی انتہا یہ ہوتی ہے کہ جیسا میں نے عرض کیا ہے کہ راضی برضا رہنا۔ حسرت موہانی آزادی کا اتنا بڑا متمنی تھا اس کی زندگی آزادی کے اور حریت کے تصورات میں گذری۔ لیکن یہ معاملے ''عارفوں کی بات'' تو اور ہی ہیں۔ وہ بھی جب معرفت کے کوچے میں آتا ہے تو وہ یہ کہتا ہے کہ

مرضیٔ یار کے خلاف نہ ہو
لوگ میرے لیے دعا نہ کریں

یعنی اگر اس نے مصیبت پہ مجھ پہ ڈالی ہے تو یہ تو یار کی مرضی ہے۔ اب اگر تم میرے لیے اسی سے ہی دعا کرتے ہو کہ یا اللہ اس سے یہ مصیبت ٹال دے تو یہ اس کی مرضی کے خلاف ہو جائے گا۔ یعنی خود اس مصیبت کے ازالے یا مدافعت کے لیے کچھ کرنا تو ایک طرف رہا' دوستوں کو بھی منع کیا جا رہا ہے کہ بھائی! تم بھی میرے لیے دعا نہ کرنا کہ کہیں یہ مرضیٔ یار کے خلاف نہ ہو جائے۔

انسان کی ہر مصیبت اس کے اپنے ہاتھوں کی لائی ہوئی ہوتی ہے

یہ قوم اس قرآن کے ماننے والے ہیں جس نے کہا ہے کہ جو مصیبت بھی تم پہ آتی ہے تمہارے اپنے ہاتھوں کی لائی ہوئی ہوتی ہے۔ آپ نے غور فرمایا کہ ''مرضیٔ یار'' کے اس تصور نے اس قوم کو کہاں پہنچا دیا۔ اب عقیدہ یہ ہے کہ جو آفت' جو مصیبت اس قوم کے اوپر آتی ہے وہ خدا کی طرف سے بھیجی ہوئی ہے۔ اب اس کے ازالے یا مدافعت کے لیے کچھ کرنا تو ایک طرف رہا' دل میں بھی اس کے خلاف کوئی گرانی محسوس ہو جانا' مرضیٔ یار کے خلاف ہو جائے گا۔ عزیزانِ من! یہ دوسرا تصور بھی غلط ہے۔ اور اگر ہم یہ اسبابِ زوالِ امت ڈھونڈیں تو آپ کو اس میں یہ چیزیں سرِ فہرست نظر آئیں گی۔ یہ جبر کے عقیدے کہ یہاں جو کچھ ہوتا ہے خدا کی مرضی سے ہوتا ہے' انسان کا اس میں کوئی اختیار و اقتدار نہیں ہے۔ یہ قرآن کی بنیادی تعلیم کے خلاف ہے۔ قرآن اسے کہتا ہے۔ جب مشرکین سے یہ کہا جائے کہ تم شرک کیوں کرتے ہو؟ تو وہ اس کے جواب میں کہتے ہیں کہ ہم کون ہیں شرک کرنے والے' خدا کی مرضی اگر ایسی نہ ہو تو کوئی شرک ہی نہیں کر سکتا۔ قرآن مشرکین کا یہ قول درج کرتا ہے (6:148)۔ اور ہمارے ہاں سب سے بڑے مقربین جو معرفت کے کوچے کے جاننے والے ہیں' وہ یہ کہتے ہیں کہ حقیقی اسلام اور حقیقی معرفت یہ ہے کہ یہ کہو کہ یہ سب کچھ اس کی مرضی سے ہو رہا ہے' اس کی مرضی کے خلاف کچھ نہیں ہو سکتا۔ چلیے! نہ اسلام' نہ کفر' نہ نیکی' نہ برائی' کوئی چیز نہیں۔ اور اس کے بعد پھر یہ بھی کہ اس نے ایک جہنم بھی رکھا ہوا ہے۔ کوئی شخص برائی کا کام بھی کرتا ہے تو یہ سب کچھ اس کی مرضی کے مطابق ہو رہا ہے۔ اب اگر اس کی مرضی کے مطابق یہ سارا کچھ ہو رہا ہے تو پھر جہنم میں بھی جھونکے چلے جا رہے ہیں۔ عزیزانِ من! یہ قرآن کے بنیادی تصور کے خلاف ہے۔

اس مجسم بہ عمل قوم کے خلاف مستبد اور EXPLOITATION کرنے والے گروہوں کی سازش

یاد رکھیے! یہ اسلام کے خلاف بہت بڑی سازش تھی کہ اس ہمہ تن مجسم عمل قوم کو یہاں پہنچا دیا کہ اگر کوئی مصیبت اور آفت آ رہی ہے' ظالم ظلم کر رہا ہے' مستبد قوتیں تباہ کر رہی ہیں' غصب ہو رہا ہے' سلب اور نہب ہو رہا ہے' EXPLOITATION ہو رہی ہے' تو کسی کے خلاف ہاتھ تک نہ اٹھاؤ۔ اس لیے کہ مرضیٔ یار کے خلاف ہو جائے گا۔ پھر یہ ظالم اور مجرم اور ان تمام کے متعلق آدھا قرآن بھرا پڑا ہے کہ ان کی سزائیں' ان کے مکافات' ان کے لیے قیامت میں جا کر بھی یہ تمام قسم کے جہنم' یہ پھر کیوں ہیں۔ اگر یہ سارا کچھ مرضیٔ یار کے مطابق ہو رہا ہے تو ظالم بھی تو ظلم مرضیٔ یار کے مطابق کر رہا ہے۔ یہ سب سازش اس لیے

انہوں نے یہ مذہب EXPLOITATION کرنے والے گروہ تھے' کرنے والے' سلب ونہب کرنے والے' کی گئی کہ یہ جس قدر مستبد' سلب ونہب کرنے والے' EXPLOITATION کرنے والے گروہ تھے' انہوں نے یہ مذہب بنا کر آپ کے دل میں یہ ڈال دیا کہ یہ سب کچھ خدا کی طرف سے ہوتا ہے۔ یہ دولت' یہ قوت' یہ حشمت' یہ طاقت' یہ اختیارات سب اسی کے دیے ہوئے ہیں۔ یہ جتنا بھی ظلم تم پہ ہوتا ہے اور اس سے مصیبت آتی ہے تو یہ ساری مصیبتیں' یہ ساری تکلیفیں' خدا کی منشا کے مطابق ہوتی ہیں۔ راضی برضا رہو۔ راضی برضائے خداوندی نہیں بلکہ اس کی تہ کے اندر جو کچھ کیا گیا وہ یہ تھا کہ ان ظالمین کی مرضی کے مطابق چلو۔ یہ رِضْوَانٌ مِّنَ اللّٰہِ کا دوسرا مفہوم لیا گیا۔

خوشنودی کے غیر قرآنی مفہوم کے بعد رضی یا رضوان کا حقیقی مفہوم

''خوشنودئ باری تعالیٰ'' کا پہلا مفہوم خدا کو انسانی جذبات کی سطح کے اوپر لے آیا۔ دوسرا مفہوم ''راضی برضائے خداوندی'' جبر کا پورا عقیدہ ہے کہ کسی ظلم اور استبداد کے خلاف ہاتھ تک نہ اٹھاؤ۔ یہ دونوں مفہوم غیر قرآنی ہیں۔ عزیزانِ من! رضی کے بنیادی معنی یہ ہوتے ہیں کہ ''کسی کے ساتھ ہم آہنگ ہوجانا' متفق ہوجانا' CONGRUOUS ہوجانا' ایک چیز کا دوسری چیز کے ساتھ فٹ ہوجانا''۔ یہ جو رَضِیَ کہا یا رِضْوَانٌ کہا ہے یہ کیا چیز ہے؟ یہ کہ اعمالِ انسانی کا قوانینِ خداوندی کے ساتھ ہم آہنگ ہوجانا۔ اور انسان کی صورت میں اس کے خوشگوار نتائج کا اعمال کے ساتھ ہم آہنگ ہوجانا۔ جس قسم کے نتیجے کے لیے وہ کام کیا گیا ہے' اگر وہی نتیجے یہاں آ کر مرتب نہ ہوں تو راستے میں کوئی غلطی ہوگئی' کہیں کوئی سہو ہوگیا' کوئی خطا ہوگئی کہ وہ نتیجہ مرتب نہیں ہوا یا نتیجہ عمل سے ہم آہنگ نہیں ہوا۔ اور جب اعمالِ انسانی خدا کے قانون سے ہم آہنگ ہوجائیں گے تو اس کے نتائج ان اعمال سے خود بخود ہم آہنگ ہوجائیں گے۔ رَضِیَ اللّٰہُ عَنۡہُمۡ وَ رَضُوۡا عَنۡہُ (98:8) کے یہ معنی ہوگئے کہ ان کے اعمال' قوانینِ خداوندی سے ہم آہنگ ہوئے اور اس کے نتائج ان کے اعمال سے ہم آہنگ ہوئے۔ جسے ہم کہتے ہیں کہ اعمالِ انسانی خدا کے قوانین سے ہم آہنگ ہوئے تو قرآن کی رو سے دیکھیے یہ معنی کیسے ہوتے ہیں۔ پہلے دیکھیے کہ رضوان کے معنی قرآن خود کیا دیتا ہے؟ قَدۡ جَآءَکُمۡ مِّنَ اللّٰہِ نُوۡرٌ وَّ کِتٰبٌ مُّبِیۡنٌ (5:15) خدا کی طرف سے تمہارے پاس ایک روشنی آگئی یعنی ایک نہایت واضح کتاب۔

ہمارے ہاں قدم قدم پر انتشار اور خلفشار کی بنیادی وجہ الفاظ کے بنیادی مفہوم کو مبہم اور غیر واضح

رکھا جاتا ہے

آ گے چل کر میں عرض کروں گا کہ قرآن نے "مبین" جو بار بار دہرایا ہے یہ کتنی عظیم چیز ہے۔ضمناً میں یہاں یہ کہتا ہوا آ گے بڑھ جاؤں گا کہ آج آپ کے ہاں جس قدر CONFUSION ' انتشار' خلفشار' پیدا ہو رہا ہے وہ اس لیے ہو رہا ہے کہ آپ کے ہاں الفاظ کا مفہوم متعین نہیں ہوتا۔مثلاً اسلامی نظام' اسلامی حکومت' اسلامی اندازِ زیست' یہ اسلام ہے' اسلام نہیں ہے۔اور پوچھا جائے کہ صاحب اسلام ہے کیا؟ تو جواب کوئی نہیں۔آپ کی تمام اصطلاحات مبہم' غیر واضح ہیں۔اور پھر میں آ گے چل کر عرض کروں گا کہ یہ ایسی جان بوجھ کہ رکھی گئیں یعنی واضح ہی نہیں ہونے دیتے۔جب منیر کمیٹی میں پوچھا گیا کہ مسلمان کسے کہتے ہیں تو سارے ملک کے علمائے کرام وہاں اکٹھے تھے' یہ نہیں بتا سکے کہ مسلمان کسے کہتے ہیں۔یہ الفاظ اور اصطلاحات اس قدر غیرِ مبین رکھے ہوئے ہیں۔مثلاً فلاں بات اسلام کے خلاف ہے۔پوچھا کہ کس چیز کے خلاف ہے؟ کہ جی! اسلام کے خلاف ہے۔

بہر حال میں یہ کہہ رہا تھا کہ کتابِ مبین ایسی نہیں کہ جس کا جی چاہے' کچھ کہہ دے اور اس کے بعد بات واضح ہی نہ ہو۔یہ کتاب مبین ہے یعنی نہایت واضح' دوٹوک' غیر مبہم بات کہنے والی۔میں یہ کہہ رہا تھا کہ قَدۡ جَآءَكُمۡ مِّنَ اللّٰهِ نُوۡرٌ وَّ كِتٰبٌ مُّبِيۡنٌ۔ يَّهۡدِىۡ بِهِ اللّٰهُ ((5:15-16 اللہ اس کے ذریعے سے صحیح راستے کی طرف راہنمائی کرتا ہے۔بِهِ اللّٰهُ (5:16)۔آپ نے دیکھا راہنمائی کیسے ملتی ہے۔يَّهۡدِىۡ بِهِ اللّٰهُ مَنِ اتَّبَعَ رِضۡوَانَهٗ سُبُلَ السَّلٰمِ (5:16) جو بھی اس کے رضوان کا اتباع چاہتا ہے(میں نے وہی لفظ استعمال کر دیا) اسے اللہ قرآن کے ذریعے سے سلامتی کے راستوں کی طرف راہنمائی کر دیتا ہے۔

رضوان کا حقیقی مفہوم کتاب اللہ کا اتباع کرنا ہے تا کہ تم سیدھی اور متوازن راہ پر چلتے جاؤ

اب معلوم ہو گیا کہ جسے رضوان کہا گیا ہے تو رضوانِ خداوندی کیا ہے یعنی اس کی کتاب کا اتباع کرنا تا کہ وہ سُبُلَ السَّلٰمِ کی طرف لے جائے وَيُخۡرِجُهُمۡ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوۡرِ ((5:16 اور اس طرح انہیں زندگی کی تاریکیوں سے روشنی کی طرف لے آئے۔تو خدا کا اتباعِ رضوان دوسرے معنوں میں اس کی کتاب کا اتباع ہے۔یہیں سے ہمیں معلوم ہو سکتا ہے کہ جسے ہم رضائے خداوندی کہتے ہیں (اگر یہی لفظ ہم نے لینا ہے) تو یوں کہیے کہ وہ چاہتا کیا ہے۔تو جو کچھ وہ چاہتا ہے وہ اس نے اپنی کتابِ مبین میں واضح طور پر بیان کر دیا۔لہٰذا یہ کتابِ مبین کا اتباع ہے کہ جو کچھ خدا چاہتا ہے۔اب وہ ہم سے کیا چاہتا ہے؟ قرآن کے

متعلق یہ کہا کہ اِنْ هُوَ اِلَّا ذِكْرٌ لِّلْعٰلَمِيْنَ (81:27) یہ تمام نوعِ انسانی کے لیے ایک واضح کھلا ہوا قانون ہے نصیحت ہے۔[478] لِمَنْ شَآءَ مِنْكُمْ اَنْ يَّسْتَقِيْمَ (81:28) تم میں سے اس کے لیے نصیحت ہے جو چاہتا ہے کہ وہ زندگی کی متوازن اور سیدھی راہ کے اوپر چلتا رہے۔ تم میں سے جو چاہتا ہے کہ وہ زندگی کی سیدھی راہ پہ چلتا رہے اس کے لیے خدا نے یہ کتاب نازل کر دی۔ یہ ذِكْرٌ لِّلْعٰلَمِيْنَ (81:27) ہے۔ اور اس کے آگے ہے وَمَا تَشَآءُوْنَ اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ (81:29) اب تمہیں چاہیے یہ کہ تم وہی چاہو جو خدا چاہتا ہے۔ وہ چاہتا یہ ہے کہ تم اس سیدھے راستے پر چلتے جاؤ تا کہ منزلِ مقصود تک پہنچ جاؤ۔ اب تمہارے لیے یہ ہے کہ تم وہ چاہو جو وہ چاہتا ہے کہ تم سیدھے راستے پہ پہنچ جاؤ۔ اور وہ سیدھا راستہ قرآن کے ذریعے سے ہے جو ذِكْرٌ لِّلْعٰلَمِيْنَ (81:27) ہے۔ وہ جو اسلام کا' دین کا' اس کے مطابق زندگی بسر کرنے کا' مقصود و منتہا ہے۔ اقبالؒ تو بڑی خوبصورت اور ارتکازاً CONCENTRATED الفاظ میں بات بیان کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ قرآن کرتا کیا ہے؟

آں چہ حق می خواہد آں سازد ترا

جیسا خدا چاہتا ہے کہ تمہاری زندگی ایسی بن جائے' قرآن تمہیں ویسا بنا دیتا ہے۔

انسانیت کے لیے قرآنِ حکیم کی طرف سے دینِ خداوندی کا تعین

اور یہ سب کچھ قرآن کے اتباع سے ہوتا ہے۔ اسی کا نام قرآنِ کریم میں دین رکھ دیا۔ جسے ہم الاسلام کہتے ہیں۔ اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ (5:3) اس دور میں دینِ خداوندی مکمل کر دیا گیا' اتمامِ نعمت ہوگئی اور اگلا لفظ ہے کہ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا ط (5:3) ہم نے اسلام کو تمہارے لیے بطور ضابطۂ حیات تجویز کر دیا' اسے پسند کر دیا۔ اب دیکھو وہی لفظ رَضِيَ سے رَضِيْتُ ہے۔ رضائے خداوندی کیا ہے؟ یہ دین جسے الاسلام کہا گیا ہے اس کا اتباع۔ دوسری جگہ یہی چیز پہلے کہی تھی کہ تم میں سے ساری دنیا کفر کر لے گی تو خدا کا کیا بگڑ جائے گا۔ اِنْ تَكْفُرُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ غَنِيٌّ عَنْكُمْ قف (39:7) تم سب کے سب بھی اگر اس کی خدائی یعنی قوانین سے انکار کرتے جاؤ تو غَنِيٌّ عَنْكُم (39:7) وہ تم سے بے نیاز ہے' مستغنی ہے۔ تمہارا کسی طرح سے بھی محتاج نہیں ہے۔ سورج تمہاری آنکھوں کا محتاج نہیں ہے کہ تم دیکھو تو سورج کی روشنی رہے۔ تم آنکھیں بند کر لو تو سورج تاریک ہو جائے۔ تم خود اپنے آپ کو اس کی روشنی سے محروم کرو گے۔ وَلَا يَرْضٰى لِعِبَادِهِ الْكُفْرَ ج (39:7) ان چیزوں سے انکار کرنا جو وہ تمہارے لیے نہیں چاہتا وَاِنْ تَشْكُرُوْا يَرْضَهُ لَكُمْ ط (39:7) اور اگر ان چیزوں کے تم سپاس گذار بنو گے' ان کو تسلیم کر لو گے' ان کے مطابق چلو گے تو ان کے نتائج تمہارے اعمال سے ہم آہنگ ہو جائیں گے۔ یہی اس کا چاہنا

ہے۔اب پھر وہی بات آ گئی کہ یہاں کہیں درمیان میں خوشنودی کے معنی تو نہیں آ گئے۔ 478آلِ عمران

مکافاتِ عمل کے ظہور پذیر ہونے کی کیفیت

عزیزانِ من! قرآن میں احتمال تو ہوسکتا تھا۔اور احتمال تو تاریخ میں ہم نے بتایا کہ ہم نے کس طرح اس کے معنی بگاڑے ۔یہیں کہہ دیا کہ یاد رکھو! وَ لَا تَزِرُ وَازِرَۃٌ وِّزۡرَ اُخۡرٰی ط (39:7) سوال کسی کی خوشنودی اور کسی کی خفگی کا نہیں ہے۔ یہ تو بوجھ ہے ہر بوجھ اٹھانے والا اپنا بوجھ خود اٹھائے گا کوئی دوسرا اس کا بوجھ نہیں اٹھا سکتا۔ ثُمَّ اِلٰی رَبِّکُمۡ مَّرۡجِعُکُمۡ فَیُنَبِّئُکُمۡ بِمَا کُنۡتُمۡ تَعۡمَلُوۡنَ (39:7) اور اس کے بعد تم نے مواخذے کے لیے اس کے سامنے جانا ہے۔ وہ تمہیں بتا دے گا کہ تم نے کیا کیا تھا۔ بات صاف ہوجائے گی۔ ہمارا تعلق تم سے یہ ہے کہ اِنَّہٗ عَلِیۡمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوۡرِ (39:7) یہی نہیں کہ تم سے جو ظاہری اعمال ہوتے ہیں، وہی ہم جانتے ہیں بلکہ ہم تو تمہارے دل میں گذرنے والے خیالات تک سے واقف ہیں۔آپ نے دیکھا کہ یہاں قانونِ مکافاتِ عمل کس طرح سے آ رہا ہے۔لہٰذا جہاں جہاں قرآنِ کریم میں لمرضات اللہ آئے گا جس کا ترجمہ ہم ''خدا کی رضا جوئی کے لیے'' کرتے ہیں۔ رِضۡوَانٌ مِّنَ اللّٰہِ (3:15) کا ترجمہ ہم ''خدا کی مرضی کے لیے' خدا کو راضی رکھنے کے لیے' خوشنودیٔ باری تعالیٰ کے لیے' راضی برضا رہنے کے لیے'' کرتے ہیں۔قطعاً غلط ہے۔

رَضِیَ اللّٰہُ عَنۡہُمۡ وَ رَضُوۡا عَنۡہُ (98:8) کا مفہوم خدا کی صفات کو حدودِ بشریت کے اندر رہتے ہوئے اپنی ذات میں منعکس کرنا ہے

برادرانِ عزیز! رِضۡوَانٌ مِّنَ اللّٰہِ (3:15) کا مفہوم یہ ہے اور یہی اپنے ہاں بطور ترجمہ استعمال کیجیے کہ ''قوانینِ خداوندی سے ہم آہنگ ہونے کے لیے یہ کچھ کیا جائے گا''۔عربی زبان میں 'ر ض ی' کا مادہ بالکل اس کے مطابق ہے۔اس مادے کی رو سے وہ بنیادی طور پہ کہتے ہیں ''کسی چیز کا کسی چیز کے ساتھ فٹ ہوجانا''۔یہی وہ روش ہے جس سے انسان کے اندر خدا کی صفات علیٰ حدِ بشریت منعکس ہوتی چلی جاتی ہیں' پیدا ہوتی چلی جاتی ہیں۔اس اعتبار سے کہ انسان کی اپنی زندگی خدا کی صفات سے ہم آہنگ ہوتی چلی جائے۔ یہ رَضِیَ اللّٰہُ عَنۡہُمۡ وَ رَضُوۡا عَنۡہُ (98:8) ہے جسے ہم مرضات اللہ کا حصول کہتے ہیں۔خوشنودی یا راضی برضا رہنے والے تصور' قرآن کی تعلیم کے خلاف چلے جاتے ہیں۔

اس آیت (3:15) پہ ہم پھر آ گئے وَ اللّٰہُ بَصِیۡرٌۢ بِالۡعِبَادِ (3:15) یہ کون لوگ ہیں جن کی یہ روش ہے؟ آپ کو یاد ہے

انہیں مزین بنادیا آلِ عمران 478 ((3:13 میں تھا کہ دنیا کی زندگی، اس کی آرائشیں، زیبائشیں، آسائشیں، بڑی مزین ہیں، پرکشش ہیں، انہیں مزین بنادیا ہے۔ یہ قابلِ نفرت نہیں ہیں لیکن جب بھی کہیں ایسا وقت آئے کہ ان میں اور خدا کی عطا کردہ کسی مستقل قدر میں، تصادم واقع ہوجائے تو خدا کے بندے وہ ہیں، مومن وہ ہیں، جو اس وقت اس قدر اور VALUE کو UPHOLD کرنے کے لیے ان چیزوں کو قربان کر دیتے ہیں۔ انہیں کے متعلق کہا تھا کہ یہ نتیجہ ہوتا ہے۔ اب ایک آیت میں بتایا کہ ان لوگوں کی خصوصیات کیا ہوتی ہیں، ان کی آرزوئیں کیا ہوتی ہیں؟ اَلَّذِیْنَ یَقُوْلُوْنَ رَبَّنَآ اِنَّنَآ اٰمَنَّا ((3:16 اے ہمارے نشوونما دینے والے! ہم تیرے قوانین کی صداقتوں پر یقینِ محکم رکھتے ہیں، ہم نے دل اور دماغ کے پورے اطمینان کے ساتھ اس چیز کو سمجھ لیا ہے اور تسلیم کرلیا ہے کہ یہ قوانین سچے ہیں اور ہم ان کے مطابق چلیں گے۔

لفظ مغفرت کا مفہوم انسان کو تخریبی اعمال کے مضرت رساں نتائج سے محفوظ رکھنا ہے

فَاغْفِرْ لَنَا ((3:16 یہ الفاظ کئی دفعہ آچکے ہیں پھر دہرانے پڑتے ہیں۔ اس کا مفہوم ''ہمیں بخش دے'' صحیح نہیں۔ غفر کے معنی ہوتے ہیں ''سامانِ حفاظت بہم پہنچا''۔ ہم جو اس راستے میں نکلے ہیں تو اس میں بڑے بڑے خطرات آئیں گے۔ ہم چاہتے یہ ہیں کہ تیری طرف سے سامانِ حفاظت پہنچے۔ اور اس نے یہ بتا دیا ہے کہ سامانِ حفاظت کس طرح سے پہنچا کرتا ہے؟ وہ کہتا یہ ہے کہ اگر تمہارے تعمیری اعمال کا پلڑا زیادہ بھاری رہے گا تو تخریبی اعمال تمہاری تباہیاں نہیں کریں گے۔ اس طرح سے تمہیں تخریبی اعمال کے مضرت رساں نتائج سے حفاظت مل جائے گی۔ اسے مغفرت کہتے ہیں۔ فَاغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَا ((3:16 ذنوب کے معنی میں نے پچھلی دفعہ بھی عرض کیا تھا کہ ''کوئی چیز جو کسی کے پیچھے چپکا دی جائے''۔ عملی زندگی کے اس پروگرام میں سب سے مضرت رساں، تباہ کن چیز وہ ہوتی ہے جو دوسرے لوگ ان کے خلاف الزامات اور جھوٹی تہمتوں کے طریقے سے کسی کے پیچھے چپکا دیتے ہیں۔ کسی ایک تحریک میں نہایت اچھا تعمیری کام ہو رہا ہے۔ کسی ایک شخص کی طرف سے اس کے پیچھے چپکا دیا کہ اعتقاد صحیح نہیں ہیں، تین نمازیں پڑھتا ہے، منکرِ حدیث ہے۔ یہ کیا چیزیں ہیں؟ اس کے پیچھے لیبل لگانا جسے کہتے ہیں۔ اب اس کے بعد آپ دیکھیں گے کہ اس بے چارے کی نوے فیصد ACTIVITIES ان خار دار جھاڑیوں سے اپنا دامن چھڑانے میں ضائع ہوجاتی ہیں۔ میں یہ سورۃ الفتح میں چل کر عرض کروں گا کہ قرآن نے اس کے لیے یہ پروگرام بتایا ہے کہ ان کے ساتھ الجھو نہیں۔ تو یہاں سامانِ حفاظت طلب کیا گیا ہے۔ ٹھیک ہے ذنوب کے اندر اپنی لغزشیں بھی آجاتی ہیں، سہو اور خطا ہوتا ہے، ان سے بھی سامانِ حفاظت طلب کیا گیا ہے۔ یہ جو دوسرے ان کے پیچھے غلط الزامات چپکا دیتے ہیں ان سے بھی سامانِ حفاظت،

سامانِ مدافعت طلب کیا گیا ہے۔ جب آپ میدانِ جنگ میں نکلتے ہیں تو اس کا ہونا بڑا ضروری ہے۔ وَ قِنَا عَذَابَ النَّارِ (3:16) اس قسم کی شعلہ انگیزیوں سے بچانا کہ جو ہماری سعی و عمل کو، کوششوں کو، یونہی خاکستر بنا کر رکھ دیں۔ یہ کون لوگ ہیں، جنہیں یہ سامانِ حفاظت ملتا ہے۔

لفظ صابرین کے بعد لفظ قانتین کا مفہوم یعنی اپنی صلاحیتوں کو ٹھیک ٹھیک مقام پر پوری دل جمعی کے ساتھ استعمال کرنے والے

میں ابھی اس کے متعلق عرض کرتا ہوں کہ قرآن کن کے متعلق کہتا ہے؟ یہ وہ لوگ ہیں اَلصّٰبِرِیْنَ (3:17) ہر مشکل مقام پر استقامت سے، استقلال سے، ثابت قدمی سے، جم کر کھڑے رہنے والے۔ وَ الصّٰدِقِیْنَ (3:17) جو کچھ زبان سے کہا ہے اس کو اپنے عمل سے صحیح کر کے دکھا دینے والے، سچ کر کے دکھا دینے والے۔ ان کے دعوے کی صداقتیں ان کے اعمال دیں گے۔ وَ الْقٰنِتِیْنَ (3:17) پہلے بھی یہ لفظ آ چکا ہوا ہے، یہ عجیب لفظ ہے۔ عربوں کے ہاں صحرائی زندگی تھی، ان کے ہاں پانی بڑی قیمتی چیز ہوتی تھی۔ سِقَآئٌ قَنِیتٌ اس مشکیزے کو کہتے تھے کہ جس میں پانی بھر لیا جائے تو راستے میں اس میں سے کہیں ایک قطرہ بھی ٹپک کر ضائع نہ ہو اور جہاں ضرورت پڑے وہاں وہ بڑی آسانی سے پانی دیدے۔ قرآن نے مومنین کی ایک صفت قانتین بھی کہی ہے یعنی اپنی صلاحیتوں کو اس طرح PRESERVE کرنے والے کہ غلط مقام میں تو ان میں سے ایک قطرہ بھی ٹپک کر ضائع نہ ہو اور جہاں صحیح مقام میں اس کی ضرورت پڑے، یوں کھول دیں جیسے مشک کا منہ کھلتا ہے اور اس میں سے پانی الٹ کر آ جاتا ہے۔ قرآن کی کیا حسین تشبیہیں ہیں صاحب! نہ اسراف میں ضائع کرنے والا، نہ وقت کے اوپر بخل کرنے والا۔ مشکیزے کا منہ کھل جائے تو وہ بخل کرتا ہی نہیں ہے۔ اور عمدہ مشکیزہ وہ ہے کہ جس میں سے ایک قطرہ پانی بھی راستے میں نہ ٹپکے۔ ورنہ اگر یوں ہو جیسے وہ کمیٹی کی چھڑکاؤ والی گاڑی چلی جا رہی تھی۔ ایک بچہ دیکھ رہا تھا اس نے کہا کہ اس میں پانی بھرا ہوا ہے تو دوسرے نے کہا تھا کہ اگر یہ راستے میں یونہی گراتی گئی تو گھر کیا لے کر جائے گی۔ برادرانِ عزیز! سِقَآئٌ قَنِیتٌ یہ ہوتا ہے کہ وہ راستے میں بلا محل و بلا مقام اس کو ضائع نہیں کرتا اور جہاں ضرورت ہوتی ہے وہاں اس کو انڈھیل دیتا ہے۔ یہ ہیں وَ الْقٰنِتِیْنَ (3:17) کے معنی کہ جہاں ضرورت پڑتی ہے منہ کھول دیتا ہے۔ وَ الْمُنْفِقِیْنَ (3:17) اس کا روپیہ، اس کا مال جو ہوتا ہے، وہ اس قسم کی میانی کے اندر رکھا ہوا ہوتا ہے کہ جس کے دونوں سرے کھلے ہوتے ہیں۔ اِدھر سے داخل کرتا ہے، اُدھر سے نکلتا چلا جاتا ہے۔

اَسْتَغْفِرُ اللّٰہَ، اِنْشَآءَ اللّٰہُ، مَاشَآءَ اللّٰہُ کے بنیادی مفہوم کے برعکس ہماری سوچ 478آلِ عمران

وَالْمُسْتَغْفِرِیْنَ بِالْاَسْحَارِ ((3:17 اس کا تو سیدھا ہی ترجمہ کر دیا کہ ''صبح کے وقت استغفار کرنے والے یعنی صبح کی نماز کے لیے بہت زیادہ جلدی اٹھ جانے والے یا تہجد کے بعد استغفار کرنے والے''۔ اور وہ آپ کو معلوم ہے اَسْتَغْفِرُ اللّٰہo رَبِّیْ مِنْ کُلِّ ذَنْبٍ وَّ اَتُوْبُ اِلَیْہِ کی ہزار دانے کی تسبیح کرتے ہیں۔ کمرے کے اندر بیٹھے ہوئے، یہ چل رہا ہے کہ اَسْتَغْفِرُ اللّٰہَ رَبِّیْ اَسْتَغْفِرُ اللّٰہَ رَبِّیْ۔ اور پھر استغفر اللہ تو ہمارے ہاں وہ انشا اللہ، ماشا اللہ، الحمدللہ کی طرح زباں زد ہو گیا ہوا ہے۔ لیکن بہرحال وَالْمُسْتَغْفِرِیْنَ بِالْاَسْحَارِ (3:17) کے متعلق تو یہ چیز ہو گئی کہ وہ صبح کے وقت اٹھ کر استغفار کی تسبیح پوری کر دینے والے۔ کیا یہی وہ عمل ہے جس سے یہ سارا کچھ حاصل ہو جائے گا۔ آ جایئے اسی 'غ ف ر' کے بنیادی مادہ کے اوپر۔ استغفار، مغفرت چاہنا۔ اس باب کے معنی ''حفاظت چاہنا'' ہو گئے۔ ٹھیک ہے اسحار، سحر، صبح کو کہتے ہیں۔ عربوں کے ہاں ہر پروگرام کی ابتدا کو سحر کہتے ہیں۔ جس طرح دن کی ابتدا صبح سے ہوتی ہے۔ ہر کام، ہر منصوبہ، ہر پروجیکٹ، ہر پروگرام، شروع کرنے سے پہلے وہ اس چیز کو دیکھ لیں کہ حفاظت کا سامان موجود ہے؟ زندگی کی کامیابی کے لیے یہ بہت اہم نقطہ ہے۔ ہمارے ہاں تو تَوَکَّلُ عَلَی اللّٰہِ چل نکلتے ہیں۔ پھر اس کے بعد کوئی یہاں بیٹھا ہے، کوئی یہاں لیٹا ہے اور بھیک مانگ رہے ہیں کہ دے جا بابا اللہ کے نام پر۔ مومنین کے ہاں یہ صورت ہے کہ وہ ہر پروگرام کے شروع کرنے سے پہلے اس امر کا یقین کر لیتے ہیں کہ سامانِ حفاظت موجود ہے۔ اور پھر راستے بھر دیکھتے چلے جاتے ہیں کہ وہ ٹھیک ٹھاک اپنی اپنی جگہ پر موجود ہیں۔ یہ ہیں مومن۔

ہم نے عبادت کے عملی مفہوم کو پرستش کی سوچ میں بدل دیا ہے

عزیزانِ من! اس سورۃ کی ابتدا ان الفاظ سے ہوئی تھی اللّٰہُ لَآ اِلٰہَ اِلَّا ھُوَ ج اَلْحَیُّ الْقَیُّوْمُ (2:255) لَآ اِلٰہَ اِلَّا ھُوَ (3:18) غور کیجیے! اتنی چیزیں تمہیداً کہہ دینے کے بعد کس انداز میں بات سامنے آئی؟ شَھِدَ اللّٰہُ اَنَّہٗ لَآ اِلٰہَ اِلَّا ھُوَ ((3:18 یہ دعویٰ ہے کہ لَآ اِلٰہَ اِلَّا ھُو (3:18)۔ میں نے عرض کیا ہے کہ ہم نے اللہ کا ترجمہ معبود کیا۔ عبادت کا ترجمہ پرستش کیا۔ معبود کے معنی ہوئے جس کی پرستش کی جائے۔ اس کے بعد ٹھیک ہے کہ پتھر کی گھڑی ہوئی مورتوں کے سامنے نہ جھکنا کے معنی غیر اللہ کی پرستش سے اجتناب برتنا ہو گئے۔ خدا کی پرستش کرنا کے معنی ہو گئے کہ صرف وہاں جا کر اس کے لیے نماز پڑھنا۔ گویا یہ جو چیز خدا نے کہی ہے کہ لَآ اِلٰہَ اِلَّا ھُوَ بنیاد ہے، اصل ہے، مقصود ہے، منتہا ہے، محور ہے۔ عملی زندگی کے اندر اس کا مظاہرہ یہ ہے کہ ہم اس کے

لیے نماز پڑھ کر تسبیح پھیر لیتے ہیں۔

لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ (3:18) کا حقیقی مفہوم تو انسانیت کو ایک فلک بوس عمارت کی نوید دیتا ہے

عزیزانِ من! سوچیے۔ یہ بات نہیں کہ میں ان ارکانِ اسلام کی کسی طرح تضحیک کر رہا ہوں یا میں ان کو کمزور کر رہا ہوں یا ان میں کوئی نقص نکال رہا ہوں۔ میں تو پوچھتا یہ ہوں کہ یہ سارا نظامِ کائنات جو ہے اس کا منتہا و مقصود بس اتنا ہے کہ اس کے سامنے جھکئے بت کے سامنے نہ جھکئے۔ یہ الٰـہَ کا غلط مفہوم ہے۔ جیسا کہ اب آپ کو اِلٰهَ کے معنی معلوم ہیں کہ ''صاحبِ اقتدار' صاحبِ اختیار' حاکم' قوتوں کا مالک''۔ یہ ترجمہ کیجیے اور پھر اس کا کیجیے دعویٰ کہ ہم اس کو مانتے ہیں کہ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ (3:18) سوائے اس کی ذات کے کوئی صاحبِ اقتدار نہیں۔ اس کو اس انداز میں مانیے اور اس کے بعد پھر مسجد میں باوضو قبلہ رو کھڑے ہو کر اس کا اقرار کیجیے کہ اِيَّاكَ نَعْبُدُ (1:4) ہم تیرے سوا کسی کی محکومیت اختیار نہیں کرتے۔ اور پھر جو مسجد سے نکلتا ہے اس کو پوچھیے کہ کیا اس کے معنی ہوئے' اور اب زندگی کے اندر کیا کرنا ہے۔ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ (3:18) یہی تھا وہ لَآ اِلٰهَ (3:18) جس کے لیے آج کل وہ ڈگڈگی بجاتے پھر رہے ہیں کہ پاکستان کا مطلب کیا لا الہ الا اللہ'۔ بات تو کسی نے بڑی عظیم کہی تھی لیکن ہم نے قرآن کے اندر آئے ہوئے لا الہ الا اللہ کو یہ کر دیا تو شاعر کے اس مصرع میں آئے ہوئے کو کیا کچھ نہ بناتے۔ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ (3:18) عزیزانِ من! اسلام کے منشور کی بنیاد لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ (3:18) ہے۔ دیکھیے! یہ کتنا عظیم منشور ہے۔ جہاں اس کا ایک ثبوت آتا ہے' سند آتی ہے' دلیل آتی ہے اور وہ ہے شَهِدَ اللّٰهُ (3:18) اللہ خود اس کی شہادت دیتا ہے۔ اللہ اکبر۔ یہ بتانے کے لیے کتنا بڑا گواہ آ گیا ہے۔ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ (3:18) کے کیا معنی ہوئے؟ یہ بہت غور طلب چیز ہے کہ خدا خود اس کی شہادت دیتا ہے کہ اس کے سوا کوئی اور صاحبِ اقتدار نہیں ہے۔ کہنے کو تو بات یوں کہی جائے گی کہ اپنے دعوے کی شہادت تو ہر شخص دے گا۔ خدا اس کی شہادت دیتا ہے

۔

دینِ خداوندی میں قرآنی نظامِ حیات اور خدا کا حقیقی تصور ایک خاص اہمیت کا حامل ہے

عزیزانِ من! دین میں بنیادی چیز خدا کا تصور ہے۔ خدا کوئی محسوس شے نہیں کہ جس کو سامنے رکھ کر دیکھ لیا جائے کہ یہ اس قسم کا ہوتا ہے۔ نہ کسی کو دکھایا جا سکتا ہے۔ چند دہریوں کے سوا سب ہی خدا کو مانتے ہیں۔ بات دور نکل جائے گی ورنہ میں عرض کروں کہ وہ بھی کچھ الفاظ ہی کا فرق ہوتا ہے۔ لیکن اگر مان بھی لیا جائے کہ ان کو انکار ہے اور ان کے علاوہ ساری دنیا کے انسان خدا کو مانتے ہیں۔ اور پھر جتنا سر پھٹول خدا کو ماننے والوں میں ہوتا ہے' وہ انکار والوں میں ہوتا ہی نہیں۔ کبھی آپ نے دو دہریوں کو

 خدا کے متعلق مباحثہ کرتے ہوئے دیکھا ہے؟ ساری تاریخ میں یہ خدا کے ماننے والے خدا کے متعلق مباحثے کرتے چلے آئے ہیں۔ یہ مذہب اور مذہب کے اندر جنگ' پھر مذہب کے اندر مختلف فرقوں کے اندر جنگ۔ فرقوں کے متعلق ہی نہیں افراد میں ایک دوسرے سے جنگ۔ کس چیز کے متعلق ہو رہی ہے؟ خدا کے تصور کے متعلق۔ خدا کا صحیح تصور مذہب کی بنیاد ہے۔ عزیزانِ من! ذہنِ انسانی کا تراشیدہ اپنا اپنا خدا ہوتا ہے۔ دو افراد کے خدا کبھی بھی آپس میں نہیں مل سکتے۔ اور جب آپ خدائے واحد کہتے ہیں تو اس کے یہ معنی ہو گئے کہ میرے ذہن کا بھی وہی خدا ہو اور آپ کے ذہن کا بھی وہی خدا ہو' میرے تصور کا بھی وہی ہو اور آپ کے تصور کا بھی وہی ہو۔ کروڑوں کے تصور کا ایک ہی خدا' اپنے ذہن کا تراشیدہ تو نہیں ہو سکتا۔ یہ تصور کہاں سے ملے گا؟ خدا خود اپنے متعلق بتائے گا کہ میں کیا ہوں۔

خدا تعالیٰ کا منزہ اور حقیقی تصور صرف اور صرف قرآنِ حکیم میں بیان کردہ خدائی صفات ہی سے سمجھا جا سکتا ہے

عزیزانِ من! ایک ہی طریقہ ہے۔ کسی اور نے تو اسے دیکھا نہیں ہے لہٰذا وہ خود ہی بتا سکتا ہے کہ میں کیا ہوں۔ اور یہ چیز اس نے وحی کے ذریعے بتائی۔ اور اس کی وحی آج اپنی اصلی منزہ شکل میں قرآن کے اندر موجود ہے۔ لہٰذا قرآن کا بنیادی مقصد اور منصب یہ ہے کہ یہ خدا کا صحیح تصور دیدیتا ہے۔ خدا کا صحیح تصور قرآن کی رو سے قائم ہو جائے تو بالفاظِ دیگر خدا یہ کہتا ہے کہ اس تصور کا خدا خود اس لَآ اِلٰهَ اِلاَّ هُوَ (3:18) کی شہادت دے گا۔

خدا تعالیٰ کے صحیح تصور کے تحت کلمۂ شہادت کا قرآنی مفہوم

عزیزانِ من! آپ اپنے ذہن میں قرآن سے خدا کا تصور متعین کیجیے۔ تو آپ دیکھیں گے کہ وہ یوں تو کبھی آسمانوں کی باتیں کہے گا' کبھی زمین کی' کبھی حیات بعد الممات کی' کبھی اس زندگی کی' کبھی سیاسیات کی' کبھی معاشیات کی' کہیں تاریخ کی' کہیں امم سابقہ کی۔ یہ سب کچھ کہتا چلا جائے گا لیکن اس کی یہ ساری تعلیم ایک محور کے گرد گھومے گی کہ خدا کا صحیح تصور کیا ہے۔ لَآ اِلٰهَ اِلاَّ هُوَ (3:18)۔ شَهِدَ اللّٰهُ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ (3:18)۔ اگر خدا کا وہ صحیح تصور قائم ہو جائے جو قرآن نے دیا ہے تو تم خود اس حقیقت کی گواہی دیدو گے کہ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ (3:18) اس کے سوا کسی اور کا اختیار و اقتدار نہیں ہے۔ وہ ایک ہی ہے جس کا قانون ساری کائنات میں چل رہا ہے۔ شَهِدَ اللّٰهُ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ (3:18)۔ اگر آپ نے خدا کے صحیح تصور کے متعلق اس کی مزید

شہادت دیکھنی ہے تو خدا کی کتاب ہمارے پاس موجود ہے۔اس کا ایک WRITTEN STATEMENT موجود ہے جسے 478 **آلِ عمران** ہماری اصطلاح میں عدالت میں دیا ہوا بیان کہیں گے۔تو یہ قرآن ہے جس میں بیان دیا ہے۔اس کی شہادت اس میں سے ملے گی ۔کیا شہادت ملے گی؟ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ (3:18)۔

خدا تعالیٰ کے صحیح تصورات کے سلسلہ میں ملائکہ کی قرآنی شہادت

یہ چیز پھر بھی ذہنی رہی' تجریدی رہی' ABSTRACT رہی' متعین کرنے کی رہی۔اور اگلی چیز قرآن نے وہ کہی کہ اب ہم عالمِ محسوسات میں آ گئے۔اب علم کی بارگاہ سے' سائنس کی دنیا سے' اس کی شہادتیں ملیں گی۔قرآن نے کہا ہے کہ شَهِدَ اللّٰهُ (3:18) خدا شہادت دیتا ہے وَ الْمَلٰٓئِكَةُ (3:18) ملائکہ اس چیز کی شہادت دیتے ہیں کہ صرف ایک ہی ہے جس کا قانون اور اقتدار اس کائنات میں ہے۔اب یہاں بھی ہم نے ملائکہ کا ترجمہ فرشتے کیا۔فرشتے سے وہی ایک موہوم تصور ہمارے ذہن میں آیا۔وہ کیسے شہادت دیتے ہیں ہمیں تو اس کا علم نہیں۔خدا کی شہادت تو چلیے پھر بھی ہم نے کسی طرح سے اس کے قرآن سے متعین کر لی' معلوم کر لیا۔ملائکہ شہادت دیتے ہیں تو ملائکہ کا تو ہمارے ساتھ کبھی کوئی ٹاکرا ہی نہیں ہوا' کبھی ملے ہی نہیں ہیں' کبھی دیکھا ہی نہیں ہے' کبھی وہ آئے ہی نہیں ہیں۔پھر ان کی شہادت کیسے ہوئی؟ کہ جی! وہ خدا کے ہاں شہادت دیتے ہیں۔خدا کے ہاں شہادت دیتے ہیں اور ہم سے کہا جاتا ہے کہ ملائکہ شہادت دیتے ہیں! اگر اس CONCEPT کو' ملائکہ کے تصور کو' قرآن کی رو سے آپ متعین کر لیں گے تو بات صاف ہو جائے گی۔قرآن ہمیں یہ بتاتا ہے کہ خدا کے عالمِ امر کا تعلق ہماری محسوس کائنات سے ہے۔اس میں خدا کے پروگرام کو بروئے کار لانے والی قوتیں ملائکہ ہیں۔ملائکہ کے معنی ''قوتوں والے'' ہیں۔اس کے پروگرام کا ایک حصہ تو وہ ہے جسے ہم عالمِ امر کہتے ہیں' جہاں قانون بنتا ہے۔وہ ہمارے ذہن کی دسترس سے باہر ہے۔دوسرا عالمِ خلق ہے جہاں وہ قانون محسوس پیکروں میں' نافذ ہوتا ہے' عمل میں آتا ہے۔یہاں بھی اس کی یہ کائناتی قوتیں کارفرما ہیں۔جنہیں آپ POWERS OF NATURE , FORCES OF NATURE کہتے ہیں۔یہاں بڑی عظیم چیز قرآن نے کہہ دی کہ ایک چیز تو خدا کے متعلق ہم نے کہی ۔ دوسری چیز یہ کہ تمہاری کائنات میں FORCES OF NATURE جس طرح سے WORK کر رہی ہیں اگر ان کو تم STUDY کرو گے تو اس نتیجے پر پہنچو گے کہ یہاں ایک ہی کا قانون چل رہا ہے' دو قانون نہیں چل رہے۔یہ شہادت دیں گی اس بات کی کہ یہاں دو قانون نہیں چل رہے۔

ہمارے ہاں ملائکہ کے متعلق پایا جانے والا تصور اور سائنس کی شہادت

عزیزانِ من! ہم نے تو ملائکہ کا ترجمہ فرشتے کیا اور بات بن گئی ''کہ جی دیندے ہون گے اوتھے گواہی ہن ساہنوں کی

پتہ ہیگا'' (کہ جی! وہاں گواہی دیتے ہونگے' یہاں ہمیں کیا پتہ!)۔ یہ تو IN-CAMERA کچھ ہو رہا ہے باہر والوں کو پتہ ہی نہیں چلتا۔ ہم یونہی آگے چل دیے کیونکہ اس میں بڑی آسانیاں ہیں۔

ملائکہ کی شہادت ان لوگوں سے پوچھیے کہ جنہوں نے اس محسوس کائنات میں خدا کی قوتوں کی WORKING کو دیکھا ہے کہ کس طرح سے کارفرما ہیں۔ آپ کو معلوم ہے کہ سائنس کے دو بنیادی قانون' FUNDAMENTAL PRINCIPLES OF SCIENCE ہیں۔ اس محسوس کائنات میں جس طرح سے خدا کا قانون کام کر رہا ہے اس کے مطالعہ' مشاہدہ' تجربہ' کو سائنس کہتے ہیں۔ اس کی کوئی بھی BRANCHES ہوں۔ یہ لوگ جنہوں نے اس قانون کا مطالعہ اور مشاہدہ کیا ہے' DISCOVER کیا ہے' کہ یہ قوتیں کائنات کے اندر کس طرح سرگرمِ عمل ہیں۔ انہوں نے سائنس کے دو بنیادی قانون قائم کیے ہیں۔ انہی کے اوپر مختلف BRANCHES OF SCIENCE کی ساری عمارتیں اٹھتی ہیں۔ ایک LAW ہے LAW OF CAUSE & EFFECT کہ یہاں کوئی کام یا کوئی نتیجہ الل ٹپ یوں ہی نہیں وجود میں آجاتا۔ جو نتیجہ مرتب ہوتا ہے اس کے پیچھے اس کا ایک سبب ہوتا ہے ایک CAUSE ہوتا ہے۔ اس CAUSE کا نتیجہ EFFECT میں آتا ہے۔ یہ اس کائنات کا ایک FUNDAMENTAL LAW ہے۔ اور دوسرا LAW ہے LAW OF UNIFORMITY OF NATURE (وحدتِ قانونِ کائنات)۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ اس کائنات میں GIVEN SPECIFIC CIRCUMSTANCES CONDITION یعنی اگر آپ خاص CONDITIONS کو اس کائنات کے اندر کسی مقام پر لے آئیں وہاں وہ قانون وہی نتیجہ مرتب کرے گا۔ اس سے پہلے تو یہ لوگ اسی زمین پر یہ کچھ کرتے تھے مثلاً یہ کہ سمندر کی سطح کے اوپر اتنی حرارت پہ پانی ابلنے لگ جاتا ہے ذرا اونچے چلتے چلے جائیں تو وہ اس سے کم حرارت میں ابلنے لگ جاتا ہے۔ خواہ آپ ہمالیہ کے پہاڑ پہ لے جایئے' سویٹزر لینڈ میں لے جایئے' قطبِ شمالی میں لے جایئے' اتنی بلندی پہ پانی اتنی ہی آگ میں ابلنا شروع کر دے گا۔ میں نے مثال عرض کی ہے۔ کوئی LAW آپ UNDER SAME CONDITION ' APPLY کیجیے اس کا ایک ہی نتیجہ مرتب ہوگا۔ اسے LAW OF UNIFORMITY OF NATURE کہتے ہیں۔ میں نے عرض کیا تھا کہ اس سے پہلے تو یہ اسی زمین پہ کرتے تھے۔ اب انہوں نے چاند پہ جا کر بھی یہ کیا کہ وہی CONDITIONS وہاں پیدا کر دیں تو آپ کو معلوم ہے کہ وہاں سے ٹیلی ویژن یہاں آ رہی تھی اور کیا چیز اس میں آ رہی تھی۔

آلِ عمران478 تمام کائنات میں وحدتِ قانون (LAW OF UNIFORMITY OF NATURE) کارفرما ہے

کیا عجیب چیزیں ہیں! یہ ساری چیزیں تو کبھی تفصیل سے آئیں گی۔ ان کا ایک ایک گوشہ غور کے قابل ہوگا۔ یہاں یہ نیوز انہوں نے دی کہ خلا پرواز اس جہاز میں سفر کررہے تھے۔ انہوں نے کہا کہ ان میں سے ابھی دو سورہے ہیں۔ پھر انہوں نے کہا کہ اب وہ جاگ اٹھے۔ ان سے یہاں پوچھا کہ تمہیں یہ اتنے لاکھوں میل کے فاصلے سے یہاں کیسے معلوم ہوا؟ ان کی ڈائری میں یہ تھا کہ اتنے وقت تک وہ سورہے تھے۔ انہوں نے کہا کہ سوئے ہوئے آدمی کی دل کی حرکت اور اس کی آواز' جاگنے والے آدمی سے ذرا مختلف ہوتی ہے۔ ہمارے ہاں ان کے دل کی حرکت ریکارڈ ہورہی تھی ہم اس سے یہاں یہ بتارہے تھے کہ اب وہ سورہے ہیں' اب وہ جاگ رہے ہیں۔ وہ کہنے لگے ہم سے لاکھوں میل دور ہونے کے باوجود بھی ہماری نگاہ سے پوشیدہ نہیں ہوسکتے چور کہیں کے۔ سوکر بتاؤ ہم تمہیں بتائیں گے کہ تم سوئے ہوئے تھے۔ یہ کیا ہے؟ سوئے ہوئے کے دل کی دھڑکن ایسی ہوتی ہے۔ اس سے پیشتر تو یہ زمین پہ سونے والے سے انہوں نے ریکارڈ کیا تھا۔ زمین سے لاکھوں میل کے فاصلے پر LAW OF UNIFORMITY OF NATURE ہے کیونکہ انہوں نے اپنے جہاز کے اندر CONDITIONS وہی رکھی ہوئی تھیں جو زمین پر تھیں۔ وہاں بھی سونے والے اور جاگنے والے کے دل کی دھڑکن وہی ہے جو اس زمین کے اوپر دھڑکن ہوتی ہے۔ اتنی عظیم قوت جو ان قوانین کو اس طرح سے جکڑے ہوئے ہے جسے قرآن ملائکہ کہتا ہے' وہ اس چیز کو کنٹرول میں رکھے ہوئے ہیں کہ سونے والے کے دل کی حرکت یہ ہونی چاہیے' جاگنے والے کی یہ ہونی چاہیے۔ اور قرآن نے کہا کہ اگر تم ان FORCES OF NATURE کا بغور مطالعہ کروتو یہ اس چیز کی شہادت دیں گی کہ انہ لا الہ الا ھو ایک ہی کا قانون ہے۔

قرآنِ حکیم کے نزدیک علما وہ ہیں جو ہر آن اٹھتے بیٹھتے چلتے پھرتے کائنات کی بلندیوں اور پستیوں پر غوروفکر کرتے ہیں وہ اس بات کی شہادت دیں گے کہ لَآ اِلٰهَ اِلاَّ هُوَ (3:18)

برادرانِ عزیز! اسی لیے قرآنِ کریم نے علما کہا ہی ان کو ہے جنہیں آپ سائنٹسٹ کہتے ہیں۔ قرآن نے یہ لفظ ان کے لیے استعمال کیا ہے۔ لیکن ایک شرط ہے کہ یہ شہادت خود خدا نے دی' اس کی کارفرما قوتوں نے دی۔ وَ اُولُوا الْعِلْمِ (3:18) صاحبانِ علم' اربابِ علم' اس کی شہادت دیں گے۔ اب آ گئی انسانوں کی زندگی۔ ملائکہ کے متعلق تو خدا نے کہا ہے کہ وہ اپنی مرضی

سے کچھ نہیں کر سکتے۔ اس لیے ان کی شہادت کے اندر ان کے اپنے کسی عمل کا' ارادے کا' نیت کا' خیانت کا' کوئی دخل نہیں ہوسکتا۔ اب انسانوں کی دنیا آ گئی۔ اس میں تو صاحب علم انسان کے کے ساتھ جب جذبات شامل ہوتے ہیں تو پھر آپ کو معلوم ہے کہ یہاں وہی علم کیا کرتا ہے۔ یہاں یہ اُولُوا الْعِلْمِ (3:18) کہہ کر بات چھوڑ نہیں دی کہ صاحب علم اس کی شہادت دے گا بلکہ یہاں انسانوں کی دنیا میں آ کر اُولُوا الْعِلْمِ (3:18) کے بعد کہا کہ اُولُوا الْعِلْمِ قَآئِمًا بِالْقِسْطِ (3:18) وہ ارباب علم جو انصاف پہ قائم ہوں گے وہ اس کی شہادت دیں گے۔ یہاں اس صفت کے ساتھ مشروط کر دیا۔ جو کسی طرف جھک جائے گا' انصاف کا راستہ چھوڑ دے گا' وہ کچھ اور شہادتیں دے گا۔ وہ جو اس میں اپنے اس قسم کے ذاتی و قلبی رجحانات کو در انداز نہ ہونے دے گا وہ اس کی شہادت دے گا کہ شَهِدَ اللّٰهُ اَنَّهٗ لَآ اِلٰـهَ اِلَّا هُوَ لا وَ الْمَلٰٓئِكَةُ وَ اُولُوا الْعِلْمِ قَآئِمًا بِالْقِسْطِ ط لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ (3:18)۔

پوری کائنات کا خالق اور مالک ہونے کے باوجود' العزیز ہونے کے باوجود وہ الحکیم بھی ہے یعنی اس کا اقتدار حکمت پر مبنی ہے

لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ (3:18) کو پھر دہرایا۔ یہ کتنی عظیم چیز ہے کہ بڑا صاحب اقتدار' بڑا صاحب اختیار۔ لیکن کیا اقتدار و اختیار ہلاکو اور چنگیز کا سا؟ معاذ اللہ۔ هُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ (3:18) بڑے غلبے کا مالک۔ یہاں تک تو یہی چیز ذہن میں آ سکتی ہے کہ اتنی بڑی قوت اور غلبہ تو ہلاکو اور چنگیز کے پاس بھی تھا۔ کہا کہ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ (3:18) خدا کا غلبہ اور قوت اور اقتدار' حکمت پر مبنی ہے۔ ہر چیز RATIONALLY استعمال کرنے والا' ہر قانون کے پیچھے ایک REASON ہے۔ اسی کو قرآن نے حکمت کہا ہے۔ کتاب اور حکمت۔ قانون کے ساتھ اس کی THE WHY OF IT کہ یہ چیز کیوں کہی گئی ہے' یہ نتیجہ ایسا کیوں مرتب ہوگا۔ یہاں کہیں دھاندلی نہیں ہے یہاں کوئی چیز یوں ہی BY CHANCE نہیں ہو جاتی بلکہ قانون کے تابع ہوتی ہے۔ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ (3:18) سے تصور آتا تھا کہ صاحب! بڑی قوتوں کا مالک ہے ہر وقت ڈرتے رہنا چاہیے پتہ نہیں کس وقت کیا کر دے۔ ٹھیک ہے الْعَزِيْزُ (3:18) ہے اتنی بڑی قوتوں کا مالک ہے لیکن ڈرنے کی بات نہیں ہے کیونکہ الْحَكِيْمُ (3:18) ہے یعنی قوت کا استعمال حکمت کے ساتھ' REASON کے ساتھ ہے۔ یہ جو اس قسم کا لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ (3:18) ہے کہ جس کی شہادت خدا دے' اس کی کتاب دے' FORCES OF NATURE دیں' اربابِ علم جو انصاف پہ قائم ہوں

وہ دیں۔ وہ اس قسم کا عزیز اور حکیم خدا' اس قسم کا نظام' اس قسم کا قانون۔ یہ کیا ہے؟ اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰہِ الْاِسْلَامُ (3:19) **آلِ عمران** 478 ہے کہ یہ الاسلام ہے جو خدا کا مقرر کردہ دین ہے۔ وہ نظامِ زندگی کہ جس میں لَآ اِلٰہَ اِلَّا ھُوَ (3:18) اس کے سوا کسی اور کا اختیار اور اقتدار نہ ہو۔

ہزار سال سے ملتِ اسلامیہ میں ہر قوم پر غیر اسلامی اور مبہم بحثوں کا سبب اُن کی نوعیت اور انکا علاج

ابھی میں عرض کروں گا کہ اس کے اقتدار اور اس کے اختیار کے کیا معنی ہیں' انسانوں کی دنیا کے اندر اس کا استعمال کیسے ہوتا ہے اور اس بنیاد لَآ اِلٰہَ اِلَّا ھُوَ (3:18)۔ اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰہِ الْاِسْلَامُ (3:19) عملی شکل کیا ہے۔ میں نے جو بات کہی تھی کہ ہمارے ہاں اِدھر سے اُدھر گھسیٹے پھر رہے ہیں کہ یہ اسلامی ہے یہ غیر اسلامی ہے یہ اسلامی ہے یہ غیر اسلامی ہے۔ یہی نہیں ہے کہ اِس کے نزدیک اسلامی ہے اور اُس کے نزدیک غیر اسلامی ہے بلکہ آج ہی اِس کے نزدیک اسلامی ہے' اِسی کے نزدیک غیر اسلامی ہے اور پرسوں پھر اسلامی ہے ۔''غریب کی جورو سب کی بھابھی''۔ سارے کھینچے لیے پھر رہے ہیں کہ اسلام نے یہ کہا ہے' اسلام میں یہ آیا ہے۔ اگر پوچھیے تو کوئی متعین بات نہیں ہوگی۔ اگر آپ یہ کہیں گے کہ پرویز نے یہ کہا ہے تو ٹھیک ہے اس کی کسی کتاب کا حوالہ دینا ہوگا' بتانا ہوگا کہ کہیں لکھا ہوا۔ اس کے پاس جا کر آپ پوچھیں گے کہ تم نے یہ کہا یا نہیں۔ متعین شخص ہے اس کو کہتے ہوئے سنا ہو تو متعین بات ہو جائے۔ اگر آپ یہ کہیں گے کہ مثلاً فلاں کتاب میں یہ لکھا ہے تو کتاب موجود ہے اس میں آپ بتا سکیں گے کہ فلاں شخص نے یہ کہا ہے۔ لیکن جب آپ یہ وہی مبہم چیز کہہ دیں کہ اسلام نے یہ کہا ہے' شریعت کا یہ حکم ہے۔ بھئی! ہمیں پہلے متعین کر کے بتاؤ کہ یہ ایک کتاب ہے اس کے اندر جو لکھا ہوگا' اسے ہم شریعت کہتے ہیں۔ پھر جب آپ کہیں گے کہ شریعت نے یہ کہا تو اس کے معنی یہ ہیں کہ اس کتاب کے اندر یہ لکھا ہے۔ تو اگر اس کتاب کو آپ غیر محرف رکھ چھوڑیں گے' اس میں کوئی تبدیلی نہیں کریں گے تو پھر تو یہ نہیں ہوگا کہ آج ایک بات کو آپ اسلامی یا شریعت کے مطابق کہیں اور کل اسی بات کو آپ غیر اسلامی کہہ دیں۔ کیونکہ اس صورت میں تو آپ کے خلاف یہ حجت قائم ہو جائے گی کہ صاحب! یہ جسے آپ نے شریعت یا اسلام یا دین کہا تھا' اس میں یہ بات لکھی تھی۔ آپ نے کل کہا تھا کہ یہ ٹھیک ہے ہم نے تصدیق کر لیا' آج آپ کہہ رہے ہیں کہ نہیں یہ بات غیر اسلامی ہے۔ تو بتا دیجیے اس کے اندر کہاں لکھا ہے۔ آپ کے پاس مدار ہو جائے گا' معیار ہو جائے گا۔ یہ معیار تھا شَھِدَ اللّٰہُ (3:19) جو اس نے کہا کہ خدا کی شہادت تو اس کی کتاب سے ملتی ہے۔ کتاب مبین ہے' کتاب متعین ہے۔ کتاب کا دعویٰ یہ ہے کہ مجھ میں کوئی اختلافی بات نہیں ہے' کوئی تضاد نہیں ہے' قیامت تک کے لیے' تمام انسانوں کے لیے ہے۔ سوال

ہی نہیں ہوسکتا کہ 60ء میں آپ ایک چیز کہہ لیں 68ء میں آ کر دوسری چیز کہہ دیں۔ پہلے الیکشن میں کچھ کہیں دوسرے میں کچھ کہیں۔ کہیں وہ اسلامی ہے کہیں یہ غیر اسلامی ہے۔ جس کے خلاف جی چاہے آپ ڈگڈگی پیٹ دیں کہ یہ غیر اسلامی ہے۔ چار لونڈے پیچھے لگا دیے کہ یہ غیر اسلامی ہے۔ اور کل کو آپ خود کہہ دیجیے کہ یہ اسلامی ہے۔ یہ کیوں ہو رہا ہے؟ اس لیے کہ اسلام کا مفہوم جان بوجھ کر متعین نہیں کرتے کیونکہ اس سے یہ اس قسم کی چیزیں کہنے کی گنجائشیں باقی رہتی ہیں۔ اسلام کا متعین واضح مفہوم خدا کی کتاب کے اندر ہے۔ جس میں تبدیلی نہیں ہوسکتی جس میں اضافہ نہیں ہوسکتا۔ وَتَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ صِدْقًا وَّعَدْلًا ۭ لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِهٖ (6:115) تبدیلی نہیں ہوسکتی' تحریف نہیں ہوسکتی۔ ہر زمانے کے لیے' ہر انسان کے لیے' جو اس نے آج حرام کہا ہے' وہ قیامت تک کے لیے حرام کہے گا۔ جسے اس نے آج جائز کہا ہے' وہ قیامت تک کے لیے ہر انسان کے لیے وہ جائز ہوگی۔ آپ روز روز بدل نہیں سکتے۔ یہ تھا الاسلام۔ اس ایک متعین کتاب پہ لے آیئے' اسے اپنا معیار بنا لیجیے تو آپ دیکھیں گے کہ یہ ساری ہنگامہ خیزیاں' شورش انگیزیاں ختم ہو جائیں گی۔ اسلام کے نام کے اوپر بہتر فرقے ہیں' اسلام کے نام پہ روز سر پھٹول ہو رہی ہے۔ اس لیے کہ اسے مبہم رکھا گیا ہے' غیر واضح اور غیر متعین رکھا گیا ہے۔ دیکھیے! اِنَّ الدِّيْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ (3:19) کہاں آیا ہے۔ اور پھر آ گئی ہماری وہ حالت کہ وَمَا اخْتَلَفَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ مَا جَاۗءَھُمُ الْعِلْمُ بَغْيًۢا بَيْنَھُمْ (3:19) یہ العلم آ جانے کے بعد پھر اختلاف کیوں پیدا ہوتے ہیں' اس کا علاج کیا ہے؟

آج وقت ہو گیا۔ اسے ہم آئندہ درس میں لے لیں گے۔ سورۃ آل عمران کی 18 ویں آیت ختم کی۔ 19 ویں آیت آج ہمارے سامنے آئی اسے ہم آئندہ لیں گے' آئندہ بھی یہی مضمون چلے گا۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا ۭ اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ (2:127)

❀...❀...❀

چوتھا باب: **سورۃ آل عمران** (آیات 19 تا 25)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عزیزانِ من! آج اکتوبر 1969ء کی 5 تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز سورۃ آلِ عمران کی 19 ویں آیت سے ہوتا ہے:((3:19۔

قرآنِ حکیم نے شروع سے انسانی زندگی کے علاوہ خارجی کائنات میں وحدتِ قانون کا نام الاسلام تجویز کیا ہے

سابقہ آیت میں یہ کہا گیا تھا کہ شَهِدَ اللّٰهُ اَنَّهٗ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۙ وَ الْمَلٰٓئِكَةُ وَ اُولُوا الْعِلْمِ قَآئِمًاۢ بِالْقِسْطِ ؕ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْعَزِیْزُ الْحَكِیْمُ ((3:18 اور اس کے بعد تھا کہ اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ 3: (19) تو لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ الاسلام ہے' الدین ہے' وہی نظامِ حیات ہے' کائنات میں وہی قانون کارفرما ہے۔ جسے میں نے کہا تھا کہ LAW OF UNIFORMITY OF NATURE (خارجی کائنات میں وحدتِ قانون) ایک ہی قانون چل رہا ہے۔ اور وہی ہے الہ واحد کا مفہوم۔ وہی ایک قانون' ایک ضابطۂ آئین' انسانی زندگی کے اندر بھی ہونا چاہیے۔ اور یہ آئین' یہ قانون' یہ ضابطہ وہ ہے جو حضراتِ انبیائے کرامؑ کی وساطت سے انسانوں کو وحی کے ذریعے سے ملتا رہا۔ اس ساری وحی کی ساری تعلیم کا ملخص یہ ہے کہ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ (3:18) اقتدار اور اختیار' محکومیت کا حق' قابلِ اطاعت' صرف ایک جسے اللہ کہا جاتا ہے۔ اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ ((3:19 یہ ہے

الاسلام' یہ ہے وہ اصولی چیز جسے الاسلام کہا۔ اور جب یہ انسانی زندگی کے اندر عملی شکل اختیار کرے گا تو یہ الدین ہوجائے گا
نظامِ حیات یہ ہے کہ خدا کے سوا کسی اور کی محکومیت اختیار نہ کی جائے۔ اسے الاسلام کہا جائے گا۔

دیگر مذاہب کی طرح اسلام کے ماننے والوں کی ناگفتہ بہ حالت کی بنیادی وجہ اور پھر اس کا شافی علاج

دین کا یہی اصول تھا جو پہلے دن سے انبیائے کرامؑ کی وساطت سے آتا رہا اور حضورِ خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر آکر تکمیل تک پہنچ گیا۔ الدین وہی ہے۔ لیکن پھر اگر وہی ایک ہی چیز تھی جو شروع سے آخر تک آتی رہی اور جس کے متعلق قرآن نے کہا ہے کہ کوئی قریہ ایسا نہیں تھا' کوئی قوم ایسی نہیں تھی' کوئی ملک ایسا نہیں تھا' جس میں یہ وحی کے علمبردار پیغمبر نہ آئے ہوں۔ تو وہ خدا کی طرف سے ایک ہی دین لے کر آئے۔ تو اب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ قدم قدم پہ خدا کے ماننے والے' خدا کی طرف سے لائی ہوئی تعلیم کے حامل ہونے کے مدعی' آپس میں اختلاف کر رہے ہیں۔ اور اختلاف بھی ایسا کہ دیگر مسائل پہ اختلاف تو پھر بھی کبھی مٹ سکتے ہیں اور مٹ جاتے ہیں لیکن یہ اختلافات تو مٹتے ہی نہیں۔ یہ کیا ہوا کہ ہر قوم نے وحی سے اپنا دین' سرچشمۂ تعلیم پایا اور اس کے بعد کیفیت یہ ہے کہ ایک کی بات دوسرے سے ملتی نہیں ہے۔ میں ابھی مختلف مذاہبِ عالم کے اختلاف کی بات کر رہا ہوں۔ اور اس کے بعد جب آپ آگے چلے تو ایک مذہب کو لیجیے جسے آپ اسلام کہتے ہیں اور اس کے اندر اختلاف کی بات۔ وہاں ایک مذہب کی تعلیم دوسرے مذہب سے نہیں مل رہی۔ یہاں ایک فرقے کی تعلیم دوسرے فرقے سے نہیں مل رہی۔ تمام اہلِ مذاہب خدا پرست کہلانے کے مدعی' یہ تمام مسلمان ایک ہی دین کے پیرو ہونے کے مدعی۔ وہاں مذہب اور مذہب میں فرق یہاں ایک مذہب کے تابع فرقے اور فرقے میں فرق۔ اتنا بڑا اختلاف۔ یہ اختلاف کیوں واقع ہوا ہے؟ باقی مذاہب کے متعلق تو بہر حال اتنا کہہ کر ہم آگے بڑھ جاتے ہیں کہ ان کی اصلی تعلیم جو خدا کی طرف سے ملی تھی' اپنی غیر منزہ حقیقی شکل میں کہیں باقی نہ رہی۔ باقی نہ رہی تو اس کے بعد اختلافات ہو گئے۔ ٹھیک ہے وہ حقیقی شکل میں ہے ہی نہیں۔ اگرچہ وہ اپنی اصلی شکل میں باقی نہیں رہی کیونکہ حوادثِ ارضی اور سماوی سے بھی ایسا' کہ آسمانی صحیفے ان کے ہاں محفوظ نہ رہے' یہ کم ہوا۔ لیکن جہاں ایسا نہیں ہوا' وہاں بھی اپنی اصلی شکل میں وہ محفوظ نہیں ہیں۔ خود ان اہلِ مذاہب نے ان کے اندر اتنی تبدیلیاں' تحریف پیدا کر دی کہ وہ اپنی اصلی شکل میں نہ رہی۔ تو وہاں بھی انسانی ہاتھوں نے کچھ کیا جس کی وجہ سے اختلاف رونما ہوئے۔ لیکن اس سے زیادہ تعجب انگیز شکل تو ہماری ہے کہ خدا کی کتاب اپنی اصلی شکل میں موجود ہے اور اس کے باوجود اتنے آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ اختلافات ہیں۔ فرقے اور فرقے کے ساتھ مناقشت کی' مجادلت کی کیفیت ہے۔ ایسا کیوں ہوا؟ یہیں قرآن بتا رہا ہے اور یہیں سے آغازِ کلام ہوتا ہے

کہ وَ مَا اخْتَلَفَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَهُمُ الْعِلْمُ (3:19) وہ لوگ کہ جنہیں الکتاب یعنی آسمانی کتاب دی گئی تھی، وحی کا علم آ جانے کے بعد انہوں نے باہمی اختلاف کیا۔ تو اس کی ایک ہی وجہ قرآن نے بتائی ہے کہ بَغْيًاۢ بَيْنَهُمْ (3:19) ان لوگوں کا ایک کا دوسرے پر چڑھ دوڑنے کا جذبہ کہ میں غالب آ جاؤں، اسے نیچا دکھا دوں، میں چڑھ دوڑوں۔ بَغْيًاۢ بَيْنَهُمْ (3:19) یہ ہے وہ نفسیاتی کمزوری، یہ ہے وہ کریکٹر کی پستی یعنی ایک دوسرے پر چڑھ دوڑنے کا جذبہ۔ اب اگر ایک ہی تعلیم ہو اور ہر ایک نے اسی کی تبلیغ کرنی ہو، اسی پر عمل کرنا ہو تو پھر ان جذبوں کے تحت کچھ نہیں ہوسکتا۔ وہ اسی صورت میں ہوگا کہ اپنے اپنے ہاں یہ کہا جائے کہ میں جس دین کے اوپر ہوں اور میں جن اعتقادات کو لیے ہوئے ہوں، یہ سچے ہیں دوسرے کے جھوٹے ہیں ۔اور كُلُّ حِزْبٍۢ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُوْنَ (30:32) پھر ہر گروہ ہر فرقہ جس جس مسلک اور جس راستے پہ خود چل رہا ہے، اس میں وہ مگن ہو جائے کہ مجھے تو نہ کسی تحقیق کی ضرورت ہے، نہ تفتیش کی، نہ سچے راستے کی۔ اور باقی سارے جتنے بھی ہیں، وہ تمام کے تمام غلط راستے پہ چل رہے ہیں۔ وہ جو کہا جاتا ہے کہ تہتر فرقوں میں سے بہتر جہنم والے اور ایک جنت والا۔ تو تہتر کے تہتر میں سے ہر فرقہ یہ کہنے والا ہے کہ میں وہ ایک ہوں جو جنت میں جانے والا ہوں، باقی سب جہنم میں جانے والے ہیں۔

مذہبی دنیا میں ہر مذہبی فرقہ اس بات پر مگن ہوتا ہے کہ وہ حق پر ہے اور باقی سب جھوٹے ہیں

قرآن کہتا ہے کہ جب ایسی حالت ہو جائے تو كُلُّ حِزْبٍۢ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُوْنَ (30:32) ہر فرقہ اس میں مگن ہو جاتا ہے کہ حق پر ہوں، باقی سب باطل ہیں۔ قرآن تو تہترویں کا استثناء ہی نہیں کرتا وہ کہتا ہے کہ ان میں سے ہر ایک اس بات پہ، مگن ہوتا ہے، مست ہوتا ہے، مطمئن ہوتا ہے، فریب خوردہ ہوتا ہے، کہ میں سچائی پہ ہوں، باقی سب جھوٹے ہیں۔ بَغْيًاۢ بَيْنَهُمْ (3:19) کا نقشہ آپ نے دیکھنا ہو تو ہمارے ہاں کے مختلف فرقے والوں کے باہمی مناظرے اور مباحثے کبھی دیکھیے۔ آج کل تو بہر حال انہیں کچھ اور ہی مصیبت پڑی ہوئی ہے۔ سیاسی مقاصد سامنے آ گئے، مذہبی چیزیں پیچھے رہ گئیں اور ان کی اہمیت بہت ہی کم ہو رہی ہے۔ ذرا اس سے پہلے جب ان کے آپس میں مباحثے ہوا کرتے تھے تو وہاں بَغْيًاۢ بَيْنَهُمْ (3:19) کی تصویر دیکھنے والی ہوتی تھی۔ نظر آ رہا ہے کہ بات غلط ہے، باطل ہے، پھر بھی اڑے ہوئے ہیں، جمے ہوئے ہیں۔ اپنا ایک ٹولہ اِدھر ہے، دوسرے کا اُدھر ہے۔ پہلے تو وہ متشابہات پہ چلتے تھے پھر محکمات پہ پہنچے۔ گالی گلوچ کے بعد لٹھم لٹھا ہو رہے ہیں۔ ہر مناظرے کا خاتمہ جھگڑے اور فساد پہ ہوتا ہے اور اس کے بعد جلوس نکل رہا ہے، فاتحین گنائے جا رہے ہیں۔

دلی میں ایک مفتی اعظم کے سلسلہ میں فاتحِ اعظم کے جشن کی روائیداد بزبانِ علامہ پرویزؒ 478آلِ عمران

دلی میں میں نے دیکھا کہ ایک بہت بڑے مفتیٔ اعظم کا جلوس نکل رہا ہے۔ فاتح اعظم زندہ باد غازیٔ اعظم زندہ باد مجاہدِ اعظم زندہ باد۔ میں نے کہا کہ پتہ نہیں پانی پت کی چوتھی لڑائی فتح کر کے آئے ہیں۔ پتہ لیا کہ صاحب یہ کون سے غازیٔ اعظم ہیں' کون سے مجاہدِ اعظم ہیں' کیا کر کے آئے ہیں؟ کہنے لگے جی فلاں حضرت صاحب ہیں' مناظرے میں تشریف لے گئے تھے۔ حنفیوں کے ساتھ مناظرہ ہوا۔ اس مناظرے میں آخر میں فساد ہوا۔ فساد میں دھر لیے گئے' چھ مہینے کی قید ہوئی۔ آج خیر سے مجاہدِ اعظم قید سے چھوٹ کر آرہے ہیں۔

فرقہ پرستی میں ہر فرقہ ایک دوسرے پہ چڑھ دوڑتا ہے جو کہ قرآن کی رو سے کفر ہے

بَغۡيَاۢ بَيۡنَهُمۡ (3:19) کیا چیز قرآن کہہ گیا ہے! ایک دوسرے پہ چڑھ دوڑنا' اس سے آگے بڑھ جانے کا جذبہ۔ آج کل بھی آپ دیکھتے ہیں کہ ایک دوسرے سے کس قدر گالم گلوچ ہو رہی ہے۔ ایک دوسرے سے بڑھ جانے کا جذبہ۔ بچپن میں جب تصوف کی کتابیں پڑھا کرتے تھے تو وہاں ایک بڑی دلچسپ کہانی آتی تھی۔ عجب الدولہ نے ایک دفعہ ایک بہت بڑی ریاست کی دعوت کا انتظام کیا۔ اس نے مختلف گروہ کے لوگوں کو بلایا۔ ان میں امرا' وزرا' اہلِ دربار' علما' صوفیائے کرام' شامل تھے۔ ہر ایک کے اندر آنے کے لیے اس نے الگ الگ دروازہ متعین کر دیا۔ دیکھا کہ دعوت کا وقت ہو چکا لیکن علمائے کرام کی کرسیاں ابھی خالی ہیں' صوفیائے عزام کی کرسیاں بھی خالی ہیں۔ ان میں سے ایک بھی نہ آیا۔ باہر جا کر اس نے دیکھا کہ علماء کرام کے دروازے کے باہر بھیڑ لگی ہوئی ہے اور دھکم دھکا ہو رہا ہے۔ ہر ایک ان میں سے دوسرے کو دھکا دے کر پیچھے ہٹا رہا ہے' آپ بڑھنے کی کوشش کر رہا ہے۔ ایک بھی اندر نہیں آ رہا۔ اور چونکہ دوسری طرف تصوف والوں کی قطار تھی۔ یہ گئے تو انہوں نے دیکھا کہ وہ صوفیائے کرام کھڑے ہیں' ہر ایک دوسرے سے کہہ رہے ہیں آپ تشریف لے جائیے میں تو خاکسار عاجز ہوں' میں پیچھے جاؤں گا۔ ان میں سے بھی کوئی آگے نہیں بڑھ رہا۔ بہر حال اس زمانے میں تو ہمارے بھی سر جھکتے تھے' میں انہیں وادیوں میں تھا۔ اہلِ شریعت کے مقابلے میں ہم یہ چیزیں تصوف بتانے کے لیے پیش کیا کرتے تھے۔ یہ تو قرآن سامنے آیا تو پتہ چلا کہ یہ دونوں باطل ہیں۔ لیکن اس میں یہ جو چیز بَغۡيَاۢ بَيۡنَهُمۡ (3:19) کی علما کی دکھائی گئی تھی کہ ایک دوسرے کو دھکا دے کر پیچھے رکھ کر آپ آگے بڑھ جانا۔ یہ ہے وہ ذہنیت۔ قرآن کہتا ہے کہ العلم آنے کے بعد تو ان کو ایک نقطے پہ متحد ہو جانا چاہیے تھا۔ العلم آجانے کے

بعد یہ کیفیت کہ ایک دوسرے کو دھکا دے کر' پیچھے چھوڑ کر' آگے بڑھ جانے کی ذہنیت کیا ہے؟ یہ کیفیت بَغْیًا بَیْنَهُمْ (3:19)
کی ہے۔ اس سے اختلاف پیدا ہوا۔ الاسلام میں کچھ فرق نہیں آ گیا تھا۔ یہ جو پیامبر ان چیزوں کے علم بردار تھے' ان چیزوں کے مدعی تھے' ان چیزوں کے اجارہ دار تھے۔ یہ بَغْیًا بَیْنَهُمْ (3:19) کی وجہ سے آپس میں یہ کیفیت ہوئی۔ اور دیکھیے قرآن اس کو کیا قرار دے رہا ہے؟ وَ مَنْ یَّكْفُرْ بِاٰیٰتِ اللّٰهِ فَاِنَّ اللّٰهَ سَرِیْعُ الْحِسَابِ (3:19) اس طرح انہوں نے قوانینِ خداوندی سے کفر اختیار کر لیا۔ ہر ایک خدا پرستی کا مدعی ہے۔ یہاں تو کفر کہا اور اس آیت (30:31) میں جس کا آخری ٹکڑا میں نے ابھی پیش کیا وہاں تو شرک ہے۔

قرآنِ حکیم نے فرقہ بندی کے عمل کو شرک قرار دیا ہے جو سب سے بڑا جرم ہے

وَ لَا تَكُوْنُوْا مِنَ الْمُشْرِكِیْنَ ۝ مِنَ الَّذِیْنَ فَرَّقُوْا دِیْنَهُمْ وَ كَانُوْا شِیَعًا ؕ كُلُّ حِزْبٍۭ بِمَا لَدَیْهِمْ فَرِحُوْنَ (30:32)

اے اہلِ ایمان' اے جماعتِ مؤمنین' اے مسلمانو! دیکھنا! ایمان لانے کے بعد پھر کہیں مشرک نہ ہو جانا۔ یہ بہت بڑی چیز تھی کہ صاحب! اس کے بعد آدمی مشرک کیسے ہو سکتا ہے؟ کہا یہ ٹھیک ہے کہ تم بتوں کے سامنے نہیں جھکو گے لیکن ہم بتاتے ہیں کہ شرک کیا ہوتا ہے؟ مشرک نہ ہو جانا یعنی ان لوگوں میں سے نہ ہو جانا جنہوں نے دین میں فرقے بنا لیے۔ عزیزانِ من! قرآن کی کھلی ہوئی آیتیں ہیں۔ پھر اس آڑ میں' اس سپر میں' اپنے آپ کو محفوظ کر لینا کہ ایک ہم حق پہ ہیں۔ قرآن کہتا ہے کہ كُلُّ حِزْبٍۭ بِمَا لَدَیْهِمْ فَرِحُوْنَ (30:32) پھر ہر گروہ مگن ہو جاتا ہے کہ جس چیز پہ میں ہوں' وہ حق ہے اور باقی سب باطل پہ ہیں۔ بَغْیًا بَیْنَهُمْ وَ مَنْ یَّكْفُرْ بِاٰیٰتِ اللّٰهِ فَاِنَّ اللّٰهَ سَرِیْعُ الْحِسَابِ (3:19)۔ اختلاف تو دور کی بات ہے قانونِ خداوندی کا نتیجہ تو اس دنیا کی سرفرازیاں اور خوشحالیاں ہونا چاہیے تھا۔

وحی کے بغیر دنیا بھر میں اہلِ مذاہب کی حالت

عزیزانِ من! آپ غور کر کے دیکھیے گا کہ دنیا میں جتنے اہلِ مذہب ہیں وہ سارے ذلت اور پستی کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔ یہ آیات اللہ سے کفر ہے' یہ قوانینِ خداوندی سے انکار ہے۔ انسانی زندگی کے اندر بھی اور خارجی کائنات میں بھی آیات اللہ ہیں۔ اہلِ مذہب ان دونوں آیات اللہ سے انکار کرتا ہے۔ نہ وہ خارجی کائنات میں سائنٹسٹ بنتا ہے' نہ وہ دین کے اندر خدا کے بتائے ہوئے نظام کا پیرو ہوتا ہے۔ خَسِرَ الدُّنْیَا وَ الْاٰخِرَةَ ؕ ذٰلِكَ هُوَ الْخُسْرَانُ الْمُبِیْنُ (22:11) یہاں کا بھی اندھا

وہاں کا بھی اندھا۔ وَ مَنۡ کَانَ فِیۡ ہٰذِہٖۤ اَعۡمٰی فَہُوَ فِی الۡاٰخِرَۃِ اَعۡمٰی (17:72) جو یہاں کا اندھا ہے وہ وہاں کا بھی اندھا ہوتا ہے۔ اللہ تو سریع الحساب ہے۔ کہتا ہے کہ ہم ان سے بہت جلد حساب لے لیتے ہیں۔ کتنی جلدی حساب ہوتا ہے؟ ان قوموں سے پوچھیے۔

اس کے بعد نبی اکرم ﷺ سے کہا گیا کہ فَاِنۡ حَآجُّوۡکَ فَقُلۡ اَسۡلَمۡتُ وَجۡہِیَ لِلّٰہِ وَ مَنِ اتَّبَعَنِ ((3:20 اس کے باوجود اگر یہ اہلِ کتاب اس چیز کے مدعی ہیں کہ ہمارے پاس بھی یہ دین آیا تھا ہم بھی اس دین کے حامل ہیں۔ اگر اس کے بعد بھی تم سے جھگڑا کریں تو جھگڑا کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ ان سے یہ کہہ دو کہ ٹھیک ہے اگر تم اسے تسلیم نہیں کرتے تو اپنے غلط راستے پہ چلو۔ اس کا نتیجہ تمہیں خود مل جائے گا۔ میری تو کیفیت یہ ہے کہ میں اپنے آپ کو خدا کے قانون کے سامنے جھکا تا ہوں۔

اگر مسلمانوں کے تمام فرقے سنّت کے ایک مفہوم پر متفق ہوجائیں تو تمام اختلافات ختم ہوسکتے ہیں

عزیزانِ من! یہاں عجیب چیز ہے۔ ہمارے ہاں سنتِ نبوی ﷺ کے اتباع پہ اتنا زور دیا جاتا ہے۔ یقیناً زور دیا جانا چاہیے۔ راستہ ہی وہی ہے۔ سوال یہ ہے کہ وہ سنت ہے کیا؟ ان حضرات سے پوچھیے تو یہاں بیس برس تو انہیں پوچھتے ہوئے ہمیں بھی گذر گئے کوئی دو فرقے متفق طور پر نہیں بتا سکتے کہ سنتِ رسول اللہ ﷺ کسے کہتے ہیں۔ ہر فرقے کے ہاں اپنی اپنی احادیث' اپنی اپنی سنتِ رسول اللہ ﷺ ہے۔ قرآن نے یہاں کیا بتایا ہے؟ دیکھیے یہاں اتباع کہا ہے اور رسول اللہ ﷺ کی زبانِ مبارک سے کہلوایا ہے کہ اگر تم لوگ اس چیز سے انکار کرتے ہو کہ دین لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ ہے تو تم کرو انکار' میں تو اس کے سامنے جھکتا ہوں۔ وَجۡہِیَ لِلّٰہِ وَ مَنِ اتَّبَعَنِ ؕ((3:20 اور جو میرا اتباع کرے گا وہ بھی یہی کچھ کرے گا۔ عزیزانِ من! غور طلب چیز ہے۔ جب آپ نے ایک کو اللہ مان لیا اور اس کے قوانین کے سامنے جھکنے کا نام آپ نے دین یا الاسلام رکھ لیا اور وہ آپ کے پاس اس کی کتاب میں محفوظ ہو تو پھر اس کے لیے کوئی وجہ بھی ہے کہ اس سے اختلاف ہوجائے؟ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ یہ اتباع کس چیز کا اتباع ہے یعنی رسول اللہ ﷺ نے کس بات کا اتباع کیا؟ لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ کا۔ ابھی وہ آیات آجاتی ہیں جن میں لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ کی تشریح پھر کردی گئی۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات کسی فرقے کی حامل نہ تھی

کیا حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانے میں بھی کوئی فرقے تھے؟ یہ جو تہتر میں سے ہر ایک یہ کہتا ہے کہ میں سچائی پہ ہوں، دوسرے گمراہ ہیں۔ کیا ان تہتر میں سے کوئی بھی یہ ثابت کر سکتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس فرقے سے BELONG کرتے تھے یعنی کیا وہ سنی تھے، شیعہ تھے، سنیوں میں سے حنفی تھے، مالکی تھے، حنبلی تھے، شافعی تھے، دیوبندی تھے، بریلوی تھے؟ کیا نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ان میں سے کسی فرقے سے بھی تعلق تھا؟ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ میں اور میرے متبعین اس روش پہ ہیں۔ تو روش تو وہ تھی جس میں کسی فرقے کا وجود نہیں تھا۔ بات تو وہ ذرا سی مزاح کی ہے لیکن اس کے اندر ایک بڑی حقیقت پوشیدہ ہے۔

مقلِّد اور غیر مقلِّد حضرات کے ہاں پایا جانے والا تصور

ہمارے ہاں مقلّد اور غیر مقلِّد حضرات ہیں۔ مقلِّد حضرات کہتے ہیں کہ کسی امام کی تقلید ضروری ہے، اس کے بغیر نجات نہیں ہو سکتی۔ اور ان میں سب سے بڑے امام امامِ اعظم امام ابوحنیفہؒ ہیں۔ ان مقلدین کا عقیدہ یہ ہے کہ ان کی تقلید کے بغیر نجات نہیں ہو سکتی۔ ایک صاحب یہ وعظ فرما رہے تھے کہ ایک سادا لوح، صرف مسلمان، نے یہ پوچھا کہ کیا حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بھی امام ابوحنیفہؒ کے مقلّد تھے؟ انہوں نے کہا کہ نہیں امام ابوحنیفہؒ تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے بہت بعد پیدا ہوئے۔ وہ کہنے لگا کہ پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم غیر مقلّد ہی مر گئے۔ یعنی اسے دھکا لگا۔ عزیزانِ من! سوچیے یہ سادہ لوح کتنی بڑی بات کہہ گیا۔ بڑی باتیں سادہ لوح ہی کیا کرتے ہیں۔ یہ تو منطق ہے جو آپ کو ان سرحدوں میں لے جاتا ہے۔ کتنی بڑی بات یہ سادہ لوح کہہ گیا کہ نجات کا مدار اگر تقلیدِ امام ابوحنیفہؒ پر ہے تو جس نے بھی ان کی تقلید نہیں کی، نجات تو نہیں ہوئی۔ اس میں کتنا درد ٹپکتا ہے کہ پھر حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم غیر مقلّد ہی مر گئے۔ اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اب (معاذ اللہ) نجات کی کیا شکل ہوگی۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا مسلک لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ (3:18) ہے

عزیزانِ من! حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں کہ میں بھی اس لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ (3:18) کے سامنے جھکتا ہوں وَ مَنِ اتَّبَعَن (3:20) اور تم نے اگر دیکھنا ہو کہ میرا اتباع کون کرتا ہے، متبعِ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کون ہے، سنتِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا اتباع کرنے والا کون ہے؟ تو یہ دیکھو کہ وہ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ (3:18) کا اتباع کرتا ہے یا نہیں۔ یہاں اگر وہ اللہ کے بعد کسی شخصیت تک جا کر رک گیا تو اللہ کا اتباع نہ ہوا۔ اور فرقہ اس لیے شرک ہوتا ہے کہ ان کے ہاں سند اور حجت کسی نہ کسی انسان کا قول ہوتا ہے، خدا کی کتاب

نہیں ہوتا۔ ان سے جا کر کوئی مسئلہ پوچھیے تو ہمیشہ یہ گنائیں گے کہ فلاں امام نے یہ کہا' فلاں محدث کا یہ قول ہے' فلاں مفسر کا یہ ارشاد ہے' فلاں کا یہ مسلک ہے۔ کسی نہ کسی شخصیت کا نام آ جائے گا' خدا تک نہیں پہنچا جائے گا۔ خدا تک اگر پہنچ جائیں تو تفرقے کا' فرقے کا' اختلاف کا' سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

تیری درگاہ میں پہنچے تو سبھی ایک ہوئے

وہاں پہنچو تو سہی۔

آپ کو پتہ ہے کہ قرآن نے مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ (2:165) کہا ہوا ہے۔ وَ مِنَ النَّاسِ مَنْ يَّتَّخِذُ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَنْدَادًا (2:165) عام طور پہ تو کہا جاتا ہے کہ خدا کے علاوہ۔ دون کے معنی ہوتا ہے کہ ''ورے ہی''۔ یہ بڑی عجیب چیز ہے کہ یہ خدا سے ورے ہی کسی کو خدا بنا لیتے ہیں۔ فرقہ ہمیشہ خدا سے ورے ہی کسی کو خدا بنانے سے ہوتا ہے وہاں تک جانے کی ضرورت ہی نہیں ہوتی۔ اور حضور ﷺ نے فرمایا اَسْلَمْتُ وَجْهِيَ لِلّٰهِ وَ مَنِ اتَّبَعَنِ (3:20) جو میرا اتباع کرتا ہے اس کا مسلک لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ (3:18) ہوگا۔ ابھی یہ نظر آ جائے گا کہ پھر لَآ اِلٰهَ کہاں سے ملے گا؟ ایک ہی آیت کے بعد آتا ہے۔

وَ قُلْ لِّلَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ وَ الْاُمِّيّٖنَ (3:20) اے رسول اب پکار کر کہہ دو۔ عزیزانِ من! یہ بڑی اہم آیت آئی ہے۔ پکار کر کہہ دو! کنہیں پکار کر کہہ دو؟ ایک تو الْاُمِّيّٖنَ (3:20) ہیں جن کے متعلق کہا ہے کہ وہ عرب کے رہنے والے اس کے مدعی نہیں تھے کہ ان کی طرف پہلے کوئی رسول آیا تھا۔ اور دوسرے اہلِ کتاب جو اس کے مدعی تھے کہ ان کی طرف رسول آتے رہے اور ان کے پاس کتاب ہے۔ وہ کہ جو اس کے مدعی نہیں تھے انہیں الْاُمِّيّٖنَ (3:20) کہا کہ ان سے بھی کہہ دو۔ یہ ہے اہم چیز۔ اور ان اہلِ کتاب سے بھی کہہ دو۔ ان سے کہو کہ ءَاَسْلَمْتُمْ (3:20) کیا تم بھی اس طرح سے جھکتے ہوا اسلام لاتے ہو؟ فَاِنْ اَسْلَمُوْا فَقَدِ اهْتَدَوْا (3:20) اگر یہ اس طرح سے اس پہ جھکتے ہیں جیسے تم جھک رہے ہو پھر تو یہ راہِ ہدایت کے اوپر ہوں گے۔ وَ اِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّمَا عَلَيْكَ الْبَلٰغُ (3:20) اور اگر یہ دونوں اس سے اعراض برتتے ہیں یعنی وہ بھی کہ جو اہلِ کتاب کہلاتے ہیں اور وہ بھی جنہیں تم اہلِ کتاب نہیں کہتے ہو یا وہ خود اس کے مدعی نہیں ہیں۔ دونوں کی طرف یہ بات آئی۔ اس کے اندر پوری انسانیت آ گئی۔ اگر یہ اس سے اعراض برتتے ہیں تو پھر تیرا کام اس چیز کو پہنچا دینا ہے وَ اللّٰهُ بَصِيْرٌۢ بِالْعِبَادِ (3:20) ہم دیکھ رہے ہیں کہ لوگ کیا کرتے ہیں۔ میں نے کہا تھا کہ یہ اس اعتبار سے اہم آیت ہے۔

مسلمانوں کو ساتھ ملا کر اہلِ یورپ کی طرف سے روس اور چین کی مخالفت دراصل نظامِ سرمایہ داری[478] کی جاذبیت کو بحال رکھنے کی ایک گہری مذہبی چال تھی آلِ عمران

ہمارے ہاں اس دور میں ایک خالص سیاسی رو چلی ۔ روس یا چین سوشلسٹ کے ملک گنے گئے ہیں ۔ ان کا معاشی نظام سرمایہ داری کے نظام کے خلاف ہے ۔ نظامِ سرمایہ داری کے حامی یورپ کی ساری طاقتیں امریکہ' MATERIALIST COUNTRIES جن کو آپ CAPITALISTIC کہتے ہیں' یہ ان کے خلاف اٹھے ۔ یہ خالص سیاسی چیز ہے ۔ اب انہیں مسلمانوں کے ممالک کی ضرورت تھی ۔ یہ مسلمان اپنے ہاں کتنے ہی کمزور وذلیل کیوں نہ ہوں' ان بڑی بڑی سلطنتوں کو ان کی ضرورت پڑ جاتی ہے ۔ ان کی جغرافیائی پوزیشن ایسی ہے کہ یہ بالکل مرکزی پوزیشن لیے ہوئے ہیں ۔ آبادی کے لحاظ سے بھی خدا کے فضل سے ساٹھ ستر کروڑ ہیں ۔ ان COUNTRIES کو ان کی ضرورت پڑتی ہے ۔ اب انہیں اس کی ضرورت پڑی کہ سوشلسٹ کے مقابلے میں کوئی حربہ استعمال کیا جائے ۔ اگر وہ سرمایہ داری نظام کو سامنے لاتے ہیں تو یہ ساری جتنی بھی UNDEVELOPED مملکتیں ہیں یہ تو بھوکوں کی' ننگوں کی ہیں ۔ ان کو تو وہ SUIT کرتا ہے جو یہ کہے کہ وہاں ہر غریب کو روٹی ملے گی ۔ سوشلسٹ کا یہ دعویٰ تھا تو لامحالہ ان کو یہ سوٹ کر جاتا ۔ اگر یہ معاشی نظام کی بات کرتے تو ان کو اپنی طرف کھینچنے کے لیے کوئی بھی چیز کشش اور جاذبیت کی نہیں تھی ۔ اب کیا کرتے ؟ یہ SOCIALIST COUNTRIES ایسی تھیں جو خدا کو نہیں مانتی تھیں ۔ CAPITALISTIC COUNTARIES نے اعلان کیا کہ BELEIVERS IN GOD, UNITE TOGETHER (آؤ خدا کے ماننے والو اکٹھے ہو جاؤ) ۔ یہ بہت بڑا نعرہ تھا ۔ خدا پرستوں کا محاذ قائم ہو گیا اور خدا کے منکرین کا ۔ یہ خالص سیاسی چیز ہے ۔ اس کے اندر مذہبی رنگ آ گیا ۔ اب خدا پرستوں نے سوائے ان دو تین COUNTRIES کے کہ جو کھلے طور پر خدا کا انکار کرتے ہیں باقی ساری دنیا خدا پرستوں کے اندر شامل ہو گئی ۔ ایک نعرے سے کتنا بڑا عظیم محاذ مقابلے میں بن گیا ۔ اور یہی چیز انہوں نے اپنی اس مصلحت کوشی کی بنا پر کہی تھی ورنہ یہی خدا پرست ہر روز یہ دوسرے خدا پرستوں کے ساتھ جو کرتے ہیں' وہ تو معلوم ہے ۔ یہ اسرائیل بھی اور عرب بھی دونوں خدا پرست ہیں ۔ انہوں نے تو سیاسی اعتبار سے اس مصلحت کی بنا پہ یہ کہا لیکن آپ حیران ہوں گے کہ مسلمانوں نے بھی یہ دہرانا شروع کر دیا ۔ عزیزانِ من ! مجھے اس وقت ان نظاموں سے بحث نہیں ہے' مجھے خدا پرستی اور انکارِ خدا سے اصولی بحث نہیں ہے ۔ میں کہہ یہ رہا ہوں کہ مسلمانوں نے بھی تسلیم کر لیا کہ یہ یورپ کے عیسائی اور یہودی خدا پرست ہیں اور یہ سوشلسٹ خدا کا انکار کرنے والے ہیں ۔

قرآنِ حکیم کے نزدیک تو خدا پرستی کا ایک اپنا معیار ہے

ٹھیک ہے وہ خدا کا انکار کرتے ہیں اور دھڑلے سے انکار کرتے ہیں۔سوال یہ ہے کہ مسلمان جو قرآن کو خدا کی کتاب مانتا ہے، کیا وہ یہود اور نصاریٰ کو خدا پرست مان سکتا ہے۔ان کے اندر کیا قرآن تفریق کرتا ہے؟ اگر وہ خدا کے ماننے والے ہیں یعنی یوں کہیے کہ اگر انہیں قرآن تسلیم کرتا ہے۔ان میں سے خدا کو ماننے کا مدعی تو ہر ایک ہے۔اگر قرآن انہیں ایسا تسلیم کرتا ہے تو پھر تو آپ کہہ سکتے ہیں اور اگر قرآنِ کریم ان کو کافر اور مشرک کہتا ہے تو آپ کون ہوتے ہیں یہ کہنے والے کہ خدا پرست ہیں۔پہلی آیت تو یہی ہے کہ اُمِّیّٖنَ (3:20) وہ ہیں کہ جن کی طرف کوئی کتاب نہیں آئی تھی۔یہ یہود و نصاریٰ اہلِ کتاب ہیں جو اس وقت موجود ہیں۔ان سے کہا جا رہا ہے کہ اگر تم بھی اس کلمہ کے اوپر جھکو جیسے ہم جھکتے ہیں تو پھر تم ہدایت کے اوپر ہو اور اگر نہیں جھکتے ہو تو جیسے اُمِّیّٖنَ ہیں تم بھی ویسے ہی ہو۔لیکن اتنی سی بات ہی نہیں قرآن تو اس معاملے میں بڑی وضاحت سے بات کرتا ہے۔آپ نے غور فرما لیا کہ یہ بات بظاہر جو بڑی عام سی نظر آتی تھی اس دور میں کتنی اہمیت اختیار کر گئی ہے۔قرآنِ کریم کی طرف آیئے۔نصاریٰ یعنی عیسائی۔میں نے کہا ہے کہ کفر اور شرک خدا پرستوں اور غیر خدا پرستوں میں امتیاز کریں گے کہ اسے کفر کہا جاتا ہے اور اسے شرک کہا جاتا ہے۔

حضرت مسیحؑ اور عزیر کے ابن اللہ ماننے کے متعلق عیسائیوں اور یہودیوں کے اس عقیدہ پر قرآنِ حکیم کا فرمان

قرآن کے الفاظ سنیے! لَقَدْ كَفَرَ الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الْمَسِيْحُ ابْنُ مَرْيَمَ ((5:17 جو بھی حضرتِ عیسیٰؑ کی الوہیت پر ایمان لایا، اس کو مان لیا یا اس نے یہ عقیدہ رکھا لَقَدْ كَفَرَ (5:17) یقینی طور پہ سمجھ لے کہ وہ کافر ہو گیا۔سنیے عزیزانِ من! قرآن کیا کہہ رہا ہے! 'لَ' بھی ہے یعنی ''یقینا''۔'قَدْ' بھی ہے۔یقینی طور پر اس نے کفر کیا۔لَقَدْ كَفَرَ الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الْمَسِيْحُ ابْنُ مَرْيَمَ ((5:72 ان لوگوں نے کفر کیا، یہ لوگ کافر ہو گئے جنہوں نے کہا کہ مسیحؑ اللہ ہے۔اور آگے بڑھیے لَقَدْ كَفَرَ الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ ثَالِثُ ثَلٰثَةٍ ((5:73 تثلیث کو ماننے والوں نے بھی کفر کیا۔کونسا ایسا عیسائی ہے جو اس چیز پر BELEIVE نہیں کرتا اور جو تثلیث میں BELEIVE نہیں کرتا۔قرآن تثلیث کہہ رہا ہے لہٰذا آپ کہاں جائیں گے۔یہ تو نصاریٰ کے متعلق تھا۔اب یہود اور نصاریٰ دونوں کے متعلق آیے۔وَ قَالَتِ الْيَهُوْدُ عُزَيْرُ ۨابْنُ اللّٰهِ وَ قَالَتِ النَّصٰرَى الْمَسِيْحُ

ذٰلِکَ قَوْلُھُمْ 478 آلِ عمران ابْنُ اللّٰہِ ((9:30 یہودیوں نے عقیدہ رکھا کہ عزیر اللہ کا بیٹا ہے' عیسائیوں نے عقیدہ رکھا کہ مسیح اللہ کا بیٹا ہے۔ بِاَفْوَاھِھِمْ ((9:30 اپنی ہی گھڑی ہوئی باتیں ہیں۔ یُضَاھِئُوْنَ قَوْلَ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا مِنْ قَبْلُ ((9:30 جو اس سے پہلے اس قسم کے کافر تھے' یہ انہی کا قول دہراتے ہیں قٰتَلَھُمُ اللّٰہُ ((9:30 اللہ تمہیں تباہ کرے قٰتَلَھُمُ اللّٰہُ اَنّٰی یُؤْفَکُوْنَ ((9:30 کدھر بڑھتے چلے جارہے ہو۔ عزیزانِ من! یہود اور نصاریٰ دونوں کے متعلق ہے۔

جو اپنے علماء اور مشائخ کو بھی خدا کی جگہ اپنا الٰہ بنالیتے ہیں ان کے متعلق خدا کا حکم

یہاں تو حضرتِ مسیح کو ابن اللہ کہنے کی بات تھی۔ آگے سنیے کہ کفر اور شرک کیا ہے۔ اِتَّخَذُوْٓا اَحْبَارَھُمْ وَ رُھْبَانَھُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰہِ وَ الْمَسِیْحَ ابْنَ مَرْیَمَ ((9:31 ان کی کیفیت یہ ہے کہ یہ اپنے علما اور مشائخ کو ہی یہ اپنا الٰہ بنالیتے ہیں اور مسیح کو بھی یہی درجہ دے رہے ہیں۔ کہا کہ کتنا بڑا کفر ہے۔ وَ مَآ اُمِرُوْٓا اِلَّا لِیَعْبُدُوْٓا اِلٰھًا وَّاحِدًا ((9:31 ان سے کہا تو یہ گیا تھا کہ الٰہ واحد کی محکومیت اختیار کرو۔ اور قرآن ان کو مشرک قرار دے رہا ہے جنہوں نے خدا کے ساتھ کن کن لوگوں کو مِّنْ دُوْنِ اللّٰہِ (9:31) خدا بنا لیا۔ یہ استنباط نہیں ہے بلکہ مشرک قرار دے رہا ہے۔ یہ ایمان ہے کہ لَآ اِلٰہَ اِلَّا ھُوَ ط ((9:31۔ سُبْحٰنَہٗ عَمَّا یُشْرِکُوْنَ ((9:31 یہ جو اس کے ساتھ شرک کرتے ہیں وہ اس سے بہت بلند اور پاک ہے۔ وہ انہیں مشرک قرار دے رہا ہے' کافر قرار دے رہا ہے۔ اور کس قسم کے کافر اور مشرک؟ یُرِیْدُوْنَ اَنْ یُّطْفِئُوْا نُوْرَ اللّٰہِ بِاَفْوَاھِھِمْ (9:32) اس قسم کے کافر اور مشرک کہ ان کی تو کوشش یہ ہے کہ خدا کے اس چراغ کو پھونکیں مار مار کر بجھا دیں۔ وَ یَاْبَی اللّٰہُ اِلَّآ اَنْ یُّتِمَّ نُوْرَہٗ وَ لَوْ کَرِہَ الْکٰفِرُوْنَ (9:32) اور خدا یہ ارادہ رکھتا ہے کہ اپنے امور کا اتمام کرے گا اگرچہ یہ کافر اسے کتنا ہی ناپسند کیوں نہ کریں۔ کافر مشرک چراغِ خداوندی کو بجھانے کے درپے ہے۔ اور آگے چلیے اور سنیے کہ یہ کافر اور مشرک کتنا واضح ہوگیا۔ یہ کس صورت میں مومن ہوسکیں گے؟ کیا اپنے ہاں اپنے طور پہ یہودی اور نصرانی رہتے ہوئے؟ سنیے عزیزانِ من! اور دیکھیے کہ قرآنِ کریم ان میں اور دوسرے کفار میں کیا فرق کررہا ہے؟ قَاتِلُوا الَّذِیْنَ لَا یُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰہِ وَ لَا بِالْیَوْمِ الْاٰخِرِ ((9:29 مشرکین کے ساتھ جہاں جنگ کا کہا تھا کہ ان میں سے یہود و نصاریٰ کے ساتھ بھی تمہیں جنگ کرنی ہوگی۔ یہ کون ہیں؟ یہ وہ لوگ ہیں جو ایمان نہیں لاتے' نہ اللہ پہ ایمان لاتے ہیں نہ آخرت پہ ایمان لاتے ہیں۔ عزیزانِ من! آپ انہیں خدا پرست کہہ رہے ہیں جبکہ قرآن کہتا ہے کہ نہ یہ خدا پر ایمان لاتے ہیں نہ آخرت پر ایمان لاتے ہیں۔

قرآنِ حکیم کی روشنی میں ایمان کی بنیادی تعریف دینِ حق یعنی قرآن کا دین اختیار کرنا ہے [478] آلِ عمران

عزیزانِ من! ایمان وہ نہیں ہے جو ہم اپنے ذہن میں سمجھ لیں کہ ایمان ہوگیا۔ ایمان وہ ہوگا جسے قرآن ایمان قرار دے۔ ہم تو اس لیے اس سے آنکھیں بند کر لیتے ہیں کہ اگر یہ کسوٹی ہو تو یہود اور نصاریٰ تو ایک طرف رہے، ہمارا ایمان بھی خطرے میں پڑ جاتا ہے۔ اسی لیے ہم نے ٹھپ ہی کر کے رکھ دیا۔ تم بھی خدا پرست ہم بھی خدا پرست۔ چل بھئی۔ قرآن کی طرف آئیے تو دونوں ختم۔ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَ لَا بِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ (9:29) نہیں ایمان رکھ سکتے وَ لَا يُحَرِّمُوْنَ مَا حَرَّمَ اللّٰهُ وَ رَسُوْلُهٗ (9:29) جن چیزوں کو خدا اور رسول نے واجب قرار دیا ہے یا حرام قرار دیا ہے یہ انہیں واجب قرار نہیں دے رہے۔ صرف ماننے کی بات نہیں۔ اگلی چیز یہ بھی آ گئی کہ وَ لَا يَدِيْنُوْنَ دِيْنَ الْحَقِّ (9:29) یعنی یہ دینِ حق اختیار نہیں کر رہے۔ اور دینِ حق تو اب قرآن ہے۔ تو قرآن تو یہ کہہ رہا ہے کہ نہ یہ خدا کو ماننے والے، نہ یہ آخرت کو ماننے والے۔ کہا جائے گا کہ نہیں صاحب! یہ اوروں کے متعلق کہا ہے۔ قرآن آپ کو بھاگنے نہیں دیتا۔ کہا کہ وَ لَا يَدِيْنُوْنَ دِيْنَ الْحَقِّ مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ (9:29) ان اہلِ کتاب میں جو قرآن کا دین یعنی دینِ حق اختیار نہیں کرتا وہ اسی زمرے میں ہے جس زمرے میں وہ لوگ ہیں جو اللہ اور آخرت کا انکار کرتے ہیں۔ ان میں کوئی فرق نہیں ہے۔ آپ دیکھ رہے ہیں کہ قرآن کی رو سے انہیں کیا سند مل رہی ہے۔

مولانا آزاد مرحوم کے نزدیک دینِ اسلام کی ایک خطرناک تاویل اور اس پر طلوعِ اسلام کا کِیا جانے والا احتجاج

اب اس کے بعد اور وضاحت لیجیے۔ کیا پھر اس کو اسلام کہہ دیں جیسا کہ مولانا آزاد مرحوم نے اپنے ہاں سیدھی سی بات کہہ دی کہ اگر تمام لوگ اپنے اپنے دین کے اوپر جس پہ بھی وہ ہیں، قائم ہو جائیں تو انہوں نے لکھا ہے کہ اسلام کہتا ہے کہ میرا کام بن گیا۔ یہی تفسیر تھی جس کا کانگرس نے، ہندو نے، ترجمہ کرا کے لاکھوں کی تعداد میں وہاں بانٹا تھا۔ یہ بات شنید نہیں بلکہ

قلندر ہرچہ گوید دیدہ گوید

یہ عاجز اس جنگ کے اندر شامل تھا۔ اس زمانے کی طلوعِ اسلام کی فائلیں آج بھی اس کی شہادت دیتی ہیں کہ کس قسم کی جنگ ہمیں تحریکِ پاکستان کے دوران میں لڑنی پڑ رہی تھی۔ یہ بھی ایک جنگ لڑنی پڑ رہی تھی۔ وہاں انہوں نے تو یہ کہا ہے۔ یہ اب آ کر چین اور روس کے خلاف سارے مسلمان ہوئے ہیں۔ وہاں یہ تفسیر پوری لکھی گئی تھی کہ اسلام کہتا ہے میرا کام ہوگیا اگر وہ اپنے آپ کو

کہیں کہ ہم ٹھیک ہندو ہیں ۔تو بس ٹھیک ہے اور پھر کسی چیز کی ضرورت نہیں ہے ۔ سنیے قرآن ان سے کہہ رہا ہے کہ یٰبَنِیۡۤ آلِ عمران 478 اِسۡرَآءِیۡلَ ((2:40 بنی اسرائیل کہہ کر یہودیوں سے کہا گیا' اعلان کر دیا۔قرآن اس میں یہودیوں کے سارے فرقے سمیٹ لا یا۔ان سے اعلان کیا گیا کہ وَ اٰمِنُوۡا بِمَاۤ اَنۡزَلۡتُ مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَکُمۡ (2:41) ہم نے جو یہ اب نازل کیا ہے اس پہ ایمان لاؤ۔ یہ سچا کر کے دکھائے گا ان چیزوں کو جو تمہیں اپنے وقت میں دی گئی تھیں۔اس پہ ایمان لاؤ۔ وَ لَا تَکُوۡنُوۡۤا اَوَّلَ کَافِرٍۭ بِہٖ((2:41 تمہیں تو چاہیے تھا کہ سب سے پہلے اس کی طرف لپکتے کہ تمہارے ہاں کی کتابوں میں اس آنے والے کی شہادت ہے' پیشن گوئیاں لکھی ہوئی ہیں۔تم سب سے پہلے اس سے کافر ہوتے ہو۔اس پہ ایمان لاؤ۔

دیگر آسمانی کتابوں کے مقابلے میں قرآنِ حکیم کی انفرادی خصوصیت اور اسکا مطالبہ

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیۡنَ اُوۡتُوا الۡکِتٰبَ اٰمِنُوۡا بِمَا نَزَّلۡنَا مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَکُمۡ ((4:47 یہاں اہلِ کتاب کو اُوۡتُوا الۡکِتَابَ (4:47) کہہ دیا ہے۔اسکے اندر سارے ہی صاحبِ کتاب آ گئے۔اور قرآن کہتا ہے کہ یہ جتنی بھی اقوامِ عالم تمہیں نظر آئیں گی کسی نہ کسی زمانے میں ان پر ہم نے کتاب نازل کی تھی۔دنیا کے اہلِ کتاب اس کے اندر آ گئے۔ایمان لاؤ اس کتاب پہ۔عزیزانِ من ! یہ کوئی عصبیت نہیں تھی یہ کوئی تعصب نہیں تھا یا یہ بات نہیں تھی پھر وہ مجھے پنجابی میں کہنا پڑا ''پئی گھماری اپنا بھانڈا سلونڈی اے'' یعنی یہ بات نہیں تھی کہ یہ اپنا بھانڈا تھا۔سوال ہی نہیں۔قرآن تو یہ کہہ رہا ہے کہ خدا یہ کہہ رہا ہے کہ ہم تمام کی طرف یہ ہدایت بھیجتے رہے ہیں۔اس آسمان کے نیچے کسی کے پاس بھی وہ کتاب جو ہم نے بھیجی تھی' اپنی اصلی شکل میں موجود نہیں ہے۔اور یہ قرآن کا دعویٰ یوں ہی نہیں ہے۔اس وقت دنیا میں کوئی مذہب بھی ایسا نہیں ہے جو ثابت کرنا تو ایک طرف رہا' اس کا مدعی بھی ہو کہ ہمارے پاس جو کتاب موجود ہے جو حرفاً حرفاً وہی ہے جو ہمارے نبی کو ملی تھی۔تفصیل چاہتے ہیں تو میری کتاب ''آسمانی کتابیں'' دیکھ لیجیے۔ان سب کی اپنی شہادتیں موجود ہیں۔یہ وجہ تھی جو قرآن کہتا ہے کہ تمہارے پاس وہ کتب اصل شکل میں نہیں ہیں۔اور یہ کتاب (قرآن) وہ ہے جو ان تمام چیزوں کی تصدیق کرے گی جو تمہیں اپنے وقت میں دی گئی تھیں۔لہٰذا اگر تم خدا کی طرف سے دیے ہوئے دین کے اوپر ایمان لانا چاہتے ہو تو پھر تو اس پر ایمان لانا پڑے گا۔یہ بات ہے۔یہاں صرف یہی کہا ہے کہ جو ہم نے نازل کیا ۔قرآنِ کریم اور وضاحت کر دیتا ہے ۔وَالَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَاٰمَنُوۡا بِمَا نُزِّلَ عَلٰی مُحَمَّدٍ((47:2 کتنی تصریح سے کہہ رہا ہے کہ اس پر ایمان لاؤ جو ہم نے محمد ﷺ پر نازل کیا ہے۔چلیے ان پہ بھی نازل کیا' پہلوں پہ بھی نازل کیا۔قرآن ہے وَهُوَ الۡحَقُّ (47:2) الحق اب یہی ہے۔قرآن نے یہاں الحق کہا ہے۔وَهُوَ الۡحَقُّ مِنۡ رَّبِّهِمۡ

(47:2) ان سب کے رب کی طرف سے اب الحق یہ ہے بِمَا نُزِّلَ عَلٰی مُحَمَّدٍ (47:2)۔عزیزانِ من! اس سے زیادہ وضاحت کی ضرورت ہے؟ ضرورت ہے تو وہ اس سے بھی زیادہ واضح کرتا ہے۔عزیزانِ من! سنیے وَ قَالُوْا كُوْنُوْا هُوْدًا اَوْ نَصٰرٰى تَهْتَدُوْا (2:135) یہ کہتے ہیں کہ یہودی ہوجاؤ‘ عیسائی ہوجاؤ‘ پھرتم ہدایت پالو گے۔ قُلْ بَلْ مِلَّةَ اِبْرٰهٖمَ حَنِيْفًا (2:135) کہا یہ یہودی‘ یہ نصاریٰ‘ جوتم کہتے ہو یہ تو خدا کے دین میں فرقے بنائے ہوئے ہیں۔ان سب کا مورثِ اعلیٰ ابراہیمؑ ہے۔قرآن کہتا ہے آؤ تمہیں بتائیں کہ ملتِ ابراہیمیؑ کیا تھی؟ ملتِ ابراہیمیؑ یہ تھی کہ وَ مَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ (2:135) تم تو مشرکین میں سے ہو‘ وہ مشرکوں میں سے نہیں تھا۔دینِ حق وہ ہوگا جس کے اندر شرک نہ ہو۔اگلی آیت قُوْلُوْا (2:136) کہو ان سے اٰمَنَّا بِاللّٰهِ (2:136) ہم ایمان لائے اللہ پہ وَ مَاۤ اُنْزِلَ اِلَيْنَا وَ مَاۤ اُنْزِلَ اِلٰۤى اِبْرٰهٖمَ وَ اِسْمٰعِيْلَ وَ اِسْحٰقَ وَ يَعْقُوْبَ وَ الْاَسْبَاطِ وَ مَاۤ اُوْتِيَ مُوْسٰى وَ عِيْسٰى وَ مَاۤ اُوْتِيَ النَّبِيُّوْنَ مِنْ رَّبِّهِمْ ۚ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْهُمْ ز (2:136)۔

دینِ خداوندی پر عمل پیرا ہونے والوں اور انکار کرنے والوں کے مابین فرق کی وضاحت

آؤ سنو کہ ہم کیا مانتے ہیں؟ ہم یہ مانتے ہیں‘ تسلیم کرتے ہیں کہ تمام انبیائے کرامؑ جن کا یہاں ذکر کیا گیا ہے اور وہ بھی کہ جن کا نام نہیں لیا گیا‘ اپنے اپنے وقت میں خدا کی طرف سے سچے رسول تھے‘ سچی کتابیں اور تعلیم لائے تھے۔ہم ان کے رسول ہونے کی جہت سے ان میں سے کسی میں فرق نہیں کرتے۔وَ نَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ (2:136) اور ہم صرف اس کے قانون کے سامنے جھکتے ہیں۔اس طرح سے ہم مشرکین میں نہیں رہتے۔کہو کہ یہ ہماری ملت ہے یہ ہمارا مسلک ہے۔عزیزانِ من! اس کے بعد ہے فَاِنْ اٰمَنُوْا بِمِثْلِ مَاۤ اٰمَنْتُمْ بِهٖ فَقَدِ اهْتَدَوْا ۚ (2:137) اگر یہ اس طرح ایمان لائیں جیسے تم ایمان لائے پھر یہ راہِ ہدایت پہ سمجھے جائیں گے۔وَ اِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّمَا هُمْ فِيْ شِقَاقٍ ط (2:137) اور اگر یہ اس سے دوسرا راستہ اختیار کرتے ہیں یا اعراض برتتے ہیں تو سمجھ لیجیے کہ یہ دوسری راہ کے اوپر چلے ہوئے ہیں۔یہ اس دین کی مخالفت میں ہیں۔فَسَيَكْفِيْكَهُمُ اللّٰهُ ۚ وَ هُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ (2:137) کوئی بات نہیں ہے اگر یہ یوں نہیں آتے‘ مخالفت کرتے ہیں تو تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکیں گے۔تمہارے لیے دینِ خداوندی کافی ہے۔اور خدا سمیع اور علیم ہے۔عزیزانِ من! اس قسم کی کئی اور آیات پیش کی جاسکتی ہیں لیکن میں اسی پہ اکتفا کرتا ہوں۔میں پوچھتا یہ ہوں کہ ان آیات کی موجودگی میں‘ انہیں خدا پرست کہا جاسکتا ہے؟ وہ تو کہتا ہے کہ یہ لوگ نہ خدا پہ ایمان رکھتے ہیں نہ آخرت پہ ایمان رکھتے ہیں۔

میں عرض یہ کر رہا تھا کہ قرآنِ کریم کے نقطۂ نگاہ سے جنہیں ہم اہلِ کتاب کا ایمان کہتے ہیں‘ وہ اسے ایمان نہیں قرار دیتا۔وہ

اسی لیے انہیں قرآن پر ایمان لانے کی دعوت دیتا ہے۔ اگر ان کا ایمان ایمان ہوجائے تو پھر سوال ہی نہیں ہے کہ انہیں دعوت دی جائے۔ اور اسی لیے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے متعلق ارشاد فرمایا گیا کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم كَآفَّةً لِّلنَّاسِ (34:28) کے لیے رسول ہیں۔ اس میں اہلِ کتاب اور غیر اہلِ کتاب کی کوئی تفریق نہیں ہے۔ فَاِنْ اٰمَنُوْا بِمِثْلِ مَآ اٰمَنْتُمْ بِهٖ فَقَدِ اهْتَدَوْا (2:137) یہ قولِ فیصل ہے کہ دنیا کا کوئی انسان بھی ہو اگر وہ اس طرح سے ایمان لاتا ہے جیسا قرآن نے کہا اور جیسا تم نے اس کے مطابق کیا تو پھر اسے آپ صاحبِ ایمان کہہ سکتے ہیں ورنہ وہ ایمان والا نہیں ہے۔

یہود اور نصاریٰ کی عورتوں کے ساتھ شادی کے سلسلہ میں اجازت کی نوعیت اور حضرت علیؓ کا فیصلہ

اس اعتبار سے جنہیں آپ کافر اور جنہیں اہلِ کتاب کہتے ہیں تو جہاں تک ایمان کا تعلق ہے قرآن ان دونوں میں کوئی تفریق نہیں کرتا۔ یہ صرف ایک معاشرتی تعلق تھا جس کی بنا پر اس نے یہود اور نصاریٰ کی عورتوں سے شادی کی اجازت دی تھی۔ عزیزانِ من! وہ بھی صرف اجازت کی بات تھی۔ اور اجازت کے معاملے میں بڑی اہم بات درمیان میں آ گئی ہے۔ یہ بڑی اصولی بات ہے کہ جسے ہم اجازت کہتے ہیں' PERMISSION کہتے ہیں' وہ فریضہ نہیں ہوتا۔ اسلامی نظام کو یہ حق پہنچتا ہے کہ اگر کبھی ایسے حالات پیدا ہوجائیں تو قرآن نے جس چیز کی صرف اجازت دی ہے' وہ اس اجازت کو عارضی طور پہ روک بھی سکتا ہے۔ جیسے ہمارے لیے گوشت حلال ہے لیکن آپ کو پتہ ہے کہ ہفتے میں دو دن بند کر دیا جاتا ہے۔ اس کا کھانا فریضہ نہیں ہے' اس کی اجازت ہے۔ اسی طرح سے اہلِ کتاب کی عورتوں سے شادی کی اجازت دی گئی۔ لیکن حضرتِ علیؓ کے زمانے میں سلطنت وسیع ہوگئی تھی اور جو عورتیں ان کی طرف سے آئیں انہوں نے سیاسی ریشہ دوانیاں شروع کر دیں۔ اور اُنہوںؓ نے اس اجازت کو روک لیا۔ انہوںؓ نے کہا تھا کہ یہ اجازت نہیں دی جاسکتی۔ تو یہ صرف ایک معاشرتی تعلق تھا جس کی بنا پہ اتنی سی EXCEPTION قرآن نے کی تھی۔ ورنہ جہاں تک ایمان لانے کا تعلق ہے تو آپ صاحبِ ایمان اسی کو کہیں گے خواہ وہ اہلِ کتاب ہو یا غیر اہلِ کتاب جو قرآن کے بتائے ہوئے انداز پر ایمان لائے۔ اس کے بغیر نہ خدا پر ایمان ہے نہ آخرت پر ایمان۔ اور اسی لیے قرآن نے اس آیت کے بعد یہیں کہہ دیا کہ اِنَّ الَّذِيْنَ يَكْفُرُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ (3:21) وہ لوگ جو خدا کے قوانین سے کفر برت رہے ہیں وَيَقْتُلُوْنَ النَّبِيّٖنَ بِغَيْرِ حَقٍّ (3:21) ان کی کیفیت یہ ہے کہ خدا کے نبیوں کو ناحق قتل کرتے ہیں' ان کی تخریب کے درپے ہوتے ہیں۔ وَّيَقْتُلُوْنَ الَّذِيْنَ يَاْمُرُوْنَ بِالْقِسْطِ مِنَ النَّاسِ (3:21) اور ان کی تو کیفیت یہ ہے کہ جو بھی ان کو اٹھ کر کہتا کہ صاحب! انصاف پہ چلو' ظلم نہ کرو تو یہ لوگ اس کے قتل کے درپے ہوجاتے ہیں۔ فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ

اَلِیۡمٍ ((3:21 ان کے لیے دردناک عذاب کا اعلان کر دو۔ انہی خدا کے ماننے والے مسلمانوں کے ہاتھوں سے ان کو دردناک 478 آلِ عمران
عذاب مل گیا تھا۔ یہ عذاب کفر کی وجہ سے نہیں بلکہ ان کی ان حرکتوں کی وجہ سے کہ انہوں نے ان کے مقابلے میں اٹھ کر جنگ شروع کر دی تھی۔

کسی عمل کے رائیگاں ہو جانے کے معنی دراصل مطلوبہ نتائج حاصل نہ ہونے کے ہوتے ہیں

یہ لوگ جو اس طرح ایمان نہیں لاتے ان کے بارے میں قرآن یہ کہتا ہے کہ اُولٰٓئِکَ الَّذِیۡنَ حَبِطَتۡ اَعۡمَالُھُمۡ فِی الدُّنۡیَا وَ الۡاٰخِرَۃِ ((3:22 دنیا اور آخرت دونوں میں ان کے اعمال رائیگاں جائیں گے۔ جسے حبطِ اعمال یا رائیگاں جانا ہم کہتے ہیں تو رائیگاں کے معنی یہ نہیں ہوتے کہ وہ نتیجہ خیز نہیں ہوتے۔ رائیگاں کے معنی ہوتے ہیں کہ نتیجہ تو ہر عمل کا نکلتا ہے لیکن انسان جو سمجھ کر کہتا ہے کہ اس کا ایسا نتیجہ مرتب ہوگا وہ نتیجہ مرتب نہ ہو اس کے خلاف نتیجہ مرتب ہو۔ وہ جس نظام کی پیروی کرتے ہیں اس کے متعلق ذہن میں تو یہ ہے کہ دنیا میں سرفرازیاں اور خوشحالیاں ملیں گی، عاقبت بھی سنور جائے گی لیکن اگر ایمان یہ نہیں ہے یعنی زندگی کا عملی ضابطہ لَآ اِلٰہَ اِلَّا ھُوَ (3:18) نہیں ہے تو پھر اپنے اپنے طور پر تم جو جی میں آئے کرتے رہو۔ اسے خدا کی عبادت اور اس کی پرستش اور نیک عملی کی زندگی بھی کیوں نہ کہو۔ وہ وہ نتیجہ مرتب نہیں کر سکتیں جو تم اپنے ذہن میں سمجھے ہوئے ہو۔ عزیزانِ من! یہ بڑی عجیب چیزیں ہیں۔ ایک تو بے عملی ہے کہ انسان کچھ کرے ہی نہیں۔ کچھ کرے گا نہیں تو اس کا نتیجہ بھی کوئی نہیں نکلے گا۔ دوسری چیز یہ ہے کہ انسان کام کرتا ہے لیکن صحیح فارمولے کے مطابق نہیں کرتا۔ اب وہ محنت بھی کرتا ہے، کام بھی کرتا ہے، نتیجہ وہ نہیں نکلتا جو نتیجہ نکالنے کے لیے وہ کام کر رہا تھا۔ اس لیے کہ فارمولا غلط تھا۔ اسے حبطِ اعمال کہتے ہیں۔ ان عیسائیوں کے SAINTS (رہبان) بڑی عبادت کرتے تھے۔ اب جب نتیجہ نہیں مرتب ہو رہا تو نتیجے کو آخرت پر اٹھا رکھتے ہیں۔

خود امتِ مسلمہ کے اعمال رائیگاں ہو جانے کی محسوس شکل یہ ہے کہ قرآنِ کریم نے کہا تھا کہ ایمان و اعمالِ صالحہ والوں پر کفار غالب نہیں آ سکتے جبکہ آج بالواسطہ یا بلاواسطہ ہمارے اوپر انہی کا غلبہ ہے۔

عزیزانِ من! کیا ہم بھی یہی نہیں کر رہے؟ کیا ہمارے اعمال یہ نتائج مرتب کر رہے ہیں جو قرآن نے کہا تھا کہ ایمان و اعمالِ صالحہ یہ کرے گا؟ قرآن نے یہ کہا تھا کہ ایمان اور ایمانِ صالحہ والوں پہ کوئی کافر کبھی غالب آ ہی نہیں سکتا۔ سیدھی سی بات

ہے کہ وَ لَنْ یَّجْعَلَ اللّٰہُ لِلْکٰفِرِیْنَ عَلَی الْمُؤْمِنِیْنَ سَبِیْلًا (4:141) مؤمنین پہ ان کا غلبہ ہو ہی نہیں سکتا۔ تو میں پوچھتا ہوں کہ یہ ہم اعمال کہتے ہیں، جسے ہم اعمالِ شریعت کہتے ہیں، جنہیں ہم اعمالِ طریقت کہتے ہیں۔ کیا ان کا نتیجہ یہ مرتب ہو رہا ہے کہ کوئی کافر ہم پہ غلبہ حاصل نہ کرے؟ اب تو بالواسطہ یا بلاواسطہ ہمارے اوپر غلبہ ہی انہی کا ہے۔ تو یہ جو اعمال ہم شریعت کے مطابق کرتے ہیں حَبِطَتْ اَعْمَالُھُمْ (3:22) رائیگاں گئے۔ یہ تمہارے سارے اعمال دنیا میں بھی رائیگاں گئے اور جب دنیا میں رائیگاں گئے تو آخرت میں بھی رائیگاں۔ حسنِ عمل کا نتیجہ تو اس زندگی کا حسین ہو جانا ہے۔ اگر یہ حسین نہیں ہوتی تو آخری عمر میں جا کر تو حسن نہیں آیا کرتا۔ وَمَا لَھُمْ مِّنْ نّٰصِرِیْنَ (3:22) ایسے لوگوں کا دنیا میں حقیقی مدد گار کوئی نہیں ہوتا۔ یاد رکھیے! EXPLOITER (استحصالی) ہوتے ہیں۔ یہ کیا بات کہہ گیا ہے کہ کوئی دوست نہیں ہوتا۔ یاد رکھیے! سب سودا کرتے ہیں۔ کیا ہوا؟ کیوں یہ اختلافات ہو گئے؟ کیوں یہ حبطِ اعمال ہوا؟

اعراض برتنے والی ذہنیت کے متعلق قرآنِ حکیم کا ارشاد

عزیزانِ من! یہ بات آ گئی جس کے لیے میں کہتا تھا۔ اب تو وہ قانون نہیں رہے ورنہ اس سے پیشتر ہمارے ہاں رواج اور شریعت دونوں باہم متوازی چلتے تھے۔ عدالتوں میں جج کی طرف سے پہلے فریق سے پوچھا جاتا تھا کہ تم شریعت کے مطابق فیصلہ چاہتے ہو یا رواج کے مطابق۔ تو فریق کو پہلے سے پتہ ہوتا تھا کہ فائدہ کس میں ہے۔ اگر شریعت کے مطابق فائدہ ہے تو کہا کہ الحمدللہ جی! مسلمان تو شریعت کے مطابق فیصلہ چاہے گا۔ اور اگر نہیں تو پھر کہا کہ جی ''ساہڈے تے رواج چلدا ہیگا'' (ہمارے ہاں تو رواج ہی چلتا ہے)۔ عزیزانِ من! اس طرح بات بڑی دور چلی جاتی ہے۔ یہ شب ہائے ہجر بھی تو درمیان میں آپ COUNT کیجیے گا۔ آپ کے ہاں فقۂ حنفی میں عرف کو شریعت مانا گیا ہے اور عرف رواج کو کہتے ہیں۔ یہ فوراً شریعت لے آتے تھے۔ ایک وہ کہ جو ان فقہ کی کتابوں میں ہے۔ آگے میں بتاتا ہوں کہ دوسری عرف کو بھی شریعت تسلیم کیا گیا ہے۔ ان دونوں میں سے جسے مان لیجیے، یہ شریعت کے مطابق ہو گیا۔ یہ ہوتی تھی منطقی دلیل۔

حیراں ہوں روؤں دل کو یا پیٹوں جگر کو میں

اَلَمْ تَرَ اِلَی الَّذِیْنَ اُوْتُوْا نَصِیْبًا مِّنَ الْکِتٰبِ یُدْعَوْنَ اِلٰی کِتٰبِ اللّٰہِ لِیَحْکُمَ بَیْنَھُمْ ثُمَّ یَتَوَلّٰی فَرِیْقٌ مِّنْھُمْ (3:23) کیا بات قرآن آگے کہہ گیا ہے! وَھُمْ مُّعْرِضُوْنَ (3:23) ان کی تو اعراض برتنے کی ذہنیت ہو گئی ہے۔ اس معاملے میں انہوں نے اس لیے اعراض برتا ہے، برتا ہے کہ اعراض برتنے میں فائدہ تھا۔ ان لوگوں کی تو ذہنیت ہی یہ ہو گئی ہے کہ وَھُمْ مُّعْرِضُوْنَ

((3:23اعراض برتا جائے۔عزیزانِ من! یہ اختلاف کی بنیاد ہے' تفرقے کی بنیاد ہے' فرقہ بندی کی بنیاد ہے' کہ کتاب اللہ[478] آلِ عمران کی طرف بلایا جائے تو وہاں سے اعراض برتا جائے۔

جولوگ خدا کی کتاب سے مطابق فیصلے نہیں لیتے' انہی کو کافر کہا جاتا ہے

قرآن نے کہا تھا کہ وَ مَآ اَنۡزَلۡنَا عَلَیۡکَ الۡکِتٰبَ اِلَّا لِتُبَیِّنَ لَهُمُ الَّذِی اخۡتَلَفُوۡا ۙ ((16:64ہم نے یہ کتاب اس لیے نازل کی ہے کہ جن باتوں میں یہ لوگ اختلاف کرتے ہیں ان کو یہ واضح کردے۔وَ هُدًی وَّ رَحۡمَةً لِّقَوۡمٍ یُّؤۡمِنُوۡنَ ((16:64اور پھر جو قوم اس پر ایمان لائے گی۔کہا کہ رحمت اور ہدایت تو اس کے پاس آ گئی کیونکہ اس نے تو ہر اختلافی معاملے میں بتا دینا ہے کہ حق کی راہ کونسی ہے۔آپ نے دیکھ لیا کہ اس کتاب کی موجودگی میں اختلاف نہیں ہوسکتا۔دوسری جگہ ہے کہ وَ مَا اخۡتَلَفۡتُمۡ فِیۡهِ مِنۡ شَیۡءٍ ((42:10تمہارے اندر کوئی اختلافی بات آجائے تو یہ کرو کہ فَحُکۡمُهٗۤ اِلَی اللّٰهِ ((42:10اس کا فیصلہ خدا سے لے لیا کرو۔خدا سے کیسے فیصلہ لے لیا کرو' اللہ میاں کے ہاں تو آدمی جا نہیں سکتا۔سن لیجیے کہ خدا کا فیصلہ کہاں سے لیا جائے گا اور سن لیجیے کہ ایمان والا اور کافر کسے کہتے ہیں؟ جگر تھام کر سنیے گا کہا کہ وَ مَنۡ لَّمۡ یَحۡکُمۡ بِمَاۤ اَنۡزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِکَ هُمُ الۡکٰفِرُوۡنَ ((5:44جو بھی خدا کی اس کتاب کے مطابق فیصلے نہیں کرتا اسی کو تو کافر کہا جاتا ہے۔معاملہ ختم ہو گیا۔آپ تو یہود و نصاریٰ کو مومن بنا رہے تھے۔دیکھیے کہ ہم کہاں کھڑے ہیں کہ جو بھی کتاب اللہ کے مطابق حکومت قائم نہیں کرتے' انہیں کافر کہا جاتا ہے۔مَنۡ لَّمۡ یَحۡکُمۡ (5:44) فیصلہ کرنے والی اتھارٹی کو حکومت کہتے ہیں۔جو بھی کتاب اللہ کے مطابق فیصلے نہیں کرتے انہیں کو تو کافر کہتے ہیں ۔آپ اپنے ذہن میں خدا کو بھی مانتے رہیے' رسول کو بھی مانتے رہیے' پانچوں اجزائے ایمان کو مانتے رہیے۔قرآن کہتا ہے کہ وَ مَنۡ لَّمۡ یَحۡکُمۡ بِمَاۤ اَنۡزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِکَ هُمُ الۡکٰفِرُوۡنَ ((5:44بات تو عمل کی ہے کہ یہاں فیصلے کس کے لیتے ہو' معاملات کے تصفیے کیسے ہوتے ہیں' قانون کیسے بنتا ہے۔اب لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ (3:18) کے معنی سمجھ میں آ گئے۔اس کے سوا کوئی الٰہ نہیں۔وہی صاحبِ اقتدار ہے' وہی صاحبِ اختیار اتھارٹی ہے اسی سے فیصلہ لینا ہے۔کیسے فیصلہ لینا ہے؟ اس کی کتاب سے فیصلہ لینا ہے۔جو اس کی کتاب سے فیصلہ لیتا ہے وہ مومن ہے' جو اس سے فیصلے نہیں لیتے ہیں وہ کافر ہیں۔عزیزانِ من! غور کیجیے کیا قرآنِ کریم کے بعد بھی کوئی فریب میں رہ سکتا ہے کہ مومن کسے کہتے ہیں اور کافر کون ہوتا ہے۔اگر اس کے بعد بھی یہ جو BELEIVERS IN GOD کی دعوت آ رہی ہے تو معاف فرمایے گا اگر آپ نے قرآن کی رو سے فیصلہ لینا ہے تو پھر BELEIVER IN GOD تو آپ کو نہیں ملے گا۔پھر تو پلڑا ہی ان کا بھاری ہو جاتا ہے جو فَاُولٰٓئِکَ هُمُ الۡکٰفِرُوۡنَ (5:44) ہیں۔یہ بڑی غور

طلب چیزیں ہیں کہ سیاسی حربے استعمال کرنا اوراس کے لیے اپنے آپ کوفریب دے لینا یا دنیا کوفریب دینا۔ میں نے عرض کیا کہ اُن سے تو گلہ نہیں ہے۔ اس لیے کہ اُنہوں نے تو یہی سن رکھا تھا کہ ہم بھی خدا مانتے ہیں یہ بھی خدا کو مانتے ہیں۔ میں اِن سے پوچھتا ہوں جن کے سامنے یہ کتاب ہے کہ یہ خدا کو ماننے والے کیسے مانیں گے۔لیکن میں نے عرض کیا کہ یہ تو اس لیے پرکھنے کے لیے نہیں بیٹھیں گے کہ اس پرکھنے کے بعد صورت تو یہ ہوگی کہ پھر اپنی پریشانی شروع ہو جائے گی۔ جب بھی ہم نے کفر کی بات کی تو قرآن پکار پکار کر کہہ دے گا کہ

ارے دل یہ تو اپنی داستاں معلوم ہوتی ہے

یہودیوں کا عقیدہ یہ ہے کہ ہم اپنی بداعمالیوں کے بدلے میں چند دن کے لیے جہنم میں جائیں گے پھر ہمارے شفاعت کرانے والے بزرگ ہمیں جنت میں پہنچا دیں گے

فَاُولٰٓئِکَ هُمُ الْکٰفِرُوْنَ (5:44) عجیب آیت ہے۔ لہٰذا یہ لوگ ذٰلِکَ بِاَنَّهُمْ قَالُوْا لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ اِلَّآ اَیَّامًا مَّعْدُوْدٰتٍ ص وَ غَرَّهُمْ فِیْ دِیْنِهِمْ مَّا کَانُوْا یَفْتَرُوْنَ (3:24) اگر کتاب اللہ کے مطابق فیصلے نہیں لیے جاتے تو بہرحال اتنا تو مانتے ہی ہیں کہ یہاں نہ سہی قیامت میں، دوزخ میں جائیں گے، جہنم میں جائیں گے۔ کہا کہ انہوں نے اس کے لیے ایک عقیدہ بنالیا کہ وہ چند دن جن میں ہم نے سبت کے دنوں میں دوکانیں کھول لی تھیں، مچھلیاں پکڑ لی تھیں وہ کچھ دن ہیں جن میں ہم نے جہنم میں جانا ہے۔ آپ کو معلوم ہے ان کے ہاں چند دن بھی جہنم میں جانے کا عقیدہ کیوں ہے؟ یہ کہتے ہیں کہ ہمارے ہاں کے جو شفیع ہیں، شفاعت کرنے والے بزرگ اس دوران میں اللہ میاں کے پاس معاملات کے فیصلے کرتے ہوں گے۔ اور وہاں جن جن کے فیصلے ہوتے چلے جا رہے ہوں گے ان کو جنت میں، جہنم میں بھیج دیں گے۔ تو ہمیں جہنم میں اتنے وقت کے لیے بھیج دیں گے جتنے میں وہ وہاں سے فارغ نہیں ہوتے۔ وَ غَرَّهُمْ فِیْ دِیْنِهِمْ (3:24) کتنا بڑا فریب ہے، کتنی خودفریبی میں مبتلا ہیں جو دین کے معاملے میں ہے۔

جنت میں داخل ہونے کے سلسلہ میں اہلِ شریعت اور اہلِ طریقت کے تصورات

اُنہوں نے اتنا تو مانا کہ چند ہی دنوں کے لیے سہی اپنی بدعملی کی وجہ سے جہنم میں جائیں گے۔ ایک یہ خدا کے محبوب ﷺ کی امت ہے۔ یہ کہتے ہیں کہ یہ جہنم میں جائیں گے ہی نہیں، وہاں سے بخشوا لیے جائیں گے۔ لیکن ان میں ایسے بھی ہیں جو مانتے

ہیں کہ نہیں پہلے بھیج دیے جائیں گے۔ باہر سے بخشوا لیے جائیں تو پھر تو عدل نہیں رہتا۔ عدل کا تقاضا بھی پورا کرنا ہے۔ عدل کے تقاضے کی بنا پر خدا جہنم میں بھیج دے گا۔ اور پھر شفاعت کے تقاضے کی بنا پر نبی اکرم ﷺ وہاں سے نکال کر جنت میں لے جائیں گے۔ یہ ہیں اہلِ شریعت۔ ان کو پھر بھی اُن کی طرح جانا پڑتا ہے اِلَّآ اَيَّامًا مَّعْدُوْدٰتٍ (3:24) کچھ دنوں کے لیے جانا پڑتا ہے۔ اہلِ طریقت کہتے ہیں کہ صاحب واہ! تم وہاں بیٹھے ہوئے انتظار کرتے رہو۔ ہم تم سے چار قدم پہلے پہنچے ہوئے ہوں گے۔ حضرت نظام الدین اولیا کی طرف سے ''تقویت القلوب'' بڑی دلچسپ چیز ہے۔ لکھا ہوا ہے کہ اللہ میاں جنت میں دیکھیں گے کہ بہت سے ہوں گے جنہیں وہاں جانے کا ٹکٹ ملا ہی نہیں تھا۔ جنت کے دروازے کے اوپر ٹکٹ کلکٹر کھڑا ہوا ہے اور اسے ڈانٹیں گے کہ یہ سب لوگ کیسے جنت میں چلے گئے۔ سردار جی کی کوٹھی کے باہر پہرے والا سنگین لگائے ہوئے' بندوق لگائے ہوئے کھڑا ہے۔ ایک صاحب آئے اور انہوں نے آ کر کہا سردار جی! ہم نے اندر منسٹر صاحب کو ملنے کے لیے جانا ہے چلے جائیں۔ وہ کہنے لگا اوئے کیسے جا سکتے ہو' دیکھتے نہیں ہو ہم کیسے بندوق لیے ہوئے تلوار لیے ہوئے کھڑے ہیں۔ اس نے کہا جی! وہ دو آدمی جو ہیں وہ تو چلے جا رہے ہیں۔ انہوں نے کہا کہ ''او ہناں ساہنوں پوچھیا سی؟'' (انہوں نے تو ہمیں پوچھا ہی نہیں) ۔ لیکن عزیزانِ من! یہاں ان کتابوں کے اندر کچھ اور ہوا ہوا ہے۔ یہ لکھی ہوئی موجود ہیں آپ دیکھ سکتے ہیں میرے پاس موجود ہیں۔ جنت کے پہرے دار یہ کہیں گے کہ ''جنوں کیندے نیں رب دی سوں'' ہمیں تو پتہ ہی نہیں ہے کہ یہ کیسے چلے گئے؟ حضرت صاحب اندر مسکرائیں گے۔ انہوں نے لکھا ہوا ہے کہ ہر پیر کے کمبل کے ایک ایک دھاگے کے ساتھ ایک ایک لاکھ مریدوں کی روحیں چمٹی ہوئی ہوں گی۔ تو وہ کمبل لیے ہوئے چلا جا رہا ہے اور رضوان نے ان کا ایک ٹکٹ دیکھا اور اندر پاس کر دیا۔ انہوں نے اندر جا کر کمبل جھاڑا۔

نبی اکرم ﷺ کا فرمانِ اقدس قرآنِ حکیم کے الفاظ میں

عزیزانِ من! کیا سنتے ہیں۔ اہلِ شریعت کو پھر بھی چند دن کے لیے انتظار کرنا ہوگا کہ بہر حال ان کے عقیدے کے مطابق باہر سے نبی اکرم ﷺ آ کر چھڑا کر لے جائیں گے۔ وہ نبی اکرم ﷺ کہ جن سے قرآن میں یہ کہلوایا گیا کہ ان سے کہہ دو کہ اگر میں بھی خدا کے کسی حکم سے معصیت کروں تو میں بھی عذابِ یومِ عظیم سے ڈرتا ہوں۔ وہ جن کے بارے میں عقیدہ ہے کہ کروڑ در کروڑ مجرمین لوگوں کو بخشوا کر لے جائے گا۔ وہ اپنی ذات کے متعلق یہ کہہ رہا ہے کہ میں بھی اگر خدا کے حکم کی سرتابی کرتا ہوں تو عذابِ یومِ عظیم سے ڈرتا ہوں۔ کہا کہ جی! امت بڑی محبوب ہوتی ہے۔ کیا اس محبوب ﷺ کو اپنی بیٹی محبوب نہیں تھی جس سے

یہ کہہ دیا تھا کہ فاطمہؓ! ذہن میں یہ نہ رکھنا کہ میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی بیٹی ہوں اس لیے وہاں چھوٹ جاؤں گی۔ وہاں کوئی شخص عمل کے بغیر نہیں چھوٹ سکے گا۔ کیا یہ حضرت فاطمہؓ امت میں بھی شامل نہیں تھی۔

ہمارے ہاں خود فریبی کی بنیادی وجہ وضعی روایات ہیں

کہا کہ وَغَرَّهُمْ فِىْ دِيْنِهِمْ مَّا كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ (3:24) جو انہوں نے وضع کیا ہے وہ وضعی روایات ہیں جنہوں نے ان کو دین کے معاملے میں خود فریبی میں مبتلا کر دیا ہے۔ عزیزانِ من! کیا انداز ہے قرآن کے بات کرنے کا! کہا ٹھیک ہے کوئی بات نہیں وضعی روایات سے اپنے دل کو بہلاتے رہو۔ فَكَيْفَ اِذَا جَمَعْنٰهُمْ لِيَوْمٍ لَّا رَيْبَ فِيْهِ (3:25) ان سے پوچھو پھر اس دن کیا ہوگا جس دن جمع کیے جائیں گے۔ وہ دن جس میں کوئی شک وشبہ نہیں ہے' یومِ مکافاتِ عمل۔ فَكَيْفَ (3:25) پوچھو ان سے جو اس وقت تو خود فریبی میں مبتلا ہیں کہ اس دن کیا ہوگا جس دن کے آنے میں کوئی شبہ نہیں ہے۔ عزیزانِ من! وہ کونسا دن ہے' اس دن کیا ہوگا؟ یہودیوں کی بات یہی چلی آ رہی تھی کہ تین دن کے بعد جتنے شافع ہیں وہ انہیں جہنم سے لے جائیں گے۔ یہاں محبوب کی امت والے یوں جائیں گے۔ اہلِ طریقت پیر صاحب کے کمبل کے ساتھ چلے جائیں گے۔ یہ ایک دن جس کے آنے میں کوئی شبہ نہیں ہے وہاں اس دن میں کیا ہوگا؟ وَوُفِّيَتْ كُلُّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ (3:25) جو کمائی کسی نے کی ہوگی' وہ پوری پوری ملے گی۔ عدل کیا ہوگا؟ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ (3:25) کسی پر زیادتی نہیں ہوگی۔ وہ دن ہے جس کے آنے میں کوئی شک وشبہ نہیں ہے۔ دو چار منٹ زائد لیتا ہوں اس لیے کہ لفظ ایسا آ گیا۔

لفظ کسب کا لغوی اور قرآنی مفہوم ''کسی کی گئی محنت کے پورے پورے معاوضے کا ملنا ہے''

عزیزانِ من! کیا عرض کروں۔ الفاظ ہی تو ہیں جن کا مجموعہ قرآن ہے۔ اور یہی تو اس قرآن کا اعجاز ہے۔ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ (3:25) آپ بھی جانتے ہیں کسب کا ترجمہ ہم ''کمائی'' کرتے ہیں۔ یہ وہ عمل ہوتا ہے کہ جس کا ثمر' معاوضہ' آپ کو ملتا جاتا ہے۔ ''شام نوں پچھدے نیں پئی کی کمایا توں'' (شام کو پوچھتے ہیں کہ بھئی! تو نے کیا کمایا)۔ وہ پھر گلّہ تو اپنا شام کو دیکھتے ہیں کہ کیا کمایا ''آج تے چنگی کمائی نئیں ہوئی'' (آج تو کوئی خاص کمائی نہیں ہوئی)۔ کوئی چیز آپ کے پاس ہوتی ہے جسے آپ کمائی کہتے ہیں۔ ''کمانا'' کہتے ہی اس کو ہیں کہ جس میں آج کی محنت کا نتیجہ ساتھ کے ساتھ آتا چلا جائے۔ آپ دیکھیے کہ قانونِ مکافاتِ عمل کی رو سے عمل کی بجائے قرآن كَسَبَتْ کہہ کر بات کیا کہی؟ وہ سَرِيْعُ الْحِسَابِ (3:19) ہے۔ ہمارے ہاں

توصورت یہ ہے کہ ادھر سے تم کام کرتے چلے جاتے ہو جس طرح سے کمائی والے کے پیسے ملتے چلے جاتے ہیں اسی طرح ملتے **آلِ عمران** 478 تمہارے ہر عمل کا نتیجہ ساتھ کے ساتھ دیتے چلے جاتے ہیں۔ **ثَقُلَتْ مَوَازِیْنُهٗ** (101:6)' **خَفَّتْ مَوَازِیْنُهٗ** (101:8) ساتھ کے ساتھ ہم دونوں پلڑوں کے اندر اِدھر بھی اور اُدھر بھی ڈالتے چلے جاتے ہیں۔ اور اس کے بعد پلڑا ایسا کھرا ہے کہ وہ ایک پرزہ بھی ادھر پڑتا ہے تو بتا دیتا ہے کہ اتنا ہو گیا۔ اُدھر پڑتا ہے تو بتا دیتا ہے کہ اتنا ہو گیا۔ **سَرِیْعُ الْحِسَابِ** (3:19) ہے۔ اس دن **وَ وُفِّیَتْ کُلُّ نَفْسٍ مَّا کَسَبَتْ** (3:25) ہر ایک کی کمائی ہر ایک کو پوری پوری دی جائے گی۔ اور یہ دو لفظ **لَهَا مَا کَسَبَتْ وَ عَلَیْهَا مَا اکْتَسَبَتْ** (2:286) اور آ گئے۔ میں نے اس دن بھی یہ عرض کیا تھا کہ یہاں **لَهَا وَ عَلَیْهَا** کہا اور **لَهَا** میں 'ل' ہے۔ عربی زبان میں 'ل' فائدے کے لیے' بہتری کے لیے' بھلائی کے لیے' خوشگوار نتائج کے لیے' آتا ہے۔ **عَلَیْهَا** میں 'عَلیٰ' ہے جو عام طور پر مخالفت کے لیے' کسی کے خلاف جانے کے لیے' آتا ہے۔ یہ **مَّا کَسَبَتْ** (3:25) کی کمائی جو کسی کے حق میں جانے والی ہے وہ بھی اس کو مل جائے گی اور جو کسی کے خلاف جانے والی ہے وہ بھی اس کو پوری کی پوری مل جائے گی۔ **وَ هُمْ لَا یُظْلَمُوْنَ** (3:25) کسی پر کسی قسم کا ظلم نہیں ہوگا۔ کہا کہ یہ ہے صحیح عقیدہ۔ نہ یہ کہ کوئی اس کی وجہ سے جنت میں چلا جائے گا کوئی اس کی وجہ سے جنت میں چلا جائے گا۔ یہ وہ دن ہے اور قرآن نے اُسے یوم کہا ہے۔

یوم کا لغوی مفہوم دن کی بجائے مدت' میعاد' وقفہ یا لمحہ کے ہوتے ہیں

آپ تو جانتے ہیں کہ یوم کے معنی یہ دن ہی نہیں ہوتا کہ جو صبح سے شام تک کا عرصہ ہوتا ہے۔ عربی زبان میں یوم کے معنی وقفہ' لمحہ' مدت' میعاد' پیریڈ' ERA ہوتے ہیں۔ یہ سب یوم کہلاتا ہے۔ اس لیے یوم کے معنی یہ ہوئے کہ ''مکافاتِ عمل کے مطابق نتائج کے سامنے آنے کا وقت''۔ وہ تو جب میں آخرت اور قیامت پر آؤں گا تو اس میں یہ چیزیں آپ کے سامنے آ جائیں گی۔ بات سامنے آ گئی تو عرض کر دوں کہ آخرت کے متعلق میری کتاب **''معارف القرآن''** جہانِ فردا ہے جس میں ان تمام چیزوں کے متعلق میں نے قرآن کے حقائق دیے ہیں۔ اللہ کا شکر ہے کہ اس کی یہ آخری کڑی تکمیل پہ پہنچ گئی۔ چھپ رہی ہے۔ امید ہے کنونشن تک آپ کے سامنے آ جائے گی۔ یہ چیزیں اس میں آ جائیں گی کہ یہ یوم کیا ہے' کب واقع ہوتا ہے۔ یہ سمجھ لیجیے کہ جب اس نے **سَرِیْعُ الْحِسَابِ** (3:19) کہا ہے تو وہ تو ہر سانس کے اندر آپ کے ہاں قیامت موجود ہے۔ آپ کے ہر عمل کا اثر آپ کی ذات پہ مرتب ہوتا چلا جاتا ہے۔ یہی وہ کسب ہے۔ یہی وہ چیز ہے جسے لے کر آپ آگے جاتے ہیں۔ **وَ هُمْ لَا یُظْلَمُوْنَ** (3:25) کسی پہ ظلم نہیں ہوگا۔

عزیزانِ من! سورۃ آلِ عمران کی آیت 25 ویں تک آ گئے۔ 26 ویں آیت اس اعتبار سے بڑی اہم ہے کہ بڑی تفصیل **آلِ عمران**
طلب ہے۔ اسے ہم آئندہ درس میں لیں گے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا ؕ اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ)(2:127

❀...❀...❀

آلِ عمران 478

پانچواں باب: سورۃ آل عمران (آیات 26 تا 27)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

لفظ "مَنۡ یَّشَآءُ" (16:93) کا واضح تر انداز میں بیان کردہ مفہوم اور خیر و شر کے مسئلے کا حل

عزیزانِ من! آج اکتوبر 1969ء کی 12 تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز سورۂ آلِ عمران کی 26 ویں آیت سے ہوتا ہے: ((3:26.

جیسا کہ میں نے سابقہ درس کے آخر میں عرض کیا تھا کہ جس موضوع سے اس آیۂ جلیلہ کا تعلق ہے وہ بڑا اہم ہے۔ اور اگرچہ جستہ جستہ الگ الگ مقامات پر ضمناً کنایتاً اشارتاً میں اس کے متعلق بہت کچھ کہتا چلا آ رہا ہوں۔ لیکن کیونکہ اب اس موضوع کی بنیادی آیت سامنے آ گئی' اس لیے میں چاہتا ہوں کہ ذرا تفصیل سے اس کے متعلق کچھ عرض کر سکوں۔

ہمارے ہاں کے تراجم میں لفظ مَنۡ یَّشَآءُ (16:93) کا معنی "چاہتا ہے" کیا جاتا ہے جو کہ غلط ہے

قرآنِ کریم میں اکثر اور بیشتر یہ چیزیں آپ کے سامنے آئیں گی کہ یُضِلُّ مَنۡ یَّشَآءُ وَ یَهۡدِیۡ مَنۡ یَّشَآءُ (35:8)(16:93) "خدا جسے چاہتا ہے ہدایت دیتا ہے' جسے چاہتا ہے گمراہ کرتا ہے"۔ ان آیتوں کے عام طور پر یہ ترجمے کیے جاتے ہیں۔ فَیَغۡفِرُ لِمَنۡ یَّشَآءُ وَ یُعَذِّبُ مَنۡ یَّشَآءُ (3:129)(2:284) "جسے چاہتا ہے بخش دیتا ہے' جسے چاہتا ہے عذاب دیتا ہے"۔ یَرۡزُقُ مَنۡ یَّشَآءُ بِغَیۡرِ حِسَابٍ (2:212)(3:37) "جسے چاہتا ہے' بغیر حساب روٹی دیتا ہے"۔ جس کا چاہتا ہے رزق تنگ کر دیتا ہے' جس کا چاہتا ہے کشادہ کر دیتا ہے۔ میں نے عرض کیا تھا کہ اگر اس کا مفہوم یہی لیا جائے کہ وہ جسے چاہتا ہے'

یہ دیتا ہے۔ جس سے چاہتا ہے' چھین لیتا ہے تو یہ مفہوم قرآنِ کریم کی بنیادی تعلیم' اس کے نقطۂ ماسکہ' اس کے محور' کے خلاف چلا جاتا ہے۔ قرآن کی تعلیم کا بنیادی نقطہ قانونِ مکافاتِ عمل ہے۔ انسان کے اپنے اعمال کا نتیجہ اس کے سامنے آتا ہے۔ قرآن ابتدا ہی اس سے کرتا ہے کہ انسان کو ہم نے صاحبِ اختیار و ارادہ پیدا کیا۔ اور اس جہت سے اب اس کے سامنے ہم نے راستہ واضح کر کے رکھ دیا۔ اِنَّا هَدَيْنٰـهُ السَّبِيْلَ اِمَّا شَاكِرًا وَّاِمَّا كَفُوْرًا (76:3) ہم نے راستہ واضح کر دیا' جس کا جی چاہے اس کو ACCEPT کر لے' جس کا جی چاہے' اس سے انکار کر دے۔ ذمہ داری کا تعین ہی اسی صورت میں ہوتا ہے جب کوئی صاحبِ اختیار ہو۔ تو اگر ایک طرف یہ تسلیم کیا جائے اور قرآنِ کریم کی تعلیم آپ دیکھیں گے کہ اسی کے اوپر چلتی ہے کہ لَـيْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰى (53:39) انسان کو صرف اس کی اپنی کوششوں کا نتیجہ ہی ملتا ہے۔ تو جب اس تعلیم کو سامنے رکھا جائے تو اس کے بعد ان آیات کا یہ مفہوم کہ وہ جسے چاہتا ہے بخشتا ہے' جسے چاہتا ہے عذاب دیتا ہے' جسے چاہتا ہے ہدایت دیتا ہے' جسے چاہتا ہے گمراہ کرتا ہے' تو آپ دیکھیں گے کہ یہ دو چیزیں تو بنیادی طور پر ایک دوسرے سے متضاد ہیں' متخاصم ہیں۔ اور قرآن نے تو اپنے منجانب اللہ ہونے کی دلیل یہ دی ہے کہ اس میں تم کوئی چیز اختلافی نہیں پاؤ گے۔ اور یہ دلیل نہ بھی ہوتی تو آپ سوچیے کہ اتنی اہم بنیادی کتاب کی یہ کیفیت ہو کہ اتنے بنیادی مسئلے کے اندر اس قسم کا تضاد اس میں آ جائے۔ ہو ہی نہیں سکتا تھا۔ تو پھر یہ کیا چیز ہے؟

عربی زبان کے قاعدے کے مطابق من یشآء کا صحیح مفہوم

میں نے عرض کیا کہ خود عربی زبان اور اس کی گرائمر کے قاعدے کے اعتبار سے مَنْ يَّشَآءُ کا ترجمہ یہ کیا جا سکتا ہے کہ خدا اسے ہدایت دیتا ہے جو ہدایت لینا چاہتا ہے' وہ اسے گمراہ کرتا ہے جو گمراہ ہونا چاہتا ہے' وہ رزق کی کشاد اس کے لیے کرتا ہے جو کشادِ رزق چاہتا ہے' جو ایسا نہیں چاہتا اس کے رزق کی تنگی ہو جاتی ہے۔ قاعدے کے اعتبار سے یہ معنی بالکل صحیح ہیں۔ اور قرآنِ کریم کی بنیادی تعلیم کے ساتھ بالکل ہم آہنگ ہوتے ہیں۔ اس لیے اس اعتبار سے یہ سارے مقامات حل ہوتے چلے جاتے ہیں۔ لیکن قرآنِ کریم میں بعض مقامات پر تو ایسا بھی آتا ہے جیسا کہ اس آیۂ جلیلہ میں ہے کہ قُلِ اللّٰهُمَّ مٰلِكَ الْمُلْكِ تُؤْتِى الْمُلْكَ مَنْ تَشَآءُ وَتَنْزِعُ الْمُلْكَ مِمَّنْ تَشَآءُ وَتُعِزُّ مَنْ تَشَآءُ وَتُذِلُّ مَنْ تَشَآءُ (3:26) اب یہاں يَشَآءُ کی جگہ تَشَآءُ ہے۔ کہیے کہ اے اللہ تو مالکِ ملک ہے (میں عام ترجمہ کر رہا ہوں) تو جسے چاہتا ہے اختیار و اقتدار دے دیتا ہے' جس کو چاہتا ہے اس سے چھین لیتا ہے' جسے چاہتا ہے عزت دے دیتا ہے' جسے چاہتا ہے ذلت دے دیتا ہے۔ اور اس سے آگے اگلی آیت میں ہے کہ وَتَرْزُقُ مَنْ تَشَآءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ (3:27) جسے چاہتا ہے' بغیر حساب رزق دے دیتا ہے۔ تو یہاں تو یہ چیز

آئی کہ ہم جسے چاہتے ہیں ایسا کرتے ہیں۔تو ان آیات پہ غور نہایت ضروری ہے۔اور اسی جہت سے میں نے کہا تھا کہ یہ آلِ عمران 478 موضوع کی اہم ترین آیت ہوجاتی ہے۔مَنۡ تَشَآءُ(3:26) کا ترجمہ اگر وہی ہم کریں کہ ''جسے تو چاہتا ہے یہ کر دیتا ہے'' تو وہ جو پہلا اعتراض ہے کہ جب سب کچھ وہی کرتا ہے تو پھر انسان کس جرم کی خطا میں پکڑا جاتا ہے۔میں نہیں چاہتا کہ اس کی تفسیر میں کچھ زیادہ کہوں ورنہ اس کے لیے تو گھنٹوں نہیں دنوں مہینوں گزر سکتے ہیں۔اس پہ یہ کچھ لکھا گیا ہے کہ ہم خوامخوہ کے لیے پکڑے جاتے ہیں۔اور حافظ تو یہاں تک کہتا ہے کہ

در طریقِ عدل ؟؟؟؟ گناہ من است

اگر چہ گناہ ہماری مرضی سے تو ہوتا نہیں لیکن اب اس کے سامنے کون بات کرے۔عدل کا یہی تقاضا ہے مان لو؟؟؟؟؟؟۔آپ سوچتے ہیں کہ یہ بات کہاں چلی جاتی ہے؟ بات یہ نہیں ہے۔

انسان کے لیے اس کے اختیار و ارادہ کی اہمیت اور خدا کے قانون کی وضاحت

قرآنِ کریم پر غور کرنے سے یہی نہیں کہ یہ تضاد مٹتا ہے' نظر آتا ہے کہ یہ تضاد صحیح نہیں۔قرآنِ کریم سے بات سمجھنے کی ہے۔ میں کوشش کروں گا کہ اس درس میں درساً درساً سمجھانے کے طریقے پر اس بات کو سمجھا دوں۔قرآنِ کریم میں ہے کہ وَ لَوۡ شَآءَ رَبُّکَ لَجَعَلَ النَّاسَ اُمَّۃً وَّاحِدَۃً (11:118) اگر اللہ چاہتا تو تمام نوعِ انسانی کو ایک امت بنا دیتا' ان میں اختلاف ہی نہیں ہوتا۔ لَوۡ شَآءَ (11:118) اگر اللہ چاہتا تو وہ ایسا کر دیتا۔تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ اللہ نے ایسا چاہا ہی نہیں ہے یعنی وہ چاہتا ہی نہیں ہے کہ ایسا ہوجائے۔آپ سوچیے تو سہی کہ قرآن کی ساری تعلیم یہ ہے کہ وہ انسانیت کے اختلافات مٹا کر ان کو امتِ واحدہ بنانا چاہتا ہے۔کَانَ النَّاسُ اُمَّۃً وَّاحِدَۃً (2:213)۔دو ہی معنی ہوسکتے ہیں کہ امتِ واحدہ تھی یا وہ چاہتا ہے کہ امتِ واحدہ ہو۔ قرآن کی تعلیم کا تو نقطۂ ماسکہ یہ ہے کہ تمام انسانیت کے اختلاف کو مٹا کر انہیں ایک نقطے پر جمع کر لیا جائے۔اب یہاں یہ ہے کہ وَ لَوۡ شَآءَ رَبُّکَ لَجَعَلَ النَّاسَ اُمَّۃً وَّاحِدَۃً (11:118) اگر خدا چاہتا تو امتِ واحدہ بن جاتی۔اس سے استنباط یہ ہوگا کہ وہ چاہتا نہیں ہے۔دوسرے مقامات پہ وہ کہتا ہے کہ ہم نے کیا ہی یہ ہے کہ یہ کسی طرح امتِ واحدہ بن جائے۔آپ نے دیکھا کہ بظاہر ٹکراؤ نظر آتا ہے۔اور آگے چلیے۔وَ لَوۡ شَآءَ اللّٰہُ مَاۤ اَشۡرَکُوۡا (6:107) اگر اللہ چاہتا تو وہ لوگ کبھی شرک ہی نہ کرتے۔تو گویا کیا اس کے یہ معنی لے لیں کہ اللہ چاہتا ہے کہ یہ شرک کریں۔آپ دیکھ رہے ہیں! ان آیات کو سطحی طور پر سامنے لانے سے کیا الجھاؤ پیدا ہوتا ہے۔''اگر اللہ چاہتا تو شرک ہوتا ہی نہ'' یہ کیا بات ہوئی؟ یہ چیز فلسفے کی اصطلاح میں تھامس؟؟؟؟ کا؟؟؟؟ کہا جاتا

ہے جس نے یہ بات کہی تھی کہ اگر خدا قادرِ مطلق ہے تو پھر شر کا جو وجود ہے؛ EVIL کا جو وجود ہے اس کی مرضی سے ہے کیونکہ آلِ عمران 478 اگر مٹانا چاہتا تو مٹا سکتا تھا۔ اور اگر اس کی مرضی کے خلاف ہے تو وہ قادرِ مطلق نہیں ہے کہ ایک چیز کو وہ مٹانا چاہتا ہو اور وہ موجود ہے۔ یہ ان کے ہاں بڑا اہم سوال آیا ہوا ہے لیکن ان کے ہاں بھی اس کا حل نہیں ملتا تھا۔ جبکہ قرآن سے تو اس میں کوئی دقت نہیں ہوتی۔

خدا تو یہ چاہتا ہی نہیں کہ کوئی انسان شرک کا مرتکب ہو

میں نے عرض کیا ہے کہ یہاں تک آپ دیکھیے وہ بات آ گئی کہ اگر اللہ چاہتا تو یہ شرک ہی نہ کرتے۔ تو جیسا میں نے ابھی عرض کیا ہے اس سے ذہنوں میں یہ آیا کہ گویا اللہ یہ چاہتا ہی نہیں ہے۔ لیکن اس نے تو ساتھ ہی یہ کہا ہے کہ نہیں! بات یہ نہیں ہے ہم شرک اور کفر کو تو پسند نہیں کرتے۔ اِنْ تَكْفُرُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ غَنِيٌّ عَنْكُمْ (39:7) اگر یہ لوگ کفر کرتے ہیں تو ہم اس سے مستغنی ہیں؛ ہمارا کچھ نہیں بگڑتا۔ وَلَا يَرْضٰى لِعِبَادِهِ الْكُفْرَ ۚ وَاِنْ تَشْكُرُوْا يَرْضَهُ لَكُمْ (39:7) لیکن وہ اپنے بندوں کے لیے کفر پسند نہیں کرتا۔ اگر اس کے مقابلے میں یہ حق کو قبول کر لیں تو وہ اس چیز کو پسند کرتا ہے۔ تو سوال یہ پیدا ہو گیا کہ وہ شرک اور کفر کو پسند بھی نہیں کرتا اور اتنا بڑا قادرِ مطلق بھی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اگر ہم چاہتے تو یہ لوگ کبھی شرک نہ کرتے۔ اور اس کے باوجود لوگ شرک کرتے ہیں؛ لوگ کفر کرتے ہیں۔ کیا بات ہوئی؟ اس نے سمجھا دیا ہے کہ بات کیا ہوئی؟ یہ چیز کہ لوگ شرک نہ کریں اس کے لیے طریقہ ان لوگوں نے خود اپنے ذہن سے تجویز کیا۔ اس کے متعلق (6:149-50) میں بڑی اہم چیزیں ہیں یعنی بات تو یہ تھی کہ انسان شرک نہ کریں؛ خدا بھی چاہتا تھا کہ شرک نہ کریں۔ اب اس کی شکل کیا ہو کہ لوگ شرک نہ کریں۔

قرآنِ حکیم کی تعلیم کے خلاف سوچ رکھنے والے لوگوں کی طرف سے اعتراض

لوگوں نے اپنے ذہن سے اس کی ایک شکل تجویز کی؛ اس کا ایک طریقہ تجویز کیا۔ اور وہ یہ کہ قرآن کہتا ہے کہ سَيَقُوْلُ الَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا لَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَآ اَشْرَكْنَا وَلَآ اٰبَآؤُنَا (6:148) مشرکین یہ کہتے ہیں کہ اگر اللہ یہ چاہتا تو نہ ہم شرک کرتے نہ ہمارے آباؤ اجداد شرک کرتے۔ آپ نے دیکھا کہ یہاں وہی اعتراض آ گیا کہ اگر اللہ یہ چاہتا تو یہ چیز ایسے نہ ہوتی۔ قرآن نے اسے کہا ہے کہ كَذٰلِكَ كَذَّبَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ (6:148) اِنہوں نے ہی ایک جھوٹی بات نہیں کی اس سے پہلے لوگ بھی یہی کچھ کہتے چلے آ رہے تھے۔ یہ کون لوگ ہیں؟ جو شرک کرنے کی ذمہ داری اپنے اوپر نہیں لینا چاہتے؛ جرم کی ذمہ داری خود نہیں لینا چاہتے۔ وہ کہتے یہ ہیں کہ ہمیں جو تم مطعون کر رہے ہو کہ ہم یہ غلط راستہ کیوں اختیار کیے ہوئے ہیں۔ اگر خدا چاہتا تو ہم یہ غلط

راستہ اختیار ہی نہ کرتے۔''خدا کے چاہنے'' کے معنی کیا ہیں؟

انسانوں کے علاوہ اختیار وارادہ نہ ہونے کے باعث تمام حیوانات کی ہر نوع میں کوئی ذہنی اختلاج نہیں پایا جاتا

حیوانات کی دنیا میں آپ دیکھیے کہ کوئی بھی خدا کے قانون کے خلاف راستہ اختیار کرتا ہی نہیں ہے' کر سکتا ہی نہیں۔اس لیے کہ یہ ناممکن ہے کیونکہ انہیں اختیار اور ارادہ نہیں دیا۔ان کی ایک نوع امتِ واحدہ ہوتی ہے۔ساری دنیا کی بکریاں جہاں بھی ہیں وہ ایک مذہب پہ چلتی ہیں' ایک شریعت پہ چلتی ہیں' ان میں کوئی اختلاف نہیں ہوتا۔ہر مقام کا شیر ایک ہی دین رکھتا ہے'ان میں کوئی اختلاف نہیں ہوتا۔کیا اس کا کریڈٹ ان کو ملتا ہے یا شیر کی درندگی کا جرم آپ اس کے خلاف ثابت کر کے اس کو لا کر پھانسی دیتے ہیں؟ قطعاً نہیں۔اس لیے کہ نہ بکریوں کا منکسر المزاج اور عاجز ہونا ان کے اختیار کی بات ہے' نہ شیر کی درندگی اس کے اختیار اور ارادے کی بات ہے۔نہ یہ مجرم قرار پاتا ہے اور نہ وہ متقی اور پرہیزگار قرار پاتی ہیں۔ان میں اختلاف بھی نہیں ہوتا۔جب ان لوگوں کو مطعون کیا جاتا ہے کہ تم ایسا کیوں کرتے ہو تو یہ لوگ کہتے تھے کہ ہم کہاں شرک کرتے ہیں' صاحب! یہ ہمارے اختیار کی بات نہیں ہے۔خدا کے حکم کے بغیر تو ایک پتا نہیں ہلتا۔آج بھی یہ دلیل آپ کے سامنے آئے گی کہ ''اس لیے کہ اگر وہ چاہتا تو ہم ایسا کرتے ہی نہ' یعنی وہ ہمیں پیدا ہی ایسا کرتا کہ ہم میں اختیار اور ارادہ ہوتا ہی نہ' نہ اختیار وارادہ ہوتا نہ ہم یہ چیز کرتے''۔اور اگر آپ مانتے ہیں کہ وہ ہر چیز پہ قادر ہے تو ہم جو کچھ کر رہے ہیں پھر تو یہ اسی کی وجہ سے کر رہے ہیں ہم تو ذمہ دار نہیں ہیں۔یعنی قرآن نے کہا یہ ہے کہ انسان اپنی ذمہ داری سے انکار کرنے کے لیے اس قسم کی توجیہات پیش کر دیتا ہے کہ اگر خدا یہ چاہتا تو ہم کیوں ایسا کرتے۔ قُلْ فَلِلّٰهِ الْحُجَّةُ الْبَالِغَةُ ((6:149 ان سے کہو کہ دلیلِ محکم خدا ہی کے لیے ہے فَلَوْ شَآءَ لَهَدٰكُمْ اَجْمَعِيْنَ((6:149 یہ بات ٹھیک ہے کہ اگر خدا کی مشیت میں ہوتا کہ تمہیں اختیار وارادہ نہ دیا جائے تو واقعی تم سب کے سب ہدایت کے اوپر ہوتے۔

انسان کی تخلیق کے لیے قانونِ مشیت کا ایک اہم پہلو اختیار وارادہ کا ملنا ہے

یہاں یہ سوال آ گیا کہ اس نے انسان کو پیدا کیا ہے تو اس کی تخلیق نے جو قانونِ مشیت رکھا ہے وہ کیا ہے؟ وہ کہتے تھے کہ یہ اس قسم کا ہوتا کہ ہم شرک کر ہی نہ سکتے' ہمارے اختیار میں نہیں ہے۔تو میں نے کہا ہے کہ یہ بات نہیں ہے۔قرآن کہتا ہے کہ ہم

اگر چاہتے تو تم میں سے کوئی بھی غلط راستے پہ نہ چلتا' ہم تمہیں پیدا ہی اس طرح سے کر دیتے کہ کسی میں غلط راہ کی طرف چلنے کا اختیار و ارادہ ہی نہ ہوتا۔ لیکن ہم یہ نہیں چاہتے تھے کہ تم سے اس طرح سے ہدایت کے راستے کے اوپر چلنے کی بات منوائی جائے۔ یہاں طریق کی بات ہو گئی۔ یہ نہیں کہ ہم چاہتے ہی نہیں تھے کہ ایسا ہو۔ جس طریق سے تم چاہتے ہو کہ ایسا ہو' وہ غلط ہوتا۔ ایسا ہوتا تو پھر کسی انسان کا صحیح راستے پہ چلنا اس کے لیے کچھ CREDITABLE نہ ہوتا' غلط راستے پہ چلنا اس کے لیے کوئی باعثِ جرم نہ ہوتا۔ ہم نہیں چاہتے تھے کہ تم سے اس طرح سے اپنی تائید کو' اپنے دین کو' صحیح راستے پہ چلنے کو' منوائیں۔ آپ نے دیکھا کہ مشرکین کا یہی اعتراض ہے اور اس کا جواب دیا گیا ہے۔ وَ قَالَ الَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا لَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَا عَبَدْنَا مِنْ دُوْنِهٖ مِنْ شَيْءٍ نَّحْنُ وَ لَآ اٰبَآؤُنَا (16:35) وہ کہتے ہیں کہ اگر اللہ چاہتا تو ہم یا ہمارے آبا ؤ اجداد شرک ہی نہ کرتے۔

قدرت نے انسان کو دیگر مخلوق کی طرح مجبور پیدا ہی نہیں کیا

قرآن کہتا ہے کہ كَذٰلِكَ فَعَلَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ (16:35) اس سے پہلے بھی لوگوں نے یہی کچھ کہا۔ جواب کیا دیا؟ وَ لَقَدْ بَعَثْنَا فِيْ كُلِّ اُمَّةٍ رَّسُوْلًا (16:36) ہم نے ان انسانوں کے لیے یہ طریقہ اختیار کیا ہے کہ ہم ہر امت میں اپنا پیغامبر بھیجتے رہے اور وہ پیغامبر ان تک پیغام پہنچاتے رہے۔ انسانوں کے علاوہ باقی مخلوق میں سے کسی کی طرف کوئی رسول نہیں بھیجا گیا۔ ضرورت ہی نہیں تھی کیونکہ انہیں مجبور پیدا کیا گیا تھا۔ رسول بھیجا اور رسول نے آ کر کیا کیا؟ فَهَلْ عَلَى الرُّسُلِ اِلَّا الْبَلٰغُ الْمُبِيْنُ (16:35) رسولوں نے آ کر ان تک بات پہنچا دی۔ نہ ہم نے انہیں مجبور پیدا کیا نہ رسولوں نے اس معاملے میں کوئی جبر کیا کہ یہ ضرور اسی طریقے کے اوپر چلیں۔ ان کے اختیار و ارادے پہ چھوڑ دیا۔ دونوں چیزوں کو ملایئے۔ پہلی چیز یہ کہ ہم اگر چاہتے تو تمام انسان ایک ہی راستے پہ چلتے۔ ٹھیک ہے یہ بھی کہتے ہیں کہ اگر اللہ چاہتا تو ہم شرک نہ کرتے۔ اس کو خدا جھٹلاتا ہے۔ کس چیز کو جھٹلاتا ہے؟ اس چیز کو کہ ''خدا اگر چاہتا کہ ہم شرک نہ کرتے' اختلاف نہ کرتے' وہ ہمیں پیدا ہی ایسا کرتا''۔ اس نے کہا یہ بات نہیں ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ اگر ہم تم سے مجبوراً توحید منوانا چاہتے تو ہم تمہیں پیدا ہی ایسا کرتے۔ ہم نے اسے اس طرح سے کرانا نہیں چاہا۔ اس کے کرانے کا دوسرا طریقہ ہے جو ہم تمہارے لیے کہتے ہیں۔ وَ قَالُوْا لَوْ شَآءَ الرَّحْمٰنُ مَا عَبَدْنٰهُمْ (43:20) وہ کہتے ہیں کہ اگر خدا چاہتا تو ہم ان بتوں کی پرستش نہ کرتے' ہم غیر اللہ کی محکومیت ہی اختیار نہ کرتے۔ غور کیجیے یہاں کیا جواب دیا گیا ہے؟ مَا لَهُمْ بِذٰلِكَ مِنْ عِلْمٍ (43:20) یہ جہالت کی گفتگو کر رہے ہیں۔ علم کی دنیا سے پوچھتے تو وہ یہ بتاتا کہ انسان کو صاحبِ اختیار و ارادہ پیدا کیا گیا ہے۔ ''خدا یہ چاہتا ہے''۔ ٹھیک ہے وہ چاہتا یہی ہے کہ یہ صحیح راستے پہ چلیں لیکن

وہ ان کو مجبورنہیں کرتا کہ وہ یہی راستہ اختیار کریں۔ وہ چاہتا یہ ہے کہ لوگ اپنے اختیار اور ارادے سے یہ راستہ اختیار کریں۔ جیسا 478 **آلِ عمران**
کہ میں نے عرض کیا ہے کہ وہ یہی چاہتے تھے کہ خدا جبراً ایسا کردے۔

کائنات کا خالق اور مالک ہونے کے باوجود انسان سے زبردستی اپنا حکم نہیں منواتا

(10:99) میں اس بات کو اور واضح کردیا۔ کہا کہ **وَ لَوْ شَآءَ رَبُّكَ لَاٰمَنَ مَنْ فِی الْاَرْضِ كُلُّهُمْ جَمِیْعًا** (10:99) خدا کی مشیت میں یہ ہوتا تو وہ انسان کو پیدا ہی ایسا کرتا کہ ساری نوعِ انسانی ایک ہی راستے پہ چلتی۔ ایسا کرنا اس کے لیے مشکل نہیں تھا۔ یہ بڑی اہم آیت ہے۔ اس میں وہ بات واضح کردی گئی جو میں ابھی ابھی کہہ رہا تھا کہ ایسا کرانے کا طریقہ اس کے نزدیک کیا ہے۔ خدا اس کے لیے چاہتا تو اس کے لیے کچھ مشکل نہیں تھا کہ تمام انسان ایک ہی راستے کے اوپر چلتے۔ اور اس سے آگے ہے **اَفَاَنْتَ تُكْرِهُ النَّاسَ حَتّٰى یَكُوْنُوْا مُؤْمِنِیْنَ** (10:99) کیا تو چاہتا ہے کہ خدا انسانوں کو مجبور کرتا کہ وہ مومن پیدا ہوتے۔ بات صاف ہوگئی۔ وہ انسان سے جبراً یہ نہیں کرانا چاہتا۔ وہ یہ چاہتا ہے کہ انسان صحیح راستے پہ چلیں۔ یہ انسان کے اپنے بہبود کی بات ہے' اس میں اس کا فائدہ ہے۔ خدا بندوں کا فائدہ چاہتا ہے۔ اچھا ہے کہ یہ کریں۔ لیکن اس کرانے کے دو طریقے تھے ایک تو یہ کہ خدا جبراً ان کو اس راستے پہ چلاتا کیونکہ انسان کے لیے یہ چیز قطعاً مفید نہیں تھی۔ اگر اس کو پتھر اور بکریوں کی طرح مجبور پیدا کیا جاتا تو اس کی ذات کی نشوونما' اس کے اختیار و ارادہ کی برومندیاں نہیں ہوسکتی تھیں۔ کہا یہ ہے کہ خدا کے لیے یہ کچھ مشکل نہیں تھا کہ تمام انسانوں کو ایک راستے کے اوپر چلنے والا بنادیتا۔ لیکن **اَفَاَنْتَ تُكْرِهُ النَّاسَ** (10:99) تو کیا تُو یہ چاہتا ہے کہ خدا جبراً ایسا کردیتا؟ نہیں۔

خدائے علیم نے ہر دور میں انسان کو صحیح راستے کی پوری پوری نشاندہی کردی تھی اور کررکھی ہے

خدا نے انسانوں کے لیے جبر کا طریقہ اختیار نہیں کیا۔ تو پھر اس نے اس کے لیے کیا طریقہ اختیار کیا ہے؟ **وَ قُلِ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكُمْ** (18:29) صحیح راستہ اس نے دکھا دیا' تیرے رب کی طرف سے الحق (THE TRUTH) آ گیا۔ پھر؟ **فَمَنْ شَآءَ فَلْیُؤْمِنْ وَّ مَنْ شَآءَ فَلْیَكْفُرْ** (18:29) جس کا جی چاہتا ہے وہ صحیح راستہ اختیار کرلے جس کا جی چاہتا ہے اس سے انکار کردے۔ آپ نے دیکھا کہ یہ طریق کا اختلاف ہوا۔ ایک طریق یہ تھا کہ وہ جبراً تمام انسانوں کو ایسا پیدا کردیتا۔ ایسا نہیں کیا گیا کیونکہ انسان کا تو شرف ہی اس میں ہے کہ اس کو اختیار و ارادہ دیا ہے۔ تخلیقِ آدم میں آدم کا پہلا تعارف یہ کرایا گیا ہے۔ جس میں ایک

طرف تو اس کا مرتبہ اتنا بلند بتایا ہے کہ فرشتے اس کے سامنے جھک رہے ہیں' ملائکہ سجدہ کر رہے ہیں۔ کس انداز سے اس کا تعارف کرایا گیا! انہوں نے پوچھا تھا کہ یہ اتنا بڑا کیوں بنا ہوا ہے؟ ملائکہ کے متعلق قرآن نے یہ کہا ہے کہ لَا یَسۡتَکۡبِرُوۡنَ (16:49) ہم جو حکم دیتے ہیں اس کے او پر وہ عمل کیے چلے جاتے ہیں۔ ان کو اس میں یارائے سرکشی ہی نہیں' سوال ہی نہیں کہ اس سے وہ سرتابی برتیں۔ آدم کا کیا تعارف کرایا گیا؟ آدم سے ہم نے کہا ہے کہ وَ لَا تَقۡرَبَا ھٰذِہِ الشَّجَرَۃَ (2:35) یہ نہ کرنا آدم نے وہی کیا۔ یہ ہے شرفِ انسانیت' یہ ہے امتیازِ آدم۔ اوراس کے بعد جب اس نے کہا کہ یہ کیا ہو گیا' میں تباہ ہو گیا۔ اس نے کہا کہ کوئی بات نہیں! فَاِمَّا یَاۡتِیَنَّکُمۡ مِّنِّیۡ ھُدًی فَمَنۡ تَبِعَ ھُدَایَ فَلَا خَوۡفٌ عَلَیۡھِمۡ وَ لَا ھُمۡ یَحۡزَنُوۡنَ (2:38) ہم تمہاری طرف ہدایتیں بھیجیں تم میں سے جو اسے قبول کرلے گا پھر اس کے او پر کوئی خوف وحزن نہ ہو گا۔

انسان کے لیے شرفِ انسانیت کا راز اس کے اختیار کے صحیح استعمال میں مضمر ہے

آپ نے دیکھا کہ وجۂ شرف انسانیت کیا چیز ہے؟ یہ کہ اس کے پاس غلط راستہ اختیار کرنے کی قدرت موجود ہے۔ یہ قدرت رکھتے ہوئے صحیح راستہ اختیار کرنا شرف ہے' ورنہ پتھر کے ڈھیلے میں سے کبھی کوئی برائی کر ہی نہیں سکتا' نیکی نہیں کرسکتا۔ فرشتے کی نیکی' نیکی نہیں قرار دی گئی کیونکہ وَ ھُمۡ لَا یَسۡتَکۡبِرُوۡنَ (16:49) ان کے اندر صلاحیت اور استطاعت ہی نہیں ہے کہ وہ سرتابی برتیں۔ بتا دیا کہ آدم کے اندر سرتابی کی صلاحیت موجود ہے۔ اس صلاحیت کو رکھنے کے باوجود سرتابی نہ کرے تو وہ شرفِ انسانیت ہے۔ وَ قُلِ الۡحَقُّ مِنۡ رَّبِّکُمۡ ققف فَمَنۡ شَآءَ فَلۡیُؤۡمِنۡ وَّ مَنۡ شَآءَ فَلۡیَکۡفُرۡ (18:29) کتنا واضح ہے جو کچھ قرآن نے کہا ہے۔ ذٰلِکَ الۡیَوۡمُ الۡحَقُّ ج فَمَنۡ شَآءَ اتَّخَذَ اِلٰی رَبِّہٖ مَاٰبًا (78:39) جس کا جی چاہے اپنے رب کی طرف صحیح راستہ اختیار کرلے' اس کو منزل سنوار دے گا۔ آپ دیکھیے! مَنۡ شَآءَ (78:39) کس طرح سے یہاں آ رہا ہے۔ اس کے لیے ایک ریفرنس (80:12) بھی لکھ لیجیے۔ اور پھر جامع طور پر قرآن نے دو لفظوں میں ساری بات واضح کر دی۔ اور وہ یہ کہ اُس عالمِ امر میں جہاں ہم قانون بناتے ہیں وہاں ہماری مشیت چلتی ہے۔ یَفۡعَلُ مَا یُرِیۡدُ (22:14) وہاں وہ جو چاہتا ہے کرتا ہے۔ اور انسانوں کی دنیا کے اندر دیکھیے۔ یہاں یَشَآءُ خدا کے لیے ہے۔ جسے آپ مشیت کہتے ہیں۔ وہاں ہماری مشیت کارفرما ہے اور انسانوں کی دنیا میں کہا کہ اِعۡمَلُوۡا مَا شِئۡتُمۡ (41:40) اپنی دنیا میں تم جیسا چاہو ہم اس میں دخل نہیں دیں گے۔ اختیار و ارادہ دے کر پھر دخل دے کر اس کو چھین لینا

می نہ سزد خدائے را

کتنا واضح ہے کہ اِعۡمَلُوۡا مَا شِئۡتُمۡ (41:40) یہاں انسان کی مشیت کارفرما ہے۔ وہی لفظ ہے بس اتنا ہے کہ اِنَّہٗ بِمَا تَعۡمَلُوۡنَ بَصِیۡرٌ (41:40) تمہیں مادر پدر آزاد نہیں چھوڑ دیا۔ جو تمہارا جی چاہے کرو لیکن ہماری نگاہ ہے کہ تم کیا کرتے ہو۔ ہم قانونِ مکافاتِ عمل کی رو سے نتائج مرتب کرتے چلے جائیں گے۔ اِعۡمَلُوۡا مَا شِئۡتُمۡ (41:40) ہی تو انسانیت کا شرف ہے۔ اور میں کہتا ہوں کہ ''کیڈا اوڈا دل گردہ اے اوہدا'' (اس کا کتنا بڑا دل گردہ ہے) کہ اتنا صاحبِ اختیار و ارادہ ہوتے ہوئے لَوۡ شَآءَ اللّٰہُ (16:35) اگر ہم چاہتے تو تمہیں صاحب اختیار و ارادہ پیدا ہی نہ کرتے۔ اس میں شک ہی گنجائش ہی نہیں ہے۔ اتنے بڑے اختیارات کا مالک ہوتے ہوئے اپنی مملکت کے اندر اتنا بڑا حقِ خود ارادیت دے دینا کہ اِعۡمَلُوۡا مَا شِئۡتُمۡ (41:40)۔ یہ خدا ہی کرسکتا تھا۔

آسمانوں پر خدا کی مشیت اور زمین پر انسان کے اختیار و ارادہ کی حکمرانی

اب دونوں چیزیں آپ کے سامنے آ گئیں۔ من تشآء وہ ہے جہاں وہ کسی چیز کے لیے قانون بناتا ہے۔ اس نے ایسا قانون کیوں بنا دیا کہ بکری مجبور ہے' انسان صاحبِ اختیار ہے؟ کہا کہ یہ ہماری مشیت ہے۔ ہمارا کارگہٗ کائنات ہے' ہم اپنے پلان کے مطابق اس کو چلا رہے ہیں۔ ہم نے ایسا بنا دیا۔ نمک کو نمکینی اور شہد کو شیرینی ہمارے قانونِ مشیت کی رو سے طے ہوئی ہے۔ کسی سے ہم نے پوچھا نہیں' مشورہ نہیں لیا' کسی کی دخل اندازی نہیں۔ لیکن انسانی دنیا کے اندر اِعۡمَلُوۡا مَا شِئۡتُمۡ (41:40) یہاں تمہاری مشیت کارفرما رہے گی۔ اگر ہم چاہتے کہ تم سب ایک طرح سے ہو تو ہم یہ تمہیں اختیار و ارادہ دیتے ہی نہیں۔ اس لَوۡ شَآءَ (16:35) کے یہ معنی ہوئے۔ اور یہ جو علم نہیں رکھتے' تکذیب کرتے ہیں۔ حقیقت سے یہ چاہتے ہیں کہ اگر خدا چاہتا کہ ہم شرک نہ کریں تو خدا پیدا ہی ایسا کرتا۔ اس نے کہا یہ ان کی جہالت ہے۔ اِعۡمَلُوۡا مَا شِئۡتُمۡ (41:40) انسان کی دنیا میں انسان کی مشیت چلتی ہے۔ اب یہ رہا کہ وہ امتِ واحدہ جو ہم چاہتے تھے کہ بنے وَ لَوۡ شَآءَ رَبُّکَ لَجَعَلَ النَّاسَ اُمَّۃً وَّاحِدَۃً (11:118) اس کے لیے طریقہ کیا اختیار کیا گیا؟ کَانَ النَّاسُ اُمَّۃً وَّاحِدَۃً (2:213) دیکھیے وہی چیز ہے وَ لَوۡ شَآءَ رَبُّکَ لَجَعَلَ النَّاسَ اُمَّۃً وَّاحِدَۃً (11:118) اگر خدا چاہتا تو سب کے سب انسان ایک امتِ واحدہ ہوتے' ان کے اندر اختلاف ہی نہ ہوتا۔

خدا کی مشیت کے معنی خدا کا وہ قانون ہے جو اس نے عالمِ امر میں کائنات کی ہر شے کے لیے بنا رکھا ہے

یہاں ''چاہتا'' کے معنی یہ ہیں کہ اگر ہماری مشیت میں ہوتا تو باقی مخلوق کی طرح انسان کو بھی ہم مجبور پیدا کرتے۔ ایک ہی امت ہوتی لیکن اس کے لیے ہم نے یہ طریقہ اختیار نہیں کیا۔ اس کے لیے کیا طریقہ اختیار کیا؟ كَانَ النَّاسُ اُمَّةً وَّاحِدَةً (2:213) کیونکہ ہم چاہتے تھے کہ انسان اپنے اختیار وارادے سے ایک امت بن جائے۔ کیا کیا؟ فَبَعَثَ اللّٰهُ النَّبِيّٖنَ مُبَشِّرِيْنَ وَ مُنْذِرِيْنَ ((2:213 ہم نے صحیح راستہ بتانے کے لیے اپنی طرف سے پیغامبر بھیج دیئے' ہر دوراہے کے اوپر سائن پوسٹ لگا دیے۔ وَ اَنْزَلَ مَعَهُمُ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ لِيَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ فِيْمَا اخْتَلَفُوْا فِيْهِ((2:213 حق و باطل میں امتیاز کرنے والی کتاب بھیج دی' فرقان بھیج دیا تا کہ لوگ اپنے اختلافی معاملات میں اس کی رو سے فیصلہ خود کرلیں۔ اور یہ حق کے مطابق اپنے اختیار اور ارادے اور مرضی اور مشیت سے حق کا راستہ اختیار کرتے چلے جائیں۔ انسان اپنے ارادے سے جو کرتا چلا جائے گا یہ طریقہ ہے جس سے ہم چاہتے ہیں کہ یہ امتِ واحدہ بنے ورنہ جبراً امتِ واحدہ بنانا ہوتا تو ہمارے لیے مشکل کیا تھا۔ وَ لَوْ شَآءَ رَبُّكَ (11:118) کے وہاں یہ معنی ہیں۔ اور وہ جو کہا ہے کہ مشرکین نے اسی اعتراض کو دہرایا کہ اگر خدا چاہتا تو ہم ایسا کیوں کرتے۔ اس کا جواب دیا کہ بالکل بکتے ہیں۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ یہ اپنے ہر معاملے میں تو اختیار وارادے والا رہنا چاہتے ہیں۔ ان سے کہیے کہ کیا اس قسم کا انسان رہنا پسند کرتے ہو یا ایک پتھر کا بت بن جانا پسند کرتے ہو۔ کوئی انسان بھی یہ نہیں چاہتا۔ کہا ہم نے یہ طریقہ انسانوں کے لیے اختیار کیا کہ انبیا بھیجے جو مُبَشِّرِيْنَ وَ مُنْذِرِيْنَ (2:213) تھے۔ کتابیں نازل کیں۔ جن میں یہ صلاحیت تھی کہ اختلافات کو مٹا دیا۔ انسانوں سے کہا کہ اب تم اپنی مرضی سے جی چاہے تو یہ راستہ اختیار کرو' جی چاہے وہ اختیار کرو۔ اور اس طرح سے تم جو اپنے اختیار وارادے سے صحیح راستہ اختیار کرتے چلے جاؤ' یوں انسانوں میں سے نکل نکل کر امتِ واحدہ بنتی چلی جائے گی۔

انسانوں میں باہمی اختلافات کی بنیادی وجہ ضد کی بنا پر ایک دوسرے پر غلبہ حاصل کرنا ہوتا ہے

وَ مَا اخْتَلَفَ فِيْهِ اِلَّا الَّذِيْنَ اُوْتُوْهُ مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَتْهُمُ الْبَيِّنٰتُ بَغْيًۢا بَيْنَهُمْ((2:213 اس علم کے آ جانے کے بعد'

کتاب آ جانے کے بعد' انبیاء آ جانے کے بعد' جو لوگ ایک دوسرے سے باہمی اختلاف کرتے ہیں بَغۡیًۢا بَیۡنَہُمۡ ۚ (2:213) 478 **آلِ عمران** یہ ایک دوسرے پر چڑھ دوڑنے کا جذبہ ہے کہ میں اس سے آگے نکل جاؤں' میں اس پہ غلبہ پا لوں۔ یہ باہمی ضد کی وجہ سے ایسا کرتے ہیں۔ فَہَدَی اللّٰہُ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا لِمَا اخۡتَلَفُوۡا فِیۡہِ مِنَ الۡحَقِّ بِاِذۡنِہٖ (2:213) ان میں سے پھر جو خدا کے قانون کے مطابق صحیح راستے کے اوپر چلتا ہے وہ حق کے راستے کے اوپر ہوتا ہے۔ اور یہاں ہے وَ اللّٰہُ یَہۡدِیۡ مَنۡ یَّشَآءُ اِلٰی صِرَاطٍ مُّسۡتَقِیۡمٍ (2:213) دیکھا! مَنۡ یَّشَآءُ (2:213) کہاں آیا ہے! مَنۡ یَّشَآءُ (2:213) کو خدا کی طرف لے جائیے تو اس کے معنی یہ ہونگے کہ ہمارا قانونِ مشیت یہ ہے کہ انسانوں کو مجبور پیدا نہیں کیا۔ ان کی طرف انبیا بھیجے' کتابیں بھیجیں' وضاحت کر دی' اختیار و ارادہ دیا۔ کہا کہ اب جو تم میں سے جی چاہے اس راستے کے اوپر آ جائے۔ ہماری مشیت ہی یہ ہے۔ خدا اپنے قانونِ مشیت کے مطابق لوگوں کو ہدایت دیتا ہے۔ قانونِ مشیت یہ ہے کہ انسان اپنی مشیت کے مطابق کوئی راستہ اختیار کرے۔ یہ خدا کی مشیت ہے کہ انسان اپنے اختیار سے راستہ اختیار کرے۔

خدا تعالیٰ سے انسان کو اپنی مرضی سے ہدایت لینا ہوگا

برادرانِ عزیز! ''چاہنے'' کے بجائے اگر آپ قانونِ مشیت کہیں گے تو بالکل بات صاف ہو جاتی ہے۔ یا اگر مَنۡ یَّشَآءُ کے معنی یہ کرو کہ ''جو انسان اس طرح سے ہدایت لینا چاہتا ہے اسے ہم ہدایت دے دیتے ہیں'' تو یہ بات بھی صاف ہو گئی۔ یہاں یہ معنی ہو گئے کہ جو انسان اپنے اختیار و ارادے سے ایسا کرنا چاہتا ہے' اس کو یوں مل جاتا ہے۔ خدا کی طرف اس کو لے جائیں گے تو یہ ہوگا کہ خدا اپنے قانونِ مشیت کے مطابق ہدایت دیتا ہے کسی کو جبراً ہدایت کے راستے پر نہیں چلاتا۔ اور اس کا قانونِ مشیت یہ ہے کہ اس نے راستہ دکھانے کے لیے روشنی دیدی۔ اور اس کے بعد انسانوں کو اختیار دیدیا کہ وہ خود راستہ صحیح اختیار کریں۔ وہ قانونِ مشیت ہوا۔

کل اختیارات کا مالک خدا اپنے قانون کے مطابق انسان کو عزت دیتا ہے اور پھر ذلت بھی انسان کو قانون کے ہی مطابق ملتی ہے

اب آیئے اس آیت کی طرف قُلِ اللّٰہُمَّ مٰلِکَ الۡمُلۡکِ تُؤۡتِی الۡمُلۡکَ مَنۡ تَشَآءُ وَ تَنۡزِعُ الۡمُلۡکَ مِمَّنۡ تَشَآءُ (3:26) کہو ہاں اے ہمارے خدا مٰلِکَ الۡمُلۡکِ (3:26) اختیار و اقتدارات کا مالک تو ہے۔ یہ ایمان بالکل صحیح ہے کہ

مطلق اختیارات صرف اس کے ہیں ۔ اب اس کے بعد وہ DELEGATE ہوتے ہیں آ گے انسانوں کو دیے جاتے ہیں جسے آج کی اصطلاح میں PREINFINAL AUTHORITY کہتے ہیں وہ وہی ہے کہ جو انسان کو اختیارات دیتا ہے۔ اے خدا تو اختیاراتِ کلی کا مالک ہے۔ مَنْ تَشَآءُ (3:26) تو یہ بات ان الفاظ میں جیسے ہم ''جسے چاہتا ہے'' کہتے ہیں یہ ہے کہ تُو جسے چاہتا ہے اختیارات دیتا ہے' جس سے چاہتا ہے چھین لیتا ہے' جسے چاہتا ہے عزت دیتا ہے' جسے چاہتا ہے ذلت دیتا ہے ۔اس کے معنی یہ کیجیے کہ تُو اختیاراتِ کلی کا مالک ہے۔انسانوں میں سے جنہیں اختیار ملتا ہے وہ تیرے قانونِ مشیت کے مطابق ملتا ہے ۔جن سے چھنتا ہے وہ بھی تیرے قانونِ مشیت کے مطابق وہ چھنتا ہے۔ جسے عزت ملتی ہے تیرے قانونِ مشیت کے مطابق ملتی ہے۔ جو ذلیل ہوتا ہے وہ بھی تیرے بتائے ہوئے قانون کے مطابق ہی ذلیل ہوتا ہے۔ اتنی بات کرنے سے بات صاف ہوگئی۔ اب طے کرنا یہ رہ گیا کہ وہ قانونِ مشیت کیا ہے جس کے مطابق اختیارات ملتے ہیں یا چھنتے ہیں۔جس کے مطابق عزت ملتی ہے یا چھنتی ہے۔ یہ دیکھنا باقی رہ گیا۔ اب ترجمہ یہ ہوگیا کہ تیرے قانونِ مشیت کے مطابق یہاں یہ کچھ ہورہا ہے۔ وہ قانونِ مشیت کیا ہے؟ قرآن نے وضاحت سے یہ بتا دیا اور یہی تو اس کا اعجاز ہے۔ یہ (3:25-26) درس کی آیتیں ہیں جو ابھی ہمارے سامنے آئیں۔ اس سے پہلے سورۃ بقرۃ (2:247) میں حضرتِ طالوت کا قصہ ہے۔ بنی اسرائیل نے اپنے نبی سے کہا کہ ہمیں ایک کمانڈر مقرر کر دیجیے تا کہ ہم مخالفین کے مقابلے میں جا کر جنگ کریں۔ انہوں نے کہا کہ ہاں! خدا نے طالوت کو تمہارا کمانڈر مقرر کر دیا ہے۔ انہوں نے کہا کہ اس کو کیسے کمانڈر مقرر کر دیا ہے؟ وَلَمْ یُؤْتَ سَعَةً مِّنَ الْمَالِ (2:247) وہ تو کسی دولت مند کا بیٹا نہیں ہے۔ ان کے نزدیک دولت معیار تھا اور یہ ہمیشہ چلا آتا ہے۔ بنی اسرائیل نے بھی یہی کہا۔ قَالَ اِنَّ اللّٰہَ اصْطَفٰہُ عَلَیْکُمْ (2:247) تمہارے کمانڈنگ کے لیے خدا نے ایک شخص کو منتخب کیا ہے۔ تو اب اگر وہ یہ بات کہہ دیتا کہ تمہیں پوچھنے کا کیا حق ہے ہم جسے چاہتے ہیں' کمانڈر بنا دیتے ہیں' جسے چاہتے ہیں ہم اختیار دیتے ہیں۔ اگر اس آیت کے یہ معنی لیے جائیں تو یہاں کہنا یہی چاہیے تھا کہ تم پوچھنے والے کون ہو۔ آپ دیکھتے ہیں کہ یہاں اختیارات کی بات آ رہی ہے۔ میں نے اسی لیے یہ آیت پیش خاص طور پہ کی کہ یہاں اختیار دینے کی بات آ رہی ہے۔ ان کا اعتراض ہمارے سامنے ہے۔ یہ نہیں کہہ دیا کہ تم کون ہوتے ہو پوچھنے والے' ہم جسے چاہتے ہیں دیتے ہیں۔ یہ نہیں کہا۔ کہا کہ اسے اس لیے یہ اختیار و اقتدار دیا جاتا ہے کہ وَزَادَهٗ بَسْطَةً فِی الْعِلْمِ وَ الْجِسْمِ (2:247) جرنیل بننے کے لیے دو QUALIFICATIONS کی ضرورت ہے۔ ایک تو یہ کہ PHYSICALLY وہ فٹ ہو۔ تو اس کی کیفیت تم دیکھو کہ صحت تنومندی PHYSICALLY نہایت فٹ ہے۔ دوسرے

یہ کہ یہ علومِ حرب کا ماہر ہے۔ اس لیے اس میں دونوں صفتیں پائی جاتی ہیں۔ علم اور جسم دونوں اعتبار سے اس کو بڑی فراوانی حاصل ہوئی ہے۔

لفظ فراوانی کا حقیقی مفہوم اور خدا کی طرف سے اس کی غایت

درمیان میں پھر یہ الفاظ کے مفہوم کی بات آ جاتی ہے۔ بَسْطَةً (2:247)۔ عربی زبان میں فراوانی کے لیے بڑے لفظ ہیں لیکن بَسْطَةِ (2:247) اس فراوانی کو کہتے ہیں جس میں وہ افادیت اور نفع پرستی میں دوسروں کو بھی شریک کر لے۔ یہ علم اور جسم کی فراوانی اس کو ملی ہے کہ جو اس کی ذات تک ہی نہیں رہتی اس کے فائدے دوسروں تک بھی پہنچتے ہیں۔ آپ نے دیکھا کہ جرنیل بنانے کے لیے کیا خصوصیتیں بتائی جا رہی ہیں۔ انہیں یہ جواب دیا جا رہا ہے۔ اور جواب دینے کے بعد کہا ہے کہ وَ اللّٰہُ یُؤْتِیْ مُلْکَہٗ (2:247) وہ اپنے اختیارات دیتا ہے۔ کسے دیتا ہے؟ دیکھیے! مَنْ یَّشَآءُ (2:247) یعنی مَنْ یَّشَآءُ (2:247) کے معنی اگر یہ ہوں کہ ہم جسے چاہتے ہیں دیدیتے ہیں تو پہلے تو وہ بتادیا کہ ہم نے کیوں دیا ہے۔ دونوں معنی کیجیے یعنی اگر تو یہ ہو کہ جو اس قسم کے اختیارات لینا چاہے، جو اس قسم کا جرنیل بننا چاہے، اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ علم اور جسم کے اندر فراوانی حاصل کرے۔ اور وہ ایسی حاصل کرے کہ اس کا یہ علم اور اس کی توانائی دوسروں کے لیے بھی مفید ہو، پھر وہ جرنیل بن سکتا ہے۔ یہ مَنْ یَّشَآءُ (2:247) ہوگا۔

مَنْ یَّشَآءُ (2:247) کا ترجمہ ''خدا کا قانونِ مشیت'' ہے

اور اگر یہ ہے کہ ہم نے بنایا ہے تو پہلے بتا دیا کہ ہم نے اس لیے بنایا ہے کہ اِنَّ اللّٰہَ اصْطَفٰہُ عَلَیْکُمْ وَ زَادَہٗ بَسْطَةً فِی الْعِلْمِ وَ الْجِسْمِ (2:247) اسے ان خصوصیات کی بنا پر ہم نے منتخب کیا ہے۔ خود قرآن نے بتا دیا۔ یہاں مَنْ یَّشَآءُ (2:247) کے یہ معنی ہوئے کہ ہم اپنے قانونِ مشیت کے مطابق اختیارات دیتے ہیں۔ اور قانونِ مشیت یہ ہے کہ جرنیل اسے بنایا جائے کہ جس میں PHYSICAL FITNESS اور علمِ حرب فراوانیوں سے ہو اور فطرت بخیل نہ واقع ہوئی ہو۔ یہ قانونِ مشیت ہو گیا۔ آپ دیکھتے ہیں یہ وہی مَنْ یَّشَآءُ (2:247) کے ساتھ وَ اللّٰہُ یُؤْتِیْ مُلْکَہٗ (2:247) ہے۔ وہاں یہ تھا کہ تُؤْتِی الْمُلْکَ مَنْ تَشَآءُ (3:26) تو جسے چاہتا ہے اختیارات دیتا ہے۔ یہاں ہے کہ وَ اللّٰہُ یُؤْتِیْ مُلْکَہٗ مَنْ یَّشَآءُ (2:247) اگر یہ ترجمہ کریں کہ اللہ جس کو چاہتا ہے اپنے اختیارات دیتا ہے۔ لیکن ساتھ ہی بتا دیا کہ اسے دیتا ہے جس میں یہ خصوصیتیں ہوتی ہیں۔ اس لیے مَنْ

تَشَآءُ کے معنی یہ نہ ہوئے کہ وہ (معاذاللہ) مہاراجہ رنجیت سنگھ کی طرح دیتا ہے یا ہمارے دور کی ملوکیت کا ترجمان سعدی کا آلِ عمران 478 نظریہ اب تک چلا آ رہا ہے۔ وہ ہے تو بڑی تنقیدی چیزیں جو وہ شخص کہہ رہا ہے لیکن کہتا تو وہ یہی ہے کہ مزاجِ شاہاں ان کے کیا پوچھتے ہیں!

گاہے بہ سلامے برنجند وگاہے بہ دُشنامے خلعت بہ بخشند

مزاجِ شاہاں کیا پوچھتے ہو! کبھی تو یہ کہ سلام کیجیے تو پھانسی دے دیں کبھی یہ کہ گالی دیجیے تو گاؤن بخش دیں۔ یہ مَنْ یَشَآءُ (2:247) کا مروجہ ترجمہ ہے۔

او تھے کی پرواہ اے راکب او تھے بے پروائیاں

پھڑ لے عملاں والیاں نوں چھڈ دے او گنہگاراں نوں

او بھئی! یہ کیوں کرتے ہو؟ مَنْ یَشَآءُ (2:247)۔

ہمارے دورِ ملوکیت میں ہونے والے قرآنی تراجم کے اثرات اور قومِ بنی اسرائیل کا ذکر جس کو خدا کے قانونِ مشیت کے مطابق مملکت اور بادشاہت ملی

عزیزانِ من! مَنْ یَشَآءُ (2:247) کا یہ ترجمہ ہمارے دورِ ملوکیت میں ہوا ہے۔ جہاں کسی کو جرأت نہیں تھی بادشاہ سے پوچھنے کی کہ آپ ایسا حکم کیوں دیتے ہیں۔ یہ مَنْ یَّشَآءُ (2:247) قرآن کا ہے کہ جس نے ان تمام چیزوں کو مٹا کر قانون کی حکمرانی کو رائج کیا۔ خدا نے اپنے متعلق کہا کَتَبَ عَلٰی نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ (6:12) ہم نے خود اپنے اوپر ایک پابندی عائد کی ہوئی ہے اور ہم اس پابندی کو کبھی نہیں توڑتے۔ قرآن یہ نظام دے رہا ہے۔ لہٰذا اس میں مَنْ یَشَآءُ (2:247) کے معنی "جو چاہتا ہے بغیر کسی قاعدے قانون اور بغیر کسی معیار کے" قطعاً غلط ہیں۔ تُؤْتِی الْمُلْکَ مَنْ تَشَآءُ (3:26) جسے تو چاہتا ہے اپنے قانونِ مشیت کے مطابق ملک عطا کرتا ہے۔ اور قانونِ مشیت یہ ہے جو (2:247) میں پہلے آ گیا۔ یہ تو ایک فرد کی بات ہوئی۔ آگے چلیے قومِ بنی اسرائیل کی بات آ گئی۔ یہ قوم حضرتِ موسیٰؑ کے زمانے میں فرعون کی محکومی اور غلامی کی زنجیروں میں جکڑی ہوئی تھی۔ اسے مملکت عطا ہو رہی ہے' بادشاہت مل رہی ہے۔ انہوں نے پوچھا ہے کہ یہ کیسے ہوگا؟ قَالَ مُوْسٰی لِقَوْمِهِ اسْتَعِيْنُوْا بِاللّٰهِ وَ اصْبِرُوْا (7:128) موسیٰؑ نے اپنی قوم سے کہا کہ یہ یوں ملے گی کہ تم خدا کے قوانین سے ان کے قواعد کے مطابق مدد چاہو یا یہ کہ

اپنی متوازن نشوونما کرتے چلے جاؤ۔ استعانت کے یہی معنی ہوتے ہیں ۔وَ اصۡبِرُوۡا (7:128) اور مشکلات کا استقامت سے مقابلہ کرتے چلے جاؤ۔ آپ دیکھتے ہیں کہ یہ کیا شرط عائد ہو رہی ہے؟ یہاں استقامت شرط ہوگئی ۔ اور اس کے بعد ہے کہ اِنَّ الۡاَرۡضَ لِلّٰهِ (7:128) یہ ملک' بادشاہت' مملکتیں' یہ بنیادی طور پر خدا کی مِلک ہے ۔یُوۡرِثُهَا (7:128) وہ ان کا وارث بناتا ہے مَنۡ یَّشَآءُ مِنۡ عِبَادِهٖ (7:128) اپنے بندوں میں سے۔ اب مَنۡ یَّشَآءُ (7:128) کا ترجمہ جو جی میں آئے کر لیجیے۔ اگر یہ ہو کہ ''جو لینا چاہتا ہے'' تو اس کے معنی یہ ہیں کہ جو بھی استعانت باللہ اور استقامت سے کام لے گا اسے ملے گی ۔ اور اگر خدا کے متعلق ہے تو یہ ہوگا کہ ''خدا اپنے قانونِ مشیت کے مطابق دے گا''۔ اور ہمارا قانونِ مشیت یہ ہے کہ جو استعانت باللہ اور استقامت سے کام لے گا اسے یہ مل جائے گی۔

استخلاف فی الارض کا حصول بھی قانونِ خداوندی کے تابع یقینِ محکم اور عملِ پیہم سے مشروط ہے

تو آپ نے دیکھا کہ یہاں تُؤۡتِی الۡمُلۡکَ مَنۡ تَشَآءُ (3:26) تھا کہ جسے تُو چاہتا ہے دیتا ہے۔ ''جسے تُو چاہتا ہے'' کے معنی یہ نہیں جو میں نے عرض کیا ہے کہ مہاراجہ رنجیت سنگھ کی طرح دیتا ہے بلکہ آپ دیکھتے ہیں کہ جسے جہاں دیا گیا ہے وہاں بتایا گیا ہے کہ یہ کیسے ملتی ہے' کن شرائط کے تابع ملتی ہے' کس قسم کی صلاحیتیں اپنے اندر پیدا کرنے کے بعد ملتی ہے ۔ اب مَنۡ یَّشَآءُ (7:128) کے ترجمے آپ دیکھتے ہیں کہ کیسے صحیح ہوتے جاتے ہیں۔ ملک یا مملکت ملنے کی بات ہے۔ کہا کہ وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا مِنۡکُمۡ وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَیَسۡتَخۡلِفَنَّهُمۡ فِی الۡاَرۡضِ (24:55) جو تم میں سے ان قوانین کی صداقتوں پر یقین رکھے اور اس کے اعمال صلاحیت بخش ہوں' تو اسے استخلاف فی الارض مل جاتا ہے ۔ اور یہ بات ہم تمہارے لیے ہی نہیں کہہ رہے کَمَا اسۡتَخۡلَفَ الَّذِیۡنَ مِنۡ قَبۡلِهِمۡ (24:55) تم سے پہلے بھی جو لوگ گزرے ہیں انہیں بھی اسی طرح سے ملتا تھا۔ اب آپ نے سمجھا کہ تُؤۡتِی الۡمُلۡکَ مَنۡ تَشَآءُ (3:26) جو کہا گیا ہے کہ ''جسے تو چاہتا ہے دیتا ہے'' یہ کیا معنی ہوئے؟ یہ کہ ''تیرے قانونِ مشیت کے مطابق ملتا ہے''۔ قانونِ مشیت یہ ہے کہ ان چیزوں کے حصول کے قوانین کی صداقتوں پر یقینِ محکم اور عملِ پیہم کیجیے تو یہ چیز مل جاتی ہے۔ دوسری جگہ ہے کہ وَ لَقَدۡ کَتَبۡنَا فِی الزَّبُوۡرِ مِنۡۢ بَعۡدِ الذِّکۡرِ (21:105) ہم نے تو یہ بات زبور میں یا پہلی کتابوں میں (دونوں ترجمے ہو سکتے ہیں) نصیحت کے بعد یہ کہہ دی تھی' لکھ دیا تھا' واجب قرار دے دیا تھا' کہ یہ بات یوں ہی ہوگی۔ کیا بات لکھی تھی؟ اَنَّ الۡاَرۡضَ (21:105) یقیناً اس زمین میں استخلاف' تمکن' اقتدار' اختیار یَرِثُهَا (21:105) خدا اس کو دیتا ہے یا وہ وارث ہوتے ہیں عِبَادِیَ الصّٰلِحُوۡنَ (21:105) وہ بندے جو اس کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ بات صاف

ہے کہ یہ جو تَشَآء ہے یہ جو خدا کی مشیت ہے ۔ وہ قانونِ مشیت بتا تا چلا جا تا ہے کہ یہ ہے ہمارا قانونِ مشیت ۔ اوراس کے 1478 **آلِ عمران**
بعد ہے اِنَّ فِیۡ ھٰذَا لَـبَلٰغًا لِّقَوۡمٍ عٰبِدِیۡنَ ((21:106 ہر وہ قوم جو قانون کی محکومیت کرنا چاہتی ہے ان کے لیے اس کے اندر بڑی دل میں اتر جانے والی ایک چیز ہے جو ہم نے کہہ دی ہے ۔ یہ وہ قانون ہے کہ اس کے لیے صلاحیت شرط ہے ۔اس کے ملنے کا قانونِ مشیت ہی وہ ہے ۔

باہر کی دنیا کا تغیر خواہ وہ تعمیری ہو یا تخریبی انسانی اعمال کا ہی پرتَو ہوتا ہے' عکس ہوتا ہے

پہلی قوموں کا ذکر کرتے ہوئے قرآن نے بنیادی نقطہ بتا دیا ۔ ذٰلِکَ ((8:53 کس کو مملکت ملی' کس سے چھنی ذٰلِکَ (8:53) یہ اس لیے یوں ہوا ۔ دیکھتے ہیں کہ وجہ بتائی جا رہی ہے ۔ یہ نہیں کہا گیا کہ یہ اس لیے ہوا کہ ہم چاہتے ہیں جس سے چھین لیتے ہیں ۔جس کو جی چاہتے ہیں ہم دیدیتے ہیں بلکہ ذٰلِکَ (8:53) یہ اس لیے یوں ہوا کہ بِاَنَّ اللّٰہَ (8:53 خدا کا قانون یہ ہے یعنی خدا یوں کرتا ہے ۔ لَمۡ یَکُ مُغَیِّرًا نِّعۡمَۃً اَنۡعَمَہَا عَلٰی قَوۡمٍ حَتّٰی یُغَیِّرُوۡا مَا بِاَنۡفُسِہِمۡ 8: (53) اس لیے کہ خدا کسی قوم کو دی ہوئی نعمت کو چھینتا نہیں ہے تاوقتیکہ وہ قوم اپنے اندر ایسی تبدیلی نہیں پیدا کرتی کہ وہ اس نعمت کی مستحق نہ رہے ۔'' اپنے اندر جب تک وہ خود تبدیلی پیدا نہیں کرتی '' اسے کہیے کہ یہ خدا کا قانونِ مشیت ہے کہ اپنے اندر کے تغیر سے باہر کی دنیا کے اندر ایک تغیر واقع ہوتا ہے ۔اب جو اس نے کہا ہے کہ مٰلِکَ الۡمُلۡکِ تُؤۡتِی الۡمُلۡکَ مَنۡ تَشَآءُ وَ تَنۡزِعُ الۡمُلۡکَ مِمَّنۡ تَشَآءُ ((3:26 یہاں بات صاف ہوگئی کہ اختیار و اقتدار' حکومتیں' استخلاف' مملکتیں' تیرے قانونِ مشیت کے مطابق ملتی ہیں ۔ تیرے قانونِ مشیت کے مطابق چھنتی ہیں ۔ اور قانونِ مشیت قرآن کے اندر اس طرح سے دیا ہوا ہے ۔ وقت تھوڑا ہونے کی وجہ سے میں دو دو چار حوالے آپ کو دے رہا ہوں ورنہ قانونِ مشیت تو قرآن نے اس شرح و بسط اور اس وضاحت و صراحت سے متعین کیا ہوا ہے کہ اس کے سمجھنے اور متعین کرنے میں کوئی شبہ ہی نہیں رہتا' کوئی دقت ہی نہیں پیش آتی ۔ ہر چیز کے لیے قانونِ مشیت ہے یعنی ہدایت و گمراہی کے لیے قانونِ مشیت' عزت و ذلت کے لیے قانونِ مشیت' ذلت و محکومی کے لیے قانونِ مشیت' مغفرت اور عذاب کے لیے قانونِ مشیت' رزق کے لیے قانونِ مشیت ۔ سارے قرآن میں یہ ہے ۔اس لیے جہاں بھی آپ کہیں گے کہ مَنۡ یَّشَآءُ (2:247) خدا کے لیے یا خدا کہے مَنۡ نَّشَآءُ (42:52) جسے ہم چاہتے ہیں یا ہم کہیں مَنۡ تَشَآءُ (3:26) جسے تو چاہتا ہے ۔اس کا ترجمہ یہ ہے کہ اس کے قانونِ مشیت کے مطابق ہوتا ہے ۔ جو قانون قرآن کے اندر وضاحت سے بیان کر دیا گیا ہے ۔ یہ مملکت کے متعلق ہے' یہ اختیارات و اقتدارات کے متعلق ہے' عزت کے متعلق اگلی چیز آئی ۔ وَ تُعِزُّ مَنۡ تَشَآءُ وَ

تُذِلُّ مَنۡ تَشَآءُ ((3:26 ہمارے ہاں تو آپ کو پتہ ہے کہ مَنۡ تَشَآءُ (3:26) کہاں استعمال ہوتا ہے؟ چورا چکے' بلیک مارکیٹنگ کرنے والے' سمگلر' OVERNIGHT MILLIONAIRE ' نے محلے کے اندر اتنا بڑا محل کھڑا کیا ہوا ہے۔ یہ سب کچھ ہے۔ اگلا کہتا ہے کہ صاحب! یہ دیکھیے ابھی کل یہ اس طرح سے بھیک مانگتا تھا' آج یہ کیفیت ہے۔ وہ کہتا ہے کہ صاحب! وَ تُعِزُّ مَنۡ تَشَآءُ وَ تُذِلُّ مَنۡ تَشَآءُ (3:26) چل بھئی! یہاں قرآن کی ساری تعلیم ختم ہوگئی۔ بات دوسری طرف چلی جائے گی۔ مارشل لا والوں کو کہہ دیجیے کہ جو کچھ بنا ہوا ہے' یہ تو خدا دیتا ہے آپ کون ہیں پوچھنے والے۔ تو کیا وہ آپ کی بات مان لے گا؟ نہیں۔ یہاں آپ تو یہ نہیں مانتے اور خدا کے ہاں اس سے اپنی یہ غلط توجیہہ منواتے ہیں۔ وَ تُعِزُّ مَنۡ تَشَآءُ وَ تُذِلُّ مَنۡ تَشَآءُ (3:26)۔ مَنۡ كَانَ يُرِيۡدُ الۡعِزَّةَ فَلِلّٰهِ الۡعِزَّةُ جَمِيۡعًا (35:10) جو عزت حاصل کرنا چاہتا ہے۔

عزت کا حصول صحیح نظریۂ زندگی کے تسلیم کرنے اور پھر اس پر عمل کرنے میں ہی مضمر ہے

عزت کے معنی غلبہ' قوت' اقتدار ہوتا ہے۔ یاد رکھیے! عزت تُذِلُّ کے مقابلے میں آتا ہے جس کے معنی کمزوری' ضعف' محکومی' ذلت ہوتا ہے۔ جو یہ لینا چاہتا ہے اسے معلوم ہونا چاہیے فَلِلّٰهِ الۡعِزَّةُ جَمِيۡعًا (35:10) عزت ساری کی ساری خدا کے لیے ہے' غلبہ اس کے لیے ہے۔ وہ غلبہ انسانوں کو دیتا ہے۔ کیسے دیتا ہے؟ بڑی غور طلب آیت ہے۔ کہتا ہے دو چیزیں ہیں۔ سورۃ نور میں جو ابھی میں نے کہا تھا کہ اس میں یہی چیز تھی کہ ایمان اور اعمالِ صالح کے بدلے میں' یہ چیزیں ملتی ہیں۔ دیکھیے کیا حسین انداز ہے کہنے کا! عزت چاہتے ہو' بلند ہونا چاہتے ہو' ابھرنا چاہتے ہو' بڑا بننا چاہتے ہو' تو اِلَيۡهِ يَصۡعَدُ الۡكَلِمُ الطَّيِّبُ ((35:10 صحیح نظریۂ زندگی تسلیم کرو۔ طیب کے معنی ثمر بار ہوتا ہے جو پھل لانے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ کیا بات ہے قرآن کے الفاظ کی! صحیح نظریۂ زندگی کے اندر یہ قوت ہوتی ہے کہ وہ بلند ہوتا ہوا اس کی طرف جاتا ہے۔ اس کے پاس عزت ہے۔ وہاں سے تم نے لینی ہے۔ ان کو اس کی طرف بلند ہونا چاہیے۔ صحیح نظریۂ زندگی کے اندر یہ قوت ہوتی ہے کہ وہ اوپر کو اٹھتا ہے۔ تو پہلی چیز تو یہ ہے کہ صحیح نظریۂ زندگی تمہارے پاس ہونا چاہیے۔ اسی میں یہ قوت ہے کہ وہ اوپر کو اٹھے۔ غلط نظریۂ زندگی میں یہ قوت نہیں ہے۔ وہ جو پہلے ایمان کہا تھا تو صحیح نظریۂ زندگی کا تسلیم کرنا ایمان ہے۔ وہ اوپر کو بلند ہوتا ہے۔ یہ PRAGMATIC TEST ہے کہ صحیح نظریۂ زندگی اوپر کی طرف اٹھتا ہے۔۔ اچھا! اب صحیح نظریۂ زندگی مان لیا تو کیا وہ آپ کے نیچے سپرنگ دے کر خود بہ خود آپ کو اٹھاتا چلا جائے گا؟ کیا بات ہے قرآن کی! وَ الۡعَمَلُ الصَّالِحُ يَرۡفَعُهٗ ((35:10 آہاہاہا! عربی جاننے والے اس کی بات دیکھ سکتے ہیں۔ صحیح نظریۂ زندگی میں یہ صلاحیت ہے لیکن وہ دانہ میز کے اوپر رکھا رہے' خود تو نہیں بار آور ہو سکتا۔ کونسی چیز ہے جو

اس دانے میں سے خوشے کو نکال کر بلندیوں کی طرف لے جاتی ہے؟ وَ الْعَمَلُ الصَّالِحُ يَرْفَعُهٗ (35:10)۔ 478آلِ عمران

انسانوں کے لیے عزت آستانوں پر جھکنے میں نہیں، قدرت کی طرف سے عطا ہونے والے قانون کے سامنے جھکنے میں ہے

عزت چاہتے ہو؟ فَلِلّٰهِ الْعِزَّةُ جَمِيْعًا (35:10) یہ ٹکڑا دیکھیے۔ عزت چاہتے ہو؟ مَنْ كَانَ يُرِيْدُ الْعِزَّةَ (35:10) جو عزت حاصل کرنا چاہتا ہے۔ اور پھر یہاں یہ بھی دیکھیے کہ ''جو چاہتا ہے'' کے معنی یہ نہیں ہیں کہ اس نے اپنے دل میں چاہ لیا۔ ''جو چاہتا ہے'' کے معنی یہ نہیں ہیں کہ میں نے کہا کہ صاحب! میں عزت لینا چاہتا ہوں، خدا نے کہا چاہتے ہو! مل جائے گی۔ سوال نہیں ہے۔ جیسے وہ پہلے کہا تھا کہ وہ قانونِ مشیت کے بغیر مملکت اور بادشاہت نہیں دیتا۔ اسی طرح یہاں بھی اگر وہ عزت لینا چاہتا ہے تو اس کو یوں ہی نہیں ملتی۔ دو ٹکڑے اس کے اندر بڑے ضروری ہیں۔ فَلِلّٰهِ الْعِزَّةُ جَمِيْعًا (35:10) کتنا حسین انداز ہے بات کرنے کا! ادھر اُدھر نہ بھٹکتے پھرو۔ اور آستانوں کے اوپر سر نہ جھکاؤ۔ وہاں ذلت ملے گی۔ جسے تم عزت کہتے ہو، وہ تمہارا فریبِ نفس ہے۔ پوری کی پوری عزت اس کے قوانین کے تابع ملتی ہے۔ جس میں پہلی چیز یہ ہے کہ اِلَيْهِ يَصْعَدُ الْكَلِمُ الطَّيِّبُ (35:10) صحیح نظریۂ زندگی اختیار کرو جس میں بارآور ہونے کی صلاحیت ہے۔ وَ الْعَمَلُ الصَّالِحُ يَرْفَعُهٗ (35:10) اور تمہارے اعمالِ صالح اس کو اوپر کی طرف ابھارتے ہیں۔ یہ کچھ کرو عزت ملے گی۔ وَ الَّذِيْنَ يَمْكُرُوْنَ السَّيِّاٰتِ لَهُمْ عَذَابٌ شَدِيْدٌ (35:10) اور جو لوگ اس کے خلاف ناہمواریاں پیدا کرنے والے کام کریں گے تو یاد رکھو ان کے لیے عزت نہیں ہے، تباہی ہے۔ بڑی سخت تباہی۔ ان کے لیے تباہی کہیں باہر سے نہیں آئے گی بلکہ وَ مَكْرُ اُولٰٓئِكَ هُوَ يَبُوْرُ (35:10) اس کے قانون کے خلاف یہ جو تدبیریں کرتے تھے، ان کے اندر یہ چیز تھی کہ تباہ ہو جائیں۔ پھر بات یاد آ گئی صاحب! اوپر تھا کہ کلمۂ طیب میں یہ صلاحیت ہوتی ہے اور عملِ صالحہ ابھارتا ہے۔ یہاں یہ ہے کہ مکر، غلط سازش کے اندر ان کے اپنے خلاف تباہی ہوتی ہے۔ وَ الَّذِيْنَ يَمْكُرُوْنَ (35:10) وہ لوگ اس کو عمل میں لاتے ہیں، یوں ان کی تباہی آ جاتی ہے۔ برادرانِ عزیز! عزت کے متعلق ایک اور آیت آ گئی۔ جیسے میں نے وہاں کہا تھا کہ قولِ فیصل آ گیا یہاں بھی آپ دیکھیں گے کہ قولِ فیصل ہے۔ دنیا کے اندر درجات کا نام، مدارج کا نام، مناصب کا نام، عزت ہے۔ مدارج کیسے مل سکتے ہیں؟ وہاں کہا ہے کہ وَ تُعِزُّ مَنْ تَشَآءُ (3:26)۔ تو خدا کے ہاں مدارج کی بلندی کا قانونِ مشیت کیا ہے؟ وَلِكُلٍّ دَرَجٰتٌ مِّمَّا عَمِلُوْا (46:19) ہر ایک کے مدارج

اس کے اعمال کے مطابق متعین ہوتے ہیں۔

خدا تعالیٰ کی مشیت تو بڑی فراخدل واقع ہوئی ہے لیکن قانون کے دائرے کے اندر

آپ نے غور فرمایا کہ وَتُعِزُّ مَنْ تَشَآءُ (3:26) کے معنی کیا ہوئے یعنی کلمۂ طیب ساتھ اعمال اور جتنے جتنے کسی کے اعمال ہونگے اس کے مطابق مدارج کا تعین ہوتا چلا جاتا ہے۔ وَلِيُوَفِّيَهُمْ اَعْمَالَهُمْ 46:19) اس کے ہاں ایسی ہے میزان کہ ہر عمل کا پورا پورا بدلا دے دیتا ہے۔ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ (46:19) وہاں کسی میں کمی نہیں کی جاتی' کسی پہ ظلم نہیں کیا جاتا۔ کہا کہ عزت لینا چاہتے ہو! آؤ ہم عزت دیتے ہیں۔ ہمارے پاس بہت ہے جتنی لینی چاہو گے ملے گی۔ کہا دے دیجیے مولا! کہتا ہے کہ اللہ واسطے نہیں ملتی۔ پہلے اپنے ذہن کو غلط نظریۂ حیات سے پاک وصاف کرو۔ لَا يَمَسُّهٗۤ اِلَّا الْمُطَهَّرُوْنَ (56:79) ان کو قرآن سے مَس نہیں ہو سکتا جو قلب و نگاہ کی پاکیزگی نہیں پیدا کرتے۔ پہلے یہ پیدا کرو پھر صحیح کلمۂ طیب یعنی نظریۂ زندگی کو اپنے اعمال کی بنیاد بناؤ۔ اس میں صلاحیت ہے کہ وہ اوپر کی طرف ابھرے گا۔ پھر تمہارے اعمال اس کو ابھارتے چلے جائیں گے۔ اور اس کے بعد کس کو کتنا ملے گا؟ وَلِكُلٍّ دَرَجٰتٌ مِّمَّا عَمِلُوْا (46:19) جو اس کے مطابق جتنا بھی کام کرتا چلا جائے گا' اس کے مدارج اتنے ہی بلند ہوتے چلے جائیں گے۔ عزت لینا چاہتے ہو تو لو عزت ملتی ہے۔ یہ نہیں کرنا چاہتے ہو تُذِلُّ مَنْ تَشَآءُ (3:26) اس کے لیے ہماری مشیت کے مطابق ذلت اور محکومی ہوگی۔ بِيَدِكَ الْخَيْرُ (3:26 اختیار واقتدار۔ خیر اور اختیار کا ایک ہی مادہ ہے۔ یہ تیرے ہاتھ میں ہے۔ ٹھیک ہے اس کے ہاتھ میں ہے لیکن وہ بخیل نہیں ہے۔ دیتا ہے اور دیتا کس طرح ہے؟ کہ

شعلہ شعلہ بہ بخشند شرر شرر نہ دہد

بڑی فراوانیوں سے دیتا ہے۔ قانون کے مطابق دیتا ہے ایسے نہیں دیتا۔ اور یہ قانونِ مشیت ہے جو سارے قرآن کے اندر موجود ہے۔ اگلی آیت میں ہے کہ وَتَرْزُقُ مَنْ تَشَآءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ (3:27)

خدا کا قانونِ مشیّت ہمارے حساب وشمار سے کہیں زیادہ رزق دینے کی صلاحیتیں رکھتا ہے

جیسا میں نے عرض کیا ہے کہ اب رزق کی بات آ گئی۔ یہ کیسے ملتا ہے؟ اس کے متعلق لوگ یہ کہتے ہیں کہ صاحب! وہ اس کی مشیت ہے (مشیّت تو وہ کہتے ہی نہیں) وہ جسے چاہتا ہے دیتا چلا جاتا ہے۔ یہ رزق کی فراوانی کیسے ملتی ہے؟ اوپر یہ آیا ہے کہ مومنین کی صفات یہ ہیں کہ وہ یہ کرتے ہیں' یہ کرتے ہیں۔ لِيَجْزِيَهُمُ اللّٰهُ اَحْسَنَ مَا عَمِلُوْا وَيَزِيْدَهُمْ مِّنْ فَضْلِهٖ (24:38)

478 آلِ عمران

ہم نے ان کو یہ سارا نظام اس لیے دیا ہے کہ جو بھی کام کرتا ہے اس کے کام کا صحیح ' نیک ' احسن ' بدلا اس کو دیا جائے۔ اور اس کے ساتھ ہی وہ اپنے فضل سے اس میں اضافہ کرے یعنی تم جو اپنے ہاں اس کا حساب لگاؤ' اس حساب کے مقابلے میں بہت زیادہ ملتا ہے۔ وہ جو ہے کہ وَاللّٰهُ يَرْزُقُ مَنْ يَّشَآءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ) (24:38 ''تے بغیر حساب دے معنی ہیگے نیں لوٹ پئی ہوئی ہیگی اے؟'' (تو کیا بغیر حساب کے یہ معنی ہیں کہ لوٹ مچی ہوئی ہے؟)۔ اس کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ تم اپنے ذہن سے' اپنے فارمولے کے مطابق' حساب کرتے ہو لیکن ہمارے فارمولے اور قانون کے اندر اس سے کہیں زیادہ دینے کی صلاحیتیں ہوتی ہیں ۔ جب اس کے مطابق کرتے ہو تو تمہارے حساب و شمار سے بھی کہیں زیادہ ملتا ہے ۔وَاللّٰهُ يَرْزُقُ مَنْ يَّشَآءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ((24:38۔ یہ سارا پروگرام دے کر یہ چیز کہی گئی کہ لِيَجْزِيَهُمُ اللّٰهُ اَحْسَنَ مَا عَمِلُوْا ((24:38 تا کہ خدا ان کو ان کے اعمال کا بہترین بدلا دیدے۔ اور آگے یہ ہے کہ اللہ رزق دیتا ہے۔ اب مَنْ يَّشَآءُ (24:38) کے معنی دیکھ لیجیے کیا ہوئے! کہ یہ ان کے اعمال کا بدلا بتا رہا ہے یعنی مَنْ يَّشَآءُ (24:38) کے معنی یہ ہیں کہ ہمارا قانونِ مشیت یہ ہے کہ ''جو لینا چاہے آئے اور لے''۔ ابھی میں عرض کرتا ہوں کہ اس نے مَنْ يَّشَآءُ (24:38) بھی کیوں کہا ہے۔ اس کے اندر رزق کے متعلق بڑی عظیم چیز ہے۔ ریفرنس لکھتے جایئے وقت تھوڑا رہ جائے گا۔ میں آج اس موضوع کو ختم کرنا چاہتا ہوں۔ کچھ تھوڑے سے زیادہ منٹ کی اجازت چاہوں گا!

زراعت کے قانون کے مطابق عمل کرنے کا نتیجہ کفر اور ایمان میں کوئی فرق پیدا نہیں کرتا

قرآن کتنے حسین انداز میں بات کرتا ہے! رزق کیسے ملتا ہے؟ اعمال کے بدلے میں' سعی و عمل کے بدلے میں' کوششوں کے بدلے میں۔ اب یہ رزق یہاں کے طبعی قوانین کے مطابق ملتا ہے یعنی زمین اچھی ہو' ریسرچ ہو' اس کے اندر زراعت کا قانون ہو' اچھی فرٹیلائزر ہو۔ پھر جسے آپ زراعت کا قانون کہتے ہیں کہ ہل چلانا' زمین کو سنوارنا' بیج کا اچھا ہونا' وقت پہ پانی دینا' وقت پہ گوڈائی کرنا' حفاظت کرنا' یہ ہو۔ یہ زراعت کا قانون ایسا ہے کہ اس میں کفر اور ایمان کا تعلق نہیں جو ہم مذہب کی دنیا میں لیتے ہیں۔ یہاں کفر اور ایمان یہ ہے کہ جس زمیندار کا یقین اس قانون کے اوپر ہے اور وہ اس کے مطابق عمل کرتا ہے' اس کو بھی ملتا ہے۔ جس کو یقین نہیں ہے' اس کو بھی ملتا ہے۔ دیکھیے قرآن کیا کہتا ہے! مَنْ كَانَ يُرِيْدُ الْعَاجِلَةَ عَجَّلْنَا لَهٗ فِيْهَا مَا نَشَآءُ لِمَنْ نُّرِيْدُ جو اس دنیاوی زندگی میں مفادِ عاجلہ حاصل کرنا چاہتا ہے ہم اسے دیتے ہیں ۔ یہاں نَشَآءُ (17:18) نُرِيْدُ (17:18) ہے۔ یوں نظر آتا ہے کہ ہم جسے چاہتے ہیں' جس کے متعلق ارادہ کرتے ہیں' اسے دیتے ہیں۔ لیکن اگر اسی دنیا

کے مفاد کو اس نے اپنے لیے منتہائے نگاہ' بنالیا ہے' متعین کرلیا ہے' قرار دے لیا ہے' تو مستقبل میں اس کے لیے کوئی خطرہ نہیں۔ **ثُمَّ جَعَلْنَا لَهٗ جَهَنَّمَ يَصْلٰهَا مَذْمُوْمًا مَّدْحُوْرًا ۔ وَ مَنْ اَرَادَ الْاٰخِرَةَ وَ سَعٰى لَهَا سَعْيَهَا وَ هُوَ مُؤْمِنٌ فَاُولٰٓئِكَ كَانَ سَعْيُهُمْ مَّشْكُوْرًا** (17:18-19) جو اس کے ساتھ مستقبل کے مفاد بھی چاہتا ہے۔ اور اس کے لیے پھر **سَعٰى لَهَا سَعْيَهَا** (17:19) جیسی کوشش کرنی چاہیے ویسی کوشش کرتا ہے۔ **فَاُولٰٓئِكَ كَانَ سَعْيُهُمْ مَّشْكُوْرًا** (17:19) اس کی مساعی مشکور ہوجاتی ہیں۔ آپ نے قانونِ مشیت دیکھا کہ مساعی مشکور ہو رہی ہیں۔ **مَا نَشَآءُ لِمَنْ نُّرِيْدُ** (17:18)۔ اوپر دو لفظ آئے ہوئے ہیں کہ جو اس کے لیے کوشش کرتا ہے جیسی کوشش کرنی چاہیے تو کوشش رائیگاں نہیں جاتی ۔ **كَانَ سَعْيُهُمْ مَّشْكُوْرًا** (17:19)۔

نَشَآءُ (17:18) اور **نُرِيْدُ** (17:18) کا بنیادی مفہوم اور پھر رزق کے سلسلہ میں اقوامِ عالم کی حالت

عزیزانِ من! آگے **نَشَآءُ** (17:18) اور **نُرِيْدُ** (17:18) کے معنی دیکھیے۔ **كُلًّا نُّمِدُّ هٰٓؤُلَآءِ وَ هٰٓؤُلَآءِ** (17:20) ہمارے قانون کے مطابق جو بھی عمل کرتا ہے ہم اس کو بڑھاتے چلے جاتے ہیں۔ اِسے بھی بڑھاتے چلے جاتے ہیں اور اُسے بھی بڑھاتے چلے جاتے ہیں جو صرف دنیاوی مفاد حاصل کرنے والا ہے۔ کیونکہ یہ بات نہیں ہے کہ ہم اس کو کہتے ہیں کہ ''ہیں! توں ساہنوں مندا ای نئیں ہیگا'' (ہیں! تُو تو ہمیں مانتا ہی نہیں ہے)۔ اس کے لیے بھی ہمارا یہ قانونِ مشیت ہے جو اس کے مطابق عمل کر رہا ہے۔ میں پھر یہ کہوں گا کہ کتنے بڑے دل گردے والا خدا ہے **كُلًّا نُّمِدُّ هٰٓؤُلَآءِ وَ هٰٓؤُلَآءِ** (17:20)۔ ''ایتھے مُنڈا اگل نئیں مندا' عاق کر دیندا اے اوہنوں۔ اے اللہ میاں عاق کرن اُتے آئے تے'' (یہاں اگر لڑکا بات نہیں مانتا تو اسے باپ عاق کر دیتا ہے۔ اگر اللہ میاں عاق کرنے پہ آئے تو)۔ **كُلًّا نُّمِدُّ هٰٓؤُلَآءِ وَ هٰٓؤُلَآءِ** (17:20)۔ عزیزانِ من! ''رب بنا سجدا جنوں کیندے ہیگے نیں''۔ آگے رب کا لفظ لایا ہے۔ **وَ مَا كَانَ عَطَآءُ رَبِّكَ مَحْظُوْرًا** (17:20) جو چیزیں تمہارے رب نے ربوبیت کے لیے دی ہوئی ہیں' ان کے راستے میں ہم نے پھاٹک نہیں لگا دیے ہوئے **كُلًّا نُّمِدُّ هٰٓؤُلَآءِ وَ هٰٓؤُلَآءِ** (17:20) آؤ' لو! یہ ہے قانونِ مشیت کہ جو آتا ہے' لے۔ **اُنْظُرْ كَيْفَ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ** (17:21) آؤ! غور کرو اقوامِ عالم کے اوپر کہ رزق کے میدان میں کس طرح ایک قوم دوسری سے آگے بڑھتی چلی جاتی ہے۔ ٹھیک ہے۔ بس یہ ہے یہاں

کا قانونِ مشیت۔ اب اس کے بعد ایک اور قانونِ مشیت بھی ہے کہ اس کے بعد کی زندگی بھی ہے۔ وَ لَلْاٰخِرَۃُ اَکۡبَرُ دَرَجٰتٍ (17:21) دوسری بات آ گئی کہ آخرت کے بھی اسی طرح سے مدارج ہیں' اس میں بھی فضیلتیں ہیں۔ اس کے لیے بھی قانونِ مشیت ہے۔ جو اسے مانتا ہے پھر اس کے مدارج آگے جاتے ہیں۔ جو یہیں تک رہنا چاہتا ہے آگے تو مدارج نہیں ہیں لیکن یہاں کی زندگی میں یہ نہیں کہ ہم نے اس کے سامنے پھاٹک لگا دیا ہے۔ یہ بات نہیں ہے۔ عزیزانِ من! آپ دیکھ رہے ہیں قانونِ مشیت کس طرح سے کارفرما رہتا ہے۔ ریفرنس لکھ لیجیے (17:19-20) اسی کے مطابق ہے۔ اور اصول کے طور پر تو قرآن نے بات صاف کر دی۔ وَ یُؤۡتِ کُلَّ ذِیۡ فَضۡلٍ فَضۡلَہٗ (11:3) جتنی کوئی اپنے اندر صلاحیت پیدا کرتا ہے اس کو اس کی صلاحیت کا بدلا دے دیا جاتا ہے۔ ہر ذِیۡ فَضۡلٍ (11:3) کو اس کا فضل دے دیا جاتا ہے۔ یہاں تو سب سے ذِیۡ فَضۡلٍ (11:3) ہونا ہے۔ یہ نہیں ہے جسے کہا کرتے ہیں کہ ذٰلِکَ فَضۡلُ اللّٰہِ یُؤۡتِیۡہِ مَنۡ یَّشَآءُ (5:54) خدا فضل جس کو جی چاہے دے دیتا ہے۔ وہ کہتا ہے کُلَّ ذِیۡ فَضۡلٍ (11:3) یوں فضل دیا جاتا ہے۔ اس کے بغیر نہیں ملتا۔ چلیے اور آگے چلیے! ابتغائے فضل کی تاکیدیں قرآن کے اندر دیکھیے۔ یَبۡتَغُوۡنَ مِنۡ فَضۡلِ اللّٰہِ (73:20) ابتغائے فضل یہ ہے کہ جب صلوٰۃ ختم ہو جاتی ہے فَانۡتَشِرُوۡا فِی الۡاَرۡضِ (62:10) جاؤ زمین میں چلو پھرو وَ ابۡتَغُوۡا مِنۡ فَضۡلِ اللّٰہِ (62:10) اور معاش کی تلاش کرو۔ یہ خدا کا فضل ہے۔ اگر مَنۡ یَّشَآءُ (5:54) والی بات وہ ہوتی ہے کہ ''جسے چاہتا ہے وہ دے دیتا ہے'' تو پھر تو ٹھیک ہے یہی ہے کہ مسجدوں میں بیٹھے رہو۔ جیسے ہمارے ہاں کا وہ متوکل بیٹھتا ہے اور کہتا ہے کہ ہم توکل علی اللہ پہ مسجد میں بیٹھے ہیں۔

ہمارے ہاں لفظ توکل عَلَی اللّٰہ کا مفہوم اور اس کا استعمال

توکل علی اللہ کیا ہوتا ہے؟ ''اک مسافر آیا جی روٹی بھیج دینا۔ آ توکل علی اللہ'' ان کے نزدیک توکل علی اللہ یہ ہے کہ مسجد میں بیٹھے ہیں اور ایک مسافر آ گیا ہے تو دوسروں سے کہتے ہیں کہ ایک مسافر کی روٹی بھیج دینا۔ وہ کہتا ہے کہ وَ ابۡتَغُوۡا مِنۡ فَضۡلِ اللّٰہِ جاؤ' اٹھو' تلاش کرو۔ یہ اس کی مشیت ہے کہ جو تلاش کرتا ہے' اس کو ملتا ہے۔ اور جو اعراض کرتا ہے مَنۡ اَعۡرَضَ عَنۡ ذِکۡرِیۡ فَاِنَّ لَہٗ مَعِیۡشَۃً ضَنۡکًا (20:124) جو ہمارے قانون سے اعراض برتتا ہے اس کی روٹی' اس کی روزی تنگ ہو جاتی ہے۔ آپ نے دیکھا کہ مَنۡ تَشَآءُ کے کیا کیا معنی چلے آ رہے ہیں۔ اور اصول یہ کہ لَیۡسَ لِلۡاِنۡسَانِ اِلَّا مَا سَعٰی (53:39) انسان کو وہی مل سکتا ہے جس کے لیے وہ کوشش کرتا ہے۔ عزیزانِ من! بات بہت لمبی ہو سکتی تھی میں نے اختصار سے کام لیا۔ اور قرآنِ کریم کی تو ایک سند ہی سامنے آ جائے تو وہ کافی ہوتی ہے۔ قرآن نے تو اپنے مطالب کو وضاحت سے بیان کرنے کے لیے تصریفِ آیات سے کام لیا

ہے کہ بار بار لوٹا کرلاتا ہے ورنہ سند کے لحاظ سے تو ایک آیت بھی کافی ہے۔ عزیزانِ من! اب آپ دیکھیے کہ یہ جو چیز ہے تُؤتِی الْمُلْکَ مَنْ تَشَآءُ وَ تَنْزِعُ الْمُلْکَ مِمَّنْ تَشَآءُ وَ تُعِزُّ مَنْ تَشَآءُ وَ تُذِلُّ مَنْ تَشَآءُ بِیَدِکَ الْخَیْرُ اِنَّکَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ (3:26) اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ ''یہ تیرے ہی مِلک' تیرے ہی اختیار میں ہے کہ جسے تو چاہتا ہے یوں ہی اندھا دھند دے دیتا ہے' جس سے چاہتا ہے چھین لیتا ہے' جسے چاہتا ہے معزز کر دیتا ہے' جسے چاہتا ہے ذلیل کر دیتا ہے''۔ قرآن کی رو سے یہ معنی بالکل غلط ہیں۔

من یشآء اور نشآء کا بڑا واضح تر مفہوم' خدا کا قانونِ مشیت ہی ہے

قرآن میں جہاں یہ من یشآء اور نشآء اور تشآء کے الفاظ آئیں۔ اب ان کے معنی یوں کیجیے کہ ''یہ خدا کے قانونِ مشیت کے مطابق ہوتا ہے''۔ جس کی وضاحت قرآن میں دے دی گئی ہے اور اس نے ہر چیز کے لیے قانونِ مشیت دیا ہے۔ خدا کے متعلق جب آئے گا تو وہ یہ چیز آئے گی۔ اور یہیں یہ جو آیت پہلے ختم کی اور اس کے بعد دیکھیے کیسے وہ بتا رہا ہے کہ سب کچھ قانون کے تابع ہوتا ہے۔ قرآن تو وہیں بات صاف کرتا ہے۔ یہاں عجیب چیز آ گئی۔ یہاں یہ اقتدار' اختیار' عزت' ذلت' یہ ساری چیزیں ہیں جو من تشآء کے مطابق ہیں۔ آگے ایک اور چیز ہے تُوْلِجُ الَّیْلَ فِی النَّهَارِ وَ تُوْلِجُ النَّهَارَ فِی الَّیْلِ وَ تُخْرِجُ الْحَیَّ مِنَ الْمَیِّتِ وَ تُخْرِجُ الْمَیِّتَ مِنَ الْحَیِّ وَ تَرْزُقُ مَنْ تَشَآءُ بِغَیْرِ حِسَابٍ (3:27) رات میں سے دن نکلتا ہے' دن میں سے رات نکلتی ہے' بے جان (INORGANIC MATTER) میں سے زندگی ابھرتی ہے' زندہ چیز مر جاتی ہے۔

خدا کے قانون کی روشن اور عملی مثال طبعی قوانین اور خارجی کائنات کا ایک ایک ذرہ بسیط اور زندہ شہادت کا ترجمان ہے

یہاں پھر مَنْ تَشَآءُ (3:27) لکھا ہوا ہے۔ تو اس کے متعلق تو ہمیں کم از کم یہ پتہ ہے کہ خدا کے یہ PHYSICAL LAWS (طبعی قوانین) ہمارے سامنے ہیں اس کے بغیر تو یہ نہیں ہوتا۔ وہ دن اور رات میں تکویرِ لیل و نہار کیسے ہوتا ہے؟ یہ ایک طبعی قانون ہے جسے آج ہمارے ہاں کا پانچویں جماعت کا بچہ بھی جانتا ہے۔ اگر مَنْ تَشَآءُ (3:27) کے معنی یہ ہوں کہ جب تو چاہتا ہے رات کر دیتا ہے' جب تو چاہتا ہے دن کر دیتا ہے۔ تو یہ تو علم اور مشاہدے کے خلاف جا رہا ہے۔ مَنْ تَشَآءُ (3:27) کیا ہے؟ یہ بھی اس کا قانونِ مشیت ہے کہ اس طرح سے یہ گردشِ لیل و نہار رہے۔ جس سے دن اور رات کا اختلاف و تکویر اسی

طرح سے قائم ہے۔آ گے کہا کہ وَتَرْزُقُ مَنْ تَشَآءُ (3:27) یہی مَنْ تَشَآءُ (3:27) جو تم ان میں دیکھ رہے ہو' وہی تمہارے آلِ عمران 478
ہاں کی عزت اور ذلت اور رزق کے معاملے میں ہے۔قرآن ABSTRACT TRUTH (بسیط حقیقت) کو بیان کرتا ہوا درمیان میں فطرت کا محسوس قانون لے آیا ہے۔اوراس کے لیے بھی یہی تَشَآءُ تَشَآءُ (3:27) کالفظ ہے۔اوراگر یہ وہاں یہ معنی ہیں کہ یہ تیرے خاص مقرر کردہ قانونِ مشیت کے مطابق ہوتا ہے تو یہاں بھی تو یہی معنی کیجیے۔مَنْ تَشَآءُ (3:27) خدا کی طرف سے جب آئے تو تیرے قانونِ مشیت کے مطابق' اس کے قانونِ مشیت کے مطابق ہو۔جب انسان ترجمہ کرنا ہو تو مَنْ یَشَآءُ (2:212) جو چاہے لے۔تو ''چاہے'' کے معنی یہ نہیں ہیں کہ دل میں چاہا اور ملا۔اس کے معنی ہیں کہ جو اس کے قانونِ مشیت کے مطابق کوشش کرے۔سیدھی سی بات ہے اسے یہ کچھ ملے گا۔وہ اپنے قانونِ مشیت کے مطابق دیتا ہے۔جو لینا چاہتا ہے وہ اس کے قانونِ مشیت کے مطابق کوشش کرے تو وہاں سعی مشکور ہے بشرطیکہ کوشش اس کے قانون کے مطابق ہو۔

خدا تعالیٰ کے قانون کو نظر انداز کرنے کا نتیجہ اور اعمال کے رائیگاں ہو جانے کے سلسلہ میں تاریخی شہادت

ورنہ قانونِ مشیت کے بغیر کی گئی کوششوں کے بارے قرآن یہ کہتا ہے کہ اُولٰٓئِکَ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ (3:22) ان کے اعمال رائیگاں گئے' نتیجہ نہیں پیدا کیا۔بڑی محنت سے ہل جوتا' فرٹیلائزر بھی ڈالا' سب کچھ کیا۔بیج ناقص ڈال دیا تو کھیتی نہیں اگے گی۔کیا ہوا؟ یہ شخص مَنْ تَشَآءُ (3:27) کے خلاف چلا گیا۔اس لیے جب آپ کہیں گے کہ مَنْ یَشَآءُ ''جو لینا چاہتا ہے'' تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ جو اس کے قانونِ مشیت کے مطابق پہلے لینے کا ارادہ کرتا ہے پھر اس کے مطابق کوشش کرتا ہے۔میں نے کہا تھا کہ میں عرض کروں کہ یہ مَنْ تَشَآءُ (3:27) کتنی عظیم چیز ہے۔عزیزانِ من! قرآن سے پہلے' مذاہب کی دنیا تھی' دین تو کہیں نہیں رہا تھا۔مذاہب کی دنیا میں خدا' مذہب' سارا کچھ' قومی یا نسلی بن کر رہ گیا تھا۔قرآن اس کی شہادت دیتا ہے۔وہ کہتے تھے کہ جو بنی اسرائیل کی نسل میں پیدا ہوا' اسی کے لیے عزت اور مملکت ہے۔یہاں کی جنت بھی اور آخرت کی بھی۔یعنی نسل کے اندر' قوم کے اندر یہ آ گیا۔یعنی ہر نبی آیا تو انسانیت کے لیے تھا اور آج ان کے بگڑے ہوئے مذہب کی تعلیم (انجیل) بھی یہ کہتی ہے کہ ''میں بنی اسرائیل کی کھوئی ہوئی بھیڑوں کی طرف آیا ہوں''۔انہوں نے انسانیت کو نسل پرستی کے دائروں میں تقسیم کر دیا۔ہندوستان میں تو کیفیت پوچھو ہی نہیں کہ جو چیز برہمن کو مل سکتی ہے وہ کھشتری کو نہیں مل سکتی' جو کھشتری کو ملتی ہے وہ

ویش کے حصے میں نہیں آ سکتی' جو ان تینوں کو ملتی ہے شودر ان سب سے محروم ہے۔ اور وید میں یہ لکھا ہوا ہے کہ بھارت کی چار دیواری کے باہر انسان بستا ہی نہیں۔ ''آ انسان وسن ڈئے نیں او تھے''۔ ان کا مذہب یہ تھا کہ اول تو اس ملک سے باہر انسان ہے ہی نہیں اور جو اس ملک میں ہیں ان کی بھی یہ کیفیت کہ ورنوں کی تقسیم میں جو چیز برہمن کو مل سکتی ہے' شودر اس سڑک پر سے نہیں چل سکتا۔ آج بھی انڈیا میں یہ کیفیت ہے کہ جس سڑک پہ برہمن چل سکتا ہے' وہاں شودر نہیں چل سکتا۔

قرآنی تعلیم کے برعکس عملِ انسانی کے کرشمے

عزیزانِ من! مَنْ تَشَآءُ (3:27) تو تمام انسانوں کے لیے تھا کہ جو کچھ کوئی لینا چاہے اس کو مل سکتا ہے۔ قرآن نے ان BARRIORS کو اٹھا کر کہا کہ یہ سب چیزیں مَنْ تَشَآءُ (3:27) جو لینا چاہتا ہے لے لے۔ بڑی چیز تھی۔ یہاں نہ نسل پرستی ہے' نہ قومیت پرستی ہے' نہ گروہ بندیاں ہیں' نہ فرقہ بندیاں ہیں' نہ کسی بھارت کی چار دیواری میں ہونے کی بات ہے' نہ کسی خاص ورن کی چیز ہے' نہ یہودی ہونے کی' نہ بنی اسرائیل ہونے کی' نہ نصرانی ہونے کی۔ انہوں نے کہا کہ جنت صرف اس کو مل سکتی ہے جو یہودی ہے۔ قرآن نے کہا کہ مَنْ یَشَآءُ (3:27) جو لینا چاہتا ہے لے لے۔ برہمن نے کہا رزق کی فراوانیاں صرف ہمیں ملیں گی شودر کو بھیک ملے گی۔ قرآن نے کہا ہے کہ تم بکتے ہو۔ وَاللّٰہُ یَرْزُقُ مَنْ یَّشَآءُ بِغَیْرِ حِسَابٍ (2:212) جو لینا چاہتا ہے لے۔ انسانیت کو مخاطب کرنے والا دین' عالم گیر انسانیت کی برادری بنانے والا دین' صرف قرآن میں ہے۔ اس دین میں مَنْ تَشَآءُ (3:27) کے یہ مذکورہ معنی ہیں۔ عزیزانِ من! کتنی بڑی چیز ہے جو قرآن اس مَنْ تَشَآءُ (3:27) کے اندر کہہ گیا ہے۔ لہٰذا جہاں قرآنِ کریم کے اندر یہ چیزیں آئیں وہاں اس کا یہ مخصوص معنی ہوگا کہ ''خدا کے قانونِ مشیت کے مطابق''۔ جو آپ کی کائناتی باہر کی دنیا فزیکل ورلڈ ہے اس میں خدا کا قانونِ مشیت سائنس دانوں سے پوچھیے۔ قرآن نے اس کے صرف اشارے دیے ہیں۔ یہ فزکس کیمسٹری کی کتاب نہیں۔ دیکھیے! جیسے تُوْلِجُ الَّیْلَ فِی النَّھَارِ (3:27) کا ایک اشارہ ہے۔ اگرچہ یہ اکانومی کی کتاب نہیں ہے لیکن مَنْ تَشَآءُ (3:27) یا مشیت کے مفہوم کو واضح کرنے کے لیے جہاں پہلی آیت میں عزت اور ذلت اور اختیارات کی بات تھی۔ اس کی وضاحت کے لیے کہا کہ قانونِ مشیت ہے۔ یہاں فطرت کے قانون کی بات کر دی۔

انسانی زندگی کی ابتدا کے متعلق قرآنِ حکیم کے انکشافات عقلِ انسانی کو جلا بخشتے ہیں

میں کہہ یہ رہا تھا کہ اس کے قانونِ مشیت کے مطابق طبعی زندگی کے اندر جو قانونِ مشیت ہے اس کا ان سے پوچھیے کہ جنہوں نے تسخیرِ کائنات کیا۔ اور اس سے آگے جہاں انسانی زندگی شروع ہوتی ہے' وہاں اس کا قانونِ مشیت وحی کی زبان سے پوچھیے' قرآن سے پوچھیے۔ اور جہاں بھی خدا کی طرف آئے تو اس کا ترجمہ یہ کیجیے کہ خدا تو یہ تمام چیزیں اپنے قانونِ مشیت کے مطابق دیتا ہے۔ جسے تو نے اس طرح سے آدم کے ذہن میں رکھ دیا کہ وہ فطرت کے قوانین کو اس طرح سے حاصل کرے۔ اور وحی کے ذریعے سے تو نے بتا دیا کہ ہم اپنی ذات سے متعلق کس طرح ان چیزوں کو حاصل کریں۔ یہ سب کچھ تیرے قانونِ مشیت کے مطابق ہوتا ہے۔ تو دیتا بھی اسی طرح سے ہے۔ جسے لینا ہے وہ اس طرح سے لے۔ اور لینے والے کے راستے میں کہیں پھاٹک نہیں لگا دیا۔ وہ جو قرآن نے کہا ہے کہ وَمَا کَانَ عَطَآءُ رَبِّکَ مَحۡظُوۡرًا (17:20) اس نے کسی کے راستے میں پھاٹک نہیں لگایا۔ وہ تمام خصوصیتیں جو برہمن کو حاصل ہیں' وہ اگر شودر لینا چاہے تو مَنۡ یَشَآءُ (2:212) وہ لے سکتا ہے۔ اگر برہمن ان قوانین کی پابندی نہیں کرتا تو شودر کے درجے پہ پہنچ جائے گا کیونکہ اس نے قانون کی خلاف ورزی کی ہے۔

قدرت نے کائنات کے ذرے ذرے کو قانون کی زنجیروں میں جکڑا ہی اسی لیے ہے کہ انسانیت اپنے معراج تک پہنچنے میں کوئی دشواری محسوس ہی نہ کرے

جنت نہ یہودیت کے لیے' نہ نصرانیت کے لیے' نہ کسی خاص فرقے کے لیے' نہ کسی پیشوائیت کے لیے بلکہ من یشآء جو لینا چاہے آگے آ کر لے۔ لیکن جتنا کام کوئی کرے گا' قسمتِ بادہ باندازۂ جام است ایں جا۔ جتنا جتنا پیالہ لاؤ گے' اتنا اتنا ہم اس کو بھر دیں گے۔ عزیزانِ من! یہ ان آیاتِ جلیلہ کا مقصد ہے۔ خدا کرے کہ میں ان کی وضاحت اس طرح سے کر سکا ہوں جیسا کہ میں نے سمجھا ہے اور جیسے قرآن بتانا چاہتا ہے۔ کوئی اور بات ذہن میں اس کے بعد اگر آئے تو تشریف لائیے گا۔ میں یہیں ہوتا ہوں۔ قرآن کی بے شمار آیات اور اس کے حوالے ان چیزوں کے متعلق یہاں میرے ہاں تبویبِ قرآن کے اندر موجود ہیں۔ لیکن ان کا خلاصہ' ملخص اور ست یہی ہے جو میں نے آپ کے سامنے پیش کیا۔

سورۃ آلِ عمران کی آیت 26 اور 27 آیت آج ہم نے لے لی اس کے بعد آئندہ لیں گے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلۡ مِنَّا ؕ اِنَّکَ اَنۡتَ السَّمِیۡعُ الۡعَلِیۡمُ (2:127)

❀...❀...❀

چھٹا باب: سورۃ آل عمران (آیات 27 تا 28)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عزیزانِ من! آج اکتوبر 1969ء کی 26 تاریخ ہے اور سلسلۂ درسِ قرآنِ کریم کا آغاز سورۂ آلِ عمران کی آیت 28 سے ہوتا ہے: (3:28)۔

انسانوں کی ابتدائی زندگی میں باہمی روابط میں اتحاد وتفریق کی کیفیت

اس آیت میں ایک بڑی اصولی بات آ رہی ہے۔ سابقہ آیت میں قرآنِ کریم نے یہ بتایا تھا کہ اقتدار و مملکت کا ملنا اور چھننا' غلبہ اور قوت' عزت اور تکریم کا ملنا' اور چلے جانا' یہ خدا کے مقرر کیے ہوئے قوانین کی رو سے ہوتا ہے۔ تمہارے اپنے خود ساختہ اصولوں کے اعتبار سے نہیں ہوتا۔ اس قانون کی رو سے اب دو جماعتیں دنیا میں آ گئیں۔ سب سے پہلے تو یہ دیکھیے کہ انسانوں کی ابتدائی آبادی ایک ہی گروہ کی تھی۔ ایک مقام کے اوپر یہ اکٹھے مل کے رہتے تھے۔ پھر ان میں اختلافات ہوئے تو یہ گروہوں میں بٹ گئے۔ ان گروہوں کی تفریق کا معیار قبیلے کی زندگی تھی۔ نسل کی بنیادوں کے اوپر وہ دو قبیلے بنتے تھے۔ تو پہلی تفریق انسانوں میں نسل کے اعتبار سے ہوئی۔ پھر آگے بڑھتے ہوئے زبانیں مختلف ہوئیں۔ زبانوں کے اعتبار سے بھی ان کے ہاں گروہ بندی ہوئی۔ پھر آگے بڑھے تو وطنوں کے اعتبار سے گروہ بندی ہوئی۔ کسی خاص ملک میں رہنے والے ایک قوم کے افراد کہلائے دوسرے ملک میں رہنے والے دوسری قوم کے افراد۔ اور انسانی تہذیب کی انتہا اسی مقام پر پہنچی ہے کہ مختلف ملکوں میں رہنے والے مختلف قومیں بنتی ہیں۔ اور پھر ایک قوم دوسری قوم سے برسرِ پیکار رہتی ہے۔ آج یہ سارا سلسلہ جو اتنی اتنی عظیم لڑائیوں کا ہے'

باہم سر پھٹول کا ہے' ایک کشمکشِ پیہم ہے' وہ اسی تفریق کی بنا پر ہے۔ اس وقت تو وہ نسلی تفریق بھی ذرا پیچھے جا پڑی ہے۔ 478 آل عمران جغرافیائی حدود کی بنیادوں کے اوپر مختلف خطوں میں رہنے والے انسان آپس میں درندوں سے بھی زیادہ بربریت کا ثبوت دے رہے ہیں۔

قرآنِ حکیم کے نزدیک تفریق کا معیار خالصتاً مستقل اقدارِ خداوندی کو قرار دیا گیا ہے

قرآنِ کریم نے تفریق کا معیار کچھ اور قرار دیا۔ یعنی وہ معیار کہ جسے آپ کہیے کہ شریفوں کی ایک قوم اور مجرموں کی دوسری قوم۔ اس نے کہا کہ جو لوگ دنیا میں مستقل اقدارِ خداوندی کے صائب ہوں' ان کو مانتے ہوں۔ وہ ایک گروہ ہے' اسے ایمان کہا جاتا ہے۔ اور جو ان سے انکار کرتے ہوں' وہ دوسرے گروہ کے افراد ہیں۔ آج کی اصطلاح میں اسے آپ آئیڈیالوجی کہتے ہیں۔ اسے ایمان کہا جاتا ہے' اسے دین کہا جاتا ہے۔ قرآن نے دین کی بنیادوں پر یا ایمان کی بنیادوں پر انسان کی تفریق کی۔ ایک دین کے ماننے والے دنیا کے کسی خطے میں وہ بسنے والے ہوں' وہ ایک گروہ کے افراد ہونگے۔ اور اس سے انکار کرنے والے دوسرے گروہ کے افراد۔ ہمارے ہاں تو جب کافر کا لفظ بولا جاتا ہے تو یہ کچھ گالی سی بن گیا ہے۔ اس میں گالی کی کوئی بات نہیں ہے۔ یہ ایک سوسائٹی ہے۔ جو اس سوسائٹی کی ممبر شپ قبول کرتا ہے اسے مومن کہا جاتا ہے۔ وہ جو اس سوسائٹی کا ممبر نہیں بنتا اسے نان ممبر کہا جاتا ہے۔ اسی نان ممبر کا ترجمہ ''کافر'' ہے یعنی اس سوسائٹی کے قوانین کو نہ ماننے والا۔ ایک ماننے والا ہے وہ مومن ہے ایک نہ ماننے والا ہے وہ کافر ہے۔ تو ممبرز اور نان ممبرز تو کوئی گالی نہیں ہوتی۔ صرف یہ ہے کہ نان ممبرز اس سوسائٹی کے اندر داخل نہیں ہیں۔ یہ تفریق قرآنِ کریم نے پہلے دن سے کی۔ حضرتِ نوحؑ کا واقعہ پہلے پیغمبر کی حیثیت سے ہمارے سامنے آتا ہے۔ اس میں یہ بات کہہ دی کہ جب انہوں نے یہ کہا کہ یہ میرا بیٹا تو میرے اہل میں سے تھا تو انہیںؑ کہہ دیا کہ نہیں! اس کے اعمال صالح نہیں تھے اس واسطے یہ تیرے اہل میں سے نہیں ہے۔ اتنے قریبی رشتے کے باوجود بیوی بھی اہل میں سے قرار نہ پائی۔ بیٹے کے ساتھ BIOLOGICAL رشتہ ہے' بیوی کے ساتھ ایک عقدی رشتہ ہے۔ ان دونوں کے متعلق کہا کہ یہ تیرے اہل میں سے نہیں ہیں۔ حضرتِ لوطؑ کی بیوی بھی اہل میں سے قرار نہ پائی' حضرتِ ابراہیمؑ کا باپ بھی اپنوں میں سے قرار نہ پایا۔ آپ دیکھتے ہیں کہ اتنے قریبی گہرے حیاتیاتی عقدی رشتے ہونے کے باوجود قرآنِ کریم نے اپنوں اور بیگانوں کا جو معیار قرار دیا وہ صرف ایمان قرار دیا۔ جو اس رشتے میں منسلک نہیں ہے' وہ دنیا کے باقی معیاروں کے اعتبار سے قریب تریں ہونے کے باوجود اپنوں میں سے نہیں ہے۔ اور اس کی تکمیل تو حضورِ خاتم النبیین ﷺ کے عہدِ مبارک میں ہوئی کہ دنیاوی معیار سے یہ سارے قریش اور

حضور ﷺ کے یہ سارے افرادِ خاندان تک ایک گروہ کے لوگ تھے۔لیکن انہیں میں سے آپ دیکھیے کہ چھٹ چھٹ کر ایک گروہ ایک طرف ہوجاتا ہے۔دوسرا گروہ دوسری طرف ہوجاتا ہے اوراس طرح سے دوقومیں وجود میں آتی ہیں۔

قرآنِ حکیم کے نزدیک نوعِ انسانی صرف دوگروہوں میں تقسیم ہے

یہ جودوقوموں کا نظریہ ہے یہ قرآنِ کریم کا دیا ہوا ہے۔جیسا کہ ابھی میں نے عرض کیا ہے کہ بڑی اصولی چیز ہمارے سامنے یہ آرہی ہے۔اور یہ اس دورِ حاضرہ کی سیاست میں تو بڑی بنیادی چیز ہے جو قرآن دے رہا ہے۔هُوَ الَّذِیْ خَلَقَكُمْ (64:2) اللہ وہ ہے کہ جس نے تمہیں پیدا کیا فَمِنْكُمْ كَافِرٌ وَّمِنْكُمْ مُّؤْمِنٌ (64:2) اس نے دو ہی گروہ بنا دیے یعنی خدا نے جو پیدا کیا ان میں سے ایک گروہ کو مومن کہا جاتا ہے' دوسرے گروہ کو کافر کہا جاتا ہے ۔ دو ہی گروہ ہیں ۔تو گویا یہ تفریق اور تقسیم IDEOLOGICAL ہے' نظری ہے' ایمان کی بنیادوں پر ہے۔اور پوری انسانیت میں دو ہی گروہ ہیں جن کا قرآن نے ذکر کیا ہے۔هُوَ الَّذِیْ خَلَقَكُمْ (64:2) پوری انسانیت دوگروہوں کے اندر تقسیم ہوجاتی ہے۔ یہ ہے جسے دوقومی نظریہ کہا جاتا ہے۔تو آج کی سیاست میں تو ہمارے ہاں یہ بات صرف ہندوستان میں ہمارے سامنے ابھر کر آئی تھی ۔ بات تو ہندوستان کی سیاست کی نہیں تھی بات تو حضرتِ نوحؑ کے زمانے سے چلی تھی ۔اور انبیائے کرامؑ کی وساطت سے دین جہاں بھی آتا' وہ دو ہی نظریے پیش کرتے رہے۔فَمِنْكُمْ كَافِرٌ وَّمِنْكُمْ مُّؤْمِنٌ (64:2) ۔اور جیسا میں نے عرض کیا ہے بڑی صاف بات ہے یعنی ایک وہ گروہ جو اس سوسائٹی کے قوانین کو مان کر اس کا ممبر بنتا ہے۔دوسرے وہ لوگ جو اسے نہیں مانتے' وہ اس سوسائٹی کے حلقے میں داخل نہیں ہوتے' نہیں مانتے۔

دوقومی نظریہ کے پیشِ نظر 1905-06 ء میں علامہ اقبالؒ کا فرمان اور تحریکِ پاکستان کی بنیادی خصوصیت

پہلی چیز نہ ماننا ہے دوسری چیز ان نہ ماننے والوں کا مخالف ہونا ہے۔کفر مخالفت کے معنی میں بھی آتا ہے۔پھر اگلی چیز یہ ہے کہ وہ ان اقدار کو دبانا چاہتے تھے' چھپانا چاہتے تھے' کہ یہ ابھر کر سامنے نہ آئیں۔کفر کے معنی چھپانے کے بھی ہوتے ہیں دبانے کے بھی ہوتے ہیں۔تو یہ اس دوسرے گروہ کی خصوصیات سامنے آئیں۔اور پھر کیونکہ یہ اقدار جن کی بنا پر یہ مومن ایک الگ قوم متشکل ہوتے تھے یہ افراد کی' قبائل کی' گروہوں کی' اقوام کی تمام ذاتی مفاد پرستیوں پر ایک زد ڈالتی تھیں' انہیں ختم کردیتی

تھیں ۔ یہ اقدار صرف انسانیت کے مفاد کو سامنے رکھتی تھیں ۔ اس لیے جو لوگ ان اقدار کو نہیں مانتے تھے ان کی مفاد پرستیوں کا یہ تقاضا تھا کہ وہ ان کی مخالفت کریں ۔ اس لیے ان دونوں گروہوں میں مخالفت بھی ازلی ہے

ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا امروز
شرارِ بو لہبی سے چراغِ مصطفویؐ

ازل سے تا امروز' پہلے دن سے آج تک کی یہ بات ہے یہ کوئی نئی چیز' دورِ حاضرہ کی سیاست نہیں ہے ۔ یہ جو اقبالؒ نے 06-1905ء میں کہا تھا کہ 'بنا ہمارے حصارِ ملت میں اتحادِ وطن نہیں ہے' تو وہ کسی مقامی سیاست کا کافر نہیں تھا بلکہ وہ اس ازلی حقیقت کو بیان کر رہا تھا ۔ یہاں تو باپ بیٹا ایک قوم کے فرد نہیں بن رہے' ایک ملک کے اندر بسنا وجہِ اشتراک شے کیا ہے؟ بیوی اور خاوند ایک قوم کے افراد نہیں بن رہے ۔ اتنے قریبی رشتے بھی ایک قوم کے افراد نہیں بنا سکتے ۔ چہ جائیکہ محض ایک ملک کے اندر بس لینے سے کافر اور مومن دونوں مل کر ایک قوم کے فرد بن گئے ۔ یہ تھی وہ چیز جو اقبالؒ نے بھی کہی جس بنا پر پھر یہ آگے بات بڑھی ۔ وہ ہمارے ہاں کی ایک مقامی سیاست تھی ۔ یہ ازلی اصول ہے جس کی بنیاد پہ وہ سیاست ہمارے رکھی گئی تھی ۔ اور اسی لیے تحریک پاکستان کی وہ بنیاد جس کے اوپر اس تحریک کی عمارت استوار ہوئی ہے' وہ عین دین کے مطابق اور قرآن کے تقاضوں کو پورا کرنے والی تھی ۔ اب ان دو گروہوں کے اندر پہلے دن سے لڑائی ہے ۔ اب ظاہر ہے کہ یہ دو گروہ کبھی بھی ایک نہیں ہو سکتے ۔ ان کے نظریات متضاد ہیں' متخاصم ہیں ۔ ان کے معتقدات میں قدم قدم کے اوپر ٹکراؤ ہوتا ہے ۔ پھر یہ جماعت مؤمنین اپنے ان اصولوں کے ماتحت ایک مملکت کی تشکیل کرتی ہے' ایک حکومت کی بنیاد بنتی ہے' ایک نئی تمدن اور تہذیب کی عمارت استوار کرتی ہے ۔ اب اس مملکت' اس حکومت میں وہ لوگ جو اس آئیڈیالوجی میں BELIEVE نہیں کرتے' اس نظریہ زندگی کی صداقت پر یقین نہیں رکھتے وہ اس نظام کے افراد کس طرح سے ہو سکتے ہیں ۔

مومن کی آئیڈیالوجی تو عالم گیر سطح پر صرف انسانیت کا تصور اپنے دامن میں لیے ہوتی ہے

بات بالکل صاف ہے کہ جو شخص بھی کسی سوسائٹی کے قوانین کو نہیں مانتا وہ اس سوسائٹی کا ممبر نہیں ہو سکتا ۔ اس میں ضد کی کونسی بات ہے' مخالفت کی کونسی بات ہے' تنگ نظری کی کونسی بات ہے ۔ لہٰذا ان میں باہمی ٹکراؤ اور مخاصمت بھی اسی طرح سے ازلی ہے ۔ اور وہ بنیاد یہ ہے کہ مومن عالمگیر انسانیت کے مفاد کو اپنے سامنے رکھتا ہے جبکہ اس آئیڈیالوجی سے انکار کرنے والا گروہ مندانہ مفاد پرستیوں کو اپنے سامنے رکھتا ہے ۔ اور ان دونوں میں ٹکراؤ ہے ۔

انسانیت کے لحاظ سے قرآنی آئیڈیالوجی کے مخالفین کے ساتھ حسنِ سلوک کا تعلیمی معیار

اس ٹکراؤ کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ جماعتِ مومنین ان لوگوں کو جو اپنوں میں سے نہیں ہیں' انہیں اپنا قرار نہ دے دیں۔ان کے ساتھ مؤدت کے' محبت کے' ولایت کے تعلقات' جسے آپ دوستانہ تعلقات کہتے ہیں' قائم نہیں کر سکتے۔ میں آگے چل کر بتاؤں گا کہ انسانیت کے اعتبار سے جو حقوق ہیں یعنی انسان ہونے کے اعتبار سے حسنِ سلوک ہے وہ تو ہر ایک سے کیا جائے گا۔ بد ترین دشمن سے بھی کیا جائے گا۔ میں اس ضمن میں قرآن کی آیات سامنے لاؤں گا۔ یہاں سوال باہمی یگانگت کے دوستانہ تعلقات کا ہے کہ یہ قائم نہیں کیے جاسکتے۔اس لیے کہ آپ کی مملکت کے اپنے اصول ہیں' آپ کی مملکت کے اپنے RULES ہوں گے ۔جو شخص قلبی طور پر ان کا مخالف ہے' وہ آپ کے اپنوں میں سے کیسے ہوسکتا ہے۔اس بنیاد کی رو سے قرآنِ کریم نے یہ کہا کہ لَا یَتَّخِذِ الْمُؤْمِنُوْنَ الْکٰفِرِیْنَ اَوْلِیَآءَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِیْنَ ((3:28 مومنوں کو قطعاً یہ نہیں چاہیے کہ وہ اپنوں کے سوا ان کفار کے ساتھ دوستی کے تعلقات قائم رکھیں۔اور یہ اتنا سنگین جرم ہے کہ اس کے متعلق کہا کہ وَ مَنْ یَّفْعَلْ ذٰلِکَ فَلَیْسَ مِنَ اللّٰہِ فِیْ شَیْءٍ ((3:28 جو ایسا کرے گا اسے خدا کے ساتھ کوئی تعلق نہیں رہے گا۔

فرقہ بندی پیدا کرنے والوں کے متعلق قرآنِ حکیم کی وارننگ

یہ بہت بڑی چیز ہے کہ مومنین کے اندر' مسلمانوں کے اندر' فرقہ پرستی کے متعلق خدا نے قرآنِ کریم میں رسول اللہ ﷺ سے یہ کہا کہ جو لوگ دین کے اندر فرقہ بنالیں تمہارا ان کے ساتھ کوئی تعلق نہیں۔اسی طرح سے یہ کہا کہ جماعتِ مؤمنین والے اگر غیرِ مؤمنین سے دوستانہ تعلقات قائم کرلیں تو ان کا خدا کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہے۔اگر مومنین کے اندر فرقہ بندی پیدا ہوجاتی ہے تو رسول کا ان سے کوئی تعلق نہیں ہے' اس سے فارغ ہو گئے۔امت کی ایک وحدت ہے اور اس وحدت کو انہوں نے پھیلاتے چلے جانا ہے تا آنکہ پوری انسانیت ایک عالم گیر وحدت بن جائے۔وہ عالم گیر وحدتِ انسانیت ان مستقل اقدار کو حقیقت تسلیم کرنے کی بنیادوں پر بنے گی۔اور اگر یہ صورت نہیں ہے تو تنہا ایک مومن بھی اپنی ذات کے اندر ایک قوم ہے ۔جیسا کہا تھا کہ ابراہیمؑ فرد تھا لیکن کہا کہ وہ اپنی ذات کے اندر امۃً قَانِتًا (16:120) تھا۔کوئی ایک بھی ساتھ شریک نہیں ہوتا تو نہ ہوا کرے۔ باپ کو چھوڑتا ہے' قوم کو چھوڑتا ہے۔ نہ وطنیت اس کے راستے میں حائل ہوتی ہے نہ باپ کا

BIOLOGICAL (حیاتیاتی) رشتہ اس کے راستے میں حائل ہوتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اِنِّیۡ ذَاهِبٌ اِلٰی رَبِّیۡ (37:99) میں آلِ عمران 478 جا رہا ہوں اپنے رب کی طرف۔ یہ بات آگے چل کر آئے گی۔

غیر مسلموں کے ساتھ باہمی تعلقات کے سلسلہ میں قرآنی حدود کا تعین اور ہماری اپنی حالتِ زار

قرآن نے کہہ دیا کہ جو مومن' غیرِ مومن سے دوست داری کے تعلقات قائم کرے گا' خدا کے ساتھ اس کا کوئی تعلق باقی نہیں رہے گا۔ اب قرآن کے اس بنیادی اصول کی تفصیل ہمارے سامنے آتی ہے۔ میں سمجھتا ہوں آج کے درس میں پوری ہو جائے تو بڑی غنیمت ہے۔ یٰۤاَیُّهَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا لَا تَتَّخِذُوۡا بِطَانَةً مِّنۡ دُوۡنِكُمۡ (3:118) یہاں لفظ بِطَانَةً نے بات واضح کر دی کہ وہ تعلقات کس قسم کے ہیں جو وہ کہہ رہے ہیں یعنی راز داری کے تعلقات۔ بطن کسی چیز کا اندر کا حصہ کہلاتا ہے۔ انسانیت کے تعلقات ان کے ساتھ رہیں گے' حسنِ سلوک رہے گا' رواداری رہے گی' انصاف رہے گا۔ یہ تو میں آگے چل کر عرض کروں گا۔ بِطَانَةً کے تعلقات قائم نہیں ہو سکتے۔ جسے مونس کہتے ہیں' جسے ایک ہو جانا کہتے ہیں' وہ تعلقات کسی غیر مسلم سے قائم نہیں کیے جا سکتے۔ کہا کہ آؤ تمہیں بتائیں ان کی کیا خصوصیات ہیں اور یہ کیوں نہیں ہو سکتا؟ لَا یَاۡلُوۡنَكُمۡ خَبَالًا (3:118) یہ تمہیں نقصان پہنچانے میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھیں گے۔ اور یہ بات حقیقت ہے۔ اپنے میں تو ہم یہ معلوم نہیں کر سکتے کیونکہ جسے قرآن کی اقدار پر یقین یا ایمان کہتے ہیں' یہ تو ہم میں ہے ہی نہیں۔ اس لیے اس کی اہمیت ہمارے سامنے کیا ہو' ہم تو خود ایک مفاد پرست گروہ بن چکے ہوئے ہیں۔ ہم تو وطن کی بنیادوں کے اوپر بھی ایک قوم نہیں بن سکے چہ جائیکہ دین کی بنیادوں کے اوپر ایک قوم بن جاتے۔ ہم افراد ہیں یہاں جو جیتے ہیں' یہاں ہر فرد اپنا اپنا مفاد سوچتا ہے۔ ہمیں تو قومی وحدت کا بھی خیال نہیں آتا' قومی مفاد کا بھی خیال نہیں آتا چہ جائیکہ دین کی وحدت کے اوپر ہماری ایک بنیاد بنے۔ اس لیے ہم اس کا احساس ہی نہیں کر سکتے۔ لیکن آپ کے مخالفین اس میں کبھی نہیں چوکتے۔ آج بھی نہیں چوکتے جیسے اس زمانے میں نہیں چوکتے تھے جس زمانے میں قرآن نے کہا تھا کہ لَا یَاۡلُوۡنَكُمۡ خَبَالًا (3:118) وہ تمہاری تباہی میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کریں گے۔ وَدُّوۡا مَا عَنِتُّمۡ (3:118) تمہیں کوئی مصیبت پہنچتی ہے تو ان کے گھر چراغاں ہو جاتا ہے' اگر تم پہ کوئی مصیبت آ جاتی ہے تو ان کے ہاں خوشیوں کے شادیانے بجتے ہیں۔ بات ٹھیک ہے۔

تقسیم سے پہلے ہندو ذہنیت کی کہانی علامہ پرویزؒ کی زبانی

مفاد پرست گروہ کا سب سے بڑا دشمن خدا کا دین ہے۔ اگر کہیں اس دین کے علم برداروں کو شکست ہوتی ہے تو مفاد پرست گروہ کے گھر میں گھی کے چراغ جلتے ہیں۔ قَدْبَدَتِ الْبَغْضَآءُ مِنْ اَفْوَاهِهِمْ (3:118) کہا ان کی کیفیت پھر یہ ہے کہ یوں ہی جوشِ جذبات میں کبھی کبھی ان کے منہ پہ کچھ باتیں ایسی آ جاتی ہیں جس سے پتہ چلتا ہے کہ وہ واقعی تمہارے دشمن ہیں۔ وَ مَاتُخْفِیْ صُدُوْرُهُمْ اَكْبَرُ (3:118) لیکن ان کے دل میں تمہارے خلاف جو انتقام کی آگ بھڑک رہی ہے وہ اس سے کہیں زیادہ ہوتی ہے۔ وہ بڑی احتیاط برتتے ہیں کہ یہ بات ظاہر نہ ہونے پائے۔ آپ کو ہندوستان کی سیاست کا معلوم نہیں ہے۔ میں تو اس سیاست کے اندر تھا۔ جس زمانے میں انہوں نے ہندو مسلم اتحاد کے لیے پہلی کوشش یہ کی تھی کہ مسلمانوں کو اس فریب کے اندر رکھا جائے کہ اس ملک میں بسنے والے سب ایک قوم کے افراد ہیں۔ یہ باتیں میرے سامنے کی بیتی ہوئی ہیں۔ وہ ہندو جن کی کیفیت یہ تھی کہ بازار میں اِدھر اور اُدھر نالی ہوتی تھی۔ بعض اوقات دو نالیوں کو ملانے والی ایک نالی ہوتی تھی اس پہ لکڑی کے تختے رکھے جاتے تھے۔ میرے اپنے بازار کی یہ بات ہے کہ ہندو آ تا تھا اس کے ہاتھ میں روٹی کا تھال ہوتا تھا۔ وہ چلا آ رہا ہے اس تختے کے اوپر ہم کھڑے ہیں۔ ہمارا گھرانہ اس محلے میں کچھ صاحبِ عزت سا گنا جاتا تھا' چوہدری جی کہہ کر سلام کرتے تھے۔ وہ ہندو وہاں تختے کے پاس آ کر کھڑا ہے۔ اس نے اس کنارے کے اوپر کھڑے ہوئے کہا کہ ذرا ہٹ جایئے گا' میں نے گزرنا ہے۔ ''او! ایناں وڈا بازار پیا ہو یا ہیگا اے' لنگ جا۔ کہ نہیں جی تسی اے تختے تے کھلوتے ہو'' (او! اتنا بڑا بازار ہے تو گزر جا۔ کہ نہیں جی! آپ تختے کے اوپر کھڑے ہیں)۔ اس کنارے کے تختے کے اوپر ایک مسلمان اگر کھڑا ہے تو اس تختے کے اوپر وہ چھلانگ کر نہیں جاتا تھا کہ روٹی بھرشٹ ہو جائے گی۔ اس کی یہ کیفیت تھی۔ اور جب ان کی مکارانہ سیاست کا تقاضا ہوا تو اسی شہر میں انہی بازاروں کے اندر رام مانی کا تہوار تھا۔ یہ اس لیے یاد ہے کہ میں خود اس سیاست کے اندر تھا۔ رام مانی کے تہوار میں ایک ہی بیل گاڑی کے اوپر وہ بڑے بڑے مٹکے جو ان کے ہاں گاگریں کہلاتی تھیں' وہ پیتل کی تھیں' وہاں ایک گلاس رکھے ہوئے تھے۔ اسی مٹکے میں سے پانی نکال نکال کر اسی گلاس میں سے مسلمان کو پلاتے تھے اُسی میں سے ہندو پیتا تھا لیکن آستیں کے اندر چھرا رکھا ہوا ہوتا تھا۔ میں کانگریس میں بھی رہا ہوں' اس لیے تعلقات تھے۔ میں نے انہی دنوں ان لوگوں کے گھروں میں جا کر دیکھا کہ جس زمانے میں وہ باہر ایک گلاس سے پانی پلا رہے تھے اسی زمانے میں ان کے گھروں کے اندر چھرے تیار ہو رہے تھے۔ پہلے وہاں کی سیاست نے بڑی کوشش کی کہ کسی طرح اس MINORITY (اقلیت) کو اپنے اندر جذب کر لیں۔

خلافت موومنٹ کے سلسلہ میں ہندوؤں کی چال اور سوچ 06-1905ء میں علامہ اقبالؒ کی آذان یعنی وطن کی بنیاد پر قوم کے وجود کی مخالفت

وہ اکّال الامم ہے حالی کے الفاظ میں جو باہر سے قومیں آئیں' ان کو کھا گیا' نگل گیا' ہضم کر گیا۔ یعنی آپ وہاں کی تاریخ دیکھیے سینکڑوں کی تعداد میں باہر سے قومیں آئیں' اپنا اپنا الگ تشخص رکھتے ہوئے۔ آج وہاں ہندوستان میں دیکھیے ان کا نام نشان تک نہیں ہے' سب ہندو ہیں۔ یہ مسلمان ایک سخت جان کی ہڈی تھی۔ خواہ کسی حالت میں وہاں رہا' یہ ان کے اندر جذب نہیں ہوا۔ اس سیاست کے اندر آخری کوشش تھی۔ آپ حیران ہوں گے کہ خلافت موومنٹ خالص آپ کے ہاں کے مسلمانوں کی ہندوؤں نے پورے کا پورا اس سیاست کو اپنا لیا کہ کسی طرح سے ان کو اپنے اندر جذب کر لیں۔ لیکن جس وقت پھر یہ چیز ناکام ہوئی ہے اور صرف اس وجہ سے ناکام ہوئی تھی کہ یہ پہلا قرآنی بصیرت رکھنے والا مردِ مومن اقبالؒ جس نے 06-1905ء میں یہ بات کہہ دی کہ بنا ہمارے حصارِ ملت کے اتحادِ وطن نہیں ہے بلکہ وطنیت کی بنیادوں پہ قوم بنانے کے لیے اس نے یہ کہہ دیا کہ

ان تازہ خداؤں میں بڑا سب سے وطن ہے
جو پیرہن اس کا ہے وہ مذہب کا کفن ہے
خاص ہے ترکیب میں قومِ رسول ہاشمی ﷺ

ملت اسلامیہ کے آسماں پر عظمتِ کردار کا ایک روشن ستارہ قائداعظمؒ اور اس کی مخالفت

اس نے اس زمانے میں یہ چیزیں کہیں کہ تم قرآن کی بنیادوں کے اوپر ایک لگ قوم ہو۔ اور اسی فلسفے کو لے کر ہمارے یہ آخری مردِ مجاہد قائداعظم رحمۃ اللہ علیہ باہر نکلے۔ خدا ان کو کروٹ کروٹ جنت دے۔ وہ اسی چیز کو' اس عَلَم کو لے کر باہر نکلا۔ اور اس شخص کا انداز بڑا عجیب ہوا کرتا تھا۔ الفاظ بڑے مختصر ہوتے تھے' بات بڑی گہری ہوتی تھی۔ ان سے پوچھا گیا کہ آج آپ نے پاکستان کی تحریک کا یہ دعویٰ چلایا ہے' یہ کس طرح سے پیدا ہوئی' کب کی پیداوار ہے؟ انہوںؒ نے کہا کہ یہ آج کی پیداوار نہیں ہے۔ جس دن ہندوستان میں پہلا غیر مسلم' مسلمان ہوا تھا اس دن پاکستان کی پہلی اینٹ رکھی گئی تھی۔ آہاہاہا! یہ شخص یہ کچھ کر رہے تھے جن کو یہ فرنگی ؟؟؟ اقبالؒ کے ؟؟؟؟ کو گالیاں دی جا رہی تھیں۔ بڑے بڑے جبوں اور قبوں میں ملبوس علامہ' ابوالکلام آزاد' حسین احمد مدنی' مفتی کفایت اللہ' سعید احمد سعید اور تمام کے تمام علمائے عزام کا یہ گروہ' سب کے سب اس کی مخالفت کر رہے تھے کہ تم ہندو اور مسلمان مل کر ایک قوم کیوں نہیں بنانے دیتے۔ عجیب چیز تھی صاحب! اسی لیے چیخ کر بسترِ مرگ سے اس بے چارے کو کہنا پڑا کہ

عجم ہنوز نہ داند رموزِ دیں ورنہ

زدیوبند حسین احمد! ایں چہ بو العجبی است
سرود برسرِ منبر کہ ملت از وطن است
چہ بے خبر زمقام محمد ﷺ عربی است
مصطفیٰ ﷺ برساں خویش را کہ دیں ہمہ او است
اگر بہ او نہ رسیدی، تمام بولہبی است

تحریکِ پاکستان میں طلوع اسلام کا کردار اور اس کی سعی و کاوش

عزیزانِ من! ہمارے ساتھ وہاں یہ بیت رہی تھی۔ یہ لوگ قرآنِ کریم کی ان صریح آیات کے مقابلے میں یہ کچھ پیش کر رہے تھے۔ بہرحال بات ''میں'' کی آجاتی ہے میں خود بھی کسی زمانے میں کانگریس میں رہا ہوں۔ بطورِ تحدیثِ نعمت عرض کروں گا کہ اللہ تعالیٰ کا یہ فضل تھا۔ سن 1930ء میں یہ بات سامنے آئی تو ہم اس زمانے کے پاکستانی ہیں۔ تو پھر یہ چیز کہ ان علما حضرات کا جو محاذ تھا، اس کو سنبھالنے کی ذمہ داری اس فقیر کے حصے میں آئی تھی۔ اور اللہ کا شکر ہے کہ وہ ایسی لڑائی لڑی ہے کہ اس زمانے کے طلوعِ اسلام کی فائلیں آپ نکال کر دیکھیے۔ اکیلا ماہوار پرچہ طلوعِ اسلام اور یہ سارے کا سارا جمِ غفیر جن کے پیچھے کانگریس اور ان تمام سیٹھوں کی دولت موجود تھی۔ یہ سارے کا سارا جمِ غفیر اور یہاں ایک ماہوار پرچہ۔ آپ حیران ہوں گے کہ اس نے ان میں ایک ایک کو شکست دے دی۔ صرف اس لیے کہ یہ قرآن کی ہدایت پہ تھا، اس کے ساتھ دین تھا، محمد رسول اللہ ﷺ کی سیرتِ مقدسہ اس کے ساتھ تھی۔ نہ وہاں مولانا ابوالکلام کی ابوالکلامیت چلی، نہ وہاں حسین احمد مدنی کی اتنی بڑی دیوبندیت چلی۔ قرآن کی آواز کو لے کر اٹھنے والا تو ایک شخص بھی اگر ہو اور مخلص ہو تو نتائج بتا دیتے ہیں کہ کس طرح حق باطل کے اوپر غالب آ کر رہتا ہے۔ یہ قرآن کی آیتیں میرے سامنے تھیں۔ اٹھائیے طلوعِ اسلام کی فائلوں کو اور دیکھیے کہ پہلی دفعہ ہمارے ہاں کی سیاست میں، یہ آیتیں اس زمانے میں آئی تھیں۔ ان سے کسی طرح سے جواب نہیں بن پڑتا تھا۔ قَدْ بَدَتِ الْبَغْضَآءُ مِنْ اَفْوَاهِهِمْ وَ مَا تُخْفِيْ صُدُوْرُهُمْ اَكْبَرُ (3:118) جوشِ جذبات میں کبھی کبھی ان کے منہ کے اوپر کچھ باتیں آجاتی ہیں، ورنہ ان کے سینوں کے اندر جو تمہارے خلاف انتقام کی آگ بھڑک رہی ہے، پوچھو ہی نہیں یہ کس قدر جلالہ نوشی کے شعلے اپنے ہاتھ لیے ہوئے ہوتی ہے۔ قَدْ بَيَّنَّا لَكُمُ الْاٰيٰتِ اِنْ كُنْتُمْ تَعْقِلُوْنَ (3:118) ہم نے یہ آیات اس طرح واضح کر دیں۔ مقابلے میں یہ حضرات علمائے کرام کا جمِ غفیر، یہ جبے اور دستار اور فضیلتوں کی سندیں لیے ہوئے، سارے کے سارے ان آیات کی مخالفت کر

رہے تھے۔

مسلمانوں کے خلاف کفار کی یا ہندوؤں کی مخالفانہ ذہنیت کا عکس

وہ کہتا ہے کہ قَدۡ بَیَّنَّا لَکُمُ الۡاٰیٰتِ (3:118)۔کہا ھٰۤاَنۡتُمۡ اُولَآءِ تُحِبُّوۡنَہُمۡ وَ لَا یُحِبُّوۡنَکُمۡ (3:119) ارے تمہیں کیا ہوگیا ہے' ان کی محبت پر اعتبار کرتے ہو' وہ کبھی تمہارے ساتھ محبت نہیں کرتے۔ وَ تُؤۡمِنُوۡنَ بِالۡکِتٰبِ کُلِّہٖ((3:119 تمہاری تو یہ کیفیت ہے کہ اپنی کتاب کے او پر بھی ان سب کی کتابوں کے او پر بھی ایمان رکھتے ہو۔ ان کی کیفیت یہ ہے' یہ تمہاری ایک کتاب میں ہمیشہ کیڑے ڈالتے ہیں۔ وَ اِذَا لَقُوۡکُمۡ قَالُوۡۤا اٰمَنَّا ((3:119 جب بھی یہ ملتے ہیں۔ اب نئی نسل نے تو ہندو دیکھا نہیں ہے' ان کو پتہ نہیں ہے کہ یہ کم بخت کیا تھا۔ جیسا میں نے کہا تھا کہ ہاتھ بھی بندھے ہوئے ہیں اور آستینوں کے اندر ان کے خنجر ہوتا تھا۔ وَ اِذَا خَلَوۡا عَضُّوۡا عَلَیۡکُمُ الۡاَنَامِلَ مِنَ الۡغَیۡظِ((3:119 تنہائی میں جاتے ہیں تو غصے میں انگلیاں کاٹتے ہیں کہ ہائے ابھی یہ مُسلا یہاں باقی ہے۔ جب ہم نے سن 1947ء میں ہجرت کی ہے تو ان کو انگلیاں کاٹتے ہوئے دیکھا ہے۔ یہ بات کہیں اور چلی جائے گی۔ قُلۡ مُوۡتُوۡا بِغَیۡظِکُمۡ ((3:119 ان سے کہو کہ جاؤ اپنے غصے کی آگ میں جل کر خود بھسم ہو جاؤ' تم خدا کے نور کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔ اِنَّ اللّٰہَ عَلِیۡمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوۡرِ o اِنۡ تَمۡسَسۡکُمۡ حَسَنَۃٌ تَسُؤۡہُمۡ (3:119-120) کوئی خوشگوار بات تمہارے ہاں آتی ہے تو ان کے گھر میں صفِ ماتم بچھ جاتی ہے۔ وَ اِنۡ تُصِبۡکُمۡ سَیِّئَۃٌ یَّفۡرَحُوۡا بِہَا ((3:120 کوئی چیز بدقسمتی سے تکلیف دہ تمہارے ہاں آتی ہے تو یہ لوگ جشنِ مسرت مناتے ہیں۔ آج تک ان کی یہ کیفیت ہے کہ پاکستان کو پنپتا نہیں دیکھ سکتے۔ وہ آگ ان کے اندر سلگ رہی ہے۔ اور سن 1965ء میں تو وہ کبھی کبھی منہ پر آتی تھی۔ وہ شعلۂ جوالہ کی طرح آپ کے ہاں نکل کر باہر آ گئی۔ وَ اِنۡ تَصۡبِرُوۡا وَ تَتَّقُوۡا لَا یَضُرُّکُمۡ کَیۡدُہُمۡ شَیۡئًا ((3:120 کوئی بات نہیں! اگر تم استقامت سے اپنی ان اقدارِ خداوندی پر جم کر کھڑے رہے اور ان کی طرف سے' احتیاط برتتے رہے' محتاط رہے' اپنی حفاظت کا سامان کرتے رہے' تو ان کی یہ خفیہ ریشہ دوانیاں تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچا سکیں گی۔ کیا بات ہے قرآن کی! کم بخت مخالفت میں بھی نکھر کر سامنے نہیں آتا۔ اِنَّ اللّٰہَ بِمَا یَعۡمَلُوۡنَ مُحِیۡطٌ((3:120 ہمارا قانونِ مکافات ان کے تمام اعمال کو گھیرے ہوئے ہے۔

عزت اور ذلت کا مدار قانونِ خداوندی سے ہی وابستہ ہوتا ہے

یہاں اسی آیت سے پہلے یہ چیز کہی تھی کہ عزت اور ذلت خدا کے قوانین سے وابستہ ہے۔ کہا کہ یہ لوگ جو دل میں ان لوگوں کے ساتھ کچھ روابط بڑھانے کی سوچتے ہیں اَيَبۡتَغُوۡنَ عِنۡدَهُمُ الۡعِزَّةَ (4:139)۔ عزت کے معنی تکریم لیتے ہیں ورنہ اس کے معنی غلبہ اور قوت' تقویت ہے۔ کہا کہ کیا وہ ان کے ساتھ دوستانہ مراسم قائم کر کے سامانِ تقویت حاصل کرنا چاہتے ہیں' کچھ غلبہ حاصل کرنا چاہتے ہیں' کچھ قوت حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ دیکھیے قرآن کیا بات کہہ گیا ہے! ان سے کہہ دیجیے کہ فَاِنَّ الۡعِزَّةَ لِلّٰهِ جَمِيۡعًا (4:139) تمہاری اور تمہاری قوم کی جو حقیقی عزت ہے وہ تو قانونِ خداوندی سے وابستہ ہونے کے اندر ہے۔ ان کے ساتھ دوستانہ مراسم کے بعد کچھ مراعات تمہیں ملیں گی' کچھ رعایتیں ملیں گی' بھیک ملے گی۔ کیا وہ بھیک کی رعائتیں لے کر سمجھتے ہو کہ تم باعزت ہو جاؤ گے؟ تمہاری ذلت اور بڑھ جائے گی۔ عزت لینا چاہتے ہو تو خدا کے قوانین کا' اس کے ضابطے کا' ایک ہی مرکز ہے۔ اس کے ساتھ وابستہ ہو جاؤ تم دیکھو گے کس طرح عزت ملتی ہے۔ فَاِنَّ الۡعِزَّةَ لِلّٰهِ جَمِيۡعًا (4:139) تمہیں پوری کی پوری حقیقی عزت' ان قوانین کے ساتھ' اپنی ملت کے ساتھ رابطہ استوار رکھنے سے ملے گی۔ ان کی طرف مائل ہونے سے یہ چیز تمہیں نہیں مل سکتی۔ اور اس کے بعد قرآنِ کریم نے اپنے انداز کے مطابق تاریخی شواہد سے اس حقیقتِ کبریٰ کی اور وضاحت ایسے انداز میں کی کہ جس کے بعد پھر کوئی شبہ باقی نہیں رہتا۔

عزت وتکریم کا بلند ترین مینار نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا اسوۂ حسنہ ہے جسے قرآنِ کریم کی دفتین میں محفوظ کر دیا گیا ہے

قرآنِ کریم نے دو ہستیوں کی زندگی کو اسوۂ حسنہ قرار دیا ہے۔ آخر میں تو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی حیاتِ طیبہ جو قیامت تک کے لیے حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی رسالت ہے۔ قیامت تک کے لیے حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی سیرت اور اسوۂ حسنہ روشنی کے بلند مینار کی طرح جگمگا رہا ہے۔ خدا کی کتاب کی طرح حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے نقوشِ قدم زمان اور مکان کی حدود سے بالا ہیں' بلند ہیں' امٹ ہیں' کبھی نہیں مٹ سکتے۔ ایک اور کی زندگی اسوۂ حسنہ کہا ہے اور وہ حضرتِ ابراہیمؑ ہیں۔ دونوں حقیقت میں ایک ہی سکہ کے دو رخ ہیں۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے قرآن میں ملتِ اسلامیہ ملتِ ابراہیمؑ کہا ہے۔ اسی ملت کا اتباع ہے جو یہاں بھی ہو رہا تھا۔ جس مقام پہ یہ کہا ہے' وہ غور طلب چیز ہے۔ میں اتنا عرض کر دوں کہ اسوہ کے معنی ماڈل ہوتا ہے۔ تمہارے لیے یہ ماڈل سامنے رکھنا ہوتا ہے۔ بہترین ماڈل ہے۔ اب ظاہر ہے کہ اگر کوئی ڈرائنگ کا ماسٹر بچوں کو کہے کہ تم یہ ڈرائنگ ماڈل کے مطابق کرو تو ماڈل سامنے رکھے گا

اور بچے اس کے مطابق اس کا اتباع کریں گے۔ اگر ڈرائنگ کے اندر کہا جائے کہ اس ماڈل کے مطابق نقشہ بناؤ تصویر بناؤ اور ماڈل سامنے نہ دیا گیا ہوتو آپ جانتے ہیں کہ پہلا ہی یہ سوال ہوگا کہ ماڈل تو ہے نہیں ہم اس کے مطابق کیا بنائیں۔ اور اگر ماڈل نہ دیا جائے تو پھر ہر شخص اپنے اپنے تصور کے مطابق ماڈل قائم کرے گا۔ قرآنِ کریم نے جب نبی اکرم ﷺ کی سیرت کو ماڈل کہا ہے تو یقینا خدا کے لیے ضروری تھا کہ وہ اس ماڈل کو قرآن کے اندر دیتا۔ اور اسی لیے نبی اکرم ﷺ کی سیرتِ طیبہ کے سارے بنیادی خدوخال قرآن کے اندر موجود ہیں۔ اس سیرت کو ماڈل کہنے والا خدا ہے اور اس نے ماڈل سامنے دیا ہوا ہے۔

غیروں سے تعلقات قرآنِ حکیم کے پیش کردہ احکام کے مطابق استوار کرنا ہونگے

یہاں حضرتِ ابراہیمؑ اور ان کے ساتھیوں کی زندگی کو ماڈل کہا ہے تو ظاہر ہے بتانا چاہیے کہ وہ ماڈل ہے کیا۔ قرآن کا یہ انداز ہے کہ وہ کوئی بات غیر واضح، نا تمام نہیں چھوڑتا۔ بات شروع ہوتی ہے **يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوْا عَدُوِّيْ وَعَدُوَّكُمْ اَوْلِيَآءَ** (60:1) اے جماعتِ مؤمنین! اپنے دشمنوں کو، میرے دشمنوں کو، کبھی اپنا دوست نہ بناؤ۔ **تُلْقُوْنَ اِلَيْهِمْ بِالْمَوَدَّةِ وَقَدْ كَفَرُوْا بِمَا جَآءَكُمْ مِّنَ الْحَقِّ** (60:1) کیا تم ان لوگوں کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھاؤ گے کہ جو تمہاری اس کتاب سے انکار کر رہے ہیں جو خدا نے تمہارے لیے بطورِ ضابطۂ حیات بھیجی۔ اب آپ نے دوستی کی، تعلقات کی اور عدمِ تعلقات کی بنیاد دیکھ لی۔ اس کتاب پر ایمان۔ بس یہ بنیاد بن گئی۔ یہ چیزیں بیان کرنے کے بعد یہ اصولی چیز دی۔ اس کے بعد کہا کہ **قَدْ كَانَتْ لَكُمْ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ فِيْٓ اِبْرٰهِيْمَ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗ** (60:4) تمہارے لیے ابراہیمؑ اور ان کے ساتھیوں کی زندگی میں ایک نہایت بہترین ماڈل ہے۔ ایک اسوہ قابلِ تقلید ہے۔ ان کی زندگی کے اندر ایک نمونہ ہے۔ اور اس کے بعد وہ ماڈل کیا ہے؟ کہا کہ **اِذْ قَالُوْا لِقَوْمِهِمْ** (60:4) جب انہوں نے اپنی قوم سے کہا۔ یہ آخری سٹیج تھی جو قوم تک پہنچی ہے۔ حضرتِ ابراہیمؑ اس گھر میں پیدا ہوئے جہاں باپ اسقفِ اعظم تھا۔ اس زمانے کا بہت بڑا پجاری ہیڈ پریسٹ تھا۔ یہ ہمارے ہاں کے آج کل کے پجاری خواہ وہ مسجد کے اندر بیٹھے ہوئے ہوں یا وہ کسی خانقاہ کے اندر بیٹھے ہوئے ہیں، ان کے گذارے تو خیرات پر ہوتے ہیں۔ اس زمانے کا پجاری جو ہوتا تھا اس کے ہاتھ میں سلطنت کا اقتدار ہوتا تھا۔ بادشاہ بھی اس سے پوچھ کر فیصلے کیا کرتا تھا۔ مملکت کے اندر سب سے بڑا اقتدار پجاری کا ہوتا تھا۔ حضرت ابراہیمؑ اس ہیڈ پریسٹ کے گھر میں پیدا ہوئے تھے۔ باپ کی یہ پوزیشن تھی اور وہ پوزیشن بغیر کسی قسم کی محنت کے بیٹے کے حصے میں خود آ رہی تھی۔

ماں باپ کی اطاعت کے سلسلہ میں حضرت ابراہیمؑ کا اسوۂ حسنہ اور اس کے خدوخال

آپ دیکھ رہے ہیں کہ حضرتِ ابراہیمؑ کے لیے کتنی بڑی TEMPTATION تھی۔ پھر باپ وہ باپ! یہ بات کئی دفعہ آ چکی ہے۔ ہمارے ہاں آج بھی یہ صورت ہے کہ باپ کے خلاف تو ایک لفظ بھی آپ نہیں کہہ سکتے۔ ہمارے لیے ماں باپ کی اطاعت کو فریضہ بنا دیا۔ دیکھیے قرآن کس کی زندگی کو ہمارے لیے اسوہ قرار دے رہا ہے؟ ابراہیمؑ کی زندگی کو۔ سب سے پہلے اس نے گھر میں بیٹھے ہوئے باپ سے یہ چیز کہی کہ ابا جان آپ کیا کر رہے ہیں۔ میں دیکھتا ہوں کہ اپنے ہاتھ سے مورتیاں گھڑتے ہو پھر ان کے سامنے سجدہ کرتے ہو۔ یہ تو انسانیت کے شرف کے بھی منافی ہے چہ جائیکہ یہ خدا پرست انسان کا وطیرہ ہو جائے۔ اس نے کہا ابراہیمؑ! کیا کہہ رہے ہو' تمہاری مت ماری گئی ہے۔ اتنی بڑی وجاہت' ثروت' دولت' منصب' عزت گاہ' اتنا بڑا مقام اور اس کے خلاف یہ کچھ کہنا اور پھر مذہب کے اعتبار سے بھی انہوںؑ نے کہا ہے۔ انہوںؑ نے کہا کہ باپ! جو بات حق کی ہے وہ تو زبان پر آ کر رہے گی۔ اس نے کہا کہ دوبارہ تم نے کہا تو یاد رکھو! گھر سے نکال دوں گا۔ انہوںؑ نے کہا کہ آپ کہہ رہے ہیں گھر سے نکال دوں گا جبکہ میں تمہارے ملک سے نکل جانے کو تیار ہوں۔ حق بات زبان پہ رکھوں گا۔ گھر سے شروعات کی' پھر ان پجاریوں کے ہاں مندر میں چلے گئے۔ میں نے کہا اس زمانے کے پجاریوں کا اقتدار' ان کی قوت کا اندازہ آپ لگائیے۔ فرعون جیسا اتنا بڑا مستبد جب حضرتِ موسیٰؑ کے مقابلے کے لیے بھیجتا ہے تو ہامان کو بھیجتا ہے' خود سامنے نہیں آتا۔ یہ چیزیں تصوراتی نہیں تھیں یہ تو تاریخی حقائق ہیں۔ حضر ابراہیمؑ اس مندر میں جا پہنچتے ہیں۔ اور پھر ظاہر ہے جب وہ بات آئے گی تو تفصیل سے بیان کروں گا کہ ان کی موجودگی میں ان کے ساتھ ایک منطق کے طور پر ایک مباحثہ سا کرتے ہیں۔ اور ان کے بتوں کے ساتھ جو کچھ وہ کرتے ہیں۔ آپ سوچیے تو سہی یہ اکیلا فرد' اس زمانے میں ابھی ساتھ ایک بھتیجا حضرتِ لوطؑ ہی تھا۔ اس زمانے کا بادشاہ انہیں بلا بھیجتا ہے۔ قرآن نے نام تو نہیں لیا لیکن یہ مشہور ہے کہ وہ نمرود تھا۔ نمرود اور فرعون کے نام انسان کو کپکپا دیتے ہیں۔ اس بادشاہ کے سامنے جا کر اس کے ساتھ مکالمہ ہو رہا ہے اور پھر اس کے بعد پوری قوم کو للکار کر کہا جا رہا ہے **اِذْ قَالُوْا لِقَوْمِهِمْ** (60:4)۔ یہ ہے وہ مقام جہاں کہا کہ تمہارے لیے ابراہیمؑ کی زندگی اسوہ ہے۔ جب انہوں نے اپنی قوم سے کہا کہ **اِنَّا بُرَءٰٓؤُا مِنْكُمْ وَمِمَّا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ** (60:4) ہم تم سے اور یہ تمہارے جتنے معبود ہیں جن کو تم نے خدا کے سوا اپنا معبود بنا لیا ہے' ان تمام سے ہم اپنا اظہارِ بریت کرتے ہیں' ان کے ساتھ نفرت کا اظہار کرتے ہیں۔ ہمارا نہ تمہارے معبودوں سے کوئی تعلق ہے' نہ تم سے۔ اتنی قلیل MINORITY' دو چار دس افراد زیادہ سے زیادہ اس زمانے میں ان کے ساتھ تھے اور اتنی بڑی مستبد قوم کے اندر

کھڑے ہو کر للکار رہے ہیں۔ قوم سے ہی قطع تعلق نہیں ہو رہا وَ مِمَّا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ (60:4) ان کے معبودوں کے متعلق بھی یہ کہا جا رہا ہے۔ دیکھتے ہیں کس مقام کے اوپر اسوۂ حسنہ آتا ہے۔ كَفَرْنَا بِكُمْ وَبَدَا بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمُ الْعَدَاوَةُ وَالْبَغْضَآءُ (60:4) ہم انکار کرتے ہیں اس تمام مسلک سے جس کے اوپر تم ہو۔ پھر یہ مومن کی زندگی ہے۔ یہ نہیں ہے کہ دل میں کچھ اور چھپا کر رکھا ہے، زبان پہ کچھ اور آ رہا ہے۔ وَبَدَا بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمُ الْعَدَاوَةُ وَالْبَغْضَآءُ اَبَدًا (60:4) تم میں اور ہم میں کھلی ہوئی بغاوت ہے، کھلی ہوئی عداوت ہے، کھلی ہوئی دشمنی ہے۔ بَدَا بَيْنَنَا کھلی ہوئی۔ مومن کا تو شعار ہی یہ ہوتا ہے کہ دوست ہے تو کھلا ہوا دوست ہے اور دشمن ہے تو کھلا ہوا دشمن۔ للکار کر کہہ دیا کہ تمہارے اور ہمارے درمیان، اَبَدًا ہمیشہ کے لیے، کھلی ہوئی دشمنی اور بغاوت ہے۔ تو گویا ہمیشہ کے لیے کہہ کر یہ ہو گیا کہ اب کوئی امکان ہی نہیں ہے تعلقات کے پھر سے وابستہ کرنے کا، استوار کرنے کا۔ اَبَدًا کے تو معنی یہ ہوئے کہ جب تک تم زندہ ہو یا ہم زندہ ہیں۔ یہ ہو ہی نہیں سکتا۔ برادرانِ عزیز! قرآن ہے، دین ہے۔ اَبَدًا کہہ کر فوراً کہا حَتّٰى تُؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ وَحْدَهٗ (60:4) اسی خدائے واحد کے اوپر ایمان لے آ ؤ، پھر تم ہمارے ہو گئے۔ عزیزانِ من! آپ دیکھ رہے ہیں۔ اور یہاں کہا کہ لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْهِمْ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ لِّمَنْ كَانَ يَرْجُوا اللّٰهَ وَالْيَوْمَ الْاٰخِرَ (60:6) جو بھی اب خدا اور آخرت پر کچھ امیدیں لگا کر بیٹھنے والا ہے اس کے لیے ان کی زندگی کے اندر اسوۂ حسنہ ہے۔

حضرت ابراہیمؑ کا اپنے باپ سے یہ کہنا کہ ''میں چلا اپنے رب کی طرف'' بڑا ہی قابلِ غور قول ہے

عزیزانِ من! یہ وہ اسوہ ہے جسے آپ اپنے لیے، حضرت ابراہیمؑ اور ان کے ساتھیوں کی زندگی کے اندر اسوۂ حسنہ کہتے ہیں۔ یہ وہ مقام تھا جس کے بعد انہوں نے یہ کہا تھا کہ اِنِّيْ ذَاهِبٌ اِلٰى رَبِّيْ (37:99) لو میں چلا اس فضا کی طرف کہ جہاں خدا کے اس نظام اور اس قانون کے بروئے کار آنے کے لیے حالات بڑے مساعد ہیں۔ یہ کہنا کہ ''میں چلا اللہ کی طرف'' یہ بات تو ہے نہیں کہ یہاں اللہ نہیں تھا۔ اللہ تو شہ رگ سے قریب ہوتا ہے۔ وَهُوَ مَعَكُمْ اَيْنَ مَا كُنْتُمْ (57:4) جہاں بھی تم ہو وہاں اللہ ہے۔ یہ جو کہا اِنِّيْ مُهَاجِرٌ اِلٰى رَبِّيْ (29:26) اِنِّيْ ذَاهِبٌ اِلٰى رَبِّيْ (37:99) تو اس کے کیا معنی تھے کہ میں چلا اپنے رب کی طرف؟ یہ COSMIC کے طریقے کے اوپر تو رب ہر جگہ فضا کے اندر موجود ہوتا تھا لیکن خدا عملاً اسی مقام میں، اسی فضا میں، اسی سوسائٹی میں، اسی مملکت میں، موجود ہوتا ہے جہاں اس کے قوانین بروئے کار آتے ہیں۔ ''ورنہ او تھے رب نئیں ہوندا ہیگا او تھے ساہڈے ورگی چولاں ای ہوندیاں ہیگیاں''۔ ''میں چلا اپنے رب کی طرف'' صاحب! کتنے حسین فقرے ہیں کہ جاؤ تمہارا اب میرے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہے۔ اس طرح قطع تعلق کرنے کے بعد حَتّٰى تُؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ وَحْدَهٗ (60:4) کیا بات ہے!

کوئی شرک کی بات نہیں، توحید ایک توحید۔ یہی توحید کا پکارنے والا تھا۔

لفظ توحید کی ترجمانی محمد علیؒ جوہر کی زبانی

پھر بات یاد آ گئی۔ جس زمانے میں ابھی بات نہیں تھی سمجھی تو یہی محمد علی جوہرؒ کانگریس کا بہت بڑا لیڈر تھا۔ خلافت موومنٹ کے زمانے میں گاندھی کا یہ قول تھا کہ محمد علی اور شوکت علی میری جیب میں ہیں، میں ان کی آستینوں میں ہوں۔ یہ کیفیت تھی۔ جب یہ بات سامنے آئی ہے تو وہی محمد علیؒ پھر یہ پکار کر کہتا ہے۔ اور اس نے وحدہ کی خوب تشریح کی ہے کہ

توحید تو یہ ہے کہ خدا حشر میں کہہ دے
یہ بندہ دو عالم سے خفا میرے لیے ہے

یہ تھا حَتّٰی تُؤْمِنُوْا بِاللّٰہِ وَحْدَہٗ (60:4)

توحید تو یہ ہے کہ خدا حشر میں کہہ دے
یہ بندہ دو عالم سے خفا میرے لیے ہے

برادرانِ عزیز! یہ ہے جہاں قرآنِ کریم نے اسوۂ حسنہ کہا ہے۔ ادھر ان سے یہ کہا۔ اُن کے متعلق کہا کہ یاد رکھو الکفر ملة واحدة یہ بظاہر تمہیں مختلف قومیں، مختلف گروہ، مختلف طبقوں میں بسنے والے، مختلف وطنوں میں بسنے والی اقوام، نظر آئیں گی لیکن درحقیقت آپس میں تو ان کے ہزار اختلافات ہوں لیکن جہاں تمہارا مقابلہ آئے گا یہ سب تمہارے مقابلے میں ایک ہوجائیں گے۔ وَالَّذِیْنَ كَفَرُوْا بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ (8:73) دیکھا کیسے دو گروہ بن رہے ہیں!

صلیبی جنگوں کے موقع پر مسلمانوں کے خلاف دنیا بھر کے عیسائیوں اور یہودیوں کا گٹھ جوڑ اور ہماری اپنی کیفیت

یہ سارے کفار تمہارے مقابلے میں جب آئیں گے تو سب ایک دوسرے کے دوست ہوجائیں گے۔ تاریخ کے اوراق شاہد ہیں کہ جتنے بھی غیر مسلم تھے، ان کی آپس میں کتنی بھی مخالفت کیوں نہ ہو۔ اتنی شدید مخالفت جتنی عیسائیوں کے مختلف گروہوں میں تھی۔ لیکن جب مسلمانوں کے مقابلے میں صلیبی جنگ کے لیے یہ اٹھے ہیں تو ساری دنیا کے عیسائی اور یہودی آپ کے مقابلے میں سب ایک تھے۔ آج بھی آپ دیکھیے ان سلطنتوں میں آپس میں دشمنیاں اس حد تک بڑھی ہوئی ہوتی ہیں۔ لیکن جب بھی کبھی

اسلام کوزک دینے اور تکلیف پہنچانے کا وقت آ تا ہے' یہ سب ایک ہوتے ہیں ۔عزیزانِ من! بات بڑی صاف ہے ۔جیسا میں نے عرض کیا ہے' ہمیں تو معلوم نہیں کہ ہم کن صداقتوں کے اوپر ہیں' ہم صداقتوں پر ہیں ہی نہیں ۔لیکن ہمارے متعلق باہر بھرم یہی ہے کہ یہ اسی دین پر ہیں ۔اور وہ جانتے ہیں آپ کے ہاں کے یہ سارے نہ ماننے والے کہ؟؟؟؟؟؟؟؟؟؟؟؟ نہیں اسلام ہے وہ زمانے کی ؟؟؟؟ کے اندر چھپا ہوا۔ یہ قوم کبھی بھی اس کو لے کر کھڑی ہوگئی اور یہ کبھی بھی اوپر آ گیا تو پھر جتنے بھی لوگ دنیا میں اس مفاد پرستیوں کے حامل ہیں جو گروہ بندیاں سکھا رہی ہے'ان کی خیریت نہیں ہے ۔اس لیے یہ سب ایک ہوجاتے ہیں ۔ وَ الَّذِیْنَ کَفَرُوْ ابَعْضُهُمْ اَوْلِیَآءُ بَعْضٍ ؕ اِلَّا تَفْعَلُوْهُ تَكُنْ فِتْنَةٌ فِی الْاَرْضِ وَ فَسَادٌ كَبِیْرٌ ((8:73 اگر تم نے ان کی مدافعت کے لیے اپنے ہاں یہ سامان وغیرہ نہ کیے جو اوپر کہے گئے ہیں تو یاد رکھیے وَفَسَادٌ كَبِیْرٌ (8:73) یہ دنیا کے اندر بہت بڑا فساد برپا کردیں گے' فتنہ برپا کردیں گے ۔ یہ تمہارے سامنے ایک متحدہ محاذ بنا کر آ جائیں گے ۔اور ان کفار کے اندر کون کون شامل ہیں؟ یہ عجیب عجیب طرح سے دھوکے دیتے ہیں ۔ پہلے تو یہ کہا کہ صاحب! قرآنِ کریم نے کفار کہا ہوا ہے ۔ ہمارے ہاں کی ایک تحریک چلی وہ خواہ نبوت کی تحریک تھی اپنے نام کے ساتھ نبی اکرم ﷺ کے بعد نبوت کی تحریک ۔ برطانیہ سب سے بڑے مہربان' عیسائی سب سے بڑے محبت والے' ان کی درازیٔ عمر کے لیے' ان کی مملکت کے لیے دعائیں ہو رہی ہیں ۔ پھر فتوے آ گئے کہ قرآن نے کفار کے ساتھ عدمِ تعاون کا کہا ہے ۔ یہ تو اہلِ کتاب ہیں ان کے متعلق یہ بات نہیں ہے ۔ابھی میں عرض کروں گا کہ قرآن کو جب ٹھپ کر رکھ دیا جائے تو اس کے بعد کیا کیا چیزیں پیدا ہوتی ہیں ۔ پھر اس کے بعد تحریک شروع ہوئی کہ جی یہ ٹھیک ہے عربوں میں تو یہ دو ہی اہلِ کتاب سامنے تھے اس لیے ان سے کہا گیا ۔قرآن نے جب کہا ہے کہ دنیا میں کوئی قوم ایسی نہیں جس کی طرف ہم نے کتاب یا نبی نہیں بھیجا تو پھر تو کوئی قوم بھی ایسی نہیں رہے گی ۔فتویٰ ملا تھا کہ یہ ہندو بھی اہلِ کتاب ہیں اس لیے اہلِ کتاب کے زمرے میں آ گئے یہ کفار کے زمرے میں نہیں آتے ۔ چلیے صاحب! پھر کیا ہوا؟ تو ان کے ساتھ تو ترکِ موالات نہیں ہیں ۔

یہودیوں اور عیسائیوں کی باہمی مخالفت کی کیفیت

میں نے عرض کیا ہے کہ یہ ساری چیز یہ ہے کہ اس کتابِ عظیم کو ایک طرف رکھ دیا پھر جو جی میں آیا' بکتے چلے جایئے ۔ سنیے قرآن کیا کہتا ہے! یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوا الْیَهُوْدَ وَ النَّصٰرٰۤى اَوْلِیَآءَ ((5:51 یاد رکھو! کہیں یہود نصاریٰ کے ساتھ دوست داری کے تعلقات قائم نہ کر لینا ۔ یاد رکھو! ان کے ساتھ راز داری کے تعلقات قائم نہیں ہو سکتے ۔ بَعْضُهُمْ اَوْلِیَآءُ

بَعۡضٍ) (5:51 کہا کہ بظاہر ان یہودی اور نصرانیوں میں ان کی آپس میں اس قدر دشمنی ہے۔ آپ کو تاریخ میں کسی دو گروہوں 478 **آلِ عمران**
اتنی شدید مخالفت نہیں ملے گی جتنی یہودی اور نصاریٰ کی ہے۔ اور بنیادی ہے۔ عیسائیوں کی تو بنیاد اس پر ہے کہ حضرتِ عیسیٰؑ کو ان یہودیوں نے ہی پکڑ کر صلیب پہ دے دیا تھا۔ ان کے ساتھ ان کی موافقت‘ ان کی محبت‘ ان کی دوستی‘ کیسے ہو سکتی تھی۔ آج تک اس طرح سے دشمنی چلی آ رہی تھی۔ لیکن قرآن کہہ رہا ہے کہ جب تمہارے مقابلے میں آئیں گے تو یہ پھر ایک دوسرے کے دوست ہو جائیں گے۔ آپ کے زمانے میں‘ آپ کے مقابلے میں آنے کا یہ تقاضا ہوا۔ پھر اس تقاضے میں سب سے پہلے یہ بنی اسرائیل‘ یہ اسرائیلیوں کی حکومت کو جو تائید حاصل ہوئی تھی وہ عیسائی سلطنتوں کی تھی۔ تو وہاں تو تاریخ ان کی یہ چلی آ رہی تھی۔ تو آپ کو معلوم ہے پھر اس کے لیے کیا کیا گیا؟ دین کے ساتھ جب جی چاہے یہ تحریف کریں‘ مذاق کریں۔

کویت کی طرف سے جاری ہونے والا ایک فتویٰ

آپ کو معلوم ہے کہ چار سال پہلے کویت کی طرف سے پھر یہ فتویٰ آ گیا کہ یہ تاریخ غلط ہے کہ یہودیوں نے حضرتِ عیسیٰؑ کو صلیب پر چڑھا دیا تھا۔ یہ بات ہی ساری غلط ہے۔ ان بے چاروں کا تو اس میں ہاتھ ہی نہیں تھا۔ چلیے! اسرائیل کی حمایت کرنے کی بات تھی۔ اسرائیل کی حمایت نہیں بلکہ مسلمانوں کی متحدہ مخالفت کرنے کے لیے اسرائیل کی حمایت کرنی تھی۔ وہ یہودی تھے اور راستے میں یہ چیز آڑے آتی تھی۔ وہاں پھر بھی اس قسم کے عیسائی ابھی بستے ہیں کیتھولک میں تو وہ ہوتے ہیں جو وہ یہ کہتے ہیں کہ صاحب! آج تک تو آپ ان کے خلاف یہ کچھ کہتے چلے آ رہے تھے۔ اب ان کے ساتھ ہم مل کر کس طرح سے متحدہ محاذ بنائیں۔ تاریخ ہی بدل دی‘ مذہب ہی بدل دیا‘ انجیلیں ہی بدل دیں کہ نہیں صاحب! ان کا تو ہاتھ ہی نہیں تھا۔ اور پھر آپ کو وہ معلوم ہے کہ آپ کے ہاں وہ سینما فلم میں جو دکھایا گیا تھا۔ آج سے پچیس سال پہلے جب اس فلم کی پہلی ورژن آئی تھی تو اس کے اندر یہودی حضرتِ عیسیٰؑ کی اس صلیب کے مجرم تھے۔ اور پھر جو نئی ورژن اس کے لیے آئی ہے تو اس نئی ورژن کے اندر یہودی بالکل الگ تھے‘ صرف رومن ہی تھے جو اس کے لیے ذمہ دار قرار پائے۔ اور آپ کو معلوم ہے وہ فلم دنیا بھر میں دکھائی جاتی رہی‘ مفت دکھاتے رہے‘ چھ چھ مہینے چلتی رہی۔ آپ دیکھتے ہیں ان کے حربے کتنے عظیم ہوتے ہیں۔ اب ان کے ہاں نئی تاریخ مرتب ہوئی۔ کاہے کے لیے ہوئی ہے؟ مسلمانوں کا مقابلہ کرنے کے لیے۔ یہ ہے جو قرآن کہتا ہے کہ بَعۡضُهُمۡ اَوۡلِيَآءُ بَعۡضٍ (5:51) آپس میں ان کی کتنی دشمنی کیوں نہ ہو لیکن تمہارے مقابلے میں آئیں گے تو یہ سب ایک دوسرے کے دوست ہوں گے۔ اور کتنی زور سے قرآن نے کہا ہے کہ وَ مَنۡ يَّتَوَلَّهُمۡ مِّنۡكُمۡ (5:51) اے جماعتِ مومنین! یاد رکھو! تم میں سے جو بھی ان

کے ساتھ باہمی ولایت کے' دوستانہ' تعلق رکھے گا فَاِنَّهٗ مِنۡهُمۡ ((5:51 وہ تم میں سے نہیں' اُن میں سے ہوگا۔ یہ کتنی بنیادی چیز ہے۔ صاحب! بات ہی یہ ہے کہ جب آپ آئیڈیالوجی کی BASIS کے اوپر ایک قوم بنتے ہیں تو جو بھی اس آئیڈیالوجی کا مخالف ہے اس کے ساتھ اگر آپ یہ تعلقات رکھتے ہیں تو پھر تو آپ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهۡدِى الۡقَوۡمَ الظّٰلِمِيۡنَ ((5:51 اور پھر تم ظالمین میں سے ہو جاؤ گے' ان کو تو پھر ہدایت نہیں ملا کرتی۔ ان کے ساتھ یہ خاص باہمی تعلقات مت رکھو۔ اور خاص طور پہ مملکت کے اندر' یہ قطعاً داخل نہیں ہو سکتے۔

پاکستان کے آئین میں ایک بنیادی کمزوری جو شروع سے چلی آ رہی ہے

عزیزانِ من! سوال اٹھایا جاتا ہے کہ پاکستان میں آنے کے بعد ہماری بدقسمتی اس ملک کے اندر یہ نظریہ ہی رہا۔ آپ کے ہاں اس کے اوپر آپس میں سر پھٹول ہو رہی ہے کہ CONSTITUTION اسلامک ہے یا غیر اسلامک۔ جو بھی آپ کے ہاں CONSTITUTION ہے اس کے اندر یہ نظریہ کہیں بھی نہیں ہے کہ یہاں پاکستان میں بسنے والے مسلمان اس بنیاد کے اوپر غیر مسلموں سے الگ قوم ہیں۔ یہ نظریہ کہیں بھی نہیں ہے' اس کے اندر یہ چیز ہی نہیں رہی۔ حتیٰ کہ وہاں ہمارے ہاں جداگانہ انتخاب ہوتا تھا یعنی ہم نے وہاں اپنی دورِ غلامی میں بھی اس چیز کو زندہ رکھا تھا۔ اور آپ کو معلوم ہے کہ جناحؒ اس معاملے کے اندر کتنے سخت متشدد تھے کہ نہیں صاحب! مسلمانوں کا نمائندہ غیر مسلم نہیں ہو سکتا۔ اسے کہتے ہیں جداگانہ انتخاب۔ یہاں آپ کے ہاں یہ چیز بھی نہیں رہی۔ سوال یہ ہوا کہ کیا ان کو مملکت کے اندر اس قسم کا رازدار بنایا جا سکتا ہے؟ ایسے معاملات ان کے سپرد کیے جا سکتے ہیں؟ کہ بطانة کی جو چیز قرآن نے کہی ہے کہ آپ کے اندرونی معاملات تک ان کی نگاہ جائے۔ کیا یہ ہو سکتا ہے؟

حضرت عمرؓ کے دور کا ایک اہم واقعہ

حضرتِ عمرؓ یہاں تک محتاط تھے۔ بڑا اہم واقعہ ہوا۔ مملکت بڑی وسیع ہو گئی' کاروبارِ مملکت بہت عظیم تھا' سیکریٹریٹ کھولنا پڑا۔ عربوں کی یہ قوم جن کے ہاں سو تک کے لیے گنتی نہیں ہے تو ایک دو کی گنتی کے بعد زیادہ سے زیادہ اس زبان میں ہزار کو الف کہہ دیا۔ اس کے آگے ان کے ہاں گنتی ہی نہیں ہے۔ وہ ایسی قوم تھی۔ مملکت اب ایسی آ گئی کہ جس میں اب لاکھوں کروڑوں تک کے لیے حساب وشمار ہوتا تھا۔ اکاونٹ کے کام کا کوئی آدمی ملتا نہیں تھا۔ حضرت عمرؓ کا ایک غلام تھا۔ ہم ابھی تک غلام کہہ دیتے ہیں۔ اسلام کے بعد تو ملازم کہہ لیجیے۔ تو وہ ملازم عیسائی تھا وہ اکاونٹ کا ماہر تھا۔ آپؓ کو یہ ضرورت پڑی کہ کہیں سے کوئی

اکاؤنٹ جاننے والا مل جائے تو اس کے سپرد یہ کام کریں۔ ملتا نہیں تھا۔ لوگوں نے کہا کہ وہ جو موجود ہے اور وہ جانتا بھی ہے۔ آپ باتیں غور کیجیے گا۔ ایک عمرؓ کا درہ بڑا مشہور ہے صاحب! ایسا نظر آتا ہے کہ ہاتھ میں لیے ہوئے تھے مار مار کر مسلمان کرتے چلے جاتے تھے۔ گھر کے اندر نجی ملازم ہے اور دوسرے اتنی ضرورت ہے۔ دو ہی چیزیں ہیں دونوں سامنے آجاتی ہیں۔ آپؓ نے کہا کہ کیا کہتے ہو! قرآن کے ان ارشادات کی موجودگی میں ایک غیر مسلم کو رموزِ سلطنت کے اندر دخیلِ کار بنا لوں۔ اکاؤنٹ نہیں رکھے جاتے تو اس سے کچھ دنیاوی نقصان ہوگا اگر اس کو رموزِ مملکت کے اندر شامل کر لیتا ہوں تو قرآن کی تعلیم کے خلاف چلا جائے گا۔ اسے میں شامل نہیں کرسکتا۔ اس سے کہا گیا کہ اتنا بڑا کام ہے۔ کیا رکھا ہے اس عیسائیت میں جس کے اندر تم ہو تم بھی مسلمان ہو جاؤ۔ اس نے کہا کہ عمرؓ کہیں گے تو ہو جاؤں گا۔ حضرتِ عمرؓ نے کہا کہ میرے کہنے کا مطلب یہ ہوگا کہ میں اکراہ اور زبردستی اس کو مسلمان بنا رہا ہوں۔ میں اس کو نہیں کہوں گا۔ وہ ساری عمر عیسائی رہا ہے ساری عمر یہ پوسٹ VACANT رہی۔ اس غیرِ مسلم عیسائی کو بطانۃً نہیں لایا جا رہا۔ اور یہ اتنی سی بات اگر میں کہوں گا کہ وہ سربراہِ مملکت ہیں اپنا ملازم ہے۔ اس قدر دور رس نگاہ تھی کہ یہ بات کہہ دینے کے معنی یہ ہوں گے کہ اس کے اوپر کوئی جبر کر رہا ہوں۔ یوں میں نہیں کہوں گا اور اس طرح سے اس کو عیسائی رہتے ہوئے مملکت میں نہیں لاؤں گا۔ یوں اسلامی مملکتوں کی تشکیل ہوا کرتی تھی۔ یہود و نصاریٰ کا شمار کفار میں ہے اور ان کے ساتھ یہ تعلقات قائم نہیں رکھے جاسکتے۔ آج آپ کے ہاں ابھی اتنی جرأتیں بے باک نہیں ہوئیں کہ جو کچھ ڈرائنگ روموں کے اندر کہا جاتا ہے وہ باہر کہا جائے۔ ڈرائنگ روموں کے اندر تو آپ دیکھیں گے کہ مذہب اعتقادات دین کے اعتقادات نظریات شعائر وغیرہ پھبتیاں کسی جارہی ہیں اور یہ سب کچھ ہو رہا ہے۔ اس کے متعلق عام انداز ایک فیشن سا ہو رہا ہے۔ سنیے قرآن کیا کہتا ہے! يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوا الَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا دِيْنَكُمْ هُزُوًا وَّ لَعِبًا مِّنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكُمْ وَالْكُفَّارَ اَوْلِيَآءَ (5:57) ان لوگوں میں سے جو بھی تمہارے دین کا مضحکہ اڑائے اس کو تماشا سمجھے خواہ وہ یہود نصاریٰ میں سے ہو خواہ وہ کفار میں سے ہو۔ اور آپ کہیے خواہ وہ نام کے مسلمانوں میں سے ہو۔ اس کے یہ معنی ہو جائیں گے کہ جرم تو یہ ہے کہ جو بھی اس کا مذاق اڑائے جو اس کو SERIOUSLY نہ لے ان کے ساتھ دوست داری کے تعلقات قائم نہیں رکھے جاسکتے۔ عزیزانِ من! یہ زندگی کا بڑا سیریس معاملہ ہے۔ یہ آپ کے ہاں کی زندگی کی بنیادیں ہیں۔ ان کو LIGHTLY لینے والا ان کو SERIOUSLY نہ لینے والا ان کا مذاق اڑانے والا اس کو ہنسی اور کھیل اور تماشا سمجھنے والا ان کے ساتھ دوستداری کے تعلقات قائم نہیں رکھے جاسکتے۔

478 آلِ عمران

قرآنِ حکیم کے نزدیک تعلقات قائم کرنے کا معاملہ اور تمدنی رشتوں کی حقیقت اور ان کی قدر و قیمت

اور اب آگے چلیے کہ اس کی حد کہاں تک ہے۔ دیکھیے یہ بات کہاں تک چلی جا رہی ہے؟ ابھی تک تو صرف گروہوں کا' قوموں کا ذکر آ رہا تھا اب اور آگے بڑھیے لَا تَجِدُ قَوْمًا يُّؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ يُوَآدُّوْنَ مَنْ حَآدَّ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَلَوْ كَانُوْٓا اٰبَآءَهُمْ اَوْ اَبْنَآءَهُمْ اَوْ اِخْوَانَهُمْ اَوْ عَشِيْرَتَهُمْ (58:22) کہا کہ تم کبھی نہیں دیکھو گے کہ جو مومن ہیں وہ ان لوگوں کے ساتھ جو خدا اور رسول کے ساتھ برسرِ جنگ رہتے ہیں' مخالفت کرتے ہیں ان لوگوں کے ساتھ کبھی دوستانہ تعلقات قائم رکھیں۔ کبھی نہیں تم دیکھو گے خواہ وہ ان کے ماں باپ ہوں' خواہ وہ ان کی اولاد ہوں' خواہ وہ ان کے بھائی ہوں' خواہ وہ ان کے اہلِ خاندان ہوں ۔عزیزانِ من! مومن کا تو یہ معیار ہے۔ وہی چیز جو میں نے پہلے کہی تھی کہ سارے رشتے جتنے بھی ہیں' یہ سب ٹوٹ جاتے ہیں اور نظریہ کی بنیادوں کے اوپر نئے رشتے وابستہ ہوتے ہیں۔ غیر نظریہ رشتوں کی بنیاد کیا ہے؟ یہ محض ایک تمدنی تعلق ہوتا ہے' INCIDENT OF BIRTH ہے کہ فلاں کس کے گھر میں پیدا ہو گیا۔ اس میں اس کا چوائس کوئی نہیں ہے' انتخاب کوئی نہیں ہے' ایک اتفاقی چیز ہے۔ وہ اتفاقی چیز جس میں انتخاب کا کوئی تعلق نہیں ہے' وہ کس طرح سے آپ کے ہاں کے دین کی' آپ کے ہاں کے ایمان کی بنیاد بن سکتی ہے۔ اس لیے یہ کہا ہے کہ یہ جتنی چیزیں محض اتفاقی ہیں۔ تمدنی ضروریات کے لیے یہ کچھ رکھنا پڑتا ہے ورنہ جہاں دین کا معاملہ آئے گا' وہاں نہ ماننے والا حقیقی باپ اور بیٹا بھی کیوں نہ ہو' اہلِ خاندان میں سے کیوں نہ ہو اور کوئی غیر کیوں نہ ہو' دونوں ایک صف میں چلے جائیں گے۔ ان کے ساتھ تمہارا کوئی تعلق نہیں رہتا۔ اور اسے پھر اتنے بڑے زور کی آواز میں کہا کہ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوْٓا اٰبَآءَكُمْ وَاِخْوَانَكُمْ اَوْلِيَآءَ اِنِ اسْتَحَبُّوا الْكُفْرَ عَلَى الْاِيْمَانِ (9:23) ایک اور کیٹگری آئی۔ اے جماعتِ مؤمنین! تم اپنے آباؤ اجداد کو' اپنے ماں باپ کو' اپنے بھائیوں کو' بھی اپنا دوست نہ بناؤ اگر وہ ایمان پر کفر کو ترجیح دیتے ہیں اور کفر کو ایمان کے بدلے میں زیادہ پسند کرتے ہیں۔ یہاں پسندیدگی کی بات آ گئی ہے کہ اگر اس کو زیادہ پسند کرتے ہیں تو یاد رکھو! ان کے ساتھ بھی یہ تعلق قائم نہ رکھو۔ وَمَنْ يَّتَوَلَّهُمْ مِّنْكُمْ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ (9:23) یاد رکھو! جو ایسا کرے گا ظالمین میں سے ہو جائے گا۔ قُلْ اِنْ كَانَ اٰبَآؤُكُمْ وَاَبْنَآؤُكُمْ وَاِخْوَانُكُمْ وَاَزْوَاجُكُمْ وَعَشِيْرَتُكُمْ وَ

اَمۡوَالُ نِ اقۡتَرَفۡتُمُوۡهَا وَ تِجَارَةٌ تَخۡشَوۡنَ كَسَادَهَا وَ مَسٰكِنُ تَرۡضَوۡنَهَاۤ اَحَبَّ اِلَيۡكُمۡ مِّنَ اللّٰهِ وَ رَسُوۡلِهٖ وَ جِهَادٍ فِىۡ سَبِيۡلِهٖ فَتَرَبَّصُوۡا حَتّٰى يَاۡتِىَ اللّٰهُ بِاَمۡرِهٖ ((9:24 یاد رکھو! تمہارے ماں باپ ہوں' تمہاری اولاد ہو' تمہارے بہن بھائی ہوں' تمہاری بیویاں ہوں' تمہارے اہلِ خاندان ہوں' وہ مال کہ جن کو تم اس طرح سے اکٹھا کرتے ہو' وہ کاروبار اور تجارت کہ جس کے مندا پڑنے سے تم اس قدر افسردہ خاطر ہوجاتے ہو' یہ بڑے بڑے محلات کہ جو تمہیں بڑے پسند ہیں' رہنے کی جگہیں' غرضیکہ ان میں سے کوئی چیز بھی اگر تمہیں خدا اور رسول اور اس کے راستے میں جہاد سے زیادہ عزیز ہوگئی تو پھر خدا کے فیصلے کا انتظار کرو۔ افوہ! خدا کے فیصلے کا انتظار کرو۔ وَ اللّٰهُ لَا يَهۡدِى الۡقَوۡمَ الۡفٰسِقِيۡنَ ((9:24 وہ قوم جو اس راستے سے نکل کر دوسری طرف ہٹ جاتی ہے' کبھی کشادکی منزلیں اس کے سامنے نہیں آیا کرتیں۔ خدا کے فیصلے کا انتظار کرو۔ عزیزانِ من! میں نے یہ عرض کیا تھا کہ قرآنِ کریم کی رو سے وہ لوگ کہ جو ان نظریاتِ حیات پر یقین اور ایمان نہیں رکھتے ہیں' وہ اپنوں میں سے نہیں ہو سکتے ہیں۔ قرآن کا یہ فیصلہ ہے۔ اس انداز کی بہت سی اور آیات میرے سامنے ہیں لیکن میں ابھی اسی پہ اکتفا کرتا ہوں۔

انسانیت کے پیشِ نظر باہمی تعلقات میں کشادہ نگہی اور حسنِ سلوک کے فروغ کی ترغیب

میں نے عرض کیا تھا کہ قرآنِ کریم ان سے دوست داری کے تعلقات سے منع کرتا ہے لیکن انسانیت کے' حسنِ سلوک کے' اور انصاف کے تعلقات سے تو وہ کبھی منع نہیں کرتا۔ وہ اس کے باوجود انسان رہتے ہیں۔ یہ((60:8 دیکھیے یہ وہی سورۃ ہے جس میں اسوۂ ابراہیمیؑ بیان کیا گیا تھا۔ یہ بیان کرنے کے بعد کہا ہے کہ لَا يَنۡهٰٮكُمُ اللّٰهُ عَنِ الَّذِيۡنَ لَمۡ يُقَاتِلُوۡكُمۡ فِى الدِّيۡنِ وَلَمۡ يُخۡرِجُوۡكُمۡ مِّنۡ دِيَارِكُمۡ اَنۡ تَبَرُّوۡهُمۡ وَتُقۡسِطُوۡۤا اِلَيۡهِمۡ ؕ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الۡمُقۡسِطِيۡنَ (60:8) قرآن کہتا ہے کہ وہ تمہیں اس سے نہیں روکتا کہ یہ لوگ جنہوں نے اعلانیہ تمہارے ساتھ جنگ نہیں کر رکھی ہوئی ان کے ساتھ تم کشادہ نگہی کا' فراخ دلی کا ثبوت نہ دو' ان کے ساتھ تم انصاف نہ کرو۔ عزیزانِ من! یہ ہے قرآنی تعلیم کی انفرادیت۔ قرآنی تعلیم یہاں منفرد ہوتی ہے۔ عیسائیت نے کہا یعنی وہ عیسائیت جو حضرتِ عیسیٰؑ کی نہیں بلکہ ان کی طرف منسوب ہے' اس نے کہا کہ دشمن کے ساتھ محبت کرو۔ یہ ایک نفسیاتی ناممکنات میں سے PSYCHOLOGICAL IMPOSIBILITY ہے۔ محبت کا تعلق جذبے سے ہے۔ جس کے ساتھ تم دشمنی کرتے ہو' بیک وقت اس کے ساتھ دشمنی بھی کرتے ہو اور محبت کے جذبات بھی تمہارے دل میں ہوں۔ یہ ناممکن ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ناممکن العمل تعلیم تھی' نہیں چل سکی۔ قرآن نے کیا کہا؟ قرآن نے کہا کہ دشمن کے ساتھ بھی عدل کرو۔

مسلم ہو یا غیر مسلم اس کو رزق بہم پہنچانے کی ذمہ داری اسلامی مملکت کے سر ہوگی 478آلِ عمران

وَ لَا یَجْرِمَنَّکُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰٓی اَلَّا تَعْدِلُوْا (5:8) اے قومِ مؤمنین! کسی قوم کے ساتھ دشمنی بھی تمہیں کہیں اس پر آمادہ نہ کردے کہ تم اس کے ساتھ عدل نہ کرو۔ اِعْدِلُوْا (5:8) عدل کرو ٔ ہر حال میں عدل کرو ھُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰی (5:8) یہی چیز تقوی سے قریب تر ہے وَ اتَّقُوا اللّٰہَ ؕ اِنَّ اللّٰہَ خَبِیْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ (5:8) یاد رکھو! قوانینِ خداوندی کی نگہداشت کرتے رہو۔ اب آپ نے دیکھ لیا کہ دوست دارانہ تعلقات اور شے ہے' اور قانون کے مطابق' فراخ دلانہ حسنِ سلوک اور انصاف اور عدل' اور شے ہے۔ اس میں سختی سے اس کی تاکید کی گئی ہے کہ وہ انسان ہیں ان کو حقوقِ انسانیت دینے ہوں گے۔ مملکت پہ اگر تمام افراد کے رزق کے بہم پہنچانے کی ذمہ داری ہے تو اس میں مسلم اور غیر مسلم کا کوئی کسی قسم کا فرق نہیں ہوگا۔ حقوقِ انسانیت ہیں۔ عدل کا تقاضا ہے کہ قانون کے مطابق ان کے فیصلے ہوں گے' اس میں دونوں کے اندر کوئی امتیاز نہیں رکھا جائے گا۔ بلکہ اسلامی مملکت میں غیر مسلم تو مزے میں رہتے ہیں۔ اس کو ذمی کہتے ہیں یعنی ان کی حفاظت کا ذمہ انہوں نے لے رکھا ہوا ہوتا ہے۔ دشمن کی گولیاں یہ مومنین سینے پہ کھاتے ہیں کہ اِن کی حفاظت کی جائے جو یہاں رہتے ہیں۔ ان کے معبدوں کی حفاظت' عبادت گاہوں کی حفاظت تو سورۃ حج میں جماعتِ مؤمنین کا فریضہ بتایا ہے۔ اور ان کی عبادت یہ ہے کہ ان کا فریضہ ہوجاتا ہے کہ ذمی ہونے کے اعتبار سے تمام حقوقِ انسانیت ان کو ملتے ہیں۔ لیکن آپ کی مملکت یا سوسائٹی کے نظام کے اندر کی جو چیزیں ہیں اس میں یہ دخیل کار نہیں ہوسکتے۔ عزیزانِ من! بات صاف ہے جو اس بنیاد کو ہی نہیں مانتا جس کے اوپر آپ کی مملکت کی عمارت استوار ہوتی ہے تو آپ اس عمارت کا محافظ اس کو کس طرح سے قرار دے سکتے ہیں۔ یہ نہیں ہوسکتا۔ ان کے ساتھ آپ TREATIES کرسکتے ہیں' معاہدات کرسکتے ہیں۔ قرآن نے یہ کچھ کہا ہوا ہے کہ قومی اعتبار سے دوسری قوموں کے ساتھ معاہدے کرو۔ قرآنِ کریم میں معاہدے نبھانے کے متعلق اتنی تاکید ہے کہ آپ نے معاہدہ کسی وقت فسخ بھی کرنا ہو تو اسی وقت آپ اس کو نہیں توڑ سکتے۔ قرآن کہتا ہے ایسے حالات پیدا کرو کہ وہ اور تم دونوں ایک لیول کے اوپر آجاؤ تو پھر ان سے کہو کہ بھئی! اب بات نہیں آگے چل سکتی۔ عزیزانِ من! دشمنوں کے ساتھ یہ تعلقات ہوئے۔ یہاں تک میں نے یہ بات کہی کہ قرآنِ کریم کی اس آیہ اور اس آیہ کی تفصیل میں مختلف مقامات پر جو آیات آئی ہیں ان کی رو سے جو بھی آپ کی اس آئیڈیالوجی میں BELIEVE نہیں کرتا اس کے ساتھ دوست داری کے تعلقات نہیں قائم ہوسکتے' وہ آپ کی قوم کا فرد نہیں بن سکتا۔ قرآن اس باب میں واضح ہے' اس باب میں دو آراء نہیں ہوسکتیں۔ لیکن اس آیت کا ایک اہم حصہ باقی ہے اِلَّآ اَنْ تَتَّقُوْا مِنْھُمْ تُقٰۃً (3:28) اور یہ وہ چیز ہے جو میں اس وقت

نہیں چھیڑ سکتا۔ چند منٹ باقی ہیں۔اس کے معنی یہ لیے جاتے ہیں کہ بھئی! ٹھیک ہے دوست داری کے تعلقات تم نہیں قائم کر سکتے لیکن اگر ان سے تمہیں ڈر ہو تو پھر ان کے دوست بنے رہو۔عزیزانِ من! آپ کو معلوم ہے میرا کسی فرقے سے تعلق نہیں ہے۔قرآن کی رو سے جو شخص فرقہ بندی کو شرک قرار دیتا ہو'اس کا فرقے سے تعلق ہی نہیں ہوسکتا۔اس لیے میں کسی فرقے کے معتقدات اور نظریات کو سامنے نہیں لایا کرتا۔لیکن جو چیز قرآن کے خلاف ہو'وہ کسی فرقے سے متعلق ہو'مجھے تو اس کی مخالفت کرنی ہی ہوتی ہے۔یہ اس فرقے کی مخالفت نہیں ہوتی بلکہ قرآن کے خلاف اس ایک عقیدے' نظریے' خیال' کی مخالفت ہوتی ہے۔ یہ جو چیز ہے کہ اگر تمہیں ڈر ہو تو پھر دوست بنے رہو اور یہ لفظ تُقٰةً یہاں جو آیا یہاں سے ہمارے ہاں ایک گروہ نے تقیہ کا ایک نظریہ قائم کیا ہوا ہے۔یہ چیز میری بصیرتِ قرآنی کے مطابق بالکل قرآن کی تعلیم کے خلاف ہے لیکن یہ چیز جیسا میں نے عرض کیا ہے چند منٹوں میں بیان کرنے کی نہیں ہے۔اس آیت کے آخری ٹکڑے کے متعلق میں اگلے درس میں آپ کے ہاں بیان کروں گا کہ میری بصیرت کے مطابق یہ چیز قرآن کی نصِّ صریح کے خلاف جاتی ہے کہ ان لوگوں سے دوست داری کے تعلقات تو نہ رکھو لیکن اگر ان سے ڈر ہو تو ایسے تعلقات بنائے ہوئے رکھو۔یہ قرآن کی بصیرت کے خلاف ہے۔اسے میں آئندہ لوں گا۔

سورۃ آلِ عمران کی 28ویں آیت کا پہلا حصہ آج ہم لے سکے۔اگلا حصہ آئندہ لیں گے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا ؕ اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ (2:127)

❀...❀...❀

ساتواں باب: سورۃ آل عمران (آیات 28 تا 32)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

تمدنی زندگی میں باہمی تعلقات کا معیار اور دل و دماغ کی باہمی رفاقت کی قدر و منزلت

عزیزانِ من! آج نومبر 1969ء کی 2 تاریخ ہے۔ سابقہ درسِ قرآن میں ہمارے سامنے سورۃ آلِ عمران کی 28 ویں آیت تھی: (3:28)۔

سابقہ درس کی یاد دہانی

اس آیت کا پہلا حصہ ہمارے سامنے آ گیا تھا۔ اور میں نے عرض کیا تھا کہ آیت کے آخری چند الفاظ ایسے ہیں جو تفصیل طلب ہیں۔ وقت کم تھا اسی لیے اسے ہم نے آج کے درس پر اٹھا رکھا تھا۔ اب یہ ہمارے سامنے آتے ہیں۔ میں آیت دہرا دوں۔ کہا یہ گیا تھا کہ لَا یَتَّخِذِ الْمُؤْمِنُوْنَ الْکٰفِرِیْنَ اَوْلِیَآءَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِیْنَ (3:28) مومنین کو یہ نہیں چاہیے کہ وہ اپنوں کے سوا دوسروں کو اپنا دوست بنائیں۔ وَ مَنْ یَّفْعَلْ ذٰلِکَ فَلَیْسَ مِنَ اللّٰہِ فِیْ شَیْءٍ (3:28) اور ایسا کرنا اسلامی نظریہ حیات کی رو سے اتنا سنگین جرم ہے کہ اس کے متعلق کہا کہ جو ایسا کرے گا' اللہ کے ساتھ اس کا کوئی تعلق نہیں رہے گا۔ بڑا شدید جرم ہے۔ اس کے متعلق میں نے قرآنِ کریم کی مختلف آیات پیش کی تھیں جو اس کی تائید میں تھیں۔ اور وہاں اس سے بھی واضح تر الفاظ میں یہ کہا گیا تھا کہ دوست بنانا تو ایک طرف ان کو کوئی ایسی پوزیشن بھی نہ دو کہ وہ تمہارے راز کی باتوں تک پہنچ سکیں۔ کہا یہ گیا تھا کہ یہ دو مختلف IDEOLOGIES ہیں۔ تمہارا نظریۂ زندگی اور ہے' ان کا نظریۂ زندگی اس کے بالکل برعکس ہے۔ ان کی ساری کوشش یہ ہوتی

ہے کہ وہ تمہارے نظریۂ زندگی کو نا کام بنا کر' اپنا نظریہ دنیا میں رائج کریں۔ اس لیے ان دو نظریاتِ حیات میں باہمی تصادم ہے' ٹکراؤ ہوتا ہے۔ اور جب یہ صورت ہے تو پھر ان کے ساتھ یہ دوستانہ مراسم' ان کے ساتھ اس قسم کے تعلقات کہ وہ تمہاری راز داری کی باتوں کے اندر تک آ جائیں۔ یہ تو ایک آستین کا سانپ ہوگا جسے تم پالو گے۔ ایسا کبھی نہ کرنا۔ یہ چیزیں پچھلے درس میں ہمارے سامنے بالوضاحت آ گئی تھیں۔ اس کے بعد اس آیت کا اگلا حصہ ہے۔

کسی کی طرف سے نقصان پہنچانے کے ڈر کی بنیاد پر دوستانہ تعلقات قائم رکھنا قرآنی تعلیم کے ہی منافی ہے

اِلَّآ اَنۡ تَتَّقُوۡا مِنۡهُمۡ تُقٰىةً (3:28) اس کے متعلق بعض لوگوں نے اس کا مفہوم یہ لیا کہ ان سے دوست داری کے تعلقات مت رکھو لیکن اگر تمہیں ان کی طرف سے خوف ہو' ڈر ہو تو پھر اپنے بچاؤ کرنے کی خاطر ایسا کر سکتے ہو۔ میں نے عرض کیا تھا کہ میں اپنی قرآنی بصیرت کے مطابق اس سلسلے میں یہ عرض کروں گا کہ یہ تصور قرآنِ کریم کی ساری تعلیم کے خلاف جاتا ہے اور اس کی اصل و بنیاد کو اکھیڑ کر رکھ دیتا ہے۔ بات یہاں یہ ہوئی کہ ان سے دوست داری کے تعلقات مت رکھو۔ اب آگے کہا کہ ہاں اگر تمہیں ان سے خوف ہو تو پھر اپنے بچاؤ کی خاطر تم ایسا کر سکتے ہو۔ اب بات ظاہر ہوئی کہ جن کے متعلق تمہیں خوف ہو ان کی طرف سے تمہیں ڈر ہو تو ظاہر ہے کہ ان کے ساتھ کوئی دلی دوست دارانہ تعلقات تو رکھ ہی نہیں سکتے۔ وہ تو دشمن ہوا اور تم تو جانتے ہو کہ دشمن ہے۔ ان کی طرف سے تمہیں خوف ہے' ڈر ہے' تم ان سے اپنا بچاؤ کرنا چاہتے ہو۔ اس بچاؤ کے لیے اگر یہ کہا جائے کہ یہ جو قرآن نے کہا ہے کہ انہیں دوست مت بناؤ لیکن اگر تمہیں ان کی طرف سے خوف ہو تو پھر تم انہیں دوست بنا لو۔ تو اب ظاہر ہے کہ یہ دوستی نہیں ہوگی بلکہ یہ ہوگا کہ دل میں تو ان کی طرف سے دشمنی رکھو کیونکہ تم جانتے ہو کہ یہ دشمن ہیں۔ تمہیں ان کی طرف سے ڈر ہے لیکن ظاہر داری میں ان کے ساتھ دوستانہ تعلقات رکھو۔ یوں اس سے یہ مفہوم ہو گیا۔ دوسری صورت اس کی پیدا ہی نہیں ہو سکتی۔ ایک تو یہ ہے کہ کسی کے متعلق آپ کو علم نہ ہو کہ معلوم نہیں کہ یہ ہمارا دوست ہے یا ہمارا دشمن ہے۔ اس طریق سے آپ ان کے ساتھ یہ تعلقات رکھ لیں۔ جب علم ہو جائے کہ نہیں صاحب! وہ دشمن ہے تو اس وقت وہ تعلقات آپ چھوڑ دیں۔ یہ دوسری شکل ہے۔ لیکن یہاں کہا یہ گیا ہے کہ اگر تمہیں ان کی طرف سے خوف ہو' ڈر ہو' تم جانتے ہو کہ وہ تمہارے دشمن ہیں لیکن ان سے بچنے کی خاطر تم ان کے ساتھ دوست داری کے تعلقات رکھو۔ تو اب دل سے تو یہ دوستی نہ ہوئی۔ تو بات یہ ہوگئی کہ دل میں ان کے ساتھ دشمنی رکھو اور ظاہر داری میں ان کے ساتھ دوستانہ تعلقات ظاہر کرو۔ ایسا ظاہر کرو گویا تمہارے تعلقات ان سے دوستی کے ہیں'

دل میں ان کے ساتھ دشمنی رکھو۔ اس آیت کے اس ٹکڑے سے یہ مفہوم لیا جاتا ہے۔ میں نے عرض کیا ہے کہ یہ چیز قرآن کی بنیادی تعلیم کے خلاف جاتی ہے۔

قرآنِ حکیم نے انسانوں کو تین گروہوں میں تقسیم کیا ہے

قرآنِ کریم نے شروع میں ہی تین گروہوں کا ذکر کیا تھا۔ ایک گروہ تو وہ تھے کہ جو کھلے بندوں دل اور دماغ کے اطمینان کے ساتھ قرآن کی صداقتوں پر ایمان رکھتے ہیں۔ دوسرا گروہ ان کا گنایا تھا جو کھلے بندوں اس سے انکار کرتے ہیں' اس کی مخالفت کرتے ہیں۔ یہ کفار کا گروہ ہوا۔ تیسرا گروہ ایک اور گنایا تھا کہ وہ دل میں کچھ اور رکھتے ہیں اور ظاہر میں کچھ اور کرتے ہیں ۔ یہ تیسرا گروہ وہ ہے کہ جسے قرآن منافقین کا گروہ کہتا ہے۔ اور اگر آپ دیکھیں تو قرآن کا شاید آدھا نہیں تو 1/3 حصہ تو اسی گروہ کی مخالفت کے اندر ہے۔ یعنی کفار کے متعلق اتنی شدت سے کچھ نہیں کہا گیا کیونکہ یہ تو تمہارے کھلے ہوئے دشمن ہیں' کھلے ہوئے تمہارے سامنے آتے ہیں۔ یہ کہتے ہیں کہ مخالفت ہے۔ ٹھیک ہے۔ کھلا ہوا دشمن جو ہے اس کے متعلق تاکید یہی کہ احتیاط برتو' ان کا مقابلہ کرو' ان سے یہ کچھ کرو۔ یہ تیسرا گروہ ایسا ہے کہ جس کی کیفیت یہ بتائی کہ وہ تم سے دوست دارانہ تعلقات ظاہر کرتے ہیں اور ان کے دل کے اندر تمہارے خلاف دشمنی ہے۔ اسی سورۃ آلِ عمران میں ذرا آگے چل کر یہ بات آئے گی۔ میں نے آپ کے سامنے یہ جو آیت رکھی تھی اسے میں پھر دہرا دوں کہ یہ وہ گروہ ہے جس کے متعلق خود قرآن نے یہ بات کہی ہے کہ یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوْا بِطَانَةً مِّنْ دُوْنِكُمْ لَا یَاْلُوْنَكُمْ خَبَالًا ((3:118 اپنے علاوہ یہ جو دوسرے لوگ ہیں' ان کو کبھی دوست نہ بناؤ۔ یہ تمہیں نقصان پہنچانے میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھیں گے۔ ان کے متعلق کیا کہا کہ یہ کون لوگ ہیں' کیا کرتے ہیں؟ قَدْ بَدَتِ الْبَغْضَآءُ مِنْ اَفْوَاهِهِمْ وَ مَا تُخْفِیْ صُدُوْرُهُمْ اَكْبَرُ ((3:118 ان کے دل میں تمہارے خلاف جو جذباتِ نفرت اور انتقام اور عداوت ہیں' وہ بہت زیادہ ہیں۔ کبھی کبھی ایسا ہوتا ہے کہ جذبات میں' جوش میں آ کر ان کے منہ سے کوئی بات ایسی نکل جاتی ہے جس سے پتہ چل جاتا ہے کہ ان کے دل میں کس قسم کی باتیں ہیں۔ ورنہ جو کچھ یہ دل میں رکھے ہوئے ہیں' وہ بہت زیادہ شدید ہیں اور ظاہر داری سے یہ آ کر تمہارے دوست بنتے ہیں۔ تو یہ تو بعینہٖ وہی پوزیشن ہوگئی جو اس آیت کے وہ ظاہری معنی لینے سے آتی ہے کہ دل میں تم ان سے دشمنی رکھو' ظاہر داری میں ان کے ساتھ دوستی رکھو۔ قرآن یہاں یہی چیز منافقین کے متعلق کہہ رہا ہے اور ان کے خلاف سخت الزام عائد کرتا ہے کہ ان کی کیفیت یہ ہے کہ دل میں یہ کچھ چھپا رکھتے ہیں اور ظاہر داری میں تمہارے ساتھ دوست دارانہ تعلقات رکھتے ہیں۔ کبھی ایسا نہ کرو۔ وَ اِذَا لَقُوْكُمْ قَالُوْٓا اٰمَنَّا وَ اِذَا خَلَوْا عَضُّوْا عَلَیْكُمُ الْاَنَامِلَ مِنَ

الْغَيْظِ ((3:119 ان کی کیفیت یہ ہے کہ تنہائیوں میں جاتے ہیں تو وہاں جا کر سازشیں کرتے ہیں مگر سامنے آتے ہیں تو کہتے ہیں ہم بھی ایمان دار ہیں، تم میں سے ہیں۔ اور جب وہ خلوت میں جاتے ہیں، تنہائیوں میں جاتے ہیں، اپنے لوگوں کے پاس جاتے ہیں، تو وہاں تمہارے خلاف غیظ وغضب سے اپنی انگلیاں کاٹتے ہیں۔ تو یہ کیفیت کن کی ہے؟ کہ دل میں کسی کے خلاف دشمنی کے جذبات رکھنا اور ظاہر داری میں اس کے ساتھ دوستانہ تعلقات رکھنا۔ میں نے جیسا عرض کیا ہے کہ شاید ایک تہائی حصہ قرآنِ کریم کا انہیں منافقین یا منافقت کے خلاف یہ کچھ کہنے کے لیے ہے۔

قرآنِ حکیم نے منافق کا لفظ غیر مسلموں کی بجائے مسلمانوں کے ایک گروہ کے لیے استعمال کیا ہے

اب سیدھی سی بات ہے کہ قرآن اس ذہنیت کے متعلق جو کچھ کہہ رہا ہے وہ ذہنیت کسی مسلمان کے ہاں پیدا ہو جائے یا غیر مسلم کے ہاں پیدا ہو جائے۔ سوال تو ذہنیت کا ہے۔ یہ تو بات غلط ہے کہ غیر مسلم کے ہاں جھوٹ بولنا قرآن کی رو سے اس قدر بڑا جرم ہو۔ فریب دینا اتنا بڑا جرم ہو اور مسلمان وہی کچھ کریں تو ان کے ہاں یہ چیز جرم ہی نہیں بلکہ یہ چیز بڑی CREDITABLE قرار پا جائے۔ قرآن نے تو کہیں یہ کچھ نہیں کہا۔ جرم کے اعتبار سے تو مسلم اور غیر مسلم میں قطعاً کوئی تمیز نہیں ہے۔ اتنی بڑی چیز آپ سمجھ سکتے ہیں کہ غیر مسلموں کے متعلق، جنہیں آپ منافق کہتے ہیں حالانکہ منافق وہ ہے کہ جو اپنے آپ کو مسلمان کہتا ہے۔ جو مسلمان کہتا ہی نہیں ہے وہ تو کفار کے زمرے میں آ گیا۔ یہ تو دوسری کیٹگری ہے جو میں نے عرض کیا ہے۔ مومن، کفار اور ایک تیسری کیٹگری کہ جو کہتے تو یہ ہیں کہ ہم ایمان لائے لیکن وَ مَا هُمْ بِمُؤْمِنِيْنَ (2:8) دل سے وہ ایمان دار نہیں ہوتے۔ تمہارے ساتھ دوست داری کے تعلقات ظاہر کرتے ہیں لیکن دل میں تمہارے خلاف دشمنی کے تعلقات رکھتے ہیں۔ یہی تو وہ تیسرا گروہ ہے۔ ان کے متعلق قرآن نے یہ کہہ دیا اور اس باب میں اتنی وضاحت سے کام لیا ہے کہ اس میں کسی قسم کا ابہام یا التباس ہی نہیں ہے، کسی قسم کی گنجائش ہی نہیں ہے۔ یوں تو قرآن کی کسی آیت میں بھی نہیں لیکن بعض چیزیں جو شدید تریں ہوتی ہیں، ان کے متعلق اتنی وضاحت سے قرآن بیان کرتا چلا جاتا ہے کہ ان الفاظ میں بھی کسی قسم کی کوئی شک وشبہ کی گنجائش نہیں رہتی۔ اس کیٹگری کے متعلق قرآن نے بتایا کہ وہ کیا کرتے ہیں؟ چار لفظوں میں اس نے بات بتا دی کہ وَ لِيَعْلَمَ الَّذِيْنَ نَافَقُوْا ((3:167 یہاں بات پیچھے سے منافقت کے متعلق چلی آتی ہے کہ یہ منافق کون ہیں؟ کہا کہ يَقُوْلُوْنَ بِاَفْوَاهِهِمْ مَّا لَيْسَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ ((3:167 یہ وہ لوگ ہیں کہ اپنی زبانوں سے وہ بات کہتے ہیں جو ان کے دل میں نہیں ہوتی۔ قرآن کی رو سے یہ منافق کی DEFINITION ہے کہ زبان سے وہ بات کہتے ہیں جو ان کے دل میں نہیں ہوتی۔ اب اگر آپ شعار یہ بناتے ہیں کہ دل

سے کسی کے خلاف دشمنی کے تعلقات رکھتے ہیں اور ظاہرداری میں آپ اس کے دوست بنے رہتے ہیں تو آپ کو توصبح سے شام تک وہ باتیں کہنی پڑیں گی جو آپ کے دل میں نہیں ہیں۔ یہ تو یہی چیز ہے جس کے متعلق قرآن یہ کہہ رہا ہے کہ یہ شدید ترین جرم ہے۔

شدید ترین عذاب کافر کے لیے نہیں بلکہ وہ تو منافق کے لیے ہے

عزیزانِ من! یہ وہ جرم ہے کہ قرآن نے جہنم کے درکِ اسفل میں' سب سے نچلے درجے کے اندر منافق کو رکھا ہے۔ کافر کو نہیں رکھا۔ بات دوسری طرف چلی جائے گی۔ وہ مرنے کے بعد کا جو جہنم ہے اس کو تو چھوڑ دیجیے۔ اِس زندگی کے اندر جس جہنم میں یہ شخص رہتا ہے اس جہنم کے متعلق کہا کہ نَارُ اللّٰہِ الْمُوْقَدَۃُ۔ الَّتِیْ تَطَّلِعُ عَلَی الْاَفْئِدَۃِ (104:6-7) وہ اللہ کی آگ جو دلوں کو لپیٹ لیا کرتی ہے۔ اس قسم کا طرزِ زندگی رکھنے والے کا دل تو ہر وقت آگ کے شعلوں کے اندر رہتا ہے' کبھی سکون اور اطمینان حاصل نہیں ہوسکتا۔ دل میں کسی کے خلاف دشمنی' عداوت' انتقام' کے جذبات ہوں اور ظاہرداری میں اس کے ساتھ دوستانہ تعلقات ہوں۔ تو اس DUAL PERSONALITY کو نبھانے کے لیے جو کچھ اسے کرنا پڑتا ہے وہ جہنم نہیں تو اور کیا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ کوئی بالکل حیوانی سطح کے اوپر چلا جائے کہ اس چیز کا احساس ہی مٹ جائے ورنہ اگر انسانیت کا احساس باقی ہے تو اس روش کو نبھانے کے لیے جو کچھ کرنا پڑتا ہوگا' آپ سوچ سکتے ہیں کہ وہ کتنا بڑا جہنم ہے۔ یہ DEFINITION ہے۔ قرآن نے ایک اور مقام پہ بڑی عجیب بات کی۔ جسے ہم جھوٹ کہتے ہیں وہ قرآنِ کریم کی رو سے سنگین ترین جرم ہے۔ یہ ساری برائیوں کی بنیاد ہے۔ جھوٹ کی DEFINITION کیا ہے؟ ایک چیز تو مثلاً یہ ہے کہ کوئی شخص آ کر کہتا ہے کہ میں نے سڑک پہ ایک سو آدمی کا ہجوم دیکھا۔ تحقیقات کے بعد معلوم ہوا کہ نہیں! وہاں تو کوئی دس آدمی تھے۔ یہ بھی جھوٹ ہے۔ یہ غلط بیانی ہے۔ اس کے لیے ایک تو یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اسے علم نہ ہو' کہیں سے بات سنی ہو' اندازہ غلط لگا لیا ہو۔ یعنی وہ اس ہجوم کو سمجھتا ہی یہ ہو کہ وہ واقعی سو تھے اور وہ اتنے نہ ہوں تو اس کی یہ وجوہات ہوسکتی ہیں۔ جہاں تک عدمِ علم کا تعلق ہے اس کے لیے تو قرآنِ کریم نے دوسری جگہ کہہ دیا کہ لَا تَقْفُ مَا لَیْسَ لَکَ بِہٖ عِلْمٌ (17:36) جس چیز کے متعلق تمہیں ذاتی طور پر علم نہ ہو' اس کے پیچھے نہ لگو۔ لیکن عدمِ علم کی بنا پر بھی آپ ایک چیز غلط کہہ سکتے ہیں' قیاس اور اندازہ بھی غلط ہوسکتا ہے۔ اسے بھی کہا جائے گا کہ یہ بات جھوٹی ہے۔

قرآنِ حکیم نے کذب کے سلسلہ میں تو ایک سورۃ کا نام ہی منافقون رکھا ہے 478آلِ عمران

دیکھیے! قرآن کذب کس کو کہتا ہے؟ عزیزانِ من! یہ اتنی بنیادی چیز ہے کہ اس کی رو سے بات صاف ہو جاتی ہے۔ کذب کیا ہے؟ اِذَا جَآئَکَ الْمُنٰفِقُوْنَ ((63:1 اس سورۃ کا نام ہی سورۃ منافقون ہے۔ بات یہاں سے شروع ہوئی ہے کہ اے رسول! تیرے پاس یہ منافق آتے ہیں۔ غور فرمایئے گا! بڑی اہم آیت ہے اور ایک بڑا بنیادی مسئلہ اس نے حل کر کے رکھ دیا کہ کذب یا جھوٹ کسے کہتے ہیں۔ تیرے پاس یہ منافق آتے ہیں قَالُوْا نَشْهَدُ اِنَّکَ لَرَسُوْلُ اللّٰہِ((63:1 کہتے ہیں کہ ہم شہادت دیتے ہیں اس بات کی کہ تو خدا کا رسول ہے۔ سوچیے کہ اس سے بڑی سچی بات بھی دنیا میں کوئی اور ہو سکتی تھی کہ ایک شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے آ کر یہ کہتا ہے کہ میں شہادت دیتا ہوں کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اللہ کے رسول ہیں۔ اس شہادت سے ہی تو ایک غیر مسلم مسلمان ہوتا ہے۔ ایک کافر کو مسلمان کرنا ہو تو پہلی چیز اس سے یہ شہادت لی جاتی ہے اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلاَّ اللّٰہُ وَ اَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ وہ آ کر کہتے ہے کہ نَشْهَدُ اِنَّکَ لَرَسُوْلُ اللّٰہِ((63:1 ہم شہادت دیتے ہیں اِنَّکَ لَرَسُوْلُ اللّٰہِ (63:1)۔ عربی جاننے والے جانتے ہیں کہ اس کے اندر کتنا زور ہے! ہم شہادت دیتے ہیں کہ یقیناً یہ قطعی حتمی بالتحقیق بات ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اللہ کے رسول ہیں۔ اس پہ تو شاباش ملنی چاہیے' آفرین کہنا چاہیے کہ کتنی سچی بات کہی۔ سنیے آگے! انہوں نے بات جو کہی ہے اس کے متعلق کہا جاتا ہے وَاللّٰہُ یَعْلَمُ اِنَّکَ لَرَسُوْلُهٗ((63:1 خدا بھی یہ جانتا ہے کہ تو یقیناً خدا کا رسول ہے۔ اس سے بڑی کیا چیز ہے جو کچھ یہ آ کر کہہ رہے ہیں' اس کی تائید خدا خود کر رہا ہے۔ لوگ' انسان' تو ایک طرف خدا خود کہتا ہے کہ یہ بات بالکل ٹھیک ہے۔ عزیزانِ من! سوچیے کہ اس سے بڑی سچی بات بھی کوئی اور ہو سکتی ہے جس کی کیفیت یہ ہو کہ وہ یہ شہادت دیں اور خدا اس شہادت کی تائید کرے۔ کہا کہ وَاللّٰہُ یَعْلَمُ اِنَّکَ لَرَسُوْلُهٗ (63:1) اللہ جانتا ہے کہ تو اس کا رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہے وَاللّٰہُ یَشْهَدُ ((63:1 لیکن خدا اس کی شہادت دیتا ہے کہ اِنَّ الْمُنٰفِقِیْنَ لَکٰذِبُوْنَ((63:1 یہ جھوٹ بولتے ہیں۔ کیا عجیب چیز ہے صاحب! جو وہ کہہ رہے ہیں اس کی تائید خود خدا کر رہا ہے کہ ان کا بیان بالکل ٹھیک ہے۔ دنیا کی ہر عدالت اس کی STATEMENT کو سچا قرار دے گی۔ وہ کہے گی اس سے محکم اور کوئی STATEMENT نہیں ہے اس لیے کہ مدعی خود اس کی تائید کر رہا ہے کہ بالکل ٹھیک ہے جو انہوں نے کہا ہے۔ وہاں نَشْهَدُ تھا کہ یہ اس چیز کی شہادت دیتے ہیں اور قرآن کہتا ہے کہ اللہ جانتا ہے جو کچھ یہ کہتے ہیں یہ بالکل ٹھیک ہے۔ اور اس کے بعد قرآن کہہ رہا ہے کہ وَاللّٰہُ یَشْهَدُ اِنَّ الْمُنٰفِقِیْنَ لَکٰذِبُوْنَ (63:1)۔ دیکھیے! وہاں انہوں نے کہا تھا لَرَسُوْلُ اللّٰہِ (63:1) انہی لفظوں میں کاٹ رہا ہے کہ خدا شہادت دیتا ہے

کہ یقیناً حتمی طور پہ یہ لوگ بالکل جھوٹے ہیں۔

منافق اپنے دل میں چھپی باتوں کی حفاظت کے لیے قسموں کو ڈھال بناتا ہے

عزیزانِ من! یہ جھوٹ کیا تھا؟ جھوٹ یہ تھا کہ اِتَّخَذُوْٓا اَيْمَانَهُمْ جُنَّةً (63:2) یہ اپنی قسموں کو سپر بناتے ہیں' اپنے دل میں جو چھپا ہوا ہے اس کی حفاظت کے لیے قسموں کو ڈھال بناتے ہیں۔تو آپ دیکھیے اس کے بعد کوئی گنجائش اس میں رہ جاتی ہے کہ قرآن کی رو سے کاذب کون ہے' کذب کسے کہتے ہیں' منافقت کیا ہوتی ہے۔کتنا سنگین جرم ہے۔رسالتِ محمد یہ ﷺ کی شہادت دیتے ہیں' خدا تائید کرتا ہے اور کہتا ہے کہ یہ بالکل جھوٹے ہیں۔کیوں جھوٹے ہیں؟ اس لیے کہ یہ يَقُوْلُوْنَ بِاَفْوَاهِهِمْ مَّا لَيْسَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ (3:167) زبان سے وہ بات کہتے ہیں جو ان کے دل میں نہیں ہے۔تو قرآن کی رو سے غلط بیانی میں اور جھوٹ میں بڑا فرق ہو گیا۔جھوٹ وہ ہے جس میں زبان اور دل ہم آہنگ نہ ہوں۔اور یہی منافقت ہے۔دل اور زبان کا ہم آہنگ ہونا سچائی ہے۔جیسا کہ میں نے عرض کیا ہے کہ یہ ہوسکتا ہے کہ ایک شخص ناواقفیت کی بنا پر کسی بات کو سچا سمجھتا ہو اور اسے اسی طرح سے سچا سمجھ کر دوسروں کے سامنے بیان کر رہا ہو۔غلط بات ہو لیکن اسے جھوٹا نہیں کہا جائے گا۔یہ کہا جائے گا کہ اس کو اس کا علم نہیں تھا' بات جھوٹی ہے۔یہ جھوٹا نہیں ہے اس لیے کہ اس کا دل اور زبان ہم آہنگ ہے۔یہ چیز بھی غلط ہے۔جیسا میں نے عرض کیا ہے قرآن اس کے متعلق تاکید کرتا ہے کہ ایسا نہ کرو۔زبان پہ بات نہ لاؤ جس کے متعلق تمہیں علم نہ ہو کہ صحیح ہے۔لیکن اگر کبھی ایسا ہوتا ہے تو یہ بات کذب کے اندر نہیں آتی' جہالت کے اندر آجائے گی۔لیکن جہاں صورت یہ ہو کہ دل میں کچھ اور ہے' زبان پہ کچھ اور آرہا ہے اور وہ زبان سے جو کہہ رہا ہے' بالکل سچی بات کہہ رہا ہے۔قرآن اسے جھوٹا کہتا ہے' اسے کذب قرار دیتا ہے۔یہ کاذب ہے اس لیے کہ یہ منافق ہے۔قرآن کی رو سے سچے کی DEFINITION یہ آگئی کہ وہ پہلے کسی بات کے متعلق تحقیق کرے' علم کی بنیادوں پہ کسی نتیجے پہ پہنچے اور پھر اس کا دل اور زبان دونوں ہم آہنگ ہوں۔اور یہ وہ چیز ہے کہ مومن کا شعار پھر یہ ہے کہ 'بر؟؟؟؟ گفت بہ منبر نہ تواں گفت' جس بات کو دل سچا مانتا ہے اسے کہنے کے لیے اس کو دنیا میں کسی کا خوف مانع نہ ہو۔

ہزار خوف ہو لیکن زباں ہو دل کی رفیق
یہی رہا ہے ازل سے قلندروں کا طریق

فرعون کے دربار میں حق کی اذان بلند کرنے والوں کی حیثیت

قرآن میں یہ جو اس قسم کے واقعات ہیں کہ جو دل میں ہے وہ زبان پہ لا رہا ہے۔ تو آپ دیکھیے کہ یہ اس قسم کے مومنین کی جماعت کا تو چھوڑیے دربارِ فرعون کے ساحرین کا قصہ قرآن بیان کرتا ہے۔ وہ کفر کی حالت میں آ رہے ہیں' ایک صداقت کا نشان دیکھتے ہیں اور اس کے سامنے ان کا دل جھک جاتا ہے۔ آپ دیکھیے مرحلہ کیا ہے؟ قرآن جو واقعات بھی بیان کرتا ہے یہ EXTREME کے ہوتے ہیں جن کو لاتا ہے۔ اتنے بڑے دشمن کے ساتھ فرعون کا مقابلہ ہے۔ اس کے لیے وہ اتنا اہتمام کر رہا ہے۔ شہروں میں ڈھنڈورا پٹوا رہا ہے' اپنے بڑے بڑے ساحرین بلوا رہا ہے' بڑے بڑے مہا پجاری آ رہے ہیں' ہامان اپنے لشکر کے ساتھ آ رہا ہے۔ فرعون کا FUTURE اس مقابلے پہ DEPEND کر رہا ہے۔ اتنے بڑے جبروت اور جلال کا مالک ہے۔ یہ آتے ہیں اور آ کر کہتے ہیں کہ آج اگر ہم یہاں کامیاب ہوئے تو ہمیں انعامات ملیں گے۔ فرعون نے کہا کہ انعام ہی نہیں ملے گا' تم بہت بڑے مقرب ہمارے بن جاؤ گے۔ ملک کے بڑے بڑے نمائندے' پورا شہر شامل ہے' جشن کا دن ہے۔ آپ اس میں پندارِ نفس بھی دیکھیے کہ کتنا بڑا ہو گا۔ یہ جو بلائے جاتے ہیں' ان کے سامنے وہاں بات ہوتی ہے۔ یہ تو میں بعد میں بتاؤں گا کہ وہاں کیا ہوا اور حضرتِ موسیٰؑ نے کیا پیش کیا ہے۔ اب یہ منافق اور کافر میں فرق دیکھیے۔ ان ساحرین کے لیے کتنا نازک مقام ہے۔ TEMPTATION کتنی ہے' جاذبیت کتنی ہے' اور اس کے بعد خوف کتنا ہے۔ فرعون۔ ایسے مقام پہ فرعون کے لیے شکست کا باعث بنتا۔ اور جب وہ دیکھتے ہیں کہ نہیں! صداقت موسیٰؑ کی طرف ہے تو وہیں بھرے دربار میں' اس جلسے کے اندر کہہ دیتے ہیں کہ اٰمَنَّا ہم ایمان لائے موسیٰؑ کے رب کے اوپر۔ آپ سوچتے ہیں کہ فرعون کا غصہ حدود فراموش ہوا تو وہ بپھرے ہوئے طوفان کی طرح گرجا' کیا کہا تم نے؟ ایمان لے آئے ہو تم؟ تم دیکھو میں کیا کرتا ہوں؟ سولی پہ الٹا لٹکوا دوں گا' ہاتھ پاؤں کٹوا دوں گا' کھال کھنچوا دوں گا۔ جو کچھ بھی ہو سکتا ہے کروں گا۔ گرج کر کہا۔ اور یہ ظاہر ہے کہ فرعون کو پھر اس کے بعد کسی قسم کی FORMALITIES تو پوری کرنی نہیں تھیں۔ اس کا تو حکم تھا اور اسی وقت یہ کچھ ہو جانا تھا۔ انہیں پتا تھا یہ کیا کہہ رہا ہے اور کیا ہو گا؟

فرعون کی دربار میں کفار کا ایک منٹ کا سچ قرآنِ حکیم میں حیاتِ جاوید سے ہم کنار ہو گیا

عزیزانِ من! اندازہ لگایے۔ کیونکہ کھلے ہوئے کافر تھے جب اقرار کیا ہے تو کھلے ہوئے مومن ہوئے ہیں۔ انہوں نے کہا ہے کہ اے فرعون! تو جو فیصلہ کرنا چاہتا ہے کر لے۔ آگے بات ہے کہ تیرا فیصلہ صرف اس طبعی زندگی تک ہے' اس سے آگے تیرا

فیصلہ چل ہی نہیں سکتا۔ اور اس کی ہمیں اب کوئی پرواہ نہیں ہے۔ سچ کے مقابلے میں، جان کوئی شے نہیں ہوتی۔ ان کفار کے ایک 478 **آلِ عمران** منٹ کے ایمان کو قرآنِ کریم اپنی دفتین میں محفوظ رکھ کر ان کو حیاتِ جاوید عطا کر دیتا ہے۔ ان کا حق تھا کہ حیاتِ جاوید عطا کی جائے۔ عزیزانِ من! انسانیت تو انہیں نفوس کے دم پر قائم ہوئی ہے کہ ایسے ایسے آزمائش کے مقام کے اوپر جن کی دل اور زبان کے ساتھ رفاقت اور ہم آہنگی قائم رہی۔ میں کہہ رہا ہوں ان ساحرین کا ایک فقرہ کہ جو تو فیصلہ کرنا چاہتا ہے کر لے، تیرا فیصلہ صرف ہماری طبعی زندگی تک ہے۔ اور زندگی صرف طبعی زندگی کا نام نہیں ہے یہ تو بہت آگے چلتی ہے۔ اس تک تیری دسترس ہی نہیں ہو سکتی۔ اس واسطے تیرا فیصلہ ہمیں کیسے ڈرا سکتا ہے۔ میں کہہ یہ رہا ہوں کہ قرآنِ کریم میں آپ دیکھیے گا کتنی عظمتوں سے یہ قصے بیان ہوئے ہیں۔ اس سے زیادہ خوف کا مقام بھی کوئی ہو سکتا ہے۔ اگر یہ مسلک ہو جو ابھی ابھی میں نے بیان کیا ہے یہ جو لوگ اس آیت کا بیان کرتے ہیں اور پھر اس کو بہت بڑا مومنانہ شعار قرار دیا جائے تو پھر تو ان کے خلاف ہمیں کچھ کہنا چاہیے یہ جو ساحرین تھے کہ انہوں نے ایسے وقت میں کیا کیا ہے۔ انہیں یہ کرنا چاہیے تھا۔ خود خدا کے خلاف یہ بات کہنی چاہیے تھی کہ جنہوں نے اپنی جان کو جوکھوں میں ڈال لیا، اللہ تعالیٰ ان کی اتنی تعریف و توصیف بیان کر رہا ہے، ان کے اوپر قرآن تحسین و آفرین کے ڈونگرے برسا رہا ہے۔ وہاں ہم آئیں گے تو آپ دیکھیں گے کہ قرآن نے ان کے لیے کیا الفاظ استعمال کیے ہیں۔ قرآن یہ تعلیم دیتا ہے۔ اور وہ تو تعلیم ہی یہ ہے کہ اس کے نزدیک DUAL PERSONALITIES بدترین چیز ہے۔ DUAL PERSONALITY (ثنویت) کو بدترین جرم بتاتا ہے۔ وہ تو کرتا ہی یہ ہے کہ آپ کی PERSONALITY (ذات) کی کیفیت یہ ہو جائے کہ

گھر میں آپ گھر کے سوا کچھ اور نہیں

قرآنِ حکیم کے الفاظ میں حضرت ابراہیمؑ کے اسوۂ حسنہ کی صداقت کی گواہی

صداقت اور صداقت۔ اور یہی وہ صداقت ہے جس کے لیے اس نے حضرتِ ابراہیمؑ اور ان کے ساتھیوں کی زندگی کو اسوۂ حسنہ قرار دیا ہے۔ کس مقام پہ یہ اسوہ قرار دیا ہے جہاں کہا کہ قَدْ كَانَتْ لَكُمْ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ فِيْۤ اِبْرٰهِيْمَ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗ (60:4) تمہارے لیے ان کے ساتھیوں کی زندگی بہترین ماڈل ہے۔ کیا تھا وہ واقعہ، کیا تھی وہ زندگی، کیا تھا شعار، کیا تھا ان کا مسلک؟ یہ کہ اِذْ قَالُوْا لِقَوْمِهِمْ اِنَّا بُرَءٰٓؤُا مِنْكُمْ وَمِمَّا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ (60:4) ہم تم سے اور تمہارے معبودانِ باطل سے بری الذمہ ہیں، متنفر ہیں، ہم ان سے کوئی تعلق نہیں رکھتے۔ یہ قَدْ دیکھیے کتنے زور کا یہاں آیا ہوا ہے۔ سنیے الفاظ! یہ اسوۂ حسنہ ہے

کہ کَفَرۡنَا بِکُمۡ (60:4) ہم تمہاری ہر بات سے' انکار کرتے ہیں' قطعِ تعلق ہے۔ اور آگے دیکھیے جو لفظ قرآن استعمال کرتا ہے۔ یہ ہے وہ چیز وَبَدَا بَیۡنَنَا وَبَیۡنَکُمُ الۡعَدَاوَۃُ وَالۡبَغۡضَآءُ اَبَدًا (60:4) تمہارے اور ہمارے درمیان درمیان ہمیشہ کے لیے کھلی ہوئی دشمنی' کھلی ہوئی عداوت ظاہر ہوگئی۔ زبان کے صرف الفاظ نہیں' الفاظ یہ ہیں کہ ہمارے متعلق کسی شبہ میں نہ رہنا۔ ہم اس کا اعلان کرتے ہیں کہ وَبَدَا بَیۡنَنَا وَبَیۡنَکُمُ الۡعَدَاوَۃُ وَالۡبَغۡضَآءُ اَبَدًا (60:4) تمہارے اور ہمارے درمیان کھلی ہوئی' ابھری ہوئی' نکھری ہوئی' عداوت ہے ہمیشہ کے لیے حَتّٰی تُؤۡمِنُوۡا بِاللّٰہِ (60:4) تا آنکہ تم بھی اس خدا پہ ایمان نہ لے آؤ۔

قرآنِ حکیم میں حضرت ابراہیمؑ کو صادق کی بجائے صدیق کے لفظ سے نوازا گیا ہے

عزیزانِ من! یہ اسوۂ حسنہ قرآن قرار دے رہا ہے۔ پہلے بات شروع کی ہے کہ قَدۡ کَانَتۡ لَکُمۡ اس کے بعد پھر کہا کہ لَقَدۡ کَانَ لَکُمۡ فِیۡہِمۡ اُسۡوَۃٌ حَسَنَۃٌ (60:6) یہ ہیں وہ لوگ جو تمہارے لیے ماڈل بننے چاہئیں جن کی یہ زندگی ہے۔ عزیزانِ من! آپ نے غور فرمایا۔ لیکن اس بدبختی کا کیا علاج کہ یہی ابراہیمؑ جن کے متعلق قرآن یہ کہہ رہا ہے اور جن کے متعلق دوسرے مقام پہ ہے اِنَّہٗ کَانَ صِدِّیۡقًا نَّبِیًّا (19:41) یہ صدیق نبی تھا۔ صادق بھی نہیں کہا بلکہ صدیق کہا کہ ہمیشہ سچ بولنے والا۔ عزیزانِ من! اگر رسول بھی سچ نہ بولے گا تو اس آسمان کے نیچے ہم سچ کو تلاش کرنے اور کہاں جائیں گے۔ رسول کے دعوئٰ رسالت کی تو پہلی دلیل ہی یہ ہوتی ہے کہ وہ سچ بولتا ہے۔ وہ ایسی بات کہتا ہے جس کا اس وقت کوئی محسوس ثبوت ہوتا ہی نہیں ہے۔ کہتا ہے کہ یہ جو میں کہہ رہا ہوں یہ میرے اپنی فکر کی تخلیق نہیں ہے۔ میں اپنی طرف سے یہ نہیں کہہ رہا بلکہ خدا کی طرف سے مجھے یہ علم ملا ہے۔ اور جو علم خدا کی طرف سے ملنے والا ہے اور جو علم لانے والا ہے' وہ کسی کے سامنے نہیں ہوتا۔ یہ اور بات ہے کہ اس کے بعد جو کچھ وہ کہہ رہا ہے' اس کو ہم آن میرٹ پرکھیں۔

نبی اپنی نبوت کے ثبوت میں اپنے صدیق ہونے کا دعوئٰ پیش کرتا ہے جبکہ وضعی روایات اس کے برعکس ہیں

پہلی بات جو رسول کہتا ہے اس کا تو اس کے پاس ثبوت کوئی نہیں ہوتا۔ کوئی مرئی' محسوس' VISIBLE ' ثبوت نہیں ہوتا۔ جب اس سے کہا جاتا ہے کہ اس کا ثبوت کیا ہے؟ تو وہ اپنے ثبوت میں یہ کہتا ہے کہ فَقَدۡ لَبِثۡتُ فِیۡکُمۡ عُمُرًا مِّنۡ قَبۡلِہٖ ؕ اَفَلَا

تَعۡقِلُوۡنَ (10:16) میں کہیں باہر سے آیا ہوا نہیں ہوں، میں نے اپنی ساری عمر تمہارے اندر بسر کی ہے۔ یہ اس چیز کا ثبوت ہے کہ تمہارا کیا اندازہ ہے کہ اس قسم کی زندگی بسر کرنے والا جھوٹ بولتا ہے؟ اور مخالفین میں سے ایک شخص بھی یہ نہیں کہتا کہ تم جھوٹے ہو۔ رسول کے دعوائے رسالت کا پہلا ثبوت اس کی صداقت ہوتی ہے کہ وہ سچا ہوتا ہے۔ قرآن نے خاص طور پہ کہا کہ صِدِّيۡقًا نَّبِيًّا (19:41)۔ نظر آتا ہے کہ قرآن بھیجنے والے خدا کے سامنے یہ کچھ تھا کہ کیا قیامت برپا ہوگی، اس ملت کے جو نام لیوا ہیں وہ کیا کریں گے۔ اسی ابراہیمؑ کے متعلق جن کے متعلق یہ کہا کہ ان کا اسوۂ حسنہ یہ تھا۔ ان کے متعلق آپ کے ہاں بخاری شریف میں یہ روایت لکھی ہوئی ہے کہ حضرتِ ابراہیمؑ نے تین مرتبہ جھوٹ بولا (معاذ اللہ معاذ اللہ)۔ اور جب یہ پہلی اینٹ رکھ دی گئی تو پھر اس کے اوپر تو آپ سوچ سکتے ہیں، کتنی بڑی عمارت استوار ہوگی۔ اتنا بڑا اولوا العزم خدا کا نبی بھی اگر جھوٹ بول سکتا ہے تو پھر یہ جو ہما شُما ہیں، ان کے لیے تو پھر پھاٹک کھل جاتا ہے۔ جھوٹ بولا۔ اب اس کے لیے جب پوچھا گیا کہ جھوٹ کیوں بولا؟ کہا کہ وہ دین کی مصلحت کے لیے تھا۔ چلیے صاحب! مصلحت کے لیے!! یہ ہمارے ہاں کے یہ جو روایت وضع کرنے والے تھے، یہ نظر آتا ہے کہ یہ ذہنی طور پہ کچھ اونچے لوگ نہیں تھے۔ اسی بخاری میں یہاں یہ کہا کہ دین کی مصلحت کے لیے جھوٹ تھا تو گویا اس کے معنی یہ کوئی جرم کی بات نہیں تھی بلکہ یہ تو دین کی خاطر آپؑ نے یہ کیا تھا۔ اس واسطے یہ بہت اونچی بات ہوگئی۔ اسی میں آگے چل کر یہ ہے کہ قیامت میں یہ امتِ محمد یہ ﷺ، گناہ گار لوگ بلکہ وہ سارے نبیوں کے پاس اِدھر اُدھر پھرتے چلے جائیں گے کہ ہماری سفارش کرو، ہماری سفارش کرو۔ یہ بڑی لمبی داستان ہے۔ حضرتِ آدم کے پاس جائیں گے تو وہ کہیں گے کہ بابا! میں نے خدا کی معصیت کی تھی۔ مجھے تو اپنے متعلق ہی ڈر نظر آتا ہے، میں تمہاری سفارش کیا کروں گا۔ ''کوئی سفارش کرن والا ملے تے اوہنوں کہناں میری وی کرنال''۔ وہ فلاں نبی کے پاس گئے ''اوہنے کہیا میں تے ایس طراں، فلاں نبی کے پاس گئے اس نے یہ کہا''۔ حضرتِ ابراہیمؑ کے پاس پہنچے۔ آپ ملاحظہ فرمایے! حضرتِ ابراہیمؑ کا تذکرہ تو میں نے کہا ہے کہ اس سے بڑی چیز کیا ہوگی کہ اسوۂ حسنہ یا تو حضورِ خاتم النبیین ﷺ کی زندگی کے متعلق ہے اور ایک ہی دوسری شخصیت ہے جس کے متعلق قرآن نے یوں برملا کہا ہے کہ اس کی زندگی تمہارے لیے اسوۂ حسنہ ہے۔ اس کے متعلق کہا کہ جھوٹ بولا۔ جب اعتراض پڑا تو کہا کہ نہیں! دین کی مصلحت کی خاطر جھوٹ بولا تھا تو یہ بہت بڑی چیز ہوئی۔ اور وہاں یہ لکھا ہے کہ جب ان کے پاس جائیں گے تو وہ کہیں گے کہ صاحب! مجھے تو خدا کے ہاں جانے سے ندامت آتی ہے، میں نے جھوٹ بولا تھا۔ جس جھوٹ سے انہیں اتنی بڑی ندامت ہو رہی ہے کہ وہ خدا کے سامنے نہیں جا رہے تو انہیں تو دھڑلے سے جانا چاہیے تھا کہ میں نے تیرے دین کی خاطر جھوٹ تک بول دیا

''سٹ پیسے''۔عزیزانِ من! ذرا سوچیے میں نے جو کہا ہے کہ یہ INTELLECTUALLY بھی یہ کچھ نہیں ہے۔ان کے 478 آلِ عمران
مقابلے میں جب ہم یہودیوں کے وہ افترا کرنے والے دیکھتے ہیں، وہ ایک جھوٹ کی خاطر ان مقامات کو دیکھ لیتے ہیں کہ یہاں زد پڑے گی۔انہوں نے ہزار برس پہلے دیکھ لیا کہ کسی وقت ہمیں یہ جو مقام جہاں انہوں نے یہ مسجد بنالی ہے اس کے اوپر دعویٰ کرنا پڑے گا ہزار سال پہلے ان کی دوررس نگاہوں نے ان کے مقتدیوں کی دوررس نگاہوں نے آپ کی کتابوں کے اندر یہ داخل کر دیا کہ یہاں اسلام سے پیشتر ایک مسجد موجود تھی جس میں تمہارے رسول نے آکر نماز پڑھی تھی۔میں کہہ یہ رہا تھا کہ یہ جھوٹ بولنا بھی ایک بڑا فن ہے۔وہ یہاں تک جھوٹ سے کام لیتے ہیں۔آپ کی قوم پھنسی ہوئی ہے کہ کبھی یہ کہہ رہے ہیں کہ وہاں کچھ نہیں تھا۔ کہتے ہیں اگر وہاں کچھ نہیں تھا تو یہ سارا کچھ آپ کے ہاں کہاں سے آ گیا۔

حضرت ابراہیمؑ کے سلسلہ میں اپنی خفت سے بچنے کے لیے ایک وکیلانہ حربہ

میں کہہ یہ رہا تھا کہ اس کے لیے بھی ایک ضرورت ہے۔کہا یہ کہ حضرتِ ابراہیمؑ نے تین مرتبہ جھوٹ بولا تھا۔حضرتِ ابراہیمؑ کو وکیلانہ حربے سے یہ کہہ کر بچا لیا کہ صاحب! دین کی حفاظت کے لیے مصلحتاً جھوٹ بولا تھا۔تو دین کی حفاظت میں جو کچھ کیا جائے گا وہ تو بڑا CREDITABLE ہوگا۔وہاں وہ چیز یاد نہیں رہی اور کہہ رہے ہیں کہ صاحب! وہ وہاں بیٹھے ہوں گے وہ کہیں گے میں تو نہیں جاتا مجھے تو شرم آتی ہے میں نے تو جھوٹ بولا تھا (معاذ اللہ معاذ اللہ)۔کیوں یہ روایت گھڑی؟ اس لیے کہ آج کے زمانے، اور آج نہیں جہاں جہاں بھی پھر ان جھوٹ بولنے والوں کو ضرورت پڑی کہ اپنے جھوٹ کے لیے کوئی سند قرار دیں، جسے میکیاوَلی سیاست کہتے ہیں اس کے لیے آج یہ آپ کے ہاں فتویٰ مل گیا کہ سچ بولنا اسلام کی رو سے بہت بڑا کریڈٹ کا کام ہے لیکن زندگی کی عملی ضروریات کے بعض تقاضے ایسے ہو جاتے ہیں جس میں نہ صرف جھوٹ بولنے کی اجازت ہے بلکہ جھوٹ بولنا واجب ہو جاتا ہے۔آپ کو پتہ ہے واجب کیا ہوتا ہے؟ فرض سے ذرا نیچے ہوتا ہے یعنی واجب کا ترک کرنے والا گناہ گار ہوتا ہے۔جہاں کوئی چیز کسی پہ واجب ہو جائے یعنی ''واجب'' لفظ سے ہی آپ جانتے ہیں کہ جو چیز واجب ہو جائے اس واجب کو اگر اس وقت نہ کیا جائے تو وہ معصیت ہوتی ہے۔تو جھوٹ بولنا اگر واجب ہو جاتا ہے تو ایسے مقام پہ سچ بولنا گناہ ہے۔

مئی 1958ء کے ترجمان القرآن کے مطابق اہم تقاضوں کے تحت جھوٹ بولنا واجب ہو جاتا ہے

اب آپ دیکھیے جب یہ فتویٰ ہو کہ زندگی کے اہم تقاضوں کے لیے جھوٹ بولنا واجب ہو جاتا ہے۔اور اس قسم کی پارٹی آپ کے دین کی اقامت کے لیے اٹھے۔یہ مودودی صاحب کا فتویٰ ہے مئی 1958ء کے ترجمان القرآن کے اندر نہایت جلی طور لکھا ہوا

ہے۔اب جن لوگوں سے یہ کہا جائے کہ زندگی کے اہم تقاضوں کے لیے جھوٹ بولنا جائز ہی نہیں' واجب ہوجاتا ہے تو پھر اب کیا 478 آلِ عمران
ہوگا؟ یہی جو کچھ ہورہا ہے۔روز اخباروں میں یہ نکلتا ہے کہ صاحب! ہمارے خلاف جھوٹ بول رہے ہیں' الزام تراشی ہورہی ہے' ہم نے کبھی نہیں کیا' ہم نے یہ کبھی نہیں کہا' کچھ نہیں ہوا۔یعنی ذرا سی بھی ان کے ضمیر میں خلش تک نہیں پیدا ہوتی۔اس لیے نہیں ہوتی کیونکہ وہ تو اس کے بعد خوش ہوتے ہوں گے کہ ہم نے تو ایک واجب کی تعمیل کی ہے۔الحمد للہ علیٰ ذٰلک کہ ترکِ وجوب ہم سے سرزد نہیں ہوا۔تو جب جھوٹ بولنے کے اوپر انسان اپنے آپ کو نیکوکار اور متقی سمجھنے لگ جائے تو آپ پھر سمجھ سکتے ہیں کہ اس کے بعد پھر انسانیت کا حشر کیا ہوگا۔وہ ایک چیز جو چلی آرہی تھی اس کی حقیقت کچھ بھی تھی۔جسے ضمیر کی آواز کہا کرتے تھے۔ضمیر کی آواز کے معنی یہ ہیں کہ جس چیز کو آپ برا سمجھتے ہیں اس کو اگر کبھی آپ کرنے لگیں تو کوئی چیز کہتی ہے کہ یہ بری چیز ہے۔اور جسے آپ برا ہی نہ سمجھیں بلکہ کہیں کہ ایسے وقت میں جھوٹ بولنا مجھ پہ واجب ہوگیا ہے تو آپ کے اندر سے کوئی آواز ہی نہیں اٹھے گی۔''اوجنوں کیندے نیں کرک نئیں آئے گی تہانوں ایس چیز اُتے''(وہ جسے کہتے ہیں کہ تمہیں اس چیز پر منہ میں رڑک تک نہیں محسوس ہوگی)۔آپ اس چیز پہ فخر کرتے پھریں گے۔اپنی پارٹیوں کے اندر جاکر تو پوچھو نہیں کہ کتنا فخر کریں گے کہ میں نے یوں دھوکا دیا۔اور پھر حضرتِ ابراہیمؑ کے یہ تین جھوٹ اور دھوکا دہی۔عزیزانِ من! جگر پھٹ جاتا ہے جب یہ چیزیں بیان کرنی پڑتی ہیں۔کرنی پڑتی ہیں کہ

بنتی نہیں ہے مینا و ساغر کہے بغیر

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی ذاتِ اقدس کے متعلق بخاری شریف میں کعب بن اشرف کا قصہ

آپ کے سمجھ میں بات نہیں آسکتی جب تک کہا نہ جائے کہ انہوں نے اس کے بعد اپنے فریبوں کے لیے پھر کہاں تک بات پہنچائی۔حضورِ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی ذاتِ اقدس تک۔بخاری شریف میں کعب بن اشرف کی بات ہے۔یہاں سے بات شروع کرتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے صحابہؓ سے کہا کہ اس شخص کے ہاتھوں میں بڑا تنگ آ گیا ہوں۔مدینے کی زندگی جہاں اپنی مملکت قائم ہوچکی ہوئی ہے' ان یہودیوں کو جوان میں عہد شکنی کرتے ہیں بیک بینی اور دوگوش باہر نکال لیا جاتا ہے۔یعنی مملکت کی قوت اتنی ہے وہاں یہ عہد شکنیاں کرتے ہیں تو جزیرۃ العرب سے ان کو باہر نکال دیا جاتا ہے۔مدینہ میں حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم بیٹھے ہوئے صحابہؓ سے یہ کہہ رہے' ہیں کہ میں اس شخص کے ہاتھوں بڑا تنگ آ گیا ہوں' کوئی شخص جاکر اس کو قتل کرسکتا ہے۔انہوں نے کہا یہ کہ صاحب! وہ شخص تو بڑا محتاط رہتا ہے' اپنی بڑی حفاظت کرتا ہے۔کوئی صحابہؓ ایسے اٹھے جنہوں نے کہا کہ ہم کر تو سکتے ہیں لیکن آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم

ہمیں اجازت دیں کہ اس کے لیے ہمیں جو جھوٹ بولنا پڑے، جو فریب دینا پڑے، وہ ہم وہاں جا کر کر لیں۔ سنتے ہیں عزیزانِ من! جگر پہ پتھر رکھیے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کہا، اس کی اجازت ہے۔

اے محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم گر قیامت را براری سرز خاک

سر برارو ایں قیامت درمیانے خلق بیں

تیری امت تیرے متعلق یہ کچھ کہہ رہی ہے۔ اور وہ پھر اٹھے۔ اور بڑی تفصیل سے لکھا ہے۔ وہ جو اس کے ساتھ دوست داری کے تعلقات رکھتے تھے، وہ گئے۔ رات کا وقت تھا اس کو آواز دی بڑی محبت اور پیار سے باہر بلایا اور اس سے یہ چیز کہی کہ صاحب! اس شخص نے یعنی محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مدینے میں بڑا خلفشار مچایا ہوا ہے، یہ تو بڑی قیامت آ رہی ہے، اس کے خلاف کوئی تدبیر کرنی چاہیے۔ یہی ایک چیز ہو سکتی تھی اس کو ساتھ ملانے کی۔ اور اس کے ساتھ یہ کہا کہ چلو باہر کہیں جا کر خفیہ طور پہ کوئی تدبیر کریں۔ اس طرح سے اس کو گھر سے نکالا اور اس کے بعد آگے آئے۔ ایک نے کہا کہ یار! آج تمہارے بال تو بڑے اچھے بنے ہوئے ہیں، خوب کنگھی کی، اتنا خوشبودار تیل ہے۔ سونگھنے کے لیے آگے بڑھا اور اس کے بعد خنجر گھونپ دیا۔ اور پھر انعام لینے کے لیے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ہاں تشریف لے آئے اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بڑی شاباش دی۔ معاذ اللہ معاذ اللہ یا اللہ! یہ آسمان نہ کہیں پھٹ پڑے۔ اس امت کے اوپر۔ پھٹ تو پڑا ہے اور کہاں نہ پھٹ پڑے گا۔ ایک ذاتِ اقدس و اعظم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جو قیامت تک کے انسانوں کے لیے اسوۂ حسنہ قرار پاتی ہے۔ جو اپنی رسالت کے دعوے کا ثبوت یہ پیش کرتی ہے کہ میں نے تمہارے اندر اپنی زندگی بسر کی ہے تم اس سے اندازہ نہیں لگاتے کہ یہ زندگی کس کی ہو سکتی ہے؟ جس کے متعلق یہ ہے کہ بدترین دشمن ابوسفیان ہرقل کے دربار میں ان کے خلاف مدد مانگنے کے لیے گیا ہوا ہے۔ وہاں ہرقل پوچھتا ہے کہ یہ بتاؤ جس نے یہ دعویٰ کیا ہے اس کی عام زندگی کیسے گزری ہے؟ عزیزانِ من! اندازہ لگایے بدترین دشمن ہے۔ ایسے وقت میں کریکٹر یہ ہوتا ہے اور کریکٹر کی قوت یہ ہوتی ہے۔ اور پھر میں کہوں گا کہ عربوں کا کریکٹر بھی ہوا کرتا تھا۔ وہاں ابوسفیان کہتا ہے کہ صاحب! جہاں تک اس کی زندگی کا تعلق ہے، وہ تو بڑی بے داغ ہے۔ اور ہرقل کہتا ہے کہ نبی کی ایک خصوصیت یہ بھی ہوتی ہے کہ اس کی زندگی بڑی بے داغ ہوتی ہے۔ ابوسفیان یہ کہہ رہا ہے اور ہرقل یہ شہادت دیتا ہے۔ اور اس نبی کے امتی اس نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے متعلق یہ کہہ رہے ہیں۔ مشہور واقعہ ہے بڑے فخر سے آپ کو کتابوں میں ملے گا۔ اور یہ بخاری شریف کی حدیث ہے۔

قرآنِ حکیم کے مطابق مومنوں کے لیے دوست داری کا معیار اور محتاط رہنے کی تاکید [478] آلِ عمران

عزیزانِ من! مجھے اِدھر آ جانا چاہیے۔ لَا یَتَّخِذِ الْمُؤْمِنُوْنَ الْکٰفِرِیْنَ اَوْلِیَآءَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِیْنَ ((3:28 مؤمنوں کے لیے قطعاً جائز نہیں ہے کہ وہ کسی غیرِ مؤمن کے ساتھ دوست داری کے تعلقات قائم کریں۔ وَ مَنْ یَّفْعَلْ ذٰلِکَ فَلَیْسَ مِنَ اللّٰہِ فِیْ شَیْءٍ ((3:28 جو ایسا کرے گا اللہ کے ساتھ اس کا کوئی تعلق نہیں ہوگا۔ اب آیئے ان الفاظ پہ اِلَّآ اَنْ تَتَّقُوْا مِنْھُمْ تُقٰۃً ((3:28 عربی زبان جاننے والے جانتے ہیں۔ سند کسی نے لینی ہو تو علامہ؟؟؟؟ کی اتقان لے لیں اس میں ان الفاظ کے معنی لکھے ہیں۔ عربی زبان کا لغت ''لغات القرآن'' دیکھیے۔ اس الا کے ایک معنی ''بلکہ'' آتے ہیں اور یہ معنی یہاں ایسا صحیح فٹ بیٹھتا ہے کہ ان کے ساتھ دوست داری کے تعلقات مت رکھو۔ اب آگے جس کے ساتھ دوست داری کے تعلقات نہیں آگے ایک شکل یہ بھی ہوسکتی ہے کہ نہ ان کی دوستی اچھی نہ ان کی دشمنی اچھی۔ INDIFFERENT ہو جاتا ہے۔ اور یہ جتنی باقی دنیا جن کے ساتھ ہمیں تعلق نہیں ہوتا ان کے متعلق یہ ہوتا ہے کہ نہ ہمارے دوستی کے تعلقات ہیں نہ ہمارے دشمنی کے تعلقات ہیں۔ عام طور پہ آپ پوچھیں تو لوگ کہتے ہیں کہ صاحب! میرا اس کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہے۔ یہاں یہ ہوسکتا تھا کہ دوست داری کے تعلقات سے منع کیا تو اس کے یہ معنی ہوئے کہ ان کے ساتھ کوئی تعلق ہی نہ رکھو' واسطہ ہی کوئی نہ رکھو۔ الا دوست داری کے تعلقات بالکل نہ رکھو بلکہ ان سے پوری پوری حفاظت اپنی کرتے آؤ اور محتاط رہو جو محتاط رہنے کا حق ہے۔ عزیزانِ من! کس قدر صاف چیز ہے۔ کسی عربی جاننے والے سے پوچھیے تو وہ بتائے گا کہ یہ CONSTRUCTION بتا رہی ہے کہ انہیں قطعاً دوست نہ رکھو۔ آگے بات یہ کہنی تھی کہ ان کی طرف سے INDIFFERENT بھی نہ ہو جاؤ کہ چلو صاحب! لاتعلقی ہے' دوستی نہیں' دشمنی بھی نہیں' کچھ نہیں۔ کہا بالکل نہیں! بلکہ تمہیں یہ چاہیے کہ اَنْ تَتَّقُوْا مِنْھُمْ ((3:28 ان کی طرف سے پورے پورے محتاط رہو' بچ کے رہو' اپنی حفاظت کا سامان رکھو۔ تُقٰۃً ہر قسم کا سامانِ حفاظت کرو جیسا بھی ہوسکتا ہے۔

انسانوں سے ڈرنے کی بجائے خدا کے قانونِ مکافات کو سامنے رکھنے کی تاکید

اب یہاں یہ بات آ سکتی تھی کہ صاحب! اگر یہ چیز ہو جائے کہ ان کے ساتھ ہماری کھلی ہوئی دشمنی ہے تو ان سے تو ہمیں ڈر ہے خوف ہے۔ اس طرح سے ان کو اعلانیہ دشمن بنا لینے سے تو ہمیں نقصان پہنچ جانے کا خطرہ ہے۔ یہ احساس تھا۔ عزیزانِ من! دیکھیے قرآن کہتا ہے کہ وَ یُحَذِّرُکُمُ اللّٰہُ نَفْسَہٗ ((3:28 ان سے بالکل نہ ڈرو' خدا کے قانونِ مکافات سے ڈرو اور کسی سے نہ ڈرو

۔اگلی آیت بتا رہی ہے۔یعنی جس ڈر کی بنا پہ تم یہ روش اختیار کرنا چاہتے تھے کہ صاحب! اچھا ہے کہ قلبی دوستی تعلقات تو نہیں رکھے ۔478 آلِ عمران ‘بظاہر تو بنا کر رکھیں۔کیوں؟ صاحب! ان سے ڈر ہے‘ ان سے خوف ہے۔کہا کہ وَ یُحَذِّرُ کُمُ اللّٰہُ نَفْسَہٗ (3:28) وہ تعلیم یہ تمہیں دیتا ہے کہ ڈرنے کی ایک ہی صورت ہے کہ خدا کے قوانین کی معصیت سے ڈرو۔اس کے لفظی معنی یہ ہیں کہ خدا تمہیں اپنے آپ سے ڈرنے کے متعلق کہتا ہے۔اس کے معنی ڈر نہیں ہوتے۔یہاں حذر ہے یعنی احتیاط برتنی ہے۔یہ احتیاط کا تقاضا ہے۔ عزیزانِ من! دیکھیے قرآن کیا الفاظ انتخاب کرتا ہے کہ ڈر کی بات یہاں نہیں کہی۔تم نے یہ کہا تھا کہ دوست داری کے تعلقات بظاہر ایسے رکھیں۔جسے حذر کہتے ہیں۔وہ کہتا ہے کہ یہ بات حذر کے طور پہ بھی وَ یُحَذِّرُ کُمُ اللّٰہُ نَفْسَہٗ ((3:28 صرف یہ چیز اس لیے ہے کہ وَ اِلَی اللّٰہِ الْمَصِیْرُ (3:28) اب اگلی بات یہ ہوگئی کہ ہاں صاحب! دل میں کچھ اور رکھا زبان پہ کچھ اور لے آئے۔عزیزانِ من! سنتے جائیے قرآن کہتا کیا ہے! قُلْ اِنْ تُخْفُوْا مَا فِیْ صُدُوْرِ کُمْ اَوْ تُبْدُوْہُ یَعْلَمْہُ اللّٰہُ ((3:29 کیا بات کر رہے ہو صاحب کہ دل میں ہم کچھ اور رکھیں گے زبان پہ کچھ اور رکھیں گے۔کس سے یہ چیز بچا لو گے؟ ان سے یہ چیز کر لو گے۔ اللہ کے اوپر تو یہ چیز برابر ہے‘ دل میں چھپا کر رکھو یا زبان پہ کوئی چیز لاؤ۔وہ تو تمہارے دلوں تک کو جانتا ہے۔یہ بالکل غلط ہے جو تم کہتے ہو۔وَ یَعْلَمُ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِی الْاَرْضِ ((3:29 ارے تمہارے دل اور ان کے اوپر کی حائل دیواریں کیا شے ہیں کائنات کی پستیوں اور بلندیوں میں کوئی مقام بھی ایسا نہیں جس کا اس کو علم نہیں ہے۔وَ اللّٰہُ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ ((3:29 اور ہر چیز کے اندازے‘ پیمانے‘ مقرر ہیں۔اس کے مطابق نتائج مرتب ہوتے رہتے ہیں۔کچھ ڈرنے کی بات نہیں ہے‘ ان سے خوف کی بات نہیں ہے۔دل میں کچھ اور زبان پہ کچھ اور۔قطعاً نہیں۔ہم تو دل میں گذرنے والے خیالات تک سے واقف ہوتے ہیں۔اور تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ یَوْمَ تَجِدُ کُلُّ نَفْسٍ مَّا عَمِلَتْ مِنْ خَیْرٍ مُّحْضَرًا ((3:30 یاد رکھو! یوم مکافاتِ عمل ایک حقیقت ہے کہ جس میں ہر شخص اپنے ہر کام کو اپنے سامنے حاضر پائے گا۔وَ مَا عَمِلَتْ مِنْ سُوْءٍ تَوَدُّ لَوْ اَنَّ بَیْنَهَا وَ بَیْنَهٗ اَمَدًا م بَعِیْدًا ((3:30 اور اس نے جو غلط کام کیے ہوں گے اس وقت وہ کہے گا کہ اے کاش ان کے نتائج میں اور مجھ میں کہیں بڑا بُعد ہوتا‘ یہ میرے قریب نہ کہیں آتے۔

قرآنِ حکیم کی طرف سے آگاہی اپنے اندر شفقت اور عاطفت دونوں کی حامل ہوتی ہے

اب سنیے جو میں نے کہا تھا کہ وَ یُحَذِّرُ کُمُ اللّٰہُ نَفْسَہٗ) (3:28 کہا ہے کہ ڈرنے کی بات یہ ہے کہ تمہارے یہ غلط عمل اس وقت تمہارے سامنے اس طرح نہ آئیں کہ ان میں اور تم میں کوئی کسی قسم کا بُعد اور کسی قسم کا پردہ ہو۔یہ کر و ہی نہ‘ تم نے محتاط رہنا

آلِ عمران 478 ہے۔ وَ يُحَذِّرُكُمُ اللّٰهُ نَفْسَهٗ (3:30) اس سے محتاط رہو۔ اللہ اکبر! وَ اللّٰهُ رَءُوْفٌ بِالْعِبَادِ (3:30) دیکھیے یہ کہاں رؤف ہے! یہ چیزیں اس لیے کہہ رہا ہے کہ وہ رافت رکھتا ہے۔ نرمی سے برتاؤ کرتا ہے۔ تمہیں اس لیے ان چیزوں کو سمجھا تا ہے کہ زندگی میں محتاط رہنے کی ضرورت ہے۔ لیکن تمہیں وہ بتا رہا ہے کہ یہ شفقتِ پدرانہ جسے کہتے ہیں' عاطفتِ استاد جسے کہتے ہیں وہ بھی بچے کے ساتھ شفقت اور عاطفت کا ایک تقاضا ہوتا ہے کہ اسے خطراتِ زندگی سے آگاہ رکھا جائے۔ یہ ہیں وہ خطرات جن سے ہم تمہیں آگاہ کرنا چاہتے ہیں کہ اس قسم کے کام نہ کرو کہ ان کاموں کے سامنے آنے سے تمہیں اس وقت یہ ہو کہ اے کاش! یہ میرے سامنے نہ آئیں۔ عزیزانِ من! کیا انداز ہے قرآن کے بات کرنے کا! کہیں باہر سے سزا نہیں مل رہی' کوئی باہر سے آ کر گواہی دینے والا نہیں بلکہ اعمال کے نتائج خود تمہارے سامنے آ رہے ہیں اور تم خود پکار رہے ہو کہ اے کاش! یہ کہیں آج میرے سامنے نہ آتے تو اچھا تھا۔ اس سے محتاط رہنا ہے۔ محتاط رہو اور یہ چیز جو ہم کہہ رہے ہیں ہماری رافت کا نتیجہ ہے ہماری محبت کا نتیجہ ہے۔ ہم ظالم نہیں ہیں' تمہارا برا نہیں چاہتے۔

قرآنِ حکیم کو سمجھنے میں ہمارے ہاں کے تراجم نے ہمیشہ حقائق کو نظر انداز کیا ہے

اس کے بعد ہے قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ وَ يَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ ۭ وَ اللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ (3:31) یہ بھی بڑی عظیم آیت ہے اور اس کے غلط معنی بھی پتہ نہیں' ہمیں کہاں سے کہاں لے گئے۔ پہلے میں عام ترجمہ عرض کر دیتا ہوں۔ عام الفاظ یہ ہیں کہ ان سے کہو اگر تم اللہ سے محبت کرتے ہو تو میرا اتباع کرو' اللہ تمہاری محبت کرے گا' تمہارے گناہوں کی بخشش کرے گا' اللہ غفور و رحیم ہے۔ ''اللہ کے ساتھ محبت کرو'' محبت ہمارے ہاں کا عام لفظ ہے۔ اس کو ذرا سوچ لیجیے گا جو میں کہہ رہا ہوں۔ کسی ان دیکھی شے کے ساتھ آپ کبھی محبت کر سکتے ہیں؟ ہمارے ہاں یہ محبت کے عام معنی ہیں۔ اپنی بیٹیوں سے معذرت کے ساتھ میں ایک عام بات کرنے لگا ہوں۔ آپ نے سنا ہوا ہو کہ فلاں جگہ ایک بڑی حسین عورت ہے اور وہ قلوپطرہ ہے۔ اس کے حسن کے متعلق آپ نے اتنے افسانے سنے ہوئے ہیں یعنی ساری تاریخِ انسانیت میں اس سے زیادہ کوئی اور حسین نہیں تھا۔ یہ ساری تفاصیل پڑھنے کے بعد کبھی آپ کے دل میں اس کے ساتھ محبت کے تعلقات کا کوئی جذبہ پیدا ہوتا ہے؟ زیادہ سے زیادہ کوئی ذہنی APPRECIATION کہیں گے کہ اچھی ہوتی ہوگی۔ میں کہتا ہوں پردیس میں کوئی شخص گیا ہوا ہؤا سے وہاں اطلاع ملے کہ تمہارے ہاں بچہ پیدا ہوا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ایک بیٹا دیا ہے اور بڑا خوبصورت بیٹا ہے۔ اسے یہ اطلاع جس کو اس نے دیکھا نہیں ہے اور وہ جب وہ آ کر اس بچے کو دیکھے اور اس بچے کی وہ پہلی خاموش سی ہنسی اس کے سامنے آئے تو آپ دیکھتے

ہیں دل کے اندر دونوں میں کیا فرق ہوتا ہے۔ وہاں بیٹھے ہوئے جب تک اس نے بچے کو دیکھا نہیں ہے تو ہمک کر اس کو کلیجے سے لگا لینے کا جذبہ نہیں پیدا ہوتا۔ جب یہ اس کو سامنے دیکھتا ہے تو پھر پوچھیے نہیں اس باپ سے کہ وہ اس بچے کے ساتھ کیا کرتا ہے۔ ان دیکھے بچے کے ساتھ باپ یہ نہیں کرسکتا۔ یہ PSYCHOLOGICAL IMPOSSIBILITY ہے۔ کسی چیز کو سن کے آپ اس کی تحسین کر سکتے ہیں۔

خدا تعالٰی کی غیر مرئی ذات کسی بھی شکل میں کسی پہلو سے محسوس پیکر میں دیکھی ہی نہیں جا سکتی

یہ عام معنوں میں میں عرض کر رہا ہوں۔ جسے ہم محبت کہتے ہیں' یہ اَن دیکھی شے کے ساتھ پیدا نہیں ہوتی۔ اس کے متعلق آپ کے دل میں ایک خیال پیدا ہوسکتا ہے' اس کے دیکھنے کے لیے کوئی آرزو پیدا ہوسکتی ہے۔ لیکن یہ چیز کہ آپ پاگل ہوجائیں' یہ نہیں ہوتا۔ خدا کی ذات غیر مرئی ہے غیر مرئی ہی نہیں ایک برتر از خیال و قیاس و گمان و وہم ہے۔ سُبۡحٰنَهٗ وَ تَعٰلٰی عَمَّا یَصِفُوۡنَ (6:100) یعنی جو صفات بھی تم اس کی بیان کرتے ہو' وہ اس سے بھی بلند ہے۔ لہٰذا خدا کے ساتھ اس قسم کی محبت کہ جو دیکھی ہوئی چیزوں کے ساتھ ہوتی ہے' یہ ہو نہیں سکتی۔

تصوف کی دنیا میں ذاتِ خداوندی کا تصور اور اس کی نوعیت اور عیسائیوں کے ہاں ننز کا کردار

ہمارے تصوف کی تو کیفیت یہ ہوتی ہے جیسے یہ رات بھر خدا سے بغل گیر رہتے ہیں۔ اللہ کی محبت کے اندر جلے جا رہے ہیں۔ اب دیکھیے اس کے اوپر آپ کے ہاں ایک غلط تصور آنے پر پھر زبان کیسے بدلتی ہے۔ مرنے والے کے متعلق کہتے ہیں کہ واصل بالحق ہوگیا۔ یہ وصال ہے۔ آپ نے دیکھا کہاں بات جا رہی ہے۔ پھر یہ جس دن وصال ہوا ہے لیکن اس کے بعد ان کا عرس ہوتا ہے۔ عرس کے معنی تو شادی ہوتا ہے۔ یہ روز دعوت نامۂ عروسی آپ کو آتا ہے۔ یعنی یہاں عروسی تو آپ کو پتہ چلتا ہے' عرس کا آپ کو پتہ ہی نہیں چلتا کہ ''ویاہ ہون ڈیا اے'' (شادی ہو رہی ہے)۔ ''آ سارا جوا وتھے کھانا اے' او دعوت ولیمہ ہوندا اے''۔ عرس ہوتا ہے' وصال ہوتے ہیں۔ یہ امت خرافات میں کھوگئی۔ کہاں سے بات آئی؟ عیسائیوں کے ہاں یہ ننز ہوتی ہیں' ساری عمر جو تجرد کی زندگی بسر کرتی ہیں' شادی نہیں کرتیں۔ انہیں آپ ننز کہتے ہیں' وہ خدا کی دلہنیں ہوتی ہیں۔ وہ غیر شادی شدہ نہیں ہوتیں۔ معاف رکھیے! ''مسز گاڈ'' ہوتی ہیں۔ خدا کی دلہنیں۔ یہاں تو ہمیں نظر نہیں آ رہا۔ ہمارے ہاں تصوف کا ایک وارثی سلسلہ ہے۔ وہ مرد زعفرانی پیرہن پہنتے ہیں' زلفیں لٹکی ہوئی' کنگھی کی ہوئی' ریشمی ان کے اندر وہ گندھے ہوئے' زیور پہنے ہوئے چلے جا رہے ہیں۔ یہ کیا ہو رہا ہے؟ دلہن جا رہی ہے۔ ان کو کہتے ہیں کہ یہ دلہن ہے۔ کس کی دلہن ہے؟ ''اللہ میاں دی ہور کیہدی''۔

خدا کا بیٹا ہونے کے تصور کے سلسلہ میں قرآنِ حکیم کا جواب

وہ کہتے رہیں اللہ میاں! جس طرح یہ قرآنِ کریم میں ہے کہ یہ کہتے ہیں کہ خدا کے ہاں بیٹا ہے۔ بات کہیں اور نکل جاتی ہے ورنہ میں بتاتا قرآن کیا بات کہہ گیا ہے۔ یہ کہتے ہیں کہ خدا کے ہاں بیٹا ہے۔ جواب دیا ہے کہ میری تو بیوی ہے نہیں ''بیٹا کتھوں ہونا اے'' (6:101)۔ یہ بڑی عجیب بات خدا کہہ گیا ہے کہ پیدا کرنے کے لیے تو ہمارے ہاں کیا مشکل ہے۔ جس نے اس ساری کائنات کو یوں پیدا کر دیا' اپنے ہاں ایک بیٹا بھی اس طرح سے پیدا کرنا کیا مشکل تھا۔ لیکن اس کائنات پیدا کرنے کے بعد جو ہم نے قانون بنا دیا ہے کہ بیٹا اسی طریق سے ہوگا تو اس طریق کو چھوڑ کر ہم اپنے ہاں بھی بیٹا نہیں پیدا کرنا چاہتے۔ آ ہاہاہا۔ ضمناً بات آ گئی۔ کیا بات ہے! قرآن کی ایک چیز ہے۔ بات یوں نظر آتی ہے کہ جیسے مناظرے کی خاطر ایک جواب دیا ہے کہ میرے تو بیوی نہیں ہے' بیٹا کیسے ہوگا۔ لیکن آپ دیکھیے اس کی تہ میں بات کیا کہہ گیا ہے کہ اور تو اور رہا اب تو خدا بھی اپنے اوپر یہ پابندی عائد کر رہا ہے کہ بیوی کے بغیر بیٹا پیدا نہیں کرے گا۔ ورنہ اس کے لیے کیا مشکل تھا جو ساری دنیا پیدا کر سکتا ہے۔ خیر! اس نے کہا یہ کہ میرے ہاں تو بیوی نہیں ہے۔ یہ سب بیویاں بنی ہوئی پھر رہی ہیں۔ دلی میں ہمارے ہاں موجود تھے۔ ظلم ہے صاحب! سُبۡحٰنَهٗ وَتَعٰلٰى عَمَّا يَصِفُوۡنَ (6:100)۔

لفظ تُحِبُّوْنَ (3:31) کا لغوی مفہوم اور خدا سے محبت ہونے کی تفصیلی وضاحت

میں کہہ یہ رہا تھا کہ خدا سے محبت کا یہ تصور جو ہمارے ہاں محبت ہوتی ہے' اس کے اوپر پھر یہ ساری عمارت قائم ہے۔ خدا سے محبت کس بنا پہ ہوئی؟ عربی کا لفظ تُحِبُّوْنَ (3:31) لیا اور جو معنی اپنے ہاں رائج ہیں' یہاں بھی وہی لیے۔ ٹھیک ہے محبت کے یہ معنی اس انداز کی بھی محبت' محبت ہوتی ہے لیکن ذرا دیکھیے تو سہی زبان سے پوچھیے' قرآن سے پوچھیے کہ اس کے معنی کیا ہوتے ہیں۔ یہ جو لفظ محبت ہے اس کا مادہ ''ح ب ب'' ہے۔ آپ قرآن کے دیکھیے مستند لغت ہیں' بنیادی طور پر اس کے معنی ہوتے ہیں کسی چیز کو لازم پکڑنا' مستحکم طور پر اس کے ساتھ رہنا' ثبات اور استقامت سے کسی کے ساتھ جڑے ہوئے رہنا۔ یہ جو ہے وَاعۡتَصِمُوۡا بِحَبۡلِ اللّٰهِ جَمِيۡعًا (3:103) اعتصام' خدا کی رسی کو اس طرح سے مضبوط تھامو کہ اس کو پکڑے رہو لازم کر کے' تمسک اس کے ساتھ ہو ثُمَّ اسۡتَقَامُوۡا (41:30) پھر استقامت ہو۔ کسی شے سے تمسک' اس کو پکڑنا اور پھر استقامت کے ساتھ اس کے ساتھ جمے ہوئے رہنا' یہ بنیادی معنی ہیں محبت کے ح ب ب کا جو مادہ ہے۔ بندے کا خدا کے ساتھ محبت کرنا' سیدھی سی

بات ہے اس نے وَاعۡتَصِمُوۡا بِحَبۡلِ اللّٰہِ (3:103) کہا ہے خدا کے ساتھ تو یہ بات پیدا ہی نہیں، یہ تصور میں بھی نہیں آ سکتا 478 آلِ عمران
خدا کی اطاعت، خدا کے اعتصام، خدا سے تمسک، اس کے ساتھ کشش، اس کی کتاب کی رو سے ہے۔ ہمارا اور اس کا تعلق اس کی کتاب کی بنا پر ہے۔ اعتصام بِحَبۡلِ اللّٰہِ (3:103)، تمسک بالقرآن، استقامت اس کے ساتھ، لزوم، ثبات یہ ساری معنی ہیں لفظِ ح ب ب کے جہاں سے یہ حُبّ ہے، جہاں سے یہ محبت ہے۔ عجیب چیز ہوتی ہے قرآن میں، جیسے ولی اللہ جو ہے اولیاء اللہ جو ہیں اللہ کے ولی، اللہ بھی ولی ہوتا ہے ان کا، مومن اللہ کا ولی ہوتا ہے۔ یہ دونوں جگہ اس لفظ کے معنی یہ دوست نہیں ہوتے۔ یہ عجیب زبان ہے صاحب یہ تو زبان میں آپ آئیں تو پھر میں عرض کروں، کیسے یہ معنی بدلتے ہیں۔ ایک طرف ولی جو ہوتا ہے وہ جسے آپ دوست کہتے ہیں، جس کے ساتھ تعلق رکھنے والا، دوسری طرف جو ہوتا ہے اس کے معنی محافظ ہوتا ہے۔ انسان خدا کا دوست کہ جتنی اس کی چیزیں وہ کہتا ہے، ان تمام کی پاسداری کرتا ہے۔ خدا انسان کا دوست مقابلے میں، وہ اس کی حفاظت کرتا ہے، سرپرستی کرتا ہے، نگرانی کرتا ہے ایک ہی لفظ کے معنی ہوتے ہیں۔ یہی جو محبت ہے، اس کے معنی انسان کی طرف سے خدا کے متعلق ہوا، لازم پکڑنا، مستحکم طور پر اس کے ساتھ دینا، تمسک کرنا، اعتصام ہونا، استقامت ہونا خدا کے قوانین کی احکام کی۔ خدا کی طرف سے جب یہ چیز آئے گی تو زبان کی رو سے اس کے معنی ہوتا ہے کسی کی حفاظت کرنا، کسی کو تھامے رکھنا۔ یہ جو گھڑونچی ہوتی ہے اس کے اوپر صراحی رکھی ہوئی ہوتی ہے۔ جس انداز سے یہ گھڑونچی صراحی کو تھامتی ہے، اسے اس کی محبت کہتے ہیں۔ یوں تھامے رکھنا۔ عزیزانِ من! اگلی چیز اور ہے، عجیب زبان ہے کسی خام شے کی نشوونما سے اسے پختہ کرکے ابھار دینا۔ ح ب ب کے ماتحت حَب کا جو لفظ ہے یہ حَبوب جو حکیموں کے ہاں گولیاں ہوتی ہیں یہ حَبِ زعفرانی یہ دیکھتے ہیں نا۔ حکیموں کے ہاں، گولی جو ہوتی ہے اس کو حَب کہتے ہیں نا یہ وہی مادہ ہے ح ب ب، یہ کیا ہے؟ یہ جب خوشے میں دانہ ایسا پڑ جائے جو پک کے ابھر آئے اسے بھی حبب کہتے ہیں۔ اب خدا کی طرف سے محبت کیا ہوئی؟ تم خدا کے ان قوانین اور احکامات سے تمسک رکھو، اعتصام رکھو، لزوم رکھو، استقامت رکھو حب اور وہ اس کے مقابلے میں تمہاری حفاظت کرے گا، نگہداشت کرے گا اور تمہاری خام صلاحیتوں میں اتنی پختگی پیدا کرے گا کہ وہ ایک دانے سے پکی ہوئی فصل بن جائے گی۔ معنی یہ سامنے رکھیے۔ کسی مستند لغت سے آپ لیجیے، یہ معنی آپ کو مل جائیں گے۔ میرے لغت میں دیکھیے سارے حوالے آپ کو مل جائیں گے۔

صلوٰۃ کا لفظ تمام انسانوں کو ایک اجتماعی نظام کی ترغیب دیتا ہے

قُلۡ اِنۡ کُنۡتُمۡ تُحِبُّوۡنَ اللّٰہَ (3:31) ان سے کہو کہ اگر تم یہ چاہتے ہو کہ خدا کے قوانین خدا کے احکام، اس کے ساتھ تمسک رکھو

التزام رکھو، ثبات رکھو تو یہ چیز انفرادی نہیں ہے کہ اپنے اپنے طور پہ تم کرتے رہو تو سمجھ لو، یہ ہو گئے۔ دین اجتماعی چیز ہے اس اجتماعی 478 **آلِ عمران** کے اندر ایک نظام ہے، تنظیم ہے۔ اس کے لیے تمہیں کسی کے پیچھے چلنا ہو گا، ایک امام ہو گا، باقی تمہارے ہاں مقتدی ہونگے۔ اس کی MINIATUARE FORM آپ کے ہاں صلوٰۃ کی شکل کے اندر ہوگی۔ انفرادی نماز کا تو تصور نہیں ہے۔ یہ کیا ہے؟ یہ آپ کے ہاں کا جو نظام ہے دین کا اس کی MINIATUARE FORM ہوتی ہے جو صلوٰۃ کی جماعت میں ہوتی ہے۔ ایک شخص کا اتباع آپ کرتے ہیں۔ وہ ہاتھ اٹھاتا ہے، ہاتھ اٹھاتے ہیں۔ وہ جھکتا ہے، آپ جھکتے ہیں۔ وہ سجدے میں جاتا ہے، آپ سجدے میں جاتے ہیں۔ حتیٰ کہ وہ غلطی کرتا ہے تو آپ غلطی بھی کرتے ہیں۔ انارکی پھیلانے کی بجائے یہ بھی اس وقت آپ کرتے ہیں، اتباع کرتے ہیں۔ بعد میں اس سے سجدۂ سہو نکال لیتے ہیں۔ RECTIFY آپ کر لیتے ہیں، انتشار نہیں پیدا ہونے دیتے صفوں کے اندر۔ دین اجتماعیت کا نام ہے۔ ایک ان میں سے ہونا چاہیے جس کا اتباع آپ کرتے چلے جائیں، پیچھے پیچھے چلتے چلے جائیں۔ کہا ہے کہ اگر تم نے خدا کی اس رسی کو اس کے قوانین کو استحکام سے پکڑنا ہے، استقامت اس کے ساتھ ہونی ہے تو اس کا طریقہ یہ نہیں کہ اپنے اپنے طور پر غاروں میں جنگلوں میں خانقاہوں میں گھروں کے اندر بیٹھے ہوئے صاحب! ہم خدا سے محبت کر رہے ہیں جی۔۔ یہ خدا سے محبت تو ہوتی تنہا ہے نا۔۔ کہتا ہے یہ طریقہ نہیں ہے کہیں خانقاہیت کا طریقہ نہ ذہن میں تمہارے آ جائے۔ کہیں یہ سینٹ جو ہیں کرسچن کے، وہ تمہارے ذہن میں نہ آ جائیں کہ زاویے اور خانقاہیں بنا رہے ہیں اور کہہ رہے ہیں کہ خدا کے ساتھ لو لگائے ہوئے بیٹھے ہیں۔ کیا طریقہ ہے؟ اس کے لیے اجتماعیت کا طریقہ ہے اور میں سب سے پہلا سربراہ ہوں اس مملکت کا فَاتَّبِعُوۡنِیۡ (3:31) میرا اتباع کرتے چلے جاؤ۔ کیا بات ہے؟ نتیجہ کیا ہو گا؟ جو تم چاہتے ہو یُحۡبِبۡکُمُ اللّٰہُ (3:31) خدا تمہاری حفاظت کرے گا، نگہ داشت کرے گا، تمہاری خام صلاحیتوں کو پکی ہوئی فصل کی طرح دانے بنا دے گا۔ یہ اس کا نتیجہ ہو گا۔

قرآنِ حکیم کا پیش کردہ نظامِ حیات پوری انسانیت کی حفاظت کے لیے زادِ راہ مہیا کرے گا

عزیزانِ من! قرآن ہے یہاں یہ کہا یُحۡبِبۡکُمُ اللّٰہُ (3:31) وہیں واضح کر دیا کہ وہ کرے گا کیا؟ ''وَ'' کے معنی یہاں ''یعنی'' ہیں ''وَ'' تفسیری ہے یعنی کرے گا کیا؟ وَ یَغۡفِرۡ لَکُمۡ ذُنُوۡبَکُمۡ (3:31) جہاں جہاں کوئی چیز سہو و خطا ہو گی، اس سے تمہاری حفاظت کا سامان بہم پہنچے گا۔ یہ کرے گا۔ یعنی جو بات یُحۡبِبۡکُمُ اللّٰہُ (3:31) کے لفظ میں تھی اس کی تفسیر خود کہہ دی کہ وہ یہ کرے گا تمہارے لیے۔ اس لیے کہ وَ اللّٰہُ غَفُوۡرٌ رَّحِیۡمٌ (3:31) یہاں تو اتنا ہی ہے نا کہ حفاظت کرے گا، یہ تو

 NEGATIVE چیز ہے لیکن کسی خطرے سے حفاظت کی بات ہے، اس میں پروگریس نہیں ہے، اس میں ارتقا نہیں ہے، اس کی آگے بڑھنا نہیں ہے۔ کیا وہ اتنا ہی کرے گا؟ کہا نہیں! وَاللّٰہُ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ (3:31) حفاظت بھی کرے گا اور سامانِ نشوونما بھی عطا کرے گا۔ اس کے لیے کہا پھر کہہ دو ان کو کہ طریقہ ایک ہی ہے قُلْ اَطِیْعُوا اللّٰہَ وَ الرَّسُوْلَ ج فَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّ اللّٰہَ لَا یُحِبُّ الْکٰفِرِیْنَ (3:32) ایک ہی طریقہ ہے اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرو۔ اور یہ میں عرض کر چکا ہوا ہوں کہ یہ اطاعت جو ہے دین کے اجتماعی نظام کی ہے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زندگی میں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جس طرح سے کر رہے تھے، اتباع کرتے چلے جاؤ۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زندگی کے بعد قرآنِ حکیم کے پیش کردہ اجتماعی نظام کی خاطر خلافت علٰی منہاجِ نبوت کا فریضہ

حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد قرآن نے یہ کہا ہے کہ یاد رکھو! یہ نہ سمجھ لینا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وفات کے بعد پھر یہ شیرازہ منتشر ہوجائے گا، پھر دین مذہب میں تبدیل ہوجائے گا، پھر یہ اجتماعیت اور نظم نہیں رہے گا، پھر انفرادی طور پہ تم نے وہی کچھ کرنے لگ جانا جو کچھ باقی مذاہب والے کرتے ہیں، قطعاً نہیں۔ ان سے کہہ دو یہ چیز کہ وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ ط اَفَائِنْ مَّاتَ اَوْ قُتِلَ انْقَلَبْتُمْ عَلٰٓی اَعْقَابِکُمْ (3:144) محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بھی اس سے زیادہ نہیں کہ خدا کا ایک پیغامبر ہے، اس کی بھی ایک طبعی زندگی ہے۔ اس طبعی زندگی کے بعد جب یہ دنیا سے رخصت ہوجائے تو پھر کیا تم یہ سمجھ لوگے کہ اب یہ دین والی بات ختم ہوگئی اور وہی جو اس دین آنے سے پہلے اہلِ مذاہب کی صورت تھی، تم وہی کرتے چلے جاؤ گے پھر۔ اگر ایسا چلے جاؤ گے تو اپنا نقصان کرو گے، ہمارا تو کچھ نقصان نہیں کرو گے۔ کتنی عظیم چیز قرآن نے بتائی ہے کہ یہ ایک شخص ہے، اس کی طبعی زندگی ہے۔ دین تو محفوظ ہوجائے گا الفاظ میں قرآن کی دفتین میں، ہم اس کے محافظ میں، عملاً اس کو آگے چلنا ہے اور اسی لیے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد جب یہ نظام قائم ہوا تو انہیں خلیفۃ الرسول کہا جانشین رسول کا، وحی جو کچھ آنی تھی، وہ تو سلسلہ نبوت کا ختم ہوگیا، حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم خاتم النبیین تھے، وہ محفوظ ہوگئی۔ اس وحی کے مطابق جہاں تک نظام قائم کرنا تھا انسانوں کے اندر، وہ نظام علٰی حالہٖ قائم رہے گا۔ رسول کے بعد رسول کا جانشین یہ کچھ کرے گا۔ اسی طریق پہ چلائے گا۔ اسی لیے اسے خلافت علٰی منہاجِ نبوت کہا جاتا ہے یعنی جس طریقے کے اوپر نبی نے چلایا تھا، اس نظام کو اسی طریقے کے اوپر چلانے والے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے جانشین۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وفات کے بعد یہ جو اتباع ہے یہ جو اطاعت ہے، یہ اطاعت اس نظام اور دین کے اندر، یہ جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا سچا جانشین ہے، یہ

اس کی اطاعت قائم مقام ہوجاتی ہے اطاعتِ رسول ﷺ کی ۔اس سلسلے کو چلنا تھا آگے ۔آگے میں آؤں گا تو یہ عرض کروں گا 478 آلِ عمران قرآنِ کریم نے اَطِیۡعُوا اللّٰہَ وَ اَطِیۡعُوا الرَّسُوۡلَ (4:59) دو چیزیں کہہ کے اس کے لیے ضمیر اور صیغے جو ہیں، واحد کے استعمال کیے ہیں ۔اس کے معنی ہیں وہ تمہاری مملکت کا مرکز جو خدا کے بتائے ہوئے نظام کے مطابق چلائے جس طرح سے کہ رسول ﷺ نے چلایا تھا، اب اس کی اطاعت جو ہے وہ آپ کے ہاں خدا اور رسول کی اطاعت ہوجاتی ہے۔

صدیوں سے ہمارے ہاں مختلف مذہبی فرقوں کا یہ وجود آخر ہمیں کیا ترغیب دیتا ہے

لیکن جب نظام آپ کے ہاں دین کا نہ رہے، یہ انفرادی ہوجائے، اپنے اپنے طور پہ کرنا ہو تو پھر اپنے اپنے طور کے لیے پھر تلاش ہوتی ہے اس چیز کی کہ اللہ کی اطاعت کیسے ہو؟ اور پھر رسول کی اطاعت کیسے ہو؟ اور اس کا نتیجہ یہ جتنی سر پھٹول ہو رہی ہے ان میں سے کوئی بھی ایسا نہیں ہے جو خدا اور رسول کی اطاعت کا منکر ہو۔ چلیے میں کہتا ہوں یہ ایک چھوٹی سی جماعت جسے اہلِ قرآن کی کہتے ہیں ان کو چھوڑ دیجیے جن کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ سنتِ رسول اللہ ﷺ کے منکر ہیں، یہ باقی جتنے بھی ہیں کیا یہ خدا اور رسول ﷺ کی اطاعت کر رہے ہیں اور آپ کے ہاں ہر ایک دوسرے کے ساتھ لٹھم لٹھم ہو رہا ہے، سر پھٹول ہو رہی ہے، ایک دوسرے کو کافر کہہ رہے ہیں۔سارے مدعی اطاعتِ خدا اور رسول کے۔ یہ انتشار، یہ تفرقہ، یہ فرقہ بندی، یہ گروہ سازی جسے قرآن بہ نصِ صریح شرک قرار دیتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ سے کہتا ہے اِنَّ الَّذِیۡنَ فَرَّقُوۡا دِیۡنَہُمۡ وَ کَانُوۡا شِیَعًا لَّسۡتَ مِنۡہُمۡ فِیۡ شَیۡءٍ (6:159) اے رسول جو لوگ اختلاف کریں دین میں اور فرقہ بنالیں، تیرا ان سے کوئی تعلق نہیں ہے۔جن کے ساتھ رسول اللہ ﷺ کا کوئی تعلق نہیں، قرآن کی شہادت کے مطابق یہ اطاعتِ رسول کیسے کر سکتے ہیں؟ عزیزانِ من! یہ ایک اجتماعی نظم کا نام تھا۔ یہ ایک نظام تھا اور اسلام اسی صورت میں پھر زندہ ہوسکتا ہے کہ جب یہ نظام اجتماعی دین کا آپ کے ہاں قائم ہو ایک مملکت، تمام مسلمان، خدا کی ایک حبل اللہ کے ساتھ تمسک رکھنے والے اور ان کے چلانے والا ان کے ہاں کا ایک ایسا سربراہ جو اسی لائن کے اوپر مملکت اور نظام کو قائم کرے جس لائن کے اوپر صدرِ اول میں یہ قائم ہوا تھا۔ یہ ہے اسلام۔ انفرادی طور پہ اسلام کے اندر یہ الگ الگ اللہ سے محبت کرنے والے، یہاں کوئی ولی اللہ بیٹھا ہے، وہاں وہ بیٹھا نہیں تو اس کی قبر بنی ہوئی ہے، وہاں کوئی صاحبِ شریعت موجود ہے۔اس کا فتویٰ ادھر چل رہا، وہ اس کو کافر قرار دے رہا ہے، وہ اسے کافر قرار دے رہا ہے۔

478 **آلِ عمران**

امت میں وحدت پیدا کرنے کا آخری علاج

یہ تمام چیزیں جو ہیں' یہ اسی صورت میں امت میں پھر سے وحدت پیدا ہوسکتی ہے کہ خلافت علیٰ منہاجِ نبوت پھر سے احیا اور اس کا قیام ہو۔ اگر یہ نہیں ہوتا تو دین نہیں ہوسکتا' مذہب رہے گا اور جو کچھ باقی مذاہب میں ہوا ہے' وہی آپ کے ہاں ہوگا خواہ کتنے ہی بڑے بڑے مدعی آپ کے ہاں کیوں نہ آتے چلے جائیں خدا سے محبت کرنے والے' خدا کی ولایت کے دعوے دار بھی ۔۔ انفرادی چیز رہے گی صاحب وہ' دین نہیں ہوگا اس کے اندر۔ **اَطِیْعُوا اللّٰہَ وَ الرَّسُوْلَ ج فَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّ اللّٰہَ لَا یُحِبُّ الْکٰفِرِیْنَ** (3:32) اگر اس سے روگردانی کرتے ہو تو یاد رکھو! یہ کفر ہے **لَا یُحِبُّ الْکٰفِرِیْنَ** (3:32) دیکھا وہی لفظ آ گیا پھر۔۔ ان کی نہ وہ حفاظت کرتا ہے' نہ نگہ داشت کرتا ہے اور نہ ان کے کچے دانے کو بنا کے فصل بناتا ہے۔ عزیزانِ من! ہم سورۂ آلِ عمران کی آیت 32 تک آ گئے آئندہ درس میں ہم آیت 33 سے لیں گے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا ط اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ (2:127)

❀...❀...❀

آٹھواں باب: سورۃ آلِ عمران (آیات 33 تا 37)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حضرت مریمؑ کی جرأت مندانہ زندگی کے خدوخال

برادرانِ عزیز! آج نومبر 1969ء کی 9 تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز سورۃ آلِ عمران کی 33 ویں آیت سے ہوتا ہے:((3:33۔

قرآنی حقائق سے ہٹ کر تاریخی طور پر حضرت عیسیٰؑ کے کوائفِ حیات کو افراط اور تفریط کا شکار بنا رکھنے کی روئیداد

آخری آیت میں بتایا یہ گیا تھا کہ دین' مذہب کی طرح کوئی انفرادی شے نہیں' یہ اجتماعی زندگی کا نام ہے۔ جس میں اجتماعی طور پر اطاعت کی جاتی ہے اور اس سے پھر ایک نتیجہ مرتب ہوتا ہے۔ اس دنیا کی سرفرازی اور خوشگواری بھی اور عاقبت کا سنورنا بھی۔ اور اس کے بعد اب قرآنِ کریم اسی چیز کو تاریخ کے اندر لے آتا ہے' انبیائے سابقہؑ کے احوال و کوائف سامنے لاتا ہے۔ اور ان میں چونکہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے پہلے یا پہلے سلسلے کے آخری نبی حضرتِ عیسیٰؑ تھے' ان کے کوائفِ حیات سے بات شروع کرتا ہے۔ انہیں اس سلسلے میں بڑی اہمیت حاصل ہے اس لیے کہ تاریخ یہ بتاتی ہے کہ کسی نبی کے متعلق بھی اتنی زیادہ غلط فہمیاں نہیں پھیلی ہوئی تھیں جتنی حضرتِ عیسیٰؑ کے متعلق تھیں۔ ان کی زندگی تو افراط اور تفریط کے گہوارے میں جھولا جھول رہی تھی۔ ایک طرف

عیسائی تھے جو سب سے پہلے انہیں خود خدا مانتے تھے' اقنومِ ثلٰثہ' باپ بیٹا روح القدس اس میں سے ایک مانتے تھے جسے تثلیث کہتے ہیں۔ انہیں ابن اللہ کہتے تھے ان کی والدہ حضرتِ مریمؑ' ان کے مجسموں کی پرستش ہوتی تھی۔ ایک طرف عقیدت مندیوں کی افراط کا یہ عالم تھا اور دوسری طرف تفریط کی یہ کیفیت کہ یہودی (معاذ اللہ معاذ اللہ) انہیں حرام کاری کا نتیجہ قرار دیتے تھے۔ حضرتِ مریمؑ کے خلاف اتنا بڑا اتہام لگاتے تھے۔ حضرتِ عیسٰیؑ کے متعلق یہ کہ وہ ایک ملعون کی موت مرے کیونکہ ان کے نزدیک صلیب پر' پھانسی پر کسی کی موت لعنتی کی موت ہوتی تھی اور وہ بڑے فخر سے اسے بیان کرتے تھے۔ اور پھر جہاں یہ عقیدت مندیوں کا افراط و تفریط کا گھوارہ نہیں بھی تھا' ان کی تعلیم جو کچھ اناجیل میں اس وقت آئی ہوئی تھی اور آج تک ہمارے سامنے ہے 'اس میں انہیں ایک تارک الدنیا' فقیر' درویش' کچھ اس قسم کا بتایا گیا ہے بڑی مظلوم زندگی۔ تعلیم میں تو ان کے کچھ ہے ہی نہیں' اناجیل تو ان کے بعد گویا ان کی سوانح عمری کہیے۔ اور وہ سوانح عمری بھی ایک ایسے انسان کی ہے جس کی ساری عمر مظلومیت میں' کمزوری میں' عجز و انکسار کے اندر' اس انداز کی جیسے میں نے عرض کیا ہے کہ کوئی خانقاہ کا فقیر اور بے نوا سا ہو' ایسی زندگی سامنے آئی ہوئی ہے۔ یہ ساری ہی چیزیں غلط تھیں نہ حضرتِ مریمؑ کے متعلق کوئی بات صحیح' نہ حضرتِ عیسٰیؑ کے متعلق کوئی بات صحیح' نہ ان کی تعلیم کے متعلق کوئی بات صحیح۔ اور یہ آخری نبیؑ تھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے پہلے اور اس زمانے میں عیسائیت بڑے زوروں پہ پھیلی ہوئی تھی۔ یہ وجہ تھی کہ قرآنِ کریم کو خاص طور پر حضرتِ عیسٰیؑ اور حضرتِ مریمؑ کے متعلق اس تفصیل سے ذکر کرنا پڑا جس طرح کسی اور نبی کے متعلق نہیں کیا۔ کشمکشِ حضرتِ موسیٰؑ تو ایسی ہے کہ اس کے متعلق بڑی وضاحت سے قرآن نے کہا ہے لیکن وہ تو ایک انقلابی پروگرام ہے جو سامنے لایا گیا ہے۔ ان کے بعد جہاں تک کوائفِ حیات کا تعلق ہے تو تمام انبیائے کرامؑ کے مقابلے میں حضرتِ عیسٰیؑ کی زندگی اور حضرتِ مریمؑ کی زندگی کے متعلق قرآن نے بڑی ہی شرح و بسط سے کہا ہے۔ اور اس کی وجہ یہ تھی جو ابھی ابھی میں نے بتائی کہ ان کے متعلق غلط فہمیاں اتنی پھیلی ہوئی تھیں۔

مختلف انبیائے کرامؑ کی نسبت سے خدا تعالیٰ کی طرف سے ملنے والا دین ایک ہی نوعیت کا مظہر تھا

اب آپ دیکھیے قرآنِ کریم لوگوں کی نظروں میں تو یہی ہے کہ عیسائیت حضرتِ عیسٰیؑ کا دین' یہودیت حضرتِ موسیٰؑ کا دین' اسلام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا دین' گروہ بندیاں ہیں۔ گروہ بندیاں نہیں ہیں' دین تو خدا کا ہے۔ اسی نے مختلف ادوار میں مختلف ممالک میں مختلف اقوام میں مختلف انبیائے کرامؑ کی وساطت سے اسے بھیجا ہے اس لیے وہ تو کہتا ہے لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِهٖ (2:285) ان میں ہم کسی قسم کی تفریق نہیں کرتے۔ اور یہ وجہ ہے کہ الزامات عائد ہوتے ہیں حضرتِ عیسٰیؑ کی والدہ پر اور

ان الزامات کی تردید کرتا ہے قرآنِ کریم۔ اور ان کی بریت اور ان کی عظمت اور ان کا مقامِ بلند جو ہے وہ اس انداز سے پیش کرتا ہے کہ اس کے بعد خود نبی اکرم ﷺ سے اگر کہا جائے کہ ان کی والدہ یا ان کی بیویاں ان کی بھی اس انداز سے یہ چیزیں پیش نہیں کی جا رہیں جس انداز سے حضرتِ مریمؑ کی زندگی پیش کی جا رہی ہے۔ اور حضرتِ عیسٰیؑ کے خلاف جتنے الزامات ہیں جس طرح سے ان کی تردید کی جا رہی ہے یہ نہیں کہ وہ عیسائیوں کے پیغمبر تھے وہ اسی سلسلۃ الذّھب کی ایک کڑی ہیں۔ خدا کے رسول تھے' اس لیے خدا نے اپنے رسول کے متعلق یہ کچھ کہا ہے۔

دینِ خداوندی کی وسیع ظرفی کے مقابلے میں مذہب کی تنگ نظری کی کیفیت اور انبیاء کی بعثت کی نوعیت

اس سے آپ دیکھیے کہ قرآن کتنی بڑی وسعتِ نگاہ' کتنا بڑا شرحِ صدر' کتنے بڑے وسیع ظرف کا دین ہے کہ عام الفاظ میں کہیے کہ دوسرے مذہب والوں کے جو بانی اور پیغمبر ہیں ان کی زندگی کے متعلق بھی وہ ان کو ان الزامات سے پاکیزہ ٹھہرانے کے لیے اتنی شرح و بسط سے یہ سب چیزیں بیان کرتا ہے۔ اور اس کے بعد جب دین مذہب میں بدلتا ہے تو پھر ساری زندگی ان مذہب والوں کی ایک دوسرے کے بانیوں کے خلاف مناظرے اور مباحثے میں گذر جاتی ہے۔ دیکھا خدا کا دین اور انسانوں کا خود ساختہ مذہب ان میں فرق کہاں پیدا ہو جاتا ہے۔ بات یہاں سے شروع ہوئی اور بڑی اہم چیز ہے جو قرآن نے بیان کی ہے۔ اِنَّ اللّٰہَ اصۡطَفٰۤی اٰدَمَ وَ نُوۡحًا وَّ اٰلَ اِبۡرٰہِیۡمَ وَ اٰلَ عِمۡرٰنَ عَلَی الۡعٰلَمِیۡنَ۔ ذُرِّیَّۃًۢ بَعۡضُہَا مِنۡۢ بَعۡضٍ ؕ وَ اللّٰہُ سَمِیۡعٌ عَلِیۡمٌ (3:33-34) کہا یہ جاتا ہے کہ قرآن نے جب کہا کہ دنیا کی ہر قوم میں نبی آیا' رسول آیا تو قرآن نے جن رسولوں کا ذکر کیا ہے' وہ تو وہی تھے جو عرب کے اردگرد کے علاقے میں ہوئے۔۔ یہودیوں کے نبی' عیسائیوں کے نبی یا اس سے پہلے قومِ عاد اور ثمود کی طرف آنے والے حضرتِ صالحؑ' حضرتِ ہودؑ وغیرہ۔ دنیا کے کسی اور علاقے کے نبی کا تو ذکر نہیں کیا گیا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جو سب سے پہلی مخاطب قوم ہے وہ ذکر قرآنِ کریم نے اس لیے نہیں کیا کہ یہ کوئی تاریخ کی کتاب نہیں تھی اور اس نے HISTORY OF THE MESSENGERS OF GOD لکھنی تھی۔ یہ تو ایک ہدایت کی کتاب ہے اور اس کا انداز یہ ہے کہ ایک اصول بیان کرتا ہے اور پھر کہتا یہ ہے کہ جو اس اصول اور اس قانون کا اتباع کرے گا اس کی زندگی خوشگوار ہوگی' جو اس کی مخالفت کرے گا' اس کے خلاف جائے گا' اس کو تباہی اور ہلاکت کا عذاب آ کے گھیر لے گا۔ یہ ہے جو بات بیان کرتا ہے اب اس کی تائید میں وہ

تاریخ کے شواہد پیش کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ دیکھو فلاں قوم نے یہ کیا' اس کا نتیجہ یہ نکلا' فلاں قوم نے اس کے خلاف کیا' اس کا نتیجہ یہ نکلا۔ اب ظاہر ہے کہ سب سے پہلے عربوں کے سامنے یہ بات پیش کی جا رہی ہے اگر عربوں سے یہ کہا جاتا کہ دیکھو سچائی یہ نتیجہ پیدا کرتی ہے یا غلط نظامِ سرمایہ داری کا نتیجہ تباہ ہونا ہے اور اس کے بعد کہا جاتا کہ تمہیں معلوم ہے کہ چین کی کنفیوشس نے کیا کہا تھا اور ان کے ہنگ چنگ منگ کی جو قوم تھی وہ کس طرح سے تباہ ہوئی تھی تو وہ منہ دیکھتے رہ جاتے کہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟ نہ وہ چین کے کنفیوشس سے واقف' نہ یہ ہنگ چنگ منگ کی جو قوم تھی' اس کا انہیں کچھ علم۔ تو پہلی بات یہیں شروع ہو جاتی کہ صاحب یہ ہیں کون تھے؟ یہ قوم کونسی ہے؟ کیا ذکر کر رہے ہیں؟ یہ کچھ بیان کرتے' وہ کہتے ہمیں اس کا علم ہی نہیں ہے۔ کہیں سے تردید ہوتی اور سارا معاملہ ہمارے مولویوں کی طرح' اسی مناظرے میں ختم ہو جاتا۔

قرآنِ حکیم تباہ ہونے والی قوموں کی علت کی وضاحت کرتا ہے

قرآن نے بات وہ کہی ہے جن سے وہ واقف تھے۔ وہ کہتا یہ ہے ان کے اجڑے ہوئے کاشانوں کے اندر تم دن رات پھرتے ہو' جاؤ ان کھنڈرات پہ لکھی ہوئی' ٹھیکریوں پہ لکھی ہوئی داستانوں کو پڑھو۔ ان میں سے کسی نے یہ نہیں کہا کہ صاحب! ہم تو نہیں جانتے قومِ عاد کے ساتھ کیا ہوا تھا؟ ہمیں معلوم ہی نہیں ہے کہ قومِ ثمود کون تھی؟ ہم نہیں جانتے کہ صالحؑ کون تھے؟ اس لیے کہ وہ تو دن رات انہی علاقوں میں پھرتے تھے' ان کے کھنڈرات ان کے سامنے تھے' ان قوموں کی داستانیں ان کے سامنے تھیں۔ بات صرف اتنی سی تھی کہ انہوں نے یہ سمجھ لیا کہ یہ چیز صاحب بس اتفاقی حادثہ تھا جس کی وجہ سے یہ تباہی آ گئی۔ کسی نے یہ کہہ دیا کہ صاحب کوئی جھکڑ چلا ہوگا' اس کی وجہ سے یہ ہو گیا۔ یعنی اس کی علت معلوم نہیں تھی۔ واقعات ان کے سامنے تھے۔ قرآن نے صرف ان کی صحیح علت بتا دی کہ غلط نظامِ زندگی کا نتیجہ یہ ہوا کرتا ہے۔ دیکھتے ہو کتنی بڑی بڑی عالی شان عمارتیں ایسی ہیں جن میں ان کے بعد کوئی دوسرا بسا تک نہیں ہے۔ یہ وجہ ہے کہ قرآن نے صرف انہی انبیا کا ذکر کیا ہے اور انہی اقوام کا تذکرہ پیش کیا ہے جن سے قرآن کی پہلی مخاطب قوم عرب آشنا تھی' واقف تھی' اچھی طرح سے جانتے تھے کہ یہ کیا کہہ رہا ہے۔ اثر ہی اسی صورت میں ہو سکتا تھا۔ واقعہ دہرانے کی بات نہیں' ذرا سا واقعہ پیش کیا وہ ساری کی ساری داستان تھی از بر تھی ان کو' روز ان کے ہاں چرچے ہوتے تھے اس بات کے۔ صرف بتانا یہ تھا کہ تم جو سمجھتے ہو کہ اس کی وجہ یہ ہو گی' یہ نہیں تھی' اس کی وجہ یہ تھی۔ اتنی سی بات کی ضرورت پیش آئی اور کسی نے اس کے خلاف نہ کوئی اعتراض کیا نہ اختلاف کیا اس کے ماننے میں۔ قانون کے ساتھ حکمت کا تقاضا یہ تھا کہ ان کے احوال و کوائف ان کے سامنے پیش کیے جاتے۔ یہ وجہ ہے کہ انہی انبیائے کرامؑ انہی اقوامِ گذشتہ کو قرآن

سامنے لایا ہے۔ چنانچہ بات یہاں سے یہ شروع کی ہے خدا نے برگزیدہ کیا یہ آدم اور نوحؑ اور آلِ ابراہیمؑ اور آلِ عمران۔ صرف 478 **آلِ عمران**
اتنا ہی کہا ہے اس نے' انبیائے کرامؑ کا کچھ ذکر نہیں ہے۔

قصۂ آدم اپنے اندر تمثیلی انداز لیے ہوئے ہے

ضمناً میں عرض کر دوں کہ آدم کے متعلق پہلے ہم سورۃ بقرہ میں دیکھ آئے ہیں کہ وہاں جو قصۂ آدم ہے' وہ تو آدمی کی داستان ہے' وہ ایک تمثیلی انداز ہے۔ وہ جو آدمی کی کشمکش ہے اس دنیا کے اندر خارجی موانعات سے اور خود اپنے سرکش جذبات کے ساتھ اور وہ فطرت کی قوتوں کو مسخر کرنے کے لیے جو اس میں صلاحیتیں اور استعداد دی گئی ہے' وہ اس کا تمثیلی بیان ہے۔ اسے ہم بڑی ہی وضاحت سے بیان کر آئے ہیں اپنے مقام پر اس لیے وہ آدم کسی نبی کا نام نہیں ہے۔ علاوہ اور ثبوت کے ایک تو دلیل یہ بھی ہے کہ ایک نبی سے یہ تو ہوسکتا ہے کہ کسی مقام پر کوئی اجتہادی غلطی اس سے ہو جائے فیصلے کی یعنی ایک تدبیری غلطی جسے کہتے ہیں یوں کہہ لیجیے۔ میدانِ جنگ میں مثلاً یا کسی اور مقام پہ کسی پروگرام کو EXECUTE کرنے کے اندر' یہ نہیں یہ کرنا چاہیے لیکن کسی نبی سے یہ ناممکن ہے کہ وہ خدا کی معصیت کرے۔ معصیت کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ اسے حکم دیا جائے کہ یوں کرو اور وہ علی الرغم اس کے خلاف کرے۔۔ نبی یہ نہیں کرتا۔ اور یہ جو آدم ہے جس کا قصہ قرآن میں آیا ہے اس کی تو سب سے بڑی معصیت بتائی یہ گئی ہے کہ وہ ان کو خدا حکم دیتا ہے کہ وَلَا تَقْرَبَا هٰذِهِ الشَّجَرَةَ (2:35) مت قریب جانا اس کے اور اس نے وہی کچھ کیا۔ تو میں نے عرض کیا ہے کہ علاوہ دیگر دلائل وشواہد کے کہ یہ کسی نبی کا قصہ نہیں تھا' یہ ایک چیز بھی آتی ہے کہ نبی یہ نہیں کچھ کیا کرتا' وہ معصیت نہیں کرتا' سہو اور نسیان ہوسکتا ہے۔ بات میں یہ کر رہا تھا کہ وہ کوئی نبی نہیں ہے۔

آدم' نوح' ابراہیمؑ اور عمران کے چار ادوار کی تمدنی زندگی کی نوعیت

قرآن نے اصل میں یہ جو پیش کیا اس نے آدم' نوح' ابراہیم اور عمران اس نے تاریخ کے یہ چار دور پیش کیے ہیں۔ یہ موضوع نہیں اس وقت ورنہ میں عرض کرتا کہ قرآن کس طرح دور پیش کرتا ہے۔ حضرتِ نوحؑ کے متعلق جو کہا ہے کہ ساڑھے نو سو برس تک وہ رہے ان میں۔۔ وہ یہ نہیں تھی کہ وہ ایک شخصیت تھی جو ساڑھے نو سو برس تک جیتا رہا انسان۔۔ کہا یہ ہے کہ تعلیمِ نوحؑ کا دور اتنے عرصے تک تھا تا آنکہ پھر دوسرا دورِ ابراہیمیؑ آ گیا۔ سب سے پہلا دور انسان کی ابتدائی تمدنی زندگی کا ہے جس میں ہنوز زندگی کے مسائل اتنے زیادہ الجھاؤ والے نہیں پیدا ہوئے تھے' SIMPLE سے مسائل تھے' دورِ آدم کہہ لیجیے۔ اس کے بعد اگلا

دورِ نوحؑ لیتا ہے قرآن جس کے اندر یعنی وہ دور وہ ہے کہ جس میں ابھی حضرتِ نوحؑ جیسے ایک انسان کو کشتی بنانے کا بھی پتہ نہیں تھا وہ بھی خدا سکھاتا ہے' وہ دور آتا ہے۔ اس کے بعد اگلا دورِ ابراہیمؑ دور آجاتا ہے۔ تمدن بہت آگے بڑھ گیا ہے۔ مسائلِ حیات زیادہ پیچیدہ ہو رہے ہیں۔ اور اس کے بعد آلِ عمران ۔۔ عمران کہا جاتا ہے حضرتِ موسیٰؑ کے والد کا نام تھا۔ بہر حال حضرتِ موسیٰؑ اور ہارونؑ کا جو سلسلہ ہے اس کو آلِ عمران کہا جاتا ہے قرآن میں۔ تو یہ مختلف ادوار قرآن نے پیش کیے ہیں۔

حضرت مریمؑ کے متعلق لفظ اصطفٰی کا مفہوم

اس سلسلے کی سب سے آخری کڑی حضرتِ عیسیٰؑ ہیں اب ان تک آجایے۔ لیکن حضرتِ عیسیٰؑ سے پہلے اس نے ان کی والدہ حضرتِ مریمؑ کا ذکر کیا ہے اور یہ بڑی اہم بات ہے جیسا میں نے ابھی عرض کیا ہے۔ یہاں میں عرض کر دوں کہ یہاں اِنَّ اللّٰہَ اصۡطَفٰۤی (3:33) کہا ہے اللہ نے منتخب کیا' برگزیدہ کیا۔ ضروری نہیں کہ جن کے متعلق اصۡطَفٰی (3:33) کا لفظ آیا ہو وہ نبی ہوں' نبوت ہی اس کے معنی ہوں۔ حضرتِ مریمؑ کے متعلق تین چار آیتیں ہی آگے چل کے کہا وَ اِذۡ قَالَتِ الۡمَلٰٓئِکَۃُ یٰمَرۡیَمُ اِنَّ اللّٰہَ اصۡطَفٰکِ (3:42) اور یہ تو ظاہر ہے کہ حضرتِ مریمؑ نبی تو نہیں تھیں' کوئی عورت نبی تھی نہیں۔ تو میں نے کہا یہ ہے کہ یہاں جو اصطفٰی کا لفظ ہے' اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ یہ نبیوں کا ہی ذکر ہے۔ برگزیدہ افراد ہیں' منتخب افراد ہیں۔ حضرتِ مریمؑ کے متعلق یہاں کہا قرآن نے ۔ دوسرے مقام پہ تو خود امتِ محمدیہ ﷺ کے متعلق کہا ہے ثُمَّ اَوۡرَثۡنَا الۡکِتٰبَ الَّذِیۡنَ اصۡطَفَیۡنَا مِنۡ عِبَادِنَا (35:32) پھر ہم نے اس کتاب کا وارث ان لوگوں کو بنایا جنہیں ہم نے منتخب کر لیا تھا اپنے بندوں میں سے۔ تو گویا یہ ضروری نہیں کہ جہاں لفظِ اصطفٰی آیا ہو "چن لینا' منتخب کر لینا' برگزیدہ کر دینا" وہ ضرور نبیوں کے ہی متعلق ہو۔ بلکہ جنہیں بھی قرآن کسی مقصد کے لیے چن کر لیتا ہے' برگزیدہ کر لیتا ہے ان کے لیے یہ لفظ آجاتا ہے۔ مطلب میرا یہ تھا کہ یہ نبیوں کا ہی ذکر نہیں آ رہا۔ حضرتِ مریمؑ کے متعلق میں نے کہا کہ قرآن نے بڑی ہی شرح و بسط سے بات بیان کی ہے اور ان کا درجہ بڑا امتاز بتایا ہے۔ یہیں (3:42) میں ہم نے دیکھا ہے کہ کہا کہ مریمؑ کو ہم نے برگزیدہ کیا۔

قرآنِ حکیم میں حضرت مریمؑ کے علاوہ فرعون کی بیوی کے لیے تحسین کے الفاظ

قرآنِ کریم میں دو اولوا العزم عورتوں کا ذکر آیا ہے خاص طور پر اور وہ ہیں ایک تو فرعون کی بیوی اور ایک حضرتِ مریمؑ۔ وَ ضَرَبَ اللّٰہُ مَثَلًا لِّلَّذِیۡنَ اٰمَنُوا امۡرَاَتَ فِرۡعَوۡنَ (66:11) مثال بیان کرتا ہے خدا مومنین کے لیے فرعون کی بیوی کی۔ وہ جب

فرعون کی بات آئے گی تو عرض کروں گا۔ قرآن نے کہا ہے کہ اِذْ قَالَتْ رَبِّ ابْنِ لِیْ عِنْدَکَ بَیْتًا فِی الْجَنَّةِ وَ نَجِّنِیْ مِنْ فِرْعَوْنَ وَ عَمَلِهٖ ((66:11 اس کی بیوی ہونے کے باوجود وہ یہ کہہ رہی ہے کہ یہ جو اس کا عقیدہ' اس کا نظریہ' اس کے عمل ہیں' میں ان سے متنفر ہوں۔ دعا مانگ رہی ہے کہ مجھے اس سے نجات دلا کسی طرح سے۔ قرآن نے اس کو بطور مثال کے پیش کیا ہے۔ اتنے بڑے جابر' اتنے بڑے مستبد بادشاہ کی بیوی ہے لیکن چونکہ ایمان نصیب ہے' اس واسطے اس کی کیفیت اس کی آرزو یہ ہے کہ وہ اس قسم کے باطل پرست مستبد حاکم بادشاہ کی ملکہ نہیں رہنا چاہتی' دعائیں مانگ رہی ہے کہ مجھے اس سے تو نجات دلا۔ اور یہ اتنی بڑی چیز ہے کہ قرآن نے اس کے تذکرے کو اپنی دفتین میں محفوظ کر لیا ہے فرعون کی بیوی کا یہ واقعہ۔۔ اس کو میں پھر بیان کروں گا۔

قرآنِ حکیم میں عصمت کی حفاظت کی بنا پر اقوامِ عالم میں حضرت مریمؑ کی عظمت کا ذکر

بات حضرتِ مریمؑ کے متعلق ہے وَ مَرْیَمَ ابْنَتَ عِمْرٰنَ الَّتِیْٓ اَحْصَنَتْ فَرْجَهَا((66:12 اور مریمؑ عمران کی بیٹی یا قبیلہ عمران کی لڑکی مریم۔۔ اس کے متعلق سارے قرآن میں حضرتِ مریمؑ کی ایک ہی تخصیص بتائی گئی ہے کہ اس نے اپنی عصمت کی حفاظت کی۔ سوال پیدا ہوگا کہ عصمت کی حفاظت تو عام طور پہ شریف عورتیں کرتی ہیں۔ یہ تو استثنا ہے کہ جو عصمت کی حفاظت نہیں ہوتی عام طور پہ کی جاتی ہے۔ کیا یہ اتنی سی چیز ایسی ہے کہ قرآن خصوصیت سے ذکر کرے اور ذکر بھی اس انداز سے کرے کہ وَ اصْطَفٰکِ عَلٰی نِسَآءِ الْعٰلَمِیْنَ ((3:42 کہا ہے اس نے' اقوامِ عالم کی عورتوں میں برگزیدگی عطا کی تجھے۔ تو بہت بڑی چیز ہے کوئی۔ اور یہی چیز سامنے ہمارے آئے گی کہ وہ کیا اتنی بڑی عظیم چیز ہے جس کے لیے قرآن نے ان الفاظ میں اس کا ذکر کیا۔ عیسائیوں کے ہاں حضرتِ مریمؑ کی پرستش ہوتی ہے اس لیے کہ وہ حضرتِ عیسٰیؑ کی ماں ہیں۔ قرآن کے نزدیک کسی نبی کی ماں ہونا یا کسی نبی کا باپ ہونا کسی نبی کا بیٹا ہونا یا اس کی بیٹی ہونا' کوئی وجۂ فضیلت نہیں ہے۔ یہ نبی کی ماں تھیں' حضرتِ ابراہیمؑ کا باپ بھی تو تھا۔ آپ دیکھتے ہیں قرآن اس کے متعلق کیا کچھ کہتا ہے۔ قرآن تو ایک طرف رہا' اللہ تو ایک طرف رہا' بیٹا کیا کہہ رہا ہے اسے؟ یہ تو کوئی وجۂ فضیلت نہیں ہے' صرف نبی کی ماں ہونا۔ عیسائیوں کے نزدیک یہ وجۂ فضیلت ہے۔

مسلمانوں کے نزدیک بھی حضرت عیسٰیؑ کی وجۂ فضیلت بن باپ پیدا ہونا سمجھا جاتا ہے

آپ کو معلوم ہے مسلمانوں کے نزدیک حضرت عیسٰیؑ کی وجۂ فضیلت کیا ہوئی؟ غور سے سنیے گا اور پھر سر پیٹیے گا۔ کرتے یہ ہیں یہ بھی عیسائیوں کی تقلید میں کہ حضرتِ عیسٰیؑ بن باپ پیدا ہوئے تھے۔ عیسائیوں کو تو یہ اس لیے کہنا پڑا کہ وہ انہیں خدا کا بیٹا کہتے

تھے' ابن اللہ جو کہا۔ تو اگر کسی انسان کا باپ قرار دے دیا جائے تو پھر وہ ابن اللہ نہیں رہتا۔ ان کا عقیدہ یہ ہے۔ میں آ گے 478 **آلِ عمران** اور یہ حضرتِ مریمؑ' حضرتِ عیسیٰؑ کی داستان اب مسلسل بیان ہوگی۔ وہ تمام چیزیں ہمارے سامنے آئیں گی کہ یہ عقائد کس طرح سے غلط ہیں۔۔ بن باپ پیدا ہونا یا ابن اللہ ہونا۔ مسلمانوں کے ہاں بھی یہ سارے عقائد مستعار آئے ہوئے ہیں' مانگے ہوئے ہیں ان لوگوں کے۔ یہ بھی اپنے ہاں عقیدہ یہ رکھتے ہیں' بن باپ پیدا ہوئے۔ ابن اللہ نہیں مانتے' خدا کا بیٹا نہیں' بن باپ پیدا ہوئے۔ عزیزانِ من! ذرا تھوڑی دیر کے لیے توجہ کو مرکوز کیجیے ایک پوائنٹ پر ایک نقطے پہ۔ میری بیٹیاں اور بہنیں بیٹھی ہیں اس لیے احتیاط کروں گا الفاظ میں لیکن بات ان کے بھی سمجھنے کی ہے۔ ایک جوان لڑکی ان کے عقیدے کے مطابق شادی شدہ نہیں ہے' حاملہ ہوجاتی ہے' بیٹا جنتی ہے۔۔ آپ سوچئے تو سہی۔ میں نے عرض کیا ہے کہ اصل حقائق جو ہیں' میں بعد میں لاؤں گا۔ میں یہ عرض کر رہا ہوں کہ جو عقیدہ ان کے ہاں کا اس کی رو سے پوزیشن کیا بنتی ہے؟ دنیا میں کہیں یہ واقع ہو' سوچئے کہ اس لڑکی کے متعلق معاشرے میں کیا بات نہیں ہوگی اور کیوں نہیں ہوگی؟ شادی شدہ نہیں ہے' حاملہ ہے' بچہ بھی پیدا ہوتا ہے۔

مودودیؒ کی طرف سے تفہیم القرآن میں حضرت مریمؑ کے ہاں بچے کی پیدائش کے معاملے کی تفصیل قابلِ غور ہے

غور فرما لیا آپ نے۔ آپ کے ہاں عقیدہ یہ ہے' مجھ سے نہ سنیے۔ عجیب اتفاق ہوا ہے کل ہی میرے پاس یہ ترجمان القرآن آیا ہے مودودی صاحب کا نومبر کے مہینے کا' اس میں اتفاق سے وہ ان کی تفسیر تفہیم القرآن مسلسل اس میں شائع ہو رہی ہے۔ اتفاق سے یہ سورۃ تحریم میں یہ بات آ گئی حضرتِ مریمؑ کی۔ یہ سنیے ذرا کہ یہی جو واقعہ ہے' اس کے متعلق کہا کیا جا رہا ہے۔

''تیسری مثال حضرتِ مریمؑ کی ہے جنہیں یہ مرتبۂ عظیم اس لیے ملا کہ اللہ نے جس شدید آزمائش میں انہیں ڈالنے کا فیصلہ فرمایا تھا' اس کے لیے انہوں نے سرِ تسلیم خم کر دیا''۔ یہ آزمائش ذرا ملاحظہ فرمایے۔ ''اس کے لیے انہوں نے سرِ تسلیم خم کر دیا۔ حضرتِ مریمؑ کے سوا دنیا میں کسی شریف اور نیک لڑکی کو کبھی ایسی سخت آزمائش میں نہیں ڈالا گیا کہ کنوار پن کی حالت میں اللہ کے حکم سے اس کو حاملہ کر دیا گیا ہو اور اسے بتا دیا گیا ہو کہ اس کا رب اس سے کیا خدمت لینا چاہتا ہے۔ جب حضرتِ مریمؑ نے اس پر کوئی واویلا نہ کیا بلکہ ایک سچی مومنہ کی حیثیت سے وہ سب کچھ برداشت کرنا قبول کر لیا جو اللہ کی مرضی پوری کرنے کے لیے برداشت کرنا ناگزیر تھا۔ تب اللہ نے ان کو سیدۃ النساء فی الجنت کے مرتبۂ عالی پر سرفراز فرما دیا''۔ اللہ نے کوئی کام لینا تھا اس کے لیے

طریق کیا تجویز کیا گیا''

ایک کنواری لڑکی اس کو حاملہ کر دیا گیا۔ میں پوچھتا یہ ہوں کہ اس کے لیے یہ جو چیز کہی گئی کہ صاحب! اللہ تعالیٰ نے پہلے پوچھ لیا کہ میرا ایک کام اٹکا ہوا ہے اور وہ اس کے لیے مجھے ایک لڑکی کی ضرورت ہے اور ہوگا اس کے ساتھ یہ۔۔ بن بیاہی ہوئی ہوگی اور وہ حاملہ ہو جائے گی لڑکا جنے گی۔۔ بتا تو اس کے لیے تیار ہے؟ آزمائش اللہ کی طرف سے اور وہ تیار ہوگئی۔عزیزانِ من! آپ سوچیے ایک شریف' بے گناہ' معصوم لڑکی اس کو اس کیفیت میں مبتلا کر دینا کہ وہ حاملہ اور بچہ جن رہی ہے یعنی اس کی کیفیت کیا ہوگی اس معاشرے کے اندر؟ اس کے پاس اس بات کا کوئی ثبوت۔اگر یہ واقعہ بھی ہو جیسا یہ حضرات فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اس سے یہ پوچھ لیا اور اس نے سرِ تسلیم خم کر دیا' کوئی ثبوت اس کے پاس یہ ہو سکتا ہے کہ بابا! میں نے یہ کچھ اس قسم کی چیز معاذ اللہ حرام کاری کی ایسے نہیں کی ہے' یہ تو اللہ نے مجھے اس کے لیے منتخب کیا ہے' اس نے یہ سارا کچھ کیا ہے؟ اس کے کہنے کا کوئی ثبوت اس کے پاس؟ کسی طرح سے وہ کسی کو بھی CONVINCE کرا سکتی ہے؟ باہر والے تو ایک طرف رہے' اپنے گھر والوں کو CONVINCE کرا سکے گی؟ کہ یہ ہوا ہے میرے ساتھ۔اس معاشرے میں اس کی کیفیت کیا ہوئی بچی بے چاری کی؟ یہ اس قسم کی کیفیت خدا آزمائش کس قسم کی لے رہا ہے' اوسوچو تو سہی اس بے چاری کے اوپر جو آسمان گذرے ہوں گے۔پھر بچہ پیدا ہونے کے بعد ساری عمر کے لیے یہ تو معاذ اللہ معاذ اللہ ان کے الفاظ میں یہ تو کالک کا ٹیکا ہے۔اور اس کے لیے کوئی ثبوت نہیں وہ دے سکتی کہ صاحب یہ چیز خدا نے مجھے دی ہے' وہ ہزار کہے لیکن کون مانتا ہے اس بات کو۔اول تو آزمائش کا لفظ ہی غلط تھا خدا کے لیے یہ استعمال کرنا کہ وہ بیٹھا ہوا آزماتا رہتا ہے کہ دیکھیں یہ لڑکی اس آزمائش پہ پورا اترتی ہے یا نہیں؟ کیسے برداشت کرتی ہے؟ پھر وہ برداشت کرتی ہے تو اللہ میاں خوش ہوتے ہیں اس کے لیے اس عذاب میں اس کو مبتلا کر کے۔کہنا وہ آزمائش تو وہ یہ چیز ہے کہ ایک شخص کھڑا ہے۔حق کی خاطر اٹھ کے کھڑا ہوتا ہے' اپنے اختیار و ارادے سے للکارتا ہے باطل کی قوتوں کو۔دیکھتا ہے کہ سخت مصیبتیں ان کی طرف سے آ رہی ہیں' تکالیف کا ہجوم آ رہا ہے اور سینہ سپر ہو کے اس کے سامنے کھڑا ہے' برداشت کیسے چلے جا رہا ہے خندہ پیشانی سے۔دیکھنے والی دنیا بھی یہ دیکھتی ہے کہ یہ شخص کتنا حق کے اوپر استقامت سے کھڑا ہے۔مخالفین تک کو یہ معلوم ہے کہ کتنی بڑی جرأت کا یہ ثبوت دے رہا ہے۔ایک دنیا جانتی ہے اس آزمائش کو جو پورا اترتا ہے۔اُس آزمائش سے تو دنیا ایک سبق بھی حاصل کرتی ہے کہ آفرین ہے تمہارے' جان تک دے دی لیکن حق سے تمہارا قدم جو ہے اس میں لغزش نہیں آئی۔بہت بڑی چیز ہوئی نا اس کا یہ عمل۔میں پوچھتا ہوں یہ جو ہے اس لڑکی کے ساتھ ہوا کیا یہ بھی اب شریف لڑکیوں

کے لیے مثال بن جائے گا؟ کہ جس کو یہ حمل ہو وہ کہتی پھرے کہ ٹھیک ہے صاحب مریم کو بھی تو ہوا تھا نا۔ یہ بھی اللہ کا حکم ہے (معاذ 478 **آلِ عمران** اللہ معاذ اللہ) ایسا ہو گیا میں نے تو کچھ نہیں کیا۔

قرآنِ حکیم نے تو قدم قدم پر سوچنے کی تاکید کی ہے

عزیزانِ من! کبھی کھڑے ہو کے سوچئے تو سہی کہ ہم کر کیا رہے ہیں؟ کیا کہہ رہے ہیں ہم؟ کہ یہ مرتبہ العظیم اس لیے ملا کہ اللہ نے جس شدید آزمائش میں انہیں ڈالنے کا فیصلہ فرمایا تھا اس کے لیے انہوں نے سرِ تسلیم خم کر دیا۔ توبہ توبہ معاذ اللہ معاذ اللہ می نہ سزد خدائے را۔ کسی معصوم بچی کے ساتھ یہ کرنا کہ وہ قدم قدم کے اوپر اس کو یہ تیر چھلنی کر رہے ہیں اور وہ سہ رہی ہیں گھر والوں کی آزمائشیں' معاشرے کی آزمائشیں' ہیکل والوں کی آزمائشیں' ملک والوں کی آزمائشیں۔ یعنی ان کی تہمتیں' ان کے طعنے' ان کے طنز' ان کی گالیاں اور اس کے پاس اپنے ہاں کوئی چیز ثبوت میں پیش کرنے کے لیے نہیں ہے۔ اگر یہ آزمائش ہے تو استبداد کس کو کہتے ہیں دنیا میں؟ معاذ اللہ میرے نزدیک بدترین مثال ہے یہ کسی کو تکلیف پہنچانے کی کہ یہ کر دیا جائے کسی شریف لڑکی کے ساتھ۔ عزیزانِ من! میں نے عرض کیا جیسا کہ عیسائیوں کو تو ضرورت پڑی حضرتِ عیسٰیؑ کو بن باپ پیدا کرنے کی کہ وہ ان کو خدا کا بیٹا بتانا چاہتے تھے' اس لیے آدمی کا بیٹا نہیں۔ میں آگے چل کے بیان کروں گا کہ وہ بھی کس قدر افسانہ ہے جو گھڑا گیا ہے۔ لیکن میں نے کہا کہ ان کو تو اپنے اس عقیدے کے لیے ضرورت تھی۔ انہیں پوچھئے کہ یہ ابن اللہ کے عقیدے سے بھی انکار کرتے ہیں اور بن باپ کے پیدا بھی کرتے ہیں کاہے کے لیے صاحب یہ؟ یعنی کوئی اس میں حکمت ہو' کوئی اس کی ضرورت ہو' کوئی تقاضا کسی قسم کا؟ معجزہ تھا یہ۔ میں کہتا ہوں اس معجزے کو کوئی ماننے والا بھی دنیا میں ہو سکتا ہے؟

آخر معجزات کی نوعیت بھی ٹھوس اور محسوس شے کی رہینِ منت ہوتی ہے

یعنی عقیدے سے تو آپ مان لیجیے معجزہ اگر کوئی شے ہے تو وہ تو یہ ہے کہ جہاں دلیل و برہان جو آپ نظری یا THEORETICAL طور پر دیتے ہیں (ان کے بھی کہنے کے مطابق) ناکام رہ جائے تو ایک کنکریٹ چیز ایسی سامنے لائی جائے کہ جس کو دیکھ کے ان کا سر جھک جائے کہ بات بالکل سچی ہے یعنی اسے کہا جائے گا نا کوئی معجزہ۔ جتنے بھی معجزات بیان کرتے ہیں کنکریٹ بیان کرتے ہیں' ٹھوس' جو دیکھے جا رہے ہیں۔ سامنے دیکھا جا رہا ہے کہ ایسا نہیں ہوتا اور ویسا ہو رہا ہے۔۔ ان کے ہی کہنے کے مطابق کہ پتھروں میں سے پانی نکل رہے ہیں۔ یہ بھی معجزہ ہے وہ ایک مردہ زندہ ہو رہا ہے۔ میں ان کی بات کر رہا

ہوں۔کوئی ایسی چیز تو ہے نا جس کو آنکھوں سے دیکھتا ہے آدمی اور پھر اس کے سامنے عاجز آتا ہے' معجزہ تو یہ ہے۔ میں کہتا ہوں **آلِ عمران** 478
جو ہے کسی کنواری لڑکی کا حاملہ ہو جانا' اس معجزے کو کوئی تسلیم بھی کر سکتا ہے؟ اور پھر اس سے کوئی عبرت بھی پکڑ سکتا ہے؟ کوئی عاجز بھی آ سکتا ہے؟ اس کے سامنے کوئی سر بھی جھکائے گا؟ پھر معجزہ یہ کس کا ہے؟ معجزے تو انبیائے کرامؑ کے ہوتے تھے' یہ کیا حضرتِ عیسیٰؑ کا معجزہ ہے کہ وہ بن باپ پیدا ہو گئے؟ وہ دنیا میں یہ کہتے پھریں گے کہ صاحب! مجھے دیکھیے معجزہ ہے' بن باپ کے پیدا ہوا ہوں؟ اس کا جواب جو دیا ہے یہودیوں نے وہ ہمارے سامنے ہے۔اب معاف رکھیے عقیدت مندی تو جو شے ہے' دنیا جو جواب دے گی اس کا وہ ہمارے سامنے ہے۔کیا یہ معجزہ حضرتِ مریمؑ کا ہے؟ اس معجزے کی جو کیفیت ہے' وہ تو ہمارے سامنے ہے۔کہ وہ ہزار جتن کرے بے چاری کسی کو قائل ہی نہیں کر سکتی کہ میں مجرم نہیں ہوں۔ یہ اللہ تعالیٰ کا ہے یہ کچھ؟ اللہ تعالیٰ کو اس قسم کے معجزے دینے کی کیا ضرورت ہے؟

قدرت کی طرف سے کائنات کی ہر شے کے لیے ایک قانون مقرر کر دیا گیا ہے

عزیزانِ من! ایک آیت ہے قرآن کی' انسان وجد میں آ جاتا ہے جب دیکھتا ہے قرآن کس انداز سے بات کہہ جاتا ہے؟ بات تھی یہی ان لوگوں کی کہ یہ حضرتِ عیسیٰؑ کو خدا کا بیٹا کہتے تھے اس کی تردید مقصود ہے' غور فرمایے کس حسین انداز میں بات کہہ گیا ہے قرآن بَدِيۡعُ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضِ ؕ((6:101 کہ یہی چیز جو ہے کہ وہ ایک بچہ پیدا کر سکتا ہے بغیر اس قسم کی ان چیزوں کے۔ جہاں تک اس عقیدے کا اس نظریے کا' اس کے امکان کا تعلق ہے' وہ کہتا ہے اس میں تو کسی شبے کی گنجائش ہی نہیں ہو سکتی' سوال کیا ہے؟ بَدِيۡعُ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضِ ؕ (6:101) جس نے اس تمام UNIVERSE کو اس سلسلۂ کائنات کو جو عدم سے وجود میں لایا۔ بدیع کے معنی ہوتے ہیں کہ جو پہلے چیز EXIST نہ کرتی ہو اس کو وہ EXISTENCE میں لے کے آ جائے بغیر کسی قسم کے پہلے میٹریل یا مسالے کے۔ بَدِيۡعُ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضِ ؕ (6:101) وہ تو اتنے عظیم کارگۂ کائنات کو عدم سے وجود میں لے آیا ہے' اس کی تو کیفیت ہی یہ ہے لہٰذا اس کے لیے یہ مشکل کیا ہے کہ کسی پتھر میں سے ایک آدمی نکال دے' آسمان سے کسی کو یوں نیچے اتار دے۔ امکان کا تعلق جو ہے نا قدرت کا جو ہے' اس کو تو یہ بیان کر دیا۔لیکن کہا کہ اس کے بعد جو سوال پیدا ہوا یہ کہ اس نے ایک بیٹا اپنا اس طرح سے پیدا کر دیا معجزے کے طور پر تو اس نے کہا کہ یہ دنیا اس طرح سے وجود میں لانے کے بعد اس نے پھر ہر شے کے لیے ہر کام کے لیے ایک قاعدہ اور قانون مقرر کر دیا ہے۔ بَدِيۡعُ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضِ ؕ (6:101) کے لیے کوئی قانون اور قاعدہ ہو ہی نہیں سکتا' عدم سے وجود میں لانا جو ہے' یہ تو معجزہ ہی ہے۔لیکن اس کے بعد کہا کہ اس

کے بعد ہم نے ہر شے کے لیے ایک قانون مقرر کیا ہے' قاعدہ مقرر کیا ہے۔ 478آلِ عمران

خدا کی تو کوئی بیوی ہی نہیں تو پھر بیٹا کہاں سے آ گیا؟

بچہ پیدا ہونے کے لیے قاعدہ یہ مقرر کیا ہے کہ وہ مرد اور عورت کے اختلاط سے پیدا ہوتا ہے۔ یہ قاعدہ مقرر کیا ہے اب جو تم کہتے ہو کہ خدا کا بیٹا ہے اَنّٰی یَکُوْنُ لَهٗ وَلَدٌ (6:101) ذرا سوچو کہ اس کے بیٹا کیسے ہوسکتا ہے؟ وَ لَمْ تَکُنْ لَّهٗ صَاحِبَةٌ (6:101) جبکہ اس کی بیوی نہیں ہے۔ کیا بات ہے؟ بَدِیْعُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ (6:101) یعنی اس کے قادرِ مطلق ہونے کی تو کیفیت یہ کہ سلسلۂ کائنات کو عدم سے وجود میں لاسکتا ہے۔ خود عائد کردہ پابندیوں کی کیفیت یہ کہ دلیل یہ دے رہا ہے کہ پھر اس کے بیٹا کیسے ہوسکتا ہے جبکہ اس کی بیوی کوئی نہیں ہے۔ یعنی اب اس کا قاعدہ یہ مقرر کیا ہوا ہے کہ اب جو بیٹا یا اگر جو بچہ پیدا ہوگا تو وہ مرد اور عورت کے اختلاط سے ہوگا۔ مجھے تو تم تسلیم کرلو چلو جی کہ ایک مرد اللہ میاں جو ہوئے ''آ میاں میں سمجھناں اوتھوں لیا ہو یا اے۔ آ ساہڈے سارے ای میاں کیندیاں نیں نا فلانے دا میاں''۔ عزیزانِ من! کیا دلیل دی ہے قرآن نے؟ یہ ہے اعجاز قرآن کا' کس انداز میں بات کر جاتا ہے؟ بَدِیْعُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ (6:101) تک صحیح بات ہے ٹھیک ہے لیکن آگے جواب سلسلہ ہے اس کے لیے تو یعنی خدا کو بھی ضرورت ہے بچہ پیدا کرنے کے لیے ایک عورت کی۔ کیسے ہوسکتا ہے جبکہ اس کی بیوی نہیں ہے تو۔ کیا بات کہہ دی ہے خدا نے۔ اور CONVERSLY کیسے ہوسکتا ہے ایک عورت کے ہاں ایک بچہ جب مرد نہیں ہے تو۔ کس قدر ٹھوس دلیل ہے۔ کہا جائے گا کہ عام طور پہ نہیں ہوسکتا' خدا کے ہاں تو ہوسکتا ہے تو خدا ہی نے تو تردید کی ہے۔ خدا کا تصور چونکہ ہمارے ذہنوں میں مرد کا ہے اس لیے اس نے کہا کہ جب عورت نہیں ہے پھر کیسے ہوسکتا ہے؟ خدا کا تصور اگر عورت کا ہوتا تو وہ یہ کہتی کہ جب مرد نہیں ہے تو کیسے ہوسکتا ہے۔

خدا تعالیٰ کی ذات بھی اپنے بنائے ہوئے قوانین کو نظر انداز نہیں کرتی

بات بالکل وہی چیز ہے۔ ایک قانون ہے اس کے لیے۔ وَ خَلَقَ کُلَّ شَیْءٍ (6:101) اشیا تو یوں پیدا ہوتی ہیں جیسے تم یوں سمجھ رہے ہو انسانوں کے بچے یوں نہیں پیدا ہوا کرتے۔ چلئے مرد کو عورت کی ضرورت ہوتی ہے' عورت کو مرد کی ضرورت ہوتی ہے۔ کیا دلیل دے گیا ہے قرآن۔ لہٰذا یہ سوال ہی نہیں ہے نہ ابن اللہ ہونے کا سوال حضرتِ عیسٰیؑ کا اور نہ کسی صورت میں بن باپ پیدا ہونے کا۔ میں پھر عرض کردوں قرآن کے الفاظ میں دہرادوں۔ جس خدا کی قدرت جو ہے اس کی یہ کیفیت ہے کہ وہ سماوات و

الارض کو عدم سے وجود میں لاتا ہے جہاں تک اس کے اختیارِ مطلق اور قدرت کا تعلق ہے۔ اس میں کوئی بات نہیں ہے کہ ایک پودا یوں ہی زمین سے اگ آئے۔ جہاں تک خدا کے لیے ممکن ہونے کا تعلق ہے کہ وہ کر سکتا ہے یا نہیں؟ وہ یہ کر سکتا ہے لیکن کرتا نہیں ہے۔ اس نے کہا ہے کہ اس کر سکنے کی قوت یہاں تک تو ہم نے اپنے اختیار کو برت لیا کہ لے آئے کائنات کو عدم سے وجود میں' وہاں تو CAUSE & EFFECT چل نہیں سکتا۔ کہیں سے تو بات شروع کرنی پڑے گی کہ جہاں EFFECT ہو اور اس کے پیچھے CAUSE نہ ہو' وہاں تو اس نے یہ کہہ دیا۔ اور جب یہ کر دیا تو اس کے بعد اب اس کی کیفیت یہ ہے کہ ایک بچے کو وجود میں لانے کے لیے وہ کہتا ہے کہ نہیں صاحب! جب تک ایک بیوی نہیں ایک عورت نہیں ہے' بچہ وجود میں نہیں آئے گا۔ لا سکتا ہوں' لاتا نہیں ہوں۔ بن باپ کے عقیدے کے لیے تو ایک ہی دلیل کافی ہو سکتی ہے۔ اور پھر جیسا میں نے عرض کیا' پیدا ابھی کرنا تھا' معجزہ دکھانا تھا تو بڑی آسان سی بات تھی' ان لوگوں کے سامنے آسمان سے ایک جیتا جاگتا بچہ نیچے آ جاتا وہ آ کے ان سے کہتا سلام علیکم' وہ کہتے کس کے بیٹے ہو؟ وہ کہتا خدا کا بیٹا ہوں۔ یعنی ہر شخص مانتا یہ چیز آسمان سے آیا ہوا ایک شخص۔ ایک نوجوان لڑکی حاملہ ہوتی ہے' اس سے بچہ پیدا ہوتا ہے آپ یہودیوں کے پیچھے پڑے ہوئے تھے لٹھ لے کر' معاذ اللہ معاذ اللہ

خدا تعالیٰ کے مقرر کردہ قوانین کے خلاف جنم لینے والے غیر فطرتی نظریاتی عقائد کا نتیجہ

عزیزانِ من! آپ کے ہاں اگر یہ بات ایسی ہو تو آپ وہی کچھ نہیں کہیں گے جو یہودی کہتے تھے۔ یہ تو پہلے عقیدتاً آپ کو منوانا پڑے گا یہ بات کہ نہیں صاحب! یہ ان کی کاریگری نہیں ہے بے چاری کی۔ یہ تو معصوم کی معصوم ہیں وہ اللہ میاں نے کچھ کر دیا اس کو یہ چیز ہو گئی اس کا یہ بیٹا ہے۔۔ یہ پہلے عقیدہ پیدا کیجیے تو اس کا جواز ہو جاتا ہے۔ اور اگر یہ عقیدہ نہ پیدا ہو تو اس کے بعد پھر؟ کیا خدا ایک معصوم بچی کو اس مصیبت میں ڈال دے گا؟ عزیزانِ من! میں تو جب غور کرتا ہوں ان کے ان عقائد کے اور اس مظلوم معصوم کی کیفیت دیکھو (اگر یہ صحیح ہے جو یہ کہتے ہیں) تو یہ تو یہ کیا بیتی ہو گی کیا گذری ہو گی؟ کا ہے کے لیے؟ اللہ تعالیٰ نے ایک معجزہ دکھانا تھا۔ واہ واہ کیا طریقہ ہے معجزہ دکھانے کا؟ کس جرم کی پاداش میں اس بے چاری کو یہ عذاب دیا جا رہا تھا ۔عزیزانِ من! کسی بچی کا گلا گھونٹ کے مار دینا یہ اتنا ظلم نہیں ہے جتنا اس جوان' شریف' غیر منکوحہ بچی کے متعلق یہ صورت پیدا کر دینا اور پھر عمر بھر وہ اسی معاشرے کے اندر وہ چلتی پھرتی' اس بچے کو لیے ہوئے پھر رہی ہو۔ می نہ سز دخدائے را۔

حضرت مریمؑ کی طرف سے ہیکل میں رہبانیت کے پیدا کردہ غیر فطرتی عقائد ونظریات کے خلاف اعلانِ جنگ کی روئیداد

کیا چیز ہے کہ جس نے حضرت مریمؑ کو یہ عظمت عطا کر دی؟ میں سوچ رہا ہوں کہ اسے اسی مقام پہ سامنے لے آؤں یا آگے چل کے جہاں یہ چیز آتی ہے۔ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ بات کلائمکس تک پہنچ گئی ہے اس لیے یہیں یہ چیز ہو جانی چاہیے' بات صاف ہو جائے۔ یہودیوں کے ہاں جسے ہیکل کہتے ہیں وہ یہ سمجھ لیجیے کہ ٹیمپل' گرجا' خانقاہ اس قسم کی چیز۔ خانقاہ تو ابھی اس کو نہ کہیے کیونکہ ان کے ہاں شروع میں شریعت ہی تھی' رہبانیت ابھی نہیں آئی تھی۔ پھر انہوں نے اپنے ہاں رہبانیت کو INTRODUCE کیا اس میں پہلے مرد راہب ہوتے تھے درویش تجرد کی زندگی بسر کرنے والے۔ پہلے شروع میں یہ چیز تھی پھر ان کے ہاں مردوں کے لیے بھی یہ شرط ہٹا دی گئی وہ ہیکل کی خدمت کے لیے پریسٹ کی حیثیت سے آتے تھے۔ پریسٹ کی دو ان کے ہاں کیٹگریز تھیں: علما جنہیں احبار کہتے تھے اور درویش جنہیں رہبان کہتے تھے۔

ہیکل کے اندر احبار کی طرف سے اختیار کردہ قبیح شکل کی فحاشیوں سے بھرپور داستان

اب ہیکل میں دونوں ہمیں نظر آتے ہیں وہ اربابِ شریعت ہیں وہ افرادِ طریقت ہیں۔ یہ جو آپ کے ہاں بنا ہوا ہے یہ پیر جی' یہ مولوی صاحب یہ سب یہودیت ہے۔ مسلمانوں میں نہ پیر ہوتا ہے' نہ مولوی ہوتا ہے۔ اُن کے ہاں یہ دو آ گئے پھر انہوں نے اپنے ہاں اس چیز کو INTRODUCE کیا کہ لڑکیاں بھی ہیکل کے اندر راہبہ بن سکتی ہیں۔ ابتدا انہوں نے کی بلوغت تک بچیوں کی حیثیت جب تک وہ بالغ نہ ہوں اس وقت تک وہ ہیکل میں رکھتے تھے اور اس کے بعد پھر وہ ہیکل سے باہر چلی جاتی تھیں۔ پھر انہوں نے اس کو آگے بڑھایا۔ اب آپ دیکھیے مندر ہو' گرجا ہو' ہیکل ہو اور اس کے بعد خواہ خانقاہیں ہو جہاں جب جوان لڑکیاں بھی ساتھ ہوں گی تو اب نگاہوں میں آلودگیاں پیدا ہونا شروع ہوئیں۔ قرآن نے بڑے خفیف رنگ سے کنایتاً بات یہ کہی ہے کہ تمہیں معلوم نہیں کہ جب وہ جوان ہوئی وہاں تو پھر وہ مندر کے پجاری کس کس نگاہوں سے دیکھتے تھے اور آپس میں جھگڑتے تھے کہ میں اس کا مالک بنوں' دوسرا کہتا تھا میں لے جاؤں۔ فیصلہ نہیں ہوتا تھا تو قرعہ ڈال رہے تھے۔ بالکل فطری چیز ہے۔ اور دنیا کی تاریخ بتا رہی ہے کہ فحاشیاں جس قدر اپنی قبیح شکل میں ان مقامات میں ہوتی ہیں جنہیں خدا کے نام سے منسوب کیا جاتا ہے' عام اڈوں میں اس انداز سے نہیں ہوتی۔ ایک چھوٹی سی کتاب ہے؟؟؟؟؟؟؟؟ ایک انگریز کی لکھی ہوئی' ذرا پڑھ کے

دیکھیے گا' پتہ چلے کہ خانقاہوں میں ہوتا کیا ہے۔ اور یہاں تو روز آپ کے ہاں یہ پیروں کی داستانیں آپ کے ہاں آتی ہیں لے اڑا اس کو لے بھاگا' وہاں یہ ہوتا تھا۔ یہ کیفیت وہاں پیدا ہوئی۔ اس معاشرے کے دستور کے مطابق بات آجاتی ہے۔ یہ لڑکی تھی' اسے ہیکل کی نذر کر دیا گیا۔ بڑے ماں باپ شریف' مذہب پرست۔ خانقاہ کی نذر ہو گئی۔ بچی تھی تو ایک نہایت شریف النفس حضرتِ ذکریاؑ' قرآن جنہیں نبی قرار دیتا ہے' ان کی زیرِ پرورش یہ رہیں' ان کی کفالت میں رہیں۔ نظر آتا ہے کہ جب یہ بچی ہیکل میں بھیجی گئی ہے تو اس زمانے میں بھی ان کا وہی پرانا دستور تھا کہ بالغ ہونے کے بعد وہ باہر آجاتی تھی۔ پھر انہوں نے اس چیز کو بدل لیا اور اگلی چیز یہ آ گئی کہ رکھا جائے اس کو وہیں لیکن وہ رہے ان پجاریوں کے چنگل میں۔

احبار و رہبان کی خود ساختہ آہنی زنجیروں سے بھرپور شریعت کے خلاف حضرت مریمؑ کی بغاوت کے صبر آزما پہلو

یہ کیفیت وہاں پیدا ہوئی۔ حضرتِ مریمؑ جوان ہوئیں۔ نہایت عمدہ پرورش' قرآن کہتا ہے نَبَاتًا حَسَنًا (3:37)۔ وہاں پجاریوں کے ہاں یہ صورت پیدا ہوئی۔ اب آپ سوچئے کہ وہاں کی شریعت اور وہاں کی طریقت دونوں یہ چیز کہتی ہیں کہ جونن بن کے ہیکل میں آ گئی' خانقاہ میں آ گئی اب وہ اس خانقاہ سے باہر نہیں جا سکتی۔ یہودیوں کی شریعت پہ ان کا اقتدار کتنا بڑا تھا اس کا اندازہ اس سے لگایے کہ رومن کی حکومت تھی اور وہ رومن کی حکومت میں ان یہودی علما کو بنی اسرائیل کو ہر قسم کی سزا دینے کا اختیار تھا۔ صرف موت کی سزا کے لیے گورنر سے CONFIRMATION ان کو کرانی پڑتی تھی یعنی وہ صرف فتویٰ ہی نہیں صادر کرتے تھے' ان کو یہ قانونی اختیارات تھے دوسروں کی مملکت کے اندر' شخصی قوانین میں لیکن ان کی حکومت کی یہ کیفیت تھی۔ اب یہ سوچئے کہ وہاں اربابِ شریعت بھی اس سے متفق ہیں' علما بھی اور وہاں رہبان بھی کہ جو ہیکل میں لڑکی آجاتی ہے' وہ جوان ہونے کے بعد اپنی مرضی سے باہر مطہر زندگی نہیں بسر کر سکتی۔ اس کو یا تو یہاں عمر بھر کے لیے مجرد رہنا ہوگا یا دوسری چیز جوان کے ہاں تھی کہ یہ جو ہیکل والے پجاری لڑکی سے نہیں پوچھ رہے' قرعہ ڈال رہے ہیں۔ قرعے میں جس کا نام نکل آئے' لڑکی نہیں لاٹری ہے جس کے نام نکل آئے یہ کیفیت ہے۔ یہ معلوم ہے حضرتِ مریمؑ کو کہ ان کے کسی حکم کی خلاف ورزی کا نتیجہ کیا ہو سکتا ہے۔ وہ جانتی ہے کہ کتنی سخت گیری ہے ان کے ہاں۔ خود وہ یہودیوں کے خاندان کی لڑکی ہے' ماں باپ وہی ہیں۔ عیسائیت تو ابھی آئی نہیں ہوئی' وہ تو سارے کے سارے یہودی تھے بنی اسرائیل' انہی میں کی لڑکی ہے۔ یہاں سے اگر بھاگ کے جاتی ہے تو اپنے ہی گاؤں میں

جائے گی' اپنے ماں باپ کے گھر میں جائے گی۔ وہ خود مذہب پرست ہیں' وہ ہیکل کے پجاریوں علما اور مشائخ کے خلاف اس کو پناہ 478 **آلِ عمران** کیسے دے سکتے ہیں؟ معاشرہ اسے قبول کیسے کرسکتا ہے؟ جب یہ یہاں سے بھاگ کے جائے گی اور وہاں اس کو اگر یہ مطہر زندگی بسر کرنی ہے' ان کے اربابِ شریعت نکاح ہی نہیں پڑھیں گے۔ آپ کو معلوم ہے آج آپ کے دور میں آج بھی یہ کچھ ہوتا ہے جہاں مولوی کو غصہ آتا ہے' پہلے تو وہ ایک دو تین پڑھ کے تمہارا نکاح فسخ کرتا ہے' نکاح ٹوٹ گیا ''طلاقاں پے گیاں چل بھئی''۔ یہ روز ہوتا ہے کہ انہوں نے یہ بدعت اختیار کی' ان کی داڑھی چھوٹی ہوگئی' بیوی کو طلاق۔ یعنی وہ بے چاری گھر میں بیٹھی ہوئی اس نے کوئی جرم نہیں کیا' یہ جرم اس نے کیا ہے' طلاق اس کو پڑ رہی ہے اس لیے کہ ان کا باندھا ہوا نکاح تھا نا ''او ہناں نے کہیا اسی بندھیا سی' اسی توڑنے آں تسی کون ہوندے ہیگے ہو''۔ روز طلاق' روز نکاح ٹوٹتا ہے۔ وہ تو غنیمت جانیے نا کہ اب انہوں نے اپنے آپ کو خود ایک اضحوکہ بنالیا ہوا ہے' مذاق بنالیا ہوا ہے' کوئی پرواہ ہی نہیں کرتا۔ لیکن یہ سوچئے کہ جس زمانے میں ان کو اختیارات اتنے ہوں قانونی کہ جس کے متعلق کہہ دیں کہ ان کی شادی نہیں ہوسکتی اس کے بعد اس کی شادی اگر ہوجائے تو کیا وہ اس کو جائز شادی قرار دیں گے؟ اور اتنے بڑے اقتدار والے۔۔ پورا معاشرہ انہی یہودیوں کا ہو جس میں یہ لڑکی جائے' وہ اعلان کردیں کہ یہ ہیکل سے گئی ہوئی لڑکی جو ہے ساری معاشرہ اس کو کھید دے گا شریعت کی رو سے یہ کسی کے ساتھ نکاح نہیں اپنا کرسکتی' نکاح کرے گی تو ہم اس کو باطل قرار دیں گے اور اس کی اولاد کو ہم ولدالزنا قرار دیں گے۔ عزیزانِ من! یہ حالات تھے وہاں کے۔ اور خانقاہیت کی زندگی خدا کے دین کے خلاف تھی۔ اس کے لیے ایک بڑی انقلابی جرأت کی ضرورت تھی اور اس کے لیے اس انقلاب کے لیے ایک لڑکی ہی موزوں ہوسکتی تھی کہ وہ اٹھ کے کھڑی ہو۔ حضرتِ مریمؑ نے ان تمام چیزوں کو دیکھا کہ اس کا انجام یہ ہوگا لیکن اس نے محسوس کیا کہ کس قدر ظلم ہو رہا ہے اس باطل شریعت کا' اس گمراہ کن شریعت کی بنا کے اوپر لڑکیوں کے ساتھ کتنا ظلم ہو رہا ہے' معاشرے کے ساتھ کتنا ظلم ہو رہا ہے۔ ان بھیڑیوں نے کتنے اختیارات باطل اپنے ہاتھ میں لے رکھے ہوئے ہیں۔ خانقاہیت کی زندگی کو انہوں نے عینِ دین بنا رکھا ہے۔ میاں بیوی راضی ہونے کے باوجود اگر یہ چاہتے ہیں کہ نکاح اگر نہ ہو تو کبھی نہیں ہوسکتا۔ ہوتا ہے تو اس کو باطل قرار دیتے ہیں' اولاد کو جائز قرار نہیں دیتے ہیں۔ یہ اختیارات سنبھالے ہوئے ہیں خدائی اختیارات ان کو حاصل ہوچکے ہوئے ہیں۔

حضرت مریمؑ کی جرأت اور پاکدامنی کو ہزاروں سلام

یہ تھی مریمؑ جس نے یہ احساس کیا کہ اس باطل کی ان آہنی زنجیروں کو توڑنا ہے' توڑنے کے لیے کسی کو تو پہل کرنی چاہیے تھی۔

اور اس نے کہا کہ جو ہوتا ہے ہو' میں توڑ کے بتاؤں گی۔ آ ہاہاہا!! جیتی رہو۔ بڑی ہمت کی ضرورت تھی۔ عزیزانِ من! بڑی ہمت کی ضرورت۔ نکل کے جانا کہاں تھا؟ قوم یہودیوں کی اپنی' معاشرہ ان کا' ماں باپ اپنے اتنے بڑے وہ قدامت پرست کہ ماں نے بچی کو تو ہیکل میں جا کے ان کی نذر کر دیا تھا۔ یہ ایسے تھے کہ یہودی مشائخ نے جب اس سے وہ بات کرتی ہیں تو اس سے یہ کہا کہ تیری تو ماں بھی بڑی مذہب پرست تھی' تیرا باپ بھی بڑا قدامت پرست تھا تو کیوں اس قسم کی نکل آئی؟ پھر حضرتِ مریمؑ نے جواب ان کو دیا او بھیڑیو! مجھ سے پوچھتے ہو تو کس قسم کی نکل آئی' تمہیں میں بتاؤں کہ تم کس قسم کے نکل آئے ہوئے ہو؟ پوچھو ان بچیوں سے جو ان ہیکلوں کی دیواروں کے اندر تمہارے پنجۂ ہوس کی شکار ہوتی ہیں' وہاں کیا کچھ ہوتا ہے۔ تمہاری اس خانقاہیت کی باطل رسم کو توڑنے کے لیے میں نے یہ اقدام کیا ہے۔ میرے ساتھ جو ہوگا' میں بھگتوں گی لیکن میری اس ایک قربانی سے تم دیکھو گے۔ اور یہ پاک بازی کی تو دلیل ہے ہی نہیں کہ خدا کی طرف سے وہ حاملہ ہوگئی۔ میں کہتا ہوں یہ کریڈٹ کیا ہے؟ وہ کونسی؟؟؟؟؟ اس کی؟ CREDITABLE بات یہ ہے کہ ان کے چنگل سے نکل کے خانقاہیت کی ان باطل زنجیروں کو توڑ کے اپنے معاشرے کے اندر جانا' اپنے ہی ماں باپ کے گھر میں جانا' اس معاشرے میں جانا۔ وہاں جانے کے بعد پھر جب یہ باتیں کریں تو اس کے بعد ان کو ان کی جتنی بھی یہ اندر کی باتیں تھیں اور جتنی یہ چیزیں تھیں' دھڑلے سے ان کا جواب دینا۔ اور بتانا کہ میں نے قصداً یہ کچھ کیا ہے کہ تمہارے ہاں کے یہ جو فریب کے نقاب تم نے اوڑھے ہوئے ہیں ان کو نوچ کے' اتار کے پھینک دوں اور دنیا کو بتا دوں کہ تم کیا کرتے ہو۔ اور یہ خدا کی شریعت نہیں ہوسکتی جو تم لے کے آئے ہوئے ہو۔ اس انقلاب کی حامل تھیں یہ حضرتِ مریمؑ اور یہ تھا جس کی وجہ سے قرآن نے کہا ہے کہ تمہیں ہم نے برگزیدہ کیا اقوامِ عالم کی عورتوں کے اوپر۔ کوئی شخص بھی جو باطل کے نظام کے خلاف پہل کر کے اٹھتا ہے' یہ ساری تاریخِ انسانیت' انہی چند مشعلوں کی رو سے جو راستہ انسانیت کا روشن ہے جو اس طرح سے اٹھ کے کھڑے ہوئے' کوئی یہاں کھڑا ہے' کوئی یہاں کھڑا ہے' کوئی یہاں کھڑا ہے۔ اور یہ وجہ ہے جو قرآن نے یہ کہا ہے ایک طرف فرعون کی بیوی وہ بھی آپ سوچ سکتے ہیں کہ اس کے اوپر کیا نہ گذری ہوگی۔ فرعون کی بیوی نے ایک دنیاوی حکومت یا حاکم کے استبداد کے خلاف اس نے یہ انقلاب کیا ہوگا' مریمؑ نے یہ مذہبیت کی یہ جو اغلال وسلاسل تھے اس کو توڑ کے یہ باہر نکلی اور یہ اس سے زیادہ اہم کام کر گئی یہ لڑکی جو تھی۔ گھر میں نہیں انہوں نے رہنے دیا۔ پرواہ نہیں ہے اس نے کہا کوئی بات نہیں' بچے کو لے کے نکل گئی۔

حضرت مسیحؑ جیسی انقلابی شخصیت کا ایک حقیقت کشا وعظ اور پھر اس کا نتیجہ

مصر میں جا کے اس نے اپنی زندگی بسر کی اپنی ت آ نکہ بچہ اتنا بڑا نہیں ہو گیا کہ آ کے پھر دونوں یہ مقابلہ کریں۔ اور اس کو لے کے اس بچے کو انہی ہیکل کی سیڑھیوں کے اوپر آ کے کھڑی ہو گئی ہے۔ کہا آ ؤ تم میں سے کون ہے بات کرنے والا؟ کہا تم نے یہ جو مکر و فریب کے جال بچھا رکھے ہیں' کوئی باہر نکل کے یہ تم میں سے تو نہیں کر سکتا تم تو سارے کا سارا گروہ ہے جو اندر بیٹھا ہوا ہے ۔ میں اس کے لیے کر سکتی ہوں' میں تمہیں بتاتی ہوں کہ یہ کیا کرتے ہیں۔ اور اس کے بعد ماں یہ کہتی ہے۔ بیٹا اٹھنے کے بعد پھر جو کچھ کہتا ہے اور تو چیز رہی خود انا جیل میں دیکھئے حضرتِ مسیحؑ کے جو وعظ ہیں ہیکل کی سیڑھیوں پہ۔ اس قسم کی ماں کی آغوش میں پرورش پایا ہوا بچہ' خدا کا نبی نہ بھی ہوتا تو وہ یقیناً ایسا انقلابی ہونا چاہیے تھا جیسا کہ حضرتِ عیسٰیؑ تھے۔ اور میں آگے چل کے بتاؤں گا کہ وہ ایک فقیرِ بے نوا' خانقاہیت کے ایک درویش نہیں تھے بہت بڑے انقلابی تھے جو رومن کی سلطنت کا تختہ الٹنے کے بعد خدا کی حکومت کو قائم کرنا چاہتے تھے۔ آگے آئے گی یہ بات۔ جس طرح حضرتِ مریمؑ کی زندگی بھی صحیح شکل میں سامنے نہیں آئی' حضرتِ عیسٰیؑ کے کوائفِ حیات بھی یا تو یہودیوں کی اس عداوت و انتقام کی آگ میں جھلس گئے اور یا عیسائیوں اور مسلمانوں نے ان کی تصویر کے نیچے جو عقیدت کی موم بتیاں جلائی ہیں' اس کے دھوئیں کے ساتھ اصل تصویر دب کر رہ گئی ہے لہٰذا آپ کو حضرتِ عیسٰیؑ کی صحیح تصویر قرآن میں ملے گی ایک انقلابی۔ سلسلۂ انبیا کی کڑی' کیا انبیائے کرامؑ درویشِ بے نوا ہوا کرتے ہیں؟ وہ دنیا کی ماریں کھانے کے لیے آیا کرتے ہیں؟ وہ باطل کا نظام الٹنے کے لیے آیا کرتے ہیں۔ ماں نے خانقاہیت کے رسوم اور اغلال جو تھے' ان کو بیٹے نے آ کے توڑ کے رکھ دیا نیز یہودیوں کی شریعت کو رومن امپائر کی باطل کی سلطنت کو الٹ کے رکھنے کے لیے ایک انقلابی تحریک پیدا کی۔ اور وہ انقلابی تحریک بعد میں جا کے جب وہ رنگ لائی ہے تو آپ دیکھیں گے تاریخ میں کیا کر گئے یہ۔ ماں تو ایسی ماں اس ماں کا بیٹا تو ایسا بیٹا۔

گھروں میں قدامت پرستی کا مقابلہ کرنے کے لیے حضرت مریمؑ کی زندگی اپنی مثال آپ ہے

عزیزانِ من! یہ ہے وہ مثال جو قرآن مومن عورتوں کے سامنے پیش کرتا ہے۔ یہ نہیں ہے کہ گھر میں میاں اگر باطل اور غلط عقائد رکھتا ہے تو اس کو نیچے وہ چھپی ہوئی بیٹھی رہے کہ ہاں صاحب! پھر کیا بات ہوئی بال آخر میاں جو ہے۔ اب اس کے بعد ان کے کانوں میں ٹھونسا جاتا ہے' مجازی خدا ہے تو حقیقی خدا تو کسی نے دیکھا ہی نہیں ہے' وہ سب کچھ تو مجازی بن جاتا ہے۔ وہ اللہ میاں

ہے تو وہ آسمان پہ میاں ہوگا' میاں تو یہ ہے۔ وہ مثال پیش کرتا ہے فرعون کی بیوی کی۔ باقی رہے یہ جو بچپن سے ہی ہماری بچیوں کو یہ غلط مذہب اور غلط طریقت کے یہ عقائد ان کے دماغوں میں ٹھونسے جاتے ہیں۔۔ مریم کی مثال پیش کردی۔ اور مثال قرآن ہمیشہ EXTREME پہ لا کے پیش کرتا ہے۔ اس گھرانے کی لڑکی ہے جس کی ماں اس اپنی بچی کو خود ہیکل میں جا کر نذر کرتی' ہے اتنے قدامت پرست گھرانے کی بچی' گوندھا ہوا مذہب پرستی کی اندر۔ لیکن وہ کہتا ہے کہ وہ اپنی غور وفکر سے جس نے خود INDEPENDENTLY آزادانہ بات کو سوچا ہو' کسی نتیجے پہ پہنچی ہو' ہیکل کے اندر رہتے ہوئے مریم کی کیفیت یہ ہے۔ شروع کی زندگی یہ ہے کہ وہ بھی ایک راہبہ نظر آ رہی ہے دنیا بھر کی نذر و نیاز کی چیزیں عمدہ عمدہ پھل فروٹ جسے کہتے ہیں وہ سب چلے آ رہے ہیں۔ قرآن کہتا ہے یہ سب کچھ وہاں تھا۔ گھرانہ وہ' یہاں پرورش ہو رہی ہے لیکن یاد رکھیے حضرت مریمؑ نبی نہیں ہے کہ وحی کے ذریعے سے یہ چیز آتی ہے۔

آزادانہ سوچ اور غور وفکر کی عادت تو انسان میں ایک انقلاب پیدا کر دیتی ہے

میں کہتا ہوں یہ بڑی عظمت ہے حضرتِ مریمؑ کی کہ خود آزادانہ اس چیز کے اوپر فکر کرتی ہے اور غور کرتی ہے اور وہ کہتی ہے کہ خدا کا دین یہ نہیں ہوسکتا' قطعاً نہیں۔ لہٰذا اس چیز کو لے کے وہ غیر نبی اٹھتی ہے۔ نبی تو وحی کے ذریعے سے ایک چیز کو پاتا ہے۔ غور فرمایا آپ نے کتنا بڑا CREDITABLE ہے یہ۔ خود اس نتیجے پہ پہنچتی ہے اور اس کے بعد یہی نہیں ہے کہ اپنے ذہن میں ہی رکھتی ہے کہ ہاں صاحب! ٹھیک ہے حالات کی مجبوری ایسی ہے کہ کیا کرسکتا ہے کوئی۔ اور پھر اگلی بات جو دنیا نے کہہ دی تھی کہ عورت ذات کیا کرسکتی ہے۔ عزیزانِ من! یہ قرآنِ کریم نے حضرتِ مریمؑ کی زندگی پیش کی ہے۔ اب آپ نے غور فرمالیا کہ کیوں یہ کچھ کہا۔ اب یہ چیز جو قرآن کہتا ہے اس نے عصمت کی حفاظت کی تو وہ یہ چیز تھی کہ یہودیوں کی اس شریعت کے مطابق نہ یہ باہر شادی کرسکتی تھی' ان کو انہوں نے قرار دے دیا کہ یہ نکاح باطل ہے انہوں نے کہہ دیا کہ یہ بچہ بھی جو ہے یہ باطل نکاح سے ہے یعنی گناہ اس کو معاذ اللہ معاذ اللہ یہ کہتے تھے۔ قرآن نے ان کی اس چیز کی تردید کی ہے جب یہ کہا ہے کہ تمہاری اس بکواس سے کچھ نہیں ہوسکتا' نکاح بھی وہ حق کا تھا' بچہ بھی وہ بالکل جائز تھا۔ تم اس کے خلاف الزام لگاتے ہو کہ اس نے عصمت کی پرواہ نہیں کی' نہیں یہ بالکل غلط ہے۔ وہ تو دینِ خداوندی کی رو سے بڑی باعصمت لڑکی تھی۔ دیکھا آپ نے کہاں لے آیا قرآن۔ یہ تمہاری شریعتِ باطلہ جس کی رو سے تم روز نکاح توڑتے رہتے ہو لوگوں کے اور ان کی بیویوں پہ طلاق ڈالتے رہتے ہو۔ عزیزانِ من! وہ تو میں نے کہا نا کہ آگے بات پہنچتی نہیں ہے نا لیکن CONSEQUENCES تک لے جایئے جب یہ ملا کی شریعت طلاق

دے دیتی ہے‘ اس کے بعد کی اولاد ہوتی کیا ہے پھر؟ ان کے پاس اقتدار نہیں‘ یہودی کے پاس اقتدار تھا‘ انہوں نے اعلان کر دیا تھا کہ اس بچے کو ہم حلال کا بچہ نہیں تسلیم کر سکتے۔ اس عورت کو ہم باعصمت عورت نہیں تسلیم کر سکتے۔ قرآن نے آ کے اس چیز کی نفی کر دی کہ تمہارے خود ساختہ شریعت کے یہ جو مسائل ہیں ان کی رو سے عصمت و زنا کے فیصلے نہیں ہوتے‘ خدا کے دین کے مطابق یہ فیصلے ہوتے ہیں۔ تم جو جی میں آئے کہو ہم شہادت دیتے ہیں اس چیز کی کہ اس نے اپنی عصمت کی حفاظت کی ہوئی تھی‘ تمہاری شریعت کی کوئی پرواہ نہیں ہے۔ دیکھا آپ نے یہ کیوں بار بار قرآن یہ بات کہتا ہے؟ اِذْ قَالَتِ امْرَاَتُ عِمْرٰنَ رَبِّ اِنِّیْ نَذَرْتُ لَکَ مَا فِیْ بَطْنِیْ ((3:35 قبیلۂ عمران کی ایک عورت مریم کی ماں‘ اس نے اپنے اس قدامت پرست طریقے کے مطابق کہا (بہت گھرانہ مذہبی نظر آتا ہے ابھی ہونے والا بچہ پیٹ میں ہی تھا) کہ یا اللہ جو کچھ میرے پیٹ میں ہے میں تیری نذر کرتی ہوں۔ مُحَرَّرًا ((3:35 تمام دنیاوی بندشوں سے آزاد کر کے اس کو۔ یہ مُحَرَّرًا (3:35): تحریر جسے کہتے ہیں نا۔ کیا بات ہے ان عربوں کی۔ جب تک آپ بات اپنے ذہن میں رکھتے ہیں‘ وہ آپ کی گرفت میں ہوتی ہے۔ جب آپ لکھ کے کسی چیز کو دے دیتے ہیں تو آپ کی گرفت میں نہیں رہتی‘ بات آزاد ہو جاتی ہے‘ اسے وہ تحریر کہتے تھے۔ ورنہ حُر جو ہے وہ تو آپ کو پتہ ہے مردِ آزاد کو کہتے ہیں۔ اور چونکہ زندگی کی حرارت جو ہے وہ مردِ حُر ہی کا حصہ ہوتا ہے‘ اس لیے ان کے ہاں دھوپ کی گرمی کو بھی حُرّ کہتے تھے۔ آ ہا ہا۔ مُحَرَّرًا فَتَقَبَّلْ مِنِّیْ ج اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ (3:35) قبول کر اس نذر کو۔ فَلَمَّا وَضَعَتْهَا قَالَتْ رَبِّ اِنِّیْ وَضَعْتُهَآ اُنْثٰی ج وَ اللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا وَضَعَتْ ط وَ لَیْسَ الذَّکَرُ کَالْاُنْثٰی ((3:36 بچہ پیدا ہوا تو اس نے دیکھا کہ لڑکی ہے تو یہ چیز چونکہ نئی نئی ابھی آئی تھی ذہن میں یہ بات آئی لڑکا ہوتا تو راہب ہوتا‘ ہیکل کی اچھی خدمت کرتا تو لڑکی پیدا ہوئی لیکن انہوں نے INTRODUCE تو کر دیا تھا نا اس چیز کو لیکن ماں کے دل میں یہ بات پیدا ضرور ہوئی یہ جو بات ہے کوئی آج کی نہیں ہے کہ لڑکی پیدا ہو تو ’’اچھا بھین اللہ دی مرضی۔ لڑکا تہاڈی مرضی نال ہونا‘ لڑکی اوہدی مرضی نال ہوئی اے‘ اے اللہ دی مرضی یعنی او اوتھے بیٹھا ہو یا کڑیاں دین ڈیا ہے‘‘۔ مریض بچ جائے شفا یاب ہو جائے شفا اللہ کی مرضی‘ مر جائے ’’اچھا بھین اللہ دی مرضی۔ منڈا پاس ہو جائے کدی نئیں کہندے‘ فیل ہو جائے تے اللہ دی مرضی۔ یعنی اے اوہناں نے اللہ؟؟؟؟؟ رکھیا ہو یا ہیگا‘‘۔

حضرت مریمؑ کا ہیکل کے ماحول میں پروان چڑھنے کے دوران ماں کے دل کی کیفیت

تو نظر آتا ہے کہ اس کے ذہن میں یہ بات آئی ’’میں تے کہیا سی‘ کا کا ہووے خیر نال تے ایتھے بھیج داں گی‘‘۔ وَ لَیْسَ

الذَّكَرُ كَالْاُنْثٰى ((3:36 قرآن ہے ال جو آیا ہے الذَّكَرُ اور كَالْاُنْثٰى (3:36) یہ کیا بات ہے یہاں جو قرآن کہہ گیا ہے 478 آلِ عمران
کہا کہ اسے کیا معلوم تھا کہ یہ لڑکی اس لڑکے سے جو اس کے ذہن میں تھا' کتنی اونچی لڑکی ہوگی۔ یہ نہیں کہا کہ لڑکا لڑکی سے اونچا ہوتا ہے۔ دیکھتے ہیں یہ ال کیا کہہ گیا ہے؟ اسے کیا معلوم تھا؟ وَاِنِّیْ سَمَّیْتُهَا مَرْیَمَ ((3:36 نام اس کا' میں مریم رکھتی ہوں۔ میں نے کہا ہے نا کہ وہ عبرانی زبان میں کہتے ہی ہیں ہیکل کی خادمہ بنانا تھا' نام بھی ایسا ہی رکھا اس نے۔ وَاِنِّیْٓ اُعِیْذُهَا بِكَ وَ ذُرِّیَّتَهَا مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ ((3:36 اسے بھی اور اس کی ذریت کو بھی۔ یہاں ماں یہ دعا کر رہی ہے ذریت نسل کے متعلق تو نظر آتا ہے کہ یہ سٹیج وہ تھی جس میں لڑکی کی شادی ہو جاتی تھی' نن کی بھی ہیکل میں جو بھیجی جاتی تھی۔ جب ہی کہا ہے کہ اس کی ذریت کو بھی میں پناہ میں دیتی ہوں شیطانِ رجیم کے خلاف' شیطان مردود کے خلاف۔ یہ چیزیں آپ سمجھ چکے ہیں کہ شیطانِ رجیم کیا ہوتا ہے؟ وہ تو سب سے بڑے شیاطین تو وہ تھے جن کے ہاں جا کے یہ حوالے کر آئی ہے۔ لیکن جو اس نے دعا مانگی تھی کہ ان سے میں پناہ کی دعا مانگتی ہوں' اللہ نے دعا منظور کر لی۔ یہ بچی وہاں بھی شیاطین کے جھرمٹ میں بھی پناہ میں رہی خدا کی۔ فَتَقَبَّلَهَا رَبُّهَا بِقَبُوْلٍ حَسَنٍ وَّ اَنْۢبَتَهَا نَبَاتًا حَسَنًا ۙ وَّ كَفَّلَهَا زَكَرِیَّا ؕ ((3:37 کہا کہ خدا نے اس کو قبول کیا پھر اس کی نشوونما ہوئی نَبَاتًا حَسَنًا (3:37) کیا بات ہے نَبَاتًا حَسَنًا (3:37) کی جیسے کونپلیں پھوٹتی ہیں' غنچے شگفتہ ہوتے ہیں' پھول لگتے ہیں نَبَاتًا حَسَنًا (3:37) بڑی خوبصورتی سے اس طرح سے وہ بڑی ہوئی۔ ''کوڑی ویل وانگوں' تہانوں پتہ اے ساہڈے اک او ہوندا ہیگا''

حضرت مریمؑ کے سلسلہ میں حضرت ذکریاؑ کی طرف سے دیکھ بھال کا عمل

یہ ہے وہ چیز جو قرآن کہہ گیا ہے عربی زبان میں۔ وَّ كَفَّلَهَا زَكَرِیَّا ((3:37 کہتا ہے کیوں نہ ہوتا ایسا' زکریا جیسا تربیت دینے والا اس کو مل گیا۔ واہ واہ واہ۔ كُلَّمَا دَخَلَ عَلَیْهَا زَكَرِیَّا الْمِحْرَابَ ۙ وَجَدَ عِنْدَهَا رِزْقًا (3:37) جب کبھی بھی زکریا وہاں آتا ان کے پاس محراب میں اس کے پاس کوئی نہ کوئی کھانے پینے کی چیز ہوتی۔ آپ دیکھیے بچی پرورش والی ہے' وہ آتے ہیں وہاں دیکھنے بھالنے کے لیے۔ کفالت میں تھی تو اس کی روٹی وغیرہ کا انتظام بھی تو ان کے ذمے ہی ہوگا۔ وہ وہاں آ کے دیکھتے ہیں کچھ کھانے پینے کی چیزیں پڑی ہوئی ہیں۔ انداز دیکھیے قرآن کا بات یوں ہی ایک کنایتاً کر جاتا ہے۔ قَالَ یٰمَرْیَمُ اَنّٰى لَكِ هٰذَا وہ پوچھتا ہے کہ ''کا کی اے کیتھوں آیاں ہیگیاں نیں اے چیزاں''۔ کتنا نیچرل ہے یہ پوچھنا ''اے انگور کتھوں آئے نیں بھئی؟ اے مٹھائی کتھوں آئی ہیگی اے' لنگد النگد ا پوچھدا اے''۔ احتیاط کی یہ کیفیت ہے۔ وہ آتے کہاں سے تھے؟ ہر خانقاہ کے اندر یہ درویش بن کے راہبہ بن کے بیٹھ جاتی ہیں۔ راہبہ کی تو راہب سے بھی زیادہ پرستش ہوتی ہے۔ وہ جواب دیتی ہے کہ

اس میں کسی بدگمانی کی بات نہیں ہے قَالَتْ هُوَ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ ط((3:37 بدگمانی کی بات نہیں ہے' خدا کی طرف سے بھیجے ہوئے ہیں478آلِ عمران
۔وِ اللّٰهُ يَرْزُقُ مَنْ يَّشَآءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ 3: (37) اللہ بھیجتا ہے جس کو چاہتا ہے' اس کی مشیت کے مطابق دوسروں کے حساب و کتاب سے الگ ملے۔ رزق کے معاملے میں یہ بتایا تھا ان آیتوں کا کیا مفہوم ہوتا ہے اس لیے ان کو دہراتا نہیں۔ یہ جو ہے نا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ (3:37) بس ہمارے ہاں یہ لفظ آیا اور اس بنیاد پہ عمارتیں استوار ہوئیں۔۔آسمان سے لایا کرتے تھے فرشتے' حضرتِ زکریا نے بڑی کوشش کی سات کوٹھڑیوں میں بند کر دیا مریم کو' باہر تالے لگا دیے۔ سوچیے ذرا یعنی کبھی سوچتے بھی ہیں کہ ہم کر کیا رہے ہیں؟ کیا؟؟؟؟؟ کیا ہوگا حضرتِ زکریاؑ نے اس لڑکی کے متعلق جو اسے کوٹھڑیوں میں بند کر رہے ہیں' تالے لگا رہے ہیں۔ سوچیے ذہن کدھر جاتا ہے؟ کس قدر SEX PERVERSITY تھی ان کے اوپر کسی چیز کی طرف دماغ ہی ان کا نہیں جاتا تھا۔ یہ کیوں احتیاط اتنی برت رہے ہیں؟ خدا کا نبی ہے۔ وہ عِنْدِ اللّٰهِ (3:37) جو ہے ان کے نزدیک تو پھر اس کو معجزہ صادر کرنا تھا جی اس کے باوجود ''ستاں تالیاں دے اندروی اوتھے برفی داٹکڑا پیا ہوندا ہیگا سی''۔ عِنْدِ اللّٰهِ

ہمارے ہاں قرآن

عزیزانِ من! عجیب چیز ہے کہ ذرا سی بھی تو ان کی قرآن پہ نگاہ نہیں اور قرآن اصل میں ان کے کسی کام آتا ہی نہیں ہے' ان کا سارا کاروبار جو ہے مسلکے مسائل اور فقہ پہ چلتا ہے۔ ساری عمر یا تو یہ رمضان میں کام آتا ہے' رمضان میں سنایا جاتا ہے اس کے بعد کچھ ملتا ہے ''یا مردیاں نوں ختم دوان واسطے ہوندا ہیگا''۔ آپ کو معلوم ہے ہر مہینے یہ قرآن ختم کرتے ہیں ''اوہدا ناں ای ختم شریف ہے''۔ عِنْدِ اللّٰهِ (3:37) ان کے نزدیک اس میں معجزہ ہونا چاہیے۔ میں دو ایک ریفرنس صرف دوں گا وَ اِنْ مِّنْ شَيْءٍ اِلَّا عِنْدَنَا خَزَآئِنُهٗ ز((15:21 رزق کی کوئی چیز بھی ایسی نہیں ہے کہ عِنْدَنَا (15:21) خدا کے ہاں' ہمارے ہاں اس کے تو خزانے بھرے ہوئے ہیں۔ وَ مَا نُنَزِّلُهٗ اِلَّا بِقَدَرٍ مَّعْلُوْمٍ((15:21 لیکن وہ جو نکلتی ہے چیز وہ ایک خاص پیمانے کے مطابق اندازے کے مطابق نکلتی ہے۔ زمین کے اندر تمام انسانوں کے لیے ہمیشہ کے لیے خزائن دبے ہوئے ہیں۔ قرآن کہتا ہے لیکن اس میں سے ایک پیمانے ایک قاعدے قانون کے مطابق نکلتی ہے۔ یہ جو ہے کہ یہ خَزَآئِنُ عِنْدَنَا ہمارے پاس ہیں میں عِنْدَ کا لفظ جو ہے اس کو کہہ رہا ہوں کہ قرآن کہاں استعمال کرتا ہے؟ کیا اس کے معنی ہیں کہ وہ آسمان پر اللہ تعالیٰ نے بوریاں بھر بھر رکھی ہوئی ہیں؟ عندنا اگر یہ معنی ہوں کہ بغیر کسی قسم کے ذریعے' وسیلے اور واسطے کے وہ براہِ راست خدا کے ہاں سے ملتا ہے تو آپ دیکھیے وہ تو یہ کہتا ہے کہ تمام چیزوں کے خزانے ہمارے پاس ہیں لیکن وہ ایک قانون کے قاعدے کے مطابق اس میں سے باہر آتی ہیں

چیزیں۔تو یہ انداز کہنے کا کہ جو چیزیں بھی خدا کی طرف سے ایسے آتی ہیں اس کو خدا کی طرف سے کہا جاتا ہے۔ ہمارے ہاں بھی یہ بچے پیدا ہوتے ہیں، بچیاں پیدا ہوتی ہیں ''اللہ دی دین ہیگی اے جی' اللہ دادتا ہویا ہیگا' او اللہ دتا ناں ہوندا ہیگا ساڈے۔ ایہدا مطلب اے پئی اے باقی جنے اسی ہیگے آں اے سارے دے سارے اونھو کمہیار نے دتے نیں''۔ یہ بات ہے ایک کہنے کی خدا کی دین جسے ہم کہتے ہیں اللہ دتا جسے ہم کہتے ہیں، وہ یہ چیز ہے۔ دوسری جگہ اور بھی اس سے واضح ہے فَابْتَغُوْا عِنْدَ اللّٰہِ الرِّزْقَ (29:17) رزق کو خدا کے ہاں تلاش کرو۔عزیزانِ من! بات صاف ہوجاتی ہے کہ عِنْدَ کے معنی کیا ہیں؟ اب یہ تو ہے نہیں کہ براہِ راست عرش پہ جا کے اللہ میاں کے پاس سے رزق لے آئے۔

کائنات کی ہر شے کو خدا اپنی طرف ہی منسوب کرتا ہے لہٰذا رزق کی تلاش میں خدا کے قانون کے مطابق حاصل ہوتی ہے

قرآن تو یہ کہتا ہے کہ فَاِذَا قُضِیَتِ الصَّلٰوۃُ فَانْتَشِرُوْا فِی الْاَرْضِ وَ ابْتَغُوْا مِنْ فَضْلِ اللّٰہِ (62:10) جب صلوٰۃِ جمعہ ختم ہوجائے تو پھر جاؤ چلو پھرو زمین میں اور خدا کے ہاں سے پھر رزق تلاش کرو۔تو ان الفاظ کے معنی یہ نہیں ہوتے کہ معجزے کے طور پر براہِ راست فرشتوں کے ذریعے کوئی چیز بھیجتا ہے۔ بلکہ یہ چیز جو ہے وہ سب چیز خدا کی دین ہے، اس کو لیا جاتا ہے کسی قاعدے اور طریقے کے مطابق۔اس بنا پہ قرآن یہ چیز کہتا ہے اور کہنے والا جو ہے اس کی تو کیفیت یہ ہے حضرتِ ابراہیمؑ نے مثلاً جیسے یہ کہا تھا یعنی وہ جو انداز ہوتا ہے کہنے کا حضرتِ ابراہیمؑ نے یہ کہا کہ وَ الَّذِیْ ھُوَ یُطْعِمُنِیْ وَیَسْقِیْنِ (26:79) خدا وہ ہے کہ جو مجھے کھلاتا بھی ہے، پلاتا بھی ہے۔اب ظاہر ہے کہ وہ کھانا تو خود ہی کھاتے تھے، پانی بھی خود ہی پیتے تھے لیکن یہ کہنا کہ وہ خدا ہے جو مجھے کھلاتا پلاتا ہے۔ٹھیک ہے ایمان یہی ہونا چاہیے کہ یہ چیزیں ORIGINALLY چونکہ خدا کی طرف سے دی ہوئی ہیں، اس واسطے یہ وہاں منسوب کر دیتا ہے۔ ورنہ اگر یہ کہا جائے کہ خدا براہِ راست پلاتا ہے پانی تو خدا نے تو دوسری جگہ یہ کہا ہے کہ ان سے کہو کہ اگر یہ کہتے ہیں کہ خدا براہِ راست پلاتا ہے تو دریا کے کنارے کھڑے ہوجاؤ، ہاتھ یوں کرلو اور اسے کہو کہ آجا پانی، اللہ میاں دیدے پانی اور اللہ نے ان سے کہا کہ پیاس مٹا کے ذرا آ کے بتائیں (13:14)۔ پانی کے متعلق حضرتِ ابراہیمؑ کہتے ہیں کہ وہ پلاتا ہے۔ پلاتا کس طرح سے ہے؟ تمہاری سعی اور کاوش سے۔ پانی اس نے پیدا کیا ہے تمہارے لیے اس اعتبار سے یہ خدا پانی دیتا ہے، لینا تم نے اپنی سعی و کاوش سے اس طریقے کے مطابق ہے۔عزیزانِ من! یہ ہیں جو ان الفاظ کے معنی ہوتے ہیں۔ یہاں تک حضرتِ

مریمؑ کا قصہ آ گیا آ گے ایک بات آتی ہے خود حضرتِ زکریاؑ کی کہ ان کے ہاں اولاد نہیں تھی۔ انہوں نے اولاد کے لیے وہاں دُعا478**آلِ عمران** بات چونکہ دوسری شروع ہو جائے گی اسے ہم آئندہ پہ اٹھا رکھتے ہیں۔ ہم سورۃ الِ عمران کی آیت 37 تک ہی آ سکے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا ؕ اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ (2:127)

❀...❀...❀

نواں باب: **سورۃ آل عمران** (آیات 38 تا 51)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حضرت مریمؑ کے کوائفِ حیات اور حضرت عیسیٰؑ کی انقلاب آفریں زندگی کے خدوخال

عزیزانِ من! آج نومبر 1969ء کی 16 تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز سورۂ آلِ عمران کی 38ویں آیت سے ہوتا ہے:((3:38۔

قرآنِ حکیم خونی رشتے کی بجائے اپنے ہاں آئیڈیالوجی کی بنیاد مہیا کرتا ہے

سابقہ آیات میں حضرتِ مریمؑ کا ذکر چلا آ رہا تھا۔ جیسا کہ میں نے تفصیل سے عرض کیا تھا اور اس پورے کے پورے درس کے دہرانے کی تو ضرورت نہیں، نہ گنجائش ہے۔ میں نے عرض کیا تھا کہ قرآنِ کریم نے حضرتِ مریمؑ کو دنیا کی عظیم عورتوں میں شمار کیا ہے اور خاص طور پہ فرعون کی بیوی اور حضرتِ مریمؑ کو مثال کے طور پہ بھی پیش کیا ہے۔ میں نے یہ عرض کیا تھا کہ حضرتِ مریمؑ کی یہ عظمت اور رفعتِ شان نہ تو اس بنا پر ہو سکتی ہے کہ وہ ایک نبی کی والدہ تھیں۔ قرآن کی رو سے کسی نبی کا باپ ہونا یا اس کی ماں ہونا یہ تو کوئی چیز وجہِ افتخار نہیں ہے۔ حضرتِ ابراہیمؑ جیسے نبی کے باپ جو تھے محض باپ ہونے کی حیثیت سے ان کا کوئی بھی مقام نہیں تھا ۔حضرتِ نوحؑ کے بیٹے، بیٹے ہونے کی حیثیت سے کوئی بھی مقام نہیں تھا۔ حضرتِ لوطؑ کی بیوی ان کی بیوی ہونے کی جہت سے کسی بھی مقام کی مالک نہیں تھی۔ یہ تو BIOLOGICAL رشتہ ہوتا ہے

دریں راہ فلاں ابنِ فلاں چیزے نیست

یہاں تو جوہرِ ذاتی ہے جس بنا پر کسی کی عظمت اور فضیلت ہے۔ دوسری چیز جو وجہِ فضیلت ہمارے ہاں عام طور پر سمجھی جاتی ہے وہ یہ کہ ان کے ہاں حضرتِ عیسٰیؑ بن باپ کے پیدا ہوئے۔ یہ چیز تو میں آگے چل کر عرض کروں گا جب حضرتِ عیسٰیؑ کا ذکر آئے گا کہ قرآنِ کریم سے اس کی بھی تائید نہیں ملتی کہ وہ بن باپ پیدا ہوئے تھے۔ لیکن بفرضِ محال اسے تسلیم بھی کر لیا جائے تو آپ سوچیے کہ ایک کنواری لڑکی کو اگر خدا کی کسی حکمت کے تابع بغیر کسی مرد کے اختلاط کے، استقرارِ حمل ہو جاتا ہے تو یہ اس عورت کے لیے کون سی بات وجہِ فضیلت ہے؟ اس میں اس کی کاری گری کیا ہے؟ وجہِ فضیلت سیرت کی پاکیزگی، کردار کی عظمت ہوتا ہے۔ یہ چیز جس میں کسی کے اپنے اختیار و ارادے کو ہی کوئی دخل نہیں ہے، اگر یہ چیز بھی ہو جیسا میں نے عرض کیا ہے، یہ بھی کوئی وجہِ افتخار نہیں ہو سکتی۔ اور جیسا میں نے تفصیل سے پچھلی دفعہ بتایا تھا کہ اس چیز کو اگر تسلیم کیا جائے کہ ایک کنواری لڑکی کو خدا ہی کے کسی اذن کے مطابق ایک حمل قرار پاتا ہے تو آپ سوچیے کہ اس معاشرے کے اندر اس بے چاری کنواری لڑکی کے اوپر گذرے گی کیا اور گذری کیا ہو گی؟ وہ ثابت ہی نہیں کر سکتی کہ میں اس باب میں معصوم ہوں۔ کوئی مان ہی نہیں سکتا کوئی تسلیم ہی نہیں کر سکتا۔ تو ایک معصوم، کنواری لڑکی کے لیے یعنی اسے اتنی مصیبت میں ڈال دینا کہ معاشرے کے اندر وہ بے چاری منہ چھپاتی پھرے ''می نہ

سز دخدائے را''۔ میں نے یہ چیزیں پچھلے درس میں عرض کی تھیں اور آگے چل کے پیدائشِ حضرتِ عیسٰیؑ کے ضمن میں تفصیلاً آلِ عمران 478 عرض کروں گا کہ یہ ان مقامات میں سے ہے جس میں ہمارے ہاں بھی انجیل کے تتبع میں عیسائیوں کے عقیدے کی محض کورانا تقلید کی بنا پر یہ سارے تصورات چلے آتے ہیں۔ اور کبھی نہیں ہم سوچتے کہ انہوں نے تو ایک بلند مقصد کے لیے یہ چیز اپنے ہاں پیدا کی کہ حضرتِ عیسٰیؑ کو انہوں نے خدا' خدا کا بیٹا' اقنومِ ثلاثہ میں سے ایک ثابت کرنا تھا۔ ہم تو آپ کو صرف ایک نبی مانتے ہیں لیکن ان کے اس اتباع میں ہم بھی وہی کچھ مانتے چلے آ رہے ہیں جو کچھ انہوں نے اپنے ہاں خود ساختہ عقائد اپنے لیے وضع کیے تھے۔ ضمناً یہ بات میں نے دہرائی ہے' بات آگے چلتی ہے۔ مقام یہ ہے کہ حضرتِ مریمؑ بچپن سے خانقاہ یا ہیکل کی نذر کر دی گئیں کہ وہاں راہبہ کی زندگی بسر کریں۔ حضرتِ زکریاؑ کی کفالت میں آ گئیں۔ مقام وہ ہے کہ جہاں وہ آ کے دیکھتے ہیں کہ ایک راہبہ کے پاس کھانے پینے کی کچھ چیزیں ہیں۔ بزرگ تھے کفیل تھے' ان کی نگاہِ دوررس کا تقاضا تھا کہ وہ پوچھتے کہ یہ کہاں سے چیزیں آتی ہیں؟ انہوں نے کہہ دیا کہ اس میں کوئی بات ایسی کوئی شک وشبہ کی نہیں' خدا کے ہاں سے آ جاتی ہیں' اللہ واسطے جسے ہم کہتے ہیں۔ خانقاہ کی راہبہ کے پاس اس قسم کے نذرانے آ جانا کوئی چیز بعید نہیں تھی۔ بات یہاں سے آگے چلے گی۔ یہ سب چیزیں میں پچھلے درس میں عرض کر چکا تھا کہ ایسے وقت میں حضرتِ زکریاؑ کے ہاں خود اپنی اولاد نہیں تھی۔

بحیثیت بزرگ حضرت زکریاؑ کی حضرت مریمؑ سے گفتگو اور پھر خدا تعالیٰ کی بارگاہ میں اولاد کے لیے اظہارِ تمنا

یہ ایک عجیب نفسیاتی کیفیت ہوتی ہے۔ ایک بچی ان کی کفالت میں آ گئی' ان پہ بڑھاپا بھی چھا گیا تھا۔ اس بچی کے ساتھ مانوس ہونے سے دل میں اولاد کا جذبہ جو تھا' وہ بیدار ہوا۔ قرآن عجیب انداز میں بات کرتا ہے آپ غور کیجیے گا' ربط کتنا ہے کہ وہاں اس بچی سے باتیں کر رہے ہیں کہ بیٹی یہ کھانے پینے کی چیزیں کہاں سے؟ آئیں کیسے ملیں؟ اچھی ہو؟ هُنَالِكَ دَعَا زَكَرِيَّا رَبَّهُ ج (3:38) وہیں اپنے دل کے اندر بھی ایک جذبہ بیدار ہوا۔ قَالَ رَبِّ هَبْ لِي مِنْ لَّدُنْكَ ذُرِّيَّةً طَيِّبَةً (3:38) اے میرے نشوونما دینے والے مجھے بھی بیٹا عطا کر' پاکیزہ اولاد تو تو دعاؤں کا سننے والا ہے۔ آپ نے دیکھا کہ کس قدر ایک صحیح بشری تقاضا ہے اور قرآن کا ربط دیکھیے کہ بچی کے ساتھ وہ باتیں کر رہے ہیں' محبت ایک جوش مار رہی ہے' جذبہ بیدار ہو رہا ہے' شدتِ آرزو' دعا کی شکل میں لب پہ آ جاتی ہے کہ اے پروردگار مجھے بھی ایک بیٹا عطا کر دے۔ سورۃ مریم کے شروع میں یہ چیز آئی ہے۔ دعا اس لیے

تھی کہ آلِ ابراہیمؑ کے جو تبرکات ورثہ میں جو چلی آ رہی تھیں چیزیں' اس کے بعد ان کا وارث کوئی نہیں ہوگا۔ اور انہوں نے کہا کہ یہ میرے باقی جو عزیز رشتے دار یا ان کے بیٹے ہیں' ان میں سے کوئی بھی اس کا اہل نہیں ہوسکتا کہ میں ان کے سپرد کروں۔ تو یہ بہت بڑا منصب ہے جو ہمارے سپرد ہے ہدایت کا رشد کا' اس کے لیے مجھے کوئی ایسا بیٹا عطا کر دے جو اس کا اہل ہو۔

لفظ محراب کا لغوی مفہوم اور ہمارے ہاں پایا جانے والا غلط تصور

فَنَادَتۡهُ الۡمَلٰٓئِكَةُ وَهُوَ قَآئِمٌ يُّصَلِّىۡ فِى الۡمِحۡرَابِ ((3:39 عین اسی وقت میں کہ جب وہ ابھی اس دعا میں مصروف تھا فِی الۡمِحۡرَابِ یہ محراب جو ہے ہمارے ہاں تو یہ مسجد کا جو محراب ہوتا ہے اسے کہتے ہیں محراب یا ہمارے ہاں ''پنجابی اچ او مراب پے جاندا اے متھے تے جیہڑا اپینڈا ہوندا ہیگا''۔ محراب بنی اسرائیل کے یہودیوں کے ہاں معبد میں ایک مقام تھا' محراب حرب ہے اس کا مادہ جس کے معنی جنگ کے ہیں خون بہانے کے ہیں محراب وہ مقام جہاں یہ کچھ کیا جائے۔ ان کے معبد میں قربان گاہ ہوتی تھی' وہ قربانی دیا کرتے تھے اپنی عبادت میں۔ قربان گاہ کے اندر چونکہ یہ خون بہانا تھا اس لیے اس مقام کو محراب کہتے تھے۔ لیکن شروع میں جو ہمارے ہاں مسجد بنی ہے اس میں تو محراب وغیرہ کا کوئی ذکر نہیں تھا' بعد میں یہ ساری چیزیں ہم نے دوسروں سے لیں۔ ہمارے ہاں بھی ایک محراب بنا ایک مقام بنا جس کے اندر امام کھڑا ہوتا ہے اور ہم نے اس کا نام محراب رکھ لیا۔ اس زمانے میں تو کسی کا ذہن نہیں ادھر گیا ہوگا' میں سمجھتا ہوں اب تو واقعی لڑائی کی جگہ وہ محراب ہی ہوتا ہے۔ وہ ابھی وہیں کھڑا تھا قربان گاہ میں دعا کر رہا تھا کہ فرشتے نے اسے آن کے کہا۔ حضرتِ زکریاؑ کی چونکہ نبوت کا ذکر قرآن میں ہے۔

نبیوں پر وحی کس طرح نازل ہوتی تھی کوئی غیر از نبی اسے سمجھ ہی نہیں سکتا

نبیوں کے معاملے میں فرشتہ کیسے آتا تھا؟ خدا کیسے بات کرتا تھا؟ میں یہ عرض کر چکا ہوں کہ غیر از نبی اس حقیقت کو پا نہیں سکتا۔ بس یہ ایک مقام ہے جہاں عام انسانوں میں اور نبی میں ایک اختصاص ہوتا ہے۔ ایک تو یہ کہ نبوت کسب و ہنر سے نہیں ملتی' اپنی محنت سے نہیں ملتی' یہ خدا کی موہبت ہے يَّخۡتَصُّ بِرَحۡمَتِهٖ مَنۡ يَّشَآءُ (3:74) اللہ مختص کرتا ہے اس کے لیے منتخب کرتا ہے کسی ایک ہستی کو۔ لیکن انتخاب کے یہ معنی نہیں ہیں کہ آگ لینے کو جائیں' پیغمبری مل جائے۔ وہ تو ایک بلند ترین شخصیت ہوتی ہے جس کو خدا انتخاب کے ذریعے سے اس عظیم ترین ذمہ داری کے لیے منتخب کرتا ہے لوگوں میں سے۔ لیکن نبوت بہر حال اس کی اپنی حاصل کردہ شئے کسب و ہنر سے پیدا کردہ شئے نہیں ہوتی' خدا کی موہبت ہوتی ہے۔ اس لیے نبوت کیسے ملتی ہے؟ کنہ وحقیقت

کیا اس کی ہوتی ہے؟ فرشتہ کیسے آتا ہے؟ کلام کیسے اس پر اترتا ہے؟ غیر از نبی اس کی کیفیت اور ماہیت کو نہیں سمجھ سکتا۔ ہم 478 آلِ عمران پیغام کو سمجھ سکتے ہیں، اس وحی کو سمجھ سکتے ہیں جو اسے ملتا ہے۔ جب وہ وحی دوسروں تک پہنچا دیتا ہے تو اس وقت پھر دوسرے جن تک وہ وحی پہنچتی ہے اور رسول ایک مقام کے اوپر آ جاتا ہے۔ وحی ملنے کے مقام میں تو اختصاص ہے نبوت کا، رسالت کے بعد جب وہ اپنے پیغامِ نبوت کو دوسروں تک پہنچا دیتا ہے تو پھر وہ پیغام سب کے لیے ہو جاتا ہے۔ اس پیغام کو ہم سمجھ سکتے ہیں وہ کس طرح خدا سے ملتا تھا، اسے نہیں سمجھ سکتے۔ اور آج اس کے سمجھنے کی پھر ضرورت بھی کیا ہے؟ نبوت تو ختم ہو گئی ذاتِ رس آلت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر۔ جس انداز سے بھی یہ ملتی تھی، ملتی تھی۔ تو میں نے یہ کہا ہے کہ حضرتِ زکریاؑ کو فرشتے نے آن کے یہ بات کہی اَنَّ اللّٰہَ یُبَشِّرُکَ بِیَحۡیٰی ((3:39 خدا تمہیں ایک بچے کی خوش خبری دیتا ہے۔ یحیٰی: ہمارے ہاں بھی "اے جیونا ناں رکھ لیندے نیں نا" یہ حیات سے ہے "جیوندا رہوے" نام میں یہ چیز تھی۔ آپ کو معلوم ہے جن کے ہاں اولاد نہیں ہوتی یا بڑھاپے میں ایک بچہ ملتا ہے اس کا کچھ عجیب سا وہ نام رکھتے ہیں اللہ رکھا، اللہ دتا۔ یہ اس میں ایک خاص نفسیاتی چیز ہوتی ہے کہ خدا کی حفاظت میں رہے" اوسے نیں ای دتا ہے اوہوای اینوں پالے"۔

حضرت زکریاؑ کو بچے کی پیدائش کی خوشخبری لیکن بیوی کے بانجھ پن کی وجہ سے پریشانی اور اس کا حل

تو نظر آتا ہے کہ حضرتِ زکریاؑ نے اس اعتبار سے، بچہ اتنی تمناؤں کے بعد ملا تھا کہ نام ہی اس کا یحیٰی رکھا "اچھا اللہ جیوندا رکھے اینوں"، یہ یحیٰی کے معنی ہیں "تے جیونا اوہدا ناں رکھ دتا جی" بڑے پیار کا نام ہے یحیٰی۔ مُصَدِّقًۢا بِکَلِمَۃٍ مِّنَ اللّٰہِ (3:39) خدا کے قانون کو اپنے عمل و کردار سے سچ کر کے دکھانے والا وَ سَیِّدًا ((3:39 ایک بڑی جماعت کا سردار وَّ حَصُوۡرًا (3:39) صاحبِ نظم و ضبط وَ نَبِیًّا مِّنَ الصّٰلِحِیۡنَ (3:39) نبی اور جس کی صلاحیتیں خود بیدار ہو چکی ہوں۔ چار لفظوں میں کیا کیا کچھ قرآن کہہ گیا ہے صاحب! بڑی چیز تھی۔ قَالَ رَبِّ اَنّٰی یَکُوۡنُ لِیۡ غُلٰمٌ وَّ قَدۡ بَلَغَنِیَ الۡکِبَرُ وَ امۡرَاَتِیۡ عَاقِرٌ ((3:40 بشارت تو سن لی لیکن بشریت کے تقاضے سے جو چیزیں اس وقت موانعات میں سے تھیں نا اولاد نہ ہونے کی وجہ سے وہ سامنے آئیں۔ اَنّٰی کہا کہ یا اللہ یہ کون سا وقت ہے اب میرے ہاں اولاد ہونے کا، میں بوڑھا ہو چکا، بیوی میری بانجھ ہے۔ آگے بات ہے ایک اس کے درمیان ذرا سا حصہ محذوف ہے۔ عربوں کے ہاں انداز یہ ہوتا تھا یاد رکھیے! بلاغت اسے کہتے تھے کہ درمیان میں ایک حصہ وہ

محذوف کر جاتے تھے' وہ چھوڑ دیتے تھے سننے والے کے اپنے فہم وادراک کے اوپر کہ وہ اس فقرے کو درمیان میں رکھ کے پورا
کرے اور بات صاف ہوتی چلی جائے۔ کہا کہ میں بوڑھا' بیوی بانجھ' بچے کی خوش خبری تو کیا یہ اسی طرح سے ملے گا جیسے یہ لڑکی مجھے مل گئی ہے یا میرے ہی ہاں بچہ ہوگا؟ بڑی چیز تھی یہ کہ یہ جو چیز ہے بچہ ہونے کے راستے میں یہ چیزیں حائل ہیں' خوش خبری بھی ہے تو یہ ہوسکتا ہے نا کہ جیسے یہ ایک بچی مجھے ملی ایک اسی طرح سے مجھے بچہ ملے۔ قَالَ كَذٰلِكَ اللّٰهُ يَفْعَلُ مَا يَشَآءُ((3:40 کہا نہیں! جس طرح خدا کی مشیت کے مطابق بچہ ہوا کرتا ہے' ویسے ہوگا۔ اور ہمارے ہاں تو چونکہ جب تک کسی چیز کو چیستاں نہ بنایا جائے' اس میں کچھ لطف پیدا نہیں ہوتا اس لیے ان تمام چیزوں کے اندر پھر ہم چیستاں بنا لیتے ہیں۔ ٹھیک ہے حضرتِ زکریاؑ بوڑھے ہیں' بڑھاپا اولاد کے لیے مانع نہیں ہوسکتا ایک ہی چیز تھی' بیوی بانجھ ہے۔ دیکھیے قرآنِ کریم یہ جو ہے نا كَذٰلِكَ اللّٰهُ يَفْعَلُ مَا يَشَآءُ((3:40 ہمارے ہاں تو یہ کیا جاتا ہے کہ صاحب! وہ اللہ جسے چاہتا ہے دے دیتا ہے' تم کیوں اس کی پرواہ کرتے ہو۔ یعنی اس میں یہ جو طریق ہے نا ایک بچے کے پیدا ہونے کا' اس میں استثنا ہوجائے گی' ہم اپنی مشیت سے یہ جسے چاہتے ہیں ایسے ہی دے دیتے ہیں۔ میں نے پچھلی دفعہ بھی عرض کیا تھا ایسے دے دینے کے متعلق خدا نے جس انداز میں نفی کی تھی' وہ تو بڑی عظیم بات تھی۔ آپ کو یاد ہے میں نے بتایا تھا کہ قرآن نے یہ کہا ہے کہ وہ ٹھیک ہے بَدِيْعُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ (6:101) ہے ہم اس کائنات کو وجود میں لائے ہیں بالکل عدم سے NON EXISTENCE سے EXISTENCE میں ہم لائے ہیں۔ یہ ٹھیک ہے ہم ایسا کر سکتے ہیں لیکن اس کے بعد تم کہتے ہو کہ ہمارے ہاں ایک بیٹا بھی ہے؟ تو اس کے بعد جواب دیا تھا کہ میری تو بیوی نہیں ہے' تو جب بیوی نہیں ہے تو بیٹا کیسے ہوگا۔ یعنی کائنات کو تو عدم سے وہ وجود میں لے آتا ہے وہاں تو کوئی قاعدہ قانون مقرر نہیں ہے لیکن جب کائنات وجود میں آجاتی ہے تو اس کے بعد ہر چیز کے لیے ایک قانون مقرر ہے۔ حتیٰ کہ اولاد کی پیدائش کے لیے بھی یہ قانون مقرر ہے کہ مرد اور عورت کے اختلاط سے بیٹا ہونا ہے۔ عجیب حسین انداز میں قرآن نے وہ بات کی ہے صاحب کہ بَدِيْعُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ (6101) وہ ہے بے شک لیکن جہاں تک اس کے بیٹے پیدا ہونے کا تعلق ہے' اس کی تو بیوی نہیں ہے۔ حالانکہ سیدھی سی بات ہے کہ جو اتنی عظیم کائنات کو بغیر کسی پہلے میٹریل کے وجود میں لا سکتا ہے' بغیر بیوی کے بغیر عورت کے بچہ کیوں نہیں پیدا کر سکتا۔ وہ کہتا ہے کہ نہیں! اب ہم نے اپنے اوپر یہ قوانین کے حدود وارد کر رکھے ہیں' اس سے اب استثنا نہیں ہوگی۔ اگر بیوی نہیں ہے تو بچہ نہیں۔ تو میں نے اسی لیے کہا تھا کہ CONVERSLY اگر عورت کے خاوند نہیں ہے تو بچہ نہیں ہے۔ بڑا انداز تھا قرآن کا۔ یہاں بھی یہ چیز جو کہی کہ یہ نہیں ہے کہ کوئی بات نہیں ہے' تم بوڑھے ہو وہ بانجھ ہے' اس کے

باوجود ہم یہ کر دیں گے۔ سنیے قرآن کیا کہتا ہے؟ [1]

قرآنِ حکیم کو سمجھنے کے لیے تصریفِ آیات کو پیش رکھنا ضروری ہے

اصل میں مشکل ہماری یہ ہے کہ ہم قرآن سمجھنے کا جو انداز ہے نا تصریفِ آیات کا' ایک بات کو جہاں جہاں قرآن کہتا ہے ان کو سامنے لایئے تو بات صاف ہو جاتی ہے۔ یہ خود بوڑھے' طبی نقطۂ نگاہ سے بڑھاپا مانع نہیں ہوتا اولاد کا' مرد کے اندر اولاد پیدا کرنے کی صلاحیت کے جراثیم آخری عمر تک بھی رہتے ہیں اگر صحت اچھی رہے تو۔ عورت میں ایک DEFECT تھا ان کی بیوی میں' بانجھ تھی۔ سورۃ انبیا میں سنیے قرآن کیا کہتا ہے؟ وہاں جو ذکر آیا ہے حضرتِ یحییٰؑ کی پیدائش کا وہاں یہ کہا ہے وَ اَصۡلَحۡنَا لَهٗ زَوۡجَهٗ (21:90) ہم نے اس کی بیوی کا وہ نقص دور کر کے اس کے لیے اس قابل بنا دیا کہ بچہ پیدا کر سکے۔

حضرت زکریاؑ کی بیوی کا شفایاب ہونا ہی بچے کی پیدائش کا سبب تھا

یہ عربی دان احباب ذرا اَصۡلَحۡنَا لَهٗ (21:90) کا جو ہے له اس کو دیکھیں کہ قرآن کیا کہہ گیا ہے؟ اَصۡلَحۡنَا لَهٗ (21:90) اس کی بیوی کو ہم نے تندرست کر دیا لَهٗ اس مرد کے لیے۔ اس میں DEFECT کوئی نہیں تھا۔ اَصۡلَحۡنَا لَهٗ (21:90) کس انداز سے بات کہتا ہے قرآن۔ وَ اَصۡلَحۡنَا لَهٗ زَوۡجَهٗ (21:90) اس کے لیے اس کی بیوی کو اس قابل بنا دیا کہ وہ اولاد پیدا کر سکے۔ عزیزانِ من! یہ ہے كَذٰلِكَ اللّٰهُ يَفۡعَلُ مَا يَشَآءُ (3:40)۔ قَالَ رَبِّ اجۡعَلۡ لِّىۡۤ اٰيَةً (3:41) کہا کہ اس کے لیے کوئی خاص حکم ہو تو فرما دیجیے۔ قَالَ اٰيَتُكَ اَلَّا تُكَلِّمَ النَّاسَ ثَلٰثَةَ اَيَّامٍ اِلَّا رَمۡزًا (3:41) یہودیوں میں روزہ رکھا جاتا تھا تو اس میں کھانے پینے کے علاوہ بات کرنے کی بھی ممانعت ہوتی تھی۔ نفسیاتی طور پر اس سے یہ کہا گیا کہ ایک چیز اپنے سامنے رکھو' تین دن کے لیے روزہ رکھو یا' اس شکرانے میں روزہ رکھو۔ وَاذۡكُرۡ رَّبَّكَ كَثِيۡرًا وَّسَبِّحۡ بِالۡعَشِىِّ وَالۡاِبۡكَارِ (3:41) اور قانونِ خداوندی کو بڑی کثرت سے اپنے سامنے رکھو۔ باقی جتنے کام کاج تم یہ کرتے ہو' جن میں مصروف رہتے ہو۔۔ میں نے عرض کیا تھا کہ تسبیح کے معنی ہوتے ہیں عربی زبان میں اور قرآن کی رو سے کسی فرائضِ مفوضہ کی سرانجام دہی میں پوری قوت سے' شدتِ عمل سے سرگرداں رہنا' مصروف رہنا۔ تسبیح کہتے ہیں گھوڑے کا جو پورے چار پاؤں سے دوڑنا ہوتا ہے' اسے تسبیح کہتے ہیں۔ تیراک کا ہاتھ پھیلا کے تیراکی جو ہوتی ہے'

1۔ کیا یہ امر قابلِ غور نہیں کہ مرغی خانے کے فارمی انڈوں میں بچے پیدا ہونے کی صلاحیت کیوں ناپید ہوتی ہے؟

اسے تسبیح کہتے ہیں۔ پرندوں کا اس تیزی سے اڑنا جو ہے وہ ان کی تسبیح ہوتی ہے۔تو یہ کہا کہ باقی جس طرح سے تم کام کاج آپ کرتے ہو'اس میں تم مصروف رہو صبح شام اپنے فرائض کے اندر' بس اتنی سی چیز ہی ہے ذرا کہ نفسیاتی طور پہ اس چیز کو ذہن میں رکھو۔ اتنی سی بات ہے جو قرآن نے کہی لیکن میں نے کہا ہے کہ اس میں کوئی چیز خلافِ فطرت' خلافِ عادت' کوئی چیز SUPRA NATURAL نہیں ہے۔ وَ اَصۡلَحۡنَا لَہٗ زَوۡجَہٗ (21:90) بات بالکل صاف کر دی۔ علاج ہوا' بیوی کا نقص دور ہو گیا' یہ تو تھے اس قابل کہ اولاد پیدا کرتے' بچہ پیدا ہو گیا۔ ضمناً بات یہ درمیان میں آ گئی لیکن اصل میں تو واقعہ چلا آ رہا ہے حضرتِ مریمؑ کا۔ میں نے گذارش کی ہے کہ حضرتِ مریمؑ کی بڑی عظمت قرآن نے بتائی ہے۔۔ اتنی عظمت کہ پیچھے سے تمام انبیائے کرامؑ کا قصہ چلا آ رہا ہے حضرتِ نوحؑ سے لے کے اور حضرتِ یحییٰؑ تک چلا آ رہا ہے۔ اور اس کے بعد ہے حضرتِ مریمؑ کا نام اور ان کا ذکر اور اس کے بعد ہے اِنَّ ھٰذِہٖۤ اُمَّتُکُمۡ اُمَّۃً وَّاحِدَۃً ۫ۖ وَّ اَنَا رَبُّکُمۡ فَاعۡبُدُوۡنِ (21:92) حضرتِ مریمؑ نبیہ نہیں تھیں' قرآن کی رو سے کوئی عورت نبی نہیں تھی۔ انبیائے کرامؑ کے ذکر کے بعد آخر میں حضرتِ مریمؑ کا ذکر ہے اور کہا ہے کہ یہ تمہاری امت گروہ' ایک گروہِ واحد تھا۔ یاد رکھو! یہ تمام افراد ایک سلکِ گہر میں منسلک تھے' ایک امت کے افراد تھے' ایک گروہ کے افراد تھے اور ہم ان کے رب تھے۔ میں کہہ یہ رہا ہوں کہ ان کی عظمت اتنی ہے کہ نبی نہ ہونے کے باوجود انبیائے کرامؑ کے گروہ میں شامل کیا ہے ان کی امت میں سے' قرآن نے گنا دیا اس گروہ میں سے قرآن نے ان کو گنا دیا۔ کیا بات تھی؟

حضرت مریمؑ کے سلسلہ میں سابقہ درس کی یاددہانی کے طور پر کچھ سطور

پچھلی دفعہ آپ درس میں تھے' آپ کو معلوم ہوگا میں نے جو تفصیل سے عرض کیا تھا۔ نو وارد احباب شاید ہوں تو چند لفظوں میں پھر عرض کر دوں۔ خانقاہیت کی زندگی' راہبانیت کی زندگی' ہیکل کے اندر ایک تو پجاری لیکن دوسرے یہ راہب ترکِ دنیا کرنے والے' تجرد کی زندگی بسر کرنے والے پھر راہبہ جن کو ننز کہتے ہیں ہمارے ہاں' شادی نہیں ہو سکتی ساری عمر۔ خانقاہیت کی زندگی کو خود قرآنِ کریم نے دوسرے مقام پہ کہا ہے کہ ہم نے کہیں یہ فرض نہیں کیا تھا ان کے اوپر' انہوں نے خود اپنے ذہن سے ایک طریق وضع کیا۔ انسانوں کا خود ساختہ طریق ہے۔ اور اس کے بعد یہ کہا کہ پھر اس کو نباہ بھی نہ سکے۔ یہ کہ دنیا کو ترک کر کے کسی گوشے میں چلے جانا' فرار ہے کشمکشِ حیات سے' SAYING NO TO LIFE ہے یہ۔ قرآن SAYING YES TO LIFE کہتا ہے مقابلہ کرتا ہے دنیا کے تمام کشاکشِ حیات کا۔ اس لیے خانقاہیت کی زندگی یکسر انسانیت کو قبرستان میں تبدیل کر دینے والی شے ہے۔ بہت بڑی بغاوت کی ہے قرآن نے اس کے خلاف۔ یہودیوں کے ہاں اس دور میں جب یہ ذکر آ

رہا ہے حضرتِ مریمؑ کا ان کے ہیکل کے اندر بھی انہوں نے راہبہ اپنے ہیکل میں لانی شروع کر دیں۔ پہلے تو جیسا میں نے طرح
تھا راہبہ کے لیے بالغ ہونے تک وہ وہاں ان کو رکھتے تھے پھر وہ باہر چلی جاتی تھیں۔ اس کے بعد انہوں نے پھر اس قانون کے اندر تبدیلی کی۔ اب دیکھیے خود قانون کیسے بدل رہے ہیں اور نظر آ رہا ہے کہ اس کے جذباتِ محرکہ کیا تھے اس قانون کے بدلنے کے ؟ کہ نہیں راہبہ عورت جو ہے مندروں کی دیوداسیوں کی طرح یہیں رہیں گی۔ یا تو وہ ساری عمر تجرد کی زندگی بسر کریں گی' نکاح نہیں کر سکیں گی اور یا وہ صرف ہیکل کے پجاریوں میں سے کسی کے پاس رہیں گی۔ دیکھتے ہیں آپ خود ساختہ قانون کس طرح بدلتا ہے۔ یہ تھا وہ مقام جس مقام پہ حضرتِ مریمؑ یہاں آئیں۔ اس مقام میں کیفیت کیا تھی؟ بڑے عجیب انداز سے قرآن بتا جاتا ہے اگلی دو آیتوں کے بعد آیت 44 سامنے لایے اسی سورۃ کی **وَ مَا كُنْتَ لَدَيْهِمْ اِذْ يُلْقُوْنَ اَقْلَامَهُمْ اَيُّهُمْ يَكْفُلُ مَرْيَمَ ص وَ مَا كُنْتَ لَدَيْهِمْ اِذْ يَخْتَصِمُوْنَ** ((3:44) جوان ہوگئی ہے۔ بچی تھی تو حضرتِ زکریاؑ کی کفالت میں' ہیکل کے پجاریوں میں کوئی کسی قسم کا نہ جھگڑا ہے نہ لڑائی ہے کچھ نہیں۔ جوان ہوگئی تو قرآن کہتا ہے اب آپس میں لڑنے جھگڑنے لگے کہ یہ کس کے پاس جائے گی۔ اس **يَخْتَصِمُوْنَ** نے کس قدر بات واضح کی ہے۔ ہیکل میں اس لڑکی کے اوپر آپس میں ان کے لڑائی جھگڑے شروع ہو گئے اور معاملہ یوں طے نہیں ہو رہا تو قرعہ اندازی سے طے کرنے لگے' لاٹری ڈال رہے ہیں اس لڑکی کی کہ کس کے پاس چلی جائے گی۔

ہیکل کے اندر شریعت کے اجارہ داروں کی ذلّت آمیز داستان

حضرتِ مریمؑ یہ سب کچھ دیکھ رہی تھیں ان کی ہوس ناکیوں کی آلودگی کو بھانپ رہی تھیں' اپنی مجبوری کو دیکھ رہی تھیں۔ کیونکہ وہ اپنے ذہن میں تو سمجھی ہوئی تھی کہ یہ شریعت ہے' یہ پابندی جو عائد کی ہے میں نے اپنے اوپر' یہ تو یہیں رہنا۔ دوسری طرف وہ یہ دیکھ رہیں تھیں کہ ہو کیا رہا ہے اس ہیکل کے اندر۔ یہودیوں کی گرفت جو تھی اس زمانے کی پیشوائیت کی تھیوکریسی تھی۔ رومنز کی حکومت تھی لیکن رومنز کے پاس ان کو موت کی سزا کی تصدیق کے لیے جانا پڑتا تھا CONFIRM کرانے کے لیے' اس سے کم درجے کی ہر سزا یہ خود دے سکتے تھے یہ ہیکل کے پجاری۔ سارا معاشرہ جو تھا بنی اسرائیل کا ان کے اندر آپ سوچ سکتے ہیں کہ معاشرتی گرفت بھی کتنی بڑی ہوگی قانون کے علاوہ۔ آپ کے ہاں بھی جس زمانے میں اقتدار تھا ان لوگوں کا جو شریعت کے اجارہ دار تھے' آپ کو معلوم نہیں کہ انہوں نے کس کس قسم کی سختیاں اور صعوبتیں کی ہوئی تھیں۔ جس سے ذرا اختلاف ہوا کھال کھنچوا دی' دار پہ لٹکوا دیا' زندہ جلا دیا' مردوں کو نکلوا کے ان کی ہڈیاں پیستے تھے یہ آپ کے ہاں کے اربابِ شریعت۔

478آلِ عمران ماں کی نظریاتی پسماندگی اور مذہبی پیشوائیت کی گرفت میں حضرت مریمؑ کی معصوم زندگی کی جرأت آمیز داستان

عزیزانِ من! آپ کے ہاں اور کسی دوسرے کے ہاں کا تصور ہی نہیں ہے۔ جہاں بھی پریسٹ کرافٹ آئے گی، یہ ساری لعنتیں اس کے ساتھ آئیں گی۔ اور جب حکومت اتنا اقتدار دیدے کسی پیشوائیت کو کہ آپ جو جی چاہے، قانون نافذ کردیں تو اس کی گرفت آپ سمجھ سکتے ہیں۔ یہ یہودیت کی گرفت، یہ ان پیشوائیت والوں کا اقتدار، وہ معاشرہ، اپنا گھرانہ اتنا مذہبی کہ خود ماں لا کے ہیکل کے سپرد کر گئی ہے ایک بچی کو نذر میں دے کے۔ اس گھرانے کی، اس معاشرے کی، اس ماحول کی، اس مذہبی پیشوائیت کی زنجیروں میں جکڑی ہوئی ایک مظلوم و معصوم بچی اور وہ دیکھ رہی ہے کہ یہاں کیا ہو رہا ہے۔ یہ چیز میں کہتا ہوں اتنی سی بات بھی جو ہے کہ ایک لڑکی کے متعلق قرعہ اندازیوں سے فیصلہ ہو رہا ہے کہ یہ کس کے پاس چلی جائے گی اس سے زیادہ ذلت کوئی اور ہو سکتی ہے۔ حیوانوں کو تو بیچا جا سکتا ہے اس طرح سے، انسانوں کو اس طرح سے سپرد کیا جائے؟ لیکن معاف رکھیے ہم کس طرح سے اپنی بچیوں کو دوسروں کے سپرد کرتے ہیں؟ کیا ان میں ان کی کوئی SAY بھی ہوتی ہے؟ ان کی کوئی رضامندی بھی ہوتی ہے؟ اتنا ہی نہیں بیشتر ایسے مقامات ہوتے ہیں جہاں ہمیں علم ہوتا ہے کہ لڑکی رضامند نہیں ہے، باندھ کے بھیج دیتے ہیں۔ اس قرآن کے پڑھنے والے کہ جس نے یہ کہا ہے لَا یَحِلُّ لَكُمْ اَنْ تَرِثُوا النِّسَآءَ كَرْهًا (4:19) یہ حلال نہیں ہے کہ عورت کی مرضی کے بغیر کوئی اس کا مالک بن جائے، حلال نہیں ہے۔ عزیزانِ من! کیا بات قرآن لَا یَحِلُّ لَكُمْ (4:19) کہہ گیا ہے؟ حرام ہے یہ۔ آپ سمجھتے یہ ہیں کہ چار کلمے ہم نے پڑھا دیے اور اقرار نامے پہ، وہ نکاح نامے کے دستخط کرا دیے، نکاح جائز ہو گیا، شریعت کے تقاضے پورے ہو گئے۔ لَا یَحِلُّ لَكُمْ (4:19)۔

شادی کے سلسلہ میں مرد اور عورت کی رضامندی یکساں مدارج کے حامل ہوتے ہیں

عزیزانِ من! مرد اور عورت قرآن کی رو سے انسان ہیں، یکساں مدارج کے حامل ہیں ان دونوں میں سے کسی ایک کی رضامندی کے خلاف کسی کی زندگی کا مستقبل دوسرے کے حوالے کر دینا، انتہائی بدترین قسم کی غلامی ہے۔ ٹھیک ہے ماں باپ بچوں کے مستقبل کو دیکھ سکتا ہے، ان کی مصلحت کو سوچ سکتا ہے، ان کو سمجھا جا سکتا ہے، انہیں مشورہ دے سکتا ہے لیکن ان کی مرضی کے خلاف خود فیصلہ نہیں کر سکتا۔ تو وہاں تو یہ سب کچھ ہو رہا تھا۔ میں یہ کہہ رہا تھا کہ بندھی ہوئی خانقاہیت کی زنجیروں میں بچی، گھر جا نہیں

سکتی کہ انہوں نے تو خود اس کو وقف کیا تھا ہیکل کے لیے' معاشرے میں جا نہیں سکتی۔ کسی ایک نن کو یہاں سے کہیے نا وہاں سے کہ وہ نکلے اور باہر آ کے پھر معاشرے میں رہے؟ اس پہ تو نفسیاتی اثر اتنا زیادہ غالب ہوتا ہے کہ وہ پاگل ہو جائے۔ایک فلم آئی تھی یہاں' میں نے دیکھا اس فلم کو اور وہ میں دیکھتا ہوں کہ خاص طور پہ ایک مصلحت کے ماتحت بنائی گئی تھی۔ایک نن بھاگی تھی گرجے سے اس کے بعد انہوں نے بتایا ہے کہ اس کی دماغی کیفیت کیا ہو گئی تھی؟ وہ اس قدر اس کو پھر حیران اور پریشان اور ششدر اور سرگرداں دکھایا گیا ہے' کہیں اس کو چین نہیں پڑتی تھی۔اور پھر وہ ان کے عقیدے کے مطابق آئی تو حضرتِ مریمؑ کا مجسمہ جو تھا اس ہیکل کے اندر اس میں زندگی پیدا ہوئی اس نے اپنا ہاتھ اس کے سر پہ رکھا۔گویا اس نے توبہ کی پھر وہاں آئی' پھر کہیں سکون ملا۔اس قسم کے نفسیاتی گھیراؤ بھی تو پیدا کیے جاتے ہیں۔۔ یہ آج کی اصطلاح ہے۔یہ بچی ہے اور وہاں یہ چیز جو ہے پیدا ہوتی ہے کہ یہ سب زنجیریں غلط اور باطل ہیں۔عزیزانِ من! ان کو توڑنے کے لیے بڑی ہمت کی ضرورت ہے۔شاید اس کا ہم اندازہ نہ لگا سکیں لیکن ذرا سوچیے اندازہ لگانے کے لیے۔

اپنے ہاں معاشرتی اور تمدنی طور پر غلط رسومات کو اپنائے رکھنا خود اپنے گلے میں موت کا پھندہ ڈالنے کے مترادف ہے

آج ہمارے معاشرے میں نکاح' شادی' مرنے جینے کے معاملے میں کتنی رسوم ایسی ہیں کہ جب بھی کسی کے ہاں ہم جاتے ہیں' وہ رسم ہو رہی ہوتی ہے تو ہم سارا وقت بیٹھے ہوئے تنقید کر رہے ہوتے ہیں کہ صاحب! کیا فضول چیزیں ہیں۔اب دیکھیے نا کتنا خرچ ہو رہا ہے صرفہ ہو رہا ہے۔یہ غریب قوم AFFORD اس کو کر سکتی ہے کسی طرح سے؟ اور یہ دیکھیے وقت کتنا ضائع ہو رہا ہے اور خوامخواہ بیہودہ بندھے ہوئے ہیں۔یہ ہو رہا ہے' وہ ہو رہا ہے' سارا کچھ ہو رہا ہے۔اپنے ہاں جب ہوتا ہے تو وہی کچھ کرتے ہیں پھر۔صاحب یہ تو سارا کچھ؟ ''او جی کی دسیے اپنی مجبوریاں ہیگیاں نیں آدمی کچھ کر سکدا ہیگا' بنا ہویا ہیگا''۔موت کی رسمیں ہمارے ہاں کی ہر شخص تنقید کرتا ہے جب اپنا مردہ اٹھاتا ہے' وہی کچھ کرتا ہے۔او صاحب! کیا ہو گیا تمہیں؟ ''او جی اسی تے منے آں' عورتاں نئیں ناں منن دیندیاں ہیگیاں۔آ رکھیاں ہویاں نیں نا عورتاں اسی اے پھندۂ قصاب''۔لیکن میں کہتا ہوں کہ عورتیں ہوں یا مرد ہوں' میں بتا یہ رہا تھا' چھوٹی چھوٹی رسمیں جن کے عواقب میں ہمیں کوئی تکلیف اور اذیت نہیں برداشت کرنی پڑ رہی۔ہر شخص اسے محسوس کر رہا ہے' پہل کرنے کی ہمت نہیں کر رہا۔ہم آزاد ہیں' کوئی پھانسی پہ نہیں چڑھ جانا ہم نے' نکو نہیں بن جانا ہم نے معاشرے میں' محض اندر ہی ایک اپنی کمزوری ہے جو ابھرنے نہیں دیتی۔اس BACK

 GROUND میں مریم کو رکھیے' اس نن کو اس ہیکل میں۔ اور اس کے اندر سے صحیح فطرت کی آواز پکار رہی ہے کہ غلط ہو رہا ہے اور اس کے بعد یہ عزم کہ میں پہل کروں گی اس کے لیے اور توڑ کے بتاؤں گی۔

ایک غریب بڑھئی سے شادی کا معاملہ تو حضرت مریمؑ کے لیے اپنے اندر جرأت اور عظمتوں کی داستان لیے ہوئے ہے

عزیزانِ من! اتنی بڑی انقلاب آفریں عورت دنیا کے اندر کم دیکھنے میں آئے گی۔ یہ ہے جو قرآن اس کی عظمت بیان کر رہا ہے۔ ''شاباش اوئے ماں دی اے جائی اے''۔ توڑی اس نے یہ زنجیریں' علی الرغم نکل گئی یہاں سے۔ اور اس کے بعد اپنے چوائس سے ایک غریب بڑھئی سے جا کے شادی کر لی۔ معاشرہ نے وہ کچھ کیا۔ اس نے کہا کرتے رہو' میں تمہارا ملک چھوڑ دوں گی' وطن چھوڑ دوں گی' قوم چھوڑ دوں گی' گھر بار چھوڑ دوں گی لیکن تمہاری غلط شریعت کی پابندیوں کو اپنے اوپر وارد نہیں کروں گی۔

عزیزانِ من! یہ ہے وہ مریمؑ۔ وَ اِذۡ قَالَتِ الۡمَلٰٓئِکَۃُ یٰمَرۡیَمُ اِنَّ اللّٰہَ اصۡطَفٰکِ وَ طَہَّرَکِ (3:42) میں نے کہا ہے نا مقام وہ ہے کہ وہ دیکھ رہی ہے کہ مجھے جھپٹنے کے لیے جھگڑے ہو رہے ہیں' قرعے پڑ رہے ہیں' لاٹری سے میرا فیصلہ ہو رہا ہے۔ چناں چہ اس کے اندر کس قدر انقلاب کے عظیم جذبات نہیں ابھرے ہوں گے۔ عین اس مقام پہ قرآن کہتا ہے یہاں ہے کہ جب ملائکہ نے مریمؑ سے کہا۔ مریمؑ کے متعلق ہم دیکھ چکے ہیں قرآن کی شہادت ہے کہ نبی نہیں تھی۔ ملائکہ نے کہا۔ یہ کیا کوئی خاص استثنا ہے EXCEPTION کی گئی اس کے لیے؟ نہیں۔

ملائکہ کے نزول کا معاملہ اور اس کی نوعیت اور ماہیت

عزیزانِ من! ملائکہ کا نزول: میں یہ پہلے بتا چکا ہوں' ملائکہ کیا ہیں۔ پھر بھی بتا تا چلا جاؤں گا۔ میں یہاں یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ یہ کوئی خصوصیت کسی خاص فرد کی نہیں تھی نبی کے علاوہ۔ نبی کے ملائکہ کا ذکر جو میں نے کہا ہے' وہ بات کوئی اور ہے' ہم نہیں سمجھ سکتے۔ غیر از نبی کے متعلق جب ملائکہ کا نزول ہوگا' یہ بات نہیں ہے کہ اس کو ہم کسی خاص ولی اللہ یا خاص نبیوں کی صف میں لے جائیں گے۔ قرآن کہتا ہے اِنَّ الَّذِیۡنَ قَالُوۡا رَبُّنَا اللّٰہُ ثُمَّ اسۡتَقَامُوۡا (41:30) وہ کہ جنہوں نے کہہ دیا کہ ہاں ہمارا نشوونما دینے والا اللہ ہے اور پھر جم کر کھڑے ہو گئے اس کے اوپر۔ تَتَنَزَّلُ عَلَیۡہِمُ الۡمَلٰٓئِکَۃُ (41:30) ان کے اوپر ملائکہ کا نزول ہوتا ہے۔ یہ تو نہ انبیا ہیں' نہ ہی کوئی خاص طور پہ منتخب شدہ حضرتِ مریمؑ کا ذکر ہے۔ یہ تو ہر اس شخص کا ذکر ہے کہ جو کہہ دے کہ میرا رب

اللہ ہے اور اس پہ جم کے کھڑا ہو جائے۔

یہ الفاظ کہ میرا رب اللہ ہے اپنے اندر ایک ایسا لامحدود پروگرام لیے ہوئے ہیں جو پوری کائنات پر محیط ہے

ضمناً یہ عرض کر دوں کہ یہ میرا رب اللہ کہنے کو ہم کہیں گے صاحب، یہ کونسی ایسی بات ہے کہ پھر اس کے اوپر استقامت سے کھڑا ہوا جائے؟ ساری عمر ہم کہتے رہیں گے۔ یہ کہتے رہنے کی بات نہیں ہے یہ بہت بڑا اجہادِ عظیم ہے کہ ربوبیت' نشوونما کے سامان یہ ذرائع کسی انسان کی ملکیت میں نہیں ہو سکتے، خدا کی ملکیت ہے، انسان ان کا امین ہو سکتا ہے۔ اس عظیم پروگرام کے اوپر جم کے کھڑا ہو جانے والا، اس پہ ملائکہ کا نزول ہوتا ہے۔ اَلَّا تَخَافُوۡا وَ لَا تَحۡزَنُوۡا (41:30) وہ ملائکہ کہتے ہیں اس سے، مت خوف کھاؤ۔ دیکھا یہ ایسی چیز ہے رَبُّنَا اللّٰہُ (41:30) کہنا۔ کتنے خوف کے سامان ہیں اس لیے کہ دنیا میں تو ہر صاحبِ اقتدار کہے گا فرعون کی طرح کہ اَنَا رَبُّکُمُ الۡاَعۡلٰی (79:24) میں تمہارا ان داتا ہوں۔ ہر صاحبِ اختیار ان داتا منواتا ہے اپنے آپ کو۔ آپ کو معلوم ہے کہ ہندی کے اندر یہ راجے کو کہتے ہی ان داتا تھے۔ تو جونہی کسی نے اپنے آپ کو ان داتا منوایا بس آپ کی ساری انسانیت کی خصوصیات اس کے سامنے ڈھیر ہو کے رہ گئیں۔ یہ کوئی چھوٹی بات نہیں ہے کہ دنیا میں کسی انسان کو یہ نہ کہے کہ تمہارے ہاتھ میں میرا رزق ہے۔ اَلَّا تَخَافُوۡا ملائکہ اس سے آگے پھر کہتے ہیں کہ مت خوف کھاؤ وَلَا تَحۡزَنُوۡ (41:30) ڈرو بھی نہیں باہر کے خطرے سے، اندر بھی کوئی افسردگی دل میں تمہارے نہ آئے وَ اَبۡشِرُوۡا بِالۡجَنَّۃِ الَّتِیۡ کُنۡتُمۡ تُوۡعَدُوۡنَ (41:30) بشارت لو ہم سے اس جنت کی جس کا تم سے وعدہ کیا گیا ہے۔ نَحۡنُ اَوۡلِیٰٓؤُکُمۡ فِی الۡحَیٰوۃِ الدُّنۡیَا وَ فِی الۡاٰخِرَۃِ (41:31) ہم تمہارے رفیق ہیں، ہم تمہارے دوست ہیں اس دنیا کی زندگی میں بھی، آنے والی دنیا کی زندگی میں بھی۔ ملائکہ آ کر کہتے ہیں ہر اس شخص سے کہ جو کہے کہ میرا رب اللہ ہے اور پھر جم کر کھڑا ہو جائے۔ میں کہہ یہ رہا تھا کہ حضرتِ مریمؑ کو اگر ملائکہ نے آ کے کوئی خوش خبری دی ہے تو اس سے ان کا نبی ہو جانا یا ان پہ وحی کا نازل ہو جانا، یہ ثابت نہیں ہوتا جیسے کہا جاتا ہے کہ صاحب انبیا کے ساتھ ہی وحی مخصوص نہیں ہے دیکھیے حضرتِ مریمؑ کی طرف بھی تو آئے تھے ملائکہ اس لیے ہم پہ بھی آتے ہیں۔

چہ بے خبر ز مقامِ محمد عربی ﷺ است

ایسا کہنے والے کو پتہ ہی نہیں مقامِ نبوت کیا ہوتی ہے۔ ملائکہ کا نزول، یہ ہوتا کیا ہے؟

478 **آلِ عمران**

میدانِ بدر میں ملائکہ کا نزول اور ان کی طرف سے معاونت کی شکل وصورت

عزیزانِ من! باتیں بڑی لمبی ہیں وقت ہوتا ہے تھوڑا' میں کیا عرض کروں آپ کے سامنے۔ کیا کرتے ہیں ملائکہ؟ ان کے نزول سے یہ کیفیت کیسے پیدا ہوتی ہے؟ سنیے وہ بدر کے میدان میں جو فرشتے آتے ہیں اِذْ يُوْحِىْ رَبُّكَ اِلَى الْمَلٰٓئِكَةِ اَنِّىْ مَعَكُمْ فَثَبِّتُوا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا (8:12) ملائکہ سے کہا کہ جاؤ حق و باطل کا بڑا عظیم معرکہ ہے اس وقت' وہ وقت آ گیا ہے جس کے لیے حضورِ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کہا تھا اے اللہ! یہ چند نفوس دنیا میں تیرے نام کو ثبت کرنے کے لیے ساری بازیاں ہار کے اس میدان میں آ گئے ہیں۔ اگر یہ جماعت آج یہاں مٹ گئی تو قیامت تک تیرا نام لینے والا کوئی نہیں ہوگا۔ اس لیے کہ آخری نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تھے نا۔ اس وقت کہا جاتا ہے ملائکہ سے جاؤ فَثَبِّتُوا میدان میں جا کر ان کے پاؤں جما دو وہاں۔ کس طرح سے پاؤں جما دو؟ کیا کر دو؟ وَمَا جَعَلَهُ اللّٰهُ اِلَّا بُشْرٰى وَلِتَطْمَئِنَّ بِهٖ قُلُوْبُكُمْ (8:10) ان کے دلوں میں اطمینان پیدا کر دو بس پاؤں جم جائیں گے۔ عزیزانِ من! ملائکہ کا نزول اس طرح سے ہوتا ہے' ایک نفسیاتی کیفیت بدل جاتی ہے انسان کی۔ وہ بدلتی ہے اس طرح سے کہ انسان کو یقینِ کامل اس چیز کے لیے ہو کہ حق کے لیے کھڑا ہوا ہوں دُنیا میں کوئی قوت مجھے ڈرا نہیں سکتی۔ جم کے کھڑا ہوا ہوں' کامیاب و کامران جاؤں گا تو پھر بھی میں غالب رہوں گا۔ اگر یہاں مغلوب ہو کے جان دے دوں گا' حیاتِ جاوید حاصل ہو جائے گی۔ جسے یہ ایمان حاصل ہو جائے' اس سے بڑا اطمینان کس کو حاصل ہو سکتا ہے؟ جسے اطمینان یہ حاصل ہو جائے' اس سے بڑا مستقل مزاج اور استقامت پذیر اور کون ہو سکتا ہے؟ ملائکہ یہ کرتے ہیں۔ کیسے کرتے ہیں؟ قرآن کے بتائے ہوئے طریق کے مطابق استقامت اپنے اندر پیدا کیجیے' ملائکہ خود نازل ہو جائیں گے' پتہ چل جائے گا کیسے کرتے ہیں۔ کرتے صرف یہ ہیں کہ آپ کے دل کو اطمینان دے دیتے ہیں۔ حضرتِ مریمؑ کے اندر جو اضطراب انگیز کیفیتیں پیدا ہو رہی تھیں۔

حضرت مریمؑ کی ساری کی ساری تگ و تاز سراپا استقامت پر مبنی تھی

عزیزانِ من! بڑی عظیم کشمکش ہوگی۔ ماحول میں اس قدر گرد آلود نگاہیں' خانقاہیت کی پابندیاں' معاشرے کا خوف' اپنے گھر والوں کے طعنے' کس طرح سے یہاں سے نکل کے جاؤں۔ دوسری طرف یہ یقین کہ غلط ہے یہ جو کچھ ہو رہا ہے۔ اس اضطرابی کیفیت میں ایک نفسیاتی سکون حاصل ہوتا ہے اس یقین کے ساتھ کہ یہ جو میں کہہ رہی ہوں کہ یہ غلط ہے اور مجھے توڑنا چاہیے' یہ حق ہے مجھے کرنا چاہیے ایسا۔۔ یہ ہے وہ مقام جہاں کہا ہے کہ ملائکہ نے آ کے اس کے دل میں یہ کہہ دیا۔ وہی جو میں نے

ابھی ابھی آیت پڑھی کہ گھبراؤ نہیں ۔۔ایک سکون پیدا ہوا' ایک اطمینان پیدا ہوا۔اور اس بنا پہ قرآن کہتا ہے کہ خدا نے منتخب کیا طَهَّرَكِ (3:42) : طَهَّرَ کے معنی ہوتا ہے کسی خطرے' آلودگی سے دور لے جانا۔ وہ جو چونکہ آلودگی سے دور رہتا ہے اس بنا پہ اس کو پاکیزگی کہا جاتا ہے۔طہر کی عجیب بات ہے کہ یہ جو ماحول ہے جس میں تجھے ہر وقت یہ چیز ڈرا رہی ہے کہ خباثت آلود ماحول ہے' اس سے خدا تجھے دور لے جائے گا۔ وَ اصْطَفٰكِ عَلٰى نِسَآءِ الْعٰلَمِيْنَ (3:42) اور اتنا بڑا انقلابی قدم جو تم اٹھاؤ گی تو خدا تمہیں اپنے دور کی عورتوں میں ممتاز کر دے گا۔کیا کر؟ اب فیصلہ کن مرحلہ آ رہا ہے مریمؑ کے لیے۔

حضرت مریمؑ کی پاکدامنی پر ہزاروں سلام

يٰمَرْيَمُ اقْنُتِيْ لِرَبِّكِ (3:43) عزیزانِ من! کیا لفظ ہیں قرآن کے؟ وجد آ جاتا ہے الفاظ کا انتخاب' خدا انتخاب کرنے والا ہو' زبان ہو عربوں کی' کیا بات نہیں پیدا ہو جاتی۔ترجمہ تو ہمارے ہاں کیا جاتا ہے کہ اے مریم اپنے رب کی فرماں بردار بن جا۔فرماں برداری کی بات نہیں ہے' بیسیوں سینکڑوں الفاظ اس کے لیے آ سکتے ہیں یعنی عربی زبان میں کسی حکم کی اطاعت کے لیے سر جھکانے کے لیے۔میں نے آپ کو یاد ہو گا کہا تھا' ان کے ہاں سقاء قنیت کہتے تھے اس مشکیزے کو جس میں پانی بھرا ہو۔عربوں کے ہاں دیکھ لیجیے پانی کی کتنی کمی تھی۔صحرا کا سفر ہے' پانی کا ایک ایک قطرہ ان کے ہاں آبِ گہر سے زیادہ قیمتی ہوتا تھا۔ ایسا مشکیزہ جس کے اندر پانی بھر دیا جائے تو اس طرح سے وہ بندھا ہوا' سلا ہوا ہو کہ ایک قطرہ پانی کسی غیر جگہ نہ ٹپکے اور جہاں ضرورت ہو بڑی سہولت سے پانی وہاں امڈ آئے' اس کو وہ کہتے تھے سقاء قنیت ۔مریم کی صلاحیتِ نسائیت جو ہے کس انداز میں قرآن نے یہ کہا ہے کہ ٹھیک ہے' انہیں محفوظ رکھ اقْنُتِيْ لِرَبِّكِ (3:43) اور پھر انہیں خدا کے قانون کے مطابق استعمال میں لا۔آ ہاہاہا آہاہاہا۔ٹھیک ہے یہاں تو محسوس کر رہی ہے کہ خلافِ منشائے خداوندی ان صلاحیتوں کے استعمال کے مجبور کی جاؤں گی۔

قرآنی الفاظ کے سلسلہ میں قرآنِ حکیم کا اعجاز

عزیزانِ من! قرآن اس قدر رمز و ایما سے بات کرتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ ہم گھر میں اپنی بچیوں' بیٹیوں' بہنوں کے سامنے بھی دھڑلے سے یہ سب کچھ پڑھ سکتے ہیں۔ایمائیت ہے نا۔اُقْنُتِيْ لِرَبِّكِ (3:43)۔پھر یہاں تجرد کی زندگی ہے' دنیا سے کٹ آف ہو گئی ہو' بالکل الگ خانقاہیت کی۔ وَ اسْجُدِيْ (3:43) جھک جاؤ اس قانون کے آگے جو تیرے دل میں آ رہا ہے کہ صحیح ہے خدا کا فیصلہ یہ' مت ڈر۔ وَ ارْكَعِيْ مَعَ الرّٰكِعِيْنَ (3:43) عام تو یہ ہے کہ رکوع کر' سجدہ کر' رکوع کر رکوع کرنے

والوں کے ساتھ۔عزیزانِ من! آپ سوچیے تو سہی یہ باتیں یہاں ہوں گی؟ یہ رکع کے معنی بھی ہوتا ہے کسی قانون کے سامنے 478 **آلِ عمران** جھک جانا۔وہ تکمیل جب اس کی ہوتی ہے تو سجدہ ہوتا ہے اور جب اس کی تیاریاں ہو رہی ہوتی ہیں تو رکوع ہوتا ہے آدھا سجدہ ہوتا ہے نا ابھی۔مکی زندگی رکوع کی زندگی تھی' مدنی زندگی سجدے کی زندگی تھی۔

قرآنِ حکیم نے اپنے ہاں تجرد یا انفرادیت کی بجائے ہمیشہ اجتماعی عمل کو اولیت دی ہے

وَ ارۡکَعِیۡ مَعَ الرّٰکِعِیۡنَ (3:43) خانقاہیت کے رہنے والے' راہبانیت کی' تجرد کی ترکِ دنیا کی زندگی بسر کرنے والے بھی کہتے ہیں کہ ہم خدا کے قانون کے سامنے جھکے ہوئے ہیں۔وہ کہتا یہ نہیں وَ ارۡکَعِیۡ مَعَ الرّٰکِعِیۡنَ دین انفرادی چیز نہیں ہے کہ اپنے اپنے طور پہ جھک جاؤ۔یہ اجتماعی شے ہے' تمام جھکنے والوں کے ساتھ مل کے جھکو۔جاؤ معاشرے کی زندگی بسر کرو۔ان میں کے ایک بن کے رہو۔خانقاہیت کی تجرد کی زندگی سب سے کٹ کے الگ بیٹھ کے سمجھ لینا اپنے ذہن میں' خدا کے مقرب بنتے چلے جا رہے ہیں۔

بہ آدم نہ رسیدی خدا را چہ مے جوئی

انسانوں سے کٹ کے اور تو کہتا ہے خدا کا مقرب ہو جاؤں گا؟ کیا بھول ہے تمہاری۔وَ ارۡکَعِیۡ مَعَ الرّٰکِعِیۡنَ (3:43)۔اسی لیے قرآن نے کہا ہے کُوۡنُوۡا مَعَ الصّٰدِقِیۡنَ سچ بولتا ہے! سچ بولنے والوں کی جماعت میں شامل ہو' اکیلا نہیں۔اکیلا اکیلا انفرادی طور پہ کبھی غالب ہی نہیں آ سکتا باطل کے اوپر۔یہاں تو ایک اجتماعی زندگی ہے۔یہ جو ہم پٹ جاتے ہیں غلط معاشرے میں سچ بولنے والے دیانت دار' وہ اس لیے کہ یہ افراد ہوتے ہیں یہ انفرادی زندگی بسر کر رہے ہوتے ہیں۔وہ شیطانی معاشرہ اجتماعیت میں ہوتا ہے' وہ اکٹھے ہو جاتے ہیں' یہ اکیلا پٹ جاتا ہے۔خدا کے قانون کے مطابق ان کا استعمال کر تجرد کی زندگی نہیں' اٹھ اور معاشرے کے اندر جا کے' باقیوں کے ساتھ مل کے خدا کے قانون کی اطاعت کر۔ ذٰلِکَ مِنۡ اَنۡۢبَآءِ الۡغَیۡبِ نُوۡحِیۡہِ اِلَیۡکَ ((3:44اے رسول اس سے پیشتر یہ باتیں کہیں نہیں کیں۔

تورات اور اناجیل کا قرآنِ حکیم کے مابین تقابلی جائزہ

کیا بات کہہ گیا ہے قرآن؟ اناجیل موجود تھی اناجیلِ اربعہ کے اندر حضرتِ مریمؑ' حضرتِ عیسٰیؑ کی زندگی کے کوائف بڑی شرح و بسط سے لکھے ہوئے ہیں۔قرآن کہتا ہے یہ وہ باتیں ہیں جو کہیں نہیں کیں۔آپ مقابلہ کر کے دیکھیے قرآن میں جس انداز

میں اور جن کیفیتوں کو بیان کیا ہے اور ان کے ہاں کی اناجیل میں جو چیزیں آئی ہیں۔ یہ عظمت اور یہ بزرگی کہیں آپ کو نہیں ملے گی ان کتابوں کے اندر۔ وقت نہیں ورنہ میں بتاتا انجیل کے اندر حضرتِ عیسٰیؑ اپنی ماں کو ڈانٹ کے باہر نکال دیتے ہیں۔ اور قرآن کی یہ کیفیت ہے کہ نساءِ عالمین کے اوپر ان کو انتخاب شدہ قرار دیتے ہیں۔ کہاں سے یہ نبیِّ اُمی ان چیزوں کو پا سکتا تھا؟ اُمی تو ایک طرف میں کہتا ہوں، پڑھا لکھا بھی ہوتا تو اس کے پاس SOURCE OF INFORMATION جو تھی وہ یہی کتابیں ہو سکتی تھیں نا جو عیسائیوں کی خود پیش کردہ تھیں۔ ان کے اندر تو میں آگے چل کے بیان کروں گا حضرتِ عیسٰیؑ، ان کے حواری، ان کی والدہ، انبیائے بنی اسرائیل، اس قدر گھناؤنی تصویریں کھینچی ہوئی ہیں، انسان ان کو پڑھ نہیں سکتا۔ ان کے پاس SOURCE OF INFORMATION کیا تھا جو اس قدر یہ صحیح صحیح ان کی سیرتیں اور ان کے کوائفِ حیات کو سامنے لے آئیں؟ کہا کہ یہ تو کہیں سے نہیں لے سکتا تھا، ہم بتا رہے ہیں تمہیں۔

قرآنِ حکیم میں حضرت مریمؑ کی پاکیزہ دامنی کی شہادت

وَ مَا كُنْتَ لَدَيْهِمْ اِذْ يُلْقُوْنَ اَقْلَامَهُمْ اَيُّهُمْ يَكْفُلُ مَرْيَمَ ص وَ مَا كُنْتَ لَدَيْهِمْ اِذْ يَخْتَصِمُوْنَ (3:44) تو ان کے پاس نہیں تھا جب وہ مریم کی کفالت کے لیے قرعے ڈال رہے تھے، تو وہاں موجود نہیں تھا جب وہ آپس میں جھگڑ رہے تھے۔ اور یہ بات تو کہیں نہیں اور تمہیں ملے گی جو ہم تمہیں بتا رہے ہیں۔ یہ ہے جو وحی کے ذریعے سے رسول کو بتایا گیا۔ انبیائے سابقہؑ کی صحیح سرگذشتیں قرآن کے اندر آپ کو ملیں گی نہایت پاکیزہ منزہ شکل میں، یہ انجیل اور تورات کے اندر کہیں نہیں ملیں گی آپ کو۔ ان کی آلودگیوں کو پاک وصاف کیا ہے قرآن نے۔ میں ذرا آگے چل کے عرض کروں گا جہاں حواریوں کا ذکر آئے گا، وہیں عرض کروں گا نا۔ اِذْ قَالَتِ الْمَلٰٓئِكَةُ يٰمَرْيَمُ اِنَّ اللّٰهَ يُبَشِّرُكِ بِكَلِمَةٍ مِّنْهُ لا (3:45) یہاں کی زندگی تجرد کی، کنوار پن کی، عمر بھر کے لیے الگ رہنے کی۔ وہ زندگی مطہر، گھر بار کی زندگی۔ یہ چیز ان کے دل میں جو جذبہ پیدا ہوا اس کے مطابق کہا کہ ڈرو نہیں بشارت ہے تمہارے پاس، خدا کے قانون کے مطابق بچہ بھی پیدا ہوگا۔ اِسْمُهُ الْمَسِيْحُ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ (3:45)

حضرت عیسٰیؑ کو ابنِ مریم کے نام سے پکارنے کی وجۂ جواز اور حضرت مریمؑ کی ایک خلش

قرآن یہاں اس بچے کا نام بتا رہا ہے مسیح۔ حضرتِ عیسٰیؑ کے جب کوائفِ حیات آئیں گے وہاں میں عرض کروں گا مسیح نام کیوں ہے اور عیسٰیؑ کے کیا معنی ہیں۔ ابنِ مریم۔۔ وہ جو ہمارے ہاں پھر کہا جاتا ہے کہ صاحب! وہ بن باپ کے پیدا ہونے کی

سند جو ہے وہ ابنِ مریم صاحب کہ وہ مریم کا بیٹا۔ انہیں معلوم نہیں ہے کہ یہ سامی اقوام میں تو عام رواج تھا اس چیز کا اور اس کے بل 478 آلِ عمران
ہمارے ہاں بھی معاشرے میں یہ چیز تھی کل تک کہ ماں اور باپ میں سے جو بھی زیادہ شہرت کا مالک ہوتا تھا اولاد کو اس کی طرف منسوب کرتے تھے۔ حضرتِ موسیٰؑ' امِ موسیٰؑ' اپنے بھائی کو وہ کہتے ہیں اے میری ماں کے جائے۔ باپ کا نام کہیں نہیں آ رہا اس لیے نہیں کہ یہ بن باپ کے پیدا ہوئے تھے اس لیے کہ وہ قرآن کی رو سے شہرت ہی ماں کے ذکر کو ہے' باپ کا تو نام تک کہیں نہیں آتا۔ ہمارے ہاں گاؤں میں گھر میں سے اگر کوئی عورت کسی خاندان میں زیادہ ممتاز ہوتی تھی تو یہ پوچھتے تھے ''او کیہڑا اللہ رکھا؟ او فاطمہ دا پتر'' باپ موجود تھا ہمارے ہاں بھی یہ چیز ہے۔ اور ان کے ہاں تو یہ چیز عام تھی اور عربوں کے ہاں بھی تھی۔ اور آپ کو معلوم ہے کہ جب سادات کی پہلی سلطنت قائم ہوئی ہے تو ان کو بنی فاطمہؓ کہتے تھے۔ کبھی آپ نے سوچا یہ بنی فاطمہؓ کیوں کہا جاتا ہے؟ آپ کو معلوم ہے کہ سادات میں سے جو حضرتِ فاطمہؓ کے بطن سے نہیں ہے حضرتِ علیؓ کی اولاد' ان کو تو علوی کہتے ہیں۔ ان کی نسبت حضرت علیٰ کی طرف ہو رہی ہے۔ لیکن جو حضرتِ فاطمہؓ کے بطن سے ہوتے ہیں' ان کو بنی فاطمہؓ کہا جاتا ہے۔ یہ فاطمہؓ کی طرف کیوں نسبت ہو رہی ہے؟ اسی قاعدے کے مطابق جو ان کے ہاں تھا کہ باپ اور ماں میں سے جو زیادہ عظمت پہ ہوتا تھا اس کی طرف اولاد کو منسوب کرتے تھے۔ بنی فاطمہ' اسی طرح سے ابنِ مریم ہے۔ یہ دلیل نہیں ہے اس چیز کی کہ باپ نہیں تھا اس لیے ماں کی طرف منسوب کرتے تھے۔ بہرحال۔ وَجِيهًا فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ وَمِنَ الْمُقَرَّبِينَ (3:45) یہ بڑی ایک گہری نفسیاتی چیز ہے کہ اسی وقت مریم کو یہ بھی کہا جا رہا ہے کہ مطہر زندگی بسر کرے گی' بال بچے بھی ہوں گے۔ یہ جو چیز ہے نا دھڑکا لگا ہوا کہ کہیں یہ خلافِ شریعت جو میں یہ بات کر رہی ہوں' اس کا اثر نہ کہیں آگے جا کے پڑ جائے' مجھ پہ نہیں سہی تو میرے بچوں پہ ہی شاید اس کا اثر پڑ جائے' ایسا نہ کہیں ہو جائے۔ یہ ایک بڑی گہری چیز ہے اور مجھے اس کا خود تجربہ ہے۔

انسان کے دل و دماغ اور اس کی شخصیت پر عقیدے کا اثر

دلی کی ملازمت کے زمانے میں میرے ساتھ ایک کرسچن' اینگلو انڈین لڑکا' رومن کیتھلک تھا' ان کے ہاں فرسٹ کزن میں شادی نہیں کرتے تھے چچا کی لڑکی سے ماموں کی لڑکی سے خالہ کی لڑکی سے' یہ ان کے ہاں منع ہے۔ قانون تو ان کے ہاں کوئی ہے نہیں لیکن ان کے ہاں اس چیز کو گویا مذہب کی رو سے شریعت بنا دیا گیا ہے' یہ منع ہے۔ وہ لڑکا تھا اس کے غالباً چچا کی یا خالہ کی فرسٹ کزن ایک لڑکی تھی وہ اس سے شادی کرنا چاہتا تھا' وہاں کی وہ پابندیاں تھیں۔ ان کے ہاں یہ نہیں ہوتا کہ شادی ہو نہیں سکتی' حرام وغیرہ ہے' ایک پابندی عائد کی ہوئی ہوتی ہے' عقیدے کی پابندی بڑی گہری ہوتی ہے۔ عزیزانِ من! بڑی گہری ہوتی

ہے۔ اس کا بڑا گہرا اثر ہوتا ہے' فزیکل اثر ہوتا ہے اس چیز کا۔ اس نے مجھ سے کہا کہ صاحب ! یہ کہتے ہیں کہ یہ شادی نہیں ہونی 478 **آلِ عمران** چاہیے اور اس قسم کی شادی سے جو اولاد پیدا ہوتی ہے' اس پہ اثر ہوجاتا ہے۔ آپ لوگوں کے ہاں تو یہ نہیں ہوتا' آپ کے ہاں تو یہ شادیاں ہوتی ہیں؟ میں نے کہا بالکل ہمارے ہاں تو چچا کی لڑکی' ماموں کی لڑکی' خالہ کی لڑکی بلکہ ہم تو PREFER کرتے ہیں قریبی رشتے۔ تو اس نے کہا کہ کبھی کوئی اثر وثر تو نہیں ہوتا اس پہ؟ میں نے کہا کچھ نہیں آپ دیکھ رہے ہیں' ہم سارے ہی اپنے اسی طرح سے پیدا ہوئے ہیں۔ وہ بڑا اچھا نیک لڑکا تھا اور مذہب پرست تھا۔ کافی عرصہ اس نے لگا دیا فیصلہ کرنے میں وہ قریباً ہر دوسرے تیسرے دن مجھ سے مشورہ کرتا تھا۔ وہ کفر اسے روکتا تھا' کعبہ اسے کھینچتا تھا۔ مجھ سے تقویت چاہتا تھا بالآخر وہ چیز غالب آئی اور اس نے شادی کر لی۔ اس وقت تک وہ خوش تھا۔ میں ہی اس کا ایک دوست تھا جس کے ساتھ وہ کوئی مشورے کرتا رہتا تھا۔ مجھ سے وہ روز یہ پوچھتا تھا کہ بھئی ! کوئی اثر تو نہیں پڑتا اولاد پہ؟ میں اسے بتاتا تھا۔ آپ حیران ہوں گے کہ اس کا پہلا بچہ پیدا ہوا اور وہ گونگا اور بہرا تھا۔ JUST A PSYCHOLOGICAL CASE۔ افوہ ! اندازہ لگایے۔ میں تو اسے یہی کہتا تھا کہ بابا میں نے تو یہ کہا تھا ہم لوگ موجود ہیں تمہارے سامنے۔ وہ کہتا چوہدری صاحب ! میں کہتا تھا نا آپ سے کہ یہ چیز جو ہے۔ کیا بات تھی؟ وہ گھٹن اس کے اندر تحت الشعور میں موجود تھی اس کے بھی اور اس کی بیوی کے بھی کہ یہ بات ٹھیک نہیں ہوئی اور ہر طرف سے یہ چیز ہوتی تھی کہ اس قسم کی شادی کا اولاد پہ اثر پڑا کرتا ہے۔ اتنا نفسیاتی گہرا اثر تھا کہ یہ چیز آپ کے ہاں کے ڈاکٹرز وہ بھی اس کی تائید کریں گے' یہ نفسیاتی اثر بڑی بری چیز ہوتی ہے۔ مریمؑ کے دل میں بھی یہ چیزیں پیدا ہو رہی ہوں گی' اسی لڑکے کی طرح جس کا میں نے ذکر کیا ہے۔

اولاد کے سلسلہ میں حضرت مریمؑ کے دلی خدشات اور خدا تعالیٰ کی طرف سے اس کی تردید

عزیزانِ من ! قرآن ہے ساتھ کے ساتھ کہتا چلا جاتا ہے کہ گھبراؤ نہیں ! وہ لڑکا سبحان اللہ وہ تو بڑا اعظیم مرتبہ لڑکا ہوگا وہ **وَجِيْهًا فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ وَمِنَ الْمُقَرَّبِيْنَ** (3:45) ہوگا۔ کس مقام پہ تسلیاں دی جارہی ہیں اس مریمؑ کو' حوصلہ کر' ہمت کر' جو فیصلہ کیا ہے اس پہ جم کے کھڑی ہوجا۔ ہوسکتا تھا کہ اپنی ذات کے لیے تو وہ فیصلہ کر لیتی' ہونے والے بچے کے لیے وہ کہتی کہ نہیں بابا ! میں ڈر گئی۔ قرآن تقویت کے سامان پہنچا رہا ہے' اطمینانِ قلب دے رہا ہے۔۔ یہ ہے ملائکہ کا نزول جسے کہتے ہیں۔ وہ بچہ گونگا بہرہ نہیں ہوگا۔ **وَيُكَلِّمُ النَّاسَ فِي الْمَهْدِ** (3:46) چھوٹی عمر میں ہی باتیں کرنے لگ جائے گا۔ یہ بھی نہیں ہوگا کہ کہیں وہ چھوٹی سی عمر میں مرہی جائے وہ بچہ۔ **وَكَهْلًا** (3:46) بڑی عمر کا ہوگا **وَمِنَ الصّٰلِحِيْنَ** (3:46) تندرست توانا ہر طرح سے بالکل فکر نہ

کر۔ کیا بات ہے؟ ملائکہ کی طمانیتِ قلب کی کیفیت کن انداز میں ایک ماں کو بتائی جا رہی ہے جس کے دل میں یہ کشمکش جو ہے 478 **آلِ عمران** ایک اضطراب کی کیفیت پیدا کر رہی ہے۔ آ ہا ہا۔ قَالَتْ رَبِّ اَنّٰی یَکُوْنُ لِیْ وَلَدٌ وَّ لَمْ یَمْسَسْنِیْ بَشَرٌ (3:47) پھر یہ بات پیدا ہو رہی ہے میں راہبہ، تجرد کی زندگی بسر کرتی ہوں میں نے کہا تو یہ ہے کہ میں ان کے چنگل میں نہیں آنا چاہتی۔ ذہن میں یہ تھا کہ یہاں سے نکل جاؤں تو زندگی پھر تجرد کی ہی ہوگی؟ کیسے ہوگا؟ مجھے تو کسی بشر نے چھوا نہیں ہے۔ دیکھیے وہی الفاظ جو حضرتِ زکریاؑ سے کہے گئے تھے نا وہی الفاظ ہیں۔ قَالَ کَذٰلِکِ اللّٰہُ یَخْلُقُ مَا یَشَآءُ (3:47) بالکل وہی الفاظ ہیں ابھی ابھی جو ہم نے دیکھے ہیں۔ وہاں بھی کوئی چیز خارقِ فطرت نہیں تھی، یہاں بھی کوئی بات خارقِ فطرت نہیں ہے۔ گھبرانے کی بات نہیں۔ اِذَا قَضٰٓی اَمْرًا فَاِنَّمَا یَقُوْلُ لَہٗ کُنْ فَیَکُوْنُ (3:47) بس اس بات میں پھر آ گے لے آئے

ہمارے ہاں لفظ کُن کے غلط مفہوم کے برعکس قرآنِ حکیم کی عقل وفکر سے بھرپور تعلیم

قرآن کہتا ہے کہ ہم جب کسی بات کا فیصلہ کرتے ہیں تو ہم اس کو کہتے ہیں کہ ہو جا تو وہ ہو جاتی ہے۔ یعنی چل بھئی! ہم نے فیصلہ کیا، ہو گئی۔ تو یہ فیصلہ کیا اور ہو گئی کے اگر یہی معنی ہیں فیصلہ کیا ادھر سے، ہو گئی (بات تو میں اور تفصیل سے کہوں گا) اس انداز سے تو پھر حضرت مریمؑ کے ہاں مان لیا جائے کہ بن باپ کے بچہ ہوا تھا تو وہ بھی نہیں ہوا تھا، وہ تو پورا حمل رہا تھا کُنْ فَیَکُوْنُ (3:47) کی بات تو ایسی نہیں تھی۔ اور یہ بات غلط ہے جو ہم نے سمجھا ہوا ہے۔ عالمِ امر وہ عالم ہے کہ جہاں خدا کے فیصلے ہوتے ہیں وہ فیصلے IMPLEMENT کیسے ہوتے ہیں وجود میں کیسے آتے ہیں، محسوس شکل میں کیسے آتے ہیں؟ بات تو لمبی ہے کم از کم ایک آیت تو لے لیجیے۔ عزیزانِ من! فیصلہ ہونا قرآن یہی کہتا ہے کہ جب فیصلہ ہم کر لیتے ہیں تو اس کے بعد پھر وہ شے ہو جاتی ہے۔ درمیان کی کڑیاں قرآن نہیں بیان کر رہا، ہر جگہ نہیں کرتا۔ سنیے کیسا ہو جاتا ہے؟ وہ ہوتا یہ ہے یہاں یہ ہے نا کہ اِذَا قَضٰٓی اَمْرًا (3:47) ایک امر جو ہمارا ہے، اس کا ہم فیصلہ کر لیتے ہیں، ایک اسکیم ہے فیصلہ کر لیتے ہیں کہ یہ یہ ہوگا۔ فیصلہ کیا گیا کیبنٹ میں کہ یہاں ایک سڑک بنے گی پھر حسنِ انتظام یہ ہے کہ پھر وہ بن جاتی ہے۔ ہم بھی بات یہ روز کہتے ہیں کہ خدا کا حسنِ انتظام تو ایسا ہے کہ یہ ہو نہیں سکتا کہ فیصلہ وہ کرے، وہ ہو نہیں۔ ہوتا کیسے ہے؟ یُدَبِّرُ الْاَمْرَ (32:5) یہ دیکھیے یہ وہی امر ہے یہاں اِذَا قَضٰٓی اَمْرًا (3:47)۔ یُدَبِّرُ الْاَمْرَ مِنَ السَّمَآءِ اِلَی الْاَرْضِ (32:5) آسمانوں کی بلندیوں کے اوپر وہ فیصلہ ہوتا ہے قرآن کے الفاظ میں پھر اس کی جو تدبیر کا آغاز ہوتا ہے، اس کے ارض سے پست تریں درجے سے ہوتا ہے، ابتدا اس کی جو ہوتی ہے اس کے پست تریں درجے سے ہوتی ہے۔ ثُمَّ یَعْرُجُ اِلَیْہِ فِیْ یَوْمٍ کَانَ مِقْدَارُہٗٓ اَلْفَ سَنَۃٍ مِّمَّا تَعُدُّوْنَ (32:5) پھر وہ چیز اس جہاں

سے اس آغاز سے آہستہ آہستہ آہستہ اوپر کو اٹھتی چلی جاتی ہے، تکمیل تک پہنچتی ہے، اس ایک ایک دن میں جو تمہاری گنتی کے اوقات ہزار ہزار سال کا ہوتا ہے۔ کائناتی قوانین کے جتنے بھی سائنٹسٹ ماہر ہیں وہ آپ کو بتائیں گے جو شے بھی آپ کو شے کی حیثیت میں نظر آتی ہے، خدا کے اس قانون کے مطابق اس کا آغاز اس تدبیر کا پست تریں درجے سے ہوتا ہے۔ ذرہ اتنا سا ہوتا ہے وہ بیج بڑ کے درخت کا، کوئی نہیں کہہ سکتا اس کے اندر یہ اتنا بڑا بڑ تو ایک طرف رہا بڑ کی کوئی پتی بھی اس میں پوشیدہ ہوگی۔ آغاز ہوتا ہے، وہاں مٹی کے اندر سے ذرا سی ایک سوئی نکلتی ہے۔ ثُمَّ يَعْرُجُ اِلَيْهِ فِىْ يَوْمٍ كَانَ مِقْدَارُهٗ اَلْفَ سَنَةٍ مِّمَّا تَعُدُّوْنَ ((32:5 لہٰذا جہاں قرآن نے یہ کہا ہونا کہ اس کا امر ایسا ہے کہ جب وہ فیصلہ کر لیتا ہے تو کہتا ہے يَقُوْلُ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ (3:47) تو اس کے یہ معنی نہیں ہوتے کہ اس نے كُنْ (3:47) کہا يَكُوْن (3:47) ہو گیا بلکہ یہ ہے کہ پھر وہ فیصلہ کرتا ہے تو وہ پھر فیصلہ EXECUTE جب ہوتا ہے پست تریں درجے سے آہستہ آہستہ اپنے ارتقائی مدارج طے کرتا ہوا۔ ہو سکتا ہے کہ ایک ایک مرحلہ ہزار ہزار سال میں، دوسری جگہ کہا ہے پچاس پچاس ہزار سال میں بھی طے کرتا ہے۔ ارتقائی منازل طے کرتا ہوا EVOLUTION کے ذریعے سے تکمیل تک پہنچتا ہے۔ یہی چیز یہاں کہی گئی ہے کہ کوئی بات نہیں! فیصلہ یہ ہے کہ وہ آئے گا، نبی ہوگا، مقرب ہوگا، تندرست و توانا ہوگا، ٹھیک طرح بچوں کی طرح باتیں کرے گا، بڑی عمر پائے گا۔ وَ يُعَلِّمُهُ الْكِتٰبَ وَ الْحِكْمَةَ وَ التَّوْرٰةَ وَ الْاِنْجِيْلَ ((3:48 بنی اسرائیل کی طرف وَ رَسُوْلًا اِلٰى بَنِىْٓ اِسْرَآءِيْلَ ((3:49 بنی اسرائیل کی طرف رسول ہوگا وہ ان کو تورات کی انجیل کی کتاب و حکمت کی تعلیم دے گا۔

تورات اور انجیل کا بنیادی تعارف

یاد رکھیے تورات جسے کہتے ہیں وہ کسی خاص کتاب کا نام نہیں ہے۔ حضرتِ موسیٰؑ کے بعد سے لے کے حضرتِ یحییٰؑ یا زکریاؑ تک جتنے بھی انبیائے بنی اسرائیل گذرے ہیں، ان کی جتنی بھی کتابیں ان کے پاس ہیں، یہودیوں کے یا بنی اسرائیل کے، اس پورے مجموعے کو تورات کہا جاتا ہے۔ ان میں صحفِ موسیٰؑ بھی شامل ہیں، پانچ کتابیں ہیں موسیٰؑ کی تو اس تورات میں بھی۔ جسے وہ تورات کہتے ہیں۔ اسے عہد نامۂ عتیق کہتے ہیں OLD TESTAMENT ۔ اور حضرتِ عیسیٰؑ والی جو چار کتابیں ہیں ان کو کہتے ہیں عہد نامۂ جدید یا NEW TESTAMENT ۔ ان دونوں کے مجموعے کا نام آج ہم بائبل رکھتے ہیں۔ تورات ہے وہ تمام کتابوں کا مجموعہ جو حضرتِ عیسیٰؑ سے پہلے انبیائے بنی اسرائیل کو ملی تھیں اور یہودیوں نے جن کو اکٹھا کر لیا ہوا ہے۔ تورات کی اور انجیل کی تعلیم دے گا، ان سے کہے گا اَنِّىْ قَدْ جِئْتُكُمْ بِاٰيَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ ((3:49 میں تمہارے خدا کی طرف سے قانون لایا

ہوں۔ یہاں بھی ان آیتوں کے غلط ترجموں نے اور تفاسیر نے جو پھر اناجیل کے اوپر یعنی بنی اسرائیل کی جتنی بھی اپنے ہاں کی خرافات ہیں، ان پہ ہی مبنی ہیں یہ، بات کہیں سے کہیں پہنچادی ہے۔

مروجہ تراجم کے مطابق حضرت عیسٰیؑ کی طرف منسوب کردہ باتیں اور قرآنِ حکیم

کہا یہ گیا ہے (میں عام ترجمہ پہلے کرکے سناتا ہوں) کہ میں تمہارے پاس اپنے رب کی طرف سے نشانی ایک لے کے آیا ہوں۔ اَنِّیۡۤ اَخۡلُقُ لَکُمۡ مِّنَ الطِّیۡنِ کَھَیۡـَٔۃِ الطَّیۡرِ فَاَنۡفُخُ فِیۡہِ فَیَکُوۡنُ طَیۡرًۢا بِاِذۡنِ اللّٰہِ ((3:49 کہ میں مٹی سے ایک چڑیا جیسی بناتا ہوں اور اس چڑیا میں پھونک مارتا ہوں اور وہ پرندہ بن کے اڑ جاتی ہے۔ تفسیر یہ کہی گئی ہے کہ بچپن میں ہی حضرتِ عیسٰیؑ بچوں کے ساتھ کھیلا کرتے تھے تو بچے تو یہ بناتے ہیں نا مٹی سے، باقی مٹی سے یہ کھلونے بناتے تھے اور حضرتِ عیسٰیؑ جو کھلونا بناتے تھے چڑیا، پھر اس میں پھونک مارتے تھے تو وہ پھر پھُر کرکے اڑ جاتی تھی۔ میں یہ عرض کررہا ہوں، وہ ترجمہ جو پیش کیا جاتا ہے، وہ تفسیر جو پیش کی جاتی ہے۔ وَ اُبۡرِئُ الۡاَکۡمَہَ ((3:49 میں اندھے کو بینائی دے دوں گا، اندھا دیکھنے لگ جائے گا۔ وَ الۡاَبۡرَصَ ((3:49 یہ جذامی یا پھلبہری ہوتی ہے اصل میں یہ وہ جو ہوتے ہیں نا سفید داغ پڑ جاتے ہیں اس کو برص کہتے ہیں نا تو اسے کہہ لیجیے یا جذامی جو ہیں ان کو اچھا کردوں گا۔ وَ اُحۡیِ الۡمَوۡتٰی بِاِذۡنِ اللّٰہِ ج ((3:49 اور میں مُردوں کو زندہ کردوں گا اللہ کے حکم سے۔ وَ اُنَبِّئُکُمۡ بِمَا تَاۡکُلُوۡنَ وَ مَا تَدَّخِرُوۡنَ فِیۡ بُیُوۡتِکُمۡ ((3:49 تو میں تمہیں بتاؤں گا تم نے کیا کھایا ہے تم نے کیا گھر میں رکھا ہے۔ کہتے ہیں کہ بچپن میں یہ کھیلا کرتے تھے تو کھیلا کرتے تھے "لکن مچی" وہ جو بچے چھپ جاتے ہیں وہ دوسرا بچہ ڈھونڈتا ہے۔ تو کیفیت یہ تھی کہ یہ تو یہاں چھپتے تھے پتہ نہیں چلتا تھا اور ان کی صورت تھی کہ دوسرے بچے جہاں چھپ جاتے تھے نا گھروں کے اندر تو باہر سے یہ بتاتے تھے، کس کے اندر چھپے ہوئے ہیں۔ برادرانِ عزیز! اس کھیل میں لطف کیا ہوگا جس کھیل میں یہی چیز پتہ چل جائے یعنی کھیل کا لطف اس میں تو نہیں آتا۔ خیر! وہ یہ کرتے تھے۔ بلکہ یہاں تک بھی لکھا ہوا ہے کہ ایک دفعہ ایک گھر میں بچے چھپے ہوئے تھے انہوں نے آ کے کہا کہ اس کے اندر ہیں وہ جو چور ہے میرا میں اس کو پکڑوں گا۔ گھر والوں نے کہا کہ نہیں ہیں، انہوں نے کہا کہ پھر کیا ہیں ان کے اندر؟ انہوں نے کہا کہ ان کے اندر تو سؤر ہیں ہمارے باندھے ہوئے۔ وہ چلے گئے جب دروازہ کھولا تو سارے بچے سؤر بن گئے ہوئے تھے اِنَّ فِیۡ ذٰلِکَ لَاٰیَۃً لَّکُمۡ اِنۡ کُنۡتُمۡ مُّؤۡمِنِیۡنَ ((3:49 اگر تم مومن ہونا چاہتے ہو تو ان باتوں میں تمہارے لیے بڑی نشانیاں ہیں۔ کہا یہ جاتا ہے کہ یہ ساری چیزیں جتنی بھی تھیں، یہ سارے معجزے تھے حضرتِ عیسٰیؑ کے بچپن سے ہی۔ جیسا کہ میں نے عرض کیا ہے کہ جب ہم خدا پہ ایمان لاتے ہیں کہ جو نیست سے اتنی عظیم الشان اس کارگہ

آلِ عمران 478 پہ آیا

کائنات کو وجود میں لاسکتا ہے تو خدا کی طرف سے کوئی اس قسم کے کام کر دینا جو ہیں وہ تو کوئی وجۂ تعجب نہیں ہیں۔ قدم قدم پہ ایک گھاس کی پتی معجزہ ہے اس کا۔ یہ سوال نہیں کہ خدا نہیں کر سکتا' سوال یہ ہے کہ خدا ان چیزوں کو کرتا نہیں ہے۔ یہ چیزیں جتنی یہ کہی گئی ہیں' یوں معجزہ نہیں تھیں۔ اور میں پھر کہتا ہوں کہ یہ بچہ جب وہ کھیل رہا ہے بچوں کے ساتھ اب اس سے اگر اس قسم کی چیزیں یہ وجود میں اگر آ رہی ہیں سامنے لوگوں کے تو ساری بنی اسرائیل کو آ کے تو اس کے پاؤں پکڑ لینے چاہئیں تھے۔ یہاں ہمارے ہاں کہیں مشہور ہو جاتا ہے کہ صاحب! فلاں جگہ ایک لڑکا نہیں ذرا بڑا بھی خواہ کیوں نہ ہو' 'اونمبر دس دیندا ہیگا اے سٹے دے' اوس بابے دے گرد دیکھو کنی خلقت بیٹھی ہوندی ہیگی اے''۔ اگر ان کے ماحول میں ایک بچہ یہ کرے کہ وہ گگھو گھوڑے بنائے اور اس میں وہ پھونک مارے اور وہ صاحب! ایک پرندہ بن کے اڑنے لگ جائے۔ آپ سوچتے ہیں وہ تو زمانہ تھا آج سے دو ہزار سال قبل کا' اس دور میں اگر ہمارے ہاں یہ کچھ ہونے لگ جائے' ساری دنیا پرستش کرنے لگ جائے اس کی۔ تو اگر یہ چیز ان کے سامنے ہوتی تھی' اندھے جو تھے دیکھنے لگ جاتے تھے' جذامی یوں ہاتھ پھیرنے سے اچھے ہوتے تھے اُحۡیِ الۡمَوۡتٰی (3:49) مُردے جی اٹھتے تھے تو میں کہتا ہوں اگر اتنا کچھ دکھانے کے بعد بھی بنی اسرائیل کی حالت یہ رہی کہ ایمان لانا تو ایک طرف رہا بقول ان کے انہوں نے پکڑ کے صلیب پہ دے دیا تو یہ سارا کچھ کس کام آیا؟ یعنی یوں خلافِ فطرت یہ سارا کچھ دکھاتے چلے جانا' معاف رکھیے یہ تو گویا آخری حربہ جسے آپ کہہ سکتے ہیں' وہ بھی ناکام رہ گیا (معاذ اللہ معاذ اللہ معاذ اللہ)۔ عزیزانِ من! رسول' خدا کا یہ نبی اس لیے نہیں آیا کرتا کہ ''اوگگھو گھوڑے بنایا کرے''۔ بات یہ ہے ''سخن شناس نہ رہی دلبرا خطا ایں جا است'' حضرتِ عیسیٰؑ کے کوائفِ حیات ان کی انجیل میں ہیں۔ وہ انجیل اس میں شبہ نہیں کہ جو پیغام حضور پہ خدا کی طرف سے آیا تھا' وہ تو محفوظ نہیں رہا' تحریف ہو گئی ہے۔ واقعاتِ زندگی جو ہیں وہ بہت سے انجیل میں ہیں۔

انجیل کے بیان کے مطابق حضرت عیسیٰؑ کا اندازِ بیان ہمیشہ تمثیلات اور استعاروں پر مبنی ہوتا تھا

انجیل میں حضرتِ عیسیٰؑ کی ایک خصوصیت بتائی ہے اور وہ یہ کہ وہ ہمیشہ باتیں تمثیلات میں کیا کرتے تھے' استعاروں میں باتیں کرتے تھے' مثالوں سے بات کرتے تھے' تشبیہ کے ساتھ تمثیل کے ساتھ۔ جتنے وعظ ہیں حضرتِ عیسیٰؑ کے انجیل میں آپ دیکھیے تمثیلات کے ذریعے سے ہیں۔ وہ اتنی زیادہ تمثیلات کے ذریعے سے بات بیان کرتے تھے کہ یہ جو آپ کے حواری تھے شاگرد یا APOSTLES جن کو کہتے ہیں بعض اوقات وہ پوچھتے تھے یہ کہ صاحب! آپ یہ بالکل سیدھی سیدھی بات نہیں کرتے ہیں ہر بات مثال میں' ہر بات تمثیل میں۔ متی کی انجیل میرے سامنے ہے۔ متی تیرہواں باب دسویں آیت۔ وہ باتیں سمجھا

رہے تھے عوام کو اپنی تعلیم' شاگردوں نے پاس آ کر اس سے کہا تو ان سے تمثیلوں میں کیوں باتیں کرتا ہے؟ اس نے جواب 478 **آلِ عمران** ان سے کہا اس لیے کہ تم کو آسمان کی بادشاہت کے بھیدوں کی سمجھ دی گئی ہے مگر اُنہیں نہیں دی گئی۔ان کی ذہنی سطح ایسی ہے کہ اگر میں ان ABSTRACT TRUTHS کو' بسیط حقائق کو محض ایک حقیقت کے ہی الفاظ میں ہی بیان کروں تو بات ان کی سمجھ میں نہیں آئے گی' انہیں تمثیل میں سمجھانا جو ہے' یہ زیادہ اقرب ہے ان کے ذہن سے ان کی سمجھ سے۔مگر انہیں نہیں دی گئی کیونکہ جس کے پاس ہے' اسے دیا جائے گا اور اس کے پاس زیادہ ہو جائے گا۔جس کے پاس نہیں ہے اس سے وہ بھی لے لیا جائے گا جو اس کے پاس ہے۔اگر ایسی باتیں میں اتنے اونچے حقائق کی ان سے بیان کروں تو وہ پہلے سے زیادہ انکار کرتے چلے جائیں گے مجھ سے۔بڑی عجیب چیز تھی۔يُضِلُّ بِهٖ كَثِيْرًا ۙ وَّيَهْدِىْ بِهٖ كَثِيْرًا (2:26) ایک جگہ مثال قرآن نے دی ہے کہا ہے نا کہ خدا مثال بیان کرتا ہے مچھر کی یا اس سے کم بھی۔وہ کہتے ہیں کہ صاحب مثال کیا؟ تو وہاں کہا ہے کہ مثال کا یہ ہوتا ہے کہ ذرا سے غلط معنوں کے اندر لیا جائے تو اس سے انسان دوسری طرف چلا جاتا ہے' صحیح معنوں میں لیا جائے تو اس سے ہی بات بڑی صاف ہو جاتی ہے تمثیل کی صورت۔میں ان سے تمثیلوں میں اس لیے باتیں کرتا ہوں کہ دیکھتے ہیں اور پھر نہیں دیکھتے' سنتے ہیں پھر نہیں سنتے' سمجھتے ہیں پھر نہیں سمجھتے اس لیے میں ان کو تمثیلوں میں بات سمجھاتا ہوں۔اور یہ سارے میرے سامنے رکھے ہوئے ہیں یہ وعظ' سرمن ماؤنٹ آف دی جو آپ کا ہے پہاڑی کا وعظ اسے آپ دیکھیے سارا وعظ جتنا بھی ہے تمثیلوں کے اندر ہے۔اور بڑی خوبصورت تمثیلیں ہوتی ہیں آپ کی۔باتیں تمثیلوں میں بیان کرتا ہے۔یہاں قول جو ہیں حضرتِ عیسٰیؑ کے قرآن نے نقل کیے ہیں وہی تمثیلی انداز نقل کیا ہے۔بنی اسرائیل' کیا کیفیت تھی؟

قرآنِ حکیم کی تعلیم کا اعجاز فکرِ انسانی کو جہانِ نو سے متعارف کراتی ہے

قرآن نے کہا ہے کہ وحی کی تعلیم انسان کو خاک کی پستیوں سے اڑا کر آسمان کی بلندیوں تک پہنچا دیتی ہے **وَرَفَعْنَا لَكَ ذِكْرَكَ** (94:4)۔خود امت کے متعلق بھی سورۃ اعراف میں ہے کہ ہم چاہتے یہ ہیں کہ ان کو آسمان کی بلندیوں پہ لے جائیں یہ کم بخت زمین کی پستیوں کے ساتھ چمٹنا چاہتا ہے وَلٰكِنَّهٗٓ اَخْلَدَ اِلَى الْاَرْضِ (7:176)۔یہ انداز ہے وحی کی تعلیم کا۔بنی اسرائیل وَضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ وَالْمَسْكَنَةُ وَبَآءُوْ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ (2:61) ذلت اور مسکنت کی مار ان پہ ماری گئی' ہر جگہ محرومیاں اور ناکامیاں ان کا پیچھا کر رہی تھی' THE WANDERING JEWS ہو چکے ہوئے تھے' کوئی پاس نہیں پھٹکنے دیتا تھا' ذلیل وخوار ہو چکے تھے' انسان نہیں رہ گئے ہوئے تھے {بالکل آب وگل کے ہیولے رہ گئے' مٹی کے مادھو بن کے

رہ گئے تھے۔ آپ نے کہا کہ میں آتا ہوں اور یہ جو تم انسان نہیں، اڑنے والے پرندے نہیں، مٹی کی یوں ہی ایک شکلیں بن کے رہ گئی ہوئی ہو میں اس کے اندر وحی کی روح پھونکوں گا فَيَكُوْنُ طَيْرًا بِإِذْنِ اللّٰهِ (3:49) آسمان کی فضاؤں میں اڑنے لگ جاؤ گے۔ ہر زبان کی طرح ہمارے ہاں بھی پرندے سے تشبیہ دیتے ہیں ہر اڑنے والے کو۔ ملتِ اسلامیہ کے متعلق اقبالؒ کہتا ہے۔

پرد در وسعتِ گردوں یگانہ

یہ آسمانوں کی وسعت کے اندر یگانہ کسی کو پاس نہیں پھٹکنے دیتی اور اس طرح سے اڑتی ہے

نگاہِ او بشاخ آشیانہ

اور اپنی نگاہ اپنے مرکز کی طرف ہر جگہ رکھتی ہے۔

یہ کہا تھا حضرتِ عیسٰیؑ نے ان سے کہ تم بالکل مٹی کے مادھو بن کے رہ گئے ہو۔ میں وحی کی تعلیم سے تمہارے اندر ایک نئی توانائی پھونکوں گا۔

تمثیلات اور استعارے زبان کی خوبصورتی اور وسعت کو بلند درجہ عطا کر دیتی ہیں۔ حضرت عیسٰیؑ کی تعلیم کے چند ایک نقوش

نفخ کے معنی ہوتا ہے کسی کے اندر نئی توانائیاں پھونک دینا۔ اور تم پھر اڑنے لگ جاؤ گے۔ پھر اقبالؒ ہی یاد آ گیا

اگر یک قطرۂ خوں داری اگر مُشتِ پرے داری

اگر اب بھی تمہارے اندر ایک قطرہ خون بھی باقی ہے زندگی کا، چند پر بھی تمہارے پاس ہیں

بیا من بتو آموزم طریقِ شاہبازی را

آ میں تمہیں سکھاتا ہوں کہ شاہبازی کے طریقے کیا ہوتے ہیں۔ یہ ہے جو کہہ گیا ہے وہ او! آ او مٹی کے مادھو خاک نشینو آ ؤ میں وحی کی توانائیاں تمہارے اندر پھونکوں گا کہ تم فضا کی بلندیوں میں اڑنے لگ جاؤ گے۔ وَ اُبْرِئُ الْاَكْمَهَ (3:49) اے اندھو! آ ؤ میں تمہیں بینائی عطا کروں گا۔ قرآن نے بیسیوں مقام پہ کہا ہے یہ اندھے جو عقل کے اندھے جن کو کہتے ہیں آ ؤ میں تمہیں توانائی عطا کروں گا۔ اور اَكْمَهَ تو عربی زبان میں کہتے ہی اس مسافر کو ہیں جو بغیر راہ دیکھے بغیر پوچھے یوں ہی چلا جا رہا ہو۔ آ ؤ میں

تمہیں بتاؤں گا۔ اَبۡرَصَ کہتے تو ہیں پھلبہری کو ہی لیکن عربی زبان میں یہ اس زمین کو کہتے ہیں جس کی سبزی جو ہے کوئی ٹڈی دَل **آلِ عمران** 478 وغیرہ چٹ کر گیا ہو۔ تمہاری زندگی کی تر و تازگی جتنی بھی ہے تمہاری شامتِ اعمال نے وہ چٹ کر کے تمہیں پھلبہری جیسا بنا دیا ہوا ہے۔ آؤ میں اس زمین کو حیاتِ تازہ عطا کرنے کے لیے آیا ہوں۔ کَيْفَ يُحْيِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا (30:50) قرآن کہتا ہے اس طرح سے ہم وحی کی سحاب پاشیوں سے زمینِ مردہ کو حیاتِ تازہ دیا کرتے ہیں وَ اُحۡیِ الۡمَوۡتٰی (3:49) اور قرآن نے ان انسانوں کو اپنی لاشیں اپنے کندھوں پہ لیے لیے پھرتے ہیں ان کو تو مُردوں سے بار بار تشبیہ دی ہے۔ میں مُردوں کو زندہ کروں گا بِاِذۡنِ اللّٰہِ خدا کے قانون کے مطابق میں یہ سب کچھ کروں گا۔ وَ اُنَبِّئُکُمۡ بِمَا تَاۡکُلُوۡنَ وَ مَا تَدَّخِرُوۡنَ فِیۡ بُیُوۡتِکُمۡ (3:49) ہر نبی کی طرح حضرتِ عیسٰیؑ بھی وہی نظام ربوبیت لائے تھے کہ جس میں گھروں کے اندر چھپا کر کچھ جمع رکھنا' یہ حرام قرار دیا گیا تھا۔ کہا کہ آج تمہاری کیفیت یہ ہے کہ کچھ تو لوگوں کے سامنے کھاتے ہو اور باقی جتنا بھی ہے وہ گھروں کے اندر چھپا کے رکھ دیتے ہو۔ میں تمہیں یہ بتاؤں گا اے یہودیوں کی سرمایہ دار قوم کہ کتنا کھانا چاہیے' کتنا رکھنا چاہیے۔ عزیزانِ من! یہ چیز بھی انجیل سے اس کی شہادت ہم کو مل رہی ہے۔ متی کی انجیل میں باب چھ آیت 19 ' حضرتِ مسیحؑ کا نظامِ ربوبیت معاشی نظام۔ دیکھو! اپنے واسطے زمین کا مال جمع نہ کرو جہاں کیڑا اور زنگ خراب کرتا ہے اور جہاں چور نقب لگاتے اور چراتے ہیں بلکہ اپنے لیے آسمان پر مال جمع کرو جہاں نہ کیڑا خراب کرتا ہے نہ زنگ' نہ وہاں چور لگاتے اور چراتے ہیں کیونکہ جہاں تیرا مال ہے' وہیں تیرا دل بھی لگا رہے گا۔ آہاہاہا! جہاں تیرا مال ہے وہیں تیرا دل بھی لگا رہے گا۔ زمین میں دباتے ہو تو زمین میں دل اٹکا رہے گا' آسمان پہ جمع کرو تمہارا دل بھی آسمان کے اوپر پہنچ جائے گا۔ آہاہاہاہا۔ بدن کا چراغ تیری آنکھ ہے بس اگر تیری آنکھ درست ہو تو تیرا سارا بدن درست ہوگا اور اگر تیری آنکھ خراب ہو تو تیرا سارا بدن تاریک ہوگا۔ پس اگر وہ روشنی جو؟؟؟ میں ہے تاریکی ہے تو تاریکی کیسی بڑی ہوگی۔ کوئی آدمی دو مالکوں کی خدمت نہیں کر سکتا کیونکہ یا تو ایک سے عداوت رکھے گا' دوسرے سے محبت یا ایک سے ملا رہے گا' دوسرے کو ناچیز جانے گا۔ تم خدا اور دولت دونوں کی خدمت نہیں کر سکتے اس لیے ایک کو چھوڑ کے' ایک خدا رکھنا پڑے گا۔ یہ ہے جو کہہ رہا ہے۔ میں تمہیں بتاؤں گا وَ اُنَبِّئُکُمۡ بِمَا تَاۡکُلُوۡنَ وَ مَا تَدَّخِرُوۡنَ فِیۡ بُیُوۡتِکُمۡ (3:49) میں یہ بتاؤں گا تمہاری جتنی بھی HIDDEN WEALTH ہے یہ جو گھروں کے اندر دبائی ہوئی ہے میں بتاؤں گا تمہیں کہ تم کتنا کھاتے تھے باہر لوگوں کے سامنے' کتنا دفن کر کے رکھتے تھے اور تمہیں بتاؤں کہ کوئی چیز اس کے بعد دفینہ نہیں کی جائے گی۔ یہ ہوگی میری تعلیم یا یہ ہے میری تعلیم بلکہ اس وقت کی بات ہے جب آپ نبی ہو کے آ کے تعلیم دے رہے تھے۔ یہ ہے میری تعلیم۔ اِنَّ فِیۡ ذٰلِکَ لَاٰیَۃً لَّکُمۡ اِنۡ کُنۡتُمۡ مُّؤۡمِنِیۡنَ

((3:49) اگر تم میری اس وحی کی صداقت پر یقین رکھتے ہو، یہ ہیں تمہارے لیے احکام جو میں لے کے آیا ہوں۔ آیت کے معنی آلِ عمران 478 یہ نہیں آیت کے معنی تو احکام خداوندی ہیں، قوانینِ الٰہی ہیں۔ حضرتِ مریمؑ سے کہا وَ مُصَدِّقًا لِّمَا بَیْنَ یَدَیَّ مِنَ التَّوْرٰىةِ وَ لِاُحِلَّ لَكُمْ بَعْضَ الَّذِیْ حُرِّمَ عَلَیْكُمْ ((3:50) اس سے پیشتر تورات میں جن چیزوں کا وعدہ کیا گیا تھا کہ تمہیں فضیلت ملے گی اقوامِ عالم کے اوپر، تمہیں بادشاہت ملے گی، اس زمین کی میں اسے سچ کر کے دکھاؤں گا تمہارے لیے۔ بہت سی چیزیں جو تمہاری باطل شریعت نے خود تمہارے اوپر حرام قرار دے رکھی ہوئی ہیں، میں ان کو پھر سے حلال قرار دوں گا۔

حلال اور حرام کا تعین صرف اور صرف خدا تعالیٰ کو حاصل ہے

عزیزانِ من! حلال اور حرام تو صرف خدا کر سکتا ہے لیکن انسانوں کی خود ساختہ شریعت خدا کے حرام کے بعد پھر فہرستیں مرتب کرنی شروع کر دیتی ہے۔ یہاں سے وہاں تک یہ بھی حرام وہ بھی حرام۔ یہودیوں کے ہاں بھی یہ کیفیت تھی۔ چار چیزیں تو خدا نے حرام کیں تو بیسیوں انہوں نے اپنے اوپر حرام کی تھیں۔ نبی کا کام یہ بتایا ہے کہ جن کو تم نے اپنے اوپر حرام قرار دے لیا ہوا ہے، میں ان سے تمہیں آزاد کرانے کے لیے آیا ہوں۔ وَ جِئْتُكُمْ بِاٰیَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ قف فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَ اَطِیْعُوْنِ ((3:50) یاد رکھو! یہ ہے جو قانون میں تمہارے پاس اپنے خدا کی طرف سے لایا ہوں۔ قانونِ خداوندی کی نگہداشت کرو۔ مذہب نہیں ہے جو تم اپنے لیے بیٹھے ہوا اپنے اپنے طور پہ نہیں وَ اَطِیْعُوْنِ (3:50) میں نے یہ ایک نظم قائم کیا ہے اس نظم کے مرکز کی حیثیت سے میری اطاعت کرو۔ اِنَّ اللّٰهَ) (3:51 کیا ہے وہ تعلیم؟ ملخص اس کا ''تت کڈیا ہویا'' اِنَّ اللّٰهَ رَبِّیْ وَ رَبُّكُمْ ((3:51 میرا اور تمہارا نشوونما دینے والا، رزق عطا کرنے والا صرف وہ خدا ہے۔ فَاعْبُدُوْهُ ((3:51 اس لیے محکومیت اس کی اختیار کرو کسی اور کی اختیار نہ کرو۔ هٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِیْمٌ ((3:51 یہ ہے وہ سیدھی متوازن راہ جس پر چلانے کے لیے میں تمہارے پاس آیا ہوں۔ سورۂ آلِ عمران کی آیت 51 تک ہم آ گئے۔ اس کے بعد قرآن یہ بتاتا ہے کہ جب پھر یہ عملاً پیغام دیا حضرتِ عیسیٰؑ نے آ کر تو پھر کیا ہوا؟ عزیزانِ من! یہ ہے حضرتِ مریمؑ کی عصمت کی وہ توجیہ جو قرآن نے بیان کی۔ یہ ہے حضرتِ عیسیٰؑ کی وہ تعلیم جو چند تمہیدی الفاظ میں قرآن کے اندر بیان کر دی۔ وہ ایک عظیم انقلابی پروگرام کو عملی شکل میں لانے والی ممتاز خاتون جن کا ذکر قرآن نے اپنی دفتین میں ابدی حیات کر دیا۔ ہر پیغمبر یہ انقلابی دعوت لے کے آتا تھا۔ یہ ایک انقلابی دعوت لے کر آنے والے پیغمبر کہ جو خاک نشینوں کو آسمان کی بلندیوں پر پہنچانے کے لیے آتے تھے۔ اور اس کے لیے بنیادی نقطہ یہ ہوتا تھا کہ کسی انسان کو روٹی کے لیے کسی دوسرے انسان کا محتاج نہیں ہونا پڑتا تھا۔ اس لیے کہا کہ میرا اور تمہارا رب وہی ہے اسی کی محکومی اختیار کرو۔ یہ ہے صراطِ مستقیم جس

کے لیے ہم نماز کی ہر رکعت میں مسجد میں قبلہ رو باوضو ہوکر دعا مانگتے ہیں اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ (1:5) ’’تے اوس ویلے 478 **آلِ عمران**
حساب اے کرن ڈئ ہونے آں پئی ایہدی جیب اِچوں پیسے کیویں کڈیے تے اے سودا مہنگا کیویں ویچیے‘‘۔ فَاعْبُدُوْهُ
(3:51) اس کی محکومی اختیار کرو هٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِيْمٌ (3:51) یہ ہے صراطِ مستقیم۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا ؕ اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ (2:127)

❀...❀...❀

478 آلِ عمران

دسواں باب: سورۃ آلِ عمران (آیات 52 تا 58)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حضرت عیسیٰؑ کے کوائفِ حیات

عزیزانِ من! آج نومبر 1969ء کی 23 تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز سورۃ آلِ عمران کی آیت 52 سے شروع ہوتا ہے:((3:52۔

آپ کو یاد ہوگا سلسلۂ کلام حضرتِ مریمؑ کے کوائفِ حیات سے چلا آ رہا تھا۔ انہوںؑ نے خانقاہیت کی انسانوں کی خود ساختہ زنجیروں کو بڑی جرأت اور ہمت سے توڑا۔ اور وہاں سے ایک نن کی زندگی کی بجائے وَارْكَعُوْا مَعَ الرّٰكِعِيْنَ (2:43) کے خداوندی اصول کے مطابق زندگیٔ مطہر زندگی بسر کی۔ اناجیل کے بیان کے مطابق یوسف نجار سے شادی کی۔

احبار و رہبان کی بیان بازی کے باعث اپنے خاوند اور بچے کے ساتھ مصر کی طرف ہجرت اور پھر واپسی

جیسا کہ میں نے پچھلی دفعہ تفصیل سے عرض کیا تھا یہودیوں کی شریعت ہیکل کے وہ احبار و رہبان اسے برداشت ہی نہیں

کر سکتے تھے کہ کوئی شخص اور وہ بھی ایک لڑکی جو ہیکل میں نن کے طور پر نذر کر دی گئی تھی' وہ اس طرح سے ان کی شریعت[8] ان 47**آلِ عمران** پابندیوں' ان کے احکام' ان کے فیصلوں کے سرتابی برت کر علی الاعلان اسی معاشرے کے اندر متاہل کی زندگی بسر کرے۔ وہ جیسا کہ قاعدہ ہے پہلی چیز یہ کہ یہ نکاح' نکاح ہی نہیں یہ زندگی ایک باعصمت خاتون کی زندگی نہیں' ایک طوفان برپا کر دیا۔ پورا معاشرہ یہودیوں کا' احبار و رہبان کو جو میں نے عرض کیا تھا' اتنے اختیارات کہ صرف موت کی سزا کے لیے انہیں رومن کے گورنر کے جانا پڑتا تھا' اس سے کم درجے کی ہر سزا وہ خود دے سکتے تھے۔ اور اگر یہ قانونی تعزیر یا پابندی نہ بھی ہو تو معاشرے میں جو سزا دی جاتی ہے' وہ تو آپ کو معلوم ہی ہے۔ کفر کا فتویٰ جس کے خلاف صادر کیا جاتا ہے' پہلی چیز ہوتی ہے کہ ان کی بیویوں پہ طلاق پڑتی ہے۔ پھر معاشرے میں آپ جانتے ہیں کہ اس قسم کی ایک بچی اور اس کے خلاف جب اس طرح سے ڈونڈی پیٹ دی جائے معاشرے میں' اس کا حشر کیا ہوگا۔ اناجیل ہمیں بتاتی ہیں کہ وہ وہاں سے اپنے خاوند اور اس بچے کو لے کر مصر کی طرف چلی گئیں۔ قرآنِ کریم میں رَبْوَةٍ (23:50) کا لفظ آیا ہے ایک سطح مرتفع ذَاتِ قَرَارٍ وَّ مَعِيْنٍ (23:50) جو بسنے کے قابل تھی سرسبز و شاداب تھی' وہاں چشمے تھے۔ قرآن نے اتنا ہی کہا ہے۔ بہرحال اس اپنے ملک سے دور چلی گئیں اور پھر وہ اس وقت آئی ہیں' اناجیل میں تو کہیں ان کی عمر اس وقت کی حضرتِ عیسیٰؑ کی نو برس یا بارہ برس لکھی ہے۔ لیکن جس وقت انہوں نے وعظ شروع کیا ہے' تبلیغ شروع کی ہے تو اناجیل میں بھی ہے کہ اس وقت ان کی عمر تیس یا اکتیس سال کی تھی۔ عمر کا سوال تاریخی ہے اسے ہم چھوڑتے ہیں۔ قرآنِ کریم کے بیان کے مطابق آپؑ نبوت سے سرفراز ہو چکے تھے جب واپس آئے ہیں یا جب آپ نے یہ سلسلۂ تبلیغ شروع کیا ہے۔ اس کے بعد کی زندگی۔

دین اور مذہب کی تعلیم میں بنیادی فرق کے ساتھ حضرت عیسیٰؑ کے کوائفِ حیات کی نوعیت

میں یہاں یہ عرض کر دوں کہ جب دین مذہب میں تبدیلی ہو جاتا ہے تو وہاں پھر سند خدا کی کتاب کی بجائے' تاریخ رہ جاتی ہے۔ یہ بڑی اہم بات ہے اسے یاد رکھیے گا۔ مذہب کی سند تاریخ ہوتی ہے' دین کی سند خدا کی کتاب ہوتی ہے۔ عیسائیوں کے ہاں تو خدا کی کتاب موجود ہی نہیں تھی۔ انہوں نے تو سب سے پہلے کیا یہ کہ اس کتاب کو نیست و نابود کیا۔ ان کے ہاں صرف تاریخ باقی ہے۔ اور جہاں خدا کی کتاب بھی باقی ہو اور' جہاں' جو میں نے کہا وہ تو صرف اسلام ہے یا مسلمان ہیں جن کے ہاں خدا کی کتاب اپنی اصلی شکل میں موجود ہے۔ وہاں بھی مذہب کا پروپیگنڈہ اتنا تیز ہوتا ہے کہ خدا کی کتاب محض ثواب حاصل کرنے کے لیے پڑھی جاتی ہے' مذہب کی سند وہاں بھی تاریخ ہی ہو جاتی ہے۔ اور تاریخ تو آپ جانتے ہیں رطب و یابس کا مجموعہ ہوتی ہے انسانوں

کی خودساختہ' جو جی میں آئے اس کے اندر لکھ لیا جائے۔ حضرتِ عیسیٰؑ کے کوائفِ حیات جو ہمیں اناجیل میں ملتے ہیں وہ ان مرتب کردہ تاریخ ہے عیسائیوں کی۔۔ حضرتِ عیسیٰؑ کی کتاب انجیل نہیں ہے وہ۔ اور وہ جتنی اناجیل ہیں وہ ان کے مصنفین کا نام لکھا ہے ''متی کی انجیل' لوکا کی انجیل' یوحنا کی انجیل'' اور اس کے بعد ان کے رسولوں کے اعمال' ان کے خطوط' پولوس کی TREATIES اس مجموعے کا نام انجیل ہے۔ حضرتِ عیسیٰؑ کا اپنا اس میں کچھ بھی نہیں ہے۔ تو تاریخ کی رو سے حضرتِ عیسیٰؑ کی جو تصویر سامنے ہمارے آتی ہے وہ ایک فقیرِ راہ نشیں' تارک الدنیا' تکیے دائرے میں بیٹھا ہوا ایک درویش جس کو دنیاوی معاملات سے کوئی تعلق نہیں۔ تعلیم دیتا ہے وہ اس قسم کی کہ کوئی اگر ایک گال پر طمانچہ مارے تو دوسرا گال سامنے کر دیجیے۔ اگر تمہارے کوئی کوٹ اتار کے لے جاتا ہے تو سدری اپنی خود اتار کے اس کے حوالے کر دیجیے۔ چور اگر گھر میں چوری کرنے کے لیے آتا ہے' مال چراتا گٹھڑی باندھتا ہے' گٹھڑی بہت بوجھل ہے' اسے اٹھا نہیں سکتا تو اپنے سر پہ اٹھا کے اس کو گھر چھوڑ آیے۔ اس تاریخ میں یہ تعلیم ملتی ہے حضرتِ عیسیٰؑ کی۔۔ بالکل ایک فقیر سا' سادھو سا' مٹھ میں بیٹھا ہوا' اس قسم کی تعلیم دینے والا۔ خدا کے رسول تو یہ تعلیم دینے کے لیے نہیں آتے۔ رسول تو ایک انقلاب لانے کے لیے آتا ہے' بلند ترین درجے کا انقلاب۔ وہ پہلے قلب و نگاہ کے اندر انقلاب پیدا کرتا ہے اور پھر اس انقلاب کا نتیجہ خارجی دنیا کے اندر ایک انقلاب ہوتا ہے۔ باطل کی ہر قوت سے ٹکراتا ہے اور اس کی جگہ حق کا نظام دنیا میں نافذ کرتا ہے۔ ہر رسول یہی پیغام لے کر آتا ہے۔ یہ نہیں تھا کہ حضرتِ موسیٰؑ تو فرعون سے ٹکرانے کے لیے آئے تھے اور حضرتِ عیسیٰؑ انہیں فراعنہ کے سامنے سر جھکانے کے لیے (معاذ اللہ) آئے تھے۔ خدا کی تعلیم بھی ایک' خدا کا پیغام بھی ایک' خدا کی طرف سے آنے والا ہر پیغامبر اسی ایک پیغام کا مبلغ۔ ان کی تعلیم میں اصولی طور پہ کہیں کسی قسم کا کوئی فرق ہو نہیں سکتا کیونکہ سرچشمۂ تعلیم ایک ہے۔ رسول پیغامبرِ انقلاب ہوتا ہے اور حضرتِ عیسیٰؑ تو عظیم الشان انقلابی پیغامبر کی حیثیت سے سامنے آتے ہیں۔ سوال پیدا ہوتا ہے سوچنے والے کے لیے کہ ایک گوشہ نشین سا فقیر جس کی تعلیم یہ ہو پھر اس کے خلاف کیا بات تھی کہ اس کو وہ پکڑ دھکڑ کے لے آ رہے ہیں۔ خود ان کے اپنے بیان کے مطابق مقدمہ چل رہا ہے' عدالت میں پیش ہو رہے ہیں' گورنر صلیب کا فیصلہ کر دیتا ہے' پھانسی دینے کی سزا صلیب کی سزا موت کی سزا۔ تو کیا اس قسم کا فقیرِ راہ نشین وہ کیا جرم تھا اس کا کہ جس کی بنا پہ اس کے خلاف اتنی بڑی سازش تھی پہلے ان کے گرفتار کرنے کی۔ خود اناجیل میں یہ چیزیں موجود ہیں ۔۔ مقدمہ چلتا ہے بہت بڑا' پھانسی کی سزا دی جاتی ہے۔ کیا جرم تھا؟ آپ نے دیکھا دو باتوں کو ملا لینے سے بات سمجھ میں آ جاتی ہے کہ بات وہ نہیں ہے جو پہلے کہی جا رہی ہے کہ تعلیم یہ تھی اور یہ کچھ وہ کہتے تھے اور ایسی زندگی بسر کرتے تھے۔ یقیناً یہ

آلِ عمران478 تو ایسی سزا اس قسم کا بغاوت کا مقدمہ اس کے خلاف چلے گا جو کچھ باغیانہ خیالات پھیلائے گا' باغیانہ ACTIVITIES ہوں گی۔ ورنہ ایک تکیے' دائرے میں بیٹھنے والا فقیر اس کے خلاف یہ کچھ کیا؟ وہ تو غالب کہتا ہے کہ 'بیٹھے ہیں راہ گذر پہ ہم کوئی ہمیں اٹھائے کیوں' راہ گذر پہ بیٹھنے والے کو تو کوئی اس کے ساتھ تعرض ہی نہیں کرتا چہ جائیکہ اس کے خلاف اتنا بڑا بغاوت کا مقدمہ چلا دیا جائے' اسے پھانسی کی سزا دی جائے۔

یہودیوں جیسی پس ماندہ قوم میں حضرت عیسٰیؑ کی اذان تو ایک انقلاب آفریں نقارۂ خدا تھی

بات کچھ اور تھی۔ اور یہیں سے تو نظر آ جاتا ہے قرآن کی تعلیم اور ان مبینہ آسمانی کتابوں کی تعلیم' جنہیں منسوب تو کیا جاتا ہے ان کے رسولوں کی طرف لیکن درحقیقت وہ ان پیغامات کی حامل تعلیم نہیں ہوتی۔ لیکن اس کے باوجود تاریخی حقائق کے اوپر جو اِدھر اُدھر کی راکھ پڑی ہوئی ہوتی ہے' بعض اوقات تحقیقات کے ناخن اس کو کریدتے ہیں تو اس کے نیچے سے اصل واقعات بھی نکل آتے ہیں۔ حضرتِ عیسٰیؑ کی زندگی' ان کا پیغام' ان کی کوششیں' ان کی سرگرمیاں' ان کا جہاد کس مقصد کے لیے تھا؟ خود عیسائیوں نے اب تحقیق جو کی ہے تو تاریخ کے اوراق سے یہ چیزیں سامنے آ رہی ہیں۔ پہلی چیز تو آپ یہ لیجیے' یہودی بڑی ہی پستی کے عالم میں محکومی کی زندگی بسر کر رہے تھے۔۔ رومنز وحشی اور بربری۔۔ اُن کی محکومی کی زندگی بڑی ہی ذلت او رمسکنت کی زندگی۔ ایک تو یہ چیز' دوسرے خود یہودیوں کے اندر مذہبی پیشوائیت' اس کی غلامی کی زنجیریں اس سے بھی زیادہ کہیں سخت اور محکم اور کڑی تھیں۔ رومن کی غلامی اگر جسموں پر تھی' اِن کی غلامی ان انسانوں کی روحوں اور قلوب کے اوپر تھی۔ اور ان کا کردار جیسا کہ آپ کے ہاں' جیسا کہ ساری دنیا میں کسی دور کی بھی تاریخ لیجیے' جتنے بھی خدا کے نام کے اوپر دین فروش ہوتے ہیں' جو کچھ ان کا کردار ہوتا ہے' اسی قسم کا بدترین قسم کا کردار ان یہودی احبار و رہبان کا تھا۔۔ اناجیل اس کی شہادت دیتی ہے ابھی آپ کے سامنے میں پیش کروں گا۔

حضرت عیسٰیؑ کا بنیادی جرم اس وقت کی سلطنت کے خلاف اعلانِ بغاوت تھا مشہور مؤرخ سیسل راک کا اعتراف

حضرتِ عیسٰیؑ کی دعوتِ انقلاب ان دونوں کے خلاف تھی۔ یہودی پیشوائیت کے خلاف' رومنز کی حکومت کے خلاف۔ چنانچہ اب تاریخ ہمیں بتا رہی ہے (ان کے بیان کے مطابق) حضرتِ عیسٰیؑ کو جب صلیب دیا گیا۔ اصل واقعہ یہ کیا تھا' وہ تو میں قرآن کی

روشنی میں بعد میں عرض کروں گا وَ مَا قَتَلُوْهُ وَ مَا صَلَبُوْهُ (4:157) انہیں صلیب ہی نہیں دیا گیا تھا۔ لیکن ان کے اپنے بیان 478 آلِ عمران
مطابق جو صلیب دیا گیا ہے تو ان کے ہاں یہ قاعدہ تھا کہ جسے صلیب دیتے تھے، مجرم کا جرم ایک تختی پر لکھ کر اس صلیب میں اس تختی کو لٹکاتے تھے۔ حضرتِ عیسیٰؑ کو جس لکڑی پہ صلیب دیا گیا ہے اس پہ جو تختی لکھی گئی ہے، جرم کی اس میں لکھا تھا۔ یہ بنی اسرائیل کا بادشاہ بننا چاہتا تھا۔ آپ دیکھتے ہیں بات کتنی بڑی حقیقت چھلک کر باہر آ جاتی ہے کہ جرم کیا تھا؟ سلطنت کے خلاف ایک بغاوت تھی۔ اور اب تو خود انہوں نے اعتراف کرلیا ہے۔ ان کا ایک مشہور مؤرخ ہے سیسل راک اس کی ایک کتاب ہے "A SHORT HISTORY OF THE JUDESH PEOPLE" یہودیوں کی مختصر تاریخ۔ اس میں وہ لکھتا ہے کہ حضرتِ مسیحؑ ان لوگوں میں سے تھے جنہیں رومی اربابِ حکومت نے اس جرم کی پاداش میں حوالۂ دار و رسن کر دیا کہ انہوں نے اپنی قوم کے حقوق و مفاد کی بازیابی کی جرأت کی تھی۔ حضرتِ یسوعؑ کے سامنے دو مقام تھے ایک طرف آپؑ مسیحِ موعودؑ ہونے کے مدعی تھے جسے بنی اسرائیل کو غیروں کی غلامی اور محکومی سے چھڑانے کے لیے آنا تھا۔ اور دوسرے انہیں ان اخلاقی اور معاشرتی ضوابط کی پابندی کرانی تھی جو بنی اسرائیل کے مصلحین کی نمایاں خصوصیت تھی۔ آپ نے دیکھا دونوں مقاصد تاریخ کی تحقیق خود اب اس کی شہادت دے رہی ہے کہ یہ ایک تارک الدنیا کی زندگی نہیں تھی، ایک بہت بڑے انقلابی کی زندگی تھی اور انقلاب بھی اس نے زندگی کے دو گوشوں میں برپا کرنا تھا۔ بنی اسرائیل کو رومنز کی محکومی اور غلامی سے چھڑانا، حضرتِ موسیٰؑ کی طرح جیسے انہوںؑ نے ان کو بنی اسرائیل کو فرعون کے استبداد کے پنجے سے چھڑایا تھا۔ اور پھر ان یہودیوں کے اندر جو اخلاقی معائب پیدا ہو چکے تھے، اقدار کی خرابیاں پیدا ہو چکی تھیں، ان کو دور کرنا۔ اور اس کا سرچشمہ احبار و رہبان، علما اور مشائخ تھے۔ یہ دو گوشۂ انقلاب تھے ان کے سامنے جس کے لیے یہ اٹھے تھے۔ اور یہ وجہ تھی کہ ان کی خود انجیل کے بیانات کے مطابق انہی یہودی احبار و رہبان نے ان کو پکڑوایا اور رومن گورنر نے پھانسی کی سزا دی۔ سیدھی سی بات ہے، دونوں کے خلاف یہ انقلابی آواز تھی، دونوں اس کے اندر شامل تھے۔ اور پھر اناجیل میں بھی کہیں کہیں بچے کھچے حقیقت کے جواہر ریزے ہمیں اسی خاک میں ملتے ہیں، وہاں سے بھی یہ چمک پیدا ہوتی ہے۔ دیکھتے ہیں ہم کہ ان کی تعلیم کیا تھی؟ ایک گال پہ طمانچہ کھا کے دوسرا گال سامنے کرنے کی نہیں اور دشمن سے پیار کرنے کی ایک نفسیاتی ناممکنات میں سے PSYCHOLOGICAL IMPOSSIBILITY جو ہے دشمن سے محبت، دشمن سے آپ عدل کر سکتے ہیں جو قرآن کہتا ہے وَ لَا یَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰۤی اَلَّا تَعْدِلُوْا (5:8) کسی قوم کی دشمنی تمہیں اس پہ آمادہ نہ کر سکے کہ تم ان سے عدل نہ کرو۔ عدل تو تم کر سکتے ہو دشمن سے اور جو دشمن جس کو تم کہتے ہو، اس سے محبت کس طرح سے کر سکتے ہو؟

478آلِ عمران

نظر آتا ہے کہ تعلیم خداوندی نہیں ہوسکتی یہ۔ اور یہ تو حضرتِ عیسیٰؑ کی تعلیم نہیں تھی۔ خود متی کے اندر موجود ہے' متی انجیل کا دسواں باب 34 سے 38 تک آیات۔ حضرتِ مسیحؑ کی یہ تعلیم ملاحظہ فرمایئے خود انجیل میں بھی یہ چیز موجود ہے۔ کہا کہ یہ نہ سمجھ کہ میں زمین پر صلح کرانے آیا ہوں' صلح کرانے نہیں بلکہ تلوار چلانے آیا ہوں۔ دیکھ رہے ہیں کون بول رہا ہے؟ کیوں کہ میں اس لیے آیا ہوں کہ آدمی کو اس کے باپ سے اور بیٹی کو اس کی ماں سے اور بہو کو اس کی ساس سے جدا کردوں اور اس آدمی کے دشمن اس کے گھر ہی کے لوگ ہوں گے۔ جو کوئی باپ یا ماں کو مجھ سے زیادہ عزیز رکھتا ہے وہ میرے لائق نہیں۔ اور سنیے کیا فقرہ ہے؟ اور جو کوئی اپنی صلیب نہ اٹھائے اور میرے پیچھے نہ چلے' وہ میرے لائق نہیں۔ یہ تو وہ جماعت تھی کہ جس کے پیچھے چلنے والوں کو اپنی صلیبیں اٹھا کے پیچھے چلنا پڑتا تھا۔ انہیں پتہ تھا کہ اس کا انجام کیا ہوگا اس دعوت کا۔ فقیروں کے ٹولے یہ کچھ کیا کرتے ہیں؟ یہ بھیک منگوں کی جماعت تھی جیسا کہ ہمیں بتایا جاتا ہے؟

سازش کرنے والوں نے ہمارے دین کو بھی اسی طرح مذہب میں بدل دیا

میں عرض کروں گا کہ بعد میں دین کے ساتھ جب سازش ہوتی ہے تو پھر اس کی تعلیم کو کیسے بدلا جاتا ہے۔ اور ہر دین کے ساتھ سازش ہوئی۔ خود ہمارے ساتھ بھی جو سازش ہوئی اس کے بعد جو ہماری تعلیم کو بھی بگاڑا ہے اس قسم کی انقلابیوں کی جماعت کو کہ جس نے ایران اور روما کے تختوں کو الٹ دیا' ان کو حجروں کے اندر اور خانقاہوں کے اندر انہوں نے خاک نشیں بنا کے رکھ دیا۔ دین اس طرح سے یہ مذہب میں تبدیل کیا جاتا ہے' یہ سازش ہوتی ہے۔ یہی سازش حضرتِ عیسیٰؑ کے ساتھ۔ دیکھتے ہیں کیا کہہ رہے ہیں؟ کہ میرے پیچھے وہ آئے گا جو اپنی صلیب آپ اٹھا کے میرے ساتھ چلے گا۔ یہ تو تھی رومنز کے متعلق لیکن یہ جو دوسرا گوشہ تھا کہ جن کے اندر آپؑ پیدا ہوئے ہیں' جن کی اصلاح مقصود ہے' جن کی خاطر رومنز سے ٹکر لی جارہی ہے' خود ان کی کیا کیفیت تھی؟ پہلے تو یہ سنیے!

حضرت عیسیٰؑ کا اپنے ساتھیوں کے لیے پیغام

حضرتِ عیسیٰؑ جب اپنے ساتھیوں کو جسے ہم کہتے ہیں تبلیغ کے لیے بھیجتے ہیں' تو انہیں کیا پیغام دیتے ہیں؟ پھر یہ متی کی انجیل کے دسویں باب کی آیات سولہ سے تیس تک۔ کہتے ہیں کہ دیکھو میں تمہیں بھیجتا ہوں گویا بھیڑوں کو بھیڑیوں کے بیچ میں' پس سانپوں کی مانند ہشیار اور کبوتروں کی مانند بھولے بنو مگر آدمیوں سے خبردار رہو کیوں کہ وہ تمہیں عدالتوں کے حوالے کریں گے۔

عزیزانِ من! یہ بھیک منگے جو جاتے ہیں شہروں میں بھیک مانگنے کے لیے جیسی تصویر کھینچی گئی ہے ان کے ہاں یہ کیفیت ہوتی ہے عدالتوں میں کھینچیں گے اور اپنے عبادت خانوں میں تمہارے کوڑے ماریں گے۔ دونوں ہی مقام ہیں رومنز عدالتوں میں کھینچیں، یہ مذہبی پیشوائیت والے اپنے عبادت خانوں میں تمہارے کوڑے ماریں گے۔ اور تم میرے سبب حاکموں اور بادشاہوں کے سامنے حاضر کیے جاؤ گے تاکہ ان کے اور غیر قوموں کے لیے گواہی ہو لیکن جب وہ تمہیں پکڑوائیں کہ فکر نہ کرنا کہ ہم کس طرح کہیں اور کیا کہیں۔ کیوں کہ جو کچھ کہنا ہوگا اس گھڑی تمہیں بتایا جائے گا کیوں کہ بولنے والے تم نہیں بلکہ تمہارے باپ کا روح ہے جو تم میں بولتا ہے۔ بھائی کو بھائی قتل کے لیے حوالے کرے گا' بیٹے کو باپ' بیٹے اپنے ماں باپ کے برخلاف کھڑے ہو کر انہیں مروا ڈالیں گے اور میرے نام کے باعث سب لوگ تم سے عداوت کریں گے مگر جو آخر تک برداشت کرے گا' وہی نجات پائے گا۔ لیکن جب تمہیں ایک شہر میں ستائیں تو دوسرے کو بھاگ جاؤ کیوں کہ میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ تم اسرائیل کے سب شہروں میں نہ پھر چکو گے کہ ابنِ آدم آجائے گا۔

حضرت عیسیٰؑ کے اپنے شاگردوں اور وہاں کے احبار و رہبان اور مشائخ کو انقلاب آفرین وعظ

آپ دیکھتے ہیں کہ یہ ہے وہ جماعت جن کو ملک میں اس پیغام کو لے کر بھیجا جا رہا ہے' کتنے بڑے انقلابیوں کی یہ جماعت ہے۔ یہ تو ان کے ساتھی تھی لیکن یہ احبار و رہبان' یہ علما و مشائخ' یہ ہیکل اور خانقاہیت کے اجارہ دار' ان کی کیفیت کیا تھی؟ حضرتِ مسیح ان کے اندر جو تبلیغ کرتے تھے' انجیل کے بیان کے مطابق ہیکل کی سیڑھیوں پر کھڑے ہو کر ان کے سامنے جو وعظ کہتے تھے' دو ایک نمونے ان کے دیکھیے' ان کا کردار سامنے آجاتا ہے۔ کیفیت آپؑ کی جرأتوں کی یہ ہوتی تھی اور ہر رسول بہت بے باکانہ جرأتوں کا مالک ہوتا ہے۔ ہر سچ بولنے والا بڑا اجرأت آزما ہوتا ہے۔ یہ تو منافقت ہے جو آدمی کو بزدل بنا دیتی ہے۔ متی کی انجیل میں ہے متی باب تیئسواں: اس وقت یسوعؑ نے لوگوں اور اپنے شاگردوں سے یہ باتیں کہیں کہ فقیہ اور فریسی موسیٰؑ کی گدی پر بیٹھے ہیں یعنی ان کے علما اور مشائخ موسیٰؑ کی گدی پر بیٹھے ہیں۔ پس وہ جو کچھ تمہیں بتائیں وہ سب کرو اور مانو لیکن ان کے سے کام نہ کرو کیوں کہ وہ کہتے ہیں اور کرتے نہیں ہیں۔ وہ ایسے بھاری بوجھ جن کا بوجھ اٹھانا مشکل ہے' باندھ کر لوگوں کے کندھوں پر رکھتے ہیں مگر آپ انہیں انگلی سے بھی ہلانا نہیں چاہتے۔ وہ اپنے سب کام لوگوں کے دکھانے کو کرتے ہیں کیوں کہ اپنے تعویذ بڑے بڑے بناتے ہیں' اپنی پوشاک کے کنارے چوڑے رکھتے ہیں اور ضیافتوں میں صدر نشینی اور عبادت خانوں میں اعلیٰ درجے کی کرسیاں اور بازاروں میں سلام اور آدمیوں سے ربی کہلانا پسند کرتے ہیں۔ اپنوں سے کہتے ہیں مگر تم ربی نہ کہلانا کیوں کہ تمہارا استاد ایک

ہی ہے اور تم سب بھائی ہو اور زمین پر کسی کو اپنا باپ نہ کہو کیوں کہ تمہارا باپ ایک ہی ہے جو آسمانی ہے اور نہ تم ہادی کہلاؤ کیوں کہ تمہارا ہادی ایک ہی ہے۔ لیکن جو تم میں بڑا ہے وہ تمہارا خادم بنے اور جو کوئی اپنے آپ کو بڑا بنائے گا وہ چھوٹا کیا جائے گا اور جو اپنے آپ کو چھوٹا بنائے گا وہ بڑا کیا جائے گا۔

پھر ہیکل کے پادریوں ان کے فریسیوں اور فقیہوں سے مخاطب ہو کر فرمایا کہ اے ریاکار فقیہو اور فریسیو! تم پر افسوس ہے کہ آسمان کی بادشاہت لوگوں پر بند کرتے ہو۔ کیوں کہ نہ تو آپ داخل ہوتے ہو اور نہ داخل ہونے والوں کو داخل ہونے دیتے ہو۔ اے ریاکار فقیہو اور فریسیو! تم پر افسوس ہے کہ ایک مرید کرنے کے لیے تری اور خشکی کا دورہ کرتے ہو اور جب وہ مرید ہو چکتا ہے تو اسے اپنے سے دونا جہنم کا فرزند بنا دیتے ہو۔ اے اندھے راہ بتانے والو! تم پر افسوس ہے جو کہتے ہو کہ اگر کوئی مَقدس کی قسم کھائے تو کچھ بات نہیں لیکن اگر مَقدس کے سونے کی قسم کھائے تو اس کا پابند ہوگا۔ اے احمقو اور اندھو! کون سا بڑا ہے سونا یا مَقدس جس نے سونے کو مقدس کیا۔ اور پھر کہتے ہو کہ اگر کوئی قربان گاہ کی قسم کھائے تو کچھ بات نہیں لیکن جو نذر اس پر چڑھی ہو اگر اس کی قسم کھائے تو اس کا پابند ہوگا۔ اے اندھو! کون سی چیز بڑی ہے نذر یا قربان گاہ جو نذر کو مقدس کرتی ہے۔ پس جو قربان گاہ کی قسم کھاتا ہے وہ اس کی اور سب چیزوں کی جو اس پر ہیں قسم کھاتا ہے اور جو مَقدس کی قسم کھاتا ہے وہ اس کی اور اس کے رہنے والے کی قسم کھاتا ہے اور جو آسمان کی قسم کھاتا ہے، وہ خدا کے تخت کی اور اس پر بیٹھنے والے کی قسم کھاتا ہے۔ اے ریاکار فقیہو اور پریسیو! تم پر افسوس ہے کہ پودینے اور سونف اور زیرے پر دھمکی دیتے ہو اور تم نے شریعت کی زیادہ بھاری باتوں یعنی انصاف اور رحم اور ایمان کو چھوڑ رکھا ہے۔ لازم تھا کہ یہ بھی کرتے اور وہ بھی نہ چھوڑتے۔ اے اندھے راہ بتانے والو! جو مچھر کو تو چھانتے ہو اونٹ کو نگل جاتے ہو۔ اے ریاکار فقیہو اور فریسیو! تم پر افسوس ہے کہ تم سفیدی پھری ہوئی قبروں کی مانند ہو جو اوپر سے تو خوبصورت دکھائی دیتے ہو مگر اندر مردوں کی ہڈیوں اور ہر طرح کی نجاست سے بھری ہوئی ہے۔ اسی طرح تم بھی ظاہر میں تو لوگوں کو راست باز دکھائی دیتے ہو مگر باطن میں ریاکاری اور بے دینی سے بھرے ہوئے ہو۔ اے ریاکار فقیہو اور فریسیو! تم پر افسوس ہے کہ نبیوں کی قبریں بناتے اور راست بازوں کے مقبرے آراستہ کرتے ہو اور کہتے ہو کہ اگر ہم اپنے باپ دادوں کے زمانے میں ہوتے تو نبیوں کے خون میں ان کے شریک نہ ہوتے۔ اس طرح تم اپنی نسبت گواہی دیتے ہو کہ ہم نبیوں کے قاتلوں کے فرزند ہیں۔ غرض اپنے باپ دادوں کا پیمانہ بھر دو۔ اے سانپو اے سانپ کے بچو! تم جہنم کی سزا سے کیوں کر بچو گے۔ اس لیے دیکھو میں نبیوں اور داناؤں اور فقیہوں کو تمہارے پاس بھیجتا ہوں ان میں سے بعض کو قتل کرو گے

اور صلیب پر چڑھاؤ گے اور بعض کو عبادت خانوں میں کوڑے مارو گے اور شہر بہ شہر ستاتے پھرو گے تا کہ سب راست بازوں کا خون جو زمین پر بہایا گیا ہے، تم پر آئے۔ راست باز ہابیل کے خون سے لے کر برکیاہ کے بیٹے زکریّا کے خون تک جسے تم نے مَقدس اور قربان گاہ کے درمیان قتل کیا ہے میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ یہ سب کچھ اس زمانے کے لوگوں پر آئے۔ آپ دیکھ رہے ہیں یہ کیا وعظ ہو رہے ہیں؟ اتنا بڑا انقلابی ہے یہ انسان، ہیکل کی سیڑھیوں پر کھڑے ہو کر وہاں کی اس مذہبی پیشوائیت کے خلاف جن کے اختیارات کی وسعتیں میں نے ابھی ابھی آپ سے بیان کیں۔

مذہبی پیشوائیت کے اختیارات کی وسعتوں کا نتیجہ اور ہماری تاریخ

عزیزانِ من! آج ہم ابھی اس کا اندازہ ہی نہیں لگا سکتے۔ اپنے ہاں بھی اپنی تاریخ میں بھی ذرا پیچھے الٹ کر دیکھیے آپ کو نظر آئے گا کہ یہ مذہبی گدی نشین جو ہیں ان کے پنجے کی گرفت کتنی سخت ہوتی ہے۔ ساری تاریخ آپ کی اس سے بھری ہوئی ہے کہ جس نے ذرا ان کے خلاف لب کشائی کی، ان کی زندہ کی کھال کھنچوا دیتے تھے۔ خون کی ندیاں صدیوں تک بہتی رہیں، بغداد کی گلیوں میں آپ کے ہاں۔ ان کے گھروں پر گدھوں کے ہل پھروا دیتے تھے، ٹکڑے ٹکڑے کر دیتے تھے، اندھے کنویں میں ساری عمر کے لیے ڈال دیتے تھے ان لوگوں کو۔ یہ اس زمانے میں یہ شخص کھڑا ہوا ہیکل کی سیڑھیوں پر یہ وعظ ان سے کہتا ہے۔ وہ اس کے خلاف کیوں نہ ہوتے۔

انجیل برنباس کی تاریخی اہمیت اور اس کے مندرجات کی نوعیت

اب اگلی بات یہ ہے کہ یہ دوسری طرف انہیں ایک حکومت بھی تو دلا رہے تھے پھر یہ کیوں اتنے مخالف تھے؟ اس کے لیے بھی ایک عجیب چیز ہمیں ملتی ہے۔ ان کے ہاں کچھ تو انجیلیں وہ ہیں جو انہوں نے اپنے ہاں معتبر بنا رکھی ہیں یا تسلیم کر رکھی ہیں۔ کچھ اناجیل وہ بھی ہیں جنہیں یہ معتبر نہیں سمجھتے اور ان میں ایک انجیل برنباس ہے۔ عزیزانِ من! عجیب و غریب انجیل ہے۔ یہ وہ انجیل ہے کہ جس میں حضرتِ مسیحؑ نے جس آنے والے کے متعلق فارقلیط کہا تھا، اس انجیل میں اس کا نام محمد ﷺ لکھا ہے۔ اور میں سمجھتا ہوں کہ جتنی ان کے ہاں کی مروجہ اناجیل ہیں، ان سب کے مقابلے میں تاریخی اعتبار سے بھی سب سے زیادہ یہ انجیل ہے جس کو انہوں نے اتنا چھپا رکھا تھا کہ دنیا کے سامنے آنے نہیں دیتے تھے۔ اس کی ہسٹری بھی بڑی عجیب ہے اس انجیل کی۔ کس طرح سے پھر یہ توپ کے کتب خانے سے ایک بڑی ہی بہت بڑی انقلابی سازش کے ماتحت وہاں سے یہ نکلی تھی اور پھر دنیا کے سامنے آئی

تھی۔ اور اب بھی ان کی کیفیت یہ ہے کہ جہاں جہاں اس کے نسخے کہیں ان کو معلوم ہوتے ہیں' کسی نہ کسی طرح سے اس کو تلف کر دیتے ہیں۔ عجیب چیز ہے یہ۔ سنیے کہ یہ جو انہیں بادشاہت لے کے دینے والے تھے' انقلابی ان کی مخالفت کیوں ہوتی تھی؟ انجیل برنباس میں ہے تب ان لوگوں نے کاہنوں کے سردار کے ساتھ مشورہ کیا اور کہا (یہ حضرتِ عیسیٰؑ کی یہ جو سرگرمیاں ہیں کہ رومن امپائر کی محکومی سے چھڑا کر اپنی حکومت قائم کی جائے' اس کے خلاف یہ بیٹھے ہوئے اپنے کاہنوں کے سردار کے ساتھ مشورہ کر رہی ہے یہ جماعت) انہوں نے کہا کہ اگر یہ آدمی بادشاہ ہو گیا تو ہم کیا کریں گے؟ کیا مصیبت آئے گی؟ ہم پر یہ بڑی مصیبت ہو گی۔ ذہن میں یوں آئے گا کہ جیسے یہ سمجھتے ہیں کہ موجودہ زمانے کی حکومت سے زیادہ مستبد ہو گا' ہم پہ زیادہ سختیاں آئیں گی۔ سنیے مصیبت کیا ہے؟ ہم پر بڑی مصیبت آئے گی اس لیے کہ وہ اللہ کی عبادت میں قدیم طریقے کے موافق اصلاح کرنا چاہتا ہے۔ ان کی خودساختہ شریعتوں کو توڑ کے خدا کے بتائے ہوئے طریقے کے مطابق اصلاح کرنا چاہتا ہے۔ دیکھتے ہیں آپ۔ کیوں کہ وہ ہماری تقالید اور رسومات کو باطل کرنے کی قدرت نہیں رکھتا اس وقت تو وہ ایسا نہیں کرسکتا۔ تب اس جیسے آدمی کی حکومت کے ماتحت ہمارا کیا انجام ہو گا۔ اور آگے سنیے جو اصل بات ہے۔ یقینا ہم اور ہماری اولاد سب تباہ ہو جائیں گے اس لیے کہ ہم اپنی ان موجودہ خدمات سے نکال دیے جائیں گے تو ہم مجبور ہوں گے کہ اپنی روٹی عطیہ کے طور پر مانگیں۔ ''ہن تے موج بنی پئی ہیگی اے''۔

دینِ خداوندی کے مقابل میں مذہب کی حیثیت ہمیشہ پروفیشن کی بنیاد پر استوار ہوتی ہے

مسئلہ ہی سارا روٹی کا ہے۔ مذہب پروفیشن ہوتا ہے۔ دین نظامِ خداوندی کی اطاعت کا نام ہے۔ وہ کہتا ہے یہ مصیبت ہو گی۔ اب تو روٹی جو ہے یعنی لیتے تو اب بھی دوسروں سے ہیں لیکن اب کیفیت یہ ہے کہ دینے والے آتے ہیں' ہاتھ باندھتے ہیں' جوڑتے ہیں' نمسکار کرتے ہیں' آداب بجالاتے ہیں' سلام کہتے ہیں' کورنش ہے پیش کرتے ہیں پھر اس کے بعد ''گوڈے گٹے وی نال چمدے ہیگے نیں' سجدہ وی کردے نیں تے تاں لا کے دیندے نیں'' اور اس وقت ہمیں روٹی عطیہ کے طور پر مانگنی پڑے گی۔ یہ تو پتہ ہے کما کے تو کھا نہیں سکتے۔ ''اک موچی وی جوتی گنڈھ کے رات نوں روٹی کھالیندا ہیگا' اے تے اینے جوگے وی نئیں ہوندے''۔ اب جو آ کے ملتی ہے تو ایک حق کے طور پر لیتے ہیں' ڈانٹ کے لیتے ہیں اُس وقت ہمیں عطیہ کے طور پر مانگنی پڑے گی۔ ملاحظہ فرمایے! جو کہتے ہیں مصیبت آئے گی۔ اب آگے سنیے صاحب یہاں آتی ہے اصل سیاست۔ اس وقت خدا کا شکر ہے کہ ہمارا ایک بادشاہ اور ایک حاکم دونوں ہماری شریعت سے اجنبی ہیں۔ سیکولر گورنمنٹ تھی انہوں نے اپنے ہاں سیکولر نظام

قائم رکھا ہے وہ INDIFFERENT ہیں۔ یہ ''اجنبی'' ترجمہ ہے اصل میں INDIFFERENT کا کہ ان کو اس سے 478 آلِ عمران واسطہ نہیں کہ ہم اپنے ہاں یہ جو شریعت کے قوانین PERSONAL LAWS شخصی قوانین جو ہیں یہ ہمارے حوالے انہوں نے کر رکھے ہیں اور امورِ سلطنت جو ہیں اپنے پاس رکھے ہوئے ہیں۔ یہاں ہماری بادشاہت قائم ہے' وہاں ان کی حکومت قائم ہے۔ اس وقت تو کیفیت یہ ہے کہ وہ اس سے اجنبی ہیں اور ہماری شریعت کی کوئی پروا کرنے والے نہیں جیسے کہ ہم ان کی شریعت کی کچھ پروا نہیں کرتے۔ اور اسی سبب سے ہم قدرت رکھتے ہیں کہ جو چاہیں کرلیں۔ اب یہ سوال ہے کہ صاحب یہاں بھی تو کوئی غلطیاں ولطیاں ہو جاتی ہیں۔ کہتا ہے پس اگر ہم نے غلطی کی تو ہمارا اللہ رحیم ہے' قربانی اور روزے کے ساتھ اس کا راضی کر لینا ممکن ہے ''او تے بڑا آسانی نال راضی ہو جاندا اے''۔ مگر جبکہ یہ بادشاہ ہو گیا تو ہرگز نہ راضی کیا جاسکے گا جب تک کہ یہ اللہ کی عبادت ویسے ہی انداز سے ہوتی نہ دیکھے جیسا کہ موسیٰؑ نے خدا کے احکام کے مطابق لکھا ہے۔ یہ ہے جو مصیبت آنے والی ہے۔

بدل کے بھیس زمانے میں پھر سے آتے ہیں

اگرچہ پیر ہے آدم جواں ہیں لات و منات

وہ دور اور تاریخ کا وہ زمانہ یا مقامات بدل دیجیے آج کی داستان آپ کی نظر آرہی ہے

وہی فطرتِ اسد اللہی وہی مرحبی وہی عنتری

قرآنی نظام میں مذہبی پیشوائیت کا الگ وجود باقی ہی نہیں رہتا

وہ ہیکل کے اندر احبار و رہبان کہلائیں یا آپ کے ہاں حجروں اور خانقاہوں کے اندر علما اور مشائخ کہلائیں' وہ پنڈت کہلائیں یا سنیاسی کہلائیں' وہ پادری کہلائیں یا سینٹس کہلائیں۔ کچھ بھی نام رکھ لیجیے' ذہنیت ہر جگہ کام وہی کرے گی۔ جب بھی دین مذہب میں تبدیل ہو جائے گا' یہی ذہنیت کام کرے گی کہ اگر یہ پھر خدا کے دین کو قائم کرنے کے لیے اس نے جو یہ بیڑا اٹھایا ہے' اگر یہ ہو گیا تو ہماری کیفیت یہ ہو جائے گی کہ ہمیں روٹی عطیہ کے طور پہ کھانی پڑے گی۔ اور اس وقت تو بڑی موج ہے کہ بادشاہ اور حکومت وہ ہمارے معاملات میں دخل نہیں دیتیں PERSONAL LAWS ہمارے ہیں SECULAR LAWS ان کے ہیں۔ وہاں اُن کی حکومت یہاں ہماری حکومت۔ اور اگر اِسؑ کے ہاتھ میں اقتدار آ گیا تو پھر تو یہاں یہ صورت یہ DUALISM اور یہ ثنویت نہیں رہے گی۔ وہاں پھر تو قانونِ خداوندی کی حاکمیت اور اسی کی حکومت ہوگی۔ پھر ہمارا تو یہاں کوئی دخل عمل ہوگا نہیں۔ ان کا تو وجود باقی نہیں رہتا۔ خدا کی حکومت کے اندر ملوکیت باقی نہیں رہتی' مذہبی پیشوائیت باقی نہیں رہتی'

نظامِ سرمایہ داری باقی نہیں رہتا۔ یہودیوں کے ہاں ایک طبقہ سب سے بڑا دنیا کے اندر سود لینے والا' دوسرا طبقہ سب سے بڑے 478 **آلِ عمران** مہاجن اور اس کے بعد حکومت رومنز کی۔ اور ان کے اندر حضرتِ عیسٰیؑ کھڑے ہوئے تھے۔ آپ اب سوچ سکتے ہیں کہ صحیح تعلیم حضرتِ عیسٰیؑ کی کیا تھی اور وہ کیا پیغام دینے کے لیے دنیا کے اندر آئے تھے۔

مذہب کی دنیا نے تو حضرت عیسٰیؑ جیسی انقلابی شخصیت کے خدوخال ہی بدل دیئے ہیں

وہ جو دین جب مذہب میں تبدیل ہوا ہے تو انؑ کی پھر سیرت کی تصویر اس قسم کی ہمارے سامنے کھینچ کے رکھ دی گئی ہے کہ جیسے تکیہ نشیں فقیر' درویش کو' دنیا کے معاملات سے کوئی واسطہ نہیں' تارک الدنیا بن کے بیٹھے ہوئے ہیں۔ وہی جو آپ کے ہاں اسلام بن کے رہ گیا۔

حضرت عیسٰیؑ کی طرف سے اٹھنے والی ایک انقلابی آواز

قرآنِ کریم نے ایک لفظ میں ساری حقیقت کو سمٹا کے رکھ دیا۔ تفصیل تو قرآن بیان نہیں کرتا ان چیزوں کی۔ یہ سب کچھ حضرتِ عیسٰیؑ کر رہے ہیں۔ فَلَمَّآ اَحَسَّ عِیْسٰی مِنْهُمُ الْكُفْرَ (3:52) جب حضرتِ عیسٰیؑ نے محسوس کیا کہ ان کی طرف سے ایک بہت بڑی سرکشی کی چیز آنے والی ہے۔ آپ نے دیکھا ایک لفظ میں کیا بات کہہ گیا ہے قرآن؟ اور پھر اَحَسَّ (3:52) کے معنی ہیں کہ یہ اندر اندر تو بہت عرصے یہ چیز پک رہی تھی' محسوس شکل میں بہت دیر کے بعد آتی تھی۔ جب اس شکل میں وہ بات ظاہر ہوگئی کہ اب یہ تو وہ لوگ جو اندر اندر سازشیں کرتے تھے' اب اس کو عملی پیکر عطا کرنے کے لیے یہ باہر نکل آئے ہیں اور اب ہوسکتا ہے کہ اعلانیہ ان کے ساتھ ٹکراؤ ہو۔ فَلَمَّآ اَحَسَّ عِیْسٰی مِنْهُمُ الْكُفْرَ قَالَ مَنْ اَنْصَارِیْٓ اِلَى اللّٰهِ (3:52) آواز دی انہوں نے کون ہے تم میں سے جو خدا کے پروگرام میں میری مدد کرنے کے لیے اٹھتا ہے۔ کیا آواز ہے صاحب؟ مَنْ اَنْصَارِیْٓ اِلَى اللّٰهِ (3:52) نظر آتا ہے کہ کوئی بہت بڑا پروگرام سامنے ہے جس کے لیے اپنی جماعت میں سے بھی لوگوں سے کہا جاتا ہے کہ ہاں بھئی! ٹھیک ہے اس وقت تو تم جو اتباع کرتے چلے آئے ہو تو کوئی اتنا زیادہ دشوار گذار راستہ نہیں تھا' ابتلا کا مقام نہیں آیا تھا۔ اب وہ مقام آ گیا ہے بتاؤ' مَنْ اَنْصَارِیْٓ اِلَى اللّٰهِ (3:52) دیکھا ایک انقلابی کی آواز۔ قَالَ الْحَوَارِیُّوْنَ نَحْنُ اَنْصَارُ اللّٰهِ (3:52) حواریوں نے کہا ہم ہیں خدا کے پروگرام کے لیے تمہارے ساتھ۔ عزیزانِ من! عجیب چیز قرآن کہہ گیا ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ اسی کی وضاحت سے یہ پتہ چل جائے گا کہ خدا کی طرف سے بھیجی ہوئی کتاب کیا کہتی ہے' انسانوں کی خود ساختہ اس قسم کی کتابیں کیا کہتی ہیں۔

قرآنِ حکیم کی وسعتِ قلبی کہ ہر نبی کا احترام فرض ہے

خدا کی طرف سے بھیجی ہوئی کتاب تو آج آسمان کے نیچے قرآن ہی ہے۔ پہلی چیز تو قرآن میں آپ نے یہ دیکھا ہوگا' دنیا کی کسی اور مذہب کی کتاب کو اٹھائیے اس کے اپنے پیغمبر جو اپنے بانیانِ مذہب جو ہیں' انہی کا تذکرہ ہوگا' انہی کی عظمتیں اور رفعتیں بیان کی جائیں گی' اس کے اندر انہی کی شان میں قصائد ہوں گے' باقی جتنے بھی ہیں' ان کے خلاف تو نفرت ہوگی ان کے اندر۔ قرآن آتا ہے اور وہ یہ کہتا ہے حضرتِ نوحؑ سے لے کے حضرتِ عیسٰیؑ تک کے پیغمبران کو گنا دیتا ہے اور اس کے بعد یہ کہتا ہے کہ اس میں سے لَا نُفَرِّقُ بَیْنَ اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِهٖ (2:285) مسلمان سے کہتا ہے کہ تمہیں ان میں سے کسی میں بھی رسالت کی حیثیت سے فرق نہیں کرنا۔ وہ محمد رسول اللہ ﷺ پر ایمان لانے سے پہلے یہ کہتا ہے کہ دنیا کے ہر نبی کے اوپر ایمان لانا ہوگا' دنیا کی ہر کتاب پہ ایمان لانا ہوگا یہ کہنا ہوگا کہ دنیا کی ہر قوم میں خدا کے رسول آئے تھے۔ ہر قریہ میں ہر ملک میں ہر زمانے میں اور وہ کہا ہے کہ کچھ تو وہ ہیں جن کے نام ہم نے بیان کر دیے ہیں۔ باقی وہ ہیں جن کے نام نہیں ہم نے لکھے۔ ہم نے نام دیے ہوں یا نہ دیے ہوں' تم نے اِن کے لیے تفصیلی طور پر' اُن کے لیے مجمل طور پر سب پہ ایمان لانا ہے اور سب کا احترام کرنا ہے کہ اپنے اپنے وقت میں یہ سب خدا کے فریستادہ رسول تھے' خدا کی سچی کتابیں لے کر آئے تھے۔ آپ سوچیے کتنی بڑی وسعتِ ظرف ہے اس کے اندر ہمارے نقطۂ نگاہ سے۔ خدا کی طرف سے تو ایک حقیقت کا بیان ہوا ہے صرف لیکن کتنی بڑی بات ہے ایک مذہب کے لیے کہ دنیا کے تمام بانیانِ مذاہب کے متعلق یہ احترام جیسا احترام رسول ہونے کی جہت سے محمد رسول اللہ ﷺ کا ویسا احترام دنیا کے ہر بانئ مذہب کا کہ ہوسکتا ہے کہ اگرچہ نام اس کا قرآن میں نہیں دیا لیکن وہ اپنی قوم کے نبی ہوں۔ مسلمان تو اس طرح سے مجبور ہوجاتا ہے دنیا کے ہر بانئ مذہب کی تعظیم کرنے کے لیے۔ لیکن یہاں تو معاملہ اس سے ایک قدم آگے بڑھتا ہے۔ نبی نہیں نبی کے ساتھی ہیں یہ لیکن CONTRAST کے لیے پہلے یہ دیکھیے کہ جن کے یہ APOSTLES ہیں

حضرت عیسٰیؑ کے بارہ حواریوں کے متعلق اناجیل کا متضاد بیان

عیسائی حضرتِ عیسٰیؑ کے ان بارہ حواریوں کو APOSTLES کہتے ہیں رسول ان کا ترجمہ کرتے ہیں۔ حضرتِ عیسٰیؑ کو تو وہ خدا مانتے ہیں' ان کو رسول مانتے ہیں۔ اب یہ دیکھیے کہ اپنے ان رسولوں کے متعلق ان APOSTLES کے متعلق ان عیسائیوں کی اپنی اناجیل کا بیان کیا ہے؟ آپ کو معلوم ہوجائے گا کہ تحریف شدہ کتابیں جو ہیں یا انسانوں کی بنائی ہوئی تاریخ اور

خدا کی بھیجی ہوئی کتاب میں کیا بین فرق ہوتا ہے۔ یہ بڑی اہم چیز ہے جو میں پیش کر رہا ہوں۔ ان حواریوں کے متعلق پہلے چھوٹے چھوٹے جملے لیجیے۔ متی کی انجیل سولہواں باب اور آٹھویں آیت۔ یہ بارہ گناتے ہیں یہ ان کے حواری انجیل کے اعتبار سے۔ یسوع نے یہ معلوم کر کے کہا کہ اے کم اعتقادو! تم آپس میں کیوں چرچا کرتے ہو کہ ہمارے پاس روٹی نہیں۔ کم اعتقادو۔۔ یعنی حضرتِ مسیحؑ کی ساری دعوت کا نچوڑ ان کے نزدیک یہ بارہ اشخاص ہیں اور ان بارہ کو مخاطب کر کے وہ یہ کہہ رہے ہیں اے کم اعتقادو۔ گویا یقین اور ایمان ان کے اندر بھی نہیں ہے۔ یہ ہم آپ نہیں کہہ رہے، ہم تو کہہ ہی نہیں سکتے، یہ خود انجیل بتا رہی ہے کہ مسیحؑ ان کے متعلق کہتا ہے اے کم اعتقادو۔ اسی میں آگے چل کے سترہویں باب میں بیسوی اکیسویں آیت ہے کہ ایک بیمار آیا حضرتِ عیسٰیؑ کے پاس، حواریوں نے کوشش کی، اس کو اچھا کریں، وہ نہ ہوسکا۔ آپؑ نے اس کا علاج کیا یا ان کے کہنے کے مطابق اس پہ ہاتھ کیا اور وہ اچھا کیا۔ اس کو چھوڑ دیجیے۔ انہوں نے آگے حواریوں نے کہا حضرتِ عیسٰیؑ سے کہ ہم اس کو اچھا کیوں نہ کر سکے؟ تو حضرتِ عیسٰیؑ نے ان سے کہا کہ اپنے ایمان کی کمی کے سبب۔ کیوں کہ میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ اگر تم میں رائی کے دانے کے برابر بھی ایمان ہوگا تو اس سے تم پہاڑ ہلا سکو گے۔ یعنی وہ جو اپنے ہاں کا خلاصہ ہے ان کی دعوت کا ان کے متعلق خود کہہ رہے ہیں کہ کم اعتقاد ہو، ایمان کی کمی ہے۔

حضرتِ عیسٰیؑ کے بارہ حواریوں میں سے سینٹ پیٹر یا پطرس کا مقام اور پھر ان کا کردار

یہاں تک تو بات خیر ایمان کی کمی تک پہنچتی ہے، اب آگے چلیے۔ ان میں سے جو بارہ ہیں ان میں سینٹ پیٹر یا پطرس جنہیں شمعون بھی کہتے ہیں، ان کا مرتبہ ان بارہ میں سب سے بلند بتایا گیا ہے۔ اتنا بلند اسی انجیل کی اسی سولہویں باب میں ہے کہ وہ حضرتِ عیسٰیؑ ان سے کہتے ہیں اور میں بھی تجھ سے کہتا ہوں کہ تو پطرس ہے اور میں اس پتھر پر اپنی کلیسا بناؤں گا اور عالمِ ارواح کے دروازے اس پر غالب نہ آئیں گے۔ میں آسمان کی بادشاہت کی کنجیاں تجھے دوں گا اور جو کچھ تو زمین پر باندھے گا، وہ آسمان پر بندھے گا اور جو کچھ تو زمین پر کھولے گا، وہ آسمان پر کھلے گا۔ آپ دیکھتے ہیں کہ کتنا بڑا مقام ہے حضرتِ عیسٰیؑ کے نزدیک سینٹ پیٹر کا۔ اسی کے متعلق اب ذرا دیکھیے کہ حضرتِ عیسٰیؑ کیا کہتے ہیں؟ حضرتِ عیسٰیؑ نے بتایا کہ اب کیا ہونے والا ہے کتنی بڑی ٹکر ہے جو ہم لینے والے ہیں ان کے ساتھ۔ کہا ہے کہ اس پر پطرس اس کو الگ لے جا کر (یہ سینٹ پیٹر حضرتِ عیسٰیؑ کو الگ لے گئے) اسے ملامت کرنے لگا کہ اے خداوند خدا تجھ سے یہ ہرگز نہیں ہو سکے گا۔ ملاحظہ فرمایئے آپ! یہ انہیں سمجھا رہے ہیں اپنے رسول کو یہ ان کے امتی کہ یہ تم سے ہرگز نہیں ہو سکے گا۔ اس نے یعنی حضرتِ عیسٰیؑ نے پھر پطرس سے کہا اے شیطان! میرے سامنے سے

دور ہوتو میرے لیے ٹھوکر کا باعث ہے کیوں کہ تو خدا کی باتوں کا نہیں بلکہ آدمیوں کی باتوں کا خیال رکھتا ہے۔ یہ جس پتھر کے اوپر 478 آلِ عمران کلیسا کی بنیاد رکھی جارہی ہے، جس کے ہاتھ میں آسمانی بادشاہت کی کنجیاں دی جارہی ہیں، جس کے متعلق کہا جارہا ہے کہ جو تو زمین پہ کھولے گا، آسمان پہ کھلے گا جو زمین پہ بند رکھے گا، آسمان پہ بند رہے گا۔ یہ ابھی اسی متی کے اسی باب میں چار آیتیں آگے چل کے ہے کہ وہ اسے کہہ رہا ہے کہ یہ کیا اعلان تو کر رہا ہے، نہیں ہو سکے گا تجھ سے اور وہ اس سے کہتے ہیں کہ شیطان! دور ہو کہ خدا کی بات نہیں، انسانوں کی باتوں کے اندر آ گیا ہے۔ وہیں لکھا ہے۔ یہ سینٹ پیٹر ہیں ان کے ہاں کے سب سے مقدس ترین۔ ذرا پوچھیے کہ یہ جو پھل ہیں بارہ، یہ تو جسے گلِ سرسبد کہتے ہیں بلند ترین شاخ کے اوپر پھوٹنے والے پھول یہ ہیں وہ، ان کے متعلق تم خود یہ کچھ لکھ رہے ہو۔ جس درخت کے پھل یہ بتا رہے ہو پھر اس درخت کے متعلق کیا کہا جائے گا۔

پطرس کے علاوہ گیارہ حواریوں کا حضرت عیسٰیؑ سے کیا جانے والا وعدہ

تم نے خود یہ معیار بتایا ہے دنیا کو۔ بارہ میں سے ایک نے تو بیچ ہی دیا اور اس کے بعد آگے ہے کہ جب وہ پکڑنے والے آئے تو باقی گیارہ کے گیارہ مسیح کو تنہا چھوڑ کے بھاگ گئے۔ اور یہ جو پطرس ہیں اس کے متعلق اب سنیے یہ جن کے متعلق ابھی ابھی میں نے عرض کیا ہے کہ خود انجیل اور حضرتِ عیسٰیؑ یہ کہہ رہے تھے۔ چھبیسواں باب اکیسویں آیت۔ یہ آخری رات جو ہے انجیل کے مطابق صبح کو جب گرفتاری ان کی ہوتی ہے (انجیل کے مطابق)۔ میں عرض کروں گا قرآن کا بیان کچھ اور ہے اور آج کی تاریخ کی حقیقت قرآن کے بیان کی صداقت کر رہی ہے، انجیل کی تکذیب کر رہی ہے۔ میں آگے چل کے آپ کو عرض کروں گا۔ وہ کہا ہے کہ پھر ان کو حضرتِ عیسٰیؑ آخری رات کی دعوت کے بعد باہر زیتون کے پہاڑ پہ لے گئے وہاں ان کو جو سرمن دیا اُس وقت یسوعؑ نے ان سے کہا کہ تم سب اسی رات میری بابت ٹھوکر کھاؤ گے۔ پطرس نے جواب میں اس سے کہا گو سب تیری ٹھوکر کھائیں گے لیکن میں کبھی ٹھوکر نہ کھاؤں گا۔ یسوعؑ نے اس سے کہا کہ میں تجھ سے سچ کہتا ہوں کہ اسی رات مرغ کے بانگ دینے سے پہلے تو تین بار میرا انکار کرے گا۔ پطرس نے اس سے کہا اگر تیرے ساتھ مجھے مرنا بھی پڑے تو بھی تیرا انکار ہرگز نہ کروں گا۔ اور سب شاگردوں نے بھی اسی طرح سے کہا۔ یہ سارا کچھ ان سے کہا شاگردوں نے بھی باقیوں نے بھی کہا پطرس نے بھی یہ چیز کہی۔ پطرس کے متعلق حضرتِ عیسٰیؑ کہتے ہیں کہ تو تو مرغ کے بانگ دینے سے پہلے تین دفعہ انکار کر دے گا میرا۔ اور وہ کہتا ہے کہ یہ بالکل ہرگز ایسا نہیں ہوگا۔ اور چلیے دو ہی ورق آگے الٹیے۔ اسی باب میں لکھا ہے کہ حضرتِ مسیح کو پکڑ کے اندر لے گئے کمرے کے اور پطرس باہر صحن میں بیٹھا ہوا تھا کہ ایک لونڈی اس کے پاس آ کر بولی تو بھی یسوعؑ کے ساتھ تھا؟ اس نے سب کے سامنے یہ کہہ کر انکار کیا

کہ میں نہیں جانتا کہ تو کیا کہتی ہے۔ اور جب وہ ڈیوڑھی میں چلا گیا تو دوسری نے اسے دیکھا جو وہاں تھے ان سے کہا کہ یہ یسوعِ ناصری کے ساتھ تھا۔ اس نے قسم کھا کر پھر انکار کیا کہ میں اس آدمی کو نہیں جانتا۔ تھوڑی دیر کے بعد جو وہاں کھڑے تھے انہوں نے پطرس کے پاس آ کر کہا کہ بے شک تو بھی ان میں سے ہے کیوں کہ تیری بولی سے بھی ظاہر ہوتا ہے۔ اس پر وہ لعنت کرنے لگا اور قسم کھانے لگا کہ میں اس آدمی کو نہیں جانتا۔ اور فی الفور مرغ نے بانگ دی پطرس کو یسوعؑ کی وہ بات یاد آئی جو اس نے کہی تھی کہ مرغ کے بانگ دینے سے پہلے تو تین بار میرا انکار کرے گا۔

انجیل کے برعکس حضرت عیسیٰؑ کے ساتھ حواریوں کے حسنِ سلوک کی قرآنی شہادت

یہ تصویر کھینچی جا رہی ہے انجیل میں حضرتِ مسیحؑ کے ان بارہ حواریوں کی جو ان کی ساری تعلیم و تبلیغ کا ملخص ہے۔ یہ انجیل کا بیان ہے ان کے اپنے رسولوں کے متعلق۔ اور ادھر قرآن آتا ہے رسول تو ایک طرف رسول کے ساتھیوں کے متعلق کہتا ہے کہ قَالَ مَنْ اَنْصَارِیْٓ اِلَی اللّٰہِ ((3:52 انہوںؑ نے آواز دی کون ہے کہ جو اس ایسے نازک وقت میں اس پروگرام میں میرا ساتھ دیتا ہے؟ قَالَ الْحَوَارِیُّوْنَ نَحْنُ اَنْصَارُ اللّٰہِ ((3:52 انجیل وہ بتا رہی ہے قرآن یہ بتا رہا ہے۔ غور فرمایا آپ نے! یہ ہے فرق تحریف شدہ کتابوں میں اور خدا کی دی ہوئی ایک کتاب کے اندر۔ اور یہ ہے اتنا عظیم ظرف کہ رسولوں کے متعلق ہی نہیں، رسولوں کے ساتھی جو جماعت ہے ان کی جس پھل سے درخت نے پہچانا جانا ہے، اس پھل کے متعلق بھی قرآن شہادت دیتا ہے۔ بات تو دو لفظوں میں کہہ گیا، ساری بات کہہ گیا ہے۔ ایسے نازک وقت میں رسول کا پکارنا کہ آؤ کون ہے ایسے وقت میں جو ساتھ دیتا ہے؟ یاد آ جاتی ہے کہ وہ صبح کہ جب صلح حدیبیہ کے وقت میں جب نظر آتا تھا کہ اب مکے والوں سے ٹکراؤ ہونے والا ہے تو اس درخت کے نیچے جو بیعتِ رضوان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے لی ہے اور اس سے کہا ہے کہ ہاں اے میرے ساتھیو! وہ وقت آ گیا کہ جس کے انتظار میں اس وقت تک ہم نے یہ گھڑیاں گنی ہیں۔ آؤ کون میرا ساتھ دینے والا ہے؟ ایک ایک نے بڑھ کے ہاتھ کے اوپر ہاتھ رکھ دیا۔ جان اور مال خدا کے ہاتھ میں بیچنے والوں کی یہ کیفیت ہے۔ یہ تو ہماری تھی لیکن میں کہتا ہوں کہ حضرتِ عیسیٰؑ کے حواریوں کے متعلق جب یہ انجیل موجود تھی، ان کے سامنے اس وقت یہ کہنا کہ انہوں نے آواز دی کہ کون ہے میرا ساتھ دینے والا؟ اور حواریوں نے کہا کہ ہم ساتھ دینے والے ہیں۔ اٰمَنَّا بِاللّٰہِ ((3:52 اس لیے کہ ہم خدا پر ایمان لائے ہوئے ہیں۔ وَ اشْھَدْ ((3:52 حضرتِ عیسیٰؑ سے کہہ رہے ہیں کہ تو گواہ رہنا بِاَنَّا مُسْلِمُوْنَ ((3:52 ہمارا سرِ تسلیم خم ہے۔ یہ کہا، مرحلہ کی نزاکت سامنے آئی، مسائل کی شدت کا احساس ہوا رَبَّنَآ اٰمَنَّا بِمَآ اَنْزَلْتَ وَ اتَّبَعْنَا الرَّسُوْلَ ((3:53 اے ہمارے

نشوونما دینے والے! جو کچھ تو نے نازل کیا' ہم اس پہ پورا پورا ایمان رکھتے ہیں اور ہم اس رسول کا اتباع کرتے چلے جا 478 **آلِ عمران**
گے۔ فَاکْتُبْنَا مَعَ الشّٰھِدِیْنَ (3:53) تو ہمیں ان میں لکھ دے کہ جو اپنے ایمان کی صداقت کی شہادت اپنی جانیں دے کے کیا کرتے ہیں۔ حواریوں کا بیان قرآن کی رو سے' حواریوں کی تفسیر خود عیسائیوں کی انجیل کی رو سے۔ غور فرمایا آپ نے؟ عزیزانِ من! یہ ہوتے ہیں رسولوں کے تربیت یافتہ۔

مذہب کا سارا دارومدار تاریخ کی سند پر ہوتا ہے

میں نے عرض کیا ہے کہ جب دین مذہب میں بدلتا ہے تو پھر تاریخ جب اس کی سند ہوتی ہے تو پھر یہ بات انجیل میں ہی نہیں ہوتی پھر یہ چیز حضرتِ عیسیٰؑ کے حواریوں کے ساتھ ہی نہیں رہتی۔ کلیجہ شق ہو جاتا ہے جب یہ کہنا پڑتا ہے ہر جگہ یہی ہوتا ہے۔ قرآن نبی اکرم ﷺ کی جماعت کے متعلق آپ دیکھیے کن الفاظ میں انہیں اُولٰٓئِکَ ھُمُ الْمُؤْمِنُوْنَ حَقًّا (8:4) کہتے ہیں ''پکے سچے مومن'' مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ وَالَّذِیْنَ مَعَہٗٓ اَشِدَّآءُ عَلَی الْکُفَّارِ رُحَمَآءُ بَیْنَھُمْ (48:29) سورۃ فتح کو دیکھیے ایسا نظر آتا ہے جیسے اللہ تعالیٰ جھوم جھوم کے ان کے اوصاف بیان کر رہا ہے۔ یہ تھے ہی ایسے۔ دستِ پروردۂ رسالت ﷺ' دنیا میں اگر وہ نمونہ نہ بنیں گے اس تعلیم کا' محسوس پیکر نہ بنیں گے اور پھر ہم ایمان کی صحیح تصویریں دیکھنے کے لیے کہاں جائیں گے؟ قرآن نے اسی لیے ان صحابہؓ کے متعلق مختلف مقامات پہ یہ شہادات دیں کہ مومنِ حقا تھے' مخالفین کے مقابلے میں چٹان کی طرح سخت ایک دوسرے کے ساتھ ریشم کی طرح نرم۔ ان کی کیفیت یہ تھی قرآن آگے کہتا ہے کہ ایک چھوٹی سی کھیتی کی مثال' پہلے ذرا سی ننھی سی سوئی نکالتی ہے' پھر وہ اوپر ابھرتی' ہے پھر وہ آگے چلتی ہے' پھر اس کے بعد اس میں خوشے پڑتے ہیں' پھر وہ پھل لاتی ہے۔ کسان کا دل وجدِ مسرت سے جھوم اٹھتا ہے۔ یہ کھیتی ہوتی ہے رسول کے ہاتھوں کی لگائی ہوئی۔ یہ تھے رسول اللہ ﷺ کے ساتھی صحابۂ کبارؓ جن کے متعلق قرآن نے یہ کہا ہے کہ اے رسول! تیرے لیے خدا اور یہ تیرے ساتھی جو ہیں یہ کفایت کرتے ہیں۔ خدا اکیلا نہیں کہا خدا اور تیرے یہ ساتھی جماعتِ مؤمنین یہ کفایت کرتے ہیں تیرے لیے (8:64)۔ یہ تھی وہ جماعت۔ دین مذہب میں تبدیل ہوتا ہے۔ اب تاریخ آپ کے سامنے آتی ہے انسانوں کی لکھی ہوئی۔

بخاری کی حدیث کے مطابق روزِ قیامت خدا سے نبی اکرم ﷺ کی اپنے صحابہؓ کے متعلق پکار؟ اور کفر کے فتوؤں کی حقیقت

عزیزانِ من! جگر تھام کے سنیے کسی چھوٹی کتاب کی حدیث نہیں' جسے اصح الکتب بعد کتاب اللہ کہا جاتا ہے' بخاری شریف

آلِ عمران 478 گروہ در گروہ کے اندر موجود ہے کہ قیامت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم میدانِ حشر میں بیٹھے ہوں گے۔ ایک طرف کو دیکھیں گے کہ گروہ در گروہ جو ہیں، فرشتے ان کو پکڑ کے دھکڑ کے جہنم کی طرف لیے جا رہے ہوں گے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سر اٹھا کر دیکھیں گے پکاریں گے، یہ تو میرے صحابہؓ ہیں، یہ تو میرے صحابہؓ ہیں۔ انہیں جہنم کی طرف لیے جا رہے ہو؟ خدا آواز دے گا کہ جب تک تو ان میں تھا یہ تو تیرے متبع رہے تھے، تیرے مرنے کے بعد یہ سارے دین سے پھر گئے تھے۔ معاذ اللہ معاذ اللہ معاذ اللہ۔ آسمان سے کہو کہ کیوں نہیں شق ہو جاتا؟ زمین سے کہو کیوں نہیں پھٹ پڑتی؟۔ وہ قرآن جو حضرتِ عیسٰیؑ کے ساتھیوں کے متعلق یہ شہادتیں دے رہا ہے وہ قرآن جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے ساتھیوں کے متعلق کہہ رہا ہے وَالَّذِيْنَ مَعَهٗۤ اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ (48:29) وہ ایمان کی سچی صداقتیں ان کے متعلق آپ کے ہاں کی یہ حدیث کی صحیح ترین کتاب، یہ روایت اس کے اندر لکھی ہوئی ہے۔ دیکھا! اسی مقام کے اوپر کھڑا کر دیا لا کے۔ نظر آ رہا ہے صاف کہ کس قدر انسانوں کی سازشیں ہوئی ہیں دین کے ساتھ، کس قدر وضعی روایات ہیں جو ان کے اندر شامل کی گئی ہیں۔ بہرحال یہ تو چلیے کبھی سازش ہوئی، پتہ نہیں کس نے کی، کس نے ان کے ساتھ یہ چیزیں ملا دیں؟ لیکن اس کے بعد قیامت یہ ہے کہ ہزار برس سے آپ سینے سے لگائے لگائے ان چیزوں کو پھر رہے ہیں۔ اور اگر کوئی شخص یہ کہہ دیتا ہے، کسی کی ایمان کی حرارت، اس کی حمیت اسے مجبور کرتی ہے یہ کہنے پہ کہ میرے رسول صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے صحابیؓ ایسے نہیں ہو سکتے تھے، اس پہ کفر کے فتوے لگائے جاتے ہیں آج۔ نظر آ رہا ہے کہ اور کچھ نہیں تو ان کا ہاتھ تو تھا نا جن کی انجیل میں ان کے صحابی کے متعلق یہ باتیں تھیں۔ کم از کم اور کچھ نہیں تو انہوں نے اتنا ہی کیا کہ ان کے صحابہ کو بھی وہاں لے آئے۔ لیکن اس سے زیادہ گہری سازش تھی۔ مجھے اس کے اندر جانے کی ضرورت نہیں ہے، آپ کے ہاں یہ موجود ہے۔ اور آج بھی اگر آپ اس کا انکار کرتے ہیں، آپ کو پتہ ہے کہ یہ جمعیت اہلِ حدیث انہوں نے ایک کتاب لکھی ہوئی ہے فتنۂ انکارِ حدیث۔ اس کے اندر یہ ہے کہ بخاری کی ایک حدیث کا انکار جو ہے، وہ بھی کفر ہے۔ کیجیے انکار اس حدیث کا آپ اور کہیے اس کے بعد کہ درخت اپنے پھل سے پہچانا جاتا ہے۔ پہچانئے اس شجرِ طیب کو اس پھل سے جس کے متعلق سب سے بڑی شہادت آپ کی یہ مل رہی ہے کہ فرشتے ان کو زنجیروں میں جکڑ کے جہنم کی طرف لیے جا رہے ہیں اور خدا شہادت دے رہا ہے کہ تیرے ہوتے ہوئے تو یہ مسلمان رہے تھے، اس کے بعد سب مرتد ہو گئے تھے۔

اے محمدؐ گر قیامت را براری سر ز خاک
سر برارو ایں قیامت درمیانے خلق بیں

478آلِ عمران

علامہ غلام احمد پرویزؒ پر کفر کے فتوؤں کی نوعیت اور ان کی ماہیت

اسے ہم سینے سے لگائے لگائے پھر رہے ہیں ۔ پھانسی دے دو پرویز کو یہ ان حدیثوں کا انکار کرتا ہے۔ کتنی بڑی حسین تھی یہ شہادت قرآن حواریوں کے متعلق دیتا ہے' کتنے عجیب الفاظ ہیں نَحۡنُ اَنۡصَارُ اللّٰہِ ج اٰمَنَّا بِاللّٰہِ ج وَ اشۡہَدۡ بِاَنَّا مُسۡلِمُوۡنَ۔ رَبَّنَاۤ اٰمَنَّا بِمَاۤ اَنۡزَلۡتَ وَ اتَّبَعۡنَا الرَّسُوۡلَ فَاکۡتُبۡنَا مَعَ الشّٰہِدِیۡنَ ((3:52-53 پھر قرآن درمیان کی کڑیاں بیان نہیں کرتا۔ ایک لفظ کے اندر بات کہہ جاتا ہے۔ کیا کیا انہوں نے یہودیوں کے ان پیشواؤں نے؟ وَ مَکَرُوۡا ((3:54 ہمارے ہاں اردو میں تو مکر برے معنوں میں آتا ہے' فریب کے معنوں میں ایک بہانہ سازی کے معنوں میں ۔ عربی زبان میں مکر کہتے ہیں کوئی اس قسم کی تدبیر جو بڑی ہی لطیف' نازک' SUBTLE سی ہو۔ تدبیر برے کام کے لیے بھی ہوتی ہے' تدبیر اچھے کام کے لیے بھی ہوتی ہے لیکن وہ بڑی نرم و نازک SUBTLE سی ہونی چاہیے۔ وَ مَکَرُوۡا انہوں نے بھی ایک خفیہ تدبیر کی' ایک خفیہ سازش کی وَ مَکَرَ اللّٰہُ ((3:54 اللہ نے بھی اس کے مقابلے میں ایک تدبیر کی۔

قرآنِ حکیم کے الفاظ کا مفہوم اردو زبان میں پورا نہیں اترتا لہٰذا قرآنِ حکیم کو قرآنِ حکیم کے الفاظ میں ہی سمجھنا ہوگا

اگر مکر کے معنی اردو میں ہوئے تو مکار تو فعال کے وزن پہ آتا ہے نا' سب سے بڑا مکر کرنے والا جو ہے۔ دیکھا میں جو بار بار کہا کرتا ہوں کہ ترجمے میں جو لفظ آجاتا ہے اپنی زبان میں ہم اس کا ترجمہ کرتے ہیں تو اس کے معنی کہاں سے کہاں چلے جاتے ہیں۔ کہہ دیجیے کہ انہوں نے تو مکر کیا تھا لیکن اللہ مکار تھا (معاذ اللہ)۔ لفظ دوسری زبانوں میں آ کے وہ اپنے اور یکسر معنی بدل دیتے ہیں۔ اسی لیے میں کہا کرتا ہوں کہ قرآن کو ترجموں سے نہ سمجھئے قرآن کو اس کی زبان میں سمجھئے۔ وَ مَکَرُوۡا وَ مَکَرَ اللّٰہُ ط وَ اللّٰہُ خَیۡرُ الۡمٰکِرِیۡنَ ((3:54 بہترین تدبیر کرنے والا۔ بات بتائی نہیں کہ کیا ہوا تھا؟ کیا کیا؟ تاریخ کے تفصیل میں جانا یہ قرآن کا منصب نہیں ہے۔ یہ تاریخ کی کتاب نہیں ہے' اصل بات جو ہے وہ کر جاتا ہے۔ انہوں نے بھی ایک اس قسم کی تدبیر کی۔ تدبیر کیا کی؟ میں نے جیسا عرض کیا ہے قرآن کو قرآن سے سمجھنا چاہیے بات سمجھ میں آجاتی ہے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا زمانہ آ گیا' مکے کی زندگی کے آخری دن آ گئے۔ اور اس کے بعد قرآن خود یہ کہتا ہے وَ اِذۡ یَمۡکُرُ بِکَ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا ((8:30 دیکھیے وہی لفظ یَمۡکُرُ (8:30) وہ جو مخالفین تھے انہوں نے ایک تدبیر کی اے رسول تیرے خلاف۔ تدبیر کیا تھی؟ لِیُثۡبِتُوۡکَ اَوۡ یَقۡتُلُوۡکَ اَوۡ یُخۡرِجُوۡکَ ((8:30 یا تو یہیں تمہیں نظر بند کر دیں' قید کر دیں یا تجھے قتل کر دیں یا تجھے یہاں سے نکال دیں۔ یہ تھا یَمۡکُرُ

478آلِ عمران

(8:30) یہ وہ اندر بیٹھے ہوئے خفیہ سازشیں کر رہے تھے۔

نبی اکرم ﷺ کی طرح حضرت عیسیٰؑ بھی دوسری طرف ہجرت کر گئے

عزیزانِ من! یہ دیکھیے وہی لفظ ہے وَ یَمْكُرُوْنَ ((8:30 انہوں نے بھی ایک تدبیر کی ہے اس سازش کی وَ یَمْكُرُ اللّٰهُ ط ((8:30 اور اس کے مقابلے میں خدا نے بھی ایک تدبیر کی۔ وَ اللّٰهُ خَیْرُ الْمٰكِرِیْنَ ((8:30 وہی الفاظ۔ رسول اللہ ﷺ کے متعلق کیا تدبیر تھی خدا کی؟ مکے سے راتوں رات ہجرت کر کے دوسرے مقام کے اوپر لے گئے بعینہٖ یہی کچھ حضرتِ عیسیٰؑ کے متعلق تھا۔ انہوں نے ایک تدبیر کی، خدا بھی غافل نہیں بیٹھا تھا۔ اس نے بھی ایک تدبیر کی۔ وَ اللّٰهُ خَیْرُ الْمٰكِرِیْنَ) (8:30 یہاں ہے وَ اللّٰهُ خَیْرُ الْمٰكِرِیْنَ) (3:54 وہاں ہے۔ خدا کی تدبیر یہ تھی کہ ان کے ہاتھ میں نہ یہ آئیں، ان کی گرفت سے پہلے ہی یہاں سے وہ ہجرت کر کے منتقل ہو کے کہیں اور چلے جائیں، یہ ہوا تھا حضرتِ عیسیٰؑ کے متعلق۔ اور یہ ہے وہ بات جس کے لیے قرآن نے آگے چل کے، جب ہم کہیں گے کہ انہوں نے نہ انہیں صلیب دیا نہ قتل کیا، وہ ان کے ہاتھ ہی نہیں آئے۔ وَ مَا قَتَلُوْهُ وَ مَا صَلَبُوْهُ (4:157) جس طرح نبی اکرم ﷺ ان کی ان تدابیر کے باوجود، ان سازشوں کے باوجود، ہاتھ ہی نہیں آئے ان کے، یہؑ ان کے ہاتھ ہی نہیں آئے تھے۔ یہود کی سازش یہ تھی کہ آپؑ کو پکڑا جائے، اپنی عدالت میں مقدمہ چلایا جائے، کفر کا فتویٰ صادر کیا جائے پھر یہ رومنز کے خلاف بغاوت کرنے کا بھی ایک جرم عائد کیا جائے۔ اور موت کا فتویٰ صادر کر کے گورنر سے اس کی تصدیق کرا کے ان کو صلیب دی جائے۔ یہودی شریعت میں صلیب پہ جو موت تھی، وہ لعنتی کی موت ہوتی تھی۔ ایک تو سزائے موت ہوتی ہے لیکن ان کے ہاں یہ جو خاص صلیب کے اوپر کسی کی موت تھی، وہ ان کے ہاں لعنتی کی موت اسے کہا کرتے تھے۔ انہوں نے یہ چیز تھی جو کچھ وہ کر رہے تھے، پکڑا جائے، گرفتار کیا جائے، صلیب پہ اس کو مارا جائے تاکہ یہ جو اتنا بڑا مقدس بنا پھرتا ہے اور خدا کا رسول اپنے آپ کو کہتا پھرتا ہے تو دنیا دیکھ لے کم از کم بنی اسرائیل اور یہودی یہ دیکھ لیں کہ جو شخص لعنت کی موت مرتا ہے، وہ خدا کا رسول کیسے ہوسکتا ہے؟ یہ تھا جو چرچا تھا۔ یہ جو خَیْرُ الْمٰكِرِیْنَ ہے خدا وہ عین اس وقت میں حضرتِ عیسیٰؑ کو یقین دلاتے ہیں کہ یہ بالکل نہیں ہوگا جو کچھ یہ کہتے ہیں۔ ایک تو یہ موت ہوتی ہے نا کسی کو قتل کر دینا، پھانسی دے دینا، صلیب پہ ایک طبعی موت ہوتی ہے۔ وہیں کہا جا رہا ہے اِذْ قَالَ اللّٰهُ یٰعِیْسٰۤى اِنِّیْ مُتَوَفِّیْكَ (3:55) گھبراؤ نہیں! یہ تمہیں پکڑ کے اس طرح سے قتل نہیں کریں گے، صلیب پہ نہیں دیں گے تو اپنی طبعی موت مرے گا۔ دیکھتے ہیں قرآن کا ربط کس طرح سے بات کرتا چلا جاتا ہے؟ یہ کہتے ہیں صلیب پہ تمہیں چڑھا کر لعنتی کی موت ماریں گے اور اس طرح سے دنیا کو کہیں گے کہ یہ جو اس قدر ذلیل انسان ہے، وہ خدا کا مقرب کیسے ہوسکتا ہے؟ وَ رَافِعُكَ اِلَیَّ ((3:55 ہم تمہیں مقرب ترین بنائیں گے اپنا۔ وَ رَافِعُكَ اِلَیَّ (3:55)۔

یہودیوں اور عیسائیوں کے مابین انتقام کی بنیادی وجہ

اب وہ آئی چیز۔ اناجیل میں تو عیسائیوں نے یہ کرنا تھا اس لیے کہ ان کے ہاں یہ چیز انہوں نے پہلے کی یہودیوں کے خلاف' انہوں نے اتنا انتقام پیدا کرنا تھا عیسائیوں نے۔۔ یہ بڑی سیاسی چیز تھی کہ انہوں نے اپنی تاریخ میں یہ کیا کہ انہوں نے پکڑا ہمارے نبی کو اور اس کو صلیب پہ چڑھایا انہوں نے۔ یعنی ان کے خلاف تو جذبات دشمنی کے اور نفرت کے اور انتقام کے مشتعل ہوگئے نا۔ اور یہ تو آج کی اب سیاستِ حاضرہ ہوئی ہے نا کہ انہوں نے اپنی تاریخ سے اور پوپ نے اپنی انجیل سے اس کو مٹا دیا ہے کہ یہودیوں نے یہ کیا تھا۔ ورنہ اس دو ہزار سال کے اندر جتنی سخت دشمنی عیسائی اور یہودیوں میں تھی' دنیا میں کسی دو قوموں میں ایسی سخت دشمنی نہیں تھی۔ اور اس ایشو کے اوپر تھی کہ عیسائی کہتے یہ تھے کہ انہوں نے ہمارے رسول کو پکڑا اور صلیب دیا۔ اگلی چیز جو تھی پھر کہ صاحب پھر صلیب دیا تو صلیب کی تو موت ایسی ہوتی ہے تو وہ کہتے تھے کہ مرے نہیں تھے وہ وہاں۔۔ یوں ان کو بچایا۔ کیا ہوا تھا پھر؟ وہ آسمان پہ اٹھا لیے گئے' وہاں چڑھا لیے گئے۔ یہ چیز ان کے ہاں موجود تھی ہمارے ہاں کی تفسیروں کے اندر بھی وہیں سے یہ چیز آ گئی۔ ہماری تو ساری تفاسیر متاثر ہیں انہی اسرائیلیات سے۔ حضرتِ عیسٰیؑ زندہ آسمان پہ تشریف لے گئے۔ چوتھے آسمان پہ ان کو کہا گیا کہ وہ ہیں۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مقامِ بلند کے بالمقابل عیسائیوں کا حضرت عیسٰیؑ کے متعلق پایا جانے والا تصور

بات میں سے بات نکلتی ہے وہ جو میں نے کہا ہے کہ انہوں نے یہ چیزیں آپ کے ہاں ایک خاص مقصد کے ماتحت داخل کیں۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا تو مقام بہت بلند ترین نظر آ رہا ہے نا۔ ان کی سازش یہ تھی کہ اس مقام کو نیچے لایا جائے۔ اس میں پہلی چیز تو وہ عیسائی جب ان کے ساتھ مباحثہ کرتے ہیں تو وہ یہی کہتے ہیں کہ آپ کے رسول عام طریقے سے ماں باپ کے ذریعے سے پیدا ہوئے تھے نا؟ ہاں۔ اور حضرتِ عیسٰیؑ کے متعلق یہ خود مانتے ہیں کہ وہ بن باپ کے پیدا ہوئے تھے۔ تو وہ کہتے ہیں کہ ساری کائنات میں سارے عالمِ انسانیت میں بنی آدم میں ایک EXCEPTION ہے۔۔ کہو دونوں میں سے کون بڑا ہوا؟ اور اس کے بعد وہ پوچھتے ہیں کہ آپ کے رسول یہ ہیں نا قبر کے اندر؟ اور تم مانتے ہو نا ہمارے رسول چوتھے آسمان پہ۔۔ کون بڑا ہوا؟ دیکھا آپ نے یہ۔ اب یہ کیا کریں؟ وہ قبر میں ہیں' عقیدہ نکلا حیات النبی کا کہ جی نہیں! زندہ ہیں۔ قرآن بار بار کہہ رہا ہے یہ بھی مرنے والے ہیں' تو بھی مرنے والا ہے (39:30) کل تو تو مر جائے گا' اس کے بعد یہ کیفیت یہ ہوگی۔ سیدھی سی بات ہے ایک طبعی انسان اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ (18:110) یہ اس کا جواب ہے۔ اب رہا یہ کہ وہؑ تو چوتھے آسمان پہ ہیں' انہوں نے معراج شریف

کے لیے نبی اکرم ﷺ کو کہا کہ وہ عرشِ معلیٰ پہ تشریف لے گئے تھے۔ وہ آپ کے ہاں کی نعتیں

رہ گئے چرخِ چہارم پہ جنابِ عیسیٰؑ

طے کئے ہفت سماوات کے میداں تو ﷺ نے

حضرت عیسیٰؑ کے متعلق آسمانوں پر زندہ اٹھا لینے کے عقیدہ کی نوعیت اور اس کی حقیقت

عزیزانِ من! کچھ بھی شاعری کیجیے آپ کی ان تفسیروں کی وجہ سے دو چیزیں تو آپ کے ایمان میں داخل ہوگئی ہوئیں کہ انؑ کی پیدائش بھی ساری کائنات میں سے EXCEPTION، دوسرا انؑ کا دنیا سے چلے جانا اور آسمان کے اوپر بھی زندہ رہنا ساری دنیا میں سے EXCEPTION۔ اسے تو انہوں نے آپ لوگوں سے منوالیا پھر اس کے بعد آپ انکار کیسے کریں گے؟ منوایا کس طرح؟ کہ جی! قرآن میں ہے وَرَافِعُکَ اِلَیَّ (3:55)۔ رفع کے معنی اوپر بلند کرنا۔ بس یہاں سے بلند کرنا کہا اور انہوں نے کہا کہ دیکھیے آسمان پہ گئے۔ عزیزانِ من! لمبی چوڑی بحث کی ضرورت نہیں ہے۔ اس معاملے میں ایک ہی لفظ ہے اس کے اندر۔ اس رَافِعُکَ (3:55) کا جو لفظ ہے اس کو دیکھ لیا جائے تو یہیں بات صاف ہو جاتی ہے۔ اِلَیَّ (3:55) ہم نے اسے اپنی طرف بلند کر لیا یہ ہوا نا۔ اس کے معنی ہوئے کہ خدا کہیں اوپر ہے۔ اِلَیَّ (3:55) اسی صورت میں ہوا نا۔ اگر یہ بجسدِ عنصری اوپر گئے ہیں تو خدا کہیں اوپر ہے۔ خدا کے متعلق یہ تصور کہ وہ کہیں اوپر کسی ایک مقام میں بیٹھا ہے، وہ خدا جو یہ کہہ رہا ہے کہ وَهُوَ مَعَكُمْ اَيْنَ مَا كُنْتُمْ (57:4) تم جہاں بھی ہو وہاں میں تمہارے ساتھ ہوں وَنَحْنُ اَقْرَبُ اِلَيْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِيْدِ (50:16) ہم تو انسان کی رگِ جان سے بھی زیادہ قریب ہیں۔ یہ بنیادی چیز خدا کا جو CONCEPT (تصور) قرآن نے دیا ہے یہ اس کے خلاف جاتی ہے اگر خدا کو کسی مقام کے اندر محدود کر کے رکھ دیا جائے تو۔ اور اِلَیَّ کے معنی اگر آپ لیتے ہیں چوتھا آسمان تو اس کے معنی یہ ہو گئے کہ سمت خدا کی ہو گئی نا وہ اِلَیَّ کے معنی؟ یہؑ چوتھے پہ ہیں وہ ساتویں کے اوپر عرش کے اوپر کہہ لیجیے اسے۔ دو ہی جگہ قرآن میں آیا ہے یہاں اِلَیَّ ہے رَّفَعَهُ اللّٰهُ اِلَيْهِ (4:158) وہاں آیا ہے۔ قرآن نے خود نفی کر دی ہے اس چیز کی کہ اس کو کہیں فزیکل چیز نہ سمجھ لینا۔ کیوں کہ اگر یہ فزیکل بلندی آپ لیں گے بجسدِ عنصری جسم کے ساتھ کسی آسمان میں تو اس کے بعد اِلَیَّ جو خدا نے اپنے متعلق کہا ہے خدا کو بھی اس سے اوپر اسی سمت میں کہیں اور کسی ایک مقام پہ ماننا پڑے گا اور یہی غلط ہے۔ برادرانِ عزیز! رَفَعَ کے معنی رفعِ درجات ہیں مقامات کی بلندی۔ رفیع الدرجات تو قرآن نے اپنے آپ کو کہا ہے (40:15)۔ بیس مرتبہ قرآن کے اندر یہ چیز ہے درجات کی رفعت جو ہے۔ اور اگر اس کے معنی ہیں بجسد عنصری کسی کا آسمان کے اوپر کسی جگہ جا کے بیٹھ

جانا تو پہلی تو چیز یہ لیجیے یہ چوتھا آسمان، اور یہ ساتواں آسمان یہ تو اب داستانِ پارینہ ہوچکی ۔ وہ تو آپ کے ہاں جو پرانا تصور تھا یہ پہلا آسمان اس طرح شیشے کا ڈل پھر دونوں میں پانچ سو سال کی مسافت پھر اس کے اوپر ایک پھر اس کے اوپر ایک ۔ پھر اس کے اوپر ایک یہ تصور تھا آپ کے ہاں کا قیاسی ۔ تو اس میں سے تیسرا چوتھا ساتواں تو گنا جاتا تھا ۔ تو یہ آسمان جواب نکلا یہ تو ہوگئی SPACE EMPTY اور اس کے اندر یہ کرے جو ہیں وہ محرک گھوم رہے ہیں کوئی یہاں کوئی وہاں، یہ چوتھا آسمان ہوا کونسا؟ اور مقام کے متعلق تو بات ہی ایک اور ہے ۔ یہاں تو خدا نے پھر اِلَیَّ ہی کہا ہے سورۃ مریم میں حضرتِ ادریسؑ کے متعلق لکھا ہے وَّ رَفَعْنٰهُ مَكَانًا عَلِيًّا (19:57) وہ مکان وہاں لکھا ہوا ہے ۔ اسے ہم نے اٹھایا ایک بلند مقام کی طرف ۔ تو ان کے متعلق مانیے پھر حضرتِ ادریسؑ کے متعلق بھی، وہاں تو مکان بھی لکھ دیا ہے ۔ اس کا ترجمہ ہی پوزیشن ہے بڑی بلند پوزیشن ۔ مقام ہم بھی کہتے ہیں کہ بڑا بلند مقام عطا کردیا خدا نے ۔ اس کے معنی یہ ہیں ۔ انہوں نے کہا تھا کہ صلیب کی موت دے کر تمہیں ذلیل ترین انسان ثابت کردیا جائے گا جو لعنتی ہوتا ہے ۔ خدا نے کہا کہ متوفی طبعی موت مرے گا اور یہ جو کہتے ہیں کہ وہ لعنتی کی زندگی اس کے مقابلے میں وَرَافِعُكَ اِلَيَّ (3:55) ہمارے نزدیک تمہارے مراتب بڑے بلند ہوں گے، تمہارے درجات بڑے بلند ہوں گے ۔ وَ مُطَهِّرُكَ مِنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا (3:55) یہ جو اس قسم کی کفر کی باتیں کر رہے ہیں، سازشیں کر رہے ہیں ۔ مُطَهِّرُ (3:55) کے معنی ہوتا ہے کسی کو کسی جگہ سے دور لے جانا، نجاست کو دور کرنے کو پاکیزگی اور طہارت کہا جاتا ہے وہ اس لیے کہا جاتا ہے ۔ ان سے دور لے جاؤں گا تم ان کے ہاتھ میں ہی نہیں آؤ گے ۔ ویسے بھی، یہ اس قسم کے نجس ان میں تم رہو گے ہی نہیں، ان سے بہت دور چلے جاؤ گے ۔ وَ جَاعِلُ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْكَ فَوْقَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ (3:55) یہ تمہارے مخالفین ٹھیک ہے آج یہ رومنز کے ساتھ ایک سازش کر رہے ہیں اور اس لیے تمہیں مغلوب کر رہے ہیں تمہارے ساتھی بھی اس وقت بظاہر مغلوب نظر آ رہے ہیں ۔ لیکن تم دیکھو گے اس کے بعد کہ تم پر ایمان رکھنے والے ان یہودیوں کے اوپر اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ (3:55) کے معنی عربی زبان میں یعنی دنیا کے آخری انسان تک ۔ ۔ یہ محاورہ ہوتا ہے جیسے ہمارے ہاں بھی کہتے ہیں کہ تم قیامت تک زور لگا کے دیکھ لو، کچھ نہیں بنے گا ۔ ۔ اس کے معنی ہوتا ہے لمبے عرصے کے لیے ۔ ایک لمبے عرصے کے لئے، یہ صورت ہے کہ تیرے ماننے والے، ان کے اوپر غالب آ کر رہیں گے ۔

عیسائیوں کے ہاتھوں یہودیوں کی تباہی کی داستانِ عبرت

عزیزانِ من! زیادہ عرصہ نہیں گذرا تھا کہ یہ ان تمام مقامات میں عیسائیوں کی حکومتیں قائم ہوئیں اور یہی یہودی جو تھے ان

سب کے غلام بن کے رہے۔ حتیٰ کہ سترّ عیسوی میں اتنا بڑا ایلغار کا ایک سیلاب آیا ہے ٹائٹس کے ماتحت کہ یہ ہیکل اور یروشلم 478 آلِ عمران یہودیوں کے یہ تمام مقدس وغیرہ کی اینٹ سے اینٹ بجا کے اس نے رکھ دی ایک بھی یہودی یروشلم میں باقی نہیں رہا۔ اس میں فلسطین میں باقی نہیں رہا تھا' یہاں سے ایک ایک کو نکال دیا۔ اور اس کے بعد یہودی ہمیشہ زمین میں WANERING JEWS کی حیثیت سے رہے' ذلیل اور خوار رہے جیسا قرآن نے کہا تھا۔ اور اگر انہیں کہیں پناہ ملی تو پھر انہی عیسائیوں کے پھینکے ہوئے ٹکڑوں کی وجہ سے پناہ ملی صاحب۔ قرآن اس مقام پہ وہ کہتا ہے وَ جَاعِلُ الَّذِیْنَ اتَّبَعُوْکَ فَوْقَ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا اِلٰی یَوْمِ الْقِیٰمَةِ ج ثُمَّ اِلَیَّ مَرْجِعُکُمْ فَاَحْکُمُ بَیْنَکُمْ فِیْمَا کُنْتُمْ فِیْهِ تَخْتَلِفُوْنَ (3:55) اور اس کے بعد یہ تو اس دنیا میں ہوگا پھر جو ادھر ہماری طرف آنا ہوگا' جن باتوں میں یہ اختلاف کرتے ہیں اس کے متعلق یہ بتا دیا جائے گا کہ حقیقت کیا تھی اور انہوں نے کیا افسانہ طرازیاں کر رکھی تھیں۔ دو ہی آیتیں ہیں اس کے بعد دوسرا ذکر شروع ہو جاتا ہے' وہاں تک ختم کرتا ہوں۔ فَاَمَّا الَّذِیْنَ کَفَرُوْا فَاُعَذِّبُهُمْ عَذَابًا شَدِیْدًا فِی الدُّنْیَا وَ الْاٰخِرَةِ ز وَ مَا لَهُمْ مِّنْ نّٰصِرِیْنَ (3:56) جو تیری مخالفت کرے گا یا ان حقائق سے انکار کرے گا' اسے اس دنیا کے اندر بھی ایک عذابِ الیم دردناک عذاب دیا جائے گا' آخرت میں بھی ان کا کوئی حامی و مددگار نہیں ہوگا۔ وَ اَمَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فَیُوَفِّیْهِمْ اُجُوْرَهُمْ ط وَ اللّٰهُ لَا یُحِبُّ الظّٰلِمِیْنَ (3:57) اور جو ایمان لائے گا ان حقیقتوں کے اوپر' اعمالِ صالح ہوں گے' ان کے کاموں کا اجر پورا پورا دیا جائے گا۔ یہ ظالم جو ہیں ان کو خدا پسند نہیں کرتا۔ اور اس کے بعد کہا رسول اللہ ﷺ سے ذٰلِکَ نَتْلُوْهُ عَلَیْکَ مِنَ الْاٰیٰتِ وَ الذِّکْرِ الْحَکِیْمِ (3:58) یہ باتیں تیری طرف خدا کے احکام' اس کی تاریخ کے یہ حقائق تیری طرف بیان کیے جاتے ہیں تاکہ تو اپنی قوم کو بھی یہ بتا دے کہ اس کے اندر موعظت اور عبرت کے ہزار سامان پوشیدہ ہیں۔ عزیزانِ من! ہم سورۃ آلِ عمران کی آیت 58 تک آ گئے 59 سے ہم اگلے درس میں لیں گے

۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا ط اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ (2:127)

❀...❀...❀

گیارہواں باب: **سورۃ آل عمران** (آیات 59 تا 63)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

قرآنِ حکیم کی تعلیم کے برعکس غلو کی بنا پر حضرت عیسٰیؑ کی عقیدت مندیوں کا نتیجہ اور ہماری حالتِ زار

عزیزانِ من! آج نومبر 1969ء کی 30 تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز سورۂ آلِ عمران کی آیت 59 سے ہوتا ہے:((3:59۔

قرآنِ حکیم کے مطابق ہر کسی رسول کے خلاف کہی ہوئی غلط بات کی تردید کرنا ہمارا فرض ہے

سابقہ آیات میں ان الزامات کی تردید کی گئی تھی جو یہودیوں کی طرف سے حضرتِ مریمؑ اور حضرتِ عیسٰیؑ کے خلاف عائد کیے جاتے تھے۔ جیسا کہ میں نے عرض کیا تھا بظاہر عیسائیوں کا ایک نبیؑ یہودی اس کے خلاف الزامات عائد کرتے ہیں اور قرآن ان کی تردید کرتا ہے۔ اور اس انداز سے تردید کرتا ہے کہ خود عیسائی بھی ایسی تردید نہیں کر سکے تھے۔ اور یہ اسی لیے کہ نبی نہ کوئی عیسائیوں کا ہوتا ہے نہ یہودیوں کا ہوتا ہے' نہ مسلمانوں کا ہوتا ہے۔ یہ انبیائے کرامؑ تو خدا کے ہوتے ہیں' سارے ہی خدا کی طرف سے آئے تھے' اسی کا پیغام لے کر آئے تھے۔ اس لیے قرآن کو ماننے والوں کو تو یہ کہا گیا لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِهٖ(2:285) ہم ان میں سے رسالت کی حیثیت سے کسی ایک میں بھی تفریق نہیں کرتے۔ لہٰذا ہم اگر ان الزامات کی تردید

کرتے ہیں قرآن کی روشنی میں' عیسائیوں کے نبی کی نہیں کرتے' خدا کے ایک رسول کے خلاف خدا کے پیغام کے دشمنوں کی طرف سے جو کچھ کہا جا رہا ہے' اس کی تردید کرتے ہیں۔ اور اس اعتبار سے آپ دیکھیے کہ ہمارے ذمے تو دنیا بھر کے انبیا کی خواہ ان کا ذکر قرآن نے تصریحاً کیا ہے یا نہیں کیا' ان کی مدافعت ہمارے لیے جزوِ ایمان ہوجاتی ہے۔ اتنی بڑی TOLERANCE ہی نہیں BROAD MINDEDNESS ہے' کشادگیٔ ظرف ہے۔ اور اس کا کسی پر احسان نہیں کہ ہم انہیں انہی جیسا بلکہ ان سے بہتر نبی تسلیم کرتے ہیں۔ وہ تو انبیا کے خلاف پوچھو نہیں تورات میں آپ دیکھیے کیا کچھ لکھا ہوا ہوتا ہے' ہمیں اس کی بھی تردید کرنی ہوتی ہے۔ پہلا جزو جو تھا وہ ان الزامات کی تردید میں گذرا۔ اگلا جزو آیا۔

انسانی زندگی کے تحفظ کو الزام تراشی اتنا نقصان نہیں پہنچاتی جتنا غلو اور مبالغہ گوئی پہنچاتی ہے

قرآنِ کریم نے ان لوگوں سے کہا تھا کہ تم اپنے انبیا یا بزرگوں کی شان میں غلو نہ کیا کرو' مبالغہ نہ کیا کرو۔ آپ دیکھیے کہ جس طرح سے کسی کے خلاف جھوٹا الزام اس کی صحیح پوزیشن نہیں رہنے دیتا' اسی طرح سے اس کی پوزیشن کے متعلق مبالغہ جو ہے وہ بھی اس کی صحیح پوزیشن نہیں رہنے دیتا۔ وہ اگر تفریط ہے تو یہ افراط ہے۔ قرآن مبالغے سے منع کرتا ہے۔ اور یہ آپ دیکھیں گے کہ الزامات تو کہیں کہیں عائد ہوتے ہیں' مبالغہ قریباً ہر بزرگ کی شان میں ہوتا ہے۔ اور قرآن مبالغے سے بھی اسی شدت سے منع کرتا ہے جس شدت سے وہ جھوٹے الزامات سے منع کرتا ہے۔ وہ ہر انسان کو اس کے صحیح مقام پر رکھنا چاہتا ہے۔ اور یہی اس کا صحیح شرف ہے کہ اس کو صحیح مقام پر رکھا جائے۔ اور میں سمجھتا ہوں کہ جتنا غلو اور مبالغہ کسی کو مارتا ہے' الزام تو ایسے مارتا ہی نہیں ہے۔ الزامات کی تردید بڑی آسان ہے۔ یہ جو علوِ مرتبت مبالغے کی بنا پر کسی کو عطا کیا جاتا ہے' اس کے خلاف آپ لب کشائی کیجیے' دیکھیے کس طرح سے بھڑوں کے چھتے میں پتھر مارنے کی بات ہوجاتی ہے۔ انبیا کے متعلق جس طرح سے مبالغے سے کام لیا گیا ہے' اس کے متعلق کوئی ایک لفظ کہیے اور ان کو صحیح مقام پہ لایے تو کفر الحاد کے فتوے۔ کہہ دیجیے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بشر تھے پھر دیکھیے ہوتا کیا ہے؟ وہ تو خیر حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا مقام ہے' کسی سائیں لسوڑی شاہ کے متعلق کہہ دیجیے کہ نہیں جی وہ تو ایسے انسان تھے جیسے اور ہوتے ہیں پھر دیکھیے کہ ان کے حلقۂ مریدین جو ہیں کیا کچھ کرتے ہیں آپ کے ساتھ۔ اینٹ اور پتھر کا یہ جو چبوترہ ہوتا ہے' جسے آپ قبر کہتے ہیں' میں نے یہ بھی دیکھا ہے کہ قبر کی طرف پیٹھ کر کے چلنے والا جو ہے وہیں اس کو پکڑ کے ڈھیر کر دیا۔۔ اتنی گستاخی یعنی حضرت صاحب کی شان میں نہیں' ان پتھروں کی شان میں جنہوں نے حضرت صاحب کو دبایا ہوا ہے۔

روم کے ایک گرجے میں حضرت عیسٰیؑ کی تصویر اور عقیدت کی موم بتیوں کا دھواں

یہ کیا چیز ہے؟ کیا عجیب تعلیم ہے قرآن کی جب وہ کہتا ہے ان سے کہ غلو مت کرو۔ جتنی حقیقتیں غلو کے اندر مستور ہوتی ہیں، الزامات میں تو نہیں ہوتیں۔ روم کے سب سے بڑے گرجے میں حضرتِ عیسٰیؑ کی ایک تصویر ہے مائیکلو اینگل کی تصویر کہتے ہیں بہترین تصویر، اس کے نیچے ان کے معتقدین اپنی عقیدت کی موم بتیاں جلاتے ہیں۔ تو ایک عرصے کی موم بتیوں کا جو دھواں ہے، انہوں نے اس تصویر کے اوپر ایک پورا COATING کر رکھا ہے۔ وہ تصویر ان عقیدت کی شمعوں کے دھوئیں کے نیچے دب کے رہ گئی ہے۔ ہر بڑی ہستی کی صحیح تصویر جو ہے، ان کے عقیدت مندوں کی موم بتیوں کے دھوئیں کے نیچے دب کے رہ جاتی ہے۔ اور پھر وہ دھواں اور چیکٹ اتنا متبرک اور مقدس ہو جاتا ہے کہ کوئی اگر اس کو ہٹانے کا، چھیڑنے کا، کریدنے کا ذرا سا بھی قصد کرے تو اس کے ہاتھ کاٹ دیے جاتے ہیں۔

عیسائیوں کی تمام تر تعلیم کا تمام تر تصور حضرت عیسٰیؑ کے بن باپ پیدا ہونے پر ہے

عزیزانِ من! یہ وجہ ہے کہ قرآنِ کریم ہر بڑے انسان کو اس کے صحیح مقام پر رکھتا ہے اور یہی اس کا صحیح احترام ہے۔ الزامات کے دائرے سے آگے بڑھے تو اب وہ دائرہ آیا جہاں غلو نے حضرتِ عیسٰیؑ کو ان کے مقام سے الگ ہٹا دیا تھا۔ اور میں سمجھتا ہوں کہ یہ مقام وہ ہے کہ جہاں آپ احباب سے بھی میں یہ کہوں گا کہ ذرا اعتدال اور توازن کو قائم رکھ کے بات سنیے۔ الزامات کی تردید تو میں نے کی تو اس سے آپ بھی متفق تھے۔ اب یہ جو مقام آ رہا ہے غلو اور مبالغے کا اس میں صدیوں کے غلط معتقدات نے ہمیں بھی اس مقام پر پہنچا دیا ہے کہ غلو کے خلاف ہم بھی کچھ سننا برداشت نہیں کر سکتے۔ یہ جتنی لڑائیاں اور جھگڑے ہوتے ہیں، یہ سب اس وجہ سے ہوتے ہیں کہ ایک گروہ نے اپنے کسی بڑے کے شان میں جو مبالغہ کر رکھا ہوتا ہے، دوسرا گروہ اس مبالغے سے ذرا نیچے اترتا ہے تو اس پہ تنقیص یا تنکیر سمجھی جاتی ہے کہ یہ ان کی شان میں گستاخی کر رہا ہے۔ اور یہ جو معاملہ ہے حضرتِ عیسٰیؑ کا ان کے متعلق تو خاص طور پہ مسلمان بہت ہی ٹچی ہو گیا ہوا ہے حالانکہ اس کی وجہ کوئی نہیں تھی۔ عیسائیوں کے مذہب کی ساری عمارت اسی مبالغے کی بنیادوں پر استوار ہوتی ہے۔ حضرتِ عیسٰیؑ بن باپ کے پیدا ہوئے۔ پوری نوعِ انسانی میں ایک EXCEPTION بہت بڑی چیز ہے۔ وہ زندہ آسمان پہ اٹھائے گئے، ساری نوعِ انسانی میں ایک EXCEPTION۔ بہت بڑی چیز ہے۔

حضرت عیسیٰؑ کے متعلق مسلم دنیا میں پائے جانے والے تصور کی بنیاد اور پھر شدتِ جذبات کی کیفیت

تو عام انسانوں سے جسے اس طرح سے الگ کیا جائے' اب اس کے لیے بن باپ کے پیدا ہوئے ابن اللہ خدا کا بیٹا۔ جس کی پیدائش عام انسانوں جیسی نہیں جس کی موت عام انسانوں جیسی نہیں' وہ سپر ہیومن کیوں نہیں بنے گا؟ وہ عام انسانوں سے بلند مقام کیوں نہیں رکھے گا؟ اسی لیے عیسائیت نے انہیں مقامِ الوہیت عطا کر دیا۔ یہ پہلی بنیاد اگر تسلیم کر لی جائے تو اس کے اوپر جو عمارت استوار ہوتی ہے اس کی آپ تردید ہی نہیں کر سکتے۔ کیا کہیں گے انہیں کس طرح سے آپ انسان کہیں گے؟ وہ زندہ آسمان پہ اٹھانے کے بعد تو پھر جب یہ اعتراض ہوا تو اس کے لیے آپ نے پھر یہ عقیدہ وضع کیا کہ نہیں صاحب! ان کو پھر آسمان سے اتارا جائے گا اور اس کے بعد ان کو پھر موت آئے گی۔ یہ اس اعتراض کا جواب ہے جو آپ کے اوپر وارد ہوتا تھا۔ لیکن یہ جو عقیدہ پہلے آ گیا آپ کے ہاں کہ پیدائش بھی خارقِ عادت ہے' عام انسانوں کی سی نہیں ہے' اس کا تو جواب ہی آپ کے پاس نہیں ہے۔ عیسائیوں کے خلاف اگر آپ اعتراض کوئی کر سکتے تھے تو یہی دو چیزیں تھیں کہ تم نے مبالغہ کیا ہے اپنے نبی کی شان میں تاکہ تم اس کو خدا کو بنا سکو۔ وہ انسان تھے' خدا کے رسولؑ تھے' اسی میں ان کی عظمت تھی' اس کا ان کے پاس جواب نہیں ہو سکتا تھا۔ اور اس کے لیے جیسا کہ آپ کے ہاں ہوا یہ ان کے عقائد آپ کے ہاں کی روایات کے اندر آ گئے۔ آپ کے قرآن کی تفسیریں ان روایات کی رو سے ہونے لگ گئیں اور بعینہٖ یہی عقیدہ جو تھا مسلمانوں کا عقیدہ بن گیا۔ اب عیسائیوں کو ضرورت ہی نہیں رہی کہ حضرتِ عیسیٰؑ کے متعلق اپنے عقائد کو صحیح ثابت کریں' آپ خود انہیں صحیح مانتے ہیں۔ اور اتنی شدت سے صحیح مانتے ہیں کہ آپ کے ہاں یہی عقائد جزوِ ایمان بن گئے ہیں۔ کسی شخص کے متعلق یہ کہا جائے کہ صاحب! یہ کہہ رہا ہے حضرتِ عیسیٰؑ کا اسی طرح باپ تھا تو آپ دیکھتے ہیں کہ طبیعت REVOLT کرتی ہے' اِبا کرتی ہے۔ اور پھر کفر کا فتویٰ وہ تو جھٹ سے عائد ہوتا ہے۔ یا اگر کسی کے متعلق کہیے کہ یہ کہتے ہیں کہ نہیں صاحب! حضرتِ عیسیٰؑ نے وفات پائی تھی تو اس کے خلاف آپ دیکھیے کیسا شور مچ جاتا ہے؟ یہ کیا چیز ہے؟ عیسائی اگر اسے نہیں مانتا کہ وہ باپ سے پیدا ہوئے تھے یا وفات پا گئے تھے' وہ عیسائیت کے دائرے سے خارج ہو جاتا ہے۔ عیسائیت کے لیے تو یہ ایمان کا حصہ ہے بلکہ عین ان کا ایمان ہے۔ کمال یہ ہے کہ مسلمان اگر اس عقیدے کو نہیں مانتا

کہ جو تو وہ اسلام کے دائرے سے خارج ہوجاتا ہے۔ آپ کے ہاں یہ چیز کہاں جزوِ ایمان تھی؟ کہاں تھا یہ لکھا قرآن میں؟ کہ جو یہ چیزیں دو نہیں مانے گا' وہ اسلام کے دائرے سے خارج ہوجائے گا۔ قرآن نے تو صرف ان انبیا کی رسالت پر ایمان لانے کے لیے کہا ہے' اتنا ہی منواتا ہے وہ کہ انہیں آپ خدا کا رسول مانیے۔ یہ کہاں اس نے یہ لکھا ہے کہ ان کے متعلق یہ بھی مانیے کہ بن باپ کے پیدا ہوئے تھے اور آسمان پہ زندہ چلے گئے تھے؟ زیادہ سے زیادہ آپ اس کو ایک مسئلے کی حیثیت دے سکتے ہیں۔ چلیے کسی نے اس طرح سے سمجھ لیا یوں سمجھ لیا' دوسرے نے اس کے خلاف سمجھ لیا' اس کو کہیے کہ تم نے یوں سمجھ لیا۔ لیکن نہیں۔

صدیوں سے ہمارے ہاں حیات و وفاتِ مسیحؑ کے مسئلہ پر مخاصمت کی نوعیت اور مناظرے

جیسا میں نے عرض کیا اس کی حیثیت آپ کے ہاں عقیدے کی' نظریے کی' خیال کی نہیں رہی بلکہ یہ ایمان کا جزو بنا دیا گیا ہے۔ اور نظر آتا ہے کہ اس کے اندر کتنی بڑی عیسائیوں کی ایک گہری سازش تھی کہ آپس میں ہمارے ہاں اس مسئلے پہ سر پھٹول ہو رہی ہے جو ہمارے ہاں مخاصمت جس ایشو پہ ہونی چاہیے تھی۔ یہاں ہزار برس سے آپ کے ہاں وفات و حیاتِ مسیحؑ اتنا اہم مسئلہ ہوگیا ہوا ہے کہ آج کل تو خیر اس قوم کو ایسی افراتفری پڑی ہوئی ہے کہ یہ چیزیں پھر بھی ذرا پیچھے بیک گراؤنڈ میں چلی گئی ہیں ورنہ اس سے پیشتر جب یہ مسائل ان کے ہاں ابھی نہیں آئے تھے' یہ مسائل اتنی اہمیت اختیار کر چکے ہوئے تھے۔ ہم نے اپنے ہاں اپنے بچپن میں بلکہ اس کے بعد کی جوانی کے عالم میں بھی اس قدر مناظرے' اس قدر مباحثے پوچھو نہیں کیا ہوتا تھا؟ یہ چیزیں اس طرح سے انسان کے غیر شعوری طور پر اس کے دل کی گہرائیوں میں اتر جاتی ہیں کہ ان کے خلاف پھر وہ ایک لفظ سننے کے لیے تیار نہیں ہوتا۔ جیسا میں نے عرض کیا ہے' الزامات کی آپ تردید کیجیے ہر شخص خوش ہوگا۔ مبالغے کو آپ ہٹا کے صحیح مقام پہ لانے لگئے' ہر شخص آپ کے گلے پہ ہاتھ ڈال دے گا۔ عزیزانِ من! لہٰذا جہاں معاملہ مبالغے کا آئے' وہاں ذہنی توازن کو برقرار رکھنا بڑا ہی ضروری ہوجاتا ہے۔ اس کا تعلق انسان کے جذبات سے ہوتا ہے' فکر سے نہیں ہوتا۔ اور جہاں جذبات کے مقام آتے ہیں وہاں اقبالؒ کے الفاظ میں کہ

مقامِ ہوش سے آساں گذر گیا اقبالؒ
مقامِ شوق میں کھویا گیا یہ فرزانہ

قرآنی حقائق تو انسانی جذبات کی شدت کو مبالغے کی حدود میں داخل ہونے ہی نہیں دیتے

عزیزانِ من! یہ مقامِ شوق ہوتے ہیں جہاں جذبات آ جاتے ہیں۔ اس لیے یہاں بڑی احتیاط کی ضرورت ہے 478_آلِ عمران مسلمان کے لیےتو احتیاط کہیں مانگ کے لانے کی بات نہیں' قرآن جب اس کے سامنے ہوتو اس کے بعد وہ تو خود آپ کو ایسے احتیاطوں کے CHANNELS ساحلوں کے اندر لے جاتا ہے کہ آپ نہ مبالغے کی طرف جا سکتے ہیں' نہ الزامات کی طرف جا سکتے ہیں۔ لہٰذا جو شخص قرآن پیش کرتا ہے وہ جس طرح سے ان الزامات کو قرآن کی روشنی میں تردید ان کی کرتا چلا جاتا ہے' ان مبالغوں کو بھی اسی طرح سے وہ ہٹا کر اس کو صحیح مقام پہ لاتا ہے' وہ مقام جو قرآن نے عطا کیا ہے۔ کسی کو اس سے اختلاف ہوتو اسے یہیں تک سمجھنا چاہیے کہ اس کا ایک مسئلہ ہے اس کے متعلق وہ کچھ اور سمجھتا ہے' یہ شخص کچھ اور سمجھتا ہے' اس سے زیادہ ان مسائل کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ عزیزانِ من! حضرتِ عیسیٰؑ کو جو بن باپ کے مانتے ہیں' اس سے نہ ان کی رسالت میں عظمت پیدا ہوتی ہے۔ اور جو یہ مانتا ہے کہ نہیں! وہ تو عام حالات میں اسی طرح پیدا ہوئے تھے جیسے دوسرے انسان پیدا ہوتے ہیں' اس سے ان کی رسالت میں کوئی کمی نہیں واقع ہوتی۔ اور ایمان ہم نے ان کی رسالتؑ پہ لانا ہے' ان چیزوں پہ ایمان نہیں لانا۔ یہ دلیل کہ صاحب! خدا اس پہ قادر ہے یا نہیں یہ تو کوئی QUESTION ہی نہیں کر سکتا۔ جو خدا اس پہ قادر ہے کہ اس پوری کائنات کو عدم سے وجود میں لا سکتا ہے NON EXISTENCE سے EXISTENT کر سکتا ہے بغیر کسی مسالے کے بغیر کسی میٹریل کے۔ جہاں تک اس کا تعلق ہے کہ وہ قادر ہے یا نہیں' قدرت کا سوال اس میں کہاں پیدا ہوتا ہے؟ ہر چیز پہ قادر ہے' کر سکتا ہے۔ سوال یہ وہ کہتا یہ ہے کہ ہم کرتے نہیں ہیں۔ کسی کا کر سکنا اور اس کا نہ کرنا' یہ نہ کرنا جو ہے یہ تو خود اس کے اختیار اور اقتدار کی بات کہہ سکتا ہے کہ اتنی قدرت رکھتے ہوئے بھی ہم نہیں کرتے۔ صاحبِ اقتدار ہے۔ میں نے پچھلی دفعہ بھی عرض کیا تھا کہ اس کو تو اس نے خود ایسے حسین انداز میں بات بیان کی ہے بَدِيۡعُ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضِ (6:101) یہاں سے بات شروع کی ہے کہ ہم اس پوری کارگہِ کائنات کو عدم سے وجود میں لائے۔ بہت بڑی قدرت ہے یہ' بہت بڑا اقتدار ہے۔ اور اس کے آگے یہ ہے لیکن یہ سوچو کہ ہمارے بیٹا کیسے ہو سکتا ہے جب کہ میری بیوی نہیں ہے۔ یہ ہے خدا نے جو گویا خود قرآن میں یہ کہا کہ ایک طرف اس کے قادرِ مطلق ہونے کا یہ عالم کہ اتنی عظیم کائنات کو بغیر کسی قانون کے بغیر کسی پہلے مسالے کے وجود میں لے آیا۔ اس کے بعد بیٹا ہو جانا جو ہے یہ کونسی چیز ایسی تھی جو ممکن نہ ہو اس کے لیے؟ وہ کہتا ہے کہ یہ کیسے ہو سکتا ہے جبکہ خدا کی بیوی نہیں ہے (6:101)۔ تو اس نے یہ پھر بتا دیا کہ اس کے بعد ہم نے یہ قانون بنایا ہے کہ انسان کی پیدائش اسی صورت میں ہو سکتی ہے کہ ایک مرد ہو ایک عورت ہو۔ ان میں سے اگر ایک بھی نہیں ہے' خدا کر سکتا ہے لیکن اس نے کہا ہے کہ ہم نہیں کرتے۔ خود دلیل دی ہے اس نے اس

بات کی کہ بیوی کے بغیر' عورت کے بغیر بچہ نہیں پیدا ہوسکتا۔ تو میں نے کہا ہے CONVERSLY مرد کے بغیر بچہ نہیں پیدا ہوسکتا۔ یہ خدا کا قانون ہے اور اس قانون کو وہ توڑتا نہیں ہے۔ وہ خود کہتا ہے کہ کیسے ہوسکتا ہے جب کہ اس کی بیوی نہیں ہے۔ تو دلیل تو یہ خدا کی دی ہوئی ہے اس دلیل کی رو سے اگر یہ مان لیا جائے کہ باپ کے بغیر نہیں ہوسکتا تو خدا کے قادرِ مطلق ہونے میں کوئی فرق نہیں پڑتا ہے۔ جب اس نے خود یہ دلیل دے دی ہے لہٰذا اسے اس طرح سے نہ لیجیے کہ اگر کسی نے اسے یوں مان لیا اور وہ کہے کہ قرآن کی رو سے ایسا مجھے نظر آتا ہے تو اس کے خلاف کفر کے فتوے لگ گئے کہ صاحب! دیکھیے یہ شخص اس چیز کو بھی مانتا ۔عزیزانِ من! یہ چیزیں اجزائے ایمان نہیں ہیں۔

قرآنِ حکیم کی طرف سے حضرت عیسٰیؑ کے متعلق پائے جانے والے عقائد کی تردیدی وضاحت نیز آدمؑ کی پیدائش کا معاملہ

اس تمہید کے بعد میں ادھر آتا ہوں کہ قرآنِ کریم ان الزامات کی تردید کے بعد اب عیسائیوں کی طرف وہ آیا ہے اور ان سے کہا ہے کہ تم حضرتِ عیسٰیؑ کے متعلق یہ عقائد رکھتے ہو۔۔ بن باپ کے پیدا ہوئے پھر اس کے بعد ان کو ابن اللہ بنایا۔ یہ نہیں ہے تو کیا صورت ہے حضرتِ عیسٰیؑ کی؟ اِنَّ مَثَلَ عِیۡسٰی عِنۡدَ اللّٰہِ کَمَثَلِ اٰدَمَ ؕ (3:59) بات ایسی صاف کی۔ لیکن اس کا کیا علاج کہ ہم نے پہلے سے ایک عقیدہ قائم کیا ہوا ہے' وہ عقیدہ اپنے مقام پہ رہے' قرآن کو اس کے مطابق لے آیا جائے۔ عیسٰیؑ کی مثال اللہ کے نزدیک (یہ عام جو ترجمہ ہے) آدم کی مثال ہے۔ پہلے تو آدم کے متعلق ہمارے ہاں عقیدہ وہ آیا جو تورات نے دے رکھا ہوا ہے۔ آدم پہلا ایک فرد تھا۔ میں نے عرض کیا تھا کہ آج یہ بات تو آسانی سے سمجھ میں آجاتی ہے کہ انسان کے ہاں بچہ پیدا ہوتا ہے؟ یہ روزمرہ کی بات ہے ہر شخص جانتا ہے۔ لیکن یہ بات کہ صاحب! پہلا انسانی بچہ کیسے وجود میں آ گیا؟ یہ بڑا مشکل مسئلہ ہے۔ مرد اور عورت کے وجود کے بعد آگے پھر چل پڑنا سلسلے کا یہ بات تو آسان ہوجاتی ہے۔ یہ ابتدا کیسے ہوئی یہ تھا نا مشکل مسئلہ۔ اس مسئلے کا حل اسی صورت میں ہوسکتا تھا کہ پہلے کسی طرح سے ایک مرد کو یا ایک انسان کو یا ایک فرد کو کسی طرح سے وجود میں لے آئیں' اس کو بنا ڈالیں کسی طرح۔ بن جانے کے بعد پھر مسئلہ آسان ہوجاتا تھا نا۔ اسے بنایا۔ مٹی لی اس مٹی کا ایک پتلا بنایا پھر اس مٹی کے پتلے کے اندر روح پھونکی پھر وہ مرد بن گیا۔ اب مرد تو ایک بنا لیا مشکل پھر پیش آئی آگے کہ اب اس کے بعد عورت کی ضرورت تو اس کے لیے پھر ایک مٹی کا پتلا نہیں بنایا۔ ''پتہ نئیں مٹی مک گئی خورے''۔ پھر اسی پتلے کی پسلی کو چیرا اس کے اندر سے وہ ایک بچہ نکالا ''او خیر نال کا کی سی'' کام بن گیا۔ وہ بھی اگر لڑکا ہوتا تو پھر وہ مشکل کی مشکل ہی رہتی۔ عزیزانِ من! تورات کے

بیانات ہیں۔ ذہنِ انسانی اس سے آگے سوچ ہی نہیں سکتا تھا۔ اور ذہنِ انسانی نے یہی سوچا۔ تورات کے انسانی ذہن نے یہ سوال 478 آلِ عمران ادھر آئے تو شیو جی اور پاروَتی ہمارے سامنے آئے بالکل اسی طرح سے۔ یعنی پہلا انسان کسی طرح سے وجود میں لایا جائے تو آگے بات چلے۔ ورنہ یہ مسئلہ سمجھ میں ہی نہیں آتا کہ مرغی پہلے تھی یا انڈہ پہلے تھا۔

چوں نہ بینند حقیقت رہے افسانہ زنند

ذہنِ انسانی بتدریج ارتقائی سفر کی پیداوار ہے

ہم الزام نہیں دیتے، ذہنِ انسان یہی سوچ سکتا تھا۔ ہماری یہ کوئی بڑی کاری گری نہیں ہے کہ ہم نے صحیح بات کو سمجھ لیا۔ اس پانچ چھ ہزار سال کے عرصے میں انسانی علم نے ٹھوکریں کھاتے ہوئے، رسیاں تڑواتے ہوئے، کتنی کاوشیں کرتے ہوئے، کتنی تحقیقات کے بعد ایک مقام پہ پہنچے ہیں جس مقام پہ یہ مسئلہ بھی حل ہوتا ہے۔ ہم اس لیے ADVANTAGEOUS POSITION میں ہیں کہ جب انسانی تحقیق ایک حقیقت تک پہنچتی ہے تو وہ حقیقت وہ ہوتی ہے جو چودہ سو سال پہلے قرآن نے بیان کی ہوئی ہوتی ہے۔ انسانی تخلیق کا مسئلہ آپ کی EVOLUTION کی تھیوری نے حل کر دیا صاحب۔ نظریۂ ارتقا کی رو سے دو اور دو چار کی طرح بات سامنے آ گئی۔ زندگی کی ابتدا غیر جاندار مادہ INORGANIC MATTER جو ہے وہاں سے شروع ہوتی ہے۔ قرآن نے کہا كَمَثَلِ اٰدَمَ ؕ خَلَقَهٗ مِنْ تُرَابٍ (3:59) موضوع آج کا نہیں ہے کہ میں قرآن کی رو سے پورے سلسلۂ ارتقا کی کڑیاں آپ کے سامنے پیش کروں۔ آگے آتا ہے ایک مقام وہاں پہنچ کے میں یہ عرض کروں گا اور اس سے پہلے جہاں سورۃ بقرۃ میں یہ داستانِ آدم و ابلیس آئی تھی، وہاں بھی میں نے اس کو بیان کیا تھا۔ آج اشارتاً بیان کر کے آگے بڑھ جاتا ہوں کہ یہ ارتقا یا EVOLUTION کی تھیوری کے مطابق زندگی کی ابتدا INORGANIC MATTER سے ہوتی ہے جسے قرآن نے تراب کہا ہے۔ اور اس کے بعد یہ کہا ہے کہ وَ جَعَلْنَا مِنَ الْمَآءِ كُلَّ شَيْءٍ حَيٍّ (21:30) پھر اس کے ساتھ جب پانی کا چھینٹا دیا جاتا ہے تو اس میں سے زندگی کی نمود ہو جاتی ہے۔ اسے وہ طینِ لازب کہتا ہے، چپکنے والی مٹی۔ یہی ہے وہ چپکنے والی مٹی، یہ جو ہڑوں کے کنارے یا سمندروں کے کنارے پہ جب سورج کی تمازت اس پہ پڑتی ہے تو وہ سوکھتی ہے۔ اور اس طرح سے سمندر کے اندر جو CELLS ہوتے ہیں وہ مٹی کے اندر مل کے، ذرا سی ان میں حرارت جب ہوتی ہے تو اس کے اندر سے زندگی کے پہلے جرثومے پیدا ہوتے ہیں۔ وہ جرثومہ جو ہوتا ہے اس کے اندر ابھی نر اور مادے کی تمیز نہیں ہوتی، وہ ایک ہی ہوتا ہے اسی کو قرآن نے نفسِ واحدہ کہا ہے۔ پھر وہ جرثومہ ذرا آگے بڑھ کے اگلی منزل میں وہ جوشِ نمو سے (یہ لفظ شاعری کا ہے) وہ خود

آلِ عمران 478 پھٹتا ہے' دوحصوں میں تقسیم ہوجاتا ہے۔اس میں سے ایک حصہ جو ہے وہ نر کا ہوتا ہے' دوسرا حصہ جو ہے وہ مؤنث کا ہوتا ہے' اسے UNILATERAL کہتے ہیں۔ SISTER CELL کہتے ہیں یا DAUGHTER CELL سے اب یہ دو میں ہوجاتا ہے۔قرآن نے جو کہا تھا کہ زندگی کی ابتدا نفسِ واحدہ سے ہوئی اور وہی نفسِ واحدہ جو ہے اس کے بعد اس میں سے نر اور مادہ پیدا ہوئے۔ لیجیے پہلا مسئلہ حل ہوگیا آپ کا۔اس کے بعد میں نے عرض کیا ہے کہ یہ کہ مختلف کڑیاں سلسلے کی طے کرتے ہوئے زندگی پھر اس کے بعد' قرآن بتاتا ہے رینگنے والے پیدا ہوئے' پانی میں تیرنے والے پیدا ہوئے' اڑنے والے پیدا ہوئے' دودھ دینے والے پیدا ہوئے اور اس کے بعد آگے بڑھ کے پھر بشریت کے پیکر کے اندر زندگی آ گئی۔اور یہاں آنے کے بعد پچھلی کڑیوں سے ایک فرق پڑا اور وہ یہ کہ اسے صاحبِ اختیار اور ارادہ بنایا گیا' اس کے اندر ایک ایسی توانائی عطا کردی کہ جو خدا کی شان کی توانائی تھی۔خدا خود نہیں تھا اس کے عالمِ امر کی ایک شے تھی جو انسان کے اندر داخل کردی گئی۔وہ شے کہ جسے ہم انسان کی ذات یا نفس یا PERSONALITY یا قوتِ ارادی کہتے ہیں۔۔ یہ دوسری بات ہوگئی۔قرآن نے یہ بتایا تھا سلسلۂ ارتقا اس کے لیے اس کو پہلے مٹی کا ایک پتلا بنانے کی ضرورت نہیں تھی۔یہ تورات کا بیان تھا' یہ قرآن کا بیان ہے۔اور میں نے جیسا عرض کیا ہے' میں لکھ چکا ہوں اپنی کتابوں کے اندر اس پوری تفصیل سے قرآن کی ساری کڑیاں ایک ایک دے کے۔اور آج تک جہاں یہ EVOLUTION کی تھیوری SCIENTIFIC BASIS پہ جس مقام پہ پہنچی ہے اس کی ہر سٹیج کے مطابق قرآن کی آیت میں نے دی ہے اس میں۔یوں آ رہی ہے کڑی یہ کڑی قرآن کی آیت اسی طریق سے جس طریق سے آج یہ آپ کی EVOLUTION کی تھیوری کی کڑیاں آتی ہیں اوپر سے۔یہ جو یہاں آدم قرآنِ کریم نے کہا ہے یہ وہی لفظ ہے جسے اپنے ہاں ہم آدمی کہتے ہیں۔قرآن میں آدمی نہیں آیا اس کی جگہ لفظ ہی آدم ہے اس کے معنی آدمی ہیں۔آدمی کی تخلیق۔اب یہ جو چیز آپ کے سامنے آجائے تو بات واضح ہوگئی۔عیسیٰؑ: قرآن نے کہا ہے کہ تم خوامخواہ کے لیے اس کو ایک EXCEPTION میں لیے جارہے' ہو خارقِ عادت میں لیے جارہے ہو' اس کی مثال تو ایک عام آدمی کی مثال ہے۔اور آدمی کی تخلیق جو ہے اس کی ابتدا شروع سے یہ کردی یعنی پہلی کڑی اس کی گنا دی خَلَقَهٗ مِنْ تُرَابٍ (3:59) اس کی تو تخلیق کا آغاز مٹی سے ہوا INORGANIC MATTER سے ہوا۔اب یہ چیز کہ یہاں آدم کا لفظ ہے اور میں نے کہا ہے کہ یہ انسان کے متعلق ہے۔یہ چیز کیا قیاس پہ مبنی ہے ہمارے؟ قیاس پہ مبنی نہیں ہے قرآن پہ مبنی ہے۔عزیزانِ من! قرآن اپنے کسی بیان کو واضح کیے بغیر نہیں چھوڑتا۔لیکن اس کے سمجھنے کا ایک طریقہ ہے اور وہ جیسا کہ میں بار بار عرض کرچکا ہوں' تصریفِ آیات ہے۔ایک بات جو

ایک مقام پہ آئی ہے' دوسرے مقامات میں آپ دیکھیے تو اس کی وضاحت آپ کو ملے گی۔ اور کوئی آیت قرآن کی ایسی نہیں رہ جاتی جس کی وضاحت قرآن سے خود نہ ملتی ہو۔ اعجاز ہے اس کتابِ عظیم کا۔ خارج سے کہیں نہ جایے لینے کے لیے یہ چیزیں' نہ اپنے ذہن سے تراشیے۔ محنت کیجیے' کوشش کیجیے اس کے اندر جایے قرآن کے' آپ کو ملے گی وہ چیز اس قرآن کے اندر۔ لیکن اس کے لیے پہلی چیز یہ ہے **لا اله** ذہن کو آپ پاک اور صاف کیجیے ان تمام نظریات' خیالات' اعتقادات سے کہ جو پہلے مروج چلے آ رہے ہیں۔ اور وہ بڑے انسان کی تحت الشعور میں پہنچے ہوئے ہوتے ہیں۔ ان کا نکالنا بڑا مشکل ہے۔ کعبے کے اندر کے بت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بھی اپنی نبوت کے آخری دنوں میں جا کے نکالے تھے۔ یہ بڑے سخت ہوتے ہیں' لمبا عرصہ لگتا ہے۔ لیکن جب تک یہ کعبے کے اندر سے نکلے نہیں تھے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس میں داخل نہیں ہوئے تھے۔ یہ مکان پہلے خالی ہونا چاہیے پھر بستا ہے' لَـآ اِلٰهَ کے بعد اِلَّا اللّٰهُ آتا ہے۔

معتقدات کی گرفت بڑی سخت گیر ہوتی ہے قصۂ آدم کسی فردِ واحد کا قصہ نہیں بلکہ نوعِ انسانی کو خطاب ہے

عزیزانِ من! قرآن کے سمجھنے کا طریقہ یہ ہے کہ ان تمام چیزوں کو نکالیے پہلے۔ اور معتقدات تو انسان کی عزیز ترین متاع ہوتے ہیں' ان کا نکالنا آسان نہیں ہوتا' چیخ اٹھتا ہے آدمی۔ قرآن نے اس کی وضاحت کی ہے کہ یہ کسی آدم نامی فرد کی بات نہیں ہے کہ اس کو خدا نے مٹی سے پیدا کیا۔ یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ (22:5) دیکھیے خطاب ہوتا ہے تمام انسانوں سے۔ اے نوعِ انسانی! اِنْ كُنْتُمْ فِیْ رَیْبٍ مِّنَ الْبَعْثِ (22:5) اگر تم دوبارہ اٹھائے جانے کے بارے کسی شک وشبہ میں ہو۔ پھر سن رکھیے انسانوں سے خطاب ہو رہا ہے یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ (22:5) کہہ کے خطاب ہو رہا ہے۔ اگر تمہیں یہ ہو تو فَاِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ تُرَابٍ (22:5) تو تم اس پہ غور نہیں کرتے کہ ہم نے تو تمہیں ابتدا میں تراب سے پیدا کیا تھا' تمہارا آغاز وہاں سے ہوا تھا۔ تو جو خدا یہ کر سکتا ہے کہ وہ بے جان مادہ جس میں زندگی کی نمود تک نہیں' اس میں سے اس قسم کا انسان پیدا کر دے' اس کے لیے کیا یہ مشکل ہے کہ اس انسان کو موت کے بعد زندہ کر دے۔ میں کہہ یہ رہا تھا یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ فَاِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ تُرَابٍ (22:5) پوری نوعِ انسانی کے متعلق ہے۔ لہٰذا جہاں کہا ہے کہ آدم کو خَلَقَهٗ مِنْ تُرَابٍ (3:59) آدمی کے متعلق ہے انسان کے متعلق ہے۔ پھر آگے کیسے چلا سلسلہ؟ یہاں موجود ہے مِّنْ تُرَابٍ ثُمَّ مِنْ نُّطْفَةٍ ثُمَّ مِنْ عَلَقَةٍ ثُمَّ مِنْ مُّضْغَةٍ مُّخَلَّقَةٍ وَّ غَیْرِ مُخَلَّقَةٍ (22:5) آپ دیکھتے ہیں کڑیاں کیسے گنا رہا

ہے قرآن تراب سے پیدا کرنے کی؟ نطفے کی حالت کے اندر آئے‘ پھر ایک نطفہ کی صورت پیدا ہوئی اس کے اندر‘ متشکل لِّنُبَیِّنَ لَکُمۡ (22:5) پھر اس نے گردشیں دیں مختلف گردشیں دیتے ہوئے وَ نُقِرُّ فِی الۡاَرۡحَامِ مَا نَشَآءُ اِلٰۤی اَجَلٍ مُّسَمًّی (22:5) پھر تمہارا مستقر جو تھا ٹھہرنے کا مقام‘ رحمِ مادر تھا ایک وقتِ مقررہ کے لیے ثُمَّ نُخۡرِجُکُمۡ طِفۡلًا (22:5) پھر بچے کی صورت میں تم باہر آ گئے ثُمَّ لِتَبۡلُغُوۡۤا اَشُدَّکُمۡ (22:5) یہ آ گے پھر جوان ہوئے۔

قرآنِ حکیم نے قصۂ آدم کی پیدائش میں بشر۔ الناس اور آدم کے الفاظ بھی استعمال کیے ہیں

آپ دیکھ رہے ہیں کہ یہ تراب سے سلسلہ شروع کر کے کہاں لا رہا ہے؟ یہ ہے تخلیقِ آدم‘ یہ ہیں آدمی کی پیدائش کے سلسلے۔ تو جہاں وہ کہتا ہے کہ آدم کے متعلق خَلَقَهٗ مِنۡ تُرَابٍ (3:59) تو یہ نہیں ہے کہ وہ الگ کوئی ایک فرد ہے جس کو مٹی کا پتلا بنایا گیا ہے۔ وہ تو سارا قرآن کہتا ہے الناس سے کہ ہم نے تم کو مٹی سے پیدا کیا خَلَقۡنٰکُمۡ (22:5) اور اس کے بعد یہ ساری کڑیاں گنا رہا ہے جن کی رو سے ایک بچہ پیدا ہوتا ہے۔ کہاں لکھا ہے کہ یہاں جو آدم ہم نے کہا ہے وہ ان کڑیوں میں سے نہیں گذرا؟ سارے قرآن میں کہیں نہیں۔ میں نے عرض کیا ہے نا کہ یہی لفظ جو ہمارے ہاں آدمی ہے‘ یہی ہے عربی زبان میں جسے آدم کہتے ہیں۔ یہاں النَّاسُ کہا ہے قرآن نے‘ ذرا اور آگے چلیے بے شمار مقامات میں یہ چیز ہے کہ دو چار نہیں‘ میں تو اختصار کی غرض سے دو چار آیات مثال کے طور پہ پیش کیا کرتا ہوں ورنہ اگر آپ دیکھیں گے تو آپ کو بے شمار مقامات میں یہ بات ملے گی۔ پورے انسانوں سے خطاب ہے وَ مِنۡ اٰیٰتِهٖۤ اَنۡ خَلَقَکُمۡ مِّنۡ تُرَابٍ ثُمَّ اِذَاۤ اَنۡتُمۡ بَشَرٌ تَنۡتَشِرُوۡنَ (30:20) دیکھیے یہاں بَشَرٌ کہا ہے۔ اس کی نشانیوں میں سے یہ بھی ہے‘ اس کے قوانین میں سے یہ بھی ایک چیز ہے‘ تمہیں اس نے تراب سے پیدا کیا اور پھر تم ایک بشر ہو کہ جو چلتے پھرتے ہو۔ تو وہاں النَّاسُ (22:5) کہا ہے یہاں بَشَرٌ (30:20) کہا ہے وہاں آدم کہا ہے تو ظاہر ہے کہ تینوں ایک ہی چیز ہیں۔ اور اس کے بعد جو کہا کہ تم اس کو مان رہے ہو عیسٰیؑ کو کہیں یہ صورت کہ وہ اس طریق سے نہیں پیدا ہوا‘ تم کہہ رہے ہو کہیں خدا کا بیٹا ہے؟ او بابا! اس کی مثال تو عام آدمی کی مثال ہے کہ جس کی تخلیق کا سلسلہ یہ تھا۔ یہاں صرف ایک لفظ سے ابتدا سے بات کی ہے یہاں بھی جو (30:20) آیت میں نے دی ہے اس میں صرف مِّنۡ تُرَابٍ (30:20) کہا ہے اگلی کڑیاں نہیں گنائیں اگلی کڑیاں دوسرے مقامات میں گنائی ہیں۔

خدا کی ذات تو اپنی ہر اسکیم کا آغاز عالم امر میں لفظ کُنۡ فَیَکُوۡنُ سے کرتی ہے

ان کڑیوں کے متعلق یہ چیز کہی کہ عالمِ امر کے اندر ہمارا یہ ایک قانون تھا اور قانون ہمارا یہ ہوا کرتا ہے ثُمَّ قَالَ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ اب ہمارے ہاں كُنْ فَيَكُوْنُ (3:59) بھی جو ہے اس کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ یہ ساری کائنات یہ سلسلۂ تخلیق كُنْ فَيَكُوْنُ (3:59) ہے صاحب! اللہ نے کہا بس اللہ نے کہا كُنْ (3:59) اور وہ ہوگیا۔ حالانکہ قرآن نے یہ بتایا ہے کہ یہ اسکیم ہوتی ہے، وہ اسکیم ہے کہ جس میں كُنْ (3:59) کے معنی ہیں اس کے عالمِ امر کے اندر اس کا ایک ارادہ، اس کا فیصلہ، اس کی مشیت جہاں وہ یہ کہتا ہے کہ يَفْعَلُ مَا يُرِيْدُ (22:14) وہاں ہم کسی سے پوچھتے نہیں ہیں کہ کیسے بنائیں؟ ہم خود فیصلہ کرتے ہیں کہ اس اسکیم کو کیسے چلانا چاہیے۔ اسکیم یہ جو ہوتی ہے خدا کی عالمِ امر سے متعلق، وہ ہوتی ہے كُنْ اور آگے جو آپ دیکھتے ہیں فَيَكُوْنُ (3:59) کیا بات ہے قرآن کی؟ اربابِ غور اس کو APPRECIATE کریں گے فَيَكُوْنُ (3:59) کے اندر مضارع کا صیغہ ہے ماضی کا نہیں ہے کہ ہم نے کہا وہ ہوگیا آہاہا! فَيَكُوْنُ (3:59) پھر وہ ہوتا چلا جاتا ہے۔ آہاہا۔ یہ کوئی PAST ماضی کی بات نہیں ہے۔ وہ تو عالمِ امر کی بات تھی ابتدا کی، وہ تو ہے كُنْ (3:59) کی صورت میں ہم کہتے ہیں ہوجا، وہ اس کڑی سے پہلی کڑی کی بات ہے۔ اور یہ بھی نہیں ہے کہ وہ ایک دفعہ کہیں اس نے كُنْ (3:59) کہہ دیا ہے اور بس اس کے بعد پھر یہ سلسلہ جو ہے، ہوگیا۔ یہ ایک پروسیس ہے، یہ ایک طریق ہے، یہ ایک عملِ جاریہ ہے، اس میں استمرار ہے، دوام ہے، ہیشگی ہے ایسے ہوتا ہے۔ جو اسکیم بھی ہمارے سامنے آتی ہے اس کے لیے ایک فیصلہ ہمارا ہوتا ہے پہلے علمِ خداوندی کا، اسے اس نے كُنْ (3:59) سے کہا کہ مشہود ہوجا۔ اے ہمارے فیصلے تو مشہود ہوجا۔ اور پھر اس کے بعد وہ ہوتا چلا جاتا ہے اور ایسا ہم کرتے چلے جاتے ہیں۔

تخلیق کے سلسلہ میں خدا کے ہاں ارتقائی مراحل کا ایک ایک دن ہمارے ہزار ہزار سال، پچاس پچاس ہزار سال کے برابر ہوتا ہے

یہ تخلیق کا امر جاری ہے۔ يَزِيْدُ فِي الْخَلْقِ مَا يَشَآءُ (35:1) وہ کہتا ہے کہ یہی نہیں ہے کہ ایک دفعہ ہم نے یہ کر دیا ہے وہ بن بنا کے پورے کا پورا COMPLETE FORM کے اندر ساری UNIVERSE آ گئی قطعاً نہیں۔ ہم اپنی تخلیق میں اضافہ کرتے رہتے ہیں۔ اضافے بھی یہ کیسے ہوتے ہیں؟ یہی كُنْ فَيَكُوْنُ (3:59) کے۔ اس نقشے کے مطابق ہماری اسکیم کے مطابق جس شے کو بھی وجود میں آنا ہوتا ہے پھر اس کے متعلق پہلے ایک نقشہ بنتا ہے علمِ الٰہی میں اس کی ایک اسکیم ہوتی ہے۔ اور اسکیم کے متعلق تو قرآنِ کریم نے یہ کہہ دیا ہے کہ اس کی ابتدا ہم اس کے پست ترین سطح سے کرتے ہیں۔ يُدَبِّرُ الْاَمْرَ مِنَ السَّمَآءِ

اِلَى الْاَرْضِ (32:5) وہاں سے ہم تدبیر کرتے ہیں اور پھر ارض سے اس کی ابتدا کرتے ہیں۔ ثُمَّ يَعْرُجُ اِلَيْهِ فِيْ يَوْمٍ كَانَ مِقْدَارُهٗٓ اَلْفَ سَنَةٍ مِّمَّا تَعُدُّوْنَ (32:5) پھر وہ آہستہ آہستہ اپنی انتہا تک چڑھتا چلا جاتا ہے' چڑھتا چلا جاتا ہے ایک ایک دور میں جس کا طول تمہارے حساب وشمار سے ہزار ہزار سال کا ہوتا ہے (70:4)۔ کئی جگہ لکھا ہے پچاس پچاس ہزار سال ہوتا ہے۔ دیکھتے ہیں مِنَ السَّمَآءِ (32:5) امر ہے ۔ كُنْ (3:59) اس کی ابتدا ہوتی ہے پست ترین درجے سے پھر وہ اس کے بعد اپنے ارتقائی منازل طے کرتا ہوا' اوپر چڑھتا چلا جاتا ہے۔ ایک ایک دور پچاس پچاس ہزار سال کا بھی ہوتا ہے یوں جا کے وہ فَيَكُوْنُ (3:59) ہوتا ہے جسے ہم نے کہا ہے كُنْ فَيَكُوْنُ (3:59)۔ عجیب چیز ہے قرآن۔ کیوں نہ ہو؟ یہ اس خدا کا ہے کہ جس نے یہ سارا سلسلہ اس طرح سے جاری کیا۔

سائنس ایجاد تک پہنچ ہی نہیں سکتی' وہ صرف رموز کو Discover کرتی ہے

سائنس کسی چیز کو ایجاد نہیں کرتی وہ ان چیزوں کو DISCOVER کرتی ہے اس کے اوپر جو جہالت کا پردہ پڑا ہوا ہوتا ہے اس پردے کو صرف اٹھاتی ہے۔ ہم کتابِ کائنات کو لکھتے نہیں ہیں ہم کتابِ کائنات کو صرف پڑھتے ہیں' لکھی ہوئی تو یہ خدا کی ہے۔ اس لیے جو یوں پھیلی ہوئی ہے' یہ اس طرح سے لکھا ہوا ہے' دونوں ہی خدا کی ہیں۔ کوئی وہاں مشاہدہ کرتا ہے کوئی یہاں اس کو آ کے دیکھ لیتا ہے۔ عزیزانِ من! دونوں میں اختلاف تو ہو ہی نہیں سکتا۔ یہ ہے وہ چیز کہ آدم کی مثال عام آدمی کی مثال ہے۔ یوں اس کے سلسلۂ تخلیق کا آغاز ہوا اور اس طرح سے وہ مختلف مراحل طے کرتا ہوا پیکرِ بشریت کے اندر آیا۔ کہیں الناس کہا ہے کہیں بشر کہا ہے کہیں آدم کہا ہے۔ اسی پروسیس کے مطابق' کوئی EXCEPTION نہیں اس کے اندر حضرتِ عیسٰیؑ کے متعلق۔ کہتے ہیں کہ صاحب! دیکھیے نا کہا ہے کہ مثال اس کی آدم کی ہے۔ اور آدم وہ تصور ہوا۔ میں کہتا ہوں علاوہ اور باتوں کے اس پہ تو اعتراض اتنا بڑا پڑتا ہے کہ اگر آدم کی مثال ہے عیسٰیؑ کی تو آدم کے متعلق تو آپ کا عقیدہ یہ ہے کہ انؑ کا نہ باپ تھا نہ ماں تھی یہی ہے نا عام عقیدے کے مطابق۔ جس کو آپ مٹی کا پتلا بناتے ہیں' ان کا تو نہ باپ تھا نہ ماں تھی آدم کی۔ تو جب اس کی باپ اور ماں دونوں نہیں تھے اور یہاں اس کی ماں کے متعلق تو آپ مانتے ہیں کہ وہ اس کو تو بار بار لکھتا ہے ابنِ مریم تو یہ تو مثال ہی ناقص ہو گئی۔ خدا کی طرف یہ منسوب کر رہے ہیں کہ وہ ایک مثال پیش کرتا ہے اور مثال اتنی ناقص ہے کہ جس کی مثال پیش کرتا ہے وہ تو پیدا ہوا تھا بن ماں اور باپ دونوں کے اور جس کو پیش کرتے ہیں آپ وہ وہ ہے کہ جس کی ماں کا آپ خود اقرار کرتے ہیں کہ وہ تھی مثال ہی ناقص ہے۔ می نہ سزد خدائے را۔

قرآنِ حکیم کو مَس کرنے سے پہلے ذہنوں کے بُت خانوں سے چھٹکارا حاصل کرنا ہوگا 478 آلِ عمران

بات ہی غلط ہو جاتی ہے اگر آپ اس کو یوں لیں۔ اس نے تو بات صاف کی تھی لیکن وہ جو پہلے اعتقادات ذہنوں کے اندر ہمارے آئے ہوئے ہیں وہ نہیں اس چیز کو اندر جانے دیتے کہ لا الہ جب تک نہ ہوگا الا اللہ آ ہی نہیں سکتا۔ سمجھ میں آ سکتی ہیں یہ باتیں بشرطیکہ ذہن پہلے ان چیزوں سے خارج کیا جائے۔ وہ جو اس نے کہا تھا لَا یَمَسُّهٗۤ اِلَّا الْمُطَهَّرُوْنَ (56:79) جس کا ترجمہ ہم نے اپنے ذہن کی سطح کے مطابق کر لیا کہ قرآن کو چھونے کے لیے پہلے پاک صاف ہونا چاہیے اور وہ نہا کے غسل کر کے وضو کر کے وہاں تک ہم رہے۔ وہ بھی ٹھیک ہے کہ پاک صاف تو ہونا چاہیے۔ بات تو یہاں یہ نہیں کہی گئی کہا تو یہ گیا ہے کہ اس کو ہی انسان مس کر سکتا ہے اس سے کچھ حاصل کر سکتا ہے جو پہلے اپنے قلب و نگاہ کو انسانی خیالات سے پاک اور صاف کر لے۔ قرآن سمجھ میں نہیں آ سکتا اگر اس کے اندر اور بُت بیٹھے ہوئے ہوں۔

بیاں میں نقطۂ توحید آ تو سکتا ہے
تیرے دماغ میں بُت خانہ ہو تو کیا کہیے

عزیزانِ من! دماغ کو بت خانے سے پاک کرنے سے خدا کی کتاب سمجھ میں آتی ہے۔ یہ کہنے کے بعد کہا اَلْحَقُّ مِنْ رَّبِّکَ (3:60) لو حقیقت آ گئی تمہارے خدا کی طرف سے' حق آ گیا تمہارے خدا کی طرف سے۔ فَلَا تَکُنْ مِّنَ الْمُمْتَرِیْنَ (3:60) اے مخاطب! اب تو تمہیں کوئی جھگڑا نہیں کرنا چاہیے اس معاملے کے اندر۔ ہم نے تو بات صاف کر دی اب تو کوئی چیز شک وشبہ کی نہیں رہی لہٰذا جھگڑے کی کوئی بات نہیں رہی۔ نبی اکرم ﷺ سے پھر کہا گیا فَمَنْ حَآجَّکَ فِیْهِ مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَکَ مِنَ الْعِلْمِ فَقُلْ تَعَالَوْا نَدْعُ اَبْنَآءَنَا وَ اَبْنَآءَکُمْ وَ نِسَآءَنَا وَ نِسَآءَکُمْ وَ اَنْفُسَنَا وَ اَنْفُسَکُمْ قف ثُمَّ نَبْتَهِلْ فَنَجْعَلْ لَّعْنَتَ اللّٰهِ عَلَی الْکٰذِبِیْنَ (3:61) جو آیت میں نے پہلے ابھی کہی تھی وہ حضرتِ عیسٰیؑ کی پیدائش کی' یہ اگلی آیت جو ہے اس کے لیے پھر ہمارے دماغ کے اندر ایک چیز پہلے سے آئی ہوئی ہے اور اس کے مفہوم کے متعلق بھی پھر عجیب عجیب پریشانیاں ہمارے ہاں آتی ہیں۔ عام طور پر اس کے متعلق جو ترجمہ کیا جاتا ہے اور سمجھا جاتا ہے اور وہ تمام تفاسیر میں آپ کو ملے گا جو پہلے لکھی گئیں۔ وہ اس لیے کہ روایات میں یہ چیز ہمارے آئی ہوئی ہے۔

ہمارے ہاں لکھی گئی تمام تفاسیر روایات پر مبنی ہیں

ہماری تفاسیر جتنی بھی ہیں، وہ روایات پر مبنی ہیں۔ روایات بھی رسول اللہ ﷺ کی وفات کے قریباً دو اڑھائی سو سال بعد کسی تحریری میٹریل کے بغیر زبانی مدون ہوئیں۔ اور ان روایات کے اوپر ہماری تفاسیر مرتب ہوئیں۔ ظاہر ہے کہ ان کی حیثیت کیا رہ جاتی ہے۔ اس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ اگر پھر اس کے باوجود تیرے ساتھ یہ لوگ جھگڑا کریں بعد اس کے کہ تیرے پاس العلم آ چکا ہے۔ العلم: قیاس آرائی نہیں، الحق، العلم خدا کی طرف سے جو علم ملتا ہے وہ آ چکا ہے۔ تو اس کے باوجود اگر یہ لوگ تجھ سے جھگڑا کرتے رہے، باز نہیں آتے اس کے بعد بھی۔ میں یہ عرض کر رہا ہوں کہ عام طور پہ جو اس کا معنی سمجھا جاتا ہے پہلے، لے آیے۔ تو پھر ان سے تم کہو کہ آؤ! ہم بھی اپنے آدمیوں کو اپنی عورتوں کو بلا لیتے ہیں، خود بھی ساتھ شامل ہو جاتے ہیں۔ تم بھی اس طرح سے اپنے ہاں ان لوگوں کو بلا لو۔ بات کیا ہوئی؟ میں آگے پھر بیان کروں گا کہ کیا سمجھا جاتا ہے۔ روایت میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے پاس نجران کے قبیلے کے عیسائی آئے آپ ﷺ نے ان کو اپنی مسجد میں ٹھہرایا۔ اس کے بعد ان کے ساتھ اسی پیدائشِ حضرت عیسیٰؑ کے متعلق باتیں ہوئیں۔ جو کچھ آپ ﷺ نے ان سے یہ کہا وہ مطمئن نہ ہوئے۔ پہلے تو یہی سوچیے کہ اگر آپ ﷺ نے ان سے یہی کہا ہوتا کہ بھئی! ہم بھی یہی مانتے ہیں کہ وہ بن باپ کے پیدا ہوئے تھے تو جھگڑا کاہے کا رہتا پھر۔ یعنی یہ تو ان کا جو دعویٰ تھا اس کو پہلے ہی مان چکے۔

قرآنِ حکیم کی واضح تعلیم کے بعد روایات کے مطابق نبی اکرم ﷺ کا دوسروں سے مباہلہ کسی صورت بھی حقائق پر مبنی نہیں ہوسکتا

قرآن کہتا ہے اس کے باوجود یہ نہیں مانتے، جھگڑتے چلے جاتے ہیں، باز ہی نہیں آتے۔ بات صاف ان سے ہم نے کہہ دی ہے، پھر بھی جھگڑ رہے ہیں۔ تو اختلاف تھا نا بنیادی ان دونوں میں۔ کیا بات ہے قرآن کی؟ کہ جی وہ پھر بھی جھگڑتے رہے تو پھر کیا ہوا؟ تو آپ ﷺ نے ان سے کہا کہ بھئی! بات یوں صاف نہیں ہوتی آؤ اب آخری حربہ ہے تم اپنے کنبے والوں کو لے آؤ میں اپنے کنبے والوں کو لے آتا ہوں نَبۡتَهِلۡ (3:61) اس کے معنی مباہلہ کر لو جی۔ آیا نا ذہن شریف میں آپ کے کہ بات کہاں پہنچ رہی ہے؟ پھر کیا کرو؟ فَنَجۡعَلۡ لَّعۡنَتَ اللّٰهِ عَلَى الۡكٰذِبِيۡنَ (3:61) اُدھر بیٹھ جاؤ ان کو لے اِدھر میں بیٹھ جاتا ہوں ایک دوسرے پہ لعنتیں بھیجتے ہیں "جیہڑ ا بہتیاں لعنتاں بھیجے جت گیا"۔ اللہ اکبر۔ چہ بے خبر ز مقامِ محمدِ عربی ﷺ ایست۔ ایک پیغمبر کا

آلِ عمران 478 یہ مقام ہے؟ جو یہ کہتا ہے کہ میں اپنے ہر دعوے کو دلیل سے پیش کرتا ہوں **هَاتُوْا بُرْهَانَكُمْ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ** (2:111) کی دلیل یہ ہے کہ دلیل پیش کرو۔ وہ اس مقام پہ آ جائے گا پھر؟ اور پھر اپنے آپ کو لو، اپنے بال بچوں کو ساتھ لو، تم بھی لو میں بھی لیتا ہوں، تو ہم بیٹھ جاتے ہیں ایک دوسرے کے سامنے **فَنَجْعَلْ لَّعْنَتَ اللّٰهِ عَلَى الْكٰذِبِيْنَ** (3:61) اور اس کے بعد کہتے ہیں خدا جھوٹے کے اوپر لعنت برسائے۔ تم بھی کہو میں بھی کہتا ہوں۔ یا اللہ یا اللہ۔ اور اس کے بعد یہ ہے کہ صاحب! وہ اس سے ڈر گئے اور انہوں نے کہا کہ صاحب وہ تو جھوٹے پہ لعنت برساتا ہے، ہمیں یہ چیلنج قبول نہیں کرنا چاہیے۔ یعنی انہوں نے سچا اس کو تسلیم کر لیا اور وہ میدان چھوڑ کے بھاگ گئے۔ اور کہتے ہیں یہ اس طرح سے محمد رسول اللہ ﷺ کے دعوے کی صداقت کا ثبوت مل گیا انہیں۔ وہ عیسائی کے عیسائی رہے اس کے باوجود وہ ایمان نہیں لائے ''تیلی وی کیتا، روکھا وی کھادا''۔

لفظ مباہلہ یا ملاعنہ کا مروجہ مفہوم اور اس کے استعمال کی صورت

عزیزانِ من! سوچیے کہاں ہم پہنچے ہوئے ہیں؟ بھری ہوئی ہیں ہماری کتبِ احادیث ان روایات سے، تفسیر ہو رہی ہے اس کی بنا پر۔ کوئی نہیں سوچتا کہ ہم رسول ﷺ کو کس مقام پہ لا رہے ہیں؟ عزیزانِ من! تصور میں لایے اس نقشے کو کہ رسول اپنے بال بچوں کو لے کے بیٹھا ہوا ہے، سامنے ان کو بٹھایا ہوا ہے۔ وہ لعنتیں بھیج رہے ہیں ایک دوسرے کے اوپر۔ وہ کہتے ہیں اس طرح سے بات جو ہے، صداقت ثابت ہو جاتی ہے، صداقت کے ثبوت کا یہ طریق ہے۔ پہلے دور کا تو ہمیں پتا نہیں ہمارے دور میں یہ جو ٹرم تھی مباہلہ، مباہلہ بھی اس کو کہتے ہیں ملاعنہ بھی اس کو کہتے ہیں۔ مباہلہ کے معنی ایک دوسرے سے مباہلہ کرنا لے لیا اس کا نام مباہلہ رکھا۔ ایک نئی ٹرم انہوں نے قائم کی۔ پھر اس کو ملاعنہ کہا، ایک دوسرے پہ لعنتیں برسانا۔ اور ہمارے دور میں اس کا بڑا چرچا ہوا مرزا قادیانی نے اس چیز کو بات پیش کی۔ جہاں کہیں دلیل نہ ملی جہاں کہیں اس سے عاجز آئے، اس کے بعد کہا مباہلہ کر لو۔ روز آپ سنتے ہوں گے ان حضرات سے کہ مباہلہ کر لو۔ بھئی! کیا کر لو؟ پھر وہ جو ان کا مشہور ہے مباہلہ کہ سچے کی زندگی میں جھوٹا مر جائے، لعنت بھیجو کر وانتظار۔ وہ مشہور ہے وہ چیز۔ عزیزانِ من! مجھے فرقہ وارانہ بحثوں میں الجھنے کی ضرورت نہیں ہوتی اس لیے کہ میں کسی فرقے سے متعلق ہی نہیں ہوں۔ میں ان باتوں کو بیان کرتا ہوں، واقعات کی رو سے واقعات کس طرح سے یہ ہوتے ہیں؟ مشہور ہے کہ انہوں نے مولوی ثنا اللہ کے ساتھ یہ مباہلہ کیا ''سچے کی زندگی میں جھوٹا مر جائے''۔ ثنا اللہ جیتے رہے، یہ فوت ہو گئے۔ پڑ گئی مصیبت۔ لیکن انہوں نے کہا کہ نہیں صاحب! گھبرانے کی ضرورت نہیں ہے ہمیں تفسیر بھی آتی ہے اپنا مدعا کہیے۔ اب لگی تفسیریں ہونے اس کی۔ ایک غلط اینٹ رکھی جائے بنیاد میں ''تا ثریا می رود دیوار کج''۔

مباہلہ کے سلسلہ میں پیش کی جانے والی شہادتیں اور پھر لفظ مباہلہ کا قرآنی اور لغوی مفہوم 478آلِ عمران

عزیزانِ من! یہ سوال ہی نہیں ہے۔ نہ مباہلہ اس کو کہتے ہیں نہ نبی کی شان یہ ہے کہ وہ لعنتیں بھیجے۔ اور ان کے ہاں جب ان سے کہا کہ صاحب! یہ دیکھیے مرزا صاحب نے اپنی کتابوں میں اتنی گالیاں دی ہیں اور وہ بالکل بازاری سطح کی گالیاں دی ہیں' زبان زیب نہیں دیتی ان کا اعادہ کیا جائے۔ تو کہا گیا کہ یہ کیا چیز ہے؟ کہنے لگے انہوں نے دی ہیں تو کیا ہوا' قرآن شریف میں دیکھو لکھا ہوا ہے کہ لعنتیں برساؤ تو لعنت تو سب سے بڑی چیز ہوتی ہے۔ مقامِ نبوت ذہن میں ہی نہیں آتا ان کے۔ اوکم بختو! نبوت تو ہے ہی نبوہ سے جس کے معنی ہی بلندی کے ہیں۔ اپنے سے کچھ تو اونچا کرو اس کو۔ عزیزانِ من! اب آیئے قرآن کی طرف۔ نَبۡتَهِلۡ اس میں لفظ ہے جہاں سے مباہلہ ہے اس کے معنی ہیں یہ کچھ کرنا جو میں نے یہ عرض کیا۔ عربی زبان میں بھل کے معنی ہوتے ہیں کسی سے قطع تعلق کر لینا' کسی کو آزاد چھوڑ دینا' کسی سے یہ کہنا کہ بھئی! اس کے بعد پھر ٹھیک ہے تم جاؤ اپنے راستے کے اوپر' مجھے اپنے راستے کے اوپر جانے دو۔ ان کے ہاں کہتے ہی یہ ہیں جب کسی اونٹنی کو وہ اس طرح چھوڑ دیتے ہیں کہ مہار بھی اس کی نہ ہو۔ عام طور پہ وہ اس کے تھنوں کے اوپر کپڑا باندھ دیتے تھے یا وہ چھکا چڑھا دیتے تھے کہ کوئی دودھ نہ دوہے۔ وہ بھی اتار دیا جائے' مہار بھی اتار دی جائے اور یوں چھوڑ دیا جائے اس کو' اس کو وہ کہتے ابتہال۔ جس شخص سے کوئی تعلق نہ رکھا جائے اس کو وہ کہتے ہیں ابتہال۔ ان کی زبان میں اس طرح سے یہ آج بھی USE کرتے ہیں۔ بھل کے معنی ہوتے ہیں کہ چھوڑ دینا۔ قرآنِ کریم نے یہ بتایا ہے کہ انہیں سمجھاؤ۔ ایک مقام پہ نہیں بیسیوں مقامات میں کہ انہیں سمجھاؤ دلائل سے' براہین سے' ان کے اپنے ہاں سے اسناد پیش کر کے' علم کی بارگاہ سے۔ یہ سب کچھ کرنے کے باوجود اگر یہ پھر بھی اپنی اس کج بحثی کے اوپر اڑے رہیں تو پھر خوامخوہ وقت ضائع کرنے کی ضرورت نہیں پھر ان سے مغز مارنے کی ضرورت نہیں ہے۔ جو دلیل و برہان سے بھی نہیں سمجھتا پھر اس کے بعد وَاِنَّ السَّاعَةَ لَاٰتِيَةٌ (15:85) یہ انقلاب جس کی طرف تو دعوت دیتا ہے یہ تو آ کے رہے گا۔ اب یہ چیز کہ اپنا سارا وقت ان کوڑھ مغزوں کے پیچھے ہی تو ضائع کر دے وَاِذَا خَاطَبَهُمُ الۡجٰهِلُوۡنَ قَالُوۡا سَلٰمًا (25:63) جب ایسوں کے ساتھ واسطہ پڑ جائے جو نہ دلیل سنیں نہ برہان مانیں نہ سند مانیں' پھر کیا کیا جائے؟ لگا رہے ان کے پیچھے؟ کہا نہیں! فَاصۡفَحِ الصَّفۡحَ الۡجَمِيۡلَ (15:85) ان سے کنارہ کش ہو جا ان سے الگ ہو جا' آہاہا! الگ بھی تو حسن کارانہ انداز سے ہو۔ یہ ہے مقام۔

دلیل و براہین کے میدان میں ناکام رہنے والے آخر پر اکثر استہزا پر اتر آتے ہیں

میں نے عرض کیا ہے کہ کئی مقامات میں قرآن نے کہا ہے کہ جب یہ مقام آ جائے کسی کے ساتھ تو پھر زیادہ وقت ان کے ساتھ ضائع نہ کرو تم پھر اپنا کام کرو۔ کہا یہاں تک جب یہ چیز ہو گئی تو وَاصْبِرْ عَلٰی مَا یَقُوْلُوْنَ (73:10) پھر جب کسی کے پاس دلیل برہان نہ رہے تو اس کے بعد پھر وہ اعتراضات' الزامات حتیٰ کہ گالیوں تک اتر آتا ہے' استہزا قرآن کہتا ہے اس پہ آ جاتے ہیں (4:140)۔ یہ کچھ حرکتیں کرنے لگ جاتے ہیں' اس سے بڑا دل دکھتا ہے انسان کا۔ ایک شخص دلیل و برہان سے بات کرے اور دوسرا شخص آپ کا منہ چڑا کے چلا جائے' آپ دیکھتے ہیں کس قدر تنگی گذرتی ہے۔ وَاصْبِرْ عَلٰی مَا یَقُوْلُوْنَ (73:10) اب ان کے پاس کوئی دلیل و برہان نہیں رہتی' اب جو بکواس یہ کر رہے ہیں' اس سے تنگی نہ محسوس کر' دل برداشتہ نہ ہو جا' استقامت سے جما رہو۔ وَاهْجُرْهُمْ هَجْرًا جَمِیْلًا (73:10) ان سے کنارہ کش ہو جا چھوڑ دے۔ یہاں بھی وہ کہا ہے هَجْرًا جَمِیْلًا (73:10) گالی دے کر نہیں' نہایت حسن کارانہ انداز سے۔ عزیزانِ من! جمیل کا لفظ آیا ہے انتہا ہے خوبصورتی کی جس میں۔ رسول تو جس کو گلے لگاتا ہے اس کو بھی جمال کی حیثیت سے لگاتا ہے اور جس کو وہ چھوڑتا ہے کہ جمال کی حیثیت سے چھوڑ۔ لعنت برسائے گا یہ رسول ﷺ ان کے اوپر؟ جس کے متعلق کہا ہے وَمَآ اَرْسَلْنٰکَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِیْنَ (21:107) اور عالمین کہا ہے اس نے تو صرف مؤمنین تو نہیں کہا ہے۔ جو عالمین کے لیے رحمت بن کے آیا ہے وہ ان لوگوں کے اوپر لعنتیں برسانا شروع کرے گا؟ وَاهْجُرْهُمْ هَجْرًا جَمِیْلًا (73:10) مقامِ نبوت ہے۔ وہ گالیاں دے رہے ہیں' استہزا کر رہے ہیں' تکذیب کر رہے ہیں' الزامات عائد کرتے ہیں' بات نہیں سنتے کچھ نہیں! کنارہ کش ہو جا' حسن کارانہ انداز سے کنارہ کش ہو جا۔ چھوڑ دینا یہ وہ مقام ہے۔ آ جایئے اب

قرآنِ حکیم کے ہاں الجھے ہوئے مسائل کا حل اور لفظ نَبْتَهِلْ کا لغوی مفہوم

قرآن کے ان مقامات کے بعد آیئے ادھر۔ اور ابتہال کے معنی میں نے ابھی عرض کر دیا عربی زبان کے کسی مستند لغت میں دیکھیے کہ بهل کے معنی کیا ہوتے ہیں؟ کہا کہ فَمَنْ حَآجَّکَ فِیْهِ مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَکَ مِنَ الْعِلْمِ (3:61) جو اس طرح سے العلم آ جانے کے بعد بھی اس طرح سے کٹ حجتی کرتے چلے جائیں' یوں ہی جھگڑا کرتے چلے جائیں' کوئی بات ہی نہ سنیں' بات ہی نہ مانیں' اس کے بعد کیا کہو؟ کہو یہ کہ بھائی! سیدھی سی بات ہے ہم ہمارے سارے متعلقین جتنے بھی ہیں' تم تمہارے

متعلقین جو تمہارے ساتھی اور ہیں مرد اور عورت جو کچھ بھی ہیں تمہارے اہلِ خاندان' تمہارا اور ہمارا اس کے بعد افتراق ہے 478 آلِ عمران
هٰذَا فِرَاقُ بَيْنِي وَ بَيْنِكَ (18:78) تمہارا اپنا راستہ ہے میرا اپنا راستہ ہے' تم اپنے ہاں اپنے گروہ کو لے لو میں اپنے گروہ کو لیتا ہوں ثُمَّ نَبْتَهِلْ (3:61) اور ایک دوسرے کو آزاد چھوڑ دو۔ کیا بات کہی ہے؟ جھگڑا کا ہے کا اس لیے؟ خوامخواہ کے لیے تم یوں لپٹے چلے جا رہے ہو نہیں بابا! میرے پاس اتنی فرصت نہیں ہے۔ کیا کیا جائے اس کے بعد؟ عزیزانِ من! عجیب مقامات ہیں قرآن کے۔ اور دیکھیے لعنت کے معنی کس طرح واضح ہوتے ہیں۔ پہلے تو یہی لیجیے نَبْتَهِلْ (3:61): آزاد چھوڑ دیجیے' کوئی علاقہ نہ رکھیے ایک دوسرے کے ساتھ۔ اپنے متعلق کہا ہے نَبْتَهِلْ (3:61) آ ؤ ہم چھوڑ دیں ایک دوسرے کو۔ کیا صورت ہوئی؟ قُلْ ((6:135 اور یہاں کہو يٰقَوْمِ اعْمَلُوْا عَلٰى مَكَانَتِكُمْ اِنِّيْ عَامِلٌ((6:135 تم کہتے ہو کہ ہمارا طریق جو ہے یہ ہے کامیابیوں' کامرانیوں کا طریق' صحیح منزل پہ پہنچانے کا۔ میں کہتا ہوں کہ غلط ہے تمہارا طریق' جو پروگرام میں دے رہا ہوں' اس سے انسانیت اپنی منزل پہ پہنچے گی۔ تم اس چیز کو مانتے نہیں۔ جھگڑے کی بات نہیں اعْمَلُوْا عَلٰى مَكَانَتِكُمْ (6:135) بات یہ لفظوں کی نہیں ہے' بات تو وہ ہے کہ جس کو عمل میں لانا ہے۔ اب اگر اس طرح سے دلائل و براہین سے بات نہیں مانتے تم اپنے پروگرام پہ عمل کرو' مجھے آزاد چھوڑ دو کہ میں اپنے پروگرام پہ عمل کروں۔ میں تمہارے اندر INTEREFERE نہیں کروں گا' مداخلت نہیں کروں گا تم میرے پروگرام میں مداخلت نہ کرو۔ اعْمَلُوْا عَلٰى مَكَانَتِكُمْ اِنِّيْ عَامِلٌ (6:135) کیا بات ہے صاحب اس رسول ﷺ کی؟ بات ختم ہو جائے گی PRAGMATIC TEST آ جائے گا' نتائج بتائیں گے کہ کس کی بات سچی تھی۔ دلائل سے اگر تم CONVINCE نہیں ہوتے' نتائج پھر بتائیں گے۔ عزیزانِ من! نتائج بتاتے ہیں کہ قرآن تو ایک نظامِ زندگی ہے اس کو عمل میں لانے کے بعد' اب دیکھیے یہاں کتنی بڑی ایک بات سامنے آ گئی۔

قیامت کا تصور برحق لیکن زندگی خود بھی تو گناہوں کی سزا دیتی ہے

ہمارے ہاں تو جتنا بھی دین کا یا مذہب کا پروگرام عبادات وغیرہ ہیں' یہاں جو کچھ آپ کرتے رہیے' اس کے بعد جو تے کھاتے رہیے' نتائج اس کے قیامت میں جا کے برپا ہوں گے' پیدا ہوں مرتب ہوں گے۔ قیامت برحق ہے لیکن تصور یہ ہے کہ وہیں ہوں گے۔ اس لیے کہ اگر آپ اس کو کہیں لوگوں سے کہہ دیتے کہ یہاں نتائج مرتب ہوں گے تو جس حالت میں ہم گذر رہے ہیں یعنی کون آپ کے قریب آتا اور کون آ رہا ہے آپ کے قریب۔ وہ کہہ رہا ہے رسول ﷺ ان سے کہ جاؤ اپنے پروگرام پہ تم عمل کرو۔ کتنی بڑی آزادی دے رہا ہے وہ ان کو۔ کہیں اس مخالف کو نہ اینٹ مارتا ہے' نہ پتھر مارتا ہے' نہ گالی دیتا ہے' نہ کہیں وہ

گھیراؤ کرتا ہے' نہ پتھراؤ کرتا ہے۔ کہتا ہے کہ تم کام کرو دیکھو پھر اس کے بعد' مجھے کام کرنے دو اپنے مطابق۔ فَسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ (6:135) فَسَوْفَ (6:135) دیکھیے یہاں اور ف جو ہے اس کے اندر اس کے معنی یہ ہیں کہ اس کا نتیجہ نکلے گا فَسَوْفَ (6:135) کے معنی ہیں بڑی جلدی۔ تَعْلَمُوْنَ (6:135) پھر سمجھ جاؤ گے تم بہت جلدی۔ مَنْ تَكُوْنُ لَهٗ عَاقِبَةُ الدَّارِ (6:135) انجامِ کار کس کا خوشگوار ہوتا ہے' فوراً سمجھ میں آ جائے گی بات۔ اور وہاں تم دیکھو گے کہ اِنَّهٗ لَا يُفْلِحُ الظّٰلِمُوْنَ (6:135) آج میں نظری طور پہ تم سے کہتا ہوں کہ ظالم کی کھیتی پنپا نہیں کرتی۔ بات تمہاری سمجھ میں نہیں آتی نا' کوئی بات نہیں' جھگڑنے کی کوئی بات نہیں۔ تم جاؤ یہ ظلم و ناانصافی کے راستے کے اوپر چلے جاؤ' کرو دھاندلیاں کرو' ناانصافیاں کرو' نا مساوات پیدا اس معاشرے کے اندر۔ دلیل سے سمجھا رہا ہوں' نہیں بات سمجھ میں آتی۔ کرو تم اس کے مطابق' میں عدل وانصاف کے مطابق ایک معاشرہ قائم کرتا ہوں' نتائج خود بتا دیں گے کہ مَنْ تَكُوْنُ لَهٗ عَاقِبَةُ الدَّارِ (6:135) انجامِ کار پھر کس کی کھیتی پنپتی ہے یہ بات ظاہر ہو جائے گی۔

لعنت کے معنی تو خوشگواریوں سے محروم ہو جانے کے ہیں

کہا کہ آؤ وقت ضائع نہ کرو کٹ حجتیوں میں' تم اپنے ہاں کام کرو' مجھے یہاں کام کرنے دو یہ ہے **ابتھال** یہ ہے مباہلہ NOT INTERFERE میں بھی INTEREFERE نہیں کرتا۔ کام کرنے دو' اس کے بعد کیا چیز نظر آ جائے گی؟ وہی جو وہاں کہی۔ عربی زبان میں **لعنہ** کے معنی ہوتا ہے خوشگواریوں سے محروم رہ جانا۔ کہا کہ یہ اس طرح سے آزاد چھوڑ دو مجھے بھی' تم بھی آزاد رہو۔ مجھے اپنی جگہ کام کرنے دو' تم اپنی جگہ کام کرتے چلے جاؤ اور اس کے بعد نتائج بتا دیں گے کہ جو جھوٹا ہے وہ زندگی کی خوشگواریوں سے محروم رہ جائے گا۔ بیٹھ کے ایک دوسرے پہ لعنتیں نہیں برسا رہے۔ وہ کہہ یہ رہا ہے کہ نظری بحث ختم ہو گئی دلائل سے تم سمجھنا نہیں چاہتے۔ میں نے بڑی کوشش کی کہ تم سمجھو اس چیز کو' فکری طور پر تم قائل نہیں ہونا چاہتے۔ پھر اس کے بعد کٹ حجتی کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ اتنا وقت کہاں زندگی کے اندر؟ میں تو زندگی کوئی کھیل تھوڑی سمجھتا ہوں یہ تو بڑی اہم چیز ہے اس کا تو ایک ایک لمحہ بڑا قیمتی ہے۔ ٹھیک ہے یوں سمجھ میں نہیں تمہارے بات آتی۔

فرعون کے دربار میں حضرت موسیٰؑ کا اندازِ گفتگو

نبی مناظرے نہیں کرتا' مباحثے نہیں کرتا اس کا تو مقام یہ ہوتا ہے کہ فرعون کے پاس حضرتِ موسیٰؑ آتے ہیں۔ آ کے اپنا

دعویٰ پیش کرتے ہیں' دلائل پیش کرتے ہیں۔ بڑا سمجھدار تھا اس نے دیکھا کہ معاملہ بگڑ رہا ہے' دلائل کی رو سے یہ غالب آ جائے گا اس نے وہ راستہ اختیار کیا جو ہر مذہب پرست راستہ اختیار کرتا ہے۔ کہا کہ موسیٰؑ! یہ بتاؤ یہ بات پھر کرلیں گے یہ بتاؤ کہ یہ اہلِ دربار بیٹھے ہوئے ہیں وزرا امرا سارے مشرکین وہ بھی ان کے باپ دادا بھی اسی طرح سے مشرک۔ کہا کہ یہ بتاؤ کہ یہ جتنے یہ بیٹھے ہوئے ہیں ان کے اسلاف کی کیا حالت ہے جنت میں ہیں یا جہنم میں ہیں؟ یعنی سیدھی سی بات تھی کہ یہ کہے گا کہ جہنم میں ہیں اور جوں ہی اس نے کہا' اس نے کہا لو دیکھو کیا کہہ رہا ہے تمہارے فلاں حضرت صاحب کو اور پٹوا دیا' معاملہ ختم ہوا۔ دیکھا یہ حکمتِ فرعونی۔ اسے پتہ نہیں تھا واسطہ کس سے پڑا ہوا ہے؟ اس نے کہا کہ کیا حالت ہے ان کے اسلاف کی؟ کہا عِلۡمُهَا عِنۡدَ رَبِّىۡ فِىۡ كِتٰبٍ (20:52) ان کا معاملہ میرے خدا کے حساب کتاب کے رجسٹر میں ہے تم بتاؤ بنی اسرائیل کو چھوڑتے ہو یا نہیں؟ یہ ہوتا ہے نبی A PRACTICAL MAN ' مناظروں میں نہیں الجھتا مباحثوں میں نہیں الجھتا۔ اس نے کہہ دیا ان سے کہ میں نے تمہیں سمجھانے کی کوشش کی تم نہیں سمجھتے۔ معاملہ ختم کرو' جاؤ اپنے طور طریقے پہ تم کام کرتے چلے جاؤ' مانتے چلے جاؤ کہ جو شخص مسیح کے کفارے کے اوپر ایمان لائے گا' اس کی نجات ہوجائے گی۔ اور اس عقیدے کے بعد جو امت تیار ہوگی' جو قوم تیار ہوگی پھر اس میں اخلاقی اقدار کو ڈھونڈتے پھرنا۔ جس قوم کا عقیدہ یہ ہوجائے کہ محض کسی کفارے پہ ایمان لانے سے دین اور دنیا سب کی اس میں بخشش ہوجاتی ہے' یہاں دنیا سنور جاتی ہے۔ کفاروں کے عقیدے کی بنا کے اوپر نتائج کی توقع کرنے والی قوم کا جو انجام ہوا کرتا ہے تم خود دیکھ لو گے۔ جاؤ یہ عقائد اپنے ہاں کے پھیلاتے چلے جاؤ اور اس کے بعد یہ کرو۔ اور میں یہ کہوں گا کہ صحیح فارمولے کے مطابق کام کرو اور اس کام کا نتیجہ یہاں بھی ملے گا' آگے جا کے بھی ملے گا۔ میں یہ کرتا ہوں تم وہ کرتے چلے جاؤ' نتائج خود بتا دیں گے کہ کون سچا تھا اس معاملے کے اندر۔ اس پریکٹیکل رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس پیغامبرِ انقلاب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے' اس یکسر عملی انسان نے خدا کی دی ہوئی اس روشنی کے مطابق ایک نظام ایک معاشرہ قائم کیا۔ بازنطینی حکومت رومن کی امپائر اتنی عظیم الشان' ایران کی اتنی عظیم الشان تہذیب کی حامل قوم صدیوں سے جن کے نقارے بج رہے تھے' چار دن کے اندر اندر ان کے پاؤں کے نیچے تھی۔ نتائج نے خود بتا دیا کون جھوٹا ہے اور کون سچا ہے؟ کہا یہ ہے اب طریقہ کام کرنے کا' یہ ہے جو کچھ میں کہتا ہوں۔ اور یہ کچھ کہنے کے بعد کہا اِنَّ هٰذَا لَهُوَ الۡقَصَصُ الۡحَقُّ (3:62) یہ جو ہم نے بیان کی ہے بات' قصے ان کے ہاں بھی ہیں' داستانیں انہوں نے بھی تراشی ہوئی ہیں لیکن جو صحیح واقعہ ہے' جو صحیح بات ہے وہ یہ ہے جو ہم نے بیان کی ہے۔ اور یاد رکھو بات کا ملخص کیا ہے؟ وَ مَا مِنۡ اِلٰهٍ اِلَّا اللّٰهُ (3:62) حضرتِ عیسیٰؑ کو بن باپ پیدا کر کے اس کو الوہیت کے مقام کے اوپر پہنچانا!

ان سے کہہ دو کہ شانِ الوہیت صرف ایک خدا کے لیے سزا وار ہے، کسی اور کے لیے نہیں ہے۔ یہ ہے ملخص ان تمام واقعات کا جو ہم بیان کرتے ہیں۔ وَاِنَّ اللّٰہَ لَھُوَ الۡعَزِیۡزُ الۡحَکِیۡمُ (3:62) اور وہ ہے صاحبِ اقتدار، غلبے کا مالک ہے۔ دھاندلی سے نہیں غلبہ پیدا کرتا، حکمت پہ مبنی ہے RATIONALLY ہر چیز وہ کرتا ہے قانون کے مطابق کرتا ہے SCIENTIFICALLY اس کے یہ پروسیس ہوتے ہیں۔

وحی کی ہر بات حکمت پر مبنی ہوتی ہے وہاں دھاندلی نہیں ہوتی

عزیزانِ من! حکمت میں تمام چیزیں آ جاتی ہیں۔ تمہاری عقیدت مندیاں چاہتی ہیں کوئی عجوبہ ہونا چاہیے اس کے اندر۔ فلاں بزرگ صاحب یہاں آئے، وہ اس علاقے کے اندر تمام ہندو بستے تھے اور مشرک بستے تھے انہوں نے آ کے صاحب دیکھا کہ وہ روز دریا کے اوپر یہاں سے وہاں تک پیدل چل کے پار چلے جایا کرتے تھے، وہاں سے واپس آ جایا کرتے تھے۔ وہ سارا علاقہ مسلمان ہو گیا۔ ''ہن نہ کوئی دریا ٹپن والا ہے نہ کوئی مسلمان ہوندا ہے''۔ کسی دور میں سامنا نہیں یہ کرنے والا ہوتا آپ دیکھیں گے ''حضرت صاحب جناں دا وصال ہو گیا ہوندا اے اوہناں دیاں داستاناں ساریاں ہوندیاں''۔ اس طریقے کے اوپر ایمان لانے والے اور اگر لائے تھے ''آ اسی بیٹھے ہوئے آں نا سارے فیر۔ یعنی ایہو جیا ایمان تے فیر ایہو جئے نتائج پیدا کردہ ہیگا''۔ ساری دنیا کی توہم پرستیاں، ساری دنیا کی جہالت، نکبت، زبوں حالی، ذلت، مسکنت ساری اس قوم کے اوپر مسلط۔ اگر وہ ٹھیک کہتے ہیں اور میں کہتا ہوں ٹھیک ہی کہتے ہیں، اس طرح کے ایمان کا یہی نتیجہ ہو سکتا ہے۔ عزیزانِ من! نبی یہ چیزیں نہیں کرتا، کسی معاملے کے اندر وہ کہیں کوئی چیز سپر نیچرل نہیں لاتا۔ صرف ایک وحی ہے جس کو وہ یہ کہتا ہے کہ یوں ملتی ہے۔ اس کو بھی اس بنا پہ نہیں منواتا کہ تم مانو کہ مجھے یہ ملتی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ یہ ہے جو کچھ ملا ہے مجھے، اسے لے جاؤ اور اس میں جا کے گھر پہ غور و فکر کرو، پرکھ کے دیکھو، عمل میں لا کے دیکھو۔ اگر یہ وہ کچھ کر دیتا ہے جو کچھ یہ کہتا ہے تو کہہ دو کہ یہ سچا ہے۔ سیدھی سی بات ہے کتنی RATIONAL APPROACH ہوتی ہے اس کی۔ الۡعَزِیۡزُ الۡحَکِیۡمُ (3:62) غلبہ یہ پائے گا یہ نظام میرا جو ہے یہ دیا ہوا پروگرام ہمارا لیکن حکمت کی بنا کے اوپر۔

وحی کا طریق عقائد پرستی کی بجائے صرف حقائق پر مبنی ہوتا ہے

حکمت کے اندر جیسا میں نے عرض کیا ہے دلائل و براہان کی ذہنی طور کے اوپر RATIONALISM،

PRACTICALLY SCIENTIFIC طریق جسے آپ کہتے ہیں وہ ساری چیزیں اس میں آ جاتی ہیں۔ کہا دین #78 تو **آلِ عمران** ہے۔ فَاِنْ تَوَلَّوْا ((3:63 اور اگر اس کے بعد بھی پھر یہ روگردانی کرتے ہیں فَاِنَّ اللّٰہَ عَلِیْمٌ ((3:63 خدا خوب جانتا ہے۔ دیکھیے کیا لفظ یہاں آیا ہے بِالْمُفْسِدِیْنَ ((3:63 یہ کرامات اور خارقِ عادت طریقوں کے اوپر یہ کچھ ماننے والے فساد ہے انسانیت کا۔ سب سے پہلے تو ذہن میں فساد شروع ہوجاتا ہے۔ انسانی ذہن دلیل مانگتا ہے، فکر مانگتا ہے، INTELLECT اس کو دیا گیا ہے، اس کو عقل دی گئی ہے، اس کو علم دیا گیا ہے۔ اس کا تقاضا کچھ اور ہوتا ہے تو ہم پرستی کے عقیدے کا تقاضا کچھ اور ہوتا ہے، ذہن میں ایک فساد شروع ہوجاتا ہے۔ اس کا عملی نتیجہ انسان کے معاشرے کے اندر برپا ہوتا ہے۔

ہماری زبوں حالی اور قدم قدم پر ذہنی انتشار کی بنیادی وجہ صرف متضاد خیالی ہے

آپ دیکھ رہے ہیں آپ کی نسل میں آج کل ہو کیا رہا ہے؟ ایک طرف آپ ان کو بی اے کے سٹوڈنٹ کو آئن سٹائن پڑھاتے ہیں۔ وہ خلانوردوں کو دیکھتا ہے اپنی آنکھ کے سامنے۔ اس سے اگلا پیریڈ دینیات کا شروع ہوجاتا ہے، اس میں آپ یہ پڑھاتے ہیں کہ چاند کے دو ٹکڑے ہوگئے تھے، ایک ادھر سے نکل گیا تھا ایک نکل گیا تھا اُدھر سے۔ اس کے ذہن میں فساد شروع ہوجاتا ہے۔ کیا بات ہے قرآن کی؟ ذہنی فساد سرکشی اختیار کر لیتا ہے اور وہ فساد معاشرہ کے اندر آ کے پھر آتش زنی اور آتش گیریوں میں آپ کے سامنے شروع ہوجاتا ہے۔ فساد ذہن سے پہلے شروع ہوتا ہے۔ کہا اس کے بعد پھر بھی اگر یہ پیٹھ پھیر کے چل دیتے ہیں، گریز کی راہیں تراشتے ہیں، نہیں مانتے۔ کوئی بات نہیں ہے۔ اس قسم کے غیر فطرتی عقائد کی رو سے عیسائیت کے اندر فساد شروع ہوجائے گا۔

مذہبی پیشوائیت کی طرف سے اٹھارویں صدی میں فسادات کی آگ کا منظر

آپ کو معلوم ہے کہ سترہویں اٹھارویں صدی عیسوی میں ان کے ہاں سائنس رونما ہوئی، فلسفہ آیا، منطق آئی۔ ان علوم کی روشنی میں جب انہوں نے ان عقائد کو دیکھا تو بات بنتی نہیں تھی تو پھر پورے معاشرے کے اندر ایک فساد شروع ہوا۔ مذہب کی توہم پرستیوں نے اپنے اس اقتدار کی بنا پر، یہ جہلاء کو پیچھے اپنے لگا کر حاصل کر لیتے ہیں، فساد شروع کیا حتیٰ کہ قتل، غارت گری، زندہ جلا دینا، پھانسیوں پہ دے دینا۔ یہ شروع کیا یہ حربہ چل نہیں سکا کیونکہ یہ رسیوں کے سانپ تو چل نہیں سکتے۔ اگلی ہی صدی کے اندر مجبور ہو کے انہیں یہ کرنا پڑا کہ ان سے کہنا پڑا ان پادریوں سے کہ بابا! تم گرجے کی چار دیواری میں تشریف لے جاؤ وہاں جو جی میں آوے بناؤ ان کو۔ باہر کی دنیا جو ہے انسانوں کی، انسانوں کے ہاتھ میں چھوڑ دو۔ اپنے معاملات انہوں نے عقل وفکر کی رو

سے نپٹانے شروع کیے اور ان کو وہاں بھیج دیا مذہب کو یوں رخصت کیا۔ یہ بھی ایک فساد ہے' وحیٔ خداوندی سے محروم کر دیا۔ وحیٔ خداوندی وہاں ہوتی تو جب تھا وہ تو ساری ہی تو ہم پرستی تھی۔

پاکستان کی یہ پوری تاریخ آخر کس چیز کی عکاسی کر رہی ہے' علامہ غلام احمد پرویزؒ کی چیخ و پکار

سوال یہ ہے کہ آپ کے ہاں کیا ہوا ہے؟ یہ جو بیس بائیس سال سے آپ کے ہاں مسلسل فساد چلا آ رہا ہے ذہنی اور فکری فساد' معاشرے کے اندر فساد کیوں ہے یہ چیز؟ اسی دور سے آپ گذر رہے ہیں جس دور سے یورپ سو سال پہلے گذرا تھا۔ مذہب کی تو ہم پرستیاں مجبور کر رہی ہیں آپ کو وہ کچھ ماننے کے لیے جسے آپ کے ذہن کی فکر اور العلم جو ہے وہ صحیح نہیں سمجھتا ہے۔ نوجوان رسی تڑا جاتا ہے۔ یہ بیٹھے ہوئے لعنتیں برسانے لگ جاتے ہیں انہوں نے سمجھا یہ تھا کہ ایسے وقت میں کرنا ہی یہ چاہیے۔ ماتھے پہ جفر کے نقشے بن رہے ہیں' منہ سے جھاگ نکل رہی ہے' آنکھیں سرخ ہو رہی ہیں' کفر کے فتوے لگ رہے ہیں' بیویوں پہ طلاق پڑ رہی ہے' اس کے پیچھے نماز ناجائز' جنازہ نہیں پڑھنا اس کا چلا ہوا ہے یہ قصہ۔ اُدھر کا نوجوان جو ہے اس کے اندر بات یہ فٹ نہیں بیٹھتی۔ ایک کشمکش کے اندر مبتلا ہے آپ کا پورا معاشرہ۔ یہ وہی فساد ہے جو اس سے پیشتر ان قوموں میں گذر چکا ہے۔ عزیزانِ من! اسی لیے بیس برس سے میں چلا رہا ہوں کہ تاریخ سے عبرت پکڑو۔ (1)

اس خاک نشینی کا انجام اور اس سے بچنے کا طریق

پہلا قدم اس کا یہ ہوگا کہ یہاں بھی آپ کے ہاں یہ ثنویت اور DUALISM آ جائے گی۔ کہا جائے گا کہ جاؤ بابا! تم مسجدوں کی چار دیواری کے اندر جاؤ' ہمیں اپنے معاملے خدا کے لیے عقل و فکر کی رو سے طے کرنے دو۔ یہ ثنویت آ جائے گی' دین گیا۔ اور اس ثنویت کا اگلا جو نتیجہ ہوگا وہ یہ کہ خوامخواہ کے لیے ان گرجوں کے اوپر ان پادریوں کے اوپر بجٹ کا کم از کم آدھا حصہ ان کے اوپر خرچ ہو جاتا تھا۔ انہوں نے کہا کہ جب معاشی بدحالی آتی ہے نکبت زبوں حالی' رشیا کے اندر پوری کی پوری قوم فاقوں سے مر رہی تھی اور سب سے بڑی عیاشی جو تھی وہ گرجوں کے اندر ہو رہی تھی۔ آپ کو معلوم ہے کہ سلطنتیں ان پادریوں سے قرضہ لیتی تھیں' سب سے بڑے مہاجن ہوتے ہیں یہ مذہب پرست۔ انہوں نے کہا کہ یہ ایک مصیبت ہے سارے کے سارے کماتے ہیں یہ بیٹھے ہوئے اس طرح سے مہاجن بنے ہوئے کھاتے چلے جاتے ہیں۔ اور انہوں نے کہا کہ یہ چوبِ مسجد' نہ قابلِ سوختن نہ قابلِ

1۔علامہ پرویزؒ کی یہ آہ وفغاں 2010 کی نہیں بلکہ یہ تو 41 سال پیشتر کی ہے۔

فروختن۔ ہمارے کام کس آتا ہے۔انہوں نے کہا لپیٹو اپنا بستر جاؤ وہاں یورپ کے اندر' یہاں تمہارا کوئی کام نہیں ہے۔مذہب ہی ختم ہوگیا رشیا کے اندر۔عزیزانِ من! ڈرتا ہوں یہ جو فساد اس طرح سے برپا ہوتا ہے ذہن میں پھر معاشرے میں' پہلا قدم اس کا وہ ہوگا جو یورپ میں ہوا۔اور اب تو زمانہ برق رفتاری سے جارہا ہے میں سمجھتا ہوں کہ شاید دو STAGES ہوں ہی نہ۔پہلا ہی قدم وہ ہوجائے جو ان ممالک کے اندر ہوا ہے جو روس اور چین کے اندر ہوا ہے۔اِنَّ اللّٰہَ عَلِیۡمٌۢ بِالۡمُفۡسِدِیۡنَ (3:63) خدا جانتا ہے پھر اس کے بعد خوب واقف ہے کہ اس سے کیسا فساد پیدا ہوتا ہے اور اس فساد کا نتیجہ کیا ہوتا ہے؟ علاج اس کا کیا ہے؟ ایک دعوت' عظیم دعوت تَعَالَوۡا اِلٰی کَلِمَۃٍ سَوَآءٍۢ بَیۡنَنَا وَ بَیۡنَکُمۡ (3:64) اور یہ جو چیز ہے اس کی تفسیر آئندہ پہ میں اٹھا رکھتا ہوں کیونکہ آج وقت ہوگیا۔سورۃ آلِ عمران کی آیت 63 تک ہم آ گئے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلۡ مِنَّا ؕ اِنَّکَ اَنۡتَ السَّمِیۡعُ الۡعَلِیۡمُ (2:127)

❀...❀...❀

478آلِ عمران

بارھواں باب: سورۃ آلِ عمران (آیات 64 تا 70)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

عزیزانِ من! آج دسمبر 1969ء کی 14 تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز سورۃ آلِ عمران کی 64 ویں آیت سے ہوتا ہے:((3:64۔

قرآنِ حکیم کی طرف سے پیش کردہ دینِ خداوندی کا منتہا

تمہیداً یہ سمجھ لیجیے کہ ایک چیز ہوتی ہے دین کی غرض و غایت' اس کا مقصود اور منتہا' دین کیوں دیا جاتا ہے؟ اس کا مقصد کیا ہوتا ہے؟ اس کے مقصد کے لیے تفصیل میں جایے تو بڑی لمبی چوڑی داستان ہوگی اور اختصار میں آیے تو دو لفظوں میں بات ختم ہوجائے گی کہ

کس نہ باشد در جہاں محتاجِ کس
نقطۂ شرعِ مبیں اینست و بس

ایک ایسا نظام قائم کرنا جس میں کوئی انسان کسی دوسرے انسان کا محکوم نہ ہو' کوئی کسی دوسرے کا محتاج نہ ہو۔ اور جب کوئی کسی کا نہ محکوم ہوگا نہ محتاج تو یہ جتنی خرابیاں' جتنی برائیاں' نقائص آپ کو معاشرے کے اندر ملتی ہیں' ان میں سے کوئی بھی باقی نہیں رہتی۔ کوئی کسی دوسرے سے اپنی بات نہیں منوا سکتا' ہر ایک کو خدا کے قوانین کے تابع زندگی بسر کرنی ہوگی۔ اس طرح سے حاکم اور محکوم کی

تمیز اٹھ جائے گی۔ ہر شخص آزاد ہوگا' پابند ہوگا صرف خدا کے احکام کا۔ کوئی کسی کا محتاج نہیں ہوگا اور جب کسی کو کسی کی احتیاج ہی 478 آلِ عمران وابستہ نہ ہوگی تو پھر اسے اس کی خاطر کوئی غلط کام کرنے کی ضرورت پیش نہیں آئے گی۔ ایک برادری ہوگی عالمگیر جس میں اخوت اور محبت کے تعلقات ہوں گے۔ ایک مساوات ہوگی جس میں ہر انسان انسان ہونے کی جہت سے واجب التکریم ہوگا۔ اس قسم کا نظام قائم کرنا' یہ دین کی غایت اور مقصود ہوتا ہے۔ اس کے بعد اس مقصد کے حاصل کرنے کے لیے کچھ ذرائع ہوتے ہیں' کچھ وسائل ہوتے ہیں' ایک پروگرام ہوتا ہے۔ یہ دین کی جزئیات یا فروعات کہلاتی ہیں۔

دین اور مذہب کی نظریاتی سوچ اور کیفیت میں مماثلت باقی ہی نہیں رہتی

جب دین کا تصور سامنے ہوتا ہے تو نگاہ اس مقصد پر ہوتی ہے اور جب دین مذہب میں تبدیل ہوجاتا ہے تو مقصد اور غایت نگاہ سے اوجھل ہوجاتی ہے اور یہ جتنی چیزیں جزئیات اور فروعات تھیں' یہ مقصود بالذات بن جاتی ہیں۔ ساری اہمیت انہی چیزوں کے اوپر دی جاتی ہے پھر' ان پہ بڑی شدت سے کاربند ہوا جاتا ہے۔ روز جھگڑے ہوتے ہیں' مناظرے ہوتے ہیں' مباحثے ہوتے ہیں' مباہلے ہوتے ہیں' جنگ وجدل ہوتی ہے۔۔ کن چیزوں کے اوپر؟ اس کے اوپر کہ نماز میں ہاتھ چھاتی پہ باندھے جائیں یا زیرِ ناف' اس چیز کے اوپر کہ آمین بالجہر کہی جائے یا بالخفی۔ یہ جتنے آپ کو مختلف فرقے نظر آتے ہیں آپ دیکھیے گا کہ ان میں یہی فروعات ہیں جن کی شدت کے نام سے فرقہ بندی کی گرہیں مضبوط کی جاتی ہیں اور اسی کا نام اصلِ دین ہوتا ہے۔ ایک آواز آتی ہے پیچھے سے کہ تیری نماز نہیں ہوئی' جی کیا ہوگیا تھا؟ تمہارے پاؤں کے درمیان فاصلہ سوا بالشت کا نہیں تھا۔ وہ سوا بالشت کا فاصلہ ہوگیا الحمدللہ نماز ہوگئی۔ پوچھیے کہ جس کی نہیں ہوئی تھی اس کا کیا بگڑا تھا' جس کی ہوگئی ہے اس کا کیا سنور گیا ہے؟ سوائے اس کے کہ تمہارے معیار کے مطابق اس نے کچھ کرلیا ہے اور اس نے تمہارے معیار کے مطابق کچھ کیا نہیں' نتیجہ تو دونوں کا کچھ نہیں ان کو مل رہا۔ پوچھیے صاحب کہ وہ جو غلط ہوا تھا اس کا نقصان کیا؟ یہ جو ٹھیک تمہارے مطابق ہوا ہے اس کا فائدہ کیا؟ بات تو کچھ بن نہیں پڑی' قیامت کے دن جا کے پتا چلے گا۔ آپ کو کیسے پتا چل گیا جی؟ اسے تو جا کے قیامت میں پتا چلے گا تمہیں قبل از قیامت کیسے پتا چل گیا؟ کہ جی درِمختار میں یہ لکھا ہے۔ چلیے صاحب ختم ہوئی بات! انہیں یوں پتا چل گیا۔ اس کے کسی بڑے نے لکھ دیا' وہ سند ہوگئی۔ سند نہ خدا کی کتاب' نہ دین کا نظام نہ اس کی غایت۔ جب نظام سامنے ہوتا ہے تو اس وقت اگر کوئی بات غلط ہوتی ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ نتیجہ مرتب ہونا تھا' مرتب نہیں ہوا' اس لیے غلط ہے۔ یہ صحیح اس لیے ہے کہ اس سے جو نتیجہ سامنے آنا تھا وہ آ گیا ہے۔ صحیح تشخیص اور صحیح دوائی وہ ہے جس سے مرض کو آرام ہوجائے۔ جہاں کہیں دیکھیں آپ کہ وہ مرض کو

ازالہ نہیں ہو رہا' بخار کم نہیں ہو رہا' آپ کھڑے ہو جائیں گے ڈاکٹر صاحب سے جا کے کہیں گے کہ کہیں کچھ نقص ہے۔ تشخیص میں دیکھے گا کہ کوئی کمی یا خرابی ہے' پھر اس کے بعد نسخے میں دیکھے گا' پھر اس کے بعد یہ دیکھے گا کہ دوائیاں جو لی گئی ہیں وہ صحیح ہیں اس کے مطابق' پھر یہ دیکھے گا کہ صحیح وقت پہ دی گئیں' پرہیز ٹھیک کیا گیا۔ ان تمام چیزوں کو دیکھے گا اگر یہ سب چیزیں ہیں تو لازمی نتیجہ ہوگا کہ بخار کم ہوگا۔ اس علاج کے صحیح ہونے کی دلیل یہ ہے کہ مرض نہیں رہا۔ اور اگر بدستور مرض وہی ہے' بڑھتا چلا جا رہا ہے اور آپ کہتے چلے جا رہے ہیں کہ دوائی بالکل صحیح ہے صاحب! اس کے لیے۔ صاحب! کیسے معلوم ہو کہ تشخیص صحیح ہے؟ دوائی صحیح ہے؟ مرض تو بڑھتا جا رہا ہے۔ وہ کہتے ہیں جلدی مرو' مرنے کے بعد پتا چل جائے گا دوائی صحیح تھی۔ دوائی پیے جا رہے ہیں' فیس دیے جا رہے ہیں' مرض بڑھتا جا رہا ہے

نہ دکھ جائے نہ درماں راس آئے

مگر خبطِ دوا ہے اور میں ہوں

پیے چلے جایئے۔ اور پھر اس شدت سے زور دیا جا رہا ہے شیشی اس انداز کی ہونی چاہیے' کارک ایسا ہونا چاہیے' اس پہ لیبل اس قسم کا لکھا ہوا ہونا چاہیے۔ ایک ایک چیز کے اوپر ذرا سا لیبل ٹیڑھا ہوا تو انہوں نے کہا کہ قبلہ بگڑ گیا تمہارا' کارک شیشے کا کیوں دیا ہے؟ ہمارے ہاں تواتر سے چلا آتا ہے کہ کارک جو ہے کاغذ کا ہونا چاہیے اس کے اوپر۔ تواتر سے چلا آ رہا ہے۔ اسلاف کا طریقہ یہ نہیں ہے کہ شیشے کی شیشی میں دوائی دی جائے۔

نتائج اگر مطلوبہ شکل اختیار نہ کریں تو جذبات کا عمل بے سود ہو جاتا ہے

عزیزانِ من! یہ کیا چیز ہے؟ غرض اور غایت اور نتیجہ سامنے نہیں ہے۔ یہ جو طریق تھا' یہ جو جزئیات تھیں' یہ جو فروعات تھیں' اصل میں وہ دین بن گئیں۔ وہی جو میں ایک مثال دیا کرتا ہوں اور بین مثال ہمارے سامنے اس دور میں جب بھی کوئی چیز نتیجے کے اعتبار سے دیکھنی ہوگی تو آپ کو فوج ہی کی مثال دینی ہوگی۔ کہ اللہ کا شکر ہے کہ ابھی تک وہاں یہ کیفیت ہے کہ صحیح اور غلط نتیجے سے پرکھی جاتی ہے بات۔ جس سپاہی کا نشانہ گولی صحیح اس نشانے پہ جا کے لگتی ہے اسے کہتے ہیں کہ ٹھیک اترا تو۔ اگر وہ ادھر اُدھر ہو جاتی ہے تو اسے کہا جاتا ہے کہ تمہارا نشانہ خطا ہو گیا۔ ایک محسوس شے ہے سامنے جس پہ نشانہ لینا ہے اس نے۔ اور باقی جتنی چیزیں ہیں اس سپاہی کی اس فوج کے اندر کی ڈسپلن کی جزئیات ہیں۔ جیسا میں کہا کرتا ہوں کہ اپنے نظام کے اندر جزئیات بھی بڑی اہمیت رکھتی ہیں۔ یہ کہ اس سپاہی کے بوٹ کے تسمے صحیح طریق پہ بند ہونے چاہئیں' یہ بھی اپنی جگہ ایک اہمیت رکھتی ہے وہاں

۔اس کے پاؤں میں فاصلہ کتنا ہونا چاہیے جب پاؤں اٹھائے تو دونوں پاؤں کے درمیان کتنا فاصلہ ہونا چاہیے ۔ SLOW MARCH میں کیا ہونا چاہیے؟ LONG MARCH میں کیا ہونا چاہیے؟ ہالٹ میں پاؤں کس طرح سے زمین پہ اس کی آواز آنی چاہیے؟ یہ چیزیں ویسے دیکھی جائیں اگر اس پروگرام میں سے نکال کے کچھ اہمیت نہیں رکھتیں۔اس پروگرام کے اندر یہ ایک میں سے ایک ایک آئٹم اپنی اہمیت رکھتی ہے۔لیکن اگر اس سپاہی کے یہ سب کچھ ٹھیک ہوں اور گولی نشانے پہ جا کے نہ لگے،ان چیزوں پہ تو اس کو کیا نمبر ملیں گے۔اور اگر نہ مملکت رہے،نہ فوج رہے،نہ پاس بندوق رہے،وردی رہے کسی طرح سے۔وہ تو جب گھر میں آجاتا ہے سپاہی وردی پہن کے آگیا،وہ رہی اس کے پاس وردی۔اب صبح کے وقت وہ اٹھا جیسے وہاں سے اٹھا کرتا تھا بگل کے وقت میں۔صبح اٹھا وردی پہنی بٹن ٹھیک لگائے بوٹ پہنے تسمے بھی ٹھیک باندھے،بندوق نہیں ہے تو نہ سہی ڈنڈا ہی ہاتھ میں لیا اور اس نے گلی میں لیفٹ رائٹ لیفٹ رائٹ اسی طرح سے وہ کرتا ہوا چلا گیا۔روز صبح اسی طرح سے کیا روز شام اسی طرح سے کیا،مملکت فتح ہو جائے گی پھر؟ اسے تسکین ہوئی۔کس بات کی؟ کہ ٹھیک اسی طرح سے وہاں کیا کرتا تھا ٹھیک اسی طرح سے ہر فوجی سپاہی کیا کرتا ہے۔ٹھیک تو اسی طرح سے کیا کرتا ہے،کاہے کے لیے کیا کرتا ہے،یہ بات ذہنوں سے رخصت ہو گئی۔ کیوں ہم ایسا کیا کرتے تھے؟ کیوں سپاہی کے لیے ضروری تھا کہ ان جزئیات کی پابندی شدت سے کرے؟ اس لیے کہ اس ڈسپلن کا ایک نتیجہ تھا کہ گولی اس کی نشانے پہ جا کے لگے۔ایک حکم کے اوپر اٹھے،ایک حکم کے اوپر جھکے،میدانِ جنگ میں جائے،وہاں جانے کے بعد یہ کچھ دکھائے کہ میں نے جو بیس برس تک یہ ٹریننگ حاصل کی تھی،اس کا نتیجہ آج یہ ہے کہ دشمن ادھر کا رخ نہیں کر سکتا،یہ غایت ہے یہ غرض ہے۔وہ جزئیات ہے وہ وسائل ہیں وہ ذرائع ہیں۔دین جب مذہب میں تبدیل ہو جاتا ہے تو اصل اور مقصد نگاہوں سے اوجھل ہو جاتا ہے اس کے ذرائع اور وسائل کی جزئیات اصلِ دین بن جاتی ہیں،اصلِ مذہب بن جاتی ہیں۔اور پھر اسی کے اوپر پوری قوم اور قوم صدیوں تک اسی جنگ وجدل میں مصروف رہتی ہے کہ تسمے جو تھے وہ اوپر سے نیچے کو باندھنے چاہئیں یا نیچے سے اوپر کو باندھنے چاہئیں۔

قرآنِ حکیم کی پیش کردہ تعلیم کے مطابق دنیا میں سب سے خسارے میں وہ لوگ ہیں جن کے اعمال رائیگاں جائیں

قومیں جب اس قسم کی فروعات کو اس قدر زیادہ اہمیت دے کے اصل اور غایت کو نگاہوں سے اوجھل کر دیتی ہیں تو قرآن کہتا

ہے اُولٰٓئِکَ حَبِطَتْ اَعْمَالُھُمْ (3:22)۔ایک تو وہ ہیں کہ جو کچھ کرتے نہیں ہیں۔ایک یہ ہیں کہ یہ سب کچھ کرتے ہیں 478 آلِ عمران
اٹھ کے وہ پریڈ شروع کر دیتا ہے گلی کے اندر۔وقت بھی اس کا صرف ہوتا ہے' توانائی بھی اس میں صرف ہوتی ہے' یہ سب کچھ کرتا ہے۔لیکن نتیجہ اس کا کیا؟ زیادہ سے زیادہ ذاتی تسکین۔عزیزانِ من! ذاتی تسکین تو آپ کو مسجد میں ہو جاتی ہے۔ ہندو کو مندر میں ہو جاتی ہے۔وہ بت کے سامنے جھک کے تو اپنی تسکین تو وہ بھی حاصل کر لیتا ہے۔یہ تسکین نہیں ہوتا' اسے فریبِ نفس کہتے ہیں۔ہر شخص کو اپنی اپنی جگہ ہو جاتا ہے۔اور یہی وہ مقام ہے جہاں پہنچ کے پھر کہا جاتا ہے کہ رام بھی وہی رحیم بھی

گنگا ایک گھاٹ بہتیرے
کہت کبیر عقل کے پھیرے

پھر وہ عقل کے پھیرے رہ جاتے ہیں نا۔اس لیے کہ رام سے بھی اپنے دل کی تسکین مقصود ہے' رحیم سے اپنے ہی نفس کا فریب مقصود ہے۔نتیجہ باہر تو نہ اس سے مطلب ہے برآمد ہونے کا' نہ اس سے کچھ مقصد ہے۔لیکن اگر نتیجے سے آپ نے پہچاننا ہے تو پھر تو سنکھیا اور مصری کی ڈلی میں بڑا فرق ہوتا ہے۔لیکن اگر آپ نے رنگ ہی دیکھنا ہے' پسا ہوا ہی دیکھنا ہے' پڑیا ہی دیکھنی ہے پھر دونوں ایک ہی قسم کی چیزیں ہوتی ہیں۔

مسلمانوں کے ہاں نماز و روزہ و قربانی و حج کی ادائیگی کی نوعیت اور نتیجتاً اس کا ماحصل

جب دین کی اصل و غایت نگاہوں سے اوجھل ہو جاتی ہے تو باقی سب فریبِ نفس رہ جاتا ہے۔اس کا نام اطمینان و سکون کہہ لیجیے جس کی انتہائی شدت کی شکل آپ کے ہاں تصوف میں مل جاتی ہے۔شرائع کی بھی صرف اس کے جو مظاہر ہوتے ہیں اس کی پابندیاں باقی رہ جاتی ہیں۔

نماز و روزہ و قربانی و حج
یہ سب باقی ہیں تو باقی نہیں ہے

جہاں تک مذہب پرستی کا تعلق ہے اب بھی بڑے فخر سے خوشی سے اعلان کیا جاتا ہے کہ الحمدللہ! پاکستان میں جس قسم کا ابھی تک اسلام ہے کہیں اور دکھائی نہیں دیا اور ویسے دنیا میں مسلمانوں جیسی مذہب پرست قوم ابھی دنیا میں اور کوئی نہیں ہے۔اور اگلا فقرہ بھی ساتھ دہرایے کہ دنیا میں اس وقت اس سے زیادہ ذلیل قوم بھی کوئی نہیں ہے۔یہ کیا ہو گیا؟ اس میں کوئی شبہ نہیں ہے کہ مذہب کے نام پہ جس قدر مشقت اور قربانیاں یہ قوم آج بھی کرتی ہے' اس کی مثال نہیں ملے گی۔یہی رمضان کے مہینے کو دیکھیے تو سہی یہ تو پھر

سردیوں کا رمضان ہے' مئی اور جون کے مہینے کا رمضان سولہ اٹھارہ گھنٹے کا روزہ' اتنا درجہ حرارت' دوتین گھنٹے سارے رات کے سونے کے لیے۔ ایک دن نہیں دو دن نہیں مسلسل متواتر پورا ایک مہینہ اس طرح سے۔ عزیزانِ من! سوچیے کچھ کم مشقت طلب ہے یہ چیز؟ یہ سارا کچھ آپ کے ہاں ہوتا ہے۔ پوچھیے کہ نتیجہ کیا ہے؟ یہی ایک مہینہ اگر آپ کے ہاں کا یہ صحیح معنوں میں عسکری ٹریننگ کا یہ گذرتا پھر دیکھتے کہ یہ قوم کس طرح مجاہدین کا ایک لشکر بن جاتی۔ لیکن یہاں پورا مہینہ اس طرح سے گذارنے کے بعد جو عید آتی ہے تو عید کے دن وہاں گڑگڑا کر دعائیں صرف مانگتے ہیں۔ اور سنتے چلے آرہے ہیں وہ دعائیں صاحب آپ ہزار برس سے یا اللہ دشمن کا بیڑہ غرق کیجیو اس کو تباہ کیجیو اور ان کی جمعیتوں میں انتشار پیدا کیجیو۔ یہ سارا کچھ ہر سال ایک مہینہ اتنی بڑی مشقت کا گذارنے کے بعد گڑگڑا کر صرف دعائیں مانگی جاتی ہیں۔ دعائیں آپ مانگے چلے جاتے ہیں اور ہر سال پہلے سے حالت بدتر ہوتی چلی جاتی ہے۔ یہ کیا ہے؟ یہ اتنا التزام' اتنی پابندی' اتنی مشقت کس چیز کے اوپر ہے؟ دین کی جزئیات جنہوں نے مذہب کی صورت اختیار کر لی' غرض اور غایت نگاہوں سے اوجھل ہوگئی' عمل کو نتیجے سے نہیں پرکھا گیا' وہ بجائے خویش ایک مقصد بن کے رہ گیا۔

اقبالؒ کے الفاظ میں مسلمانوں کو مذہبی طور پر الجھائے رکھنے کی شیطانی چال کی وضاحت

اس مقام پہ جب قومیں پہنچ جاتی ہیں تو سارا زور فروعات کے اوپر رہ جاتا ہے۔ پھر وہاں یہ صورت ہوجاتی ہے' جھگڑے سارے اس بات پہ ہوتے ہیں۔ وہ جو اقبالؒ نے ''ابلیس کی مجلسِ شوریٰ'' میں کہا ہے ابلیس کی زبان سے۔ جب اس نے کہا ہے کہ مجھے خطرہ نظر آتا ہے اس امت سے کہ یہ اگر بیدار ہوگئی تو پھر ابلیسیت دنیا میں باقی نہیں رہے گی۔ تو اس کے مشیروں نے پوچھا کہ کہیے کہ اس کے لیے پروگرام کیا ہے؟ اس نے کہا پروگرام کچھ مشکل نہیں ہے۔ کوشش یہ کرو کہ تم اس امت کو الجھائے رکھو اس قسم کے مسائل میں کہ

ابنِ مریم گیا یا زندۂ جاوید ہے
ہے صفاتِ ذاتِ حق' حق سے جدا یا عینِ ذات
اور آنے والے سے مسیحِ ناصری مقصود ہے
یا مجدد جس میں ہوں فرزندِ مریم کے صفات
اور ہیں کلام اللہ کے الفاظ حادث یا قدیم

امتِ مرحوم کی ہے کس عقیدے میں نجات

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دربار میں یہودی اور نصاریٰ کی حاضری کا مقصد اور پھر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی راہنمائی

ان مسائل میں ان کو الجھا دیجئے' کام بن گیا۔عزیزانِ من! ان مسائل میں یہ آپ کی امت ہزار برس سے الجھی چلی آ رہی ہے۔دین کی غرض و غایت نگاہوں سے اوجھل ہوگئی۔یہ وہ مقام تھا جس میں اہلِ کتاب تھے' نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ظہور کے وقت الجھے ہوئے تھے انہی مسائل کے اندر یہودی بھی' نصاریٰ بھی۔وہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس آتے تھے تو یہ نہیں کہ دین کی غایت انسانیت کے مصائب جو ہیں ان کے متعلق کوئی گفتگو کریں' وہ گفتگو اس کے اوپر کرتے تھے الوہیت مسیح یا عزیر ابن اللہ کی الوہیت کا معاملہ یا صلیب کا مسئلہ یا کفارے کا مسئلہ' پیدائشِ مسیحؑ' وفاتِ مسیحؑ۔یہ تھے وہ مسائل جن کی اہمیت تھی۔سابقہ آیات جو ہمارے سامنے آئی ہیں' انہیں مسائل پہ مشتمل تھیں۔یہ کچھ تھا۔دیکھیے قرآنِ کریم کس مقام پہ لے آتا ہے؟ ان سے کہا گیا کہ تم ان دین کی فروعات کو لے کے آجاتے ہو' جزئیات کو لے کے آجاتے ہو' انہیں رکھو ایک طرف۔قُلْ يَآهْلَ الْكِتٰبِ تَعَالَوْا اِلٰى كَلِمَةٍ سَوَآءٍۢ بَيْنَنَا وَ بَيْنَكُمْ (3:64) ان جزئیات میں جو اختلافات ہیں ان کو بالائے طاق رکھو' کچھ باتیں ایسی بھی تو ہیں کہ جن کا تم بھی دعویٰ کرتے ہو' ہم بھی وہی کچھ کہتے ہیں۔تو آؤ وہ جو COMMON FACTOR ہیں تمہارے اور ہمارے درمیان' وہ جو اقدارِ مشترکہ ہیں' ان میں تو کوئی اختلاف نہیں ہے' ان میں تو کوئی نزاع نہیں ہے' ان میں تو کوئی جھگڑا نہیں ہے۔آؤ ان چیزوں کے اوپر ہم آجائیں۔یہاں تو تم میں اور ہم میں تعاون ہوگا یہاں تو اتحاد کی صورت نکل آئے گی۔کتنی عجیب چیز ہے؟

مسلمانوں کے مابین جذبات پر اختلافات کی نوعیت اور ایک خطرناک گھاٹی کی نشاندہی

مسلمانوں کے موجودہ فرقوں میں لیجئے' ہر منبر سے یہ آواز نکلے گی لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم خدا کی توحید حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رسالت پورا اقرار ہے اس کا۔قرآنِ کریم سے ابتدا' خدا کی کتاب پہ ایمان ہے' خدا پہ ایمان' اس کی وحدانیت پہ ایمان' اس کے رسول پر ایمان' اس کی کتاب پر ایمان' آخرت پر ایمان' ہر فرقے میں یہ مشترک اقدار ہیں۔یہ تھی بنیاد اور اصل دین کی۔یہ اتنی چیزیں مشترک ہونے کے باوجود آپ دیکھتے ہیں کہ یہ اس قدر اختلافات اور اس قدر تفرقے کن باتوں کے اوپر؟ جزئیات کے اوپر' سارا وقت ان جزئیات کی اہمیت کے متعلق آپ کا گذر جاتا ہے۔کوئی نہیں کہتا کہ بابا! ان کو الگ رکھ دو جو اقدارِ مشترک

ہیں ان کے اوپر تو آ جاؤ۔ جو دعوت اسلام نے یا رسول اللہ ﷺ نے اہلِ کتاب کو دی تھی کہ تَعَالَوْا اِلٰی كَلِمَةٍ سَوَآءٍۭ بَیْنَنَا وَ بَیْنَكُمْ غیر مسلموں کو یہ دعوت دی حضور ﷺ نے' آج مسلمانوں کے فرقوں کے اجارہ دار جو ہیں وہ آپس میں اس اقدارِ مشترک کے اوپر کبھی دعوت نہیں دیتے ایک دوسرے کو کہ بابا! یہ فرعی مسائل' اختلافی چیزیں' یہ جھگڑے والی باتیں جو ہیں ان کو چھوڑ دو۔ آؤ کچھ تو تم میں اور ہم میں مشترک ہے۔ اور کچھ کیوں مشترک ہے دعوے کے اعتبار سے تو یہ بنیادی چیزیں ہر ایک میں مشترک ہیں' ہر فرقہ اس چیز کا اقرار کرتا ہے کہ ہمارا ایمان ہے خدائے واحد پر۔ میں نے عرض کیا ہے کہ کوئی فرقہ بھی اس سے انکار نہیں کرے گا کہ لَآ اِلٰـهَ اِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ۔ لیکن آپ دیکھیے کہ جو بات نبی اکرم ﷺ غیر مسلموں سے کہتے ہیں' یہ مسلمانوں کے فرقے ایک دوسرے سے وہ بات نہیں کہتے۔ کیا بات کہی تھی؟ کہا کہ آؤ! تم بھی یہ دعویٰ کرتے ہو ہم بھی یہ دعویٰ کرتے ہیں ایک قدرِ مشترک ہے تم میں اور ہم میں' آؤ اس کے اوپر آ جاؤ۔ اور وہ کیا ہے؟ اَلَّا نَعْبُدَ اِلَّا اللّٰهَ (3:64) خدا کے علاوہ کسی اور کو حاکم تصور نہ کیا جائے۔ دیکھیے دین کی غایت اور غرض آ رہی ہے کہ ان فروعی اعتقادی مسائل کو چھوڑ؛ ان جزئیات میں مت الجھو؛ دین کی غایت کی طرف آؤ۔ تم بھی تو کہتے ہو۔ اب فرق یہ آ جائے گا کہ مذہب کے اندر اس کو کہیں گے پوجا پاٹ' دین میں اس کو کہیں گے محکومیت۔ کہا تم بھی تو الہ خدا ہی کو مانتے ہو؛ ہم بھی یہی کہتے ہیں۔ آؤ یہ قدرِ مشترک ہے نا اَلَّا نَعْبُدَ اِلَّا اللّٰهَ (3:64)۔ اللہ کے سوا کسی اور کو ہم اپنا حاکم اور صاحبِ اقتدار تسلیم نہ کریں۔ یہ مثبت۔ اور اس کے بعد وَ لَا نُشْرِكَ بِهٖ شَيْـًٔا (3:64) دنیا کی کسی شے کو اس کی صفات میں مشترک ہم تسلیم نہ کریں؛ انہیں صفاتِ الوہیت نہ دیں خدائی کا درجہ نہ دیں کسی کو بھی۔ عزیزانِ من! یہ لا الہ اور الا اللہ کے دونوں اجزا اس میں آ گئے۔ لا الہ تو یہ ہے کہ وَ لَا نُشْرِكَ بِهٖ شَيْـًٔا (3:64) کسی اور کو الوہیت کا خدائی کا درجہ نہ دو اور اس کے سوا کسی اور کی محکومیت اختیار نہ کریں۔ تمہارے ہاں بھی تو یہی کہا جاتا ہے نا لیکن تم بھی زبان سے یہ کہتے ہو؛ عملاً یہ کچھ نہیں کرتے۔ میری دعوت یہ ہے کہ اس قدرِ مشترک کے اوپر دونوں ہم عملاً قائم ہو جائیں۔ آپ دیکھتے ہیں کہ باہمی اتحاد' باہمی تعاون کی بنیاد کتنی مضبوط یہاں پیش کی جا رہی ہے اور دین کی تو غایت ہی یہ ہے تَعَالَوْا اِلٰی كَلِمَةٍ سَوَآءٍۭ بَیْنَنَا وَ بَیْنَكُمْ اَلَّا نَعْبُدَ اِلَّا اللّٰهَ وَ لَا نُشْرِكَ بِهٖ شَيْـًٔا (3:64)۔ اور اگلی چیز ہے۔ یہاں تو شَيْـًٔا کہا ہے نا' تو ہم پرستیوں کے اندر اشیائے کائنات کو خدا کا درجہ دیا جاتا تھا۔ یہ دیوی دیوتا جتنے تھے یہ اشیائے کائنات تھے' مظاہرِ فطرت تھے' فطرت کی قوتیں تھیں انہیں بھی خدا کا درجہ دیا جاتا تھا۔ لیکن اس سے آگے اس سے بھی زیادہ خطرناک گھاٹی وہ ہے جہاں انسانوں کو خدا بنا لیا جاتا تھا اور کہا کہ وَ لَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ (3:64) نہ تو اشیائے کائنات میں سے کسی کو ہم خدا کا درجہ دیں اور نہ

ہی ہم ایک دوسرے کو خدا سے ورے ہی اپنا خدا تسلیم کر لیں' انسانوں کو خدا تسلیم نہ کیا جائے۔

انسانوں کو خدا بنا لینے کے عمل کی نوعیت اور اس کا مفہوم

اب یہ جو چیز ہے انسانوں کو خدا تسلیم کرنا ہم میں سے بھی ہر ایک یہ کہے گا کہ نہیں صاحب! ہم تو یہ نہیں کرتے۔ بلکہ اس سے پہلا جو ٹکڑا تھا کہ ہم کسی کو شریک نہیں کرتے اس خدائی میں' یہ بھی ہم میں سے ہر شخص کہے گا۔ ہر شخص یہ کہے گا اور اس کے ساتھ جہاں شَيْئًا کہا ہے عجیب چیز ہے انسان نہیں بلکہ پتھر اور چونے کی عمارت جسے قبر یا مزار کہا جاتا ہے اور پھر مزارِ مقدس ہو جاتا ہے' یہ کیا ہے؟ یہ تو اشیا میں سے ہے۔ آپ دیکھتے ہیں کہ اس شے کو آپ کتنی اہمیت دیتے ہیں۔ کس جہت سے اہمیت دیتے ہیں؟ کہ صاحب! حضرت صاحب کو یہاں دفن کیا گیا تھا۔ جس شے کو دفن کیا گیا تھا وہ تو انسان نہیں رہا وہ پھر شے کے اندر آ جاتا ہے۔ عزیزانِ من! مردہ جسم اشیا کے اندر شمار ہوتا ہے' انسانوں میں شمار نہیں ہوتا۔ مردہ جسم کی ہڈیوں کے اوپر پتھر اور چونے کی اور اینٹوں کی عمارت اشیا میں تسلیم ہوتی ہے۔ انہیں آپ نے الوہیت کا درجہ دیا ہوا ہوتا ہے یا نہیں؟ گڑگڑا کر دعائیں مانگتے ہیں وہاں جا کر' سجدے کرتے ہیں' استمداد کی جاتی ہے ان سے جو صرف خدا کے قوانین سے ہونی چاہیے دنیا کے اندر۔ اشیا کو دیا ہوا ہے الوہیت کا درجہ۔ مذاق کرتے ہیں ہم اس چیز کے اوپر کہ ہندو بت کو پوجتا ہے' اگنی کو دیوی دیوتا مانتا ہے' ان چیزوں سے مدد مانگتا ہے' ان چیزوں سے ڈرتا ہے۔ خود نہیں سوچتا کہ وہ تو پھر بھی انہوں نے آسمان کے اوپر بجلی کو کڑکتے تو دیکھا' بارش کو برستے تو دیکھا تم نے تو اس میں مردے کی ہڈی کو دیکھا اور اس عمارت کے اندر تم نے کیا دیکھا؟ سوائے اس کے کہ ایک عقیدہ ہے تمہارا۔ عقیدے کے اعتبار سے اس کا بھی عقیدہ ہے وہ کہتا ہے کہ میں پتھر سے مانگتا ہوں' بت سے مانگتا ہوں' دیتا ہے مجھے۔ یہ شَيْئًا ہے اشیا ہیں۔ لیکن اگلی چیز جو قرآن کہتا ہے کہ انسانوں کو تم رب بنا لیتے ہو۔ آپ ان سے کہیے گا یہ بھی کہیں گے کہ ہم تو نہیں رب بناتے۔

احبار و رہبان کو اپنا خدا بنا لینے کے سلسلہ میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ایک روایت

سورۃ توبہ میں یہ چیز آئی ہے اس کی تفسیر کہ انسانوں کو رب کیسے بنایا جاتا ہے؟ اِتَّخَذُوْٓا اَحْبَارَهُمْ وَ رُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ ((9:31 یہی الفاظ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ (9:31) وہاں آئے ہیں کہ یہ اپنے علما اور مشائخ کو خدا سے ورے ہی اپنا خدا بنا لیتے ہیں۔ یہاں بھی کسی سے کہیے تو وہ کہیں گے کہ نہیں صاحب! ہم تو نہیں خدا بناتے۔ عجیب بات ہے یہ چیز ہمارے ہاں آئی

ہے ایک روایت میں اور بڑی صحیح نظر آتی ہے کہ ایک یہودی جو مسلمان ہوئے ہوئے تھے انہوں نے رسول اللہ ﷺ سے کہا 478آلِ عمران
یارسول اللہ ﷺ! ہم ان کو پوجتے تو نہیں تھے اپنے احبار و رہبان کو، ہم ان کی پرستش تو نہیں کرتے تھے۔ تو یہ کیسے کہہ دیا ہے قرآن نے یا خدا نے کہ ہم اپنے احبار و رہبان کو خدا سے ورے ہی خدا بنا لیتے تھے ہم ان کی پرستش نہیں کیا کرتے تھے۔ دیکھا آپ نے یہی سوال آج بھی کسی سے کہیے تو یہ کہیں گے کہ غلط ہے صاحب! ہم ان کی پرستش تو نہیں کرتے۔ وہیں یہ سوال پیدا ہوا اور انہوں نے کہا۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ پرستش تو تم نہیں کرتے تھے کیا یہ حقیقت نہیں کہ جس چیز کو تمہارے یہ علما حلال کہتے تھے تم حلال مان لیتے تھے۔ جسے یہ حرام کہتے تھے تم حرام مانتے تھے۔ یہی تو خدائی کا درجہ دینا ہے کسی کو۔ کیا بات کہہ دی صاحب؟ کتنی عظیم چیز ہے۔ بظاہر نگاہ ہی نہیں جاتی اس طرف۔ یہ بات کیا ہے

حلال کو حلال اور حرام کو حرام قرار دینے کا حق صرف خدا کو حاصل ہے، کسی نبی کو بھی نہیں

قرآنِ کریم نے بڑی شدت سے اس پہ زور دیا ہے کہ حرام اور حلال قرار دینے کا اقتدار صرف خدا کو حاصل ہے، کسی اور کو حاصل نہیں ہے۔ یہ کیا بات ہے؟ اوا تنی اہم چیز ہے یہ؟ عزیزانِ من! بڑی اہم چیز ہے۔ حلال کے معنی ہی ہیں وہ شے جو آزاد کی گئی ہے۔ انسان کو اس کی آزادی ہے کہ کائنات میں جو چیزیں قدرت نے پیدا کی ہیں، ان سے تمتع کرے، ان سے فائدہ حاصل کرے، ان سے کھائے پیئے۔ اب ایک شخص دوسرے سے کہتا ہے کہ نہیں! تم یہ گوشت نہیں کھا سکتے۔ اسے کیا حق حاصل ہے کہ میری آزادی کے اوپر پابندی لگا دے؟ وہ اپنے حکم کا محکوم بنا رہا ہے مجھے۔ اور ایک فرد کو ہی نہیں اگر عقیدہ یہ ہو جائے کہ صاحب! یہ چیز قیامت تک کے لیے تمام مسلمانوں پر حرام ہے ارب ہا ارب آنے والے جو انسان ہیں، ان کو محکوم بنا لیا اس شخص نے اپنے فیصلے کا۔ اس سے بڑی غلامی اور کیا ہوتی ہے؟ اور یہ وجہ ہے کہ یہ اختیار خدا نے صرف اپنے ہاتھ میں رکھا ہے۔ کسی انسان کو حق حاصل نہیں ہے کہ جن چیزوں کو خدا نے حلال قرار دیا ہے، انہیں حرام قرار دے۔ حتیٰ کہ رسول اللہ ﷺ کے متعلق بھی دوسروں کے اوپر تو ایک طرف اپنے متعلق آپ ﷺ نے ایک شے کے متعلق کہہ دیا تھا کہ میں اسے استعمال نہیں کروں گا۔ قرآن میں ہے یٰاَیُّھَا النَّبِیُّ لِمَ تُحَرِّمُ مَآ اَحَلَّ اللّٰہُ لَکَ (66:1) جس چیز کو خدا نے حلال قرار دیا ہے، تم کون ہوتے ہو اس کو اپنے اوپر حرام قرار دینے والے۔ اپنے اوپر بھی نہیں۔ عزیزانِ من! یہ حلت و حرمت کا مسئلہ محض عقیدے کی بات نہیں، بڑی گہری چیز ہے۔ کسی کو کیا حق حاصل ہے کسی دوسرے انسان کی آزادی کو چھینے؟ یہ صرف خدا کو حق حاصل تھا، اس نے جن چیزوں کو حرام قرار دیا ہے۔

خدا کی حاکمیت تو اپنے اندر ایک عظیم مفہوم اور نظم و ضبط لیے ہوئے ہے

جب ہم خدا کی الوہیت' اس کے اقتدارِ اعلیٰ' اس کی حاکمیت کو تسلیم کرتے ہیں' اس کے فیصلے کو تسلیم کرنا ہوگا۔ چھوٹے پیمانے 478 آلِ عمران
کے اوپر جب ہم اپنے ہاں کے کسی نظامِ حکومت کی حاکمیت کو تسلیم کرتے ہیں' نہایت عمدہ لذیذ امرود جیسی چیز اطمینان سے کھاتے پیتے ہیں۔ لیکن برسات کے دنوں میں ہر ڈیپارٹمنٹ کی طرف سے ایک نوٹس نکل آتا ہے کہ دو مہینے کے لیے پابندی عائد کی جاتی ہے کہ امرود نہیں کھایا جائے گا۔ ٹھیک ہے اس کے لیے وہ وجہ بیان کرتے ہیں کہ ہیضے کا ڈر ہے۔ لیکن آپ نے دیکھا' پابندی عائد ہوگئی۔ اگر ہم اس قانون کا احترام کرتے ہیں تو ہم اپنی آزادی کو روک لیں گے اس درجے تک۔ حتیٰ کہ اگر انہوں نے کہہ دیا کہ ہفتے میں دو دن آپ کو گوشت کا ناغہ کرنا ہوگا' مانتے ہیں اس چیز کو۔ یہ پابندیاں صرف وہ قوم قبول کرے گی نا جو اس حکومت کو حکومت تسلیم کر رہی ہے۔ ذرا ایک لائن کے پار سرحد کے پیچھے یہ دو دن کے ناغے کچھ معنی ہی نہیں رکھتے۔ اگر ہم نے خدا کی حاکمیت کو تسلیم کر لیا ہے تو پھر اس نے جن چیزوں کے متعلق کہا ہے کہ ان پہ پابندی ہے' اس کی حاکمیت کا تقاضا ہے کہ ہم اس پابندی کو عائد کریں۔ لیکن خدا کے علاوہ تو کسی حاکمیت جو ہے' اس کو مانا نہیں جا سکتا۔ اس لیے کسی کو یہ حق حاصل نہیں ہے کہ ابدی طور پر کسی انسان کی کسی آزادی کو چھین لے۔ یہ جو میں نے وقتی طور پہ کہا ہے یہ مصلحت کے ماتحت ہے۔ مصلحت کے معنی یہ ہیں کہ ایک ڈاکٹر یہ کہتا ہے کہ ان دنوں تم نے دودھ نہیں پینا' چند دنوں کے لیے گوشت سے ذرا پرہیز کرنا ہے۔ اسی میں یہ چیز آجاتی ہے جو حکومت کی طرف سے ہوتا ہے کہ اتنے دنوں تک یہ چیز نہیں کرنی۔ ابدی طور پہ وہ اس چیز کو حرام نہیں قرار دے سکتے۔

انسانوں کی آزادی اور پابندی کے متعلق قائدِ اعظمؒ کے الفاظ بڑے غور طلب ہیں

ابدی کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ انسان خود ان میں تبدیلیاں نہیں کر سکتا۔ یہ چیز خدا کو حاصل ہے' اس کے اقتدارِ اعلیٰ کی یہ چیز ہے کہ وہ ہماری آزادی کو پابند کر دے۔ اور یہ تھی وہ عظیم چیز جو قائدِ اعظمؒ نے 1941ء میں کہی تھی جب پوچھا گیا تھا کہ جس مملکت کی تشکیل کے لیے آپؒ جدوجہد کر رہے ہیں' وہ دوسری حکومتوں سے کس طرح ممتاز اور مختص ہوگی؟ امتیازی نشان کیا ہوگا؟ انہوںؒ نے یہ کہا تھا کہ اس کا امتیازی نشان یہ ہوگا کہ اس مملکت اور اس حکومت میں اطاعت اور وفا کیشی کا مرجع صرف خدا کی ذات ہوگی جس کا عملی ذریعہ اس کی کتاب قرآن کے احکام کی تعمیل ہوگا۔ اور اگلی چیز تھی کہ قرآن ہی ہماری آزادی اور پابندی کے حدود متعین کرے گا۔ بڑی عجیب چیز تھی یہ۔ اسے کہتے ہیں لا الہ الا اللہ۔ یہ چیز تھی جو مذہب میں آ کے انسانوں کے ہاتھ میں چلی جاتی ہے۔

قرآنِ حکیم کے نزدیک حلال وحرام کے فتوؤں سے انسانوں کو محکوم بنانا جرم ہے

قرآن نے کہا کہ یہ لوگ اپنے احبار و رہبان کو اَرۡبَابًا مِّنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ (3:64) تسلیم کرتے ہیں۔ جب اعتراض کیا گیا تو کہا

کہ ہم اس کی عبادت تو نہیں کرتے، پرستش تو نہیں کرتے، پوجا تو نہیں کرتے۔ کہا کہ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ (3:64) کے معنی یہ ہیں۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ جس چیز کو وہ حلال قرار دے دیں، وہ حلال سمجھی جائے۔ جسے حرام قرار دے دیں، حرام سمجھی جائے۔ آپ کے ہاں ہو کیا رہا ہے؟ زندگی کا کوئی مسئلہ، کوئی معاملہ آپ کے سامنے آئے، آن میرٹ وہ DISCUSS ہی نہیں ہونے پاتا۔ جونہی ادھر سے ایک بات آئی اور اُدھر سے فتویٰ آ گیا کہ ناجائز ہے شریعتِ حقہ کی رو سے۔ چلیے صاحب بیٹھے رہیے۔ بھائی صاحب! آپ کو کس نے یہ اختیار دے دیا؟ یعنی یہ ٹھیکے دار ہیں۔ اور پھر اس کے بعد اسی بنا پر شورشیں اٹھ رہی ہیں، ہنگامے برپا ہو رہے ہیں، فسادات ہو رہے ہیں۔ کوئی دوسرا کرے تو اس کے متعلق تو یہ ہے کہ مجرم ہے، یہ کریں تو یہ جہاد میں مصروف ہیں صاحب، اقامتِ دین کے لیے یہ کچھ ہو رہا ہے۔ حضور کو یہ سند کس نے دے دی ہے جناب اس چیز کی؟ سند اور حجت تو خدا کی کتاب ہے یہ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ (3:64) ہیں۔ حرام اور حلال کی آپ صاحب! پوچھیے نہیں اتنی اتنی لمبی فہرستیں آپ کے ہاں بنی چلی آ رہی ہیں۔ آپ کی آزادیاں ساری مسلوب ہیں۔ ان کے مقابلے میں حکومت کچھ نہیں کر سکتی۔ یہ ہے اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ (3:64) بنا لینا۔ مذہب میں خدا کی حاکمیت تو باقی نہیں رہتی، قدم قدم پر انسانوں کی حاکمیت تسلیم کر لی جاتی ہے۔ کوئی مسئلہ ہو بات یہ ہوتی ہے، مولوی صاحب کیا فرماتے ہیں۔ پہلے لوگ پوچھنے جاتے ہیں، اب خیر پوچھنے نہیں جاتے ہیں، وہ خود مسلط کر دیتے ہیں ان کے اوپر۔ نتیجہ یہ کہ آپ خدا کی کتاب دین میں سند اور حجت تو ایک طرف رہی، وہ عقلِ عامہ جو اللہ تعالیٰ نے انسان کے لیے شرف کا موجب بنائی تھی، اس سے بھی کام نہیں لے سکتے آپ۔ کہا ان سے یہ تھا کہ آؤ ہم ایک دوسرے کو خدا نہ بنا لیں۔ یہ ہیں وہ کَلِمَةٍ سَوَآءٍۢ بَيْنَنَا وَ بَيْنَكُمْ (3:64) جسے کہا ہے تم بھی تو یہ کہتے ہو نا کہ خدا کے سوا کسی اور کو خدا نہیں بنانا چاہیے، ہم بھی یہی کہتے ہیں۔ لیکن آؤ ذرا عملاً اس کی شکل لے لیں۔ اور اس کی شکل عملاً یہی ہے کہ خدا کے سوا کسی کا اقتدار نہیں۔ خدا کا اقتدار وہ تو ایک غیر محسوس غیر مرئی ذات ہے، خود تو وہ آتا نہیں حکومت کرنے کے لیے، نہ احکام دینے کے لیے۔ وہی چیز جو قائداعظمؒ نے کہی تھی کہ اس کا عملی طریق اس کی کتاب کی احکام کی تعمیل ہے۔

دنیا بھر میں سوائے قرآنِ کریم کے کوئی آسمانی کتاب کوئی قوم بھی اپنے پاس رکھنے کا دعویٰ نہیں کر سکتی

یہ چیز ہے کہ جو دعوت دی گئی کہ لاؤ تم بتاؤ خدا کے احکام تمہارے پاس اصلی شکل میں کہاں ہیں؟ کوئی اہلِ کتاب بھی اس کا دعویٰ نہیں کر سکتا۔ آج خدا کے احکام اپنی اصلی شکل میں قرآن میں موجود ہیں لیکن آپ کے اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ (3:64) جو ہیں

کبھی قرآن کو سامنے نہیں لائیں گے۔ کوئی فتویٰ ان سے پوچھ لیجیے' کبھی یہ نہیں ہوگا کہ خدا نے یہ فرمایا ہے۔ فلاں کتاب میں یہ لکھا ہے' فلاں امام کا یہ حکم ہے' فلاں مفسر نے یہ لکھا ہے' فلاں روایت میں یہ آیا ہے۔ بس یہیں تک دین ہو جائے گا صاحب۔ وہ جو قدرِ مشترک ہے تمام مسلمانوں کے اندر خدا کی کتاب اس کو کبھی نہیں لائیں گے سامنے۔ اس لیے کہ اس سے فرقے ختم ہو جاتے ہیں' اجارہ داریاں اس میں سے بالکل ختم ہو جاتی ہیں' اَرۡبَابًا مِّنۡ دُوۡنِ اللّٰہِ (3:64) کا وجود باقی نہیں رہتا۔ عزیزانِ من! یاد رکھیے! دین میں نہ علما کا وجود ہوتا ہے' نہ مشائخ کا وجود ہوتا ہے۔ وہاں خدا کی حاکمیت ہوتی ہے۔ اس کا عملی ذریعہ خدا کے نام پر اس کی کتاب کے احکام کو نافذ کرنے والی قوت ہوتی ہے۔ یہ تھا وہ قدرِ مشترک جس کی طرف دعوت دی کہ آؤ اس قدرِ مشترک کی طرف۔ کہا فَاِنۡ تَوَلَّوۡا (3:64) اور اگر اس کے بعد اس سے یہ روگردانی کریں فَقُوۡلُوا اشۡهَدُوۡا بِاَنَّا مُسۡلِمُوۡنَ (3:64) تو ان سے کہو کہ بہت اچھا! تم جدھر جانا چاہتے ہو جاؤ' اس کی شہادت دینا کہ ہم اسی کے اوپر جھکے ہوئے ہیں جس کی طرف تمہیں دعوت دے رہے ہیں۔ لیکن یہ اس شخص نے کہا تھا جو ان کی مذہب کی گروہ بندیوں کے اندر نہیں تھا' باہر کھڑا تھا۔ اور جب پوری قوم گروہ بندیوں کے اندر جکڑی جائے تو پھر کوئی بھی ایسا گروہ نہیں رہتا جو یہ کہے کہ آؤ اس قدرِ مشترک کی طرف۔

دین کا پیش کردہ نظامِ حیات ہی قدرِ مشترک قرار پا سکتا ہے نہ کہ مذہبی فرقوں کا مختلف وجود

دین کے اوپر تو وہی گروہ ہوگا جو ان سب سے کہے کہ آؤ قدرِ مشترک کی طرف۔ مذہب کے اندر ہر فرقہ کہے گا کہ آؤ میرے فرقے کی طرف۔ دین کا پابند یہ نہیں کہے گا وہ کہے گا آؤ خدا کی کتاب کی طرف۔ اگر یہ روگردانی کریں تو ان سے کہو کہ بہت اچھا! تم اس کی شہادت دو گے کہ ہم تمہارے فرقے میں سے کسی سے متعلق نہیں ہوئے' ہم اس کے قوانین کے سامنے جھکنے والے ہیں۔ یٰۤاَهۡلَ الۡكِتٰبِ لِمَ تُحَآجُّوۡنَ فِیۡۤ اِبۡرٰهِیۡمَ وَمَاۤ اُنۡزِلَتِ التَّوۡرٰىةُ وَالۡاِنۡجِیۡلُ اِلَّا مِنۡۢ بَعۡدِهٖ ؕ اَفَلَا تَعۡقِلُوۡنَ (3:65) عزیزانِ من! کتنی عجیب چیزیں قرآن کہتا چلا جا رہا ہے۔ باتیں ہو رہی ہیں چودہ سو سال پہلے کی' گفتگو ہو رہی ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم یا اسلام کے مدعی اور غیر مسلموں کی اہلِ کتاب کی اور داستان ہماری بیان ہو رہی ہے۔ کہا تم اس کو تو مانتے ہو نا کہ ابراہیمؑ تمہارا مورثِ اعلیٰ تھا؟ یہودی نصرانی دونوں مانتے ہیں۔ کہا یہ بتاؤ کہ ابراہیمؑ یہودی تھا یا نصرانی تھا؟ بڑی عجیب چیز ہے۔

تمام مذہبی فرقوں سے ایک اہم سوال کہ کیا نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم شیعہ تھے یا سنی؟

آج یہ بات سنیوں سے بھی اور شیعہ سے بھی' دیو بندیوں سے بھی اور بریلویوں سے بھی' حنفیوں سے بھی اور مالکیوں سے بھی' اہلِ حدیث سے بھی اور اہلِ فقہ سے بھی پوچھنے کی بات یہ ہے کہ تم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رسالت پہ ایمان رکھتے ہو نا؟ ہاں

رکھتے ہیں۔تو پھر یہ بتائیے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم شیعہ تھے یا سنی تھے؟ کتنی عجیب چیز کہہ گیا ہے قرآن۔کہو وہ حنفی تھے یا مالکی تھے وہ اہلِ حدیث تھے یا اہلِ فقہ تھے؟ جواب نہیں بن پڑتا۔قرآن یہ کہتا ہے کہ یہ چیزیں اس کے بعد آئی تھیں۔آہاہاہا۔مَا كَانَ اِبْرٰهِيْمُ يَهُوْدِيًّا وَّ لَا نَصْرَانِيًّا (3:67) کہا اس لیے کہ یہ تو اِلَّا مِنْۢ بَعْدِهٖ (3:65) یہ اس کے بعد کی باتیں ہیں۔آ ؤ ORIGIN کی طرف آ ؤ جڑ کی طرف آ ؤ' بتاؤ تو سہی۔میں پوچھتا یہ ہوں کہ یہ جو سنتِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اتنے متبع ہونے کے دعوے دار ہیں یعنی حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی روشِ زندگی پہ ان سے یہ پوچھنا چاہیے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اہلِ حدیث تھے یا اہلِ فقہ تھے۔جہاں تک ان چیزوں کے نام کا تعلق ہے فرقہ بندیوں کا قرآن نے کہا ہے هُوَ سَمّٰىكُمُ الْمُسْلِمِيْنَ (22:78) خدا نے تمہارا نام صرف مسلم رکھا ہے۔لیکن یہاں تو اس کے بعد ''اک ناں تے ماں پیو نے رکھیا ہوندا اے نا اک اوہدے کا کے اوں باتے اوں دے ناں ہوندے ہیگے نیں''۔

یہاں تو مذہبی گروہ بندی سے ہٹ کر اپنے نام کا تعارف کرانا بھی مشکل ہے

خدا نے نام مسلم رکھا ہے؟ رکھتا پھرے وہ پسند ہی نہیں۔کسی سے آپ پوچھ لیجیے یا کوئی پوچھے آپ سے کہ کون ہوتے ہو جی؟ مسلمان ہوتا ہوں۔اوہو وہ ٹھیک ہے صاحب ''او تے پتا اے ساہنوں' کیہڑے مسلمان؟'' جی سنی مسلمان۔''اوہو سنی مسلمان تے گل ہوئی نا' کیہڑے سنی مسلمان جی؟'' کہ جی حنفی مسلمان ہوں میں۔اچھا حنفی مسلمان!''نہ میں پوچھنا اے چاہنا ہیگاں پئی دیو بندی ہو یا بریلوی ہیگے اوتسی؟''۔چلیے جاؤ آ گے' تسکین نہیں ہو رہی اس کے بعد۔آپ سوچیے تو سہی ''جو ایس ذہن اچ نکلے اوہناں نوں کہو کہ جی نہیں! پیر صاحب دے مرید ہاں''۔اچھا پھر نقشبندی ہیں یا چشتیہ ہیں صاحب جی؟ چشتی ہوں جی۔چشتیہ نظامیہ ہیں یا صابریہ ہیں؟ ذاتوں میں سے گوتیں گوتوں میں سے سب گوتیں چلی آ رہی ہیں هُوَ سَمّٰىكُمُ الْمُسْلِمِيْنَ (22:78) رکھا ہوا ہے ایک طرف۔عزیزانِ من! کسی کا اطمینان نہیں ہوتا خالی مسلمان کہنے سے۔لیکن قرآن تو دکھتی ہوئی رگ کو پکڑتا ہے' وہ کہتا یہ ہے ان سے پوچھو یہ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم حنفی تھے یا مالکی تھے؟ شیعہ تھے یا سنی تھے؟ وہ کہتا ہے یہ چیزیں اس کے بعد آئی تھیں۔کتنی عجیب چیز ہے کہ یہ چیزیں اس کے بعد آئی تھیں۔ان کی اصطلاح میں کوئی چیز جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد آئی ہو' اسے بدعت کہتے ہیں۔یعنی یہ اب سنی کہلانا یا حنفی کہلانا تو بدعت نہیں ہے ''روئی دی ٹوپی پانا بدعت ہے' کیوں بھئی؟ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے نہیں سی پائی۔رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مالکی کہلایا سی اپنے آپ نوں؟ اوں مذہب دی گل ہیگی اے۔اوجیہڑی توں کہن ڈیا ہیگاں اے او دنیا دی گل ہیگی؟''۔عزیزانِ من! دیکھتے ہیں آپ وہ جو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ایک روایت

آلِ عمران 478 میں ہے کہ مجھے نظر آتا ہے جس روش پہ یہ امت چلنے والی ہے کہ یہ یہودی نصرانی جس طرح سے، جس قدموں کے اوپر، جس کے اوپر چلے تھے، اسی کے اوپر یہ چلنے والے نظر آتے ہیں۔ قدم بہ قدم وہیں آپ پہنچے ہوئے ہیں۔ ان سے بھی یہ پوچھا گیا کہ بتاؤ مورثِ اعلیٰ جس کو ابراہیمؑ تم کہتے ہو وہ یہودی تھا یا نصرانی تھا؟ آج پوچھنے کی بات ہے کہ تمہارا مورثِ اعلیٰ جسے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کہتے ہو، پوچھو ان سے کہ شیعہ تھے یا سنی تھے؟ حنفی تھے یا مالکی تھے؟ اہلِ حدیث تھے یا اہلِ فقہ تھے؟ کچھ نہیں تھے، وہ صرف مسلمان تھے۔ لیکن اس کے بغیر ان کا تو ایمان ہی نہیں ہوسکتا۔

کیا کسی مسلمان کے لیے کسی کا مقلّد ہونا ضروری ہے

شاید آپ کو یاد ہو اس سے پہلے بھی کبھی یہ بات سنائی، بات تو ہے ذرا ہنسی کی لیکن بڑی گہری بات ہے۔ وہ سیدھا سادا سا مسلمان، مولوی صاحب نے زور دے دے کے اس کو بتایا کہ صاحب! جو شخص تقلید نہیں کرتا، مقلد نہیں ہوتا امام ابوحنیفہؒ کا، اس کی نجات ہو ہی نہیں سکتی۔ سنتا رہا امام ابوحنیفہؒ کی تقلید میں نجات ہے ٹھیک ہے۔ وہ ایک دن کہیں وہ مولوی صاحب سیرت بیان کر رہے تھے، وعظ بیان کر رہے تھے اس میں انہوں نے ذکر کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی وفات سن 10 ہجری میں ہوئی، امام ابوحنیفہؒ کی پیدائش سن 80 ھجری میں ہوئی، وفات سن 150 ہجری میں ہوئی۔ اس نے اس کے بعد پوچھا کہ جی یہ امام ابوحنیفہؒ ، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی وفات کے کوئی سو سال بعد ہوئے؟ انہوں نے کہا کہ ہاں بعد ہوئے تھے۔ تو کہنے لگے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم ان سے پہلے وفات پا گئے؟ کہنے لگے ہاں۔ کہنے لگے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم غیر مقلد ہی مر گئے پھر۔ انہوں نے تو بتایا ہوا تھا نا کہ وہ تو امام ابوحنیفہؒ کی تقلید میں نجات ہے تو وہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم تو پہلے فوت ہو گئے۔ عزیزانِ من! یہاں تک پہنچا دیا جاتا ہے اس مسئلے کو۔ اور بات یہ بڑی گہری ہے، وہی ہے قرآن کی بات کہ یہ تمہارے ہاں تقلید جو ہے وہ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے بعد کی پیداوار چیز ہے، تم بتاؤ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم تم میں حنفی تھے یا مالکی تھے؟ کوئی یہاں نہیں پہنچے گا۔ ان سے کہا کہ چھوڑو ان جزئیات کو ہمیں بتاؤ ابراہیمؑ کو تو قدرِ مشترک مانتے ہو نا؟ کیا بات ہے قرآن کی۔ آئمہ کو، مفسرین کو، راویوں کو ان کو الگ رکھو رسول صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو تو مانتے ہو نا سارے ہے نا قدرِ مشترک؟ ہاں جی ہے قدرِ مشترک۔ بتاؤ پھر کہ رسول صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم حنفی تھے یا مالکی تھے؟ کہا یہ چیزیں اس کے بعد کی آئی ہیں اور اس کے بعد کیا بات کہہ دی کہ بابا! یہ چیز جو ہے کوئی اتنا بڑا مسئلہ نہیں ہے لہٰذا مذہب کا مسئلہ ہو، شریعت کا ہو یا فلسفے کا بات تو سیدھی سی ہے اَفَلَا تَعۡقِلُوۡنَ (3:65) او عقل سے بھی کام لیتے ہو یا نہیں۔ جو چیز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے بعد کی ہے وہ رسول صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی ہو کیسے سکتی ہے؟ اَفَلَا تَعۡقِلُوۡنَ (3:65) واہ واہ واہ! قرآن ہے۔ هٰۤاَنۡتُمۡ هٰٓؤُلَآءِ حَاجَجۡتُمۡ فِيۡمَا لَـكُمۡ بِهٖ عِلۡمٌ

(3:66) کہتا ہے اس وقت تک تم باتیں وہ کر رہے تھے جن کے متعلق تم کہتے تھے کہ ہاں صاحب! وہ ہمیں معلوم ہیں
معلوم نہیں ہیں۔ اچھی بات صاحب! نہ سہی معلوم ہمیں۔ **فَلِمَ تُحَآجُّوْنَ فِيْمَا لَيْسَ لَكُمْ بِهٖ عِلْمٌ ؕ** (3:66) اور یہ بات جو ہے کہ ابراہیمؑ جو تھا وہ تمہاری گروہ بندیوں سے پہلے کا تھا ابراہیمؑ کے متعلق تمہیں کچھ بھی علم نہیں ہے' اس بارے میں کم بختو کیوں جھگڑ رہے ہو۔ اتنا تو تمہیں علم ہے نا کہ یہ تورات و انجیل کی گروہ بندیاں تمہاری ابراہیمؑ کے بعد کی چیزیں ہیں۔ تو یہاں تو نہ جھگڑو تم۔ **وَاللّٰهُ يَعْلَمُ وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ** (3:66) یہ وہ چیزیں ہیں خدا اپنے علم کی بنا پر بتاتا ہے' تمہیں ان چیزوں کا علم ہی نہیں تھا۔ اب آ گئی وہ چیز **مَا كَانَ اِبْرٰهِيْمُ يَهُوْدِيًّا وَّلَا نَصْرَانِيًّا** (3:67) ابراہیمؑ نہ یہودی تھا نہ نصرانی تھا۔ آج ہم کہیں گے کہ رسول اللہ ﷺ نہ شیعہ تھے نہ سنی تھے نہ حنفی تھے نہ مالکی تھے نہ دیو بندی تھے نہ بریلوی تھے نہ اہلِ حدیث تھے۔ کیا تھے؟ **وَلٰكِنْ كَانَ حَنِيْفًا مُّسْلِمًا** (3:67) وہ صرف مسلم تھے۔ اور اس کے ساتھ **حَنِيْفًا** (3:67) ناک کی سیدھ چلنے والا اِدھر اُدھر بالکل نہیں تکتا' سیدھا اس نصب العین کے اوپر اس کی نگاہ تھی اور اس کی طرف جاتا تھا۔ **وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ** (3:67) یہ یہاں جو کہا ہے آ کے کہ وہ مشرک نہیں تھا' یہ کیا چیز ہے؟

قرآنِ حکیم کے نزدیک فرقہ بندی تو شرک ہے

قرآن نے کہا ہے **وَلَا تَكُوْنُوْا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ۔ مِنَ الَّذِيْنَ فَرَّقُوْا دِيْنَهُمْ وَكَانُوْا شِيَعًا ؕ كُلُّ حِزْبٍۭ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُوْنَ** (30:31-32) یاد رکھنا مسلم ہونے کے بعد پھر مشرک نہ ہو جانا یعنی ان میں سے نہ ہو جانا جنہوں نے اپنے دین میں فرقے پیدا کر لیے' خود بھی گروہ بن گئے۔ اور پھر کیفیت یہ ہو جاتی ہے کہ ہر گروہ مگن ہوتا ہے جس مسلک کے اوپر وہ چلا جا رہا ہوتا ہے۔ یہاں جو کہا ہے کہ ابراہیمؑ یہودی نہیں تھا' نصرانی نہیں تھا' یہ گروہ بندیاں ہیں' یہ فرقے ہیں دین کے اندر۔ ابراہیمؑ کو کہا کہ وہ کسی فرقے سے متعلق نہیں تھا اس لیے کہا **وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ** (3:67) دین آنے کے بعد خدا نے جو نام مسلم رکھا ہے اس کے بعد کسی مذہبی فرقے سے متعلق ہو جانا' یا فرقے کا دعویٰ کرنا قرآن کی رو سے شرک ہے۔ یہاں کہا ابراہیمؑ مشرک نہیں تھا' تم اس کو مشرک بناتے ہو اگر یہودی یا نصرانی کہتے ہو تو' وہ تو ایسا نہیں تھا۔

ہر فرقے کی سند ایک الگ اتھارٹی ہوتی ہے جبکہ خدا تعالیٰ کے نزدیک اس کی کتاب ہی اتھارٹی ہے

فرقے میں بات اصل اور حجت جو ہے وہ کسی انسان پہ جا کے رک جائے گی' آپ دیکھیں گے۔ دین میں آخری سند اور حجت خدا کی کتاب ہوگی۔ اور جب ایک سند اور حجت ہوگی سب کے لیے' تفرقے کا سوال اور اختلاف کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

تفرقہ تو وہاں ہوتا ہے جب ہر ایک کے لیے سند اور اتھارٹی مختلف ہو۔ یہ حنفی اور مالکی کس بنا پہ دو فرقے ہیں؟ ایک کی سند امام ابو حنیفہؒ ہیں دوسرے کی سند امام مالکؒ ہیں۔ یہ دونوں سندیں نیچے سے ختم کر دیجیے اور قدرِ مشترک لے آیئے خدا کی کتاب' نہ حنفی رہتا ہے نہ مالکی رہتا ہے۔ ملتیں جب مٹ گئیں' اجزائے ایماں ہوگئیں۔ یہ رومی بھی کیا بات کہہ جاتا ہے۔ ان نسبتوں کو ختم کیجیے قدرِ مشترک ایک رہ جائے گی آپ کے ہاں۔ اب اگلی بات آئی۔ یہ کہتے ہیں ابراہیمؑ ہمارے تھے اس لیے کہ ہم بنی اسرائیل ہیں۔ اسرائیل جو تھے' وہ ابراہیمؑ کے پوتے کا نام تھا' حضرت یعقوبؑ کا نام تھا۔ اس لیے نسلی اعتبار سے ابراہیمؑ ہمارے تھے۔ اب وہ نسلی اعتبار سے وہاں تک پہنچنے والے۔ کہا یاد رکھو! دریں راہ فلاں ابنِ فلاں چیزے نیست ۔ نسل کی نسبت دین میں کچھ معنی ہی نہیں رکھتی۔ اِنَّ اَوۡلَی النَّاسِ بِاِبۡرٰهِيۡمَ لَلَّذِيۡنَ اتَّبَعُوۡهُ (3:68) ابراہیمؑ اس کا تھا جو اس کی اتباع کرتے تھے جو اس کی پیروی کرتے تھے جو اس کے نقشِ قدم پہ چلتے تھے' ابراہیمؑ اس کا تھا۔ ابراہیمؑ نے تو باپ سے کہہ دیا تھا کہ جا تیرا راستہ دوسرا ہے' میرا راستہ دوسرا ہے۔ نوحؑ نے بیٹے سے کہہ دیا۔ یہاں اس بات سے کہ تم ابراہیمؑ کی نسل اور اولاد میں سے ہو' اس لیے تمہاری اجارہ داری ہے کہ ابراہیمؑ تمہارا ہے۔ دین میں یہ بات نہیں ہوتی۔ ACCIDENT OF BIRTH تو وہ ہے جس پہ کسی کا اختیار ہی نہیں ہوتا۔ عزیزانِ من! دین میں یہ BIOLOGICAL نسبت ٹھیک ہے سوسائٹی کے لیے' ان قوانین کے لیے کوئی حیثیت رکھے تو رکھے' دین کے اعتبار سے اس کی کوئی حیثیت ہی نہیں۔

دین میں نسلی نسبتیں کوئی معنی نہیں رکھتیں

کوئی چیز جس میں انسان کے اپنے اختیار و ارادے اور CHOICE اور انتخاب کو دخل نہیں ہے' دین میں اس کی کوئی حیثیت نہیں۔ یہ کس کے گھر میں پیدا ہو گیا' اس کا کوئی چوائس تھا اس کے اندر؟ نسلی نسبتیں حیوانی سطح تک ہوتی ہیں' دین کی نسبت انسانیت کی سطح پہ ہوتی ہے۔ کہا ابراہیمؑ سب سے زیادہ ان کا تھا کہ جو اس کے نقشِ قدم پہ چلتے تھے۔ وَ هٰذَا النَّبِیُّ (3:68) یہ ہے وہ نبی جو ملتِ ابراہیمیؑ کا دعوے دار ہے' ابراہیمؑ اس کا تھا۔ وَ الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا (3:68) ابراہیمؑ ان کا ہے جو اس پہ ایمان لائے ہیں۔ یہ سارے کے سارے ایک دین پہ تھے۔ وَ اللّٰهُ وَلِیُّ الۡمُؤۡمِنِيۡنَ (3:68) اور اس اعتبار سے پھر سب سے زیادہ اوپر جا کے ایک خدا رہ جاتا ہے جو ان سب کا سرپرست ہو جاتا ہے۔ یہاں سے ابراہیمؑ بھی بیچ میں سے نکل گیا۔ کہا یہ ساری چیزیں ان سے کہو۔ اب ان کا کوئی جواب ان کے پاس نہیں ہے۔ کسی فرقے والے سے آپ باتیں یہ کیجیے اس کا کوئی جواب اس کے پاس نہیں ہوگا۔ کہہ کے پوچھیے اس سے کہ رسول اللہ ﷺ مقلد تھے یا غیر مقلد تھے' حنفی تھے یا مالکی تھے؟ کوئی جواب نہیں ہوگا اس

کے لیے ان کے پاس۔ قدرِ مشترک کی طرف آنا نہیں چاہتے کہ یہ جو گروہ بندیوں کے، سامریوں کے بت ہیں، ان کو وہ توڑنا نہیں چاہتے۔

توحید کے اس صراطِ مستقیم میں کسی قسم کی کوئی مفاہمت نہیں ہوتی

پھر اب کریں گے کیا؟ کیا باتیں قرآن کہہ جاتا ہے؟ کہا کہ اس کے بعد ان کی کوشش یہ ہوگی کہ تم تو ان کو بلا رہے تھے نا قدرِ مشترک کی طرف، بنیاد کی طرف، ان کی کوشش یہ ہوگی کہ تم سے کچھ COMPROMISE کریں کچھ مفاہمت کریں کچھ تم جھکو کچھ ہم بڑھتے ہیں، آؤ اس طرح سے ایک معاملے کے اوپر، طے کرلیں بات۔ بزنس میں یہی ہوتا ہے نا دوکاندار کچھ مانگتا ہے، یہ گاہک کچھ دیتا ہے۔ کچھ وہ کم کرتا ہے، کچھ یہ آگے بڑھتا ہے۔ آہستہ آہستہ درمیان میں جا کے پھر وہ سودا ہو جاتا ہے اس چیز کا۔ کہا اب یہ اس چیز پہ اتر آئیں گے کہ کچھ COMPROMISE کیا جائے۔ اور جیسا کہ اس سے پیشتر بیسیوں دفعہ میں نے عرض کیا حق یا TRUTH جو ہے وہ تو ایک متعین چیز کا نام ہے۔ اس سے ایک ذرا آپ بال برابر بھی اِدھر اور اُدھر ہوں گے تو وہ حق حق نہیں رہے گا، باطل ہو جاتا ہے۔ اس میں 49% یا 51% کا QUESTION نہیں ہے وہ یا حق ہے یا باطل ہے۔ وہ جو میں مثال دیا کرتا ہوں کہ دو اور دو چار، یہ تو حق ہے۔ اب اگر ایک کہتا ہے دو اور دو چار ہوتے ہیں، دوسرا کہتا ہے نہیں! دو اور دو چھ ہوتے ہیں۔ اب دونوں آپس میں جھگڑ رہے ہیں۔ وہ ایک معتبر صلح کرانے والے درمیان میں آجاتے ہیں، وہ کہتے ہیں کہ جھگڑا اس لیے ہے کہ نہ تم اپنے مقام سے ہٹتے ہو، نہ وہ اپنی جگہ سے ٹلتا ہے۔ قیامت تک جھگڑتے رہو گے، بات بنے گی نہیں۔ میاں شریفوں کی سی روش اختیار کرو، ضد سے کیا بات بنے گی، جھگڑتے جاؤ گے۔ نہ دو اور دو چھ نہ دو اور دو چار۔ دو اور دو پانچ پہ ختم۔ میں پوچھتا یہ ہوں کہ دو اور دو پانچ ماننے والا وہ جس نے دو اور دو چھ کہے تھے وہ تو ٹھیک ہے اس کا کچھ نہیں بگڑا، جو دو اور دو چار کہتا ہے تھا، اس کا رہا ہی کچھ نہیں۔

شرک کے مقابلے میں حق ہمیشہ لاشریک ہوتا ہے

باطل ہر مقام پہ مفاہمت کرسکتا ہے، حق لاشریک ہے، یہ مفاہمت نہیں کرسکتا۔ دنیا کی نگاہوں سے دیکھنے والے اسے ضدی کہتے ہیں عزیزانِ من! اسی ضد کا نام تو ایمان ہے۔ ذرا مفاہمت کے اوپر یہ آجائے تو پھر یہ دیانت دار یہ امانت ان کو یہ سزائیں بھگتنے کی ضرورت کیا پیش آتی ہے۔ یہ تو اس لیے بھگت رہے ہوتے ہیں کہ یہ دو اور دو چار کہتے ہیں خواہ سولی پہ لٹکا دیا جائے۔ یہ سوا

آلِ عمران 478 چار کہنے کو بھی تیار نہیں ہوتے چہ جائیکہ پانچ کے اوپر سودا کرلیں۔ پانچ پہ سودا کرے گا جس نے پہلے دو اور دو چھ کہا ہوا ہوگا اس نے پھر بھی کچھ کمایا۔ یہ نہیں سودا کرسکتا۔ سارے دنیا دار اس کو بدنام کریں گے آ کے پھر' اپنی ضد پہ رہا صاحب اڑا ہوا رہا' کیا مل گیا صاحب اس کے بعد؟ اچھا بھلا سودا ہو رہا تھا گنوایا اس نے' اپنا ہی نقصان کیا کچھ۔ کون سمجھائے ان کو دو اور دو چھ کہنے والوں کو کہ چار کہنے والا تو سوا چار بھی نہیں کہتا۔ اس مقام کے اوپر آ گئے پھر یہ اہلِ کتاب' سودے بازی پہ اتر آئے۔ **وَدَّتْ طَّآئِفَةٌ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ لَوْ يُضِلُّوْنَكُمْ** (3:69) اب اس کے بعد ان کی خواہش یہ ہوگی کہ اب تم سے سودا بازی کر کے یوں تمہیں صحیح راستے سے بہکائیں۔ یہ کیا سودا بازی ہے؟ قرآن نے دوسرے مقام پہ اس بات کو یہ کہا ہے۔ حق پہ رہنے والوں کے لیے بھی آزمائش کے کیا کیا مقام آتے ہیں؟ وہ مقام آتے ہیں کہ جہاں پھر عام لوگ جتنے ہوتے ہیں' اکثر اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ خود اپنے بہی خواہ بھی یہ کہنے لگ جاتے ہیں کہ میاں! ضد کو چھوڑو۔ اس کا نام ضد ہوتا ہے ان کے ہاں۔ پھر وہ بھی ناصح مشفق بن کے آ جاتے ہیں کہ صاحب! دیکھ لیا تم نے اپنی بات پہ اڑے ہوئے رہ کر دیکھا پھر کیا پھل پایا' کیا فائدہ پایا تم نے' اٹھایا اتنا نقصان۔ لیکن یہ اسے معلوم ہوتا ہے کہ میں نے کیا پایا ہے اور کیا نقصان نہیں ہوا۔ قرآن کہتا ہے **وَ اِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِمْ اٰيَاتُنَا بَيِّنٰتٍ قَالَ الَّذِيْنَ لَا يَرْجُوْنَ لِقَآءَنَا ائْتِ بِقُرْاٰنٍ غَيْرِ هٰذَآ** (10:15) جب تو ان کے سامنے یہ چیزیں پیش کرتا ہے حق پر مبنی' اصول پر مبنی تو یہ لوگ (بات یہاں یہ کہی ہے) کہ جو اسی دنیا کی زندگی کو ہی زندگی سمجھتے ہیں اور ذہن میں یہ نہیں ہے کہ زندگی نے آگے بھی چلنا ہے اور مجھے اپنے آپ کو اس طرح محفوظ رکھنا ہے کہ میں آگے چلنے کے قابل ہو جاؤں۔ جو اس چیز کو نہیں مانتے' ان کے نزدیک سوال ہی نہیں ہے کہ حق ایک شے ہے اور اسی کے اوپر جم کے رہنا چاہیے۔ وہ یہ کہتے ہیں کہ بھئی! سوال یہ ہے ہم تمہارے ساتھ تیار ہیں معاملہ کرنے کے لیے' اس قرآن کی جگہ کوئی اور قرآن لاؤ۔ لیجیے صاحب۔ اس نبی کے بعد کوئی اور نبی لاؤ اس کتاب کی جگہ کوئی اور کتاب لاؤ یہ قرآن بڑا سخت قسم کا ہے صاحب۔ اور اگر یہ چیز ممکن نہیں کہ سارے کا سارا قرآن ہی اور لے **اَوْ بَدِّلْهُ** (10:15) کچھ تھوڑی سی تبدیلی کر دو اس کے اندر۔

الفاظ تو قرآن کے وہی رکھے لیکن اس کی تعلیم کو چیستاں بنا دیا گیا

قرآن کو تو بدل نہیں سکی یہ قوم' بدل نہیں سکتی تھی ان کی بدقسمتی کہ اس نے حفاظت کا ذمہ لے لیا۔ یہ سر کو پیٹتے ہیں کہ یہ کیسی کتاب نازل کی ہے ''کنے مزے وچ سن اے سارے یہودی تے عیسائی تے اے ہندو'' یعنی وہ کتاب ہی نہیں ہے جو جی میں آئے کہہ دیجیے۔ لیکن انہوں نے کہا کوئی بات نہیں۔ وہ جو میں کہا کرتا ہوں کہ

478آلِ عمران

میری قرآن دانی پر نہ ہوئیے تم خفا صاحب
مجھے تفسیر بھی آتی ہے اپنا مدعا کہیے

قرآن کی جگہ دوسرا قرآن تو نہیں آ سکتا تھا۔ آپ تفسیریں اٹھا کے دیکھیے ایک سے دوسری ملتی نہیں ہے۔ ایک ہی قرآن کی تفسیریں۔ بدلا گیا قرآن۔ اب جس کسی سے قرآن کی کوئی بات کہو وہ پوچھتا یہ ہے کہ جی یہ بات اسلاف میں سے کسی نے کہی ہے' یہ سلفِ صالحین کی تفسیر کے خلاف ہے۔ اوقرآن کے خلاف کہو' جی نہیں۔ حضرت صاحب نے یہ فرمایا اس میں' امام فخر الدین کی تفسیر میں یہ آیا ہے' ابنِ کثیر نے اس کے متعلق یہ کہا ہے ان میں سے تو کسی نے یہ کچھ نہیں کہا ہے۔ کوئی نہیں یہ کہے گا کہ قرآن یہ کہتا ہے یا نہیں۔ دیکھا کیسے بدلا گیا وہ قرآن؟ کتنی گنجائشیں اس کے اندر نکلتی ہیں پھر۔ اس آیت کی تفسیر فلاں امام نے یوں فرمائی' اس لیے اس کے یہی معنی ہوں گے کہ تبدیل کر دو قرآن کو جبکہ رسول سے کہا جا رہا ہے' رسول تو نہیں کر سکتا تھا۔

قرآنِ حکیم کے متعلق نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد

قُلۡ مَا یَکُوۡنُ لِیۡۤ اَنۡ اُبَدِّلَهٗ مِنۡ تِلۡقَآیِٔ نَفۡسِیۡ) (10:15 میرے بس میں نہیں ہے کہ میں اس میں خود کوئی تبدیلی کر دوں میرے بس میں نہیں ہے۔ اللہ اکبر! کتنی بڑی چیز ہے صاحب۔ اسے کہتے ہیں خدا کی حاکمیت کو ماننا' ورنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جو ارشاد فرما دیتے' کون تھا جو اس کے خلاف ذرا سا اعتراض دل میں بھی لاتا۔ ایک طرف وہ کیفیت ہے کہ فَلَا وَ رَبِّکَ لَا یُؤۡمِنُوۡنَ حَتّٰی یُحَکِّمُوۡکَ فِیۡمَا شَجَرَ بَیۡنَهُمۡ ثُمَّ لَا یَجِدُوۡا فِیۡۤ اَنۡفُسِهِمۡ حَرَجًا مِّمَّا قَضَیۡتَ (4:65) ان سے کہہ دو کہ تیرے رب کی قسم! کوئی شخص ان میں سے مومن نہیں ہو سکتا تاوقتیکہ اپنے اختلافی معاملے میں تمہیں اپنا حَکَم اور ثالث مقرر نہ کرے اور پھر تمہارے فیصلے کے خلاف اس کے دل میں بھی کوئی گرانی نہ گذرے۔ ایک طرف تو مقام یہ ہے' یہ مقام ہے بحیثیت حَکَم ہونے کے۔ جب آپ کسی کو ثالث مقرر کرتے ہیں حَکَمۡ مقرر کرتے ہیں اور اسے حکم ہے کہ جب تمہارے پاس یہ آئیں تو خدا کی کتاب کے مطابق فیصلہ کروان میں۔ لیکن جہاں تک خود خدا کی کتاب کا تعلق ہے' قرآن کا تعلق ہے' رسول کہتا ہے کہ مجھے کوئی اختیار نہیں کہ میں ان میں کسی قسم کی کوئی تبدیلی کر دوں۔ اِنۡ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا یُوۡحٰۤی اِلَیَّ) (10:15 تم تو ایک طرف' میں بھی اسی کا اتباع کرتا ہوں جو میری طرف خدا کی طرف سے وحی آتی ہے۔

نبوت اور رسالت کے بلند ترین مقام پر فائز ہستی کا قانونِ خداوندی کے متعلق فرمان اور ہم

عزیزانِ من! اگلی آیت وہ ہے بیسیوں دفعہ میں سامنے لایا' سینکڑوں دفعہ سامنے لانے کی ضرورت ہے کہ اور تو اور ذاتِ

رسالت مآب ﷺ جن کے نام کی طرف نسبت سے ہم ایمان والے کہلاتے ہیں، جن کی عظمت کا بھی مقام یہی ہے کہ "بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر"۔ اس مقام کے اوپر جو فائز ہے شخصیت وہ بھی یہ کہہ رہی ہے کہ اِنِّیْٓ اَخَافُ (10:15) میں تو ڈرتا ہوں ۔کس چیز سے؟ اِنْ عَصَیْتُ رَبِّیْ ((10:15 اگر میں بھی خدا کے کسی حکم کی نافرمانی کروں تو عَذَابَ یَوْمٍ عَظِیْمٍ ((10:15 میں بھی اس کے عظیم عذاب میں گرفتار ہو جاؤں گا۔ ڈرتا ہوں کہ میں بھی اگر خدا کے کسی حکم کی نافرمانی کروں، اس کے عذاب سے میں بھی نہیں بچ سکتا۔ عزیزانِ من! یہ اعلان کرنے والا جو ہے خود اس کے متعلق اس کے بعد ہم نے یہ ایمان بنایا جو خود کہتا ہے کہ میں بھی اگر نافرمانی کروں حکمِ خدا کی تو میں بھی نہیں بچ سکتا۔ پھر ہم نے ایمان اپنا یہ بنالیا، عقیدہ اپنا یہ بنایا کہ جتنے خدا کی نافرمانی کرنے والے مجرم مسلمان ہوں گے، ان سب کو آپ ﷺ بخشوا کے لے جائیں گے۔ یعنی آپ ﷺ اپنے متعلق یہ فرما رہے ہیں جو خود اپنے متعلق یہ کہہ رہا ہے اس کی یہ صورت ہوگی کہ احکامِ خداوندی کی معصیت کرنے والے گروہ در گروہ کھڑے ہوں گے اور اس معصیت کے علی الرغم، یہ ان کو بخشوا کے لے جائیں گے؟۔ کتنی عظیم چیز ہے کہ تم تو ایک طرف رہے، میں بھی اگر خدا کے کسی حکم کی معصیت کروں گا، میں بھی نہیں بخشا جا سکتا۔ تم کہتے ہو کہ میں اس کی بجائے تبدیلی کردوں قرآن کے اندر۔ میری تو کیفیت یہ ہے کہ اگر اس حکم سے ذرا سرتابی کروں تو میں عذاب میں مبتلا ہو جاؤں چہ جائیکہ میں اس کے اندر تبدیلی کردوں۔ یہ ہے وہ ابدی ضابطہ اور آئین آپ کے پاس۔

قانون سازی کے سلسلہ میں مغربی جمہوریت کی حقیقی شکل وصورت اور اسلامی آئین کا مقام

آپ لیے پھر رہے ہیں جمہوریتیں یہاں کی، مغرب کی جمہوریت کے اندر آج اکیاون کی رائے ایک قانون کو پاس کرتی ہے۔ دو ہی ووٹیں تو چاہئیں انچاس والوں کو۔ راتوں رات سودا ہو جاتا ہے، وہ جو کہتے ہیں اکراس دی فلور، دو ووٹیں ادھر چلی جاتی ہیں۔ دوسرے دن اکیاون والے، پہلے قانون کی جگہ اس کا الٹ قانون جو ہے، نافذ کر دیتے ہیں۔ لیکن یہاں اس قانون کے ضابطے کی کیفیت یہ ہے کہ دنیا کے انسان عام تو ایک طرف رہا، خود ذاتِ رسالت مآب ﷺ یہ کہتی ہے کہ میں بھی اس میں کوئی تبدیلی نہیں کر سکتا۔ عزیزانِ من! اسلامی آئین یہ ہوتا ہے کہ جس میں اکیاون تو ایک طرف رہے، سو فیصد اور سو فیصد اس پارلیمنٹ میں بیٹھنے والے نہیں، ساری دنیا کے انسان بھی مل کے متفق علیہ طور پہ بھی چاہیں تو اس کے ایک لفظ کے اندر تبدیلی نہیں کر سکتے۔ آج بھی نہیں کر سکتے، قیامت تک نہیں کر سکتے۔ اسے کہتے ہیں ETERNAL VALUES، اسے کہتے ہیں غیر متبدل آئین۔ اسلام کا آئین مسلمانوں کی حکومت کی بنیاد ان غیر متبدل اقدارِ خداوندی کے اوپر ہے کہ جن میں تبدیلی کے متعلق رسول

اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں کہ میں بھی نہیں کرسکتا۔

مغربی جمہوریت کی پیدا کردہ مفاد پرستیوں کی یہ گریس انسان کو کہیں ٹکنے ہی نہیں دیتی

یہ تھا وہ مقام جہاں ان سے کہا۔ وہ کہتے کیا تھے؟ قرآن نے دولفظوں میں دوسرے مقام پہ یہ کہا ہے۔ وہی جو میں نے کہا ہے کہ ذرا سا تم جھکو' کچھ ہم آگے بڑھتے ہیں اور بین بین سودا ہوجائے گا۔ وَدُّوْا لَوْ تُدْهِنُ فَيُدْهِنُوْنَ ((68:9 یہ کیا لفظ دھن قرآن نے استعمال کیا ہے؟ فرش کے اوپر تھوڑی سی گریس لگا دی جائے نا تھوڑی سی تو اس فرش کے اوپر چلنے سے یہ کیفیت ہوتی ہے نا پھسلنے کی۔ اسے یہ کہتے ہیں تُدْهِنُ۔ یہ کہتے ہیں کہ کوئی بات نہیں چلو! فرش پہ تھوڑی سی گریس لگا دیتے ہیں' وہ چلنے سے تھوڑا سا تم پھسلو' تھوڑا سا ہم پھسلتے ہیں۔ عزیزانِ من! یہ مفاد پرستیوں کی گریس ہے جو لگتی ہے دین میں پھر وہ مذہب ہوجاتا ہے۔ پھر اس فرش پہ پوچھو ہی نہیں پھسل پھسل کے ''کوئی او پیا ای کوئی ایتھے پیا ہیگا ای''۔ یہ پھر پھسلن یہی نہیں ہوتی ''گوٹے گڈے بھندی ہیگی اے تے انسان نوں لمبا پا دیندی ہیگی'' پھر اس میں کھڑے ہونے کی قوت نہیں رہتی۔ جب فرشوں کے اوپر گریس لگتی ہے تو اس میں کھڑے ہونے کی قوت نہیں رہتی۔ کیا الفاظ قرآن استعمال کرجاتا ہے؟ وَ مَا يُضِلُّوْنَ اِلَّآ اَنْفُسَهُمْ وَ مَا يَشْعُرُوْنَ ((3:69 کوشش یہ کرتے ہیں کہ تمہیں قرآن سے ادھر اُدھر لے جاکے غلط راستے پہ ڈال دیں' ان کو کیا پتہ ہے کہ خود اپنی ذات کو غلط راستے کے اوپر ڈال رہے ہیں۔ وَ مَا يَشْعُرُوْنَ (3:69) بات سمجھتے نہیں ہیں' شعور نہیں رہتا۔ خوش ہو رہے ہیں کہ تمہیں بہکا رہے ہیں' تمہیں پھسلا رہے ہیں' خود اپنے آپ کو بہکا رہے ہیں۔ دو اور دو پانچ کے اوپر راضی ہوجانے والا وہ جو چھ کہہ رہا تھا یہ کیا ہے اس نے خود پھر دھوکہ دیا ہے نا اپنے آپ کو جو خوش ہو رہا ہے۔ حق پہ تو نہیں آیا' اپنے آپ کو بہکا رہے ہیں۔ يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ لِمَ تَكْفُرُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَ اَنْتُمْ تَشْهَدُوْنَ ((3:70 کہتا ہے تم مشاہدہ کر رہے ہو اس بات کا کہ خدا کے احکام کیا نتائج پیدا کر رہے ہیں۔ ان کا مشاہدہ کر رہے ہو تم اور اس کے باوجود اس سے انکار کیسے چلے جارہے ہو۔ ہمیں کہا جائے گا کہ صاحب! یہ بات ان سے تو کہی گئی تھی ہم نے تو مشاہدہ نہیں کیا لیکن کیا بات ہے قرآن کی صاحب؟ یہ کسی فرقے کے مسلمان کو پوچھیے' کسی گروہ سے پوچھیے' منبر سے سنیے' پلیٹ فارم سے سنیے۔ یہ جب بھی مثالیں دے گا صدرِ اول کے مسلمانوں نے یہ کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور صحابہؓ نے یہ کیا۔

نوٹ: ریکارڈنگ یہیں تک ہے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا ۖ إِنَّكَ أَنْتَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ (2:127)

❀...❀...❀

تیرھواں باب: سورة آل عمران (آیات 71 تا 78)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عزیزانِ من! آج دسمبر 1969ء کی 21 تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز سورۃ آلِ عمران کی 71 ویں آیت سے ہوتا ہے: (3:71)۔

سلسلۂ کلام یوں چلا آ رہا تھا کہ قرآنِ کریم کے اب مخاطب اس زمانے کے اہلِ کتاب تھے۔ اور اہلِ کتاب سے تخاطب کے معنی تھے ان کے احبار و رہبان یعنی علما اور مشائخ کو مخاطب کر کے یہ کہنا کہ انہوں نے دین میں کس قسم کی تحریف کر رکھی ہے؟ کیسی کیسی فساد انگیزیاں خدا کے نام پر برپا کی جا رہی ہیں؟ کتنے کتنے بڑے دھوکے اور فریب دیے جا رہے ہیں؟ یہی سلسلہ چلا

آ رہا تھا اور اسی کی اگلی کڑی اب ہمارے سامنے آتی ہے بلکہ چار پانچ آیتیں اس کے بعد مسلسل اسی مضمون کو لیے ہوئے آتے ہیں۔ ان سے کہا گیا کہ یٰٓاَھْلَ الْکِتٰبِ لِمَ تَلْبِسُوْنَ الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ وَ تَکْتُمُوْنَ الْحَقَّ وَ اَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ (3:71) پہلی چیز یہ کہی کہ تم حق اور باطل میں تلبیس کرتے، التباس کرتے ہو۔ لبس کے معنی ہوتا ہے کسی کے اوپر کچھ اس قسم کا کپڑا یا لباس پہنا کے اصل چیز کو دوسری چیز کے ساتھ مخلوط کر دینا، گڈ مڈ کر دینا، التباس پیدا کر دینا ان دونوں کے اندر۔ اور کتمانِ حق کے معنی ہیں حقیقت کو چھپا ہی دینا۔ وَ اَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ (3:71) دیدہ دانستہ ایسا کرتے ہو، نادانستہ نہیں، دیدہ دانستہ ایسا کرتے ہو۔

قرآنِ حکیم کی طرف سے احبار و رہبان کی پیش کردہ تصور دراصل ہر دور اور ہر قوم کے احبار و رہبان کی ترجمان ہے

میں نے جیسا کہ پچھلی دفعہ بھی عرض کیا تھا قرآنِ کریم اقوامِ سابقہ کی داستانیں بیان کرے یا ان کی مذہبی پیشواؤں کے اس قسم کے کارنامے فریب انگیزیوں کے سامنے لائے تو اس کی حیثیت تاریخی نہیں ہوتی کہ وہ کچھ پہلی اقوام کے یا پارینہ داستانیں سامنے لاتا ہے بلکہ ان داستانوں کے سامنے لانے سے مقصد یہ ہوتا ہے کہ دین جب بھی مذہب کی سطح پر اترتا ہے تو وہ ہر مقام میں ویسا ہی ہو جاتا ہے، ایک جیسا ہی ہو جاتا ہے۔ اور اس مذہب کے علم بردار وہ کسی دور میں ہوں، کسی قوم میں ہوں، کسی ملک میں ہوں ان کی بنیادی خصوصیات ان کے ہاں کے جتنے یہ نقائص و زمائم ہیں، وہ بھی زمانے کے اعتبار سے ان کا رنگ ان کی شکل شاید مختلف ہو جائے، روح ہر جگہ وہی کارفرما ہوتی ہے۔ یعنی دین بھی پہلے دن سے آخری دن تک ایک ہوتا ہے اور مذہب بھی پیکروں کے فرق کے ساتھ روح کے اعتبار سے، ہر جگہ ہر مقام پر ایک ہی جیسا ہوتا ہے اور ایک ہی جیسے نتائج پیدا کرتا ہے۔ اس لیے قرآنِ کریم نے جہاں جہاں یہود و نصاریٰ کے احبار و رہبان، علما اور مشائخ کے متعلق کچھ کہا ہے، وہ درحقیقت ہر مذہب کے مذہبی پیشواؤں کے متعلق یہی بات کہی گئی ہے۔

ہمیں قرآنِ حکیم کی طرف سے عطا کردہ نظامِ حیات کو مذہب کی متضاد خیالی سے محفوظ رکھنا ہوگا

میں پھر اسے دہرا دوں کہ دین ایک نظامِ زندگی ہے جس میں پیشوائیت جسے ہم کہتے ہیں، اس کا کوئی دخل نہیں ہوتا۔ خدا کی کتاب ضابطۂ حیات ہوتا ہے۔ اس ضابطۂ حیات کو ایک نظام آپ کے ہاں کا جسے آج کی اصطلاح میں مملکت کہا جاتا ہے، حکومت کہا جاتا ہے، اس کے ذریعے سے قانون کی حیثیت سے نافذ کیا جاتا ہے۔ یہ ہوتی ہے صحیح شکل اسلام کی۔ لیکن جب یہ چیز انفرادی بن کے رہ جاتی ہے پھر یہ مذہب کی سطح پہ اتر آتا ہے اور اس میں پھر یہی چیز مذہبی پیشوائیت اپنے ہاتھ میں لے لیتی ہے۔ یہ مذہب

ہوتا ہے خواہ وہ زمانہ قبل از اسلام کی یہودیت اور نصرانیت ہو' بدھ مت ہو' ہندو مت ہو' جو بھی ہوں وہ مذہب ہوتے ہیں وہ 478 آلِ عمران مقام پہ ہوتے ہیں ۔ اور جیسا کہ ہمارے ہاں بھی پہلے دور کے بعد پھر دین مذہب میں تبدیل ہو گیا اور وہ مذہب میں تبدیل ہوتا آج تک چلا آ رہا ہے ۔ لہٰذا یہ جتنی چیزیں یہود و نصاریٰ کے احبار و رہبان کے متعلق کہی گئی ہیں آج کی CONTEXT میں اسے اگر ہم سمجھیں گے خود ہمارے ہاں کے جو علما اور مشائخ ہیں یا جو کچھ ہمارے ساتھ ہوا ہے' یہ اس کی داستان ہے جو دہرا رہا ہے قرآن ۔ تلبیسِ حق و باطل : التباس پیدا کر دینا حق کا باطل کے ساتھ' باطل اور حق کو اس طرح سے الجھا کر دینا کہ اس میں معلوم ہی نہ ہو سکے کہ حق کہاں چھپ گیا ہے' باطل کس طرح سے آ کے اس کے ساتھ گڈ مڈ ہو گیا ہے ۔ یہ چیز وہ کرتے تھے ۔ ان کے ہاں تو یہ چیز تھی کہ کتاب اپنی اصلی شکل میں موجود ہی نہیں تھی اس لیے انہوں نے کتاب کے اندر یہ بات پیدا کر دی' خود اس کے اندر تحریف کر دی ۔ حق کے اوپر انہوں نے لبادے اوڑھا دیے اپنے خیالات کے' خود کتاب اپنی اصلی شکل میں باقی نہ رہی ۔ قرآن کی یہ خصوصیت تھی اور ہے اور رہے گی کہ اس کی حفاظت کا ذمہ خود اللہ تعالیٰ نے لیا ہے ۔ اس لیے اس کے اندر تو لفظی تحریف تو ہو نہیں سکتی' نہ ہوئی ہے نہ ہو سکے گی ۔ اور یہ خصوصیت صرف مبینہ آسمانی کتابوں میں صرف قرآنِ کریم کو حاصل ہے ۔ آج آسمان کے نیچے خدا کی بھیجی ہوئی کتابوں میں قرآن کے علاوہ کوئی کتاب ایسی نہیں ہے جو حرفاً حرفاً وہی ہو جو ان کے مذہب کے بانی کو ملی تھی ۔ لیکن ہمارے التباس کی یہ صورت ہے' وہ الفاظ کو علیٰ حالہٖ رکھتے ہوئے اس کے بعد جو اس کی تفسیریں اور تشریحیں کی جاتی ہیں' وہاں آ کے یہ التباس ہوتا ہے ۔ اوپر تو ایک آیت لکھی ہوئی ہوتی ہے قرآن کی' اب اس کے نیچے آپ پڑھیے یہاں سے وہاں تک کچھ پتا نہیں آپ کو چلے گا کہ اس میں خدا کی باتیں کون کون سی ہیں اور انسانوں کے اپنے خیالات کون کون سے ہیں ۔ پھر ان خیالات کو جو پیش کیا جاتا ہے کہ وہ بھی انسان یا شارح یا مفسر اپنے اقوال کی حیثیت سے پیش نہیں کرتا ۔ اور یہ ہے بہت بڑی دقت اور بہت بڑا التباس جو ہے حق اور باطل کا وہ اس مقام پہ آ کے ہوتا ہے ۔ میں تمہیدی الفاظ میں آپ کو بتا دوں کہ ہمارے ہاں کی تفاسیر کی تاریخ کیا ہے؟

عربی زبان میں قرآنِ حکیم کی تاریخی حیثیت اور روایات کی نوعیت

قرآنِ کریم عربی زبان میں نثر کی سب سے پہلی کتاب ہے' کوئی کتاب عربی زبان میں تھی ہی نہیں اس سے پیشتر ۔ اور ایک خاصے دور تک اسلام آنے کے بعد بھی کتاب کی شکل میں صرف قرآن ہمارے پاس تھا ۔ رسول اللہ ﷺ کی وفات کے دو اڑھائی تین سو سال بعد پہلی دفعہ ہمارے ہاں روایات مدون ہوئیں ان کو اکٹھا کیا گیا اور اس کے متعلق یہ نہیں کہ پہلے سے کوئی تحریری مواد موجود تھا' PHYSICAL MATERIAL موجود تھا جس کو اکٹھا کر کے ایک جگہ آپ نے مجموعہ یہ بنا لیا' یہ نہیں

 تھی صورت۔ بلکہ یہ روایات زبانی چلی آ رہی تھیں۔ فلاں نے ان سے سنا' انہوں نے ان سے سنا' انہوں نے ان سے سنا۔ دو اڑھائی سو سال کے بعد اب آپ دیکھیے اس چیز کو کہ اگر یہ دو سو اڑھائی سو سالوں کے بعد زبانی روایات کو کہیں اکٹھا کیا جائے اس کے متعلق کوئی بھی یقین سے یہ کہہ سکتا ہے کہ یہ پہلے کہنے والے کے اوریجنل الفاظ یہی ہیں؟ یہ نہیں کہ یہ قیاس کی بات ہے بلکہ یہ بنیادی اصول ہے روایات کا کہ ان میں الفاظ رسول اللہ ﷺ کے نہیں ہیں۔ اس لیے ہر حدیث کے پہلے لکھا ہوا ہوتا ہے قال رسول اللہ ﷺ اور آخر میں ہوتا ہے اوکما قال رسول اللہ ﷺ۔ حضور ﷺ نے فرمایا یہ یا جیسا حضور ﷺ نے فرمایا ہو۔ یعنی وہاں یہ یقینی بات نہیں ہے۔ اور روایات ان کا تواتر لفظی نہیں ہے' الفاظ نہیں آئے جیسے قرآنِ کریم کے حفظ یاد کیے جاتے ہیں اور اسی طرح سے حفاظ آگے اپنے شاگردوں کو اسی طرح سے حفظ یاد کراتے ہیں قرآن کے الفاظ۔ وہاں یہ صورت نہیں تھی وہ روایت بالمعنی ہوتی ہے یعنی مفہوم جو کسی نے سمجھا حضور ﷺ نے کچھ فرمایا' سننے والے نے اس کا مفہوم یوں سمجھا۔ اس نے یہ مفہوم اپنے الفاظ میں آگے منتقل۔ کیا اس نے پھر یہ مفہوم اپنے الفاظ میں آگے کسی کو بتایا۔ پانچ چھ اس درمیان میں راوی آئے اور یہ آخری راوی نے اس مفہوم کو جو اس انداز سے منتقل ہو کے چلا آ رہا تھا' وہ بیان کیا اس سے جنہوں نے ہی احادیث کے مجموعے مرتب فرمائے۔ تو آپ اسے دیکھ لیجیے کہ حقیقت کتنی رہ جاتی ہے؟ امکان کتنا ہے اس کے اندر التباس کا۔ دانستہ جو کچھ کیا ہے وہ الگ بات ہے۔ نا دانستہ یا نہایت ایمان دارانہ بھی کسی سے الفاظ کا مفہوم آگے اپنے الفاظ میں بیان کیا جائے' اگر منتقل کیا جائے تو سمجھنے والے کی اپنی سطح سمجھنے کے بعد اس کو EXPRESS کرنے کی' دوسرے تک منتقل کرنے کی صلاحیت۔ آپ روز درس سنتے جاتے ہیں ڈیڑھ گھنٹے تک میرا اور اب سال ہا سال سے سن رہے ہیں۔ ایک درس کو باہر جا کے RE-PRODUCE کیجیے کسی دوسرے کے سامنے بیان کیجیے۔ آپ حضرات دو تین تو یہاں جمع ہوتے ہیں جا کے ایک ایک الگ بیان کرے اور جن سے بیان کیا گیا ہے' پھر ان سے پوچھیے کہ اس نے کیا کہا تھا تو بات سمجھ میں آ جائے گی۔ اور یہ چیز جو ہے قانون میں عدالت میں اسے شہادت ہی تسلیم نہیں کیا جاتا اگر کوئی یہ کہے کہ صاحب! میں نے تو یہ واقعہ نہیں دیکھا' میں نے سنا تھا فلاں سے۔

روایات کی بنیاد پر لکھی گئی تفسیروں کی نوعیت اور معیار

یہ چیز جو تھی یہ دو اڑھائی سو سال کے بعد یہ مدون ہوئی۔ ٹھیک ہے یہ اگر الگ مجموعہ رہتا تو بھی تھا' اس کے بعد پہلی تفسیر کی کتاب آپ کے ہاں امام طبری نے لکھی۔ اسے ام التفاسیر کہا جاتا ہے۔ بڑی ضخیم کتاب ہے۔ قرآن کے تیس پاروں کی طرح تیس ہی جلدوں کے اندر ہے وہ۔ انہوں نے اپنی تفسیر میں یہ نہیں کہ اپنی طرف سے کچھ کہا ہو بلکہ قرآن کی تفسیر میں یہ کہا ہے کہ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس کے متعلق یہ فرمایا۔ اور یہ جو کچھ یہ فرمایا' یہ ان روایات سے لیا جو اس سے کچھ عرصہ پہلے مدون ہوئی تھیں۔ یہ روایات امام بخاری' 256ھ میں ان کی وفات ہوئی ہے۔ امام طبری یہ تین سو سال کے بعد کا عرصہ ہے۔ تو گویا ان سے کچھ عرصہ بعد انہوں نے یہ مدون کیا۔ اس کی بنیاد تھی یہ روایات جو اس سے پہلے جمع ہوئی تھیں۔ وہ اس طرح سے جمع ہوئیں اب ان کی بنیاد پہ امام طبریؒ نے کسی آیت کی تفسیر لکھی تو وہ لکھی کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہ فرمایا ہے۔ یعنی ان روایات میں یوں آیا ہے۔

تفسیر کے سلسلہ میں اپنی اپنی رائے کو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تفسیر قرار دے دیا گیا

اب اس کے بعد ظاہر ہے کہ جب کسی سے یہ کہہ دیا جائے کہ اس آیت کی تفسیر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یوں فرمائی ہے تو کون سا مسلمان ہے جو اس سے اختلاف کرے یا اس سے مختلف کوئی تفسیر بیان کرے۔ تصور میں نہیں کسی کے آ سکتا' سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ نتیجہ اس کا یہ کہ یہ جو پہلی تفسیر مرتب کی گئی' اس تفسیر سے کوئی مختلف تفسیر کرنا' اسے تفسیر بالرائے قرار دے دیا گیا۔ تو یہ تو اس شخص کی رائے ہے اپنی۔ قرآن کا مفہوم صحیح وہی ہے جو صاحبِ قرآن نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بیان فرمایا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ صحیح مفہوم وہی قرآن کا ہوسکتا تھا جو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بیان فرمایا۔ اصل بات یہ ہے کہ یہ جو چیز آپ روایت میں کہہ رہے ہیں کیا اس کا یقینی طور پہ کہا جا سکتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہی فرمایا تھا۔ عزیزانِ من! بات یہاں آتی ہے جو شخص کسی ایک روایت کو دیکھ کے کہتا ہے کہ یہ قرآن کے خلاف جاتی ہے' عقل کے خلاف جاتی ہے' تجربے کے خلاف جاتی ہے' یہ نبوت کی شان کے خلاف جاتی ہے' اس لیے یہ صحیح نہیں تو وہ یہ نہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے کسی قول یا ارشاد سے انکار کر رہا ہے وہ بلکہ وہ کہہ یہ رہا ہے کہ اس قول کا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف منسوب کرنا صحیح نہیں ہے' وہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا قول نہیں ہوسکتا۔ اب اگر اس پہلی تفسیر کی یہ حیثیت ہوتی تو اس سے اختلاف کیا جا سکتا تھا کہ امام طبریؒ کی یہ رائے ہے یا راویوں نے جو اپنے اپنے ذہن کے مطابق بیان کیا ہے۔ تو اس اختلاف سے آپ دوسری تفسیر مرتب کر سکتے تھے۔ لیکن جب یہ کہا جائے کہ یہ مفہوم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا بیان فرمودہ ہے تو اس کے بعد تو پھر اس کی جرأت نہیں کی جا سکتی۔

تیرہ سو سال میں لکھی گئی تفسیریں ایک ہی تفسیر ''تفسیر طبری'' کی طرحی غزلیں ہیں

نتیجہ اس کا یہ کہ اس تیرہ سو سال کے عرصے میں شمار کے اعتبار سے لیجیے' ہزارہا کی تعداد کے اندر آپ کے ہاں تفاسیر کی کتابیں ملیں گی لیکن مفہوم یا معنی کے اعتبار سے دیکھیے تو وہ بالکل طرحی غزلیں آپ کو نظر آئیں گی۔ جو امام طبریؒ کی تفسیر کے بعد لکھی

گئیں۔ صرف اس میں اندازِ تحریر کا کچھ فرق نظر آئے گی' انہی معنی کے لیے کچھ مزید دلائل اور کسی نے دے دیے ہوں گے لیکن مفہوم یہاں آ گیا ہے' اس سے ذرا ادھر اُدھر نہیں کوئی ہو سکا۔ اب یہ وہ بات ہے کہ جب آپ کسی تفسیر کو دیکھتے ہیں تو اس کے بعد جھنجھلا اٹھتے ہیں کہ صاحب! اس سے یا تو قرآن کچھ پلے ہی نہیں پڑتا اور جو سمجھ میں آتی ہے وہ تو ایسی ہے کہ جو ماننے کو جی نہیں چاہتا۔ وہ قرآن نہیں ہوتا اور اگلی چیز یہ ہے کہ وہ نبی اکرم ﷺ کی ارشاد فرمودہ تفسیر بھی نہیں ہوتی۔ لیکن اس کی نسبت کر دی جاتی ہے اس ذاتِ اقدس و اعظم ﷺ کی طرف' اس لیے اس کے خلاف کوئی شخص کچھ کہہ نہیں سکتا۔ اور اگر کوئی یہ کہتا ہے تو اس کو پھر منکرِ شانِ رسالت ﷺ کہا جاتا ہے۔ عزیزانِ من! یہ ہے بنیادی چیز ہمارے ہاں کی۔ اب یہ جو تفسیر آپ کے ہاں آئے گی آپ دیکھتے ہیں کہ اس میں حق اور باطل کا التباس کس طرح سے ہو گیا۔

قرآنی الفاظ کے صحیح مفہوم تک پہنچنے کا وہ طریق جسے قرآنِ حکیم نے خود متعین کیا ہے

قرآن کی آیات کے الفاظ تو اسی طرح سے ہیں' وہ وہاں لکھی ہوئی بھی ہیں لیکن الفاظ تک تو آپ کو کوئی پہنچنے نہیں دیتا اور ان کا جو مفہوم بیان ہو چکا ہوا ہے' وہی آپ کے ہاں اب قرآن بن کر رہ گیا ہے۔ یہ شکل ہمارے ساتھ پیدا ہوئی۔ اب قرآنِ کریم کے الفاظ کا محفوظ رہنا جو ہے عملاً اگر دیکھا جائے تو ہمارے لیے کچھ مفید نہ رہا۔ اگر تو یہ ہوتا نا کہ قرآن کے جو الفاظ موجود ہیں ان کے متعلق آپ لغت کی رو سے' تاریخ کی رو سے' عقلِ عامہ کی رو سے' علم کی رو سے' ان کے مطابق معنی متعین کرنے کے لیے آپ کو اس کی اجازت ہوتی تو پھر تو قرآن کے الفاظ آپ کے لیے کچھ فائدہ مند ہو سکتے تھے لیکن جب صورت یہ نہ ہو جو الفاظ ہیں ان کے مفہوم پہلے سے متعین شدہ ہیں اور ان سے آپ اختلاف نہیں کر سکتے تو آپ ان قوانین کے پابند ہو گئے جو آپ تک منتقل ہو کے آ رہے ہیں' ان الفاظ کے نہیں۔ عزیزانِ من! یہ ہے شکل جو ہمارے ہاں ہوئی۔ اس کا طریقہ ایک ہی ہے قرآن نے اپنے آپ کو سمجھنے کا خود طریقہ یہ بتایا ہے کہ میں نے لسانِ عربیٔ مبین میں یہ کتاب نازل کی یہ زبان اور اس کے ساتھ تصریفِ آیات۔ قرآن کا دعویٰ یہ ہے کہ میں نے اپنے تمام مفاہیم کو' اپنے معنی کو واضح کر دیا ہے اور اس کا طریقہ یہ ہے کہ ایک مقام پہ جو بات آئے گی' دوسرے مقامات میں وہ بار بار دہرائی گئی ہو گی' ان مقامات کو سب یکجا کر لیجیے تو آپ کو اس آیت کا اور ان آیات کا مفہوم متعین ہو کے آپ کے سامنے آ جاتا ہے۔ خدا نے خود کہا ہے کہ ہم نے اس کتاب کے معنی کو واضح کیا ہے۔ اور جو خدا نے واضح کیا ہے تو وہ تو بہر حال اسی قرآن کے اندر اس کی وضاحت آ جائے گی نا۔ اگر اس طرح سے قرآنِ کریم کے معنی کو سمجھا جائے تو وہ تفسیر القرآن بالقرآن کہلائے گی قرآن سے قرآن کا سمجھنا جو ہے۔ اب اس کو یوں سمجھ لیجیے اور پھر آپ کے ہاں جتنا اس تیرہ سو سال کے اندر

آپ کے ہاں قرآن کے متعلق لٹریچر آیا ہے خواہ وہ امام طبریؒ کی تفسیر ہو خواہ وہ روایات ہوں ان کو دیکھیے ۔ جو چیزیں ان میں آلِ عمران 478 کے مطابق ہوں جو قرآن نے کہا ہے ان کو ہم کہہ سکتے ہیں کہ یہ نبی اکرم ﷺ کی بیان فرمودہ ہے‘ اسے ہم کہہ سکتے ہیں کہ وہ صحیح ہے۔ اور جو اس کے خلاف جاتا ہے ہم کہیں گے کہ ان کی نسبت حضور ﷺ کی طرف غلط ہے۔ سمجھنے والوں نے یا بات سمجھی نہیں یا سمجھنے کے بعد وہ صحیح طور پر آگے اس کو سمجھا نہیں سکے ۔ یہ اگر چیز تسلیم کر لی جائے تو آپ دیکھیں گے کہ پھر قرآنِ کریم کے معنیٰ‘ مفہوم ہر دور میں علمِ انسانی کی سطح کے ساتھ ساتھ بلند سے بلند تر ہوتے چلے جائیں گے ۔ قرآن نے تو خود کہا تھا کہ ہم اپنی آیات اپنی نشانیاں تمہیں انفس و آفاق میں دکھاتے جائیں گے حَتّٰی یَتَبَیَّنَ لَهُمْ اَنَّهُ الْحَقُّ (41:53) تا آنکہ اس طرح سے یہ حقیقت واضح ہو جائے گی کہ قرآن واقعی الحق ہے۔

قرآنِ حکیم کی تفسیر بیان کرنے والے کا فریضہ

عزیزانِ من! انفس و آفاق کی نشانیوں کے تابع قرآن کے معنیٰ متعین ہوں گے اور وہ بھی کسی فرد کا کسی دور کا سمجھا ہوا قرآن کسی دوسرے کے لیے سند اور حجت نہیں ہوگا‘ نہ آنے والے دور کے لیے اس کی پابندی ہوگی کہ وہ اس سے ہٹ نہیں سکتا۔ قرآن اپنی جگہ موجود ہے۔ قرآن کو کسی نے جو سمجھا ہے‘ اس سمجھنے کے لیے یہ نہیں ہے کہ وہ سند اور حجت ہو جائے گا کسی دوسرے کے لیے یا آنے والے ادوار کے لیے۔ یوں قرآنِ کریم کے معنیٰ‘ تفاسیر علمِ انسانی کی سطح کے بلند اور وسیع ہونے کے ساتھ ساتھ وسیع اور بلند ہوتے چلے جائیں گے۔ اگر یہ نہیں ہوگا تو وہ تَلْبِسُوْنَ الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ (3:71) التباس ہے حق اور باطل کا۔ اور تفسیر لکھنے والے کے لیے بھی نہایت ضروری ہے کہ وہ یہ نہ کہے کہ یہ تو قرآن کی ہے بلکہ یہ کہے کہ اس سے میں یہ سمجھا ہوں اور اس کی اپنی سند کی یہ بات الگ ہو جانی چاہیے قرآنِ کریم کے اس مفہوم سے۔ یہ التباسِ حق و باطل ہے۔ وَتَکْتُمُوْنَ الْحَقَّ (3:71) اور تم پھر حق کو چھپاتے ہو۔

ہمارے ہاں کتمانِ حق کے سلسلہ میں بخاری شریف کی ایک روایت اور تصوف کی بنیاد

یہ کتمانِ حق اس سے بھی بڑی چیز ہے۔ وہاں تو یہ تھا کہ کتاب کا کچھ حصہ جو ہے انہوں نے بیچ میں سے نکال کے چھپا ہی لیا‘ الگ رکھ لیا۔ ہمارے ہاں یہ جو چیز ہوئی اس کا انداز ایک اور ہو گیا۔ میں نے کہا ہے قرآن نے احبار اور رہبان دونوں کہے ہیں۔ احبار تو حَبر ہے علما جن کو کہتے ہیں‘ رہبان مشائخ ہیں جو تصوف میں ہوتے ہیں۔ یہ تصوف ہمارے ہاں یہودیوں کے ہاں

سے آیا۔ ان کے رہبان تھے یہ کیا کرتے تھے؟ یہ جو کرتے تھے اس کو چھوڑیے۔ ہمارے ہاں یہ کیا چیز ہوئی؟ ہمارے ہاں ایک حدیث ہے بخاری شریف کی' روایت ہے حضرتِ ابو ہریرۃ ؓ نے یہ کہا ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے دو بند برتن پائے تھے ایک برتن کے CONTENTS جو تھے جو کچھ اس میں تھا وہ میں نے آپ لوگوں کے سامنے ظاہر کر دیا۔ اگر دوسرے برتن کا میں منہ کھول دوں تو میرا گلا کٹ جائے۔ یہ موجود ہے۔ تو گویا آدھا حصہ اگر برابر برابر بھی تھا ان دو برتنوں میں تو وہ ایسا ہے کہ جس کا بند کھولنے یا ڈھکنا کھولنے کی ضرورت انہوں نے بھی نہ کی جن کو رسول اللہ ﷺ نے یہ چیز منتقل کی تھی۔

تصوف کی تعلیم کا ماحصل اور مولانا رومؒ کا ایک شعر

آپ کہیں گے کہ بات تو کچھ ایسی ہے' آخر پھر اس کے بعد ہوا کیا؟ اتنا کچھ ہوا اس کے بعد اس اینٹ کے اوپر جو بنیاد اٹھی ہے یہ آپ کے تصوف کے ہاں مسلمہ ہے کہ قرآن کے معنی وہ نہیں ہیں جو ان الفاظ کے معنی ہیں۔ قرآن کے باطنی معنی ہیں جو ان کے نیچے چھپے ہوئے ہیں' وہ نہ لغت کے محتاج ہیں' نہ روایات کے محتاج ہیں' نہ عام تفاسیر کے محتاج ہیں' نہ زبان کے محتاج ہیں۔ صاحب! یہ کیسے اس کے یہ معنی ہو گئے؟ یہ ارض ہے جی اس کے معنی کیا ہے؟ وحدتِ وجود ہے اس کے معنی۔ صاحب! یہ کیسے اس کے یہ معنی ہو گئے؟ کہنے لگے یہ اس برتن میں تھے جو ڈھکنا کھلا نہیں تھا۔ آپ کو کیسے علم ہو گیا؟ یہ چیز قرآن کے باطنی معنی سینہ بہ سینہ منتقل ہوتے چلے آ رہے ہیں۔ ان کے ہاں صدری علم آپ کو معلوم ہے نا وہ سینہ بہ سینہ منتقل ہوتے ہیں۔ وہ اندر ہی ان کی تعلیم دی جاتی ہے۔ یہ ہے وہ چیز۔ اور پھر اس کی حیثیت کیا ہے؟ مولانا روم کے الفاظ میں کہ

ما ز قرآں مغز را برداشتیم
استخواں پیشِ سگاں انداختیم

قرآن کا جو مغز ہے وہ ہم نے لے لیا ہے' یہ باطنی معنی جو ہیں۔ اور یہ جو باقی الفاظ رہ گئے ہیں (معاذ اللہ) یہ تو ہڈیاں ہیں جو ہم نے کتوں کے آگے پھینک دی ہیں۔ اللہ اکبر۔ گویا اللہ تعالیٰ نے ان ہڈیوں کی حفاظت کا ذمہ لے لیا تھا اپنے ہاں۔ مغز تو یہ لے گئے نا بیچ میں سے' اب یہ جو الفاظِ قرآن کی حفاظت ہو رہی ہے تو ان کی تو حقیقت یہ رہ گئی۔

شیخ اکبر ابنِ عربیؒ تصوف کے سرخیل کی طرف سے باطنی معنی پر مبنی سو جلدوں پر پھیلی قرآنی تفسیر میں فتوحاتِ مکیہ یا فصوص الحِکم

 ان کے ہاں سارے قرآن کے معنی اور تفسیر باطنی طور پر یہ کیے جاتے ہیں۔شیخ اکبر ابنِ عربی یہ سرخیل ہیں ہمارے ہاں تصوف کے سب سے بڑے۔وہ اگرچہ آج موجود نہیں اپنی اصلی شکل میں' کہا جاتا ہے سو جلدوں میں انہوں نے قرآن کی تفسیر لکھی' ساری باطنی معنی کے اعتبار سے۔اور جو اس کا حصہ ان کی تصانیف میں موجود ہے فتوحاتِ مکیہ یا فصوص الحکم وغیرہ آپ دیکھیے افو ہو! آپ بالکل ناطقہ سر بہ گریباں کہ اسے کیا کہیے۔لیکن اس کی سند اور حجت؟ سند اور حجت وہ کہتے ہیں کیا مانگتے ہو'یہ سینہ بہ سینہ علم چلا آ رہا ہے۔ان کے فصوص الحکم میں یہ بات ہے کہ صاحب! قرآن کی یہ آیت ہے' حدیث میں یہ آیا ہے۔چلو وہاں تک تو تم آ ؤ کہ وہاں کی ہی کوئی سند تم دے دو' مفسرین نے اتنا تو کیا تھا۔انہوں نے کہا ہے کہ ہم بھی سند دیتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی لیکن تمہاری طرح نہیں۔تین سو سال کے بعد سنی ہوئی باتیں روایت کرتے ہو' جس طرح سے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہر رات خدا سے پوچھ کے قرآن کی آیت کی تفسیر کرتے تھے اور وہ صحیح معنوں میں پہنچی نہیں ہے آ گے' راویوں کے ذہن میں خلط ملط ہو گیا۔ہم براہِ راست اسی مقام سے خدا سے معنی پوچھتے ہیں۔تو ہم تو روز خود پوچھتے ہیں اور تم تین سو سال کے بعد پوچھی ہوئی باتیں راویوں کی رو سے آئی ہوئی' ان کا اعتبار کرتے ہو۔کس کی بات زیادہ مستند ہے؟ یہ فصوص الحکم میں وہ لکھتے ہیں کہ ہم اسی مقام سے لیتے ہیں جس مقام سے رسول لیتا تھا۔اور معنی پھر جو ہیں میں نے عرض کیا ہے کہ وہ ذرا اٹھا کے دیکھیے کتابیں پھر آپ دیکھیں گے کہ وہ کیا کیا''اوہدے اچ باتاں پایاں ہویاں ہیگیاں''۔وہ ٹھیک ہے یعنی کسی لفظ کو جب آپ کہیں گے باطنی معنی' یہ ہیں نہ زبان میں وہ معنی' نہ اس کے ہاں قرآن کی کوئی سند حتیٰ کہ نہ تفسیر کی سند نہ کوئی حدیث کی سند یہ کتمانِ حق نہیں ہے؟ اس سے بڑا کتمانِ حق تو کبھی کسی کے تصور میں نہیں آ سکتا۔

فتوحاتِ مکہ اور یہودیوں کے تصور کے مطابق تورات کے معنی میں مماثلت

بعینہٖ یہی چیز یہودیوں کے رہبان کے ہاں تھی۔یہ شیخ اکبر ابن عربی نے جو فتوحاتِ مکیہ لی ہے تو وہ کتاب قریباً قریباً وہی ہے' یہودیوں کے تصور میں کتابِ زہار کہلاتی تھی۔اس میں ساری تورات کے معنی جو تھے باطنی طور پہ دیے گئے تھے۔یہ دونوں ہی چیزیں ان کے ہاں تھیں: روایات کی رو سے تفسیر۔یہودیوں کے ہاں یہ چیز تھی کہ حضرتِ موسیٰؑ کو تو یہ وحی ملی تھی جو تورات میں ہے۔حضرتِ ہارونؑ اور ان کی اولاد کو دوسری وحی ملی تھی جو روایات میں ہے۔لہٰذا موسیٰؑ کی وحی کی تفسیر' ہارونؑ کی وحی کی رو سے کی جائے گی۔ان کے ہاں یہ چیز تو تھی تفسیر روایات کی رو سے اور ان کے جتنے یہ رہبان تھے انہوں نے یہ کتابِ زہار وغیرہ تصوف کی لکھی تھیں باطنی معنی کی رو سے تورات کی تفسیر۔آپ دیکھتے ہیں کہ لفظاً لفظاً مال بہ مال آپ کے ہاں وہی ہو رہا ہے جو پہلے اہلِ

کتاب کے ہاں ہوا تھا۔ وَ تَكۡتُمُوۡنَ الۡحَقَّ وَ اَنۡتُمۡ تَعۡلَمُوۡنَ (3:71) عوام تو نہیں جانتے ان چیزوں کو' وہ جو کرنے والے تھے تو کہا ہے کہ تم جانتے ہو اس چیز کو اور اس کے باوجود ایسا کرتے ہو۔ آپ دیکھیں گے جتنے قدامت پرست ہمارے ہیں ان میں بیشتر تو وہ ہوتے ہیں جنہیں خود پتا بھی نہیں ہوتا۔ ان سے جو کہا جاتا ہے' وہ اسی وقت مان لیتے ہیں' تسلیم کر لیتے ہیں۔ اس سے آگے ان کا مبلغِ علم ہوتا ہی نہیں ہے۔ لیکن ان میں وہ لوگ بھی ہوتے ہیں جو جانتے ہیں اس چیز کو لیکن اس کے باوجود یہی چیزیں پیش کرتے ہیں ان کے اپنے مفاد وابستہ ہوتے ہیں اس کے ساتھ۔ وَ اَنۡتُمۡ تَعۡلَمُوۡنَ ۝ وَ قَالَتۡ طَّآئِفَةٌ مِّنۡ اَهۡلِ الۡكِتٰبِ اٰمِنُوۡا بِالَّذِیۡۤ اُنۡزِلَ عَلَى الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَجۡهَ النَّهَارِ وَ اكۡفُرُوۡۤا اٰخِرَهٗ لَعَلَّهُمۡ یَرۡجِعُوۡنَ (3:72) اب یہ سب سے زیادہ خطرناک وادی آئی ہے۔ پہلی چیز تو یہ تھی کہ ان چیزوں کو پیش اس طرح سے کرو ملاؤ اپنے خیالات کو' افسانوں کو' داستانوں کو۔ اگلی چیز یہ آئی کہ اس سے بھی کام نہیں چلے تو یوں کرو کہ یہ جماعتِ مؤمنین میں مسلمان بن کے شامل ہو جاؤ۔ لکھا یہ ہے کہ صبح کے وقت مسلمان بنو اور ان کے اندر چلے آؤ دن بھر ان کے اندر رہو۔ DISPARAGE COMPAIGN: سنا تم نے کچھ اس کے متعلق بھی! یہ دیکھنا یہ جو میں کہہ رہا ہوں بڑی مستند خبر ہے' معتبر ذریعے سے آئی ہے' یہ چیز جو ہے اور دیکھو یہ کچھ ہو رہا ہے یہ اندر' تمہیں معلوم نہیں ہے ہم تو اندر سے آئے ہیں' درونِ خانہ کی ساری باتیں جانتے ہیں' یہ ہو رہا ہے یہاں جو کچھ بھی ہو رہا ہے۔ لیکن ہمیں آپ کو اس سے کیا غرض اپنے تک ہی رکھیے گا آگے' نہ کیجیے گا خوامخوہ کے لیے ہم کسی کی غیبت کیوں کریں۔ وہ کہہ کے چلے گئے اس نے آگے سے پہنچایا' بڑے معتبر ذریعے سے ملی ہے خبر صاحب! اپنے تک ہی رکھیے گا بات نہ کیجیے گا۔ یہ COMPAIGN انسان کو ایسے تباہ کر کے رکھ دیتی ہے۔ آپ دیکھتے ہیں کہاں یہ چیز آئی ہے؟ یہ تلقین کر رہے ہیں وہ اپنے لوگوں سے کہ کرو یہ کہ صبح کے وقت ان کے اندر جاؤ اٰمِنُوۡا مسلمان بن کے جاؤ ان کے اندر' ان کے اندر رہو شام کو واپس آؤ۔ دیکھیے قرآن کیا کہتا ہے؟ **لَعَلَّهُمۡ یَرۡجِعُوۡنَ** (3:72) اس سے ہوسکتا ہے کہ ان میں سے بھی کچھ لوگ بددل ہو کے اور اسی طرح سے تمہارے ساتھ واپس آ جائیں۔ اور اگر واپس نہ بھی آئیں تو جو باتیں تم وہاں چھوڑ آئے ہو' آہستہ آہستہ وہی چیزیں ان کے معتقدات و نظریات بن جائیں گے۔

ہمارے ہاں لکھی جانے والی تاریخ مسلمانوں کی تاریخ ہے نہ کہ اسلام کی

عزیزانِ من! اگر کبھی اسلام کی تاریخ آپ کے سامنے آئے' یہ تاریخ جو ہمارے ہاں ہے یہ مسلمانوں کی تاریخ ہے اس قوم کی تاریخ ہے۔ سوال یہ ہے کہ اسلام پہ کیا بیتی' یہ کیا تھا اور آج یہ جو کچھ بن گیا ہے' یہ کیسے بنا؟ اس میں آپ دیکھیں گے التباسِ حق و باطل' کتمانِ حقیقت اور یہ تیسری چیز یہ سازش: مسلمان ہو کے ان کے اندر آؤ۔ آپ دیکھیں گے کہ آپ کے موجودہ

مذہب کے معتقدات کا کم از کم ستر اسی فیصد حصہ وہ ہے جو غیر مسلموں کے معتقدات تھے اور اس طرح آئے کہ وہ خود مسلمان ہوگئے 478 آلِ عمران آپ کے ہاں آئے۔ آپ کے ہاں کی بڑی معتبر مستند کتابیں بھی جو سمجھی جاتی تھیں، تحقیق کرنے کے بعد معلوم ہوا کہ یہ صاحب تو آپ کے اندر اس مقصد کو لے کے آئے ہوئے تھے۔ سارے معتقدات آپ کے ہاں کے کوئی یہودیوں کے' کوئی نصرانیوں کے' کوئی مجوسیوں کے چلے آئے ہیں آپ کے ہاں۔ رفتہ رفتہ وہ آپ کے ہاں کا معمول بن گئے اور سند آپ کے ہاں ہوگئی کہ اسلاف سے یہ چیز ہمارے ہاں آ رہی ہے۔ ایک آپ کے سند یہ ہے جو چیزیں یعنی کچھ پرانی ہوجائیں وہ خود آپ کے ہاں مستند ہوجاتی ہے۔ آج کا جھوٹ جھوٹ ہے یہ جھوٹ اگر منتقل ہو کے آگے سو برس تک چلا جا رہا ہے تو یہ سچ ہوجاتا ہے پھر۔ سند اس کی یہ ہے کہ صاحب! منتقل ہوتا چلا آ رہا ہے۔ اس سے آپ دیکھتے ہیں قدامت پرستی اور اسلاف پرستی کتنی آجاتی ہے۔

ہمارے ہاں مروجہ اسلام کی اکثر بنیاد غیر قرآنی اور غیر اسلامی نظریات کی رہینِ منت ہے

عزیزانِ من! قرآن تو حق پرستی کے لیے آیا تھا۔ ابھی آیت آتی ہے اتنی جلیل القدر آیت کہ جس میں اس نے کہا ہے کہ کسی شخصیت کو یہ حق حاصل نہیں ہے کہ وہ اپنے طور پہ کسی سے کوئی بات منوالے۔ شخصیت پرستی کو تو قرآن نے کاٹ کے رکھ دیا ہے۔ یہاں سند ہوجاتی ہے ہمارے ہاں شخصیت پرستی۔ صبح کے وقت ان میں جاؤ' شام کے وقت وہاں سے نکل آؤ۔ دن بھر چپکے چپکے نہایت معتبر مسلمان بنے ہوئے' یہ خیالات پھیلاتے چلے جاؤ۔ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ (3:72) دو معنی اس کے ہوسکتے ہیں کچھ تو یہ کہ ہوسکتا ہے کہ اس کے ساتھ آپ کے یوں آجائیں اور دوسرے یہ کہ ہوسکتا ہے کہ زمانہ قبل از اسلام کے جتنے وہ معتقدات تھے ان کی طرف پلٹ کے چلے جائیں یہ پھر۔ یہ يَرجِعُوْنَ (3:72) یہ چیز ہے پھر لوٹ کے وہیں آجائیں۔ اور آپ کے مروجہ اسلام میں آپ دیکھیں گے کہ جیسا میں نے عرض کیا ہے کہ کم از کم اتنا حصہ قبل از اسلام کے مذاہب جو تھے ان کے معتقدات و نظریات و خیالات و تصورات کا اتنا حصہ آپ کے ہاں عینِ اسلام بن گیا ہوا ہے۔ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ (3:72) تا کہ یہ پلٹ کے واپس وہیں جا پہنچیں جو اسلام سے پہلے کا دور تھا' کہا یہ بھی کرو۔ پھر اگلی چیز ان کو تلقین کی جاتی ہے۔ میں نے عرض کیا تھا آپ دیکھ لیجیے قدم بہ قدم کس طرح سے یہ ساری چیزیں ہم پہ منطبق ہو رہی ہیں جو قبل از اسلام کے اہلِ کتاب کے متعلق اور ان کے احبار و رہبان کے متعلق کہی جا رہی ہیں۔ کہا وَ لَا تُؤْمِنُوْٓا اِلَّا لِمَنْ تَبِعَ دِيْنَكُمْ (3:73) اپنی پارٹی کے علاوہ کسی شخص پہ قطعاً اعتماد نہ کرو' کسی کی بات کا یقین نہ کرو' مانو ہی نہیں۔ جو تمہارے ساتھ ہے' تمہارے ہاں کا آدمی ہے' تمہاری پارٹی کا ہے' تمہارے دین پہ ہے' تم سے ہم عقیدہ ہے' ہم آہنگ ہے' ہم فکر ہے' بس قابلِ اعتماد اس کو سمجھو۔ اس کے علاوہ یہ جو دوسرے لوگ ہیں' ان کی کسی بات پر اعتماد مت

کرو۔ اب یہ دیکھیے کہ جن کو یہاں بھیج رہے ہیں وہ کہ جاؤ صبح کو اوران کے اندر جا کے ملؤ تلقین ان سے یہ کی جا رہی ہے کہ ہو 478 آلِ عمران
ہے کہ وہاں تم جاؤ اندر تو ان کی اچھی باتیں تمہیں نظر آئیں تو ہوسکتا تھا کہ یہ وہاں متاثر ہوجائیں۔ انہیں پہلے ہی PREJUDICE MIND سے بھیجا جاتا ہے کہ ان میں سے کسی کی بات پہ اعتماد نہ کرنا۔ پھر انہیں یہ تلقین کی جاتی ہے۔

حق پر قائم رہنے کے لیے باطل کی مختلف چالوں سے محفوظ رہنے کی تلقین

آپ دیکھیں گے آیت اگر آپ کے سامنے قرآن ہے کھلا ہوا' درمیان میں ایک ٹکڑا آتا ہے **قُلْ اِنَّ الْهُدٰى هُدَى اللّٰهِ** (3:73) یہ انداز ہے اس کا تعلق آگے جاکے آئے گا' درمیان میں سمجھ لیجیے کہ یہ ایک بریکٹ کے اندر چیز آئی ہوئی ہے۔ ان کی بات یوں ہے کہ وہ ان سے کہتے ہیں کہ ان میں سے کسی کی بات نہ ماننا' بات اپنوں کی ماننا' ان کی نہ ماننا۔ **اَنْ يُّؤْتٰٓى اَحَدٌ مِّثْلَ مَآ اُوْتِيْتُمْ** (3:73) یہ سمجھ لینا کہ کبھی یہ نہ دل میں تمہارے آجائے کہ صاحب ہمارے پاس بھی خدا کی طرف سے صحیح دین آیا تھا ان کی طرف بھی خدا کی طرف سے صحیح دین آیا ہے' چلو موازنہ کرکے پرکھ کے دیکھ تو لیں' شاید ان کے پاس کچھ حقیقت ہوگی' یہ نہ دل میں کبھی سمجھ لینا۔ جو کچھ تمہیں ملا ہے کسی اور کو نہیں وہ ملا۔

بہتر فرقوں کے تصور کا تجزیہ غور وفکر کا متقاضی ہے

وہ جو قرآن نے کہا تھا کہ جب دین فرقوں میں بٹ جاتا ہے تو پھر اس کے بعد ہوتا یہ ہے کہ **كُلُّ حِزْبٍۭ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُوْنَ** (30:32) پھر ہر گروہ جو کچھ اس کے پاس ہوتا ہے وہ کہتا ہے' یہ حق ہے اور باقی سب باطل ہے۔ تہتر فرقے ہوں گے ایک ان میں سے جنت میں جائے گا اور بہتر سارے جہنم میں چلے جائیں گے اور ہر فرقہ یہ کہتا ہے کہ ہم جنت میں جانے والے' باقی جہنم میں جانے والے۔ اگر ہر فرقہ سچا ہے تو وہ تو تہتر کے تہتر جنت میں چلے گئے' جہنم میں کون جائے گا؟ اور اگر کسی ایک کی بات بھی غلط ہے تو تہتر کے تہتر جہنم میں چلے گئے۔ اور قرآن تو یہ کہتا ہے کہ خود یہ فرقوں کے اندر بٹ جانا شرک ہے کسی دین کا **وَلَا تَكُوْنُوْا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ O مِنَ الَّذِيْنَ فَرَّقُوْا دِيْنَهُمْ وَكَانُوْا شِيَعًا** (30:31-32)۔ اس میں ہوتا یہ ہے یہ جو ان کو تلقین کی جا رہی ہے کہ کہیں ذہن میں یہ بات نہ لے آنا کہ یہ جو دوسرا فریق ہے جس کے ہاں تمہیں بھیجا جاتا ہے ان کے ہاں بھی سچائی ہے' ان کے ہاں بھی صداقت ہے' ان کے ہاں بھی کوئی سچی بات ہے' اچھی بات ہے' بالکل نہیں۔ صداقتیں سچائیاں اچھی بات جتنی ہے وہ ساری سمٹ کے تمہارے پاس آگئیں کوئی ایک بات بھی دوسرے کے ہاں نہیں۔

فرقہ بندی کی موجودگی میں ''رکوع کرو رکوع کرنے والوں کے ساتھ'' کا قرآنی حکم کب اور کہاں پورا ہوگا؟ 478 آلِ عمران

عزیزانِ من! وہ تو دوسرے مذہب والے ان مذہب والوں کے متعلق یہ کہہ رہے تھے۔ آپ اپنے ہاں کے فرقوں کے اندر یہ دیکھ رہے ہیں۔ کتنا ہی اچھا آپ کا کریکٹر' سیرت' اخلاق ہو' کسی مسجد میں جا کے جہاں کے نماز پڑھنے والے ہاتھ مثلاً چھاتی پہ باندھتے تھے' وہاں نیچے ہاتھ باندھ لیجیے بس اتنا کچھ کیجیے اور اس کے بعد پھر دیکھیے کہ آپ کی کسی ایک خوبی کا بھی اعتراف کیا جاتا ہے؟ ذرا سا کسی سے اختلاف کر دیجیے کسی عقیدے کی جزو میں چھوٹے سے چھوٹے میں' سر سے پاؤں تک کیڑے ڈالے جائیں گے آپ میں' کوئی خوبی باقی نہیں رہے گی۔ یہ مانا ہی نہیں جائے گا کہ ان کے ہاں بھی کوئی چیز اچھی ہو سکتی ہے نہ ان کے مسلک میں' نہ مؤقف میں' نہ ان کے ہاں جس راستے پہ چل رہے ہیں اس میں' نہ ان کی عبادات میں' نہ ان کے اخلاق میں کچھ نہیں' وہ تو مناپلی ہو جاتی ہے اپنے گروہ کی۔ اور اس سے آگے بڑھیے تو آج کل تو یہ مذہبی فرقہ بندیاں پیچھے سمٹ گئی ہیں کیونکہ وہ بھی سیاست میں آ گئے۔ سیاسی پارٹیوں میں آپ دیکھیے آج تک ایک شخص جو ہے آپ کے ہاں نہایت دیانت دار' معتبر' اخلاقِ حسنہ کا پابند' دنیا بھر کی خوبیاں اس میں۔ بدقسمتی سے اگر وہ دوسرے دن کسی دوسری پارٹی کو جوائن کر لیتا ہے' قدِ آدم پوسٹر شائع ہوتے ہیں ساری زندگی اس شخص نے منافقت کی ہے' کوئی خوبی اس میں نہیں' دنیا بھر کے معائب اور اس میں بد اخلاقیاں گن گن کر گنائی جاتی ہیں۔ اور یہ چلا جا رہا ہے یہ پروپیگنڈہ۔ پھر اس کے اگر دوبارہ یہ پلٹ آئے ہیں تو اس کے بعد پھر وہ سب سے بڑے امام بنتے ہیں صاحب آپ کے ہاں۔ کوئی نہیں پوچھتا کہ چھ مہینے پہلے آپ کیا کہہ رہے تھے ان کے متعلق۔ چھ چھ مہینے نہیں عمر کے آدھے آدھے حصے لوگوں نے گذارے ایک جماعت کے ساتھ اس کے بعد ان کو کسی معاملے میں اختلاف ہوا' اختلاف سے وہ الگ ہوئے۔ بس اس چیز کے کہ وہ الگ ہوئے ہیں وہ لوگ جو ان کے ہاں امامت کے قابل سمجھے جاتے تھے' امارت کے قابل سمجھے جاتے تھے' دنیا بھر کی برائیاں اب ان کے اندر پیدا ہو گئی ہیں۔ دیکھا آپ نے یہ گروہ بندی کا نتیجہ کیا ہوتا ہے؟ یہ تھی وہ تلقین جو وہ کر کے بھیجتے تھے کہ کہیں ذہن میں یہ نہ سمجھ لینا کہ جو کچھ تمہیں ملا ہے' اس جیسا ان کو بھی کہیں مل گیا ہوا ہے۔ یہ ہیں وہ گروہ بندانہ تعصب جسے کہتے ہیں' عصبیتِ جاہلیہ جسے قرآن نے کہا ہے کہ کسی چیز کو آن میرٹ نہ لو۔ پہلے سے ہی ذہن میں فیصلہ کر کے آگے جاؤ پھر تم۔ جاؤ صبح کے وقت ان میں ایمان دار بن کے' ایمان لے آؤ لیکن ذہن میں یہ سمجھ لو کہ کوئی حقیقت' صداقت' سچائی' حسن' خوبی ان کے ہاں نہیں ہے' وہ سب تمہارے ہی ہاں ہے۔ اَوْ يُحَآجُّوْكُمْ عِنْدَ رَبِّكُمْ (3:73) اس لیے کہ اگر تم

نے یہ تسلیم کرلیا کہ ان کے ہاں بھی کچھ سچائیاں ہوسکتی ہیں تو پھر تو وہ خدا کے ہاں تمہارے ساتھ جھگڑا کرسکیں گے کہ صاحب! آلِ عمران 78 جب تسلیم تھا کہ ہمارے ہاں بھی خدا کی طرف سے دیا ہوا کوئی دین کا حصہ ہے' انہوں نے اس کی مخالفت کی تھی اس لیے سرے سے مانو ہی نہیں کہ ان کے ہاں کوئی بات حق کی ہے تاکہ تمہارے خلاف یہ حجت بن نہ سکیں۔

دنیا بھر کے انسانوں کے اختلافات کا حل خدا کی آخری کتاب ''القرآن'' کو الھدیٰ تسلیم کرنے میں ہے

اب اس کا جواب آیا ہے' اس زمانے کا جواب نہیں' قیامت تک کے لیے جواب' قرآن کی تو ہر چیز قیامت تک کے لیے ہے۔ جواب سنیے میں کہتا ہوں کہ اگر اس چیز کو آج بھی ہم اپنے ہاں رکھ لیں' آپ دیکھیے گا کہ روزمرہ کے یہ سر پھٹول اور مخالفتیں اور مقدمے بازیاں کیسے ختم ہوتی ہیں۔ چار لفظوں میں بات کہی قُلْ اِنَّ الْهُدٰى هُدَى اللّٰهِ (3:73) مدعی تو ہر ایک ہے' دعوے دار تو ہر ایک ہے کہ صحیح راستے پہ ہم ہی ہیں' دوسرے نہیں ہیں۔ اس نے کہا کہ کوئی بات نہیں' نہ کسی ایک فرد کی بات نہ دوسرے کی بات' الْهُدٰى (3:73) جو ہے THE RIGHT PATH وہ جو ایک ہی ہوسکتا ہے اِنَّ یقینی چیز یہ ہے کہ الْهُدٰى (3:73) جو ہے وہ تو صرف وہ ہوسکتی ہے جو خدا نے دی ہوئی ہے۔ عزیزانِ من! اگر آج بھی اس اصول کو تسلیم کرلیا جائے کہ اِنَّ الْهُدٰى هُدَى اللّٰهِ (3:73) آپ دیکھتے ہیں کیسے بات صاف ہوجاتی ہے۔ غیر مسلموں کے لیے تو دقت تھی کہ ھدی اللہ جو تھی' خدا کی راہنمائی جو تھی انہیں اپنی منزہ شکل میں کہیں اور سے مل نہیں سکتی تھی کہ اپنی اصلی شکل میں تو کتاب ان کے پاس موجود نہیں تھی' وہ کہاں ڈھونڈنے جاتے۔ لیکن ہم تو اس باب میں بڑے خوش قسمت واقع ہوئے ہیں کہ اِنَّ الْهُدٰى هُدَى اللّٰهِ (3:73) ہدایت صرف خدا کی طرف سے دی ہوئی ہدایت ہے اور وہ قرآن ہے جو ہمارے پاس موجود ہے۔ اس کو اگر آپ بنیاد مان لیں' اصل مان لیں' حجت مان لیں' معیار مان لیں' باقی ساری چیزیں اس کے اوپر آکے پرکھتے چلے جایے۔ جو اس راہنمائی کے مطابق ہے صحیح ہے' جو اس کے خلاف جاتا ہے' غلط ہے' جھگڑا ختم ہوا۔ جب بھی فریقین کے درمیان ایک چیز بطور معیار کے قدرِ مشترک تسلیم کرلی جائے تو جھگڑا ختم ہوجاتا ہے اس کے بعد۔ اِنَّ الْهُدٰى هُدَى اللّٰهِ (3:73)۔

بنی اسرائیل یعنی یہودیوں کا دعوائے نبوت جو نسلی قرار پا گیا اس کا نتیجہ

اب ان کے ہاں اعتراض یہ تھا کہ صاحب! یہ نبوت بنی اسماعیل کے ہاں کیوں آ گئی‘ یہ تو بنی اسرائیل کے ہاں رہنی چاہیے تھی۔ یہودیوں کے ہاں نبوت قومی تھی وہ نسلی تھی‘ وہ بنی اسرائیل کے اندر اس کو مختص سمجھنا چاہتے تھے۔ حضرتِ ابراہیمؑ کے دو بیٹے حضرتِ اسماعیلؑ اور حضرتِ اسحاقؑ تھے۔ حضرتِ اسحاقؑ کی اولاد میں حضرتِ یعقوبؑ تھے ان کا لقب تھا اسرائیل‘ ان سے جو نسل آ گے چلی وہ بنی اسرائیل۔ حضرتِ اسماعیلؑ سے جو نسل آ گے چلی وہ بنی اسماعیل‘ یہ آ کر حجاز میں متمکن ہو گئے تھے۔ یہ حجاز کے عرب جو تھے یا قریش وغیرہ یہ اس قبیلے سے تھے۔ اور وہ بنی اسرائیل جن کو یہودی کہتے ہیں‘ انہوں نے بعد میں یہ عقیدہ بنا لیا تھا کہ کتاب‘ حکم‘ نبوت یہ سب کی سب بنی اسرائیل کے اندر نسلی طور پہ رہے گی۔ چنانچہ وہ کہتے تھے کہ نہ تو ان کے باہر کوئی نبی آ سکتا ہے۔ ان کے ہاں یہ چیز بھی تھی آپ کو معلوم ہے کہ یہودیت کا مذہب جو ہے کوئی غیرِ بنی اسرائیل جو نسلاً بنی اسرائیل میں نہیں ہے‘ وہ یہودی نہیں ہوسکتا۔ مذہب بھی نسل کے اندر محدود ہو کے رہ گیا ہے‘ اس سے باہر نہیں جا سکا۔ لہٰذا ہدایت بھی ان کے ہاں‘ نجات وسعادت بھی ان کے ہاں‘ جنت بھی ان کے ہاں۔ یہ چیز تھی جو ان کے ہاں چلی آ رہی تھی۔

خدا تعالیٰ کی طرف سے حضرت ابراہیمؑ کا پیغام الناس کے لیے تھا

قرآن نے آ کے کہا یہ تو پہلے دن سے بات غلط ہے۔ جس ابراہیمؑ کی طرف تم اپنی نسلی نسبت کرتے ہو اس نے خود کہا تھا کہ میں الناس کے لیے آیا ہوں۔ اس نے تو اپنے اور بیگانے کا معیار یہ قائم کیا تھا کہ **فَمَنۡ تَبِعَنِیۡ فَاِنَّهٗ مِنِّیۡ** (14:36) جو میری پیروی کرے گا جو میرے پیچھے پیچھے چلے گا‘ وہ مجھ میں سے ہے۔ انہوںؑ نے جب یہ کہا گیا تھا کہ یا اللہ! میں نے یہ کعبہ تعمیر کیا ہے اپنی اولاد کو یہاں بسایا ہے ان کے لیے خوشگواریوں کا کچھ وعدہ تو دو۔ خدا نے کہا تھا وعدہ تو میں کہوں گا لیکن **لَا یَنَالُ عَهۡدِی الظّٰلِمِیۡنَ** (2:124) ان میں سے جو لوگ اس راستے سے ہٹ جائیں گے‘ جو ظالم ہوں گے‘ ان کے لیے میرا یہ وعدہ نہیں ہے۔ نسل کا تو یہاں سوال ہی نہیں ہے۔ یہ صورت نہیں ہے۔ دین کسی نسل کے اندر کسی گروہ کے اندر محدود نہیں ہوسکتا‘ یہ انسان کے لیے ہے اور صرف انسان کی حیثیت سے یہ اس کو اپیل کرتا ہے۔ اس لیے ان سے یہ جو اعتراض کیا کہ صاحب! یہ نبوت کس طرح سے غیرِ اسرائیل کی طرف چلی گئی‘ اسماعیلؑ کی طرف چلی گئی‘ یہ اعتراض تھا ان کے ہاں کا۔

ختمِ نبوت کے بعد قرآنِ حکیم نے ہر کسی آنے والے کے انتظار کو ہمیشہ کے لیے خیر باد کہہ دیا ہے

یہودی تو انتظار کر رہے تھے ایک آنے والے کا‘ ان کی کتابوں کے اندر محرف کتابوں کے اندر بھی آنے والے کے متعلق یہ

چیزیں موجود تھیں۔ لیکن یہ تو عجیب چیز ہے دنیا میں جتنے لوگ بھی آنے والے کا انتظار کرتے ہیں' جب وہ آنے والا آنے کا ذکر کرتا ہے تو اس کے پیچھے پڑ جاتے ہیں۔ انہوں نے اعتراض یہ کیا تھا کہ یہ بنی اسرائیل میں سے ہوتا تو ہم مان لیتے اس کو' بنی اسماعیلؑ سے ہے ہم نہیں مانیں گے اس کو اور پھر ہم انتظار کریں گے تا آنکہ بنی اسرائیل میں سے آنے والا کوئی آئے۔ کہا کہ قُلْ اِنَّ الْفَضْلَ بِیَدِ اللّٰہِ یُؤْتِیْہِ مَنْ یَّشَآءُ وَ اللّٰہُ وَاسِعٌ عَلِیْمٌ ۔ یَّخْتَصُّ بِرَحْمَتِہٖ مَنْ یَّشَآءُ ط وَ اللّٰہُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِیْمِ ((74-3:73 نبوت ایسی چیز نہیں ہے کہ جو کسی نسل' گروہ' قوم' ملک کے اندر پابند ہو یہ چیز اکتسابی ہے نہیں کہ کوئی شخص کسب و ہنر سے حاصل کر لے۔ یہ خالصتاً ایک وہبی چیز ہے' خدا اپنی مشیت کے مطابق یہ دیکھتا ہے کس قوم میں کس ملک میں کونسی ایسی ہستی ہے کہ جو اتنی بڑی عظیم ذمہ داریوں کو اٹھانے کے قابل ہے۔ اس کا انتخاب خدا اپنے سٹینڈرڈ کے مطابق کرتا ہے' تمہارے معیاروں کے مطابق نہیں کرتا۔ اس کو کیوں نہیں ملی؟ اس کو کیوں مل گئی؟ یہ تو یہ کہتے تھے کہ یہ بنی اسرائیل میں سے کیوں نہیں آیا؟ خود مکے والے کہتے تھے کہ مکے میں اور طائف میں اتنے اتنے بڑے امیر' رؤسا' بڑے بڑے امرا' بڑے بڑے دولت مند تھے' لو اس کو نبی بنا دیا ہے۔ اسی لیے وہ کہتے تھے کہ اس میں شریک کرلو دو تین آدمی مکے کے بڑے بڑے' طائف کے بڑے بڑے لمیٹڈ کمپنی بناؤ' دیکھو کیسے چلتی ہے۔

نبوت کا انتخاب خدا کی مشیت کے مطابق سرانجام پاتا تھا

ہم سمجھے ہی نہیں کہ نبوت کہتے کس کو ہیں؟ یہ تو جسے نبوت ملی تھی وہ یہ کہتا تھا بلکہ قرآن نے اس کے متعلق یہ کہا تھا کہ تو کل تک نہیں جانتا تھا کہ کتاب کسے کہتے ہیں' ایمان کسے کہتے ہیں (42:52) یہ تو نبی ہونے والے کو ایک دن پہلے پتا نہیں ہوتا۔ اس لیے کہا کہ یہ چیز اختصاص ہے۔ یہ انتخاب خدا کی مشیت کے رو سے ہوتا ہے۔ یہ نہیں ہوتا تمہاری گروہ بندیوں میں بٹ کے رہ جائے یا جو شخص کسب و ہنر سے وہ آہستہ آہستہ بتدریج مختلف مقامات طے کرتا ہوا' سیڑھی کے ڈنڈے چڑھتا ہوا' کسی ایک دن نبی ہو جائے' یہ ایسے نہیں ہوتا۔ یہ موہبت ہے۔ یہ ودیعت کی جاتی ہے خدا کی طرف سے اور جاتی ہے کا لفظ تو اب کہنا نہیں چاہیئے' جاتی تھی اب کہنا چاہیے۔ یہ تو سلسلہ ہمیشہ کے لیے ختم ہو گیا' کتاب محفوظ ہو گئی نبوت کی ضرورت باقی نہیں رہی۔ لیکن انہیں یہ جواب دیا گیا کہ یہ تمہارے معیار کے مطابق گروہ بندیوں میں سے نہیں آیا۔ اب آیئے قرآن! میں نے کہا تھا نا کہ دین کے اعتبار سے وسعت کی یہ کیفیت کہ جب تک تمام انبیائے سابقہؑ پر ایمان نہ لائے' محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر ایمان لانا کافی نہیں ہو سکتا۔ مسلمان نہیں کسی کو بنا سکتا جب تک پہلی کتبِ سابقہ کے متعلق یہ یقین نہ رکھے کہ وہ اپنے اپنے وقتوں میں خدا کی طرف سے آئی تھیں۔

قرآن پر ایمان لانا کچھ فائدہ نہیں دیتا' کتنی بڑی چیز ہے۔ پھر یہ چیز کہ ان میں سے بعض کے تو ہم نے نام لے لیے ہیں انبیاء و رسل کے بعض وہ ہیں جن کے متعلق ہم نے ذکر نہیں کیا (4:164)۔ لیکن تم کو یہ ماننا پڑے گا اس لیے کوئی دین کوئی مذہب دنیا کے اندر کیوں نہ ہو' اس کے بانی کے متعلق آپ کہہ سکتے ہیں کہ خدا نے جب کہا ہے کہ ہم نے ہر قریہ میں رسول بھیجا تھا' ہوسکتا ہے کہ یہ خدا کا رسول ہی ہو۔ آپ کسی کی شان میں گستاخی کرنا تو ایک طرف رہا' اس سے انکار ہی نہیں کر سکتے۔

کسی ذاتی خوبی کو پرائیویٹ کرنے کا نتیجہ

اور آگے آیئے! یہ جو چیز میں نے کہی تھی کہ اپنے گروہ کے علاوہ باہر کے گروہ میں کوئی خوبی نہیں' کوئی ایک خوبی نہیں اس میں باقی جو دکھائی دے۔ یہاں وہ کہتا ہے وَ مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ مَنْ اِنْ تَاْمَنْهُ بِقِنْطَارٍ يُّؤَدِّهٖۤ اِلَيْكَ (3:75) ان اہلِ کتاب میں وہ بھی ہیں کہ جن کی کیفیت یہ ہے کہ ان کے پاس اگر تو ڈھیروں مال بھی امانت کے طور پہ رکھ دے' وہ اسی طرح سے تمہیں لوٹا کے واپس دے دیں گے۔ کتنی بڑی کشادہ نگہی ہے۔ لیکن کہا کہ ان کے ہاں یہ چیز MORALITY جو ہے ان کے ہاں کی وہ انہوں نے پرائیویٹ رکھ چھوڑی ہے۔ MORALITY کی کئی قسمیں ہیں۔ آج یہ بات سمجھ میں آئے گی۔ آپ کے ہاں PERSONAL , PRIVATE & PUBLIC MORALITY جو ہے اس کا تو عام چرچا ہے' سارا یورپ اس کو مانتا ہے۔ ذاتی طور پر شخصی طور پر انفرادی طور پر ضابطۂ اخلاق اور' پبلک کے لیے اور۔ یورپ کے بڑے بڑے مدبرین' POLITITION' سیاستدان ان کے اقوال پڑھیے اور وہ یہ ہیں CAVOUR نے لکھا ہے کہ جو کچھ ہم اپنی سلطنت کے لیے کرتے ہیں' اگر انفرادی طور پر آپس میں وہ کچھ کرنے لگیں تو دنیا کے سب سے بڑے شیطان کہلائیں۔ MY COUNTRY RIGHT OR WRONG۔ اپنی نیشن کا مفاد' دوسری نیشن کے ایک ایک فرد کے خون کا آخری قطرہ بھی نچوڑ لیا جائے اور اگر اپنی قوم کے لیے وہ کام آتا ہے تو PATRIOTISM سب سے بڑا جوہر' مجسمے کھڑے کیے جاتے ہیں۔ میکیاولی سیاست: اپنی قوم کے مفاد کے لیے دوسری قوموں کو ہر قسم کا دھوکہ دو' چوری کرو' ڈاکہ ڈالو۔ اپنے ہاں بددیانتی اگر کرو تو جرم ہے۔ اجتماعی طور پہ ہر قسم کی بددیانتی' ہر قسم کی ڈکیتی دوسری قوموں کے ساتھ کرو تو یہ سب سے بڑی حب الوطنی ہے۔ قصیدے لکھے جائیں گے اس کی شان میں' STATUE کھڑے کیے جائیں گے۔ یہ کیا ہوا؟ CODE OF ETHICS تو ایک ہی ہونا چاہیے' ضابطۂ اخلاق تو ایک ہی ہونا چاہیے۔ لیکن یہاں اپنوں میں اور دوسروں کے ساتھ ضابطۂ اخلاق بالکل مختلف

ہے PRIVATE MORALITY ‘ پبلک MORALITY انٹرنیشنل MORALITY ہے‘ بین الاقوامی ضابطہ پھ
اور ہوتا ہے۔

بعض اوقات ذاتی منفعت کے لیے جھوٹ بولنا جائز ہی نہیں بلکہ واجب ہو جانے کے فتوے کا تجزیہ

عزیزانِ من! آپ کی ساری سیاست کا مدار اس پہ ہے۔ اپنے گروہ کے اندر دیانت دار رہو‘ سچ بولو‘ لیکن دوسروں کے ساتھ معاہدہ کرو تو اپنے ہاں کا مفاد سامنے رکھو اور اس کے لیے جو جی میں آئے کرو۔ یہ فتوے پھر اس کے بعد دیے جاتے ہیں کہ زندگی کی بعض ضرورتیں ایسی ہیں کہ جن کے لیے جھوٹ بولنا جائز ہی نہیں‘ واجب ہو جاتا ہے۔ یہ کیا ہے؟ دو ضابطے۔ عزیزانِ من! یہ دو ضابطے تو ڈاکوؤں کے ہاں بھی ہوتے ہیں۔ ڈاکوؤں کا جتھہ بھی اس وقت تک قائم رہتا ہے جب تک وہ اپنے درمیان اگر انصاف‘ دیانت اسے قائم رکھتے ہیں۔ ان کے ہاں بھی ایک CODE OF ETHICS ہوتا ہے۔ ان میں اگر کوئی شخص آپس میں یہ کچھ کرتا ہے تو اسے وہ گولی مار دیتے ہیں۔ اور دن رات ان کو تلقین کی جاتی ہے غیروں کے ساتھ وہ کچھ کرنے کی جو اپنوں کے ساتھ کرو تو گولی ماردی جائے۔ جھوٹ‘ فریب‘ بددیانتی‘ لوٹنا کھسوٹنا۔ وہ تو اگر مال کی تقسیم میں ذرا سا بھی ادھر اُدھر کچھ کریں تو اسے گولی مار دیتے ہیں۔ کہتے ہیں جی! بڑا بے ایمان ہے۔ اور جاتے وقت وہ بچوں کو شروع سے آخر تک تلقین یہ ہوتی ہے کہ جا رہے ہو نا! ہر قسم کی بے ایمانی سے کام لینا‘ ذرا سا اس میں شرک نہ آئے تمہارے اندر۔ یہ ہیں ضابطۂ اخلاق کی گروہ بندیاں۔

قرآنِ حکیم تمام انسانیت کے لیے ایک ہی ضابطۂ اخلاق پیش کرتا ہے

لیکن قرآن تو UNIVERSAL ETHICS دیتا ہے عالمگیر ضابطۂ اخلاق‘ اپنے اور بیگانے کی اس میں کوئی تمیز ہی نہیں کوئی‘ اختصاص ہی نہیں‘ کوئی تفریق نہیں۔ قرآن نے کہیں یہ نہیں کہا کہ اگر فریب جو ہے‘ اپنوں کو فریب نہ دو‘ دوسروں کو فریب دو‘ کہیں یہ نہیں کہا کہ اپنوں کے ساتھ جھوٹ نہ بولو اور دوسروں کے ساتھ جھوٹ بولو۔ اس کے ہاں تو اگر عفتِ قلب و نگاہ کی تاکید کی گئی ہے تو دنیا کی ہر عورت کے متعلق یہ کہا گیا ہے۔ وہ اپنی حقیقی بہن میں اور دنیا کی کسی عورت میں تمیز کرنا قطعاً نہیں سکھاتا۔ وہ کہتا ہے دل میں بھی خیال آ جائے گا تو عصمت کا شیشہ تمہارا چور چور ہو جائے گا۔ حرام کا پیسہ حرام ہے خواہ آپ کو مشرک کی جیب سے بھی کیوں نہ ملے۔ کہا ان کے ہاں یہ جو تقسیم انہوں نے کر رکھی ہے اس کا نتیجہ یہ ہے وَ مِنۡهُمۡ مَّنۡ اِنۡ تَاۡمَنۡهُ بِدِيۡنَارٍ لَّا يُؤَدِّهٖۤ

اِلَيْكَ اِلَّا مَا دُمْتَ عَلَيْهِ قَآئِمًا ط (3:75) وہ بھی ہیں کہ ان کے پاس اگر ایک پیسہ بھی کسی کو یا روپیہ بھی کسی کے پاس رکھ دو تو جب تک ہنٹر لے کے اس کے سر کے اوپر کھڑا نہ رہے' واپس دینے کا نام نہیں لیتا۔ بات تو یہ کہی واقعہ کی' اب اس کے بعد وہ علت آئی کہ کیوں یہ ایسا کرتے ہیں؟ عزیزانِ من! کیا بات ہے قرآن کی؟ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَالُوْا (3:75) یہ اس لیے کہ ان کا عقیدہ یہ ہے کہ لَيْسَ عَلَيْنَا فِي الْاُمِّيّٖنَ سَبِيْلٌ ج (3:75) یہ جو ہم سے الگ غیر ہیں' یہ عرب والے لوگ' ان کے معاملے میں جو جی میں آئے کرلو' کچھ جرم نہیں ہے۔ کہتا ہے یہ ہے وہ بنیاد اس چیز کی۔ یہ نہیں کہ انفرادی طور پر' انفرادی طور پر تو ان کے اندر بڑے ایمان دار مل جائیں گے تم کو۔ لیکن اپنے ہاں ضابطۂ اخلاق یہ ہے کہ ہم سے الگ یہ جو قوم یہاں ہے عربوں کے ہاں کی' ان کے ساتھ جو جی میں آئے کرلو کوئی جرم نہیں ہے۔ لَيْسَ عَلَيْنَا فِي الْاُمِّيّٖنَ سَبِيْلٌ (3:75) اور پھر یہ بات میں نے جو ابھی ابھی عرض کیا ہے کہ ہمارے ہاں بھی فتوے دیے جاتے ہیں کہ جھوٹ بولنا واجب ہو جاتا ہے۔ یہ واجب کا لفظ آپ کو پتہ ہے یہ نہیں کہا گیا کہ واجب ہو جاتا ہے کہا یہ گیا ہے کہ اس میں واجب ہونے کا فتویٰ دیا جاتا ہے یعنی شریعت کی رو سے ایسا ہو جاتا ہے۔ تو میں نے عرض کیا تھا نا کہ جو کچھ بھی یہ خود کرتے ہیں' اس کو فوراً خدا رسول ﷺ کی طرف لے جاتے ہیں۔ اب دیکھیے قرآن کیا کہتا ہے؟ وہ بھی یہ کرتے تھے۔ ان کے ہاں بھی یہ چیز موجود تھی تالمود کے اندر کہ غیرِ اسرائیل کے ہاں سے یہ سب چیزیں جو کی جائیں گی' ان میں ثواب ہوتا ہے۔ تو گویا خدا کی شریعت وہ یہ بتاتے تھے نا۔ قرآن کہتا ہے وَ يَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ وَ هُمْ يَعْلَمُوْنَ (3:75) خدا کے خلاف یہ جھوٹ گھڑتے ہیں' منسوب کرتے ہیں اور دیدہ دانستہ ایسا کرتے ہیں۔ عزیزانِ من! کون ایسا ہے کہ اگر ان چیزوں سے الگ ہو کے' اس سے پوچھا جائے کہ تم بتاؤ کہ فریب دینا کسی صورت میں بھی خدا کا حکم ہو سکتا ہے؟ اور بات اس کی سمجھ میں اس وقت آئے گی جب یہ کہا جائے کہ اگر تمہیں فریب دیا جائے تو کیا اس کے بعد اسے تم یہ کہہ کے معاف کر دو گے کہ اس نے خدا کے حکم کی تعمیل کی ہے؟ یا اُسے تھانے میں لے جاؤ گے۔ وَ يَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ (3:75) جرأتیں ان کی ملاحظہ فرماؤ! ارے انفرادی طور پر بدکردار ہو گئے ہو تو چلو یہاں تک سہی' ان چیزوں کو کہتے ہو کہ خدا کی شریعت میں یہ چیز ہے۔ قرآن ہے نا میں نے کہا تھا کہ تاریخ کی کتاب نہیں ہے فوراً اپنا اصول لایا۔ بَلٰى (3:76) سن رکھو! قطعاً یہ بات نہیں جو کچھ یہ کہتے ہیں۔ مَنْ اَوْفٰى بِعَهْدِهٖ وَ اتَّقٰى فَاِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِيْنَ (3:76) اپنے اور بیگانے کا کوئی فرق نہیں ہے' جو بھی اس معاہدے کو جو خدا کے ساتھ اس نے کیا ہوا ہے' اس کی پابندی کرتا ہے' اس کا شمار متقیوں کے اندر ہوتا ہے اور خدا انہی کو پسند کرتا ہے۔ یہاں گروہ بندانہ اس قسم کی مفاد پرستیاں' اس قسم کی تاویلات' تقسیمیں' افتراق' اس قسم کی تفریق قطعاً خدا کے لیے نہیں ہے۔ وہ خدا رب العالمین ہے'

ہر انسان اس کی نگاہ میں یکساں ہے۔ ضابطۂ اخلاق اس کے ہاں کا جو دیا ہوا ہے، وہ تمام یونیورسل ہے۔ 478آلِ عمران

یونیورسل قانون کا بنیادی مفہوم پوری کائنات کے نظم و نسق کا ترجمان ہے

یونیورسل جب میں کہتا ہوں، بات دور چلی جائے گی یہ تو معنی اس کے اور ہیں۔ یہ انسانوں کی سوسائٹی کا بنایا ہوا نہیں ہے۔ جیسے کائنات کے اندر خدا کے متعین کردہ قوانین از خود جاری اور ساری ہیں۔ نہ ان کے بنانے میں یہ ہوا ہے کہ اس نے ان سے مشورہ کیا ہو کہ سناؤ بھئی تمہارے لیے کیا قانون بنادوں۔ مچھلیوں نے نہ کانفرنس کر کے کبھی کہا تھا کہ صاحب! ہمیں پانی میں رہنے کے لیے پر عطا کیجیے اور نہ پرندوں نے کہا تھا کہ نہیں صاحب! ہمیں اڑنے کے لیے وہ پر دیجیے۔ سوال نہیں تھا۔ اسے یونیورسل کوڈ کہتے ہیں کہ اس نے ایک بہت بڑا پروگرام سامنے رکھا کائنات کا، اس کے مطابق یہ قوانین نافذ کیے۔ ہر ایک کے اوپر یکساں اطلاق ہوتا ہے ان کا۔ یہ جو انسانوں کی دنیا کے لیے بھی دیے ہیں یہ بھی اسی قسم کے قوانین یا اقدار بنا کے تمہیں دیے ہیں، اسے کہتے ہیں یونیورسل کوڈ۔ یہ قانون کہ سانس لینے سے زندگی رہتی ہے، یونیورسل لا ہے۔ اسے تو ہم جانتے ہیں کہ ذرا سانس گھٹے تو اس وقت تڑپنے لگ جاتے ہیں۔ دنیا میں جہاں ذی حیات ہے وہاں یہ قانون ہے۔ آپ دیکھ رہے ہیں کوئی تفریق اس کے اندر نہیں ہے۔ سنکھیا کھانے سے ہلاکت ہو جاتی ہے، یونیورسل لا ہے یہ تو ہم جانتے ہیں۔ عزیزانِ من! حرام کا مال کھانے سے بھی ایک ہلاکت ہو جاتی ہے، یہ بھی یونیورسل لا ہے بعینہٖ اسی طرح جیسے سنکھیا کھانے سے ہلاکت ہو جاتی ہے۔ یونیورسل لا ہے مسلم غیر مسلم کی کوئی تفریق نہیں ہے، کالے اور گورے کا کوئی فرق نہیں ہے، بنی اسرائیل اور بنی اسماعیلؑ کا کوئی فرق نہیں ہے۔ پاکستانی اور یورپین کا کوئی فرق نہیں ہے۔ سانس ہر ذی حیات کے لیے ایک ابدی قانون ہے زندگی کا انحصار ہے، سنکھیا مہلک ہے، پانی ممدِ حیات ہے۔ بعینہٖ اسی طرح سے حرام کا مال، جھوٹ، فریب، کذب، افترا سنکھیا کی طرح ہلاکت آفریں ہے، یونیورسل لا ہے۔ بَلٰی مَنْ اَوْفٰی (3:76) دیکھیے یہ مَنْ کتنے زور کا آیا ہوا ہے؟ ساری تخصیصات کاٹ کے رکھ دیں۔ مَنْ اَوْفٰی بِعَهْدِهٖ وَ اتَّقٰی فَاِنَّ اللّٰهَ یُحِبُّ الْمُتَّقِیْنَ (3:76) جو بھی ان قوانین کی نگہداشت کرتا ہے، وہ ہے کہ جو خدا کے نزدیک پسندیدہ ہے نہ یہ کہ بنی اسرائیل کے گھرانے میں جو پیدا ہو جاتا ہے، وہ ہے۔ اِنَّ الَّذِیْنَ یَشْتَرُوْنَ بِعَهْدِ اللّٰهِ وَ اَیْمَانِهِمْ ثَمَنًا قَلِیْلًا (3:77) ان کے برعکس یہ لوگ کہ جو کہتے ہیں کہ خدا کے ساتھ عہد ہم نے کیا ہے ان چیزوں کو مانتے ہیں تمام چیزوں کو، قسمیں اٹھا اٹھا کے ان چیزوں کو وہ مانتے ہیں لیکن تھوڑے سے دنیاوی مفاد کی خاطر اس کو بیچ دیتے ہیں۔ اب یہ دیکھیے کہ اس کا جذبۂ محرکہ مفاد کی خاطر ثمنِ قلیل ہو گیا۔

قدرت کی طرف سے متعین کردہ انسانی اقدار کے مقابلے میں پوری کائنات کی متاع ثمنِ قلیل کا درجہ رکھتی ہے

478آلِ عمران

میں اس سے پیشتر بھی کئی دفعہ یہ بات عرض کر چکا ہوں قرآن نے ہمیشہ ثمنِ قلیل کہا ہے۔ اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ ''پنج ست روپئے تے نہ لوؤ' ہزار روپیہ لے لو کہ جی! قرآن نے تے ثمنِ قلیل کہیا اے کہ تھوڑی قیمت نہ لوو یعنی لوؤ تے رج کے لے فیر۔ تیلی وی کیتا روکھا وی کھادا'' کیونکہ قرآن کہتا ہے ثمنِ قلیل نہ لو۔ قرآنِ کریم نے دوسرے مقامات پہ بتایا ہے کہ جب بھی آپ دنیا کی پوری متاع سے زمین کے برابر سونا' اس سے بھی دوگنا جو کچھ بھی ہوگا' آخرت کی کسی ایک متاع کے مقابلے میں ثمنِ قلیل ہوجائے گا (13:18,3:91)۔ لہٰذا جہاں وہ ثمنِ قلیل کہتا ہے دنیا کی متاع کے اندر QUANTITATIVELY وہ فرق نہیں پڑتا ہے کہ دس روپے ثمنِ قلیل ہیں سو روپیہ جو ہے ٹھیک ہے ثمنِ کثیر ہے وہ۔ یہاں تقابل وہ کرتا ہے ہمیشہ PHYSICAL LIFE (طبعی زندگی) سے متعلق جتنی متاعِ حیات ہیں اور وہ متاعِ حیات جو تمہاری اپنی ذات کی زندگی سے متعلق ہے جس سے آپ کا مستقبل سنورتا ہے' جب دونوں میں ٹکراؤ پیدا ہوجائے گا تو یہاں کی زندگی کی عظیم ترین متاع بھی اس کے مقابلے میں قلیل ترین ثمن ہوجائے گی۔ اس لیے یہ کہا کہ ہم جو ضابطۂ یونیورسل کو ڈ دیتے ہیں اخلاق کا' اس کا تعلق تمہاری ذات سے ہے۔ جس چیز سے اس کا نقصان ہوتا ہے دنیاوی متاع کے اعتبار سے کتنا ہی بڑا وہ متاعِ حیات کیوں نہ ہو' وہ ثمنِ قلیل ہے۔ کہا یہ لوگ اس کی خاطر اسے بیچ دیتے ہیں۔ اُولٰٓئِکَ لَا خَلَاقَ لَھُمْ فِی الْاٰخِرَۃِ (3:77) آپ کہیں گے میں نے یہ معنی کیسے لیے؟ یہ دیکھیے آگے تو آیا ہے کہ یہ یہاں کا متاع تو یہ حاصل کر سکتے ہیں اس سے لیکن مستقبل میں ان کے لیے کوئی حصہ نہیں ہوگا آخرت کی خوشگواریوں میں ان کے لیے کوئی حصہ نہیں ہوگا۔ وَ لَا یُکَلِّمُھُمُ اللّٰہُ وَ لَا یَنْظُرُ اِلَیْھِمْ یَوْمَ الْقِیٰمَۃِ وَ لَا یُزَکِّیْھِمْ وَ لَھُمْ عَذَابٌ اَلِیْمٌ ص (3:77)

دُور اندیشی کا لفظ اپنے اندر عالمگیر انسانیت کا مفاد لیے ہوتا ہے جبکہ حیوان کو اس کا اندازہ ہی نہیں ہوتا

میں کئی دفعہ یہ عرض کر چکا ہوں کہ جب مستقبل آپ کہتے ہیں ٹھیک ہے مرنے کے بعد کی زندگی یقینی مستقبل ہے' اس پہ ہمارا ایمان ہے۔ مستقبل صرف وہی نہیں ہے' اس دنیا کے اندر بھی بعض چیزیں مفادِ عاجلہ ہوتی ہیں' فوری فائدے کے لیے آدمی کرتا ہے۔ بعض چیزیں وہ ہوتی ہیں کہ وہ ذرا دور اندیشی سے کام لیتا ہے۔ دور اندیشی کے یہ معنی نہیں ہیں کہ اپنے لیے تو بہت زیادہ جمع

کر لیتا ہے کہ صاحب! بڑھاپے میں بھی کام آئے' میری اولاد کے کام آئے۔ دور اندیشی کے معنی یہ ہیں' عالمگیر انسانیت کے مفاد 478آلِ عمران
کے لیے کچھ کرنا' آنے والی نسلوں کے لیے کچھ کرنا۔ حیوان کے ذہن میں مستقبل نہیں ہوتا۔ یہ انسان کی خصوصیت ہے۔
FUTURE کا تصور حیوان کے ذہن میں نہیں ہوتا۔ یہ اتنا کچھ تو ہوتا ہے بعض حیوان میں کہ جو سردیوں کے اندر ان کو برف کے اندر یا اس طرح سے رہنا پڑتا ہے' وہ کچھ جمع کر لیتے ہیں۔ INSTINCT کہلاتی ہے یہ ایک HABIT ہوتی ہے جو چلی آتی ہے۔ یہ جو ہے ذہنی طور کے اوپر مستقبل کے متعلق یہ سوچنا' اس کی خوشگواریوں کا سوچنا' انسانیت ہے۔

مفادِ عاجلہ کے مفہوم کے لیے حضرت عمرؓ کی زندگی کا ایک تاریخی فیصلہ اور آخرت کا مفہوم

وہ لوگ جو مفادِ عاجلہ کے اوپر ٹوٹ پڑتے ہیں کہ سمیٹ لو جتنا سمٹ سکتا ہے لے لو اپنی ذات کے لیے' اسی کے دور میں باقی انسان بھوکے مرتے ہوں' کل کیا ہوگا اس ملک کا اس قوم کا اس کے بعد کی نسلوں کا کیا بنے گا' انہیں اس سے کوئی غرض نہیں ہوتی۔ اسے بھی قرآن متاعِ عاجلہ کہتا ہے۔ اور اس کے مقابلے میں یہ جو تصور ہے کہ یہاں قومیں وہی پنپ سکتی ہیں جو صرف مفادِ خویش پہ نگاہ نہ رکھیں' آنے والوں کے اوپر بھی نگاہ رکھیں یعنی میری ذات ہی نہیں بلکہ انسانیت' آج ہی نہیں کل' موجودہ نسل نہیں آنے والی' موجودہ زندگی نہیں آنے والی زندگی' یہ ساری آخرت میں آ جاتی ہے۔ جب حضرتِ عمرؓ کے دور میں عراق کی زمینیں فتوحات میں آئیں تو یہ پہلا وقت تھا جب ان کو یہ فیصلہ کرنا تھا کہ زمین کسی کی ذاتی ملکیت ہو سکتی ہے؟ اس کے اوپر تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ پہلی دفعہ یہ سوال آیا اور سوال بڑا اہم تھا۔ اس سے پہلے مالِ غنیمت چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں چیزیں آتی تھیں اسلحہ' تھوڑی سی دولت' سپاہیوں میں بٹ جاتا تھا ان کے ہاں عام رواج یہ تھا عرب کے اندر۔ پہلی یہ چیز ایک آئی کہ مستقل ذریعۂ رزق ایک ہے' اتنے وسیع پیمانے کے اوپر آیا ہے۔ کیا اسی انداز سے ان سپاہیوں میں اس کو بانٹ دیا جائے؟ ایک گروہ کا یہ خیال تھا۔ حضرتِ عمرؓ بلا تامل اس پہ راضی نہیں ہو رہے تھے۔ تاریخ بتاتی ہے کہ اس ایشو کے اوپر ان کی CABINET میں قریب ایک مہینہ تک DISCUSSION ہوتی رہی تھی اور آخرالامر حضرتِ عمرؓ نے قرآن کی اس آیت سے یہ دلیل جس میں یہ کہا گیا ہے کہ جو کچھ تم اس وقت کرتے ہو' تمہارے بعد آنے والوں کا بھی اس میں حصہ ہونا چاہیے(59:10)۔ آپؓ نے یہ کہا تھا کہ اگر یہ چیز انفرادی طور پہ تقسیم کر دی جاتی ہے تو اس میں انہی کا حصہ ہوگا اور اگر اس کو ملت کی مشترکہ تحویل میں رہنے دیا جائے گا تو آنے والی نسلوں کا بھی اس میں حصہ ہوگا اس لیے ان کو تقسیم نہیں کیا جائے گا۔ یہ ہے ایمان بالآخرت کی پہلی چیز۔ کیا چیزیں قرآن دے جاتا ہے؟

اور کیسے ان لوگوں نے سمجھا تھا قرآن کو؟۔ہم جب کہتے ہیں نا کہ آخرت میں ان کا کوئی حصہ نہیں ہوگا' یہ جتنے احبار و رہبان یا بے
بھی اس قسم کے اکٹھا کرنے والے ہیں متاعِ حیات ثمنِ قلیل' ان میں سے کسی کو یہاں کے مستقبل کا بھی کچھ فکر نہیں ہوتا' آنے والی نسلوں کا نہیں ہوتا' عالمگیر انسانیت کا نہیں ہوتا' صرف میں ہوتی ہے کہ اور سمیٹتے چلے جاؤ۔اور جب یہ نہیں ہوتا تو اس کے بعد پھر آخرت کا فکر کس کو ہوگا۔**لَا يُكَلِّمُهُمُ اللّٰهُ** (3:77)

وہ دور جس میں انسانیت نظامِ ربوبیت کے لیے اپنے پاؤں پہ کھڑی ہو جائے گی

بڑی عجیب چیز ہے یہاں **يَوْمَ الْقِيٰمَةِ** (3:77) کہا ہے ٹھیک ہے مرنے کے بعد کی قیامت صحیح ہے۔لیکن میں نے عرض کیا ہے کہ قرآن کی رو سے یہ سمجھ آتا ہے کہ یہاں بھی جب وہ نظام خداوندی قائم ہوتا ہے جس میں (قیامت کے معنی ہوتے ہیں یکلخت اٹھ کے کھڑے ہوجانا) انسانیت اپنے پاؤں پہ کھڑی ہوجاتی ہے۔**يَوْمَ يَقُوْمُ النَّاسُ لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ** (83:6) پوری انسانیت ربوبیتِ عالمینی کے لیے جب کھڑی ہوجاتی ہے۔کہا کہ وہ دور اب جو آنے والا ہے۔نبی اکرم ﷺ کے دستِ مبارک سے اس کی اینٹ رکھی جا رہی تھی کہ یہ جو اب دور آنے والا ہے' اس دور کے اندر غلط نظامِ معاشرت اور معاشی کے اندر یہ لوگ سمیٹ کے لے جا سکتے ہیں سب کچھ۔اُس دور میں تم دیکھو گے کہ ان کا کوئی حصہ نہیں ہوگا' ان کو منہ نہیں لگایا جائے گا' ان سے بات تک نہیں کی جائے گی۔یہ جو اس قسم کے لفظ آتے ہیں **لَا يُكَلِّمُهُمُ اللّٰهُ** (3:77) خدا ان سے کلام نہیں کرے گا وغیرہ' میں نے عرض کیا ہے یہ کتاب عربی زبان میں نازل ہوئی ہے زبان کا جو انداز ہوتا ہے اس کو ہمیشہ ملحوظ رکھنا چاہیے۔ہمارے ہاں بھی کہتے ہیں نا میں تم سے کلام نہیں کروں گا' منہ نہیں لگاؤں گا تمہیں۔وہ بتا رہا ہے کہ اس کے معنی کیا ہوتے ہیں؟ سچ مچ بات کرنے کے معنی نہیں ہوتے۔انہیں منہ نہیں لگایا جائے گا' ان سے بات تک نہیں کی جائے گی' ان سے پوچھا تک نہیں جائے گا۔**وَ لَا يُزَكِّيْهِمْ** (3:77) ان کی نشوونما کا کوئی سامان اس وقت نہیں ہوگا۔**وَ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ** (3:77) اور یہ جو احساس اس وقت ان کو ہوگا کہ ہم نے اپنے لیے جو کچھ سمیٹا تھا عزیزانِ من! ذرا بھی قانون کی اور انصاف کی حکمرانی کہیں ہوجائے اس قسم کی ذہنیت والوں کے ساتھ جو ہوتا ہے پھر وہ تو دنیا دیکھ لیتی ہے **وَ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ** (3:77)۔

لفظ "**يَلْوٗنَ**" (3:78) کا لغوی مفہوم اور چرب زبانی کرنے والوں کی کیفیت

آگے ایک اور چیز آئی ۔ وَ اِنَّ مِنْهُمْ لَفَرِيْقًا يَّلْوٗنَ اَلْسِنَتَهُمْ بِالْكِتٰبِ لِتَحْسَبُوْهُ مِنَ الْكِتٰبِ وَ مَا هُوَ مِنَ الْكِتٰبِ ج(3:78) بڑی عجیب چیز ہے! کہتا ہے وہ بھی ہیں پھر ان میں سے يَلْوٗنَ اَلْسِنَتَهُمْ (3:78)۔ یہ جو لفظ ہے يَلْوٗنَ (3:78) کے معنی ہوتا ہے دو قسم کی رسیاں لے کے ان کو اس طرح سے باندھ لینا کہ وہ ایک رسی بن جائے ۔ یہ مختلف قسم کی ڈوریوں کو باندھ کے ایک رسہ بنا لو۔ کہتا ہے پھر ان کی کیفیت یہ ہے کہ کتاب کے الفاظ تو ہوں گے لیکن اس کے اندر اپنی چرب زبانی کو اس طرح سے ملائیں گے کہ دونوں رسیوں کو باندھ کے ایک رسہ بنا کے آپ کے سامنے پیش کریں گے' کہیں گے کہ یہ ہے کتاب اللہ۔ لِتَحْسَبُوْهُ مِنَ الْكِتٰبِ وَ مَا هُوَ مِنَ الْكِتٰبِ وَ يَقُوْلُوْنَ هُوَ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ(3:78) قسمیں کھا کھا کے کہیں گے صاحب ! خدا کی کتاب ہے' خدا کی طرف سے یہ آیا ہے۔ قرآن کہتا ہے' وہ کتاب میں ہوتا ہی نہیں ہے۔ اسے کہتے ہیں خدا کی طرف سے ہے' وہ خدا کی طرف سے ہوتا ہی نہیں ہے۔ یہ يَلْوٗنَ (3:78) آپ نے دیکھا ہے کیا لفظ آیا ہے اس کو اور اس کو لے کے دونوں کی بٹی ہوئی رسی ۔ کہا یہ کہ پھر خالص حریر کی یہ رسی ہے جو تمہیں میں یہ دے رہا ہوں ۔قسم اٹھا لیجیے ۔ کہتا ہے کہ وہ کتاب میں نہیں ہوتا۔ عزیزانِ من! بڑی گہری چیز ہے ۔ یہودیوں کا عقیدہ اگر آپ کے سامنے آ جائے تو پھر بات سمجھ میں آتی ہے کہ کتاب میں نہیں ہے۔ یہ کہتے ہیں خدا کی طرف سے ہے جبکہ خدا کی طرف سے نہیں ہے۔

یہودیوں کے مطابق وحی کی دو قسمیں ہیں یعنی وحی متلو اور وحی خفی

ان کے ہاں وحی کی دو قسمیں تھیں ایک وحی وہ تھی جو وہ کہتے تھے کہ خدا کی کتاب کے اندر ہے الفاظ میں' وحیٔ متلو اسے کہتے تھے اس کی تلاوت ہوتی ہے' وہ پڑھی جاتی ہے۔ وہ دوسری وحی تھی جس کو وحیٔ خفی کہتے تھے وہ کہتے تھے وہ بھی وحی آتی ہے خدا کی طرف سے' الفاظ نہیں اس کے ہوتے خدا کی طرف سے' مفہوم ہوتا ہے۔ الفاظ جو اس کے ہوتے ہیں وہ نبی کی اپنی زبان میں ہوتے ہیں اور وہ آگے منتقل ہو کے آتی ہے۔ دونوں کا درجہ بالکل وحی منزل من اللہ کا ہوتا ہے۔تو میں نے عرض کیا نا کہ ان کے ہاں ایک تورات تھی اور ان کے ہاں دوسرا حصہ انہوں نے حضرتِ ہارونؑ کے ہاں کی روایات کو دیا تھا۔ وہ عقیدہ یہ تھا ان کے ہاں کا کہ دونوں یہ وحی ہیں' بالکل ایک جیسی ہیں' خدا کی طرف سے ہیں' دونوں ہی کتاب کے بمنزلہ ہیں۔ اب یہ خارج از کتاب کو کہتے تھے کہ خدا کی طرف سے ہے جبکہ خدا اس کا انکار کر رہا ہے کہ یہ نہیں ہے۔

صدیوں سے ہمارے ہاں پایا جانے والا یہی تصور نہایت ہی غور و فکر کا متقاضی ہے

عزیزانِ من! آپ کو معلوم ہے کہ بعینہٖ یہی عقیدہ آپ کے ہاں بھی موجود ہے۔ وحی کی دو قسمیں آپ کے ہاں بھی مانی جاتی

ہیں وحیٔ جلی اور وحیٔ خفی، وحیٔ متلو اور وحیٔ غیر متلو۔ ایک وحی قرآن کے اندر قرآن کے الفاظ میں، دوسری وحی قرآن سے باہر روایات کے اندر، دونوں کا درجہ ایک ہے۔ یہ عقیدہ ہے ہمارے ہاں اہلِ حدیث حضرات کا۔ مولانا اسماعیل صدر جمعیتِ اہلِ حدیث گوجرانوالا جن کا انتقال تھوڑا عرصہ پہلے ہوا تھا، ان کا ایک چھوٹا سا کتابچہ ہے ''جماعتِ اسلامی کا نظریۂ حدیث''۔ ان میں یہ عقائد آپ دیکھیے اس میں یہ ہے کہ جس طرح سے جبریل قرآن کو لے کے نازل ہوتے تھے، اسی طرح سے روایات کو لے کے نازل ہوتے ہیں۔ ان کا یہ عقیدہ ہے کہ بخاری اور مسلم کی کسی حدیث کا، ایک حدیث کا انکار انسان کو اسلام کے دائرے سے خارج کر دیتا ہے۔ دونوں منزل من اللہ ہیں، دونوں برابر کی وحی ہیں۔ اور اس کے لیے ایک روایت کے اندر یہ الفاظ ہیں جس میں کہا گیا کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ مجھے قرآن دیا گیا و مثلہ معہ اور اس کی مثل اس کے ساتھ کچھ اور جو قرآن میں نہیں ہے۔ عزیزانِ من! قرآن میں تو کہیں وحی کی یہ تفریق نہیں کی گئی کہ وہ اس طرح سے دو قسم کا ہوتا ہے۔ وہ تو یہ کہا گیا ہے وَ اُوۡحِیَ اِلَیَّ ہٰذَا الۡقُرۡاٰنُ (6:19) خدا کہتا ہے کہ اے رسول! ہم نے یہی قرآن تیری طرف وحی کیا ہے۔ بہرحال یہ بات لمبی ہو جائے گی۔ میں کہہ یہ رہا تھا کہ ان کے ہاں یہ عقیدہ تھا بعینہ وہی عقیدہ ہمارے ہاں آیا۔ اب آپ کو سمجھ میں آیا دو رسیوں کو بٹ کے ایک رسہ بنانے کے معنی کیا ہیں۔ اور اس کے بعد بتایا نتیجہ لِتَحۡسَبُوۡہُ مِنَ الۡکِتٰبِ (3:78) تاکہ تم یوں محسوس کرو کہ واقعی یہ خدا کی کتاب ہے۔ وَ مَا ہُوَ مِنَ الۡکِتٰبِ ۚ وَ یَقُوۡلُوۡنَ ہُوَ مِنۡ عِنۡدِ اللّٰہِ وَ مَا ہُوَ مِنۡ عِنۡدِ اللّٰہِ ۚ وَ یَقُوۡلُوۡنَ عَلَی اللّٰہِ الۡکَذِبَ ((3:78) خدا کے خلاف بھی یہ تکذیب سے باز نہیں آتے۔ اس کی طرف یہ چیز منسوب کر دینا کہ خدا نے اس طرح سے دو قسم کی وحی بھیجی، کتاب کے اندر کی وحی کی حفاظت کا ذمہ تو خود لے لیا۔ دوسرا حصہ وحی کا اور وہ اتنا بڑا حصہ ہے ان کے متعلق کہا جاتا ہے کہ 1/10 قرآن میں ہے 9/10 حصہ روایات میں ہے اور اس کی حفاظت کے متعلق خود ان کا عقیدہ یہ کہ ان میں سے کوئی چیز الفاظِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نہیں ہے۔ جمع کرنے والوں نے اس کے بعد ان کے ہاں سب سے بڑی اہمیت بتائی جاتی ہے کہ اسماء الرجال والے لوگ آئے جنہوں نے ان مجموعوں کے اوپر تنقید کی، تنقید کر کے ان میں سے کتنا ہی حصہ جو تھا، وہ نکال دیا انسانوں نے۔

امام بخاریؒ کے بعد اسماء الرجال کی طرف سے چھانٹ پھٹک کے عمل کا نتیجہ

سب سے پہلے جنہوں نے یہ جمع کیا امام بخاری خود لکھتے ہیں کہ مجھے چھ لاکھ کے قریب حدیثیں ملیں ان میں سے پانچ لاکھ چرانوے ہزار انہوں نے خود مسترد کر دیں DISCARD کر دیں، قریب چھ ہزار ہی لیں۔ ان میں سے مکررات نکال دی

جائیں' ایک حدیث جو بار بار آئی ہے تو قریباً تین ہزار رہ جاتی ہیں۔ یہ خدا کی طرف سے جو دوسری وحی مثلہ معہ ملی ہے اس لئے یہ چیز انسان کر رہے ہیں بعد میں۔ پھر جو انہوں نے اپنے ہاں جمع کیا ان مجموعوں کے اندر بعد میں آئے اسماء الرجال والے جنہوں نے پھر تنقید کی ان کے اوپر کہ نہیں! یہ راوی بھی صحیح نہیں ہے وہ راوی بھی غلط ہے' اس لیے یہ حدیث جو ہے (اب اس کی قسمیں ہوئیں) یہ ضعیف سی ہے اس میں یہ نقص ہے' اس میں یہ کمی ہے۔ خدا کی وحی قرآن کے ساتھ قرآن کی مثل اس کے ساتھ یہ کچھ بھی کیا جاتا ہے اور کہا یہ جاتا ہے کہ یہ قرآن جیسی ہے' جبریل اس کو بھی لے کے نازل ہوا کرتے تھے حضور ﷺ کی طرف۔ آپ نے دیکھا کہ یہ عقائد کس طرح ہمارے ہاں در آئے ہیں۔ وَ یَقُوْلُوْنَ هُوَ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ وَ مَا هُوَ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ ج وَ یَقُوْلُوْنَ عَلَی اللّٰهِ الْكَذِبَ وَ هُمْ یَعْلَمُوْنَ ((3:78 جانتے ہیں اس چیز کو۔

ہر حدیث کے آخر میں لکھے گئے الفاظ ''یا جیسے رسولؐ نے کہا ہو''

دیکھیے! ہر حدیث کے بعد یہ کہنا ''اوکما قال رسول اللہ ﷺ'' یا جیسے رسول اللہ ﷺ نے کہا ہو' خود اعتراف کرتے ہیں کہ ہمیں یہ معلوم ہے کہ بعینہ یہ لفظاً لفظاً یقینی طور پہ نہیں ہے یہ یا جیسا آپ نے کہا ہو۔ عزیزانِ من! یہ چیز تھی جو اسلام کے زمانے میں اہلِ کتاب کی طرف سے یہ چیزیں پیش کی جاتی تھیں۔ یہ تھے ان کے اعتراضات' یہ تھا ان کا مسلک' یہ تھا ان کا مؤقف۔ قرآن نے ایک ایک بات ان کی گنائی ہے اس لیے کہ جب یہ دین بھی بعد میں مذہب کے اندر تبدیل کر لیا جائے' اس میں بھی مذہبی پیشوائیت آ جائے تو اس میں بھی اسی قسم کے عقائد در آئیں گے۔ قرآن نے ان اہلِ کتاب کے ان عقائد کو لے کے ان کی اس طرح سے وضاحت کی اور تردید کی تا کہ جب یہی حالت کہا کہ تمہارے ساتھ پیدا ہو جائے' اسی کے مطابق تم میری بات کو سمجھ لینا۔ ہم سورۃ آلِ عمران کی آیت 78 تک آ گئے 79 سے اگلی دفعہ شروع کریں گے اور وہ بھی ایک عظیم اصول کی بات آئی ہے مَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ یُّؤْتِیَهُ اللّٰهُ الْكِتٰبَ وَ الْحُكْمَ وَ النُّبُوَّةَ ثُمَّ یَقُوْلَ لِلنَّاسِ كُوْنُوْا عِبَادًا لِّیْ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ((3:79 بڑی عظیم چیز ہے اسے ہم آئندہ لیں گے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا ط اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ)(2:127

❀...❀...❀

چودھواں باب: سورۃ آل عمران (آیات 79 تا 85)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عزیزانِ من! آج دسمبر 1969ء کی 28 تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز سورۃ آلِ عمران کی آیت 79 سے ہو رہا ہے:((3:79۔

دین کی غرض و غایت اور اس کا ملخص خدا تعالیٰ کی حکومت اختیار کرنا ہے

یہ آیت اور اس کے بعد دو تین اور آیات یہ ایسی ہیں کہ جن میں دین کا ملخص آ گیا ہے SUM UP کر دیا گیا ہے۔ اس لیے یہ بڑی ہی غور طلب اور بصیرت افروز ہیں۔ دین کی غرض و غایت کیا ہے؟ اس کا منتہا اور مقصود کیا ہے؟ وہ ہے انسان کو پوری آزادی دینا۔ اور آزادی کی DEFINITION (تعریف) ' مفہوم قرآن کی رو سے یہ ہے کہ کوئی انسان کسی دوسرے

کوئی انسان کسی دوسرے انسان کا محکوم اور محتاج نہ ہو۔ اس قسم کی انسانی زندگی کہ جس میں کوئی انسان کسی دوسرے انسان سے اپنا حکم نہ منوائے، کوئی انسان کسی دوسرے کا دُبَیل نہ ہو۔ لیکن اگر کسی حکم کی پابندی نہ رہے تو تمدنی زندگی بسر ہی نہیں ہو سکتی۔ آزادی مادر پدر آزادی کا نام نہیں ہے؛ اس میں بھی پابندیاں ضروری ہیں، پابندیوں ہی سے صحیح آزادی نصیب ہوتی ہے۔ اور یہی وہ مقام ہے جہاں دین آتا ہے کہ کوئی انسان کسی دوسرے انسان کی آزادی پر پابندی نہیں عائد کر سکتا۔ یہ پابندیاں خدا کی طرف سے عائد کی گئی ہیں۔ تو دین کا ملخص یہ ہے کہ محکومی، حکم کی اطاعت یا فرماں پذیری صرف قوانینِ خداوندی کی ہوگی۔ اس کے علاوہ کسی اور کی اطاعت اور محکومی جائز نہیں ہے۔ نہ کسی کو حق حاصل ہے کہ کسی دوسرے سے اپنا حکم منوائے اور نہ کسی کو اس قسم کی زندگی اختیار کرنی چاہیے کہ وہ کسی دوسرے انسانوں کے محکوم اور تابع زندگی بسر کرے۔ اور یہی وہ حقیقتِ کبریٰ ہے کہ جس کا اعلان سورۃ فاتحہ کی پہلی ہی آیات میں یہ کہہ کے کر دیا گیا کہ اِیَّاکَ نَعۡبُدُ (1:4)۔ اسی کا نام توحید ہے۔ توحید کے یہ معنی نہیں ہیں کہ آپ کہیں کہ خدا ایک ہے۔ اس کہہ دینے سے کیا مقصد ہے؟ خدا ایک ہے خدا تین چار ہیں، نظری طور پر اس کا فرق نہیں پڑتا کچھ بھی۔ فرق وہاں ہے جہاں اِیَّاکَ (1:4) ہے۔ بڑے زور کی یہ چیز ہے جسے اِیَّاکَ نَعۡبُدُ (1:4) کہا گیا ہے ہم صرف تیری محکومی اختیار کرتے ہیں کسی اور کے حکم کی اطاعت نہیں کرتے۔ عبدیت، عبودیت یا جسے پھر عبادت کہا جاتا ہے اس کے معنی ہی ہیں کسی کا محکوم ہو جانا، کسی کا تابع فرمان ہو جانا۔ دین جب مذہب کی سطح پہ اتر آتا ہے تو وہاں پھر ان الفاظ کے معنی پرستش اور پوجا پاٹ کے ہو جاتے ہیں۔ بڑا غلط مفہوم ہے یہ۔ اس کے معنی ہیں اطاعت پذیری اور اس کے معنی ہیں فرماں برداری اور حکم کی تعمیل کرنا، اطاعت کرنا، محکومیت اختیار کرنا۔ اِیَّاکَ نَعۡبُدُ (1:4) دین کا ملخص، اصل الاصول اور اساس اور بنیاد ہے۔ عملی زندگی میں اس کے معنی یہ ہیں کہ اطاعت صرف قانونِ خداوندی کی ہوگی، کسی اور کی اطاعت نہیں ہوگی۔

تمدنی لحاظ سے انسانی زندگی کے نشیب و فراز اور پھر جمہوریت کا فریب اور مذہبی پیشوائیت کی غلامی

تاریخِ انسانیت، پر غور کیجیے انسانوں سے اپنی اطاعت کرانے والے کس کس روپ میں انسانوں کے سامنے آئے؟ جب نظامِ حکومت آپ کے ہاں صرف زور اور قوت کا تھا جسے آپ چنگیز اور ہلاکو کا دور کہیں گے، جسے آپ فرعون اور نمرود کا دور کہیں گے۔ اس میں ایک فرد کے حکم کی تعمیل، اطاعت یہ تھا نظام انسان کا۔ یہ دور ایک عرصے تک انسانوں میں چلا۔ انسانوں نے ترقی

کی' مہذب ہوئے' انہوں نے ملوکیت کو ڈیموکریسی میں بدلا پھر جمہوریت کے میدان میں اترا۔ اب اطاعت کن کی ہوگئی قوانین ساز کی اطاعت ہوگئی جن کے ہاتھ میں' جن کے اختیار میں قانون بنانا تھا' ان کے قانون کی اطاعت۔ آپ غور کیجیے یہ پھر ایک فریب ہے۔ ایک فرد کے حکم کی اطاعت کہا کہ یہ تو بہت بڑی غلامی ہے' اکیاون کے حکم کی اطاعت یہ آزادی ہے۔ اطاعت ایک انسان کی ہو یا انسانوں کے گروہ کی ہو' وہ محکومی کی محکومی ہے۔ اس کا نام دیا گیا کہ نہیں ! یہ اطاعت جو ہے LEGISLATIVE کی اطاعت ہے' مجلسِ قانون ساز کی اطاعت ہے' قانون کی اطاعت ہے۔ انسان نے فوری حکم دیا تو اس کے حکم کی اطاعت ہے۔ اسے بیٹھ کے کہیں قانون کی شکل دے دی تو یہ قانون کی اطاعت ہے۔ یہ آزادی ہے' وہ محکومی ہے۔ اگر دیکھا جائے تو بات دونوں میں ایک ہی ہے یہ بھی انسانوں کی ہی اطاعت ہے۔ اور اس سے کہیں گہری اطاعت کہ جو قلب اور روح کے اوپر اپنی حکمرانی جتاتے ہیں مذہبی پیشواؤں کی اطاعت' عقیدت مندی کے نام سے اطاعت اور یہ اطاعت بدترین قسم کی غلامی ہے۔ پہلی غلامی وہ ہے کہ جس میں غلام ہر وقت محسوس کرتا ہے کہ میں غلام ہوں اور اس غلامی کی زنجیروں کو توڑنے کی کوشش کرتا ہے۔ یہ غلامی وہ ہے کہ جس میں اگر زنجیر ٹوٹتی ہے تو چیختا ہے چلاتا ہے روتا ہے' مژگانِ عقیدت سے اس ٹوٹے ہوئے ٹکڑوں کو جمع کرتا ہے۔ اپنے ہاتھوں سے پھر اپنی گردن میں ڈال لیتا ہے۔ عقیدت مندی کی اطاعت اور محکومی بدترین قسم کی محکومی تھی۔ تین ہی شکلیں اس وقت تک محکومی کی یا دوسروں سے اپنی اطاعت کی تھیں: عقیدت مندانہ' آمرانہ (جسے ڈکٹیٹرشپ آپ کہتے ہیں) یا آج کے دورِ تہذیب و تمدن میں قانون ساز جماعت کے قانون کی اطاعت۔ LEGISTALIVE کی اطاعت' EXECUTIVE کی اطاعت اور عقیدت مندانہ اطاعت۔

انسانیت کی سطح پر آئین سازی کے سلسلہ میں خدائے علیم وخبیر کا اعلان

ساری تاریخ ابھی تک انہی میں آئی ہیں۔ جبکہ قرآن ایک آیت میں یہ کہہ دیتا ہے کہ یہ تینوں ہی اطاعتوں کے مراکز غلط او رباطل ہیں مَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّؤْتِيَهُ اللّٰهُ الْكِتٰبَ وَ الْحُكْمَ وَ النُّبُوَّةَ ثُمَّ يَقُوْلَ لِلنَّاسِ كُوْنُوْا عِبَادًا لِّيْ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ (3:79) کسی انسان کو یہ حق نہیں پہنچتا خواہ وہ قانون کی کتاب وضع کرنے والا ہو خواہ وہ EXECUTIVE AUTHORITY ہو' اپنا حکم چلانے والا ہو' خواہ عقیدت مندی کی معراجِ کبریٰ کے اوپر نبوت کا حامل بھی کیوں نہ ہو' کسی انسان کو حق حاصل نہیں کہ کسی دوسرے انسان سے وہ کہے کہ تم میرے محکوم ہو جاؤ۔ اللہ اکبر۔ عزیزانِ من! یہ ہے قرآن' یہ ہے دین' یہ ہے اس کا پیغام' یہ ہے اس کا اصل الاصول: مَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّؤْتِيَهُ اللّٰهُ الْكِتٰبَ وَ الْحُكْمَ وَ النُّبُوَّةَ ثُمَّ يَقُوْلَ لِلنَّاسِ كُوْنُوْا عِبَادًا لِّيْ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ (3:79

 کسی انسان کے لیے یہ جائز ہی نہیں ہے' اس کو حق ہی نہیں پہنچتا اس قسم کا۔ کتاب اور حکم و نبوت میں آپ دیکھیے کس طرح سے تمام کے آ گئے ہیں تینوں گوشے جن میں انسان نے آج تک اپنے عہدِ جہالت سے لے کر اس دورِ تہذیب و تمدن تک محکومیت کے مختلف یا حکومت کرنے کے مختلف انداز اختیار کیے ہیں۔ روحانیت کی دنیا کے اندر قرآن نے نبوت کہہ کے انتہائی درجہ جو تھا' اس کو وہ لے لیا۔ نبی کو بھی حق حاصل نہیں ہے' صاحبِ حکم جو ہے اسے بھی یہ حق حاصل نہیں ہے' قانون بنانے والوں کو بھی یہ حق حاصل نہیں ہے کہ کسی انسان سے وہ یہ کہیں کہ تم خدا سے ورے ہماری محکومیت اختیار کرو۔ انہیں کہنا یہ چاہیے وَ لٰکِنْ كُوْنُوْا رَبّٰنِيّٖنَ ((3:79 تم سب کو ربانی بن جانا چاہیے۔

ربوبیتِ عامہ کے لیے لفظ ربانی کی جامعیت کی وضاحت خود قرآنِ حکیم کے الفاظ میں

ربانی ایسا جامع لفظ یہاں قرآن لایا ہے یعنی خدا کی صفتِ ربوبیت کا حامل' اس کے علمبردار اس کو آگے چلانے والے۔ صفتِ ربوبیت کیا ہے؟ دوسروں کی نشوونما کرنا۔ انہیں چاہیے یہ کہ اگر انہیں یہ صلاحیتیں ملی ہیں' یہ اقتدار ملا ہے' یہ اختیار ملا ہے کہ وہ قانون کو نافذ کر سکتے ہیں' اصولوں کے تابع قوانین کو وضع کر سکتے ہیں یا اگر ان کے پاس خدا کے احکام انہیں ملے ہیں اور انہیں وہ آگے چلاتے ہیں تو مقصد یہ ان کا ہونا چاہیے کہ نوعِ انسان کی نشوونما کریں۔ اور آپ جانتے ہیں کہ محکومی میں تو ساری نشوونما کی صلاحیتیں سلب ہو کر رہ جاتی ہیں۔ یہی نہیں ہے کہ وہ دوسرے انسانوں سے INDIFFERENT ہو جائیں' دوسرے سے حکم نہ منائیے اور ان کے ساتھ کوئی تعلق نہ رکھیے یہ بھی تو ایک چیز ہے کہا نہیں! وہ منفیانہ پہلو ہے NEGATIVE ASPECT ہے۔ آپ کہیں کہ میں حکم تو نہیں کسی پہ بھی چلاتا لیکن مجھے اس کے معاملے سے واسطہ بھی کچھ نہیں' وہ کہتا ہے یہ بات غلط ہے کہ آپ INDIFFERENT ہو کے اس سے بھاگیں۔ تمہیں ربانین ہونا ہوگا۔ خدا کے قوانین کی اطاعت سے اپنی نشوونما کرو اور جتنے بھی تمہارے متعلق ہیں' ان تمام کی نشوونما کا ذمہ اپنے اوپر لو۔ صاحبِ کتاب' صاحبِ حکم اور صاحبِ حکومت تینوں گوشوں کے اندر یہ کہا گیا ہے کہ تمہارا فریضہ یہ ہے کہ نوعِ انسانی کی نشوونما کا انتظام کرو۔

ربانی بننے کی خاطر قرآنی تعلیم کی خاطر دروس کے طریقِ کار کی ضرورت اور اس کی اہمیت

یہاں تک بات نظری طور پر ہو رہی تھی۔ یہ کرو کس طرح سے؟ ربانی کیسے بنو؟ صرف خدا کی محکومیت کیسے اختیار کرو؟ خدا تو کسی کے سامنے نہیں آتا وہ تو کسی کو اپنا حکم خود براہِ راست نہیں دیتا' کس طرح سے یہ چیز کی جائے؟ بِمَا كُنْتُمْ تُعَلِّمُوْنَ

الْکِتٰبَ ((3:79 خدا کی کتاب کے ذریعے سے ایسا ہوگا۔ اس نے جو ضابطۂ قوانین دیا ہے اس کی تم تعلیم دیتے ہو اور صرف تعلیم دینے سے کام نہیں چلتا وَ بِمَا کُنۡتُمۡ تَدۡرُسُوۡنَ ((3:79 میں نے عرض کیا تھا کہ جسے ہم درس کہتے ہیں یہ شہر والوں نے تو کم دیکھا ہوگا' گاؤں والے جانتے ہیں۔ فصل کاٹی جاتی ہے' گیہوں ابھی خوشوں میں ہوتی ہے' چھلکوں میں ہوتی ہے پھر اسے گاہا جاتا ہے۔ بیل چلائے جاتے ہیں سارا دن اس کے اوپر بیل چلاتے رہتے ہیں تا آنکہ وہ ان کا چھلکا دانوں سے الگ ہوجائے یا دانے چھلکوں سے الگ ہوجائیں۔ چھلکے الگ کردیے جائیں اور اناج الگ کردیا جائے یہ جو پروسیس ہوتا ہے حشو و زوائد کو دور کرکے اصل مقصود کو حاصل کرلینا اسے درس کہا جاتا ہے۔ وَ بِمَا کُنۡتُمۡ تَدۡرُسُوۡنَ (3:79) کتاب کے الفاظ تُعَلِّمُوۡنَ (3:79) تو وہاں تک ہیں کہ جہاں تک علم ہے کتاب کا اور تدریس یا درس کی کیفیت یہ ہے کہ اس کے اندر سے اس کے معنی کو باہر لے آنا۔ یہ سب کچھ ہوگا الکتاب کے ذریعے سے۔ تُعَلِّمُوۡنَ الۡکِتٰبَ (3:79) یہ الکتاب ہے یاد رکھیے! ہر کتاب کے ذریعے سے یہ نہیں ہوگا الکتاب جو خدا کی طرف سے تمہیں ملی ہے اس کی تعلیم' اس کی درس و تدریس' اس کے معنی کو حاصل کرنا' اس کی رو سے تم قوانینِ خداوندی کی اطاعت کرو گے۔ دنیا بھر کی اطاعتوں سے اور محکومیوں سے نجات مل جائے گی۔ اس سے تمہاری ذات کی بھی نشوونما ہوگی اور تم دوسروں کی بھی نشوونما کرسکو گے۔ یہ ہے فریضہ ان لوگوں کا کہ جن کو قانون سازی کے اختیارات ملے ہوں' جن کو ان قوانین کے نافذ کرنے کے اختیارات ملے ہوں اور جو روحانیت کی دنیا میں اعتقادات کی دنیا میں خدا کی طرف سے خواہ وہ نبوت لے کے بھی کیوں نہ آئے ہوں' ان میں سے ہر ایک کا فریضہ یہ ہے کہ کتابِ خداوندی کی تعلیم کرے' اس کی تدریس کرے اور اس طرح سے اپنی اور دوسروں کی صلاحیتوں کی نشوونما کا سامان بہم پہنچائے۔

قائدِ اعظمؒ کی بصیرتِ قرآنی خود ان کے اپنے الفاظ میں

برادرانِ عزیز! یہ ہے دین کی غرض و غایت۔ خدا کی اطاعت کرو' خدا کا حکم مانو' اسلام پر چلو۔ روز آپ یہ الفاظ سنتے چلے آ رہے ہیں' متعین طور پہ کوئی نہیں بتاتا کہ یہ کرو کیسے؟ اس کا ذریعہ کیا ہے؟ حیرت ہوتی ہے مجھے کہ اتنی گہری چیز کون شخص کہہ گیا۔ کن حالات میں کہہ گیا؟ قائدِ اعظم محمد علی جناحؒ' مسٹر جناحؒ بار ایٹ لا' عام الفاظ میں سنیے کہ داڑھی مونڈھا سوٹ بوٹ پہنے ہوئے مغرب زدہ۔ اس سے جب پوچھا گیا سن 1941ء میں حیدر آباد دکن میں عثمانیہ یونیورسٹی کے سٹوڈنٹس نے یہ سوال کیا تھا کہ آپ جس جداگانہ مملکت کے لیے جدو جہد کر رہے ہیں جسے اسلامی مملکت کہا جاتا ہے' اس کا امتیازی نشان یا خصوصیتِ کبریٰ کیا ہوگی؟ غور کیجیے کس سے یہ سوال کیا جا رہا ہے؟ تو انہوںؒ نے کہا کہ اس کی خصوصیت یہ ہے کہ اسلامی مملکت میں

اطاعت کا مرجع صرف خدا کی ذات ہوتی ہے اس کے علاوہ کوئی اور نہیں ہوتی اور اس کا عملی ذریعہ قرآنِ کریم کے احکام کی تعمیل ہوتا ہے۔ حیرت ہوتی ہے۔

سرِ خدا کہ زاہد و عابد بہ کس نہ گفت
در حیرتم کہ بادہ کشاں از کجا شنید

اتنی سی چیز تو عام سننے میں آئے گی کہ ہاں صاحب! اطاعت صرف خدا کی ہوتی ہے۔ یہ ہے ایک پریکٹیکل شخص جو ہے وہ سوچتا ہے کھڑا ہو کر کہ خدا کی اطاعت کس طرح سے ہوگی؟ فوراً اس کے ساتھ انہوں نے کہہ دیا کہ اطاعت کا مرجع صرف خدا کی ذات ہوتی ہے اور اس کے فوراً بعد یہ کہا کہ اس کا عملی ذریعہ قرآنِ کریم کے اصول واحکام کی تعمیل ہے جو اس کی آزادی اور پابندی کی حدود متعین کرتے ہیں اور اس کے بعد کہا کہ تم پھر جانتے ہو کہ قانون کی تعمیل کے لیے تو ایک مملکت کی ضرورت ہوتی ہے میں اس لیے پاکستان کا تقاضا کر رہا ہوں۔

تحریکِ پاکستان کے سلسلہ میں ہمارے دانشوروں کی بھانت بھانت کی بولیاں

آج بھانت بھانت کی بولیاں بولی جارہی ہیں، پاکستان کیوں وجود میں لایا گیا تھا؟ مقصد کیا تھا اس مملکت کے بنانے سے؟ ہندوؤں کے ساتھ ہم نے کیوں یہ ٹکراؤ لیا؟ بڑے بڑے جگادری اس زمانے کے آپ کے سامنے آرہے ہیں۔ ٹی وی کے اوپر ان کے انٹرویو ہو رہے ہیں اور آپ کو پتہ ہے کہہ کیا رہے ہیں؟ کہ صاحب! یہ ہندوؤں کی تنگ نظری تھی، انہوں نے ہم کو ستایا اتنا تھا، تنگ اتنا کیا تھا کہ مجبور ہو کے ہم نے یہ کہا۔ وہ کہتے ہیں کہ اگر ہندو کچھ ذرا لبرل ہو جاتا، کشادہ ظرف ہو جاتا، پاکستان کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا۔ اللہ اکبر۔ یعنی اس کی تنگ نظری سے مجبور ہو کے ہم نے یہ کچھ کیا۔ کوئی POSITIVE اور مثبت بنیاد نہیں تھی آپ کے ہاں اس مطالبے کی۔ مثبت بنیاد آپ کے ہاں یہ دیتا ہے۔ آپ کے ہاں کے یہ تمام علمائے کرام اس زمانے میں (دو چار کو مستثنیٰ کر کے) تمام کے تمام ہندوستان میں رہتے ہوئے وہاں کی سیکولر گورنمنٹ کا تقاضا کر رہے تھے کہ ہمارا اسلام یہاں آزاد ہوگا اس لیے کہ ہندو ہمیں ضمانت دیتا ہے کہ ہم تمہارے نماز روزے میں تعرض نہیں کریں گے۔ لیجیے اسلام آزاد ہو گیا۔ علمائے کرام وہاں کے نیشنلسٹ علما جن کو کہا جاتا تھا، جمعیت علمائے ہند متفقہ طور پر یہ DEMAND کر رہی تھی۔ اور ایک مغرب زدہ SUITED BOOTED داڑھی مونڈھا مسٹر جناحؒ یہ کہہ رہا تھا کہ اسلامی مملکت کا امتیازی نشان یہ ہے کہ اس میں اطاعت خدا کے سوا کسی اور کی جائز نہیں ہوتی اور اس کا عملی ذریعہ خدا کی کتاب کے احکام وقوانین کی اطاعت ہوتا ہے اور اس کے لیے ایک

مملکت کی ضرورت ہوتی ہے اگر یہ نہ ملے تو کوئی مسلمان مسلمان ہو نہیں سکتا۔ مَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّؤْتِيَهُ اللّٰهُ الْكِتٰبَ وَ الْحُكْمَ وَ النُّبُوَّةَ ثُمَّ يَقُوْلَ لِلنَّاسِ (3:79) کتنی عجیب تفسیر یہ شخص کر گیا قرآن کی اطاعت کی۔ یہ ہے دین کی غرض و غایت: کسی شخص کو حق نہیں پہنچتا کہ وہ یہ انسانوں سے کہے کہ كُوْنُوْا عِبَادًا لِّيْ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَ لٰكِنْ كُوْنُوْا رَبّٰنِيّٖنَ بِمَا كُنْتُمْ تُعَلِّمُوْنَ الْكِتٰبَ وَ بِمَا كُنْتُمْ تَدْرُسُوْنَ (3:79) کتنی واضح بات ہے کیسے خدا والے بن جاؤ؟ کیسے ربانی بن جاؤ؟ کیسے اس کی اطاعت کرو؟ اس کتاب کے ذریعے سے' کتاب کو پڑھو پڑھاؤ' کتاب پر غور و فکر کرو' اس کے معنی کو اس کے الفاظ سے الگ کرو' سمجھو سوچو کہ غرض و غایت اصل و بنیاد کیا ہے اس کی۔ اسے یہ کہنا چاہیے وہ یہی کہے گا۔ وہ کبھی یہ نہیں کہے گا وَ لَا يَاْمُرَكُمْ اَنْ تَتَّخِذُوا الْمَلٰٓئِكَةَ وَ النَّبِيّٖنَ اَرْبَابًا ؕ (3:80) وہ نہ تو دورِ جہالت کی طرح یہ کہے گا کہ یہ فطرت کی قوتوں کو دیوی دیوتا بنالو اور تو ہم پرستیوں میں مبتلا رہو اور نہ ہی وہ یہ کہے گا کہ نبیوں کو اپنا خدا بنالو۔

رسول کی اطاعت کے معنی خدا کے قانون کی اطاعت ہے نہ کہ رسول کی ذات کی

عزیزانِ من! سوچیے میں نے کہا ہے کہ انتہائی سیڑھی کا جو ڈنڈا ہے وہاں تک گیا ہے قرآن۔ نبی کہنے کے بعد یہ عقیدت مندانہ جو سارا سلسلہ ہے سارا چکر ہے' اس کو توڑ کے رکھ دیا۔ کسی کو یہ حق نہیں پہنچتا جب نبی کو یہ حق نہیں پہنچتا تو آپ کے ہاں کے یہ حضرات اور مشائخ اور یہ پیر اور مولوی' کس کو یہ حق پہنچتا ہے کہ وہ یہ کہے کہ میری اطاعت کرو۔ اور یہیں سے ایک بہت بڑی حقیقت سامنے آ گئی کہ قرآن نے جہاں رسول کی اطاعت کا بھی حکم دیا ہے وہ رسول کی ذات کی اطاعت نہیں ہے۔ اس لیے کہ ذات کے متعلق تو یہ کہا کہ کسی بشر کو حق ہی حاصل نہیں ہے کہ اپنی اطاعت ہی کسی سے کرائے اور اس میں نبوت کا لفظ قرآن نے خود واضح کر کے کہہ دیا کہ نبی کو بھی حق حاصل نہیں ہے' رسول بھی اپنی اطاعت نہیں کراتا۔ وہ سب سے پہلے خدا کے احکام کی اطاعت خود کرتا ہے وَ اَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِيْنَ (6:163) کہتا ہے اور اس کے بعد انہی احکام کو آگے ایک نظام کے تابع نافذ کرتا ہے اور اس کا نام ہوتا ہے رسول کی اطاعت یعنی خدا کے احکام کی اطاعت جو اس مرکز کے ذریعے سے کی جاتی ہے۔ اطاعت کے لیے ایک نظم کا ہونا ضروری ہے' نظم و نسق انتظام کا ہونا ضروری ہے۔ یہ جو نظم و نسق ہے آپ کے ہاں اطاعت کا' یہ ہے جسے مملکت کہا جاتا ہے۔ اس کا ایک سربراہ ہوگا فرد ہو' جماعت ہو' شکل اس کی کوئی بھی ہو وہ اتھارٹی کہ جو خدا کے قوانین کو عملاً نافذ کرے۔ پہلے خود اس کی اطاعت کرے پھر دوسروں پر اس کو نافذ کرے' بس یہ ہے اطاعت اس کی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد یہ سلسلہ ختم نہیں ہوا' خدا کے احکام کی اطاعت تو قیامت تک کرنی تھی مسلمان نے۔ یہ نظام آگے چلا اور اس کے بعد جو آپ کی مملکت کا سربراہ ہوا جسے

آپ خلیفۃ المسلمین کہتے ہیں' وہ جب خدا کے احکام کی اطاعت کراتا تھا تو وہ بمنزلہ خدا اور رسول کی اطاعت کے ہوجاتا تھا۔ 478 آلِ عمران
اس کے بعد بھی جب بھی آپ کے ہاں کوئی مملکت ایسی قائم ہوگی جس میں خدا کے احکام وقوانین کی اطاعت کرائی جائے گی تو وہ جس اتھارٹی کے ذریعے سے وہ اطاعت ہوگی' اس کی اطاعت خدا اور رسول کی اطاعت کے بمنزلہ ہوجائے گی۔

مذہب میں اطاعت انفرادی ہوتی ہے جبکہ دین کی اطاعت اجتماعی

ترجمہ اس کا ہوگا خدا کے احکام کی اطاعت جو سر براہِ مملکت کی وساطت سے ہوتی ہے تاکہ دین انفرادی نہ ہوجائے۔ دین انفرادی ہوتا ہی نہیں ہے' دین تو اجتماعی ہوتا ہے۔ مذہب میں اطاعت انفرادی طور پہ ہوتی ہے۔ میں اپنے طور پہ یہاں گوشے میں نماز پڑھ لیتا ہوں' دوسرا مسجد میں جا کے اپنے طور پہ کر لیتا ہے۔ میں بھی اطاعت کرتا ہوں وہ بھی اطاعت کرتا ہے۔ مذہب میں ہے یہ چیز' یہ اطاعت نہیں ہے' یہ پرستش ہے۔ دین کی اطاعت ایک نظمِ اجتماعی کے تابع ہوتی ہے۔ آج کی اصطلاح میں اس کو سٹیٹ یا مملکت کہا جاتا ہے وہ اتھارٹی جو خدا کے قوانین کو عملاً نافذ کرے گی اس کی اطاعت خدا اور رسول کی اطاعت کے بمنزلہ ہوجائے گی ۔تو کہا کہ وہ یہ نہیں کہے گا کہ تم ملائکہ کو بلکہ وہ یہ بھی نہیں کہے گا کہ نبیوں کو بھی تم اَرۡبَابًا مِّنۡ دُوۡنِ اللّٰہِ بنا لو۔ اَیَاۡمُرُكُمۡ بِالۡکُفۡرِ بَعۡدَ اِذۡ اَنۡتُمۡ مُّسۡلِمُوۡنَ ((3:80 کہتا ہے کہ جبکہ تم مسلم ہو چکے ہو تو کیا اس کے بعد وہ تمہیں کفر کی طرف لے جائے گا؟ کفر اور اسلام میں حدِ امتیاز ہی یہ ہے کہ کفر میں انسان اپنی اطاعت دوسرے انسان سے کراتا ہے۔ اسلام میں کوئی فرد دوسرے سے اپنی اطاعت نہیں کراتا' خدا کے احکام کی اطاعت کرتا ہے۔ یہ ہے اسلام اور یہ ہے کفر۔ اور اس نے کہ یہ چیز نئی نہیں ہے پہلے دن سے یہی دین تھا جو ہم نے دیا ہر نبی کو دیا اور اس کے بعد یہ کہا کہ یہ چیز اس نبی کی زندگی تک ہی نہیں' نہ ہی اس کی ذات تک محدود ہے' یہ سلسلۂ رشد وہدایت اسی طرح سے آگے چلتا جائے گا۔

ہر آنے والے نبی نے پہلے نبی کے دین کی تجدید کی لیکن اس میں برابر آمیزش ہوتی رہی

ہر نبی نے اپنی امت کو یہ دین دیا' جاتے وقت اپنی امت سے یہ کہہ گیا کہ اس کے بعد پھر میرے جیسا اور رسول بھی خدا کی طرف سے آئے گا' وہ بھی یہی دین تمہیں دے گا اس لیے کہ اس دوران میں اس دین میں انسانی خیالات کی آمیزشیں ہوجائیں گی۔ اس میں تحریف ہوجائے گی' الحاق ہوجائے گا۔ وہ پھر آئے گا خدا کا منزہ دین پھر پیش کرے گا جب وہ آئے تو یہ نہ کہنا کہ ہم اپنی گروہ بندی کے اوپر رہیں گے' تمہاری بات نہیں مانیں گے۔ وہ بھی خدا کا یہی دین دے گا جو میں دے رہا ہوں پھر اس کی بات ماننا۔ آپ نے دیکھا کہ یہ کس طرح سے ایک مسلسل سلسلہ آرہا ہے۔ اور اسی طرح سے آگے بڑھتے چلے جانا' ہر نیا آنے والا

رسول اسی دین کی تجدید کرے گا' اسی کو دوبارہ دے گا اپنی اصل غیر محرف' منزہ شکل کے اندر۔ اس پہ ایمان لانا اس کی بات ماننا
وہی ہوگی بات جو میری بات ہے اور یوں سلسلہ آگے چلاتے چلے جانا۔

دنیا بھر میں مختلف مذاہب کے وجود کی وجۂ جواز

یہ جو آپ کو دنیا میں مختلف مذاہب ملتے ہیں' یہ کیوں مختلف مذاہب ہو گئے؟ خدا کی اس تلقین کی خلاف ورزی سے۔ پہلے نبی کی امت نے یہ سمجھ لیا کہ ساری سچائیاں ہمارے پاس ہیں۔ حالانکہ نبی کی دی ہوئی سچائیاں ان کے پاس باقی ہی نہیں رہی تھیں۔ جو دوسرا آیا انہوں نے اس کی مخالفت کی۔ قرآن نے کہا تھا کہ اس کی مخالفت نہیں کرنا' وہ بھی ہمارا ہی دین دے رہا ہے۔ کس انداز میں قرآن یہ بات کرتا ہے؟ وَاِذْ اَخَذَ اللّٰهُ مِيْثَاقَ النَّبِيّٖنَ لَمَآ اٰتَيْتُكُمْ مِّنْ كِتٰبٍ وَّ حِكْمَةٍ ثُمَّ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مُّصَدِّقٌ لِّمَا مَعَكُمْ لَتُؤْمِنُنَّ بِهٖ وَ لَتَنْصُرُنَّهٗ ط (3:81) یہ عہد لیا تھا خدا نے (یہاں مِيْثَاقَ النَّبِيّٖنَ ہے اس کے معنی ہیں وہ عہد جو نبیوں کے ذریعے سے ان کی امتوں سے لیا گیا' ہر امت سے یہ عہد لیا تھا ان کے نبی کی وساطت سے خدا نے) کہ تمہیں کتاب اور حکمت دی ہے' قوانین دیے ہیں تو ان کی غرض و غایت سمجھا دی ہے۔ یاد رکھو! اس کے بعد جب یہ کہ اس میں انسانی آمیزشیں ہو جائیں تو پھر ہمارا کوئی رسول آئے۔ یاد رکھیے! وہ جو یہاں مفہوم یہ لیا جاتا ہے کہ مقصد نبی اکرم ﷺ سے ہے آخری رسول آئے' وہ بات نہیں ہے ثُمَّ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ (3:81) ہے نکرہ ہے اس کے بعد جب بھی کوئی اور رسول آئے۔ مُّصَدِّقٌ لِّمَا مَعَكُمْ (3:81) پہچان کیا ہوگی کہ وہ رسول خدا ہی کا رسول ہے؟ وہ سچا کر دکھائے گا اس تعلیم کو جو تمہیں دی گئی ہے۔ تو اب آپ دیکھ لیجیے گا پھر اختلاف کی تو بات نہ ہوئی۔ خدا کی طرف سے آنے والے رسول کی پہچان یہ ہے اس کی صداقت کی کہ وہ خدا کی طرف سے پہلی صداقتوں کی تصدیق کرتا ہوا آتا ہے۔ جب وہ یہ آئے تو لَتُؤْمِنُنَّ بِهٖ (3:81) پھر تم نے اس پہ ایمان لانا۔ آپ دیکھتے ہیں کہ گروہ بندانہ جکڑ بندیوں کو کیسے توڑ رہا ہے قرآن۔ یہ نہ کہہ دینا کہ نہیں! ہمارے ہی پاس صداقت ہے ہم کسی اور کو نہیں ماننے کے لیے تیار۔ لَتُؤْمِنُنَّ بِهٖ (3:81) اس کی بات ماننا وَ لَتَنْصُرُنَّهٗ ط (3:81) پھر اس کی نصرت کرنا پھر اس کی مدد کرنا۔ قَالَ ءَاَقْرَرْتُمْ (3:81) پھر خدا ان سے پوچھتا تھا کہ کیا تم اس کا اقرار کرتے ہو؟ وَ اَخَذْتُمْ عَلٰى ذٰلِكُمْ اِصْرِيْ (3:81) اس کے اوپر وہ ان سے پکا عہد لیتا تھا۔ خدا کا ایک عہد تھا یہ جو ان امتوں سے لیا جاتا تھا کہ ہم اس رسول کی مدد کریں گے اس پہ ایمان لائیں گے۔ قَالُوْٓا اَقْرَرْنَا (3:81) اور وہ کہتے تھے کہ ہم اقرار کرتے ہیں۔ اس لیے کہ یہ چیز ان کے ایمان کا جزو بن جاتی تھی' جزوِ ایمان ہو جاتی تھی۔ قَالَ فَاشْهَدُوْا وَ اَنَا مَعَكُمْ مِّنَ الشّٰهِدِيْنَ (3:81) تو اس کے بعد خدا ان سے کہتا تھا کہ اب اس بات کی نگرانی کرنا (شھد کے معنی

کسی چیز کا نگران ہونا ہوتا ہے)' تم نے اقرار کیا ہے تو اس کی اب نگرانی کرنا اور میں بھی دیکھوں گا' نگرانی کروں گا کہ تم کرتے ہو یا نہیں کرتے۔

لفظ فسق کا لغوی مفہوم

فَمَنْ تَوَلّٰی بَعْدَ ذٰلِکَ فَاُولٰٓئِکَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ (3:82) جو اس اقرار کے بعد پھر گریز کی راہیں نکالے اور اعراض برتے اس سے تو پھر یوں سمجھ لیجیے کہ وہ صحیح پیٹرن سے الگ ہوگیا۔ دیکھیے یہاں فاسقون کا لفظ کیسا عجیب آیا ہے۔ آپ کو یاد ہوگا میں نے بتایا تھا کہ فسق کس کو کہتے ہیں؟ ہر پھل اپنے اوپر کے چھلکے کے اندر نشوونما پاتا ہے۔ آم کا چھلکا ہوتا ہے' اندر وہ آم نشوونما پاتا ہے۔ اگر کسی وقت ایسی صورت ہو کہ اندر کا جو اس کا مادہ ہے گودا ہے اس کا' وہ اس چھلکے کو توڑ کے دوسری طرف نکلنا چاہے تو آپ جانتے ہیں کہ پھل سڑ جاتا ہے۔ اپنے پیٹرن کو توڑ کر کسی اور طرف کو نکل جانا' اسے عربی زبان میں فسق کہتے ہیں۔ تَوَلّٰی (3:82) کے معنی اعراض برتنا' روگردانی کرنا' کسی دوسری طرف نکل جانا۔ جو ایسا کرے گا تو وہ اس پیٹرن سے اس خول سے نکل جائے گا جس کے اندر اس کی نشوونما ہوسکتی ہے پھر یہ پھل گل سڑ جائے گا' نشوونما پا کر تکمیل کو نہیں اپنے پہنچ سکتا۔ اس کا طریقہ یہی ہے کہ یہ جو پیٹرن خدا نے تجویز کیا ہے' اس کے اندر رہتے ہوئے آگے بڑھتے چلے جاؤ۔ دونوں آیتوں کو پھر سامنے لایے مَا کَانَ لِبَشَرٍ اَنْ یُّؤْتِیَهُ اللّٰهُ الْکِتٰبَ (3:79) دین یہی تھا' اسی کا اقرار ہر امت سے لیا گیا تھا' کسی ایک رسول تک مختص اور محدود نہیں تھا۔ اب اس کے بعد ایک چیز اس میں اور آگئی جو وضاحت طلب ہے۔ کہا یہ ہے کہ خدا نے کتاب اور حکم اور نبوت دی۔ ہمارے اس دور میں عجیب عجیب قسم کے نئے نئے شاخسانے سامنے آتے ہیں ان میں سے ایک تو یہ ہے کہ خدا کی طرف سے جو نبی آتا ہے' کچھ وہ ہوتے ہیں جن کو کتاب ملتی ہے' کچھ وہ ہوتے ہیں جن کو کتاب ہی نہیں ملتی بغیر کتاب کے ہی آجاتا ہے وہ۔ کیا کہا جائے اس ذہن کو؟ بار بار ادھر آنا پڑتا ہے۔ نظر یہ آتا ہے کہ قومیں زوال پہ چلی جاتی ہیں تو ان کی ذہنیت بھی اتنی پست ہوجاتی ہے کہ اتنی سی بات سمجھ میں نہیں آتی۔ خدا کی طرف سے رسول آتا ہے پیغامبر آتا ہے پیغام نہیں لاتا' چٹھی رساں آتا ہے چٹھی نہیں لاتا۔ سوچیے تو سہی کبھی تصور بھی یہ آسکتا تھا کہ خدا کی طرف سے ایک مبعوث ہو کوئی اور اس کے ساتھ خدا کی طرف سے کوئی پیغام نہ لائے' نبوت ہو اور کتاب نہ ہو اس کے ساتھ۔ اور یہ چیز میں صرف منطقی دلیل کی بنا پہ نہیں کہتا قرآنِ کریم نے تصریح کی ہے خود کہ ہر نبی کو کتاب دی گئی تھی۔ کَانَ النَّاسُ اُمَّةً وَّاحِدَةً قف فَبَعَثَ اللّٰهُ النَّبِیّٖنَ مُبَشِّرِیْنَ وَ مُنْذِرِیْنَ ص وَ اَنْزَلَ مَعَهُمُ الْکِتٰبَ (2:213) نوعِ انسانی ایک امتِ واحدہ تھی' انہوں نے اختلاف پیدا کیے ٹکڑے ٹکڑے ہوئے۔ خدا نے انبیا بھیجنے شروع کیے' مبشر تھے منذر

تھے۔

کوئی نبی بھی ایسا نہیں گزرا جس کو خدا نے کتاب نہ دی ہو یا فیصلہ کرنے کا اختیار نہ دیا ہو

وَ اَنْزَلَ مَعَهُمُ الْكِتٰبَ (2:213) تمام انبیا کے ساتھ کتاب بھیجی ہم نے۔ بات ہی صاف ہے خدا کے احکام کے بغیر نبی کیا کرنے کو آئے گا۔ پہلی چیز تو یہ تھی جو یہاں مغالطہ دیا گیا کہ نبی آتا ہے' کتاب نہیں ساتھ لاتا۔ قرآنِ کریم کی واضح اس قدر بالصراحت بیان کی ہوئی تعلیم کے خلاف۔ ہر نبی کے ساتھ کتاب قرآن کہتا ہے۔ میں کہتا ہوں نہ بھی کہتا تو بات واضح تھی لیکن قرآن تو وضاحت سے کہہ رہا ہے۔ پہلی چیز تو یہ۔ اگلی چیز وَالْحُكْمَ) (3:79 نبی صاحبِ حکم ہوتا ہے۔ یہاں حکمت نہیں کہا حکم کہا ہے' یہی ہے جس سے حکومت ہے۔ حکومت تو ایک اصطلاحی چیز ہے ہمارے ہاں' اصل میں اس کے معنی ہوتے ہیں قوتِ فیصلہ JUDGMENT اور پھر اس کو EXECUTE کرنا فیصلہ دینا اور پھر فیصلے کو نافذ کرنا۔ آپ کے ہاں آج کی اصطلاح میں ایک مقننہ ہوتی ہے' ایک اجرایہ ہوتی ہے۔ ایک LEGISLATURE ہوتی ہے' ایک EXECUTIVE POWER ہوتی ہے۔ قانون ساز' اگر کہیں قانون ساز اسمبلی قانون ساز ادارہ قانون بنانے کے اختیارات تو ہوں لیکن قوتِ نافذہ نہ ہو ' عصا نہ ہو تو کلیسی ہے کارِ بے بنیاد' قانون بناتے چلے جایئے فائدہ کیا ہے قانون بنانے کا؟ برادرانِ عزیز! وہ وعظ ہوتا ہے۔ وعظ ان قوانین' ہدایات کے مجموعے کا نام ہے کہ جو ہدایات اور قوانین تو ہوں' قوتِ نافذہ ساتھ اس کے نہ ہو۔ وعظ کہنے والا ''لِلاں لین ڈیا ہویا ہونداا ے اوئے دیکھو اوئے اللہ واسطے سچ بولیا کرو' جھوٹ نہ بولیا کرواوئے' چوری نہ کریا کرواوئے' بندے بنو۔ اے کجھ کرن ڈیا اے''۔ کیا فائدہ ہے اس قانون کا۔ قانون وہ قانون زندہ ہوتا ہے کہ ایک قانون بنایا جائے اس کو نافذ کرنے کی قدرت حاصل ہو اس کو۔ اسی لیے قرآن نے کتاب اور حکم کہا ہے۔ حکمت نہیں کہی حکمت تو قانون کی غرض وغایت ہوتی ہے۔ قوتِ نافذہ ہے ساتھ وَالْحُكْمَ (3:79)۔ اب یہ کہنا کہ صاحب! نبی وعظ کہنے کے لیے آیا کرتے تھے' صاحبِ حکم نہیں ہوتے تھے۔ کہا جائے گا کہ صاحب! یہاں تو کہا ہے کہ حکم ملے کسی کو ملے کسی کو نہ ملے۔ مصیبت یہ ہے کہ نہ قرآن خود جانتے تھے نہ اس کے بعد جو متبعین ہیں ان کو یہ چیز نصیب ہوئی ہے کہ قرآن کے اوپر ایک نگاہ تو ڈال لیں' وہ کیا کہتا ہے؟ تمام انبیائے کرامؑ کا ذکر آرہا ہے پیچھے سے نام بہ نام اِبْرٰهِيْمَ اِسْحٰقَ وَ يَعْقُوْبَ دَاوٗدَ سُلَيْمٰنَ اَيُّوْبَ يُوْسُفَ مُوْسٰى هٰرُوْنَ زَكَرِيَّا يَحْيٰى عِيْسٰى اِلْيَاسَ اِسْمٰعِيْلَ اَلْيَسَعَ يُوْنُسَ لُوْطًا (6:83-84-85) دیکھ رہے ہیں اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ وَ الْحُكْمَ وَ النُّبُوَّةَ ج((6:89 نبی وعظ کہنے کے لیے آئے گا؟ خالی کتاب دیدے گا آپ کو؟ کہ لو بھئی یہ خدا کی طرف سے قانون آئے ہیں''

جیہڑا دیے اوہدا اوی بھلا جیہڑا نہ دیے اوہدا اوی بھلا‘‘ کوئی بات ہے یہ۔ اب یہ بات نہیں ہے کہ وہ مثلاً اتنی بڑی امپائر بنالی ہو تو یہ کہیں کہ صاحب حکومت تھی۔ خواہ اس کی اپنی جماعت کیوں نہ ہو اپنے FOLLOWERS کیوں نہ ہوں، وہ یہ نقشہ قائم کر کے جائے گا کہ ان سے خدا کے قوانین کی اطاعت ایک حکومت کے انداز سے کرائے۔ نبی کسی غیر کی حکومت کے اندر محکوم بن کے نہیں رہ سکتا۔ اگر صورت یہ ہو کہ محکومیت دوسرے کی اختیار کی ہے اور وہ بھی کفار کی محکومیت وہ اختیار کی ہوئی ہے اور خدا کے احکام و قوانین وحی کی رو سے پا کے دیے چلا جاتا ہے، وعظ کہہ رہا ہے وہ شخص، خود بھی کفار کے احکام کا اتباع کر رہا ہے، اپنے متبعین سے بھی ان کا اتباع کرا رہا ہے اور خدا کے احکام وحی سے پا کے دنیا کو دے رہا ہے۔ اللہ اکبر۔ تصور نہیں آ سکتا۔ اب یہ چیز کہ صاحب! قرآنِ کریم نے چند انبیا ہیں کہ جن کے متعلق کہا ہے ان کو یہ ملکِ عظیم دیا تھا حکومت دی تھی سب کے متعلق تو یہ نہیں کہا۔ قرآنِ کریم تاریخ کی کتاب نہیں ہے۔ اول تو قرآن نے یہ کہا ہے کہ ہم نے ہر بستی میں رسول بھیجا، ہر ملک میں بھیجا، ہر زمانے میں بھیجا۔ چند ایک رسول ہیں جن کا ذکر قرآن میں آیا ہے۔ پھر ہر رسول کی بھی پوری کی پوری سوانح حیات نہیں ہے، ان کی زندگیوں کا کوئی اہم واقعہ جو ہے وہ سامنے لایا ہے قرآن۔ لیکن جب اس نے یہ چیز کہہ دی ہے اُولٰٓئِکَ الَّذِیۡنَ اٰتَیۡنٰہُمُ الۡکِتٰبَ وَ الۡحُکۡمَ وَ النُّبُوَّۃَ ج (6:89) تو کیا کوئی شخص جو قرآن پہ ایمان رکھتا ہے وہ یہ تسلیم کرے گا کہ کوئی ایسا نبی بھی گذرا تھا جس کو کتاب تو ملی تھی حکم نہیں ملا تھا، اقتدارِ حکومت نہیں ملا تھا۔ قرآن کہتا ہے۔ پیش کیا کرتے ہیں انبیائے کرامؑ میں حضرتِ عیسٰیؑ کی زندگی صاحب۔ میں کہہ رہا ہوں مجھے ضرورت نہیں ہے نہ تاریخ میں جانے کی، نہ منطق گھولنے کی۔ یہاں عیسٰیؑ کا نام لکھا ہے قرآن نے یعنی وہ نبیؑ بھی ہیں، ہارونؑ ہیں ایوبؑ ہیں عیسٰیؑ ہیں الیاسؑ ہیں اسماعیلؑ ہیں یونسؑ ہیں جن کے متعلق کہا جاتا ہے کہ صاحب! ان کی تو حکومت کا کچھ ذکر ہی نہیں ہے۔ نام لے کے ان کے کہا ہے اُولٰٓئِکَ الَّذِیۡنَ اٰتَیۡنٰہُمُ الۡکِتٰبَ وَ الۡحُکۡمَ (6:89) او حکومت کے لیے یہ ضروری نہیں ہے کہ کوئی امپائر اتنی بڑی قائم کی، ایک چھوٹی سی کمیونٹی کو بھی اگر وہ جو وہاں حکومت ہے اس کے دائرے سے باہر لے جا کر، خدا کے احکام ان کے اوپر نافذ کرتا ہے اور اس کے مطابق وہ زندگی بسر کرتے ہیں تو یہ صاحبِ حکم ہو گیا۔

انبیائے کرامؑ کا ہجرت کرنا اپنے اندر ایک عظیم مقصد لیے ہوئے ہوتا تھا

آپ کو معلوم ہے کہ یہ نبی ہجرت کیوں کیا کرتا تھا؟ کوئی بھی جگہ یا کوئی ملک یا قوم ایسا ہو سکتا ہے کہ وہاں کوئی شخص اٹھ کے یہ کہے کہ بھئی! سچ بولا کرو چوری نہ کیا کرو زنا نہ کیا کرو ڈاکہ زانی نہ کرو ایک دوسرے کو برا نہ کہو اور لوگ اس کو ملک سے نکال دیں اپنے۔ یہ کیوں ہجرت کرتا تھا نبی؟ وہ کوشش کرتا تھا کہ جہاں پیدا ہوا ہے، وہاں اس کے گرد ایک جماعت جو جمع ہوئی ہے، وہاں جو

حکومت قائم ہے اس کے علی الرغم یا اس حکومت کو بدل کے اس کی جگہ خدا کی حکومت قائم کرے پہلی اس کی کوشش یہ ہوتی تھی۔ 478 **آلِ عمران** وہ دیکھتا تھا کہ حالات ساز گار نہیں ہو رہے اس کے لیے تو اپنا وقت ضائع نہیں کرتا تھا وہ اپنی اس جماعت کو لے کے اس فضا میں چلا جاتا تھا۔ اِنِّیۡ ذَاهِبٌ اِلٰی رَبِّیۡ (37:99) کہتا ہے ابراہیمؑ۔ یہاں کیا خدا نہیں تھا جہاں وہ پیدا ہوئے تھے؟ یہ کیا تھا کونسا خدا تھا جس کی طرف یہ جا رہے تھے؟ کون سی زمین تھی جس میں خدا کی طرف وہ جا رہا ہے؟ اِنِّیۡ مُهَاجِرٌ اِلٰی رَبِّیۡ (29:26) کہتا ہے وہ۔ وہ اس فضا کی طرف منتقل ہو جاتا تھا کہ جہاں جا کر پھر وہ اپنے متبعین سے ہی سہی ایک جماعت سے ہی سہی ایک پارٹی سے سہی صرف خالص قوانینِ خداوندی کی اطاعت کراتا تھا۔ عزیزانِ من! ہر نبی یہ کر کے جاتا تھا لہٰذا یہ سوال ہی نہیں ہے کہ کوئی نبی آئے اور وہ ساری عمر خود بھی غیروں کی اطاعت کرتا رہے اپنے متبعین سے بھی غیرِ خداوندی اطاعت کراتا چلا جائے اور وعظ کے طور پر یہ پند و نصائح کر جائے سچ بولا کرو جھوٹ نہ بولا کرو۔ تصور ہی نہیں ان کو آیا کہ نبوت کا مقام کیا ہوتا ہے؟ نبی بہت بڑا انقلاب آفریں شخصیت ہوتی ہے باطل کے بندھنوں کو توڑ دیتا ہے۔ وہ نبی جو آتا ہے وعظ کہنے کے لیے نہیں آتا۔ قرآن کی شہادت ہمارے پاس ہے تمام انبیا کے ذکر کے بعد کہا ہے کہ ہم نے ان کو کتاب دی اور حکم دیا۔ نبی یہ کرنے آتا تھا۔ اب کہا جائے گا کہ صاحب! ٹھیک ہے نبی تک تو یہ معاملہ ٹھیک ہے وہ یہ کرتا تھا اور نبی کے چلے جانے کے بعد وہ جو امت اس کی ہوتی ہے وہ وارث ہو جاتی ہے اس کی کتاب کی اس کے پیغامِ نبوت کی۔ اور اس کے بعد کیا پھر یہ چیز وہ امت جو ہے وہ بغیر حکم یا بغیر حکومت کے اس تعلیم کی پیرو کار سمجھی جا سکتی ہے؟

وحی تو ہو مگر خدا کی کتاب کے مطابق قوتِ فیصلہ ناپید ہو جائے تو قوم صرف وعظ کہنے والی بن کر رہ جاتی ہے

کیا یہ تصور کیا جا سکتا ہے یا تسلیم کیا جا سکتا ہے کہ نبی کی امت ہو نبی کی کتاب یا پیغام جو ہے پھر اس کو وعظ کے طور پہ اپنے ہاں دہراتی رہے اور محکومیت وہ غیرِ خداوندی کی اختیار کیے ہوئے ہو کیا اس کا نام اسلام قرار دیا جائے گا؟ کیا ان کو مسلم قرار دیا جائے گا؟ اگر تو قرآن یہ کہے کہ یہ حکومت کی بات جو تھی یہ صرف نبی تک محدود تھی پھر تصور ہو سکتا ہے کہ بعد میں خواہ اپنی حکومت نہ بھی رہے تو اللہ کے ان احکام کے اوپر انفرادی طور پہ ہی انسان عمل کرتا رہے تو ٹھیک ہے یہ مذہب پرست ہو جاتا ہے۔ مذہب پرست تو ہو جاتا ہے سوال یہ ہے کہ کیا دین کا اتباع بھی یہ کرتا ہے؟ قرآن کہتا ہے کہ نبی کے بعد یہ تینوں چیزیں جو انبیا کو اس نے کہی

ہیں وہ کہتا ہے' ان کی امت کے اندر یہ تینوں چیزیں برقرار رہتی ہیں۔ اور اس وقت تک وہ امت دین کی حامل قرار پاتی ہے۔[478] وہاں **آلِ عمران**
انبیا کا ذکر تھا انہی الفاظ میں یہ کہا ہے وَلَقَدْ اٰتَيْنَا بَنِيْٓ اِسْرَاۗءِيْلَ الْكِتٰبَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ (45:16) اس قوم کے پاس یہ تینوں چیزیں موجود ہوتی ہیں: نبوت کا بتایا ہوا راستہ' خدا کی کتاب وَالْحُكْمَ (45:16) جب تک یہ قوتِ نافذہ رہتی ہے اس قوم کے پاس وہ خدا کی کتاب پر چلنے کی مدعی بھی ہو سکتی ہے اور اسے کہا بھی جا سکتا ہے کہ دین پر چل رہی ہے۔ جب قوتِ نافذہ نہیں رہتی تو بے شک اس کے پاس کتاب رہے نبوت کے تمام جتنے بھی بصیرت افروز احکامات ہیں اس کے پاس وہ بھی اس کے پاس رہیں' اگر اس میں حکم نہیں باقی رہا ہوا وہ دین پہ نہیں چل سکتی' وعظ کہنے والی قوم بن جاتی ہے۔ اور یہ تھا تیسرا ٹکڑا جو اس فرنگی زدہ مسٹرؒ نے یہ کہا تھا کہ اسلامی حکومت کا امتیاز یہ ہے کہ اس میں اطاعت کا مرجع خدا کی ذات کے علاوہ کوئی نہیں ہوتا۔ اور اس کی عملی شکل اس کی کتاب کے احکامات کی تعمیل ہوتی ہے اور اس تعمیل کے لیے ایک مملکت کی ضرورت ہوتی ہے۔ دیکھتے ہیں یہ تھی بنیاد پاکستان کی' یہ ہیں قرآن کے احکام۔ وَالْحُكْمَ اسؒ نے سمجھا تھا کہ کتاب بھی تمہارے پاس موجود ہے' ٹھیک ہے تم تعلیم بھی اس کی دے سکتے ہو لیکن اگر وہ قوتِ نافذہ نہیں ہے تمہارے پاس تو دین پہ نہیں تم چل سکتے۔ اور یہی چیز تھی جو اس سے پیشتر حکیم الامتؒ ان سے کہہ رہا تھا کہ

ملاں کو جو ہے ہند میں سجدے کی اجازت
ناداں یہ سمجھتا ہے کہ اسلام ہے آزاد

غیروں کی حکومت میں دین پر عمل ہو ہی نہیں سکتا

سجدے کی اجازت سے اسلام آزاد نہیں ہوتا' مذہب آزاد ہوتے ہیں۔ آپ کو مذہبی آزادی ہر غیر خداوندی حکومت دیدے گی۔ وکٹوریہ نے بھی جسے غدر کہا جاتا ہے جو آزادی کی جنگ تھی' اس کے بعد جو اس کا DECLARATION آیا تھا اس میں مذہب کی آزادی سب سے پہلے اس نے دی۔ وہی مذہب کی آزادی ہندوستان میں آپ کو ہندو دے رہا تھا جس پہ ہمارے علمائے کرام مطمئن تھے کہ صاحب اسلام کو آزادی حاصل ہے۔ اسی لیے سر پیپٹ کے کہا تھا اس مرنے والے نے بسترِ مرگ سے کہ

بہ مصطفٰی ﷺ برساں خویش را کہ دیں ہمہ

اوست

مدنی سے یہ کہہ رہا تھا

اگر باُو نہ رسیدی تمام بو لہبی ایست

مصطفٰی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم وعظ کہہ کے نہیں چلے گئے تھے' کتاب کے ساتھ وَالْحُکْمَ (45:16) صاحبِ اقتدار تھے'ایک مملکت قائم کی تھی' ایک TERRITORY تھی جس کے اندر خدا کے قوانین کو عملاً نافذ کیا جاتا تھا۔عزیزانِ من! یہی چیز تھی یہ تصور تھا جو تیرہ سو سال کے بعد پھر ہندوستان میں ہمیں آ کے ملا۔ بڑی خوش نصیب تھی یہ قوم اس دور میں کہ جس کو دوبارہ کم ازکم دین کا صحیح تصور وہاں دیا گیا کہ اسے دین کہتے ہیں۔کتاب کے ساتھ حکم' ہر نبی کے پاس حکم' صاحبِ اقتدار' صاحبِ حکومت' خدا کے قانون کو نافذ کرنے کی قوت رکھنے والا۔خیر! یہی تھا وہ اقرار جو ہر امت سے لیا جاتا تھا کہ یہ نہ سمجھ لینا کہ اس کے ساتھ بات ختم ہوگئی جب بھی CONTINUITY OF GOVERNMENT ہوتی ہے حکومت جب مسلسل چلتی ہے تو جو ایک کے بعد دوسرا آتا ہے اس کی اطاعت درحقیقت حکومت کی اطاعت ہوتی ہے۔یہ نہیں ہوتا کہ وہ ختم ہوگیا اب اس کے بعد میں کیوں اطاعت کروں؟ سو سال کے اندر ہندوستان میں انگریزوں کے جتنے وائسرائے آئے' پانچ پانچ سال کے لیے آتے تھے' کبھی تین تین سال کے بعد ہی چلا جاتا تھا وہ۔یہ تھوڑا تھا کہ جو نیا وائسرائے آیا ہے اس کے بعد آپ کہہ دیں کہ نہیں صاحب! ہم تو پرانے کی اطاعت کرتے چلے جائیں گے آپ کون آ گئے اس میں سے' بالکل نہیں۔یہ جو اتھارٹی ہے اشخاص بدلتے ہیں' قانون وہی رہتا ہے۔دین سے انحراف اس وقت ہوگا جب کوئی اپنے قوانین کی اطاعت آپ سے کرانے لگ جائے گا۔جب تک قوانینِ خداوندی کی اطاعت کراتا چلا جائے گا' یہ اس فرد کی اطاعت نہیں ہوگی' قانون کی اطاعت ہوگی بذریعہ ہیئتِ حاکمیہ کے بذریعہ اجرایہ کے EXECUTIVE کے THROUGH قانون کی اطاعت۔جب آپ کو کوئی سپاہی کہتا ہے کہ صاحب! بائیں طرف چلیے' آپ سپاہی کا حکم نہیں مان رہے ہوتے' آپ مملکت کا قانون مان رہے ہوتے ہیں۔رسول آپ سے یہ کہنے کے لیے آتا ہے کہ تمہارے خدا نے کہا ہے KEEP TO THE LEFT (مثال کے طور پہ) آپ اس کی اطاعت کرتے ہیں۔یہ اطاعت قانون کی اطاعت ہوتی ہے۔دین میں قانون کی اطاعت ہوتی ہے اور اطاعت کرانے کی قوت' قوتِ نافذہ ہوتی ہے۔یہ ہے وہ رسول کراتا ہے اور اسے حکم یا حکومت کہا جاتا ہے۔اطاعت کا نام سمجھ لیا آپ نے۔

خارجی کائنات میں قانونِ خداوندی کی حکمرانی اور اس کی افادیت اور نوعیت

اب دیکھیے دین کو کس طرح سے سمٹا دیا چار لفظوں میں اَفَغَیْرَ دِیْنِ اللّٰہِ یَبْغُوْنَ (3:83) تو کیا یہ لوگ اللہ کے سوا کسی اور دین 478 **آلِ عمران**
کو چاہتے ہیں۔ بھئی! اللہ کا دین کیا ہے؟ اتنی بات کہنے سے تو صاف نہیں ہوئی یہ تو آیت کے پہلے چار لفظ ہیں۔ کیا یہ لوگ اللہ کے دین کے علاوہ کوئی اور دین چاہتے ہیں حالانکہ وَ لَہٗ اَسْلَمَ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ طَوْعًا وَّ کَرْھًا (3:83) اور دیکھتے نہیں اس کائنات کے اندر ہر شے اس کے قوانین کے تابع چلتی چلی جا رہی ہے۔ یہ ہے دینِ خداوندی۔ کبھی آپ نے یہ دیکھا ہے کہ آگ مالا تو یہ جیسے کہ گرمی ہے' حرارت ہے' جلا دوں گی' بھون دوں گی اور اس کے بعد ہاتھ ڈالیے تو وہ ٹھنڈک دے آپ کو؟ وہ جو کہتی ہے' وہ ہوتی ہے جو دعویٰ کرتی ہے' کر کے دکھاتی ہے۔ وہاں یہ نہیں ہوتا کہ الفاظ کے ذریعے سے ساری چیزیں ہوتی ہیں۔ نظریہ اور تھیوری تو محض سائنٹسٹ کی کتاب میں ہوتا ہے۔ فطرت کی پیدا کردہ چیز عمل پیرا ہوتی ہے عملاً خدا کے قانون کے اوپر۔ آم کے درخت کا پتہ پتہ پکارتا ہے کہ میں آم ہوں اس کی شہادت دیتا ہے جب موسم آتا ہے تو آم لگتا ہے اس کے اندر۔ وَ لَہٗ اَسْلَمَ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ (3:83) یہ ہے دین اللہ۔ کیا اس کے سوا کوئی اور بھی اپنے لیے تم چاہتے ہو؟ دیکھتے نہیں ہو دین اللہ۔ کیا بات ہے صاحب۔

خارجی کائنات کی ہر شے قانونِ خداوندی کی اطاعت طوعاً کر رہی ہے

عزیزانِ من! بڑی غور طلب ہے یہ آیت۔ اَسْلَمَ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ طَوْعًا وَّ کَرْھًا (3:83) طوعاً تو ہوتا ہے بطیب خاطر' کرہاً ہوتا ہے مجبوراً' دل تو نہ مانے لیکن کرنا پڑے۔ تو کیا یہ صورت ہے؟ کائنات کی جتنی چیزیں ہیں ان میں تو کوئی صورت ایسی ہے نہیں کہ وہ کرہاً اطاعت کر رہی ہو۔ یہاں مَنْ کہا ہے قرآنِ کریم نے۔ عربی زبان میں مَنْ کے اندر بے جان اور جاندار' انسان اور غیرِ انسان دونوں آ جاتے ہیں۔ جہاں ما کہا ہے قرآن نے وہاں یہ ہے سَبَّحَ لِلّٰہِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ (57:1, 59:1,61:1) وہ طوعاً اور کرہاً نہیں۔ یَسْجُدُ لَہٗ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَ مَنْ فِی الْاَرْضِ (22:18)۔ اور جہاں کہا ہے اَسْلَمَ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ طَوْعًا وَّ کَرْھًا (3:83) طوعاً جو ہے یہ جتنی باہر کی خارجی کائنات ہے وہ ان قوانینِ خداوندی کی اطاعت طوعاً کر رہی ہے' استکراہاً نہیں کر رہے ہیں کہ اندر سے بڑبڑاتے چلے جائیں اور خارج میں اطاعت کرنی پڑے' یہ صورت نہیں ہے۔ قرآن نے اس کی وضاحت خود کر دی۔ عزیزانِ من! بڑی غور طلب ہیں یہ آیات اس لیے ان کو ذہن میں بھی رکھیے گا' نوٹ بھی ان کو کیجیے گا۔ میں نے عرض کیا ہے کہ خارجی کائنات کی ہر شے قانونِ خداوندی کی اطاعت طوعاً

کر رہی ہے۔ ثُمَّ اسۡتَوٰۤی اِلَی السَّمَآءِ وَهِیَ دُخَانٌ ((41:11 یہ بات تو بڑی عظیم ہے لیکن میں اپنے مفہوم تک ہی رہوں گا۔ بر
پیش نظر موضوع ہے۔ فَقَالَ لَهَا وَلِلۡاَرۡضِ ائۡتِیَا طَوۡعًا اَوۡ كَرۡهًا ((41:11 (بات کہنے کی سمجھانے کی ہے) سماوات اور ارض سے ہم نے کہا کہ تمہیں ان قوانین کی اطاعت کرنی ہوگی طوعاً کرو یا کرھاً کرو تمہیں یہ کرنی ہوگی۔ قَالَتَاۤ اَتَیۡنَا طَآئِعِیۡنَ ((41:11 انہوں نے کہا کرہاً کیوں صاحب ہم تو بطیب خاطر اطاعت کریں گے۔ تو نظر آیا کہ سماوات اور ارض کے اندر جو خارجی کائنات ہے جسے اختیار و ارادہ نہیں، قرآن کہتا ہے کہ انہوں نے تو اطاعت طوعاً کی ہے۔ اطاعت کہتے ہی اسے ہیں کہ جو طوعاً کی جائے دل کی فرماں برداری سے۔ اس میں یہ چیز نہ ہو کہ کچھ کرنے پہ مجبوراً آپ ہو رہے ہیں، کر تو رہے ہیں مرتے دھرتے کر رہے ہیں۔ یہ کیفیت نہ ہو، طوعاً کیسے چلے جا رہے ہیں۔

قانون کی اطاعت کرنے کے سلسلہ میں انسان کی کیفیت اور قانونِ مکافات

لیکن انسانوں کی یہ صورت نہیں۔ انسانوں میں دو کیٹگریز ہو جاتی ہیں۔ قرآنِ کریم نے خود استثنا کی ہے انسانوں کی اَلَمۡ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ یَسۡجُدُ لَهٗ مَنۡ فِی السَّمٰوٰتِ وَمَنۡ فِی الۡاَرۡضِ ((22:18 دیکھیے یہاں پھر من آیا ہے۔ سجدہ ریز ہے اس کے سامنے جو بھی کائنات کے اندر ہے۔ وَالشَّمۡسُ وَالۡقَمَرُ وَالنُّجُوۡمُ وَالۡجِبَالُ وَالشَّجَرُ وَالدَّوَآبُّ ((22:18 تمام ان چیزوں کے متعلق کہا یہ سب کی سب اطاعت کر رہی ہیں، کسی کو مجالِ انکار نہیں، یارائے سرکشی نہیں، اس لیے کہ وہ طوعاً یہ کچھ کر رہی ہیں۔ تمام کے متعلق یہاں لفظ مَنۡ ہے جس میں انسان بھی آئیں گے۔ وَكَثِیۡرٌ مِّنَ النَّاسِ ((22:18 لیکن لوگوں میں سے ایک اکثریت کرتی ہے، الناس پورے کے پورے نہیں کہا گیا وَكَثِیۡرٌ حَقَّ عَلَیۡهِ الۡعَذَابُ ((22:18 اور بہت سے ان میں ایسے بھی ہیں کہ جو سرکشی کرتے ہیں، قانون کے مطابق نہیں چلتے، اس کی سزا بھگتتے ہیں۔ انسان دو کیٹگریز کے اندر تقسیم ہو گیا: کچھ تو وہ ہیں جو طوعاً کرتے ہیں کون ہیں یہ؟ وہ جماعتِ مومنین جو قلب اور دماغ کی کامل رضامندی سے ان کی صداقتوں کو تسلیم کرتی ہے پھر بطیب خاطر اس کی اطاعت کرتی ہے۔ یہ تو ہو گئے جو طوعاً اختیار کرتے ہیں۔ یہ کرہاً کون اختیار کرتے ہیں؟ زمانے کے تقاضے مار مار کے جن کو لے آتے ہیں اس طرف۔ اور ان میں بدقسمتی سے سب سے پہلے ہم مسلمانوں کی قوم ہے۔ دنیا نے کہا کہ ملوکیت بہترین اندازِ نظم و نسقِ حکومت ہے، چلے آئے۔ قرآن نے آ کے کہا کہ بالکل غلط ہے۔ کسی انسان کو اس کا حق حاصل نہیں ہے۔ نہ ہی یہ وہ چیز ہے کہ جو وراثتاً باپ سے بیٹے کو ملتی چلی آئے۔ لوگوں نے طوعاً اس کو قبول نہ کیا۔ بادشاہتیں قائم رہیں۔ قرآن دینے والے نے یہ نہیں کہا اس کے بعد کہ اسی وقت جبراً ان کو منوا لو۔ اس نے کہا کوئی بات نہیں ہے چھوڑ دو ان کو دیکھو تو سہی۔ زمانے کے تقاضے

بدلتے چلے گئے اس کے بعد زمانے کے تقاضوں کے تھپیڑوں نے مجبور کر دیا انسان کو کہ وہ ملوکیت کو پاش پاش کر کے اس کی جگہ دوسرا نظامِ حکومت قائم کرے' کرہاً مانا انسان نے۔ نظامِ سرمایہ داری چلا آ رہا ہے صدیوں سے چلا آ رہا ہے۔ اسلام نے آ کے کہا کہ یہ بالکل باطل کا ابلیسی نظام ہے۔ کسی انسان کو حق حاصل نہیں ہے کہ دوسرے کی محنت کو EXPLOITE کرلے' استحصال اس کا کر لے۔ بڑے بڑے فلاسفرز نے اس کے خلاف دعوے کیے۔ کہا نہیں صاحب! صحیح نظامِ فطرت ہی یہی ہے۔ پاؤں چلنے کے لیے بنائے گئے ہیں۔ آنکھ دیکھنے کے لیے بنائی گئی ہے۔ اندازہ لگایئے منطق بھی کہاں ابلیسانہ انسان کو لے جاتی ہے؟ کہ یہی صحیح ہے۔ قرآن نے ایک جماعت تیار کی جس نے طوعاً اسے قبول کیا اس چیز کو کہ کسی کو حق حاصل نہیں ہے کہ دوسرے کی محنت کا ما حصل لے جائے۔ یہ جماعتِ مؤمنین تھی جو رسول اللہ ﷺ نے تیار کی۔ اس کے بعد ہم نے بھی اسے چھوڑ دیا' اسی نظام کی طرف آ گئے۔ اور اس کے بعد آج دیکھ رہے ہیں آپ کہ زمانے کے تقاضے اس کا سیلاب اور اس کے تھپیڑے مار مار کر ساری دنیا کو اس طرف لا رہے ہیں اور سب سے آخر میں ہمیں پیٹ پیٹ کے مار مار کے اس طرف لا رہے ہیں۔ مجبور ہو رہا ہے انسان اس چیز کو ماننے کے لیے کہ جو چیز اس کو طوعاً ماننی تھی اس سے کتنا عرصہ پہلے۔ کرہاً منوا رہا ہے زمانہ ایک ایک چیز۔ غلامی: یونان کے فلاسفرز میں دیکھیے ارسطو کے ہاں ستر غلام تھے' ستر دلیلیں اس نے دی ہیں غلامی کے حق میں۔ مسلمہ چلا آ رہا تھا انسانیت کا۔ قرآن نے آن کے اس کو حرفِ باطل کی طرح مٹا دیا اس نے کہا وَ لَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِیْٓ اٰدَمَ (17:70) ہر انسانی بچہ یکساں طور پہ واجب التکریم ہے۔ انسانوں کی ایک جماعت پیدا کی کہ جس نے اس کو طوعاً اس کو مٹایا' مساواتِ انسانیہ کو اپنے ہاں قائم کیا۔ جس نے بلالِ حبشیؓ کو سید کہا۔ اس کے بعد اس قوم نے خود اپنے ہاں غلامی کو رائج کر لیا۔ دنیا نے بھی غلامی کو اپنے ہاں جاری رکھا۔ آپ نے دیکھا کہ زمانے کے تقاضوں نے کس طرح سے دنیا کو مجبور کر دیا کہ وہ اس لعنت کو اپنے ہاں سے ہٹائیں۔ لیکن ان کرہاً ماننے والوں میں بھی بدقسمتی ہماری دیکھیے کہ جن کے ہاں قرآن موجود ہے اور اس کو اتنا دہرایا جاتا ہے' سب سے آخر میں ان کی باری کہیں آتی ہے۔

صراطِ مستقیم کو قبول کرنے والوں میں قومِ مسلم کی حالت

یو این او نے جب یہ چارٹر اپنے ہاں منظور کیا ہے HUMAN RIGHTS کا اس میں یہ شق تھی کہ غلامی کو مٹایا جائے گا۔ دنیا کی کافر' مشرک قوموں نے وہاں دستخط کیے کہ مٹایا جائے۔ ایک استثنا تھی اس میں اور وہ تھی سعودی حکومت کے آپ کے ہاں کے امیر المؤمنین' انہوں نے کہا کہ میں اس پہ دستخط نہیں کر سکتا کیوں کہ یہ اسلام میں مداخلت کے مرادف ہے۔ اللہ اکبر۔

غلامی کو مٹانے کے چارٹر پہ ایک مسلمان کا امیر دستخط نہیں کرسکتا۔ آپ کو معلوم ہے اس کے بعد اب کیا حشر وہاں ہوا ہے؟ دوسری 478 آلِ عمران جنریشن میں آنے کے بعد کرہاً اس کو مٹانا پڑا۔ طوعاً نہیں مانو گے تو یہ احکام جو ہیں خدا کے یہ تو وعظ نہیں ہے' خود نہیں مانو گے' زمانے کے تقاضے مار مار کے تمہیں منائیں گے۔ اس لیے کہ وہ وَ اِلَيۡهِ يُرۡجَعُوۡنَ (3:83) تم کو پلٹ کے لایا جائے گا اس طرف۔ دیکھیے یہ یُرجعون کیا چیز کہہ دی ہے؟ ذرا دیکھیں! لایا جائے گا تم کو۔ خود نہیں آ ؤ گے تو یُرجعون لوٹا کر لائے جاؤ گے یہاں۔ کہا یہ ہے دین۔ اب دیکھیے اس کو۔ وَ لَهٗۤ اَسۡلَمَ مَنۡ فِى السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ طَوۡعًا وَّ كَرۡهًا وَّاِلَيۡهِ يُرۡجَعُوۡنَ (3:83) کیا اس کے علاوہ کوئی اور دین تم تلاش کر رہے ہو؟ جاؤ کرو تلاش ہم تمہیں مجبور نہیں کرتے۔ عزیزانِ من! یہ ہے دین۔ اب پھر سن لیجیے کہ اَفَغَيۡرَ دِيۡنِ اللّٰهِ يَبۡغُوۡنَ (3:83) دینِ خداوندی کے علاوہ کوئی اور دین کوئی اور نظام کوئی اطاعت کے لیے اور قوانین ان کی تلاش کرتے پھر رہے ہیں یہ؟ سوال ہی نہیں ہے۔ کائنات کی ہر شے اس کے تابع چلتی ہے۔ انسانوں کی یہ کیفیت ہے ضرور کہ ان میں سے ایک جماعت ابتداً جو ہوتی ہے {وہ طوعاً مانتی ہے اس کو لیکن پھر باقی ان کے ہاں کے جو ہیں وہ یوں نہیں مانتے تو حقیقت اپنے آپ کو منوا لیتی ہے۔ خود نہیں اس طرف آتے اِلَيۡهِ يُرۡجَعُوۡنَ (3:83) ادھر لائے جاتے ہیں پھر یہ۔ اس کے سوا چارہ کار ہی نہیں ہے۔ کوئی دوسرا دین ہے ہی نہیں کہ جس کے اوپر کوئی آئے۔ بس فرق اتنا ہے کہ یہ اگر پہلے آئیں وہ جو کہتے ہیں کہ

آنچہ دانا کند' کند ناداں

لیک بعد از خرابئ بسیار

حقائق پر مبنی قانون کو نہ ماننے والوں کی حالتِ زار

عقل مند جو ایک چیز اختیار کرتا ہے' بے وقوف کو بھی وہ اختیار کرنی پڑتی ہے لیکن بہت سے جوتے کھانے کے بعد۔ الیہ یرجعون آنا پڑے گا' لائے جاؤ گے یہاں' مفر نہیں دینِ خداوندی کے علاوہ۔ اور یہ وجہ ہے جو قرآن نے کہا ہے لِيُظۡهِرَهٗ عَلَى الدِّيۡنِ كُلِّهٖ (9:33) ہر نظامِ عالم کے اوپر غالب آ کر رہے گا۔ طوعاً نہیں لاؤ گے' کرہاً لانا پڑے گا صاحب' دوسرا نظام انسانوں میں چل ہی نہیں سکتا الیہ یُرجعون' آنا پڑے گا۔ لیکن انسان کی کیفیت یہ ہے کہ اسے جو اختیار و ارادہ دیا ہے بس اس سے ''اے بھلیا مانساں وانگوں بندے دا پتر بن کے نئیں اوندا ایدھر'' اس کی کیفیت یہ ہے: وہ سردار جی تھے نمبردار' گاؤں میں گیا سپاہی' اس پہ کیا کچھ جرمانہ سا۔ اسے کہا کہ تمہیں یہ سو پیاز کے گنڈے کھانے پڑیں گے۔ اس نے کہا کہ نہیں میں تو نہیں کھاؤں گا۔ اس نے دو

جوتے سر پہ مارے ایک اٹھا کے کھا لیا۔ اس نے کہا دوسرا کھا کہنے لگا ''میں تے نئیں کھاندا' اوہنے دو ہور لا یاں ۔ سو جوتیاں وی 478 **آلِ عمران**
کھادیاں تے سوگنڈے وی کھادے''۔ یہ ہے کرہاً ماننا کرہاً منّنے والا ''سو جوتیاں وی کھاندا اے تے سوگنڈے وی کھاندا اے'' ۔انسان کی تاریخ ساری یہ ہے کہ جس نے قانونِ خداوندی کو دیکھ کے مان لیا ہے'اس نے تو وہ صحیح ہے پیاز کھایا ہے اس نے' جس نے یہ نہیں کیا اس نے سو جوتے بھی کھائے ہیں اور سو پیاز بھی کھائے ہیں۔ عزیزانِ من! کھانا پڑے گا ہر ایک کو الیہ یُرجعون۔ لیکن انسان کی کیفیت یہ ہے قرآن کہتا ہے کتنے حسین انداز میں بات کرتا ہے کہ بڑا ہی ظالم واقع ہوا ہے' بڑا ہی جاہل واقع ہوا ہے۔

قرآنِ حکیم کی آیت (33:72) کے غلط تراجم کی نوعیت اور پھر اس کا صحیح مفہوم

(33:72) وہ مشہور آیت جو آپ کے ہاں کی ہے اور جس کے غلط مفہوم نے پوچھو نہیں پھر کہاں سے کہاں بات لے جاتے ہیں۔ اِنَّا عَرَضۡنَا الۡاَمَانَةَ عَلَى السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضِ وَ الۡجِبَالِ (33:72) ہم نے اپنی اس امانت کو سماوات پر زمین پر پہاڑوں کے سامنے پیش کیا۔ پہلے میں آپ کو یہ بتا دوں اس کا جو غلط ترجمہ آپ کے ہاں ہے وہ کیا ہے؟ پہلے وہ سن لیجیے پھر اس کے بعد اس کثافت کے مقابلے میں لطافت آئے گی تو وہ زیادہ نکھرے گی۔ ہم نے اپنی امانت کو سماوات اور پہاڑوں کے سامنے پیش کیا فَاَبَيۡنَ اَنۡ يَّحۡمِلۡنَهَا (33:72) توبہ توبہ کر اٹھے انہوں نے کہا کہ نہیں صاحب ہم نہیں اس کو اٹھا سکتے' بالکل نہیں اٹھا سکتے وَ اَشۡفَقۡنَ مِنۡهَا (33:72) ڈر گئے کانپ گئے۔ یعنی یہ پیش کرنے والے کا دیکھیے کہ جس چیز کو وہ اٹھا ہی نہیں سکتے' وہ کانپ رہے ہیں' ڈر رہے ہیں' اس کے سامنے پیش کیا جا رہا ہے۔ بہر حال! پیش کیا' انہوں نے انکار کر دیا' نہیں اٹھائیں گے' بالکل نہیں اٹھائیں گے۔ وَ حَمَلَهَا الۡاِنۡسَانُ (33:72) انسان نے جب یہ چیز دیکھی کہ صاحب ''ایہدی تے رہ نئیں اوندی ہیگی' اوہ ہر ایک نے جو انکار کر دتا تے اوہنے کہیا پئی اے گھر موڑ کے لے جائے گا' فرشتے کی کہن گے'' انسان نے کہا کہ بابا لاؤ میرے سر پہ رکھ دو۔ وہ سر پہ رکھ دیا۔ تو اس کے بعد یہ ہونا چاہیے تھا کہ بھئی تمہارا شکریہ تم نے میری عزت رکھ لی' وہ بوجھ میرا اٹھا لیا۔ وہ رکھا گیا اور کہا اِنَّهٗ كَانَ ظَلُوۡمًا جَهُوۡلًا (33:72) بڑا ہی بے وقوف ہے'' فٹے منہ تیرا۔ بڑا' الوسی چک لیا سو''۔ عزیزانِ من! یہ ترجمہ کیا جاتا ہے اس آیت کا انکار کر دیا ان سب نے' ڈر گئے اس کے اٹھانے سے' انسان نے اس کو اٹھا لیا بڑا ظالم اور جاہل واقع ہوا تھا صاحب ۔اللہ اکبر۔ ایک لفظ حملِ امانت جو تھا پھر کہتے ہیں کہ صاحب! یہ عربوں کی زبان عربی ہے۔ تیرہ سو سال سے یہ ہوتا چلا آ رہا ہے'

یہ کوئی سمجھا ہی نہیں ہے اس کا کیا علاج ؟ آج بھی ان کے ہاں کی لغت میں دیکھ لیجیے کہ حملِ امانت کے معنی ہوتے ہیں امانت میں خیانت کرنا۔ کہا کہ ہم نے ان قوانین کی اطاعت کی چیز کو کائنات کی تمام چیزوں کے اوپر پیش کیا یہ امانت تھی انہوں نے اس میں خیانت کرنے سے انکار کیا' ڈر گئے خیانت نہیں کی۔ وَ حَمَلَهَا الْاِنْسَانُ (33:72) خیانت کی تو اس نے کی' بڑا ہی جاہل اور ظالم تھا۔ ظالم تھا اپنے آپ پہ ظلم کیا' جاہل تھا

ہر کہ دانا کنڈ کند ناداں

اس جاہل کو کرنا یہی پڑنا تھا لیکن جہالت کا تقاضا یہ ہے کہ اس وقت یوں نہیں کیا ہے۔ خیانت کرتا ہے' مار کھاتا ہے' جوتے کھاتا ہے پھر پیاز کھاتا ہے آخر میں یہاں پہنچتا ہے۔ وہ جو تھے جن کو اس نے کہا کہ نہ عقل ہے نہ شعور ہے' وہ اس سے کتنے زیادہ عقل مند نکلے۔ عزیزانِ من! یہ ہے طوعاً و کرہاً و الیہ یُرجعون یہاں آ کے رہنا ہے تم نے۔ کہا یہ ہے دین' کیا اس کے علاوہ کسی اور دین کی یہ تلاش کر رہے ہیں ظالم اور جاہل۔ دوسرا دین ہی نہیں' اس کا نام توحید ہے۔ دین ہی ایک ہے جو ساری خارجی کائنات میں بھی وہ چل رہا ہے' اسی پہ انسانوں کو بالآخر چلنا ہے۔ طوعاً چلو بڑی خوبی کی بات ہے نہ چلو گے' مجبوراً یہاں آنا پڑے گا' جوتے کھا کے یہاں آنا پڑے گا۔ حملِ امانت کرتے ہوئے کر کے دیکھ لو اس کا نتیجہ۔ بڑے ظالم اور جاہل ہو جو یہ کرتے ہو۔ کہا یہ ہے دین ان سے پوچھو کوئی اور دین چاہتے ہو؟ اور اس کے بعد کہو قُلْ ((3:84 ان سے کہو ہماری کیفیت یہ ہے کہ ہم اسے طوعاً مانتے ہیں اٰمَنَّا بِاللّٰہِ وَ مَآ اُنْزِلَ عَلَيْنَا وَ مَآ اُنْزِلَ عَلٰٓى اِبْرٰهِيْمَ وَ اِسْمٰعِيْلَ وَ اِسْحٰقَ وَ يَعْقُوْبَ وَ الْاَسْبَاطِ وَ مَآ اُوْتِیَ مُوْسٰى وَ عِيْسٰى وَ النَّبِيُّوْنَ مِنْ رَّبِّهِمْ ص ((3:84 وہ جو میثاق لیا تھا ہر امت سے۔ ہم ہیں وہ ایمان لائے ہیں اس پر اس پہ بھی کہ جو اس سے پیشتر انبیائے کرامؑ آئے تھے انہوں نے یہی دین دیا تھا' اس حقیقت پہ ہم ایمان لاتے ہیں جو کچھ دیا گیا تھا ان تمام انبیاؑ کو ان کے رب کی طرف سے۔ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْهُمْ ز((3:84 ان میں سے ان کی پوزیشن جو ہے نبوت اور رسالت کی اس باب میں ہم ان میں سے کسی میں کوئی فرق نہیں کرتے' خدا کی طرف سے سچے پیغامبر' سچے رسول ہم ان کو مانتے ہیں۔ ایمان ہو گیا تو کیا یہ نجات کے لیے **کافی** ہو گیا؟ بس اتنی سی بات تھی مان لیا؟ اتنی سی بات نہیں۔ اٰمَنَّا (3:84) ایمان کی بات وَ نَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ ((3:84 رسول ان سب کو مانتے ہیں' اطاعت صرف اس کی کرتے ہیں۔

ایمان لانا ہی کافی نہیں ہے لَهٗ مُسْلِمُوْنَ (3:84) جب تک مومن مسلم نہیں ہوتا ایمان کا فائدہ کچھ نہیں ہوتا۔ ایمان تو کسی

آلِ عمران 478 فارمولے کی صداقت کوتسلیم کر لینا ہے۔ اسلام' اس فارمولے کو عملاً نافذ کر کے' عملاً اس کے اوپر عمل کر کے' اس کے نتائج پیدا کرنا ہے۔ یہ اسلام ہے۔ دین ہے ان احکام اور قوانین کے ضابطے کا نام۔ اسلام ہے اس ضابطے پر عملاً کرنے کا نام' اطاعت کرنے کا نام' اسلام اسی نظری چیز کی تعمیل کا نام ہے۔ اس لیے نظری طور پہ پہلے یہ کہا کہ ہم اسے تسلیم کرتے ہیں' بطیب خاطر تسلیم کرتے ہیں وَ نَحۡنُ لَهٗ مُسۡلِمُوۡنَ (3:84) اور ہم سرِ تسلیم خم کرتے ہیں۔ اور پھر یہ دیکھیے توحید لَهٗ سارے انبیاؑ کا ذکر آ گیا ہے اطاعت' قوانین' احکام' ان کی نہیں نَحۡنُ لَهٗ مُسۡلِمُوۡنَ (3:84) اس کے سامنے ہم جھکتے ہیں۔ اور اس کے بعد کہا کہ یہ دوسرے نظاموں کے تابع زندگی بسر کرنے والے' دوسرے احکامات ماننے والے مانتے رہیں۔ وَ مَنۡ یَّبۡتَغِ غَیۡرَ الۡاِسۡلَامِ دِیۡنًا (3:85) جو کوئی بھی اس کے علاوہ کوئی اور نظام اختیار کرے گا فَلَنۡ یُّقۡبَلَ مِنۡهُ (3:85) اپنے ہاں خوش ہو جائے۔ بالکل ٹھیک ہے ہماری میزان کے اندر تو وہ پورا نہیں اترتا' نہیں قبول کیا جا سکتا یہاں۔ بڑی چیز ہے صاحب۔ نہیں قبول کیا جا سکتا' کیا بات ہوئی؟ یعنی وہ جو حاکمیت کی بات ہوتی ہے' وہ بات نہیں ہے کہ وہ مرضی ہے اس کے اوپر وہ کہے گا کہ نہیں! ہم نے جو کہا ہے وہی ہوگا اس کے علاوہ کچھ بھی ہوگا' ہم نہیں قبول کریں گے۔ قبول کرنے کے معنی یہ ہیں تم آگ پہ دیگچی رکھو گے' چائے گرم ہوگی۔ اس کے علاوہ دوسرا دن یہ ہے کہ برف کی سل کے اوپر دیگچی رکھ' لو چائے نہیں بن سکے گی اس کے معنی ہیں قبول نہیں کیا جائے گا۔ ببول کا بیج بو کے دیکھ لیجیے آم کا پھل کھانے کے لیے' پوری محنت کیجیے گا اس پہ اسی طرح سے پرورش اس کی کیجیے گا' دن رات محنت کیجیے گا سب کچھ کیجیے گا۔ یہ اللہ کا دین نہ تھا جو تم نے اختیار کیا تھا' یہ قبول نہیں کیا جائے گا یہ درخت آم کا پھل نہیں لائے گا۔ یہ ہے جی قبول نہیں کیا جائے گا۔ وَ مَنۡ یَّبۡتَغِ غَیۡرَ الۡاِسۡلَامِ دِیۡنًا فَلَنۡ یُّقۡبَلَ مِنۡهُ ج (3:85) کہا جائے گا کہ صاحب! ہم نے دیکھا ہے کہ ان کے علاوہ بھی دوسری چیزیں لوگ اختیار کرتے ہیں۔ بڑے فائدے اٹھاتے ہیں بددیانتی کے فائدے' بے ایمانی کے فائدے' فریب کاریوں کے فائدے' رشوت ستانیوں کے فائدے' بڑی دولت اکٹھی کی بڑی کوٹھیاں بنائیں یہ سارا کچھ یہ ہے۔ عزیزانِ من! قرآن ہے۔ ٹھیک ہے یہ کچھ ہوتا ہے وَ هُوَ فِی الۡاٰخِرَةِ مِنَ الۡخٰسِرِیۡنَ (3:85) انجام کار تم دیکھ لینا کس کا بیڑہ غرق ہوتا ہے۔ یہیں آ کے فریب کھا جاتا ہے انسان۔ قرآن نے اسے مفادِ عاجلہ کہا ہے' مفادِ عاجلہ حاصل ہو جاتا ہے۔

کشتوں کے استعمال سے چہروں کی سرخ وسفید خوبصورتی کا انجامِ موت

دلی میں شریف خانی حکما جو تھے' حکیم اجمل خاں جن کا بڑا نام تھا' بڑے پایے کے طبیب تھے صاحب۔ حکیم صاحب سے الگ ہٹ کے وہاں کے دوسرے حکما تھے ان کے ہاں کیفیت یہ تھی سامنے جا کے دیکھیے تو مجسمہ نظر آتے تھے صحت کا' سرخ وسپید

رنگ' ان کے ہاں کی کیفیت یہ کہ شملہ میں برف کے دنوں میں حکیم صاحب ململ کا کرتہ پہنے ہوئے چلے جارہے ہیں' سردی ہی نہیں لگ رہی۔ ان کے مطب میں ہم نے دیکھا صاحب سردی کے زمانے میں سامنے تپائی پہ برف کا بھرا ہوا گلاس رکھا ہوا ہے اسے سپ کرتے چلے جارہے ہیں' پسینہ آرہا ہے۔ رشک آتا تھا ان کی صحت کے اوپر۔ کسی نے بھی پچاس سال سے زیادہ عمر نہیں پائی۔ یہ ساری سرخیاں جتنی بھی تھیں وہ کشتوں کی تھیں۔ یہ توانائیاں یہ گھبرو بنے جارہے ہیں' پہلوانوں کی طرح رنگت آرہی ہے' غیر الاسلام دین قبول کیا تھا نا وَ هُوَ فِي الْاٰخِرَةِ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ (3:85) رنگت میں نکھار دے جاتا ہے سنکھیا تھوڑے وقت کے لیے' شام کے وقت تو یہ شراب کا گھونٹ پینے والے کا بھی دیکھیے کہ اس کی صحت کتنی عجیب چمکتی دمکتی نظر آتی ہے۔ اسی کو صبح کے وقت اٹھیے جب خمار کے اندر اس کی ہڈیاں ٹوٹ رہی ہوتی ہیں وَ هُوَ فِي الْاٰخِرَةِ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ (3:85)۔ عزیزانِ من! اسی لیے اس فریب میں نہ آجایے کہ خدا کے دین کے علاوہ کوئی دوسرا دین قبول کرنے سے آخر الامر تک آپ کامیاب اور فوز و فلاح والے رہیں گے' نہیں ہوسکتا یہ۔ اس لیے اس نے کہا کہ وَ مَنْ يَّبْتَغِ غَيْرَ الْاِسْلَامِ دِيْنًا فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْهُ (3:85) بالکل نہیں قبول ہوگا۔ مفادِ عاجلہ کچھ وقت کے لیے حاصل ہوجائیں گے وَ هُوَ فِي الْاٰخِرَةِ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ (3:85) انجامِ کار تم دیکھو گے کہ وہ پھر نقصان میں رہے گا۔ اب اس کے بعد یہ سارے نظریے بیان کرنے کے بعد قرآن براہِ راست ہماری طرف آ گیا ہے۔ وہ قوم کہ جو ایمان لائی' وہ قوم کہ جس نے اپنی آنکھوں سے اس ایمان اور اس دین کے زندہ اور تابندہ نتائج کو دیکھ لیا اور کہا اس کے بعد پھر کفر اختیار کرلیا جس قوم نے' آؤ تمہیں اب اس کی کہانی اور داستان سنائیں۔ آج وقت ہوگیا یہ داستان ہم اگلے درس پہ چھوڑ دیتے ہیں۔ ہم سورۃ آلِ عمران کی آیت 85 تک آ گئے عزیزانِ من! 86 سے اگلی دفعہ لیں گے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا ؕ اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ (2:127)

❀...❀...❀

پندرھواں باب: **سورۃ آل عمران** (آیات 86 تا 97)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اسباب زوالِ اُمت کا ایک نہایت ہی اہم پہلو اور اس کا شافی علاج

عزیزانِ من! آج جنوری 1970ء کی 4 تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز سورۂ آلِ عمران کی 86 ویں آیت سے ہوتا ہے:((3:86۔

قرآن فہمی کے دوران علامہ پرویزؒ کی ذہنی کیفیت

آغازِ کلام اس آیۂ جلیلہ سے ہوتا ہے کہ جب پہلے پہل اس کے صحیح مطالب میرے سامنے آئے، آج تک وہ احساس باقی ہے۔ کئی دنوں تک مجھ پر سکتے کا عالم رہا اور اس کے بعد اب تک یہی کیفیت ہے کہ جب یہ آیتِ جلیلہ سامنے آتی ہے تو پھر یہی کیفیت طاری ہوجاتی ہے۔ میرے پاس مغرب کے بڑے بڑے مفکرین، سائنٹسٹ اکثر آتے رہتے ہیں، اسلام کے متعلق ان سے باتیں ہوتی ہیں۔ دلائل و براہین کی رو سے اپنی بصیرت کے مطابق انہیں میں قرآن کا یہ نظام سمجھا تا ہوں، فکری طور پر وہ اسے سمجھ بھی جاتے ہیں۔ لیکن اٹھتے وقت وہ کہتے یہ ہیں کہ اس قدر مکمل، اس قدر انسانیت ساز، بے نظیر نظام جس کا ذکر تم نے کیا ہے اور جسے سمجھایا ہے، یہ کہیں عالمِ اسلام میں اس وقت عملاً قائم بھی ہے؟ کہیں چل بھی رہا ہے؟ تا کہ ہم دیکھ لیں اس کے نتائج سے کہ جو کچھ اس کے دعوے ہیں، وہ واقعی نتائج سے ان کا ثبوت ملتا ہے یا نہیں؟ اور جب وہ مجھ سے پوچھتے ہیں تو وہ اس مور کی طرح جو اپنے رقص میں تو محو ہوتا ہے لیکن جب پاؤں پہ نگاہ جاتی ہے تو پھر وہ اپنے پَر سمیٹ لیتا ہے۔ میری یہی کیفیت ہوجاتی ہے۔ لیکن اس سے ایک بڑی اہم چیز سامنے آتی ہے کہ ایک چیز ہوتی ہے کسی نظام کو نظری طور پر پیش کرنا دلائل اور براہین سے اس کی صداقت کو ثابت کرنے کی کوشش کرنا، فکری طور پر یہ بتانا کہ یہ کس طرح سے ان مشکلات کا حل اپنے اندر رکھتا ہے جن کے حل میں وہ جنت سے نکلا ہوا آدم، مارا مارا پھر رہا ہے۔

کسی مریض کے لیے نسخے پر مطمئن ہونا ہی ضروری نہیں بلکہ اس نسخے کے مطابق علاج لینا بھی ضروری ہے

لیکن بات آگے آتی ہے کہ اس کے بعد اس نظام کو عملاً متشکل کر کے دکھا دیا جائے تو اس کے نتائج' اس کی صداقت کے بڑے بین اور مشہود ثبوت بن جاتے ہیں اور حقیقی ثبوت یہ ہوتا ہے۔ پہلی چیز بھی ضروری ہے علاج کے لیے نسخے کا لکھا جانا ضروری ہوتا ہے۔ ایک سمجھ دار مریض بھی اس نسخے کے اجزا کو دیکھ کر یا ڈاکٹر سے سمجھ کر مطمئن ہوسکتا ہے کہ اس سے میرے مرض کا علاج ہوجائے گا۔ لیکن وہ اس کی صداقت پر ایمان اس وقت لاتا ہے جب وہ اس نسخے کو استعمال کرتا ہے اور اس سے دیکھتا ہے کہ اسے شفا حاصل ہوگئی۔ سائنٹسٹ کا ایک فارمولا نظری طور پر بڑا ہی اطمینان بخش ہوسکتا ہے' وہ اسے ثابت بھی کر سکتا ہے' سمجھا بھی سکتا ہے لیکن اگر وہ فارمولا لیبارٹری میں ان پریکٹس لایا جائے' عملاً اسے کر کے دکھایا جائے اور پھر وہ نتائج سامنے آجائیں جس کا وہ مدعی ہے تو پھر اس میں کسی شبہ کی گنجائش ہی نہیں رہتی۔ بنیادی طور پر دلائل و براہین کی رو سے کسی نظریے کا' فارمولے کا' نظام کا پیش کرنا' اس کے بعد عملاً اس کے نتائج کو سامنے لا کر مشاہدے کے طور پر اس کی صداقت کا ثبوت بہم پہنچانا' یہ چیز اگر کر دی جائے تو اس کے بعد پھر کوئی چیز باقی ہی نہیں رہتی۔ رسول آتا تھا وہ خدا کے پیغام کو نظری طور پر پہلے پیش کرتا تھا' دلائل و براہین سے سمجھاتا تھا۔ قرآنِ کریم میں آپ دیکھیے کہ دلائل پہ کتنا زور دیا گیا ہے۔ فکر' تدبر' شعور' تعقل' براہین لیکن اس کے بعد رسول اس نظام کو پھر عملاً متشکل جب کرتا ہے تو اس کی صداقت اس قدر مشاہدے میں آنے کے بعد بین ہوجاتی ہے کہ قرآن کہتا ہے يَدْخُلُوْنَ فِيْ دِيْنِ اللّٰهِ اَفْوَاجًا (110:2) تو پھر فوج در فوج لوگ اس نظام میں داخل ہوجاتے ہیں۔ یہ ایک پروگرام ہے جو نظامِ خداوندی کے لیے دیا گیا۔ رسول نظری طور پر پیش کرتا تھا پھر اس کے بعد عملاً اس کو کر کے دکھاتا تھا' اس کے نتائج اس کی صداقت کے زندہ' مشہود ثبوت بن جاتے تھے اور اس طرح سے جو ایمان آتا تھا' وہ ایمان غیر متزلزل تھا' بڑا مستحکم تھا۔

نوعِ انسانی کے لیے عظیم ترین نظامِ حیات کو پامال کرنے والی قوم کی زبوں حالی پر قرآنِ حکیم کی آہ وفغاں

لیکن اگر کوئی قوم کسی نظام کو پہلے نظری طور پر دلائل و براہین کی رو سے سمجھے پھر وہ نظام عملاً متشکل ہوجائے اور اس کے درخشندہ' زندہ' پائندہ نتائج سامنے آجائیں' محسوس شکل میں وہ اس کا مشاہدہ کرلیں اور یہ سب کچھ ہونے کے بعد پھر وہ قوم اس

نظام سے انکار کر دے اور دوسرا نظام اختیار کر لے تو آپ سوچتے ہیں اس قوم کی کیفیت کیا ہوگی؟ کیفیت یہ ہوگی کہ اس کے اور تو اور خود خدا بھی یہ کہہ اٹھے کہ كَيْفَ يَهْدِي اللّٰهُ قَوْمًا كَفَرُوْا بَعْدَ اِيْمَانِهِمْ وَ شَهِدُوْا اَنَّ الرَّسُوْلَ حَقٌّ وَّ جَآءَهُمُ الْبَيِّنٰتُ ط((3:86 میں نے کہا تھا یہ آیۂ جلیلہ کے مطالب جب سامنے آئے تو لرزہ طاری ہو گیا مجھ پر۔ کہا یہ کہ کہو وہ قوم کہ جس کے سامنے جَآءَهُمُ الْبَيِّنٰتُ (3:86) نہایت واضح طور پر ایک نظام آ جائے۔ کھلا ہوا نکھرا ہوا ابھرا ہوا' بینات کے تو معنی یہ ہیں۔ یوں نظری طور پر اس قدر واضح' مدلل' نکھرا ہوا' ابھرا ہوا سامنے آ جائے۔ وَ شَهِدُوْا اَنَّ الرَّسُوْلَ حَقٌّ ((3:86 اور وہ مشاہدہ کر لیں اس بات کا کہ رسول جو کچھ کہتا تھا فی الواقع اس نے کر کے دکھا دیا ہے وہ ایک حقیقتِ ثابتہ کی طرح سامنے آ گیا ہے۔ عربی زبان میں حق کے معنی جیسا ہم جانتے ہیں ویسے تو سچائی کو کہا جاتا ہے لیکن یہ معنی نہیں یہ تو صداقت ہوتی ہے' صدق ہوتا ہے' TRUTH ہی اس کے معنی نہیں ہوتے۔ جب کوئی TRUTH عملی شکل اختیار کر کے ٹھوس نتائج سامنے لے آتا ہے تو عرب اس وقت اس کو حق کہتے ہیں۔ حقیقت ہمیشہ مشہود ہوتی ہے محسوس ہوتی ہے' نظری طور پہ نہیں ہوتی اور لفظ شَهِدُوْا (3:86) نے تو بات واضح کر دی ۔

قرآنی حقائق کی نہایت شدت کے ساتھ وضاحت کو قبول نہ کرنے پر "کَيْفَ" کے لفظ کا استعمال قابلِ غور ہی نہیں' قابلِ ندامت بھی ہے

وہ قوم کہ جس کے پاس بینات آ جائیں دلائل و براہین کی رو سے اور پھر وہ مشاہدہ کر لے کہ رسول جو دعویٰ کرتا تھا وہ ٹھوس نتائج پیدا کر کے ہمارے سامنے آ گیا ہے۔ کہا کہ اس کے بعد كَفَرُوْا بَعْدَ اِيْمَانِهِمْ (3:86) اس طرح سے جو قوم ایمان لائی ہو' اس کے بعد پھر وہ اس نظام سے پھر جائے تو آپ کو معلوم ہے' قرآن نے کہا کیا ہے؟ كَيْفَ يَهْدِي اللّٰهُ((3:86 تو کہو وہ کونسا طریقہ اور ہے جس سے خدا اس قوم کو کشادگی کی راہیں دکھائے۔ اللہ اکبر۔ یہ عجیب چیز ہے کہنے کی كَيْفَ(3:86)' كَيْفَ(3:86) کے اندر وہ طریق ہوتا ہے۔ حضرتِ ابراہیمؑ نے جب کہا تھا خدا سے' کہا یہ تھا کہ اَرِنِيْ كَيْفَ تُحْيِ الْمَوْتٰى (2:260) پوچھا تھا کہ ایمان نہیں رکھتے؟ کہا تھا ایمان رکھتا ہوں لیکن اطمینان یوں چاہتا ہوں کہ وہ طریقہ بتایا جائے جس طریقے سے مردہ قومیں زندہ ہوا کرتی ہیں۔ یہاں كَيْفَ (2:260) نے یہ بات کہہ دی کہ طریقے تو دو ہی تھے' نظری طور پر دلائل و براہین سے ایک چیز کو پیش کرنا۔ بلند فکری سطح پر پہنچے ہوئے انسانوں کے لیے یہی چیز کافی ہوجاتی ہے' وہ مطمئن ہوجاتے ہیں۔ اور یہ تھے وہ لوگ جو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مکی زندگی میں اگرچہ بڑا لمبا عرصہ تھا لیکن وہ لوگ اس طرح سے اسلام کی طرف آئے۔

کتنے آئے تھے اتنے لمبے عرصے کے اندر!!! لیکن اس کے بعد جب اس کا دوسرا شو شروع ہوا ہے اور اس کے بعد یہی نظام جسے نظری طور پہ پیش کیا جا رہا تھا' عملاً متشکل ہو کے سامنے آیا ہے عرصہ چھ سات سال کا لیکن کیفیت یہ تھی کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے آخری حج میں کم از کم ایک لاکھ کا مجمع تو مکے کے میدان میں جمع ہوا تھا اور حضرت عمرؓ کے دور میں بائیس لاکھ مربع میل پر یہ مملکت پھیلی ہوئی تھی۔ یہ کیا چیز تھی؟ وَشَهِدُوْٓا اَنَّ الرَّسُوْلَ حَقٌّ (3:86) اس قوم نے مشاہدہ کر لیا کہ جو کچھ کہہ رہا تھا رسول' وہ ایک ٹھوس حقیقت کی شکل میں سامنے آ گیا۔

ملوکیت کو ختم کرنے والی قوم خود ہی ملوکیت کے تخت پر صدیوں سے جلوہ افروز ہے

تو کہا کہ اس کے بعد پھر وہ قوم اگر اس نظام کو چھوڑ کر اس سے انکار کر لے' دوسرا نظام اختیار کرے كَيْفَ يَهْدِى اللّٰهُ قَوْمًا (3:86) تو بتاؤ تم خدا کو کہ اور کون سا طریقہ اختیار کیا جائے تمہارے لیے۔ افوہو۔ غور فرمایے! ہے نا ایسی چیز جس سے لرزہ طاری ہو جائے۔ کہو کم بختو کون سا اور طریقہ باقی رہ گیا ہے جو اختیار کیا جائے کہ تمہیں کشاد کی راہ وہ دکھا دے اس کے بعد اور طریقہ کونسا ہے۔ كَيْفَ يَهْدِى اللّٰهُ قَوْمًا كَفَرُوْا بَعْدَ اِيْمَانِهِمْ (3:86) جس قوم کی کیفیت یہ ہوا قبالؒ کے الفاظ میں کہ

خود طلسمِ قیصر و کسریٰ شکست

اس قوم نے خود آ کر قیصر و کسریٰ کی ملوکیتوں کے تختوں کو الٹ دیا اور اس کے بعد

خود سرِ تختِ ملوکیت نشست

ملوکیت کو اس طرح سے تباہ کیا اور اس کے بعد یہ قوم خود ہی ملوکیت کے تخت کے اوپر بیٹھ گئی۔ كَيْفَ يَهْدِى اللّٰهُ قَوْمًا (3:86) اس قوم کو کس طرح ہدایت کی راہ دکھائی جا سکتی ہے۔ کشاد کی راہ دکھانا' کامیابی کی راہ دکھانا۔ کیا کیا چیز نہیں قرآن نے ختم کی ہے اس نظام میں' عملاً نہیں ختم کی' ملوکیت کو ختم کیا اس ملوکیت کے بعد آج دنیا میں سنگین ترین شکل میں ملوکیت چودہ سو سال کے بعد بھی جب دنیا کی کافر سے کافر ترین قومیں بھی اسے چھوڑ چکی ہیں' آپ کے ہاں آج تک چلی آ رہی ہے۔ اور دھاندلی سے نہیں چلی آ رہی' چلی آ رہی ہے اور اس کے لیے آپ کے محراب و منبر میں خطبہ کے اندر دعائیں مانگی جا رہی ہیں ان کے لیے۔ اللہ اکبر۔ ملوکیت کے لیے خدا سے دعائیں مانگی جا رہی ہیں کہ پختہ رہے' پائندہ رہے' ہمیشہ رہے' زندہ رہے' خدا کی نصرت اسے حاصل ہو۔ یعنی ابلیسی نظام کو' خدا کی نصرت کی دعائیں' مساجد کے خطبے میں مانگی جا رہی ہیں ہزار برس سے۔ اور جیسے میں نے عرض کیا ہے کہ دنیا کی یعنی سخت ترین کافر قومیں جنہیں آپ کہہ سکتے ہیں' مشرک قومیں جنہیں کہتے ہیں' خدا سے انکار کرنے والی قومیں جنہیں کہتے

ہیں' انہوں نے بھی ملوکیت کو چھوڑ دیا اور آپ کے ہاں اس کی سلامتی کی دعائیں مانگی جارہی ہیں۔ 478آلِ عمران

ملوکیت کو دوام بخشنے کے لیے احبار و رہبان کا کردار قوموں پر سب سے زیادہ اثر انداز ہوتا ہے

دیکھا! آپ نے کیا کیا؟ فرعون کے ساتھ ہامان دوسری لعنت تھی انسانیت کے سر پر مذہبی پیشوائیت۔ قرآنِ کریم نے یہ کہہ کے کہ تم دیکھو احبار و رہبان کس طرح سے لوگوں کا مال ناجائز طور پہ کھا جاتے ہیں۔ عوام کو خدا کے راستے کی طرف آنے میں راستے میں یہی گروہ حائل ہے (9:34)۔ اس کو اس طرح سے مٹایا کہ آپ کو یہ لفظ ہی نظر نہیں آتا۔ ابتدائی اسلام کے لٹریچر میں یہ لفظ نہیں ہے۔ یہ مولوی کا لفظ ہی ہے نہیں ہمارے ہاں۔ قرآن نے ایک جگہ جہاں علما کا لفظ استعمال کیا ہے' سائنٹسٹ کے معنی میں استعمال کیا ہے۔ اس کو عملاً ختم کیا اس نظام نے' مشاہدہ کرلیا اس قوم نے کہ یہ جو جذام ہے جسدِ انسانیت کے اوپر اس کا یہ علاج تھا۔ آج دنیا کے مشرک ترین اور کافر ترین ملکوں کے اندر بھی آپ دیکھیں گے کہ اس کا وجود نہیں رہا۔ سخت ترین گر ہیں اگر اس کی ہیں' اس سامریت کی بھی' اس ہامانیت کی بھی' تو وہ مسلمانوں کے اندر آج موجود ہیں۔ قرآن نے اسی آیۂ جلیلہ میں جہاں مذہبی پیشوائیت کے خلاف کہا آدھی آیت ہے' اگلی آدھی آیت میں یہ کہا کہ یہ لوگ جو اس طرح سے دولت کے انبار اکٹھے کر کے نظامِ سرمایہ داری کو قائم کرتے ہیں' ان کا سارا سرمایہ جہنم کی آگ میں تپایا جائے گا اور داغے جائیں گے یہ لوگ۔ تیسری یہ لعنت تھی انسانیت کی جو قارون کی شکل کے اندر دنیا میں آئی۔ اسلام نے اس کو مٹایا (9:34-35)۔

احبار و رہبان کے بعد قارونیت یعنی نظامِ سرمایہ داری کا تانا بانا اور اس کی گرفت کے خدوخال

اس کے بعد بدترین شکل میں سرمایہ داری اور جاگیرداری اور زمینداری کا نظام جو آیا ہے تو وہ آپ کے ہاں نظام آیا۔ کیفیت یہ ہے کہ دنیا کی وہ قومیں جنہوں نے کیپٹل ازم یا سرمایہ داری کے نظام کو جنم دیا تھا' وہ قومیں بھی اس کو چھوڑ کے کم از کم اسی فیصد اس کو اپنے ہاں ختم کر چکی ہیں۔ اور آپ کے ہاں آج بھی اس مسئلہ پہ جنگ ہو رہی ہے کہ سرمایہ داری کا نظام عینِ اسلام ہے اور جو اس کو مٹانے کی کوشش کرے گا ہم اس کا ڈٹ کر مقابلہ کریں گے۔ یہ اقامتِ دین ہے آپ کے ہاں آج اس بیسویں صدی میں۔ اس کے بعد آپ توقع کرتے ہیں کہ کشاد کی راہیں آپ پہ کھلیں؟ كَيْفَ يَهْدِى اللّٰهُ قَوْمًا (3:86) تم ہی بتاؤ کہ پھر کونسا طریقہ اور باقی ہے جس سے یہ کچھ کیا جائے اور آپ کو پھر کشاد کی راہ دکھائی جا سکے۔ كَيْفَ يَهْدِى اللّٰهُ قَوْمًا میں کہہ رہا ہوں کہ یہ جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے مار تھی' اس قوم پہ غضب تھا مسلط ہوا ہوا تیرہ سو سال سے آپ دیکھ رہے ہیں كَيْفَ يَهْدِى اللّٰهُ

قَوْمًا (3:86) کس طرح صحیح آ رہا ہے۔

مذہب پرست قومیں خالص عقل کی راہنمائی کے تابع چلنے والی قوموں کا مقابلہ کر ہی نہیں سکتی

اس وقت سارا عالمِ اسلام اپنی ذلت اور مسکنت' اپنی محکومی اور ناداری کے ہاتھوں تنگ آیا ہوا ہے۔ تڑپ رہا ہے' بلک رہا ہے' اس جہنم سے نکلنے کا راستہ نہیں مل رہا اس کو۔ كَيْفَ يَهْدِى اللّٰهُ قَوْمًا (3:86)۔ وَ مَا هُمْ بِخٰرِجِيْنَ مِنَ النَّارِ (2:167)۔ دوسری قومیں' خدا کی راہنمائی یوں اگر ان کے سامنے نہیں آئی تو خالص عقل کی رو سے ہی انہوں نے اپنے ہاں کے کچھ تو معاملے سنوار لیے ہیں۔ بڑی حد تک یہ راہنمائی کر سکتی ہے۔ لیکن جو قوم دین کے نظام کو چھوڑ کر مذہب کی سطح کے اوپر اتر آتی ہے' اس کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ عقل کی راہیں مسدود ہو جاتی ہیں۔ کائناتی قوتوں سے وہ فائدہ حاصل نہیں کر سکتی۔ نظامِ خداوندی تو ان کے ہاں سے متروک ہو چکا ہوا ہوتا ہے۔ ذلت اور پستیوں کے اس مقام پہ آ جاتی ہیں کہ ساری دنیا انہیں نفرت کی نگاہ سے دیکھتی ہے۔ دیکھیے قرآن کیا کہتا ہے اس باب میں؟ ہاں! پہلے تو یہ کہو وَ اللّٰهُ لَا يَهْدِى الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ (3:86) آپ کو معلوم ہے کہ ظلم کے معنی عربی زبان میں اور قرآن کے استعمال کی رو سے یہ ہیں کہ جو شے جس مقام پہ ہونی چاہیے' اسے اس مقام پہ نہ رکھا جائے۔ یہاں ظالمین اس قوم کو کہا ہے یہ قوم اعتقاداً سب چیزیں وہ مان رہی ہے۔ خدا کو مان رہی ہے' رسول کو مان رہی ہے' کتاب کو مان رہی ہے' دین کو مان رہی ہے لیکن کسی کو اس کے صحیح مقام پہ نہیں رکھا ہوا۔ خدا جو ایک نظام اور ایک ضابطۂ قوانین دینے والا تھا وہ صرف پرستش کی شے بن کر رہ گئی۔

جہاں مذہب کی حکمرانی ہوگی وہاں زندگی کا کوئی شعبہ بھی اپنے مقام پر دکھائی نہیں دے گا

عبادت جس کے معنی قانونِ خداوندی کی اطاعت تھی' اس کے مطابق زندگی بسر کرنا تھا' وہ آپ کے ہاں محض پوجا پاٹ بن کے رہ گئی۔ ؟؟؟؟ کہ جس کے معنی اس دنیا کے حصے حاصل کرنا تھا اپنا شیئر لینا تھا اس دنیا کے اندر ایک موہوم تصور بن کر رہ گیا۔ آخرت کہ جس کے معنی مستقبل سنوارنا تھا کسی قوم کے لیے' آپ کے ہاں ایک ایسی تاریخ آ گئی یعنی وہ ہائی کورٹ کی تاریخ کہ جس کا پتا ہی نہیں آپ کو کہ وہ کب ہوگا اور کیسے کچھ تصور ہوگا۔ کوئی شے اپنے مقام پہ نہیں ہے۔ دین کے یہ اجزا یا ارکان ان کی ادائیگی ہو رہی ہے' حج بھی ہو رہا ہے' زکوتیں بھی دے رہے ہیں' آپ نمازیں بھی پڑھ رہے ہیں' مشقت سے روزے بھی رکھ رہے ہیں' کوئی شے اپنے مقام پہ نہیں رہی ہوئی۔ مقام تو ان کا اس دین کے اندر تھا نا۔ ایک مشین کو گھڑی کے پرزوں کو اگر

آپ کھول کے میز کے اوپر رکھ دیں' الگ الگ سارے پرزے ٹھیک ہوتے ہیں' وہ کیوں گھڑی نہیں چلتی ؟ وہ کیوں وقت آلِ عمران 478
نہیں بتاتی ؟ کہ وہ پرزے اپنے مقام پہ نہیں ہوتے' اسے ظلم کہا جاتا ہے۔ پرزے موجود ہیں' قرآن موجود ہے' اس کے ایک حرف میں تبدیلی نہیں ہوئی کہ خدا نے اس کی حفاظت کا ذمہ لیا ہے' قوم موجود ہے۔ اس زمانے میں تو یہ کہیں ایک کروڑ بھی نہیں ہوگی ساری دنیا میں' آج تو ساٹھ ستر کروڑ ہے' مملکتیں موجود ہیں آپ کی۔ اُس زمانے میں تو مملکت سمٹی ہوئی تھی بڑی مختصر تھی۔ اتنی پھیلی ہوئی مملکت' اتنی بڑی آبادی اس قوم کی' قرآن اس کے اندر موجود ہے۔ اب آپ کہیں گے کہ وَ شَهِدُوْٓا اَنَّ الرَّسُوْلَ حَقٌّ (3:86) انہوں نے اس کا مشاہدہ نہیں کیا۔

نظامِ دین کے سلسلہ میں رسول اکرم ﷺ اور خلافتِ راشدہ کے دور کی جلوہ گری کی شہادت

مشاہدے کی تو کیفیت یہ ہے جیسا میں اس سے پہلے بھی کئی دفعہ کہہ چکا ہوں' آج بھی اس قوم کے کسی وعظ کو جا کر سنیے وہ جو آپ کا صدرِ اول کا دور ہے' محمد رسول اللہ ﷺ والذین معہٗ کا دور' اس دور کی ساری تاریخ دہراتے چلے جائیں گے۔ یہ کر کے دکھایا انہوں نے یہ کر کے دکھایا ہمارے اسلاف نے اس قوم نے یہ کیا' خلافتِ راشدہؓ میں یہ ہوا' رسول اللہ ﷺ نے اس طرح سے نظام قائم کیا' اس نظام کے یہ عملی نتائج تھے۔ ساری تاریخ اس دور کی آپ ہر روز ہر خطبے میں ہر وعظ میں سنیں گے' اس سے بڑی شہادت اور کونسی ہوتی ہے۔ یہ اس سے منکر نہیں ہے یہ' یہ قوم اس کی شہادت دے رہی ہے۔ کہیں کوئی نئی بات آپ کے ہاں ایسی اونچے درجے کی آئے' یہ قوم کہتی ہے کہ صاحب! کون سی نئی بات ہے ہمارے ہاں آپ دیکھیے خلافتِ راشدہؓ نے یہ کچھ کر کے دکھایا تھا' سب سے پہلے انہوں نے یہ نظام قائم کیا۔ ساری دنیا میں اس کی یہ شہادت دیتی ہے۔ کیا شہادت دیتی ہے؟ اَنَّ الرَّسُوْلَ حَقٌّ (3:86) ہمارے رسول نے یہ عملاً کر کے دکھایا تھا' ٹھوس طریقے پہ دنیا کے سامنے یہ نظام آ گیا تھا۔ آپ دیکھتے ہیں کہ یہ کتنی ستم ظریفی ہے اور بوالعجبی ہے کہ قوم آج تک شہادت دے رہی ہے اس چیز کی کہ یہ واقعی نظام قائم ہوا تھا اس نے یہ نتائج پیدا کیے تھے۔ اس طرح سے رسول ﷺ کی حقانیت کی شہادت دیتی ہے یہ قوم۔ لیکن کیفیت یہ ہے قَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ (3:86) ہے سب چیزیں موجود ہیں اس کے پاس' اپنے مقام پہ نہیں رکھا ہوا۔ تو کہو کہ جو قوم اس طرح سے بینات اپنے پاس رکھتی ہو' اس نظام کے عملاً قائم ہونے کے بعد نتائج کی شہادت دیتی چلی جائے اس وقت تک یعنی خود اس کی بھی شہادت دیتی ہے کہ جب یہ نظام باقی نہیں رہا تھا تو ہمارے دورِ ملوکیت میں پھر کتنا استبداد ہوا' کتنا ظلم ہوا' اسلام اپنے مقام سے ہٹ گیا' یہ

سب کچھ کہتے چلے آ رہے ہیں۔ قرآن کہتا ہے کہ جس قوم کی یہ کیفیت ہو جائے کہ بینات موجود ہوں، رسول کی حقانیت 478 آلِ عمران شہادت دیتی ہوئی چلی آ رہی ہو اور پھر اس نظام سے انکار کرتے ہوئے عملاً دوسرے نظام اختیار کیے ہوئے ہو کَیۡفَ یَهۡدِی اللّٰهُ قَوۡمًا (3:86) پھر اس قوم کی کیفیت کیا ہو جاتی ہے میں نے یہ ابھی عرض کیا تھا۔

دین کے برعکس مذہبی حکمرانی میں حرماں نصیبی کی کیفیت کا نتیجہ

عزیزانِ من! کیفیت یہ ہو جاتی ہے اُولٰٓئِکَ جَزَآؤُهُمۡ (3:87) یہ وہ قوم ہے کہ جس کی اس روش کا عملی نتیجہ یہ ہوتا ہے اَنَّ عَلَیۡهِمۡ لَعۡنَةَ اللّٰهِ وَ الۡمَلٰٓئِکَةِ وَ النَّاسِ اَجۡمَعِیۡنَ (3:87) لعنت کے معنی میں آپ کو بتا چکا ہوں لعن کے معنی ہوتا ہے محروم ہو جانا کسی خوشگواری سے، حرماں نصیبی ہو جانا اس سے، محروم ہو جانا، دور ہو جانا اس سے۔ کہتا ہے جس قوم کی یہ کیفیت ہو جائے پھر اس کی کیفیت یہ ہوتی ہے (آپ کو پتہ ہے کہ ملائکہ کے معنی فطرت کی یہ قوتیں ہیں) پہلی چیز یہ ہو جاتی ہے کہ فطرت کی قوتوں نے جو خوشگواریاں ان کو دینی تھیں، اس سے پہلے محروم ہو جاتی ہیں۔ مذہب کی سطح یہ ہے۔ لَعۡنَةَ اللّٰهِ (3:87) پہلی چیز تو یہ ہے کہ خدا کے نظام نے جو برکات ان کو دینی تھیں، پہلے تو انہوں نے اپنے آپ کو ان سے محروم کیا۔ خدا کے ہاں سے جسے آپ کہتے ہیں ملعون یوں ٹھہرے، دور ہو گئے ان نوازشات سے ان سعادات سے ان برکات سے، ان نتائج سے جو خدا کے نظام نے پیدا کرنے تھے۔ اس سے تو دور ہوئے ہی تھے۔ چلیے برسبیلِ تنزل خالص عقل کی رو سے کام لیتے تو کم از کم فطرت کی قوتوں کو ہی مسخر کر لیتے، وہیں سے کچھ قوتیں حاصل کرتے۔ لَعۡنَةَ اللّٰهِ وَ الۡمَلٰٓئِکَةِ (3:87) فطرت کی قوتوں سے بھی یہ محروم ہو گئے۔ عزیزانِ من! دنیا میں جتنی قومیں مذہب پرست رہتی ہیں، وہ فطرت کی قوتوں کو مسخر کر ہی نہیں سکتیں، ساری تاریخ آپ کے سامنے ہے اس لیے کہ مذہب کی بنیاد یہ ہے کہ عقل کے دیے کو گل کر دیا جائے۔ ''اج وی تہاڈے ہاں مشہور ہے نا دو چیزاں شریعت اچ نئیں نا ہوندیاں۔ شرع اچ شرم نئیں ہوندی، تے شرع اچ عقل نئیں ہوندی، بے شرم وی ہونداا ے تے بے عقل وی ہونداا ے''۔

دنیا کی کوئی قوم بغیر کسی وجہ کے ذلت کے سمندر میں غرق نہیں ہوتی

ان سے جب کہیے تو وہ جو آپ کہتے ہیں کہ سمجھایے عقلی طور پہ تو وہ کہتے ہیں شریعت کے معاملے میں عقل کو دخل نہیں ہوتا۔ چل بھئی۔ جب عقل کو دخل نہ رہے تو آپ پھر دیکھتے ہیں کہ فطرت کی قوتیں مسخر کی جا سکیں، یہ تو عقل کی رو سے مسخر کی جا سکتی ہیں۔ ملائکہ کی لعنت۔ اور جس قوم کی کیفیت یہ ہو کہ نہ تو وہ سماوی برکات سے متمتع ہو سکتی ہو کہ نظامِ خداوندی کا وہ نتیجہ تھا، نہ ہی فطرت کی

قوتوں کو مسخر کرے کہ دنیا کی ذلیل ترین قوم ہوجائے گی اس کا نتیجہ ہوجائے گا وَ النَّاسِ اَجۡمَعِیۡنَ ((3:87 اقوامِ عالم کی اہل 478 **آل عمران** خوشگواریوں سے ہی محروم ہوجاتی ہے وہ قوم' بھیک مانگتی ہے دوسروں سے' ذلت کے ٹکڑے کھاتی ہے وہ قوم۔ اس سے بڑی لعنت اور کون سی ہوسکتی ہے کسی قوم کے اوپر۔ غور فرمایا آپ نے کہ ان معاملات میں قرآن کیا کہہ گیا ہے۔ یہ اس قوم کی کیفیت ہوتی ہے جو خدا کی طرف سے یوں ہی یہ لعنتیں نہیں برستیں جَزَآؤُهُمۡ ((3:87 ان کی اس روش کا نتیجہ یہ ہوتا ہے۔ کوئی خوشگواری کی راہ ان کے سامنے کھلی ہوئی نہیں ہوتی اور اس کے بعد پھر بیٹھی ہے یہ دعائیں مانگ رہی ہے۔ کہتا ہے کَیۡفَ یَهۡدِی اللّٰهُ (3:86) کیا کرتے ہو تم؟ روش یہی اختیار کیے ہوئے ہو' چاہتے یہ ہو کہ یہ چیزیں دور ہوجائیں' نہیں ہوسکتیں۔ خٰلِدِیۡنَ فِیۡهَا (3:88) اسی کے اندر رہتے چلے جائیں گے' بڑھتے چلے جائیں جتنا زیادہ زور تم کو دیا جاتا ہے اسی روش کا کہ جس روش کے نتیجے میں یہ چیزیں آئی ہوئی تھیں۔ غور فرمایا آپ نے! جہاں کہیں آپ کہیں وعظ سنیں گے جی! مسلمانوں کی حالتِ زار یہ دیکھیں سیلاب آ گیا ہے جی' بری حالت ہے جی! آنا کیوں نہیں ہے مسلمانوں نے دیکھیے نا اسلام کو چھوڑ دیا ہے۔ ان کی حالت خراب ہوگئی ہے۔ امراض پھیل رہے ہیں صاحب!۔ یعنی یہ ساری چیزیں یہ کہتے چلے جائیں گے۔ جب پوچھیے کہ کریں کیا تو جن چیزوں کی وجہ سے یہ کچھ ہو رہا ہے' ان ہی میں اور زور دیتے چلے جائیں گے' وہی غلط عقیدے اور پختہ کرو' وہی غلط عمل اور زیادہ کرو' تھوڑے ہو گئے ہیں تم میں۔ کیا اس سے یہ قوم نکل سکتی ہے اس کے اندر سے؟ جس بد پرہیزی سے مرض لاحق ہوا ہے' اس بد پرہیزی میں اور زیادہ ہوتے چلے جاؤ۔ خٰلِدِیۡنَ فِیۡهَا لَا یُخَفَّفُ عَنۡهُمُ الۡعَذَابُ ((3:88 عذاب میں تخفیف تک نہیں ہوسکتی۔

صدیوں سے گرفتار ہماری کسمپرسی کا شافی علاج زندگی کی قدر و قیمت کو جاننے میں مضمر ہے

عزیزانِ من! مرض میں تخفیف تو اس وقت ہو کہ جو بد پرہیزی آپ کر رہے تھے' اس میں کچھ کمی کیجیے تو تخفیف ہو اس میں۔ اگر آپ بڑھتے چلے جایئے' تخفیف کیسے ہوگی اس عذاب سے۔ اور اگلی چیز ہے وَ لَا هُمۡ یُنۡظَرُوۡنَ ((3:88 کہا یہ گیا ہوا ہے کہ صاحب! یہ عذاب اور یہ ثواب یہ چیزیں جو ہیں آخرت کے ساتھ متعلق ہیں' وہاں جا کے ہوتا ہے' اس دنیا میں یہ نہیں۔ قرآن کہتا ہے وَ لَا هُمۡ یُنۡظَرُوۡنَ (3:88) اس قوم کو تو پھر یہ بھی مہلت نہیں دی جاتی کہ چلیے یہ زندگی ٹھیک رہے' اگلی زندگی میں عذاب ملے ان کو' یہیں عذاب شروع ہوجاتا ہے ان کا۔ دین کے خوشگوار نتائج بھی اس دنیا سے شروع ہوجاتے ہیں۔ اس کے چھوڑنے کا جو نتیجہ ہے تباہ کن الم انگیز' وہ بھی اسی دنیا سے شروع ہوتا ہے۔ جنت اور جہنم کی ابتدا تو اسی زندگی سے ہوتی ہے۔ اسی زندگی اور اُسی

زندگی کے تو معنی کچھ نہیں ہیں، زندگی تو مسلسل ہے۔ اس کے تو حصے بخرے کیے نہیں جا سکتے۔ یہ تو ہو ہی نہیں سکتا کہ ایک قوم اُس دنیا 478 **آلِ عمران** میں تو انسانیت میں سب سے ذلیل تریں قوم ہو اور جوں ہی آنکھیں بند ہوں خدا کی مقرب ترین قوم بن جائے۔ **وَ لَا هُمۡ يُنۡظَرُوۡنَ** (3:88) مہلت نہیں پھر ان کو ملتی۔ عزیزانِ من! دیکھ رہے ہیں قرآنِ کریم نے کس طرح آپ کی پوری تاریخ کو دو آیتوں کے اندر سمٹا کے رکھ دیا ہے۔ میں نے کہا تھا کہ جب یہ آیات سامنے آئی ہیں تو واقعی مجھ پہ سکتہ طاری ہو گیا تھا۔ انسان کے اوپر لرزہ آ جاتا ہے۔

لفظ تاب تو انسان کو مایوس ہونے ہی نہیں دیتا

ہم اس حالت میں ہیں اور وہ یہ کہہ رہا ہے کہ **خٰلِدِيۡنَ فِيۡهَا لَا يُخَفَّفُ عَنۡهُمُ الۡعَذَابُ** (3:88) پھر کیا شکل ہے اس چیز کی؟ کیا کوئی صورت ہے بھی یہاں سے بچنے کی؟ نکل سکتی ہے اس سے قوم؟ قرآن ہے ابدی مایوسیاں یہ طاری نہیں کرتا۔ وہ جو ایک فقرہ مشہور ہے کہ ہر بچے کی پیدائش اس امر کا اعلان ہوتی ہے کہ فطرت ابھی انسان سے مایوس نہیں ہے۔ خدا تو مایوسی سکھاتا ہی نہیں ہے، قرآن تو مایوسی کو کفر قرار دیتا ہے۔ اس حالت میں بھی کہا **اِلَّا الَّذِيۡنَ تَابُوۡا مِنۡۢ بَعۡدِ ذٰلِكَ** (3:89) بچ جاؤ گے ابدی مایوسی نہیں ہے، بچنے کی راہ یہ ہے۔ تاب کے معنی میں نے عرض کیا تھا کسی دوراہے پہ آپ پہنچ کے جہاں دو راستے پھٹتے ہوں آپ نے جس گاؤں جانا ہے وہ راستہ چھوڑ کے دوسرے راستے پہ غلطی سے قدم آپ کا اٹھ جائے، آپ چلتے جائیں، کچھ دور جانے کے بعد آپ کو اس کا احساس ہو کہ یہ راستہ وہ نہیں ہے۔ وہاں پہلے آپ رکیں گے یہ احساس ہونا چاہیے کہ غلط راستے پہ چل رہا ہوں اس رکنے کے بعد پھر کیا وہاں رک جانا جو ہے آپ کو صحیح راستے پہ لے جائے گا؟ یہ پہلا احساس ہے غلطی کا، پھر آپ کو پلٹ کے وہیں آنا پڑے گا جہاں سے آپ غلط راستے پہ چلے تھے یہ وہاں سے پلٹ کے اس مقام پہ جو آنا ہے، اسے عربی زبان میں تاب کہتے ہیں۔ یہ ایک عمل ہے کرنے کا کام ہے۔ وہاں اگر آپ کھڑے ہوں اور کھڑے ہو کے کرتے ہیں یا اللہ میری توبہ **استغفر اللہ ربی من کل ذنب و اتوب الیہ** اور کھڑے رہیں وہیں، پہنچ جائیں گے شام کو آپ اس گاؤں میں؟ اور اگر یا اللہ میری توبہ کر کے چلتے رہیں اسی راستے پہ تو۔ **اِلَّا الَّذِيۡنَ تَابُوۡا مِنۡۢ بَعۡدِ ذٰلِكَ** (3:89) احساس ہو جائے کہ غلط راستہ ہے پھر پلٹے وہاں سے پھر وہیں آئے جہاں سے غلط قدم اٹھا تھا۔ وہاں آ گئے کیا پہنچ گئے اس گاؤں میں؟ ابھی ایک منزل اور باقی ہے **وَاَصۡلَحُوۡا** قف (3:89) پھر صحیح راستے پہ چلو۔ عزیزانِ من! قرآن ہے۔ **فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوۡرٌ رَّحِيۡمٌ** (3:89) یہ تم کرو پھر دیکھو اس

کا نظام یہ جو تمہیں اتنا نقصان پہنچا تھا' اس سے بھی حفاظت ہو جائے گی' وہ جو تمہاری اس طرح سے نشوونما' سامانِ مرحمت آلِ عمران 478 کی ہو گئی تھی' وہ بھی پوری ہو جائے گی۔ لیکن پہلا جو عذاب تھا وہ بھی جَزَآؤُھُمْ (3:87) تھا وہ بھی تمہاری غلط روش کا نتیجہ تھا' اب اس کے بعد اگر پھر سے ان خوشگواریوں کو لینا چاہتے ہو تو اس سے بھی تمہاری ہی روش ہو گی جس کا ایک نتیجہ ہوگا' سفر تو تم نے ہی کرنا ہے۔

تباہی اور بربادی کے مایوس کن حالات میں ایک آنے والے کا غلط تصور اور اس کی نوعیت

ہر مقام پہ خدا نے یہ بات کہی۔ دیکھیے اس مقام پر اس مایوسی کے عالم میں جن کی نگاہیں قرآن پہ نہیں تھیں' انہوں نے پھر اس کے لیے گھبرا کر مایوس ہو کر کہیں یہ چیز نکالی کہ صاحب! کوئی آنے والا آئے گا تو وہ کچھ کرے گا یعنی ہم نہیں پھر بھی کچھ کریں گے۔ آنے والے کی پھر شکلیں مختلف ہیں۔ دنیا کی ہر قوم جس نے دین کو چھوڑا تھا' مذہب کی سطح پہ اتری تھی' جب گھبرا گئی اور مایوس ہو گئی اپنی انحطاط سے زوال سے تو انہوں نے آنے والے کا عقیدہ ایک مترشح کیا تاکہ قوم کو کچھ حوصلہ دلائے رکھیں' فریب میں رکھیں ان کو کہ کہیں یہ کچھ چھوڑ کے بھاگ ہی نہ جائیں۔ یہ ایک چیز تھی جو مذہبی پیشوائیت نے ان کے دل میں ایک فریب کے طور پہ ڈالی تھی کہ کہیں ابدی مایوس ہونے کے بعد تو وہ چھوڑ کے چلے جائیں گے نا جیسے اس دور میں ہمارے ہوا ہے۔ آنے والے کا عقیدہ وضع کیا گیا۔ عزیزانِ من! دنیا کے ہر مذہب میں آنے والے کا عقیدہ موجود ہے۔ بدھ مت والے آخری متیا بدھ کے انتظار میں ہیں' ہندو کلنکی اوتار کے انتظار میں ہیں' یہودی ایک مسیحا کے انتظار میں ہیں۔ وہ مسیحا آ بھی گیا لیکن اس کو انہوں نے اپنے بقول پھانسی پہ چڑھا دیا۔ اس مسیحا کے ماننے والے پھر حضرتِ عیسیٰؑ کی آمد کے انتظار میں ہیں۔ اور وہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جو آخر میں آ کے اتمامِ دین اور تکمیل کر گیا ہے انسانیت کے سارے نظام کی' اس کے ماننے والے پھر انتظار میں ہیں۔ کیوں انتظار میں ہیں؟ جب یہ مایوسی طاری ہو جاتی ہے تو اس وقت پھر قوم کی اپنی قوتِ عمل شل ہو جاتی ہے۔ پھر وہ یہ سوچتی ہے کہ

مردے از غیب بیروں آید و کارے بکند

''یعنی ساہنوں نہ کچھ کرنا پئے''۔

زوال انگیز قوم کی کیفیت اور 1965ء کی جنگ کا ماجرا

آپ نے یہ وعظ سنے ہوں گے' میں نے سنے ہیں کہ امام مہدی جب تشریف لے آئیں گے اور اس کے بعد وہ توپوں سے

لڑائی ہوگی نا کہ اتنا انہوں نے اپنے ہاں اصلاح کر لی ہے اپنے وعظ میں کہ وہ تیر کمان کی بجائے کہا کہ توپوں سے لڑائی ہوگی۔ تو وہ 478 **آلِ عمران** کہتے تھے کہ ان کی توپیں چلانے والے آسمان سے فرشتے آئیں گے ''یعنی او وی اے نئیں چلان گے''۔ ان کی کیفیت یہ ہوگی کہ وہ کہیں گے اس آنے والے سے بھی کہ جا تو اور تیرا رب جا کے دشمنوں سے لڑے اِنَّا هٰهُنَا قٰعِدُوْنَ (5:24) ''اسی بیٹھے آں ایتھے''۔ وہ آئے گا توپیں فرشتے چلائیں گے۔ جب ملک فتح ہوجائے گا تو پھر ہم جشن منائیں گے، شادیانے منائیں گے نعرۂ تکبیر۔ زوال انگیز قوم کی کیفیت یہ ہوجاتی ہے وہ توپ بھی خود نہیں چلاتی، فرشتے چلاتے ہیں۔ یہ تھا غیر شعوری عقیدہ جس کی بنا پہ سن 65ء کی جنگ میں بھی ہمارے سامنے موجود تھے وہ توپیں چلانے والے۔ ہم نے کہا کہ نہیں صاحب! یہ نہیں چلا رہے ہیں ''اے تے گھوڑیاں والے چلان ڈئے ہوئے ہیگے نیں تے سبز عمامیاں والے چلاندے نیں اے آسمانوں آئے ہوئے'' ۔آپ نے دیکھا غلط عقائد جب تحت الشعور کی گہرائیوں میں ہوتے ہیں کس کس شکل میں سامنے آتے ہیں؟ سامنے دیکھ رہے ہوتے ہیں ہم کہ وہ خاکی وردی والے تھے جو چلا رہے تھے۔ کہتے تھے کہ نہیں! یہ تو سفید عماموں والے تھے جو چلا رہے تھے ۔''غیب سے آئے گا کوئی تو یہ کچھ کرے گا'' یہی عقیدہ ہے کہ جس نے مجددیت کے کہیں عقیدے پیدا کیے، کہیں نبوتِ جدیدہ کے عقیدے پیدا کیے۔ یہ مایوسی کی چیزیں ہیں۔

قرآنِ حکیم کو محفوظ رکھنے کا مقصد

یہ یاد رکھیے قرآن نے یہ نہیں کہا۔ باقی قوموں کے لیے یہ تھی مایوسی، اس کے لیے ایک نبی کی ضرورت تھی کہ ان کے پاس خدا کا پیغام بینات اپنی اصلی شکل کے اندر موجود نہیں تھے۔ قرآن کو قیامت تک کے لیے محفوظ اس لیے رکھا گیا ہے کہ کسی دوسرے آنے والے کی ضرورت باقی نہ رہے۔ بینات موجود ہیں بات اگلی صرف یہ ہے کہ اس نظام کو عملاً تم متشکل کرلو یہی نتائج پیدا ہوجائیں گے۔ آنے والے کا سوال کہاں ہے؟ اسی لیے قرآن نے اس عذاب سے نکلنے کے بعد یہاں یہ نہیں کہا کہ ٹھہر جاؤ ایک ہم اور نبی بھیجیں گے، وہ آپ کو نکالے گا آ کے۔ کہا اِلَّا الَّذِيْنَ تَابُوْا (3:89) (جمع کے سارے صیغے ہیں) تم ہی نے یہ کچھ کرنا ہے۔ پھر پلٹ کے آ جاؤ وَ اَصْلَحُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ (3:89) یہی چاہتے تھے نا۔ آپ نے دیکھا کسی غیب سے آنے والے کا کوئی ذکر نہیں ہے۔ تم غلط راستے پہ چلے۔ تم وہاں سے پلٹ کے صحیح راستے کے اوپر آ جاؤ۔ غلط راستے پہ چلنے کے وہ نتیجے تھے، صحیح راستے پہ چلنے کا یہ نتیجہ ہے۔ بینات تمہارے پاس موجود ہیں، صحیح راستہ آج اختیار کر سکتے ہو۔ قرآن کو قیامت تک محفوظ

آلِ عمران 478 رکھنے کا مقصد ہی یہ تھا کہ جب بھی یہ قوم ہوش مند ہو جائے، محسوس کر لے اپنی غلطی کو، یہ صحیح راستہ اختیار کر لے۔ راستہ تو موجود ہے وہاں وہ نہیں گم ہوا۔

صدیوں سے غلط راستے کو بدلے بغیر آج ساری مسلم قوم مرثیہ پڑھتے ہوئے دکھائی دیتی ہے

لیکن اگر کیفیت یہ ہو جائے کہ اِنَّ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا بَعْدَ اِیْمَانِھِمْ (3:90) اس ایمان کے بعد کفر کی راہیں اختیار یعنی غلط راستہ اختیار کیا۔ اس کا احساس بھی ہوا کہ ہم ذلیل ترین قوم ہیں۔ یہ احساس اتنا عالم گیر ہے، کہیں دو مسلمان آپس میں ملیں، آپ دیکھیں گے وہ مرثیہ پڑھیں گے اپنا، ساری قوم مرثیہ پڑھ رہی ہے۔ سارا عالمِ اسلام اپنا نوحہ خواں آپ ہو گیا ہوا ہے۔ یہ کیفیت احساس کی ہو گئی ہے۔ لیکن اس کے بعد کفر کی یہ کیفیت بَعْدَ اِیْمَانِھِمْ (3:90) لیکن ثُمَّ ازْدَادُوْا کُفْرًا (3:90) اور اسی راستے میں بڑھتے چلے جا رہے ہیں۔ وہاں کہا تھا کہ جو لوگ اِلَّا الَّذِیْنَ تَابُوْا مِنْ م بَعْدِ ذٰلِکَ وَ اَصْلَحُوْا (3:89) وہ نکل سکیں گے۔ کہا جن کی کیفیت یہ ہو۔ کفر اختیار کیا غلط روش اختیار کی۔ اس میں بڑھتے چلے جاتے ہیں لَّنْ تُقْبَلَ تَوْبَتُھُمْ (3:90) اور کھڑے ہوئے توبہ توبہ کر رہے ہیں۔ کہتا ہے یہ توبہ قبول ہو جائے گی؟ یعنی' راستہ وہی تو غلط ہے اس میں بڑھتے چلے جا رہے ہیں اور کہتے چلے جا رہے ہیں کہ یا اللہ ہماری توبہ۔ وہ کہتا ہے یہ کیفیت اُولٰٓئِکَ ھُمُ الضَّآلُّوْنَ (3:90) انہی کو تو گمراہ کہتے ہیں۔ غلط راستے کے اوپر ثُمَّ ازْدَادُوْا کُفْرًا (3:90)۔ کیسا عجیب نقشہ کھینچا گیا ہے ہماری حالت کا؟ ہر شخص محسوس کر رہا ہے غلط راستے پہ چل رہا ہے۔ ہر شخص اسی راستے کے اوپر اور آگے بڑھتا چلا جا رہا ہے، کہتا جا رہا ہے زبان سے توبہ میری استغفر اللہ۔ وہ کہتا ہے کہ کیا اس طرح بھی کبھی توبہ قبول ہوا کرتی ہے؟ توبہ کے تو معنی یہ تھے کہ عملاً پلٹ جاؤ اس راستے کے اوپر، صحیح راستے کے اوپر آ جاؤ۔ کہتا ہے جن کی کیفیت یہ ہو بڑھتے چلے گئے تا آنکہ پھر موت آ جائے۔ جب موت آ جائے تو اس کے بعد کچھ باقی گنجائش ہی نہیں رہتی، امکان ہی نہیں رہتا۔

توبہ کی قبولیت تو عمل کے ساتھ مشروط ہے

اِنَّ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا وَ مَاتُوْا وَ ھُمْ کُفَّارٌ فَلَنْ یُّقْبَلَ مِنْ اَحَدِھِمْ مِّلْءُ الْاَرْضِ ذَھَبًا وَّ لَوِ افْتَدٰی بِہٖ ط (3:91) یہاں تو امکان تھا کہ ابھی چلنے کی سکت تھی۔ جو غلط راستے پہ چلتا چلتا سڑک کے کنارے مر جائے تو وہ کس طرح سے گاؤں پہنچ جائے گا جی؟ جیب میں ہوں دس ہزار کے نوٹ قرآن کہتا ہے پچاس ہزار کے کیوں نہ ہوں کوئی فائدہ ہی نہیں دیں گے یہ۔ وہیں پلٹنے کے لیے اگر کھڑا

ہوجاتا اُدھر سے بس کوئی آ جاتی، پیسے جیب میں ہوتے، وہ بس والے کو کرایہ دیتا، پلٹ کے آ جاتا، پیسے بھی کام دیتے۔ یہ اگر جیب میں پیسہ رکھتے ہوئے پلٹا نہیں ہے اور مر گیا ہے دس لاکھ روپیہ بھی جیب میں ہوگا، قرآن کہتا ہے فائدہ کیا ہوگا؟ یہ زمین کے وزن کا سونا بھی دے دیا جائے اس کے بعد یہ کفارہ نہیں ہوسکتا۔ یہ توبہ کا امکان اس وقت تک ہے جب تک عمل کی گنجائش ہے۔ عزیزانِ من! یاد رکھیے یہ جو آخری وقت میں کہتے ہیں نا کہ کلمہ پڑھ توبہ کر وہ سمجھتے ہیں کہ آخری وقت میں آخری سانس میں یا اللہ میری توبہ کہا۔ دم برابر ہوا، بخشا گیا۔ قرآن نے دوسری جگہ کہا ہے کہ جب موت سامنے آ جائے تو اس وقت کی توبہ کچھ کام نہیں دیا کرتی (4:18)۔ اس لیے کہ توبہ منہ سے چند لفظ نکالنے کا نام نہیں ہے توبہ تو اپنے غلط روش کے عملاً ازالے کا نام ہے۔ اور جب عمل کا امکان ختم ہوجائے، گنجائش ختم ہوجائے، اس کے بعد توبہ کے معنی کیا ہیں۔

الم انگیز عذاب کی بنیادی وجہ دولت کے ڈھیر کو اپنی ذات تک محدود رکھنا ہے

اسی لیے یہ کہا کہ وہ لوگ جو اسی غلط روش پہ چلتے جائیں چلتے جائیں تا آنکہ موت آ جائے ان کو تو اس کے بعد پھر وہ سارا ہی جتنا سرمایہ جمع کیا تھا، اتنا اس سے کہیں زیادہ بڑا، ساری دنیا کی دولت اگر وہ دے کر چاہیں کہ پھر وہ ان کا کفارہ بن جائے، نہیں بن سکتا۔ اُولٰٓئِکَ لَهُمۡ عَذَابٌ اَلِیۡمٌ (3:91) ان کے لیے بڑا دردانگیز عذاب ہے۔ اتنی دولت کے ڈھیر پاس ہوں اور پھر ذرا سی تخفیف نہ ہو اس عذاب میں کتنا یہ عذابِ الیم یہاں کہا ہے الم انگیز، دردناک عذاب ہے یہ۔ ان پہ یہ عذاب وَ مَا لَهُمۡ مِّنۡ نّٰصِرِیۡنَ (3:91) اور کوئی پھر اس وقت مددگار بھی نہیں ہوسکتا۔ خود پلٹنے والے کے تو مددگار کوئی ہو سکتے ہیں، ساتھی کوئی مل جائیں، کوئی سواری راستے میں مل جائے، کمزور ہے لڑھکتا ہوا چلا آ رہا ہے، کوئی رحم کھا کے ہی اپنے ساتھ سوار کر لے، کوئی دوست ہی مل جائے۔ جو اس حالت کے اندر سڑک کے کنارے مر جائے اور مردہ کی حالت میں ہو۔ نہ اپنا روپیہ کام دے سکتا ہے نہ کسی رفیق کی وہاں مدد کام دے سکتی ہے پھر تو وہ منزلِ مقصود پہ پہنچ ہی نہیں سکتا۔

تباہ حال قوموں کے نفوس تو باقی رہتے ہیں لیکن ان کے ہاں وقار کی کوئی چیز باقی نہیں رہتی

لہٰذا قبل اس کے کہ اس قوم پہ وہ کیفیت آ جائے جسے قرآن نے ابدی موت کہا ہے۔ قرآن نے قوموں کی ہلاکت جو کہا ہے وہ اس مقام کو کہا ہے جہاں پھر بازیابی کا امکان نہیں رہتا اور قوم میں پھر عزتِ نفس تک وہ ختم ہوجاتی ہے اور قرآن کہتا ہے کہ ان کی داستانیں باقی رہ جاتی ہیں۔ ختم ہوجاتی کے معنی یہ نہیں کہ اس کا کوئی ایک متنفس باقی نہیں رہتا، نسلیں تو باقی رہتی ہیں اس قوم کی لیکن

478 آلِ عمران زندہ اقوام کی صف میں ان کا نام باقی نہیں رہتا۔ ان کی داستانیں جو گذشتہ ماضی کی ہوتی ہیں' وہ باقی رہتی ہیں جیسا ہمارے ہاں ہو چکا ہے۔ جب بھی کسی مسلمان سے ان لوگوں سے بات کیجیے مذہب پرست طبقہ سے ہمیشہ ماضی کی داستانیں سنائیں گے اپنے حال کے اوپر ہمیشہ ماتم کریں گے۔ لیکن خیر! میں تو ان میں سے نہیں ہوں جو یہ کہوں کہ ابدی موت اور ہلاکت آ گئی ہے اس قوم پہ۔ یہ احساس تو ابھی ہے ان کا کہ ہماری حالت بڑی ہی دردانگیز اور عبرت ناک ہے۔ قرآن بھی ان کے پاس موجود ہے' کہیں بھی یہ چیز ان کے سمجھ میں یہ اگر بات آ گئی کہ یہ ایک کرنے کی چیز تھی' یہ پھر اپنے نتائج ان کو دیدے۔

قرآنِ حکیم انسانیت کو ابدی مایوسی سے ہمیشہ کے لیے محفوظ رکھنے کا طریق تجویز کرتا ہے

عزیزانِ من! قرآن کا محفوظ ہونا ہمیں ابدی مایوسی کے جہنم میں نہیں دھکیل سکتا۔ لیکن اگر وہ ابدی موت آتی ہے تو پھر اس کے بعد کوئی گنجائش باقی نہیں رہتی۔ اب یہ توبہ کیا ہے؟ کرنا کیا چاہیے؟ پہلا قدم کیا اٹھانا چاہیے؟ یہ جتنی غلط روش ہے آپ دیکھتے ہیں کہ یہ کیا کر رہی ہے؟ آپ کے معاشرے میں بڑی خرابیاں ہیں' بڑی برائیاں ہیں' رپورٹ اس پہ مرتب کیجیے تو ہزاروں صفحوں کی مرتب ہو جائے۔ سمٹا کے لائیے تو بات ایک ہی ہے کہ یہ ہوسِ زر اتنی ہو گئی ہے کہ کوئی VALUE یا قدر باقی نہیں قوم کے اندر رہی۔ ہر شخص یہ چاہتا ہے زیادہ سے زیادہ مجھے مل جائے' سمیٹتا چلا جائے' لیتا چلا جائے۔ عزیزانِ من! بڑی غور طلب چیز ہے۔ قرآن نے علاج بتا دیا ہے اس نے کہا ہے کہ اس حالت میں توبہ کیا ہو گی تمہاری؟ غور کیجیے گا کہ قرآن کس طرح سے علتِ مرض کے اوپر؟؟؟؟؟؟؟؟؟؟ سبب کو لیتا ہے وہ کہتا ہے بنیادی سبب یہ تھا کہ تم میں سے ہر ایک نے اپنی ذات کے لیے سمیٹنا شروع کر دیا۔ اس کی توبہ کیا ہے؟ اس روش کو چھوڑ کے دوسری روش اختیار کرنا کیا ہے؟ یہ ہے کہ جو چیزیں تمہیں عزیز ترین ہیں جن کی بڑی جاذبیت ہے' ان چیزوں کو دوسروں کی منفعت کے لیے کھلا چھوڑ دو۔ باتیں کرتے ہیں صاحب کہ یہ اسلام کے اندر اصل چیز وہ روحانیت ہے' یہ کیا چیزیں تم دنیاداروں کی لے آئے۔ آپ غور کیجیے کہ یہاں پہنچنے کے بعد علاج کیا بتاتا ہے؟ وہی سرمایہ داری کا نظام جس نے یہاں پہنچایا ہے' اس کے علی الرغم وہ کہتا ہے کہ یہ ہے علاج لَنۡ تَنَالُوا الۡبِرَّ ((3:92 کشاد کی راہ چاہتے ہو؟ یہ کہا تھا نا کہ بتاؤ کون سا طریق ہے پھر جس سے کشاد کی راہیں تمہارے سامنے آ جائیں؟ کشاد کی راہ معلوم کرنا چاہتے ہو؟ یہ ہے اس کی راہ عملاً یہ کرنا ہو گا کہا ہے لَنۡ تَنَالُوا الۡبِرَّ (3:92) اس کے سوا کوئی دوسری راہ ہے نہیں۔ عزیزانِ من! میں' یہ نہیں ہے کہ یہ نماز' روزہ' حج' زکوٰۃ اس کی تنقیص کرتا ہوں یا اس کا مقام جو ہے اس کی قیمت کم کرتا ہوں' قطعاً نہیں' وہ تو اس

مشین کے پرزے ہیں اگر ان پرزوں کی قیمت میں کم کر دوں تو مشین تو دوبارہ بن ہی نہیں سکتی۔ 478آلِ عمران

ضروریاتِ زندگی کو احسن طریق سے پورا کرنے کی بجائے نمود و نمائش کی جاذبیتوں کو دعوت دینا' جہنم کو دعوت دینا ہے

لیکن قرآن دیکھیے بات کہاں سے چلا رہا ہے؟ ذکر اس نے ان چیزوں کا نہیں کیا' بنیاد ہے جو اس کو لایا ہے وہ۔ کہا یہ ہے کہ کشاد کی راہ نہیں مل سکتی تاوقتیکہ یہ نہ کرو' کیا نہ کرو؟ حَتّٰی تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ ط (3:92) کیا بات کر گیا ہے؟ یہ تُحِبُّوْنَ (3:92) کی بات تھی نا یعنی ایک تو چیز وہ ہے جو ضرورتاً آپ لیتے ہیں' اس کی کشش و جاذبیت کی بنا نہیں اسے آپ لیتے' وہ تو ضرورت کی چیز ہے۔ کھانا کھاتے ہیں آپ ضرورت کی چیز ہے' زندگی کا تقاضا ہے پانی پیتے ہیں' زندگی کا تقاضا ہے ایک چھت بھی چاہیے آپ کو' کپڑے بھی چاہئیں آپ کو' علاج معالجے کے لیے بھی چاہیے آپ کو۔ اس سے اگلی وہ چیز ہوتی ہے جو محض اس چیز کی جاذبیت کی بنا پہ آپ سمیٹیں۔ تو کہا ہے کہ جو چیزیں اس جاذبیت کی بنا کے اوپر تم سمیٹتے چلے جا رہے ہو تُنْفِقُوْا مِمَّا (3:92) کھلا رکھو ان کو مِمَّا تُحِبُّوْنَ (3:92)۔ واہ واہ واہ یہ انفاق کے معنی خرچ کرنا ہمارے ہاں آ گیا ہے' آپ کو معلوم ہے میں نے بتایا تھا آپ کو بنیادی معنی اس کے یہ ہوتے ہیں' وہ میانی اب اگلی نسل کو تو معلوم ہی نہیں ہوگا کیا ہوتی ہے' روپیہ ہی نہیں ہوتا تو میانی کیا سمجھیں گے؟ وہ جس زمانے میں روپے ہوتے تھے تو وہ روپے رکھے۔ اگر وہ سو روپیہ جیب میں کہیں ڈال دے تو جیب سمیت ہاتھی مع ہودا غائب۔ تو وہ بنائی ہوتی تھی موٹی ستلی کی بٹی ہوئی ایک میانی ایک طرف سے بندھی ہوئی تھی دوسری طرف وہ کھلی ہوئی ہوتی تھی اس میں وہ روپیہ ڈالتے چلے جاتے تھے اس میں وہ محفوظ رہتا تھا اور جب انہوں نے شہر آنا ہوتا تھا تو وہ کرتے کے نیچے کمر سے باندھ لیتے تھے اسے۔ یہ تو وہ ہوتی جو دوسری طرف سے بندھی ہوئی ہو اور ایک میانی وہ ہوتی ہے جس کے دونوں سرے کھلے ہوئے ہوں۔ ادھر سے ڈالتے چلے جایے اُدھر سے نکلتا چلا جائے۔ اسے انفاق کہتے ہیں۔

فردوسِ گم گشتہ کو پالینے کا طریق

وہ روپیہ حاصل کرنے کی مذمت نہیں کرتا' وہ تارک الدنیا نہیں ہے۔ وہ یہ راہیں نہیں سکھاتا' وہ کہتا ہے ٹھیک ہے حاصل کرو لیکن یہ نہ کرو کہ اس میں ڈالو وہ جو قرآن میں آیا ہے کہ ڈالتا ہے اور اس کے بعد اس کا منہ بند کر کے رکھ دیتا ہے (70:18)۔ کہتا ہے یہ غلط ہے منہ بند کرنا میانی کا جو ہے یہ ہے غلط راستہ جو ہے' کفر کا راستہ جو ہے۔ روپیہ حاصل کرنا کفر کا راستہ نہیں' حاصل کرو۔

اس میانی میں ڈالو کہ ادھر سے ڈالتے چلے جاؤ، نوعِ انسانی کی منفعت کے لیے اگلا منہ اس کا کھلا رکھو۔ عزیزانِ من! بنیادی ہے[478] **آلِ عمران**
پھر سے اس فردوسِ گم گشتہ کی بازیابی کے لیے قرآن نے جو طریق بتایا آپ غور کیجیے پہلا قدم یہ بتایا ہے یہاں۔ اس کے یہ معنی ہوئے کہ اس کو الٹ دیجیے تو بنیادی، اساسی، اصولی جو سبب ہے آپ کی ذلت کا غلط راستے کا وہ یہ ہے یہ نظامِ سرمایہ داری جسے آج کی اصطلاح میں کہتے ہیں، سب کچھ اپنے لیے سمیٹ کے رکھتے چلے جانا۔ تو کہا یہ ہے طریقہ لَنۡ تَنَالُوا الۡبِرَّ (3:92) اس کے سوا کوئی دوسرا طریقہ نہیں ہے کہ جو چیزیں محض ان چیزوں کی جاذبیت کی بنا پہ تم نے اکٹھی کی ہیں، عندالضرورت نہیں ہے، ان کا منہ کھلا رکھو۔ کھلا رکھو کے بعد پھر کہ صاحب دیے چلے جائیں اس کا کوئی حساب کتاب ہی نہیں؟ وہ کہا ٹھیک ہے بینک میں تو یوں جمع نہیں کرا رہے کہ تمہارے پاس ہر مہینے اس کے ہاں کا وہ آ جائے گا CREDIT DEBIT کا اکاونٹ، یہ تو وہاں تم دے رہے ہو وَمَا تُنۡفِقُوۡا مِنۡ شَیۡءٍ فَاِنَّ اللّٰہَ بِہٖ عَلِیۡمٌ (3:92) کہ یہ اس نظامِ خداوندی کے لیے دو جس کا حساب کتاب خود خدا نے رکھا ہوا ہے۔ یہ نہ سوچو کہ صاحب یہ دیا تو اس کے بعد تو یہ گیا، یہ گیا نہیں ہے۔ وہ علیم ہے ہر آن علم رکھتا ہے اس چیز کا کتنا دیا جا رہا ہے پھر اس کے حساب سے تمہارے ہاں اس نے ایک الگ اکاونٹ کھولا ہوا ہے اس کے حساب سے اس کے نتائج آئیں گے۔ یہ ہے طریقہ اس فردوسِ گشتہ کی بازیابی کا جس کے لیے کہا تھا کَیۡفَ یَهۡدِی اللّٰہُ (3:86) اس کَیۡفَ (3:86) کے معنی ابدی مایوسی نہیں تھی۔ کہا یہ تھا وہ شدت تھی یہ بات کہنے کی کہ کسی چیز کی صداقت پر ایمان لانے کے لیے جو مکمل ترین چیز تھی، وہ تو ہم نے کر کے دکھا دی، بینات دیے اور مشہود نتائج تمہارے سامنے آ گئے۔ اس کے بعد تم نے وہ روش اگر چھوڑی تو تیسرا راستہ کوئی ہے نہیں، راستہ وہی ہے۔

قرآنی نظامِ حکومت کی ابتدا لفظ انفاق کے فارمولے کو عملی شکل دینے سے ہو گی نہ کہ کفر اور اسلام کی آمیزش سے

وہ راستہ کیا ہے؟ اس نظام کو پھر سے عملاً متشکل کرو۔ متشکل کرنے کی ابتدا کہاں سے کرو؟ انفاق۔ عزیزانِ من! کئی کمیٹیاں بیٹھتی ہیں، کئی کمیشن بیٹھتے ہیں، اسکیمیں رائج ہوتی ہیں، کرپشن دور ہونی چاہیئے، انسداد ہونا چاہیے ان بدعنوانیوں کا۔

آلِ عمران 478 ہزاروں رپورٹیں لکھی جائیں' کتنے کمیشن بٹھائے جائیں۔ آپ نے دیکھا ہے کہ مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی۔ دوا غلط ہے' چیزیں غلط نظام کے اندر یہ پیوند کاری سے کچھ نہیں ہوا کرتا۔ یہ تو غلط نظام کو بدلنا ہوگا آپ کو۔ آپ کفر اور اسلام کے ملغوبے سے کوئی نتیجہ نہیں پیدا کر سکتے' اسے تو شرک کہتے ہیں۔ باطل دوئی پسند ہے حق لاشریک ہے۔ یا تو کفرِ خالص آپ کو رکھنا ہوگا یا دینِ خالص لانا ہوگا' پیوند سازی سے کچھ نہیں ہوتا۔ ہم کیونکہ کفر کو چھوڑنا نہیں چاہتے اور ادھر سے اتنی جرأت بھی نہیں ہے کہ اعلانیہ کہہ دیں کہ ہم نے اسلام کو چھوڑا' منافقت کی شکل اختیار ہم کرتے ہیں۔ اسلام اس چیز کی قطعاً اجازت نہیں دیتا کہ صاحب! ذاتی ملکیت نہ رہے یا ان چیزوں کو قومیایا جائے' نیشنلائز کیا جائے لیکن یہ کلیدی صنعتیں جو ہیں ان کو کچھ وقت کے لیے قومیایا جائے گا۔ کیا ہے یہ چیز؟ کفر اور اسلام کی آمیزش چاہتے ہیں آپ۔ اگر یہ کفر ہے ان چیزوں کو قومیانا تو زہر کا تو ایک ذرہ بھی زہر ہوتا ہے' لحمِ خنزیر کا ایک ٹکڑا بھی خنزیر کا لحم ہوتا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ نہیں صاحب سیر بھر نہیں پاؤ کھایا جا چکتا ہے اور وہ بھی محض عارضی طور پر'' یعنی الیکشن ختم ہوجان گے تے معاملہ مک جائے گا''۔ عزیزانِ من! اس روش کے اوپر تو آپ دیکھیے دنیا ہنس رہی ہے' مذاق اڑا رہی ہے آپ کا۔ اور آپ کا یا ہمارا مذاق اڑتا تو کونسی بات تھی آج دنیا کے اندر اسلام کا مذاق اڑ رہا ہے۔

تحریکِ پاکستان کی بنیاد اسلام کے احیا کے لیے تھی نہ کہ یہ کہ اسلام ایک چلا ہوا کارتوس ہے

ہزار سال کے بعد' تیرہ سو سال کے بعد صاحب پہلی مرتبہ ایک قوم نے یہ دعویٰ کیا تھا اور دعویٰ لے کے اٹھی تھی کہ ہم مملکت اس لیے چاہتے ہیں کہ ہم اس اسلام کا پھر سے احیا کر سکیں جو صدرِ اول میں آیا تھا اور جس نے یہ نتائج دکھائے تھے۔ دنیا نے یہ کہہ دیا تھا' یہ چلا ہوا کارتوس ہے اب نہیں دوبارہ چلنے کی اس میں ہمت۔ انہوں نے کہا تھا کہ غلط کہتے ہو' یہ چلا ہوا نہیں ہے' کارتوس ہے ابھی تک' ہم اسے بتائیں گے تمہیں عملاً نافذ کرنے کے بعد۔ ساری دنیا آپ کی طرف نہیں دیکھ رہی تھی' آپ کے اس دعوے کی طرف دیکھ رہی تھی کہ اسلام آج بھی انسانیت ساز نظام بن سکتا ہے دنیا کے اندر؟ اور اس بائیس سال [(1)] کے عرصے میں آپ نے جو کچھ کر کے دکھایا میں نے جیسا عرض کیا ہے کہ اپنی ہنسی نہیں ہم نے اڑوائی' ہم نے اسلام کی ہنسی اڑا دی۔ اور غیر تو جس نتیجے پہ پہنچے ہوں گے آپ کے ہاں کے امام الہند مولانا ابوالکلام آزاد کہ ابھی تک رعب ہے ذہنوں میں اس شخص کے علم کا کہ سر جھک جاتے ہیں' وہ شخص بھی آخری کتاب اپنی جو اس کے مرنے کے بعد شائع ہوئی ہے' اس کتاب کے اندر وہ شخص یہ لکھ کے چلا گیا ہے کہ ٹھیک ہے اسلام نے تیرہ سو سال پہلے ایک تجربہ کیا تھا' سو سال کے تجربے کے بعد وہ اس نتیجے پہ پہنچا کہ یہ نہیں چل سکتی ناممکن العمل چیز ہے' ناکام ہے' اس ناکام تجربے کو پھر سے دہرانے کا اعادہ کرنا حماقت ہے۔ وہ شخص لکھتا ہے اپنی کتاب میں۔ یہ کیا ہے؟ وہ کفر

میں اسلام کی پیوند سازی ہے۔ پیوند سازی' باطل کا تو میں نے کہا ہے ایک قطرہ جو ہے پورے حق کو ستیا ناس کر کے رکھ دیتا ہے[478] آلِ عمران
من بھر دودھ میں ایک تولہ بھر نہیں ایک چھٹا نک بھر نہیں ذرا سا بھی اگر آپ ایسڈ کا قطرہ یا دہی ڈال دیں گے' دودھ نہیں رہے گا'
کچھ عرصے کے بعد ساری دہی ہو جائے گا۔

قرآنِ حکیم نے اپنے معاشی نظام کی بنیاد اڑھائی پرسنٹ کی بجائے قُلِ الْعَفْوَ (2:219) پر رکھی ہے

عزیزانِ من! کرنے کا کام یہ ہے۔ قرآن نے سارا کچھ گنانے کے بعد صرف یہ ایک ہی بات کہی ہے کہ یہاں سے بات شروع کر دو اور پھر تم دیکھو کہ کس طرح سے آہستہ آہستہ تم وہیں پہنچ جاؤ گے۔ لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰی تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ (3:92) کس حد تک یہ ہوگا انفاق؟ کس حد تک کھلا رکھنا ہوگا؟ یَسْئَلُوْنَکَ مَاذَا یُنْفِقُوْنَ (2:219) پوچھا پھر انہوں نے کہ کس حد تک ہم اس کو کھلا رکھیں؟ کہا قُلِ الْعَفْوَ (2:219) ان سے کہہ دو کہ جتنا تمہاری اپنی ضروریات سے زائد ہے سارے کا سارا۔ قرآن کہتا ہے دین کی پہلی اینٹ یہ ہے' یہ کرو۔ اب آپ کو معلوم ہے کہ یہ چیز جو تھی پھر مذہب میں آ کے کیا ہوگئی؟ یہ ہوگئی کہ صاحب! اڑھائی پرسنٹ اس میں سے دے دیجیے۔ ارے یا تو کفرِ خالص اختیار کرو کہ صاحب سوال ہی نہیں ہے دینے کا کسی' کو میرا مال ہے' میں مالک ہوں' جیسے جی چاہے میں کروں۔ یہ بھی جرأت نہیں ہے۔ اسے لانا ہے ضرور اس میں' یُنْفِقُوْنَ (2:219) کا ترجمہ خرچ کرو اس میں سے خرچ کرو پہلی چیز تو کھلا رکھو نہیں اس میں سے خرچ کرو۔ کتنا خرچ کرو؟ اس نے کہا تھا قُلِ الْعَفْوَ (2:219)۔ کہتے ہیں یہ آیت منسوخ ہوگئی ہے۔ ٹھیک ہے کیا کیا جائے؟ اڑھائی فیصد چالیسواں حصہ۔ کہا گیا کہ اچھی بات ہے کچھ اسلامی حکومت نہ سہی مسلمانوں کی حکومت قائم ہوگئی ہے' یہ زکوٰۃ کا روپیہ جو آپ کہتے ہیں انہیں دیدیا جائے؟ کہنے

1۔محترم پرویز صاحبؒ کی یہ حق گوئی 1970ء کی بیان کردہ ہے۔

لگے واہ! یہ تو ٹیکس ہو جائے گا انہیں کیسے دیا جائے۔ کہ جی پھر کسے دیا جائے؟ ''کہن لگے اسی کا ہدے لئی بیٹھے ہوئے ہیگے آں ایتھے''۔ آپ دیکھتے ہیں یہ ثنویت' حکومت جو لے گی وہ ٹیکس کہلائے گا اور جو ہم خدا کا ٹیکس وصول کریں گے' وہ زکوٰۃ کہلائے گی۔ یہ دیدو کہتے ہیں باقی سارا مال حلال وطیب۔ غور فرمایا آپ نے۔ اور یہاں بھی مرے کو مارے شاہ مدار۔ زکوٰۃ کا نصاب کبھی آپ نے غور کیا ہے یعنی کتنے پہ زکوٰۃ واجب ہوتی ہے؟ چاندی باون تولے۔ جیسا کہ میں نے پہلے بھی کبھی عرض کیا ہے' چاندی بے چارے غریبوں کے پاس ہوتی ہے۔ اب تو خیر ان غریبوں کے پاس بھی وہ نہیں رہی وہ انہوں نے آخری چھلا تک بیچ کے بے

چاروں نے اب تو روٹی کپڑے کا انتظام کیا ہے لیکن بہر حال غریبوں کے پاس چاندی ہوتی ہے۔ باون تولے چاندی کے حساب سے بھی کوئی ڈیڑھ دوسو روپیہ سمجھ لیجیے یہ اگر ہے کسی کے پاس تو اس کو تو پڑ گئی زکوٰۃ۔ سونا جو ہے ساڑھے سات تولے ہزار بارہ سو روپیہ یعنی سونا رکھنے والا ہزار بارہ سو تک جو ہے وہ مستثنیٰ ہے اس ٹیکس سے غریب کے پاس ڈیڑھ سو آ جائے تو لے لو اس میں سے صاحب۔ اور اتنے لینے کے بعد باقی سب حلال وطیب۔ بے حد ونہایت ذاتی ملکیت کی اجازت شریعت کی رو سے یہ فتویٰ ہے آپ کا۔ اور دعویٰ یہ ہے کہ اسلامی مملکت ہم نے قائم کرنی ہے۔

امتوں کے مرضِ کہن کا چارہ

وہ کہتا ہے لَنۡ تَنَالُوا الۡبِرَّ حَتّٰی تُنۡفِقُوۡا مِمَّا تُحِبُّوۡنَ ((3:92 تمہارے سامنے کبھی کشاد کی راہیں نہیں کھل سکتیں جب تک کہ اس کو کھلا نہ رکھو اور کس حد تک؟ قُلِ الۡعَفۡوَ (2:219) اپنی ضرورت سے زائد جتنا ہے سارے کا سارا۔ عزیزانِ من! یہ ہے اسلام۔ چاہتے ہو کشاد کی راہیں آپ کے سامنے کھلیں تو یہ کرنا پڑے گا یہ کرنے کی ہمت نہیں ہے۔ جی نہیں چاہتا تو کیوں فریب دیتے ہو اپنے آپ کو اور دنیا کو بھی کیوں فریب دیتے ہو۔ جس سے پوچھیے وہ یہ کہتا ہے کہ صاحب! قرآن کا معاشی نظام اگر نافذ یہاں کر دیا جائے تو سارے مسائل کا حل ہو جائے گا' آپ کے ہاں ساری مشکلات کا حل ہو جائے گا۔ اول تو کبھی بتائیں گے نہیں کہ یہ کیا ہے؟

میکیاولی سیاست میں کبھی کوئی بات متعین طور پر نہیں کی جاتی

یاد رکھیے! یہ جسے میکیاولی سیاست کہتے ہیں اس کی تکنیک یہ ہے کہ بات مبہم کیجیے ہمیشہ' متعین بات نہ کیجیے۔ آپ کو پتا ہے مبہم بات کی مثال میں آپ کو دیتا ہوں مثلاً میں نے یہ کہا کہ صاحب! خنزیر حرام ہے آپ نے کہا کیسے کہتے ہو؟ میں نے کہا قرآن کی یہ آیت ہے' بات ٹھیک کہہ دی میں نے۔ چلیے اس سے نیچے اترے یا دوسرے درجے والے ہیں جماعت اہلِ حدیث ان سے اگر کسی چیز کے متعلق پوچھا جائے کہ صاحب نماز میں ہاتھ یہاں باندھنے چاہئیں وہ کہتے ہیں اس کی دلیل انہوں نے کہا کہ بخاری شریف کی یہ حدیث ہے' متعین بات ہے آپ دیکھ سکتے ہیں۔ فقہ والوں سے بھی اگر پوچھا جائے کہ صاحب! یہ جو آپ کہتے ہیں کہ کوا حلال ہے یا حرام ہے' اس کے لیے دلیل کیا ہے؟ یعنی آپ مانیں یا نہ مانیں بات وہ متعین کہیں گے کہ صاحب فقہ کی فلاں کتاب میں یہ لکھا ہے' شامی میں یہ آیا ہے' درِمختار میں یہ آیا ہے' ہدایہ میں یہ لکھا ہے۔ ٹھیک ہے متعین بات تو

کریں گے نا۔ آپ کو پتا ہے کہ آج کل آپ کے ہاں بات کیا ہو رہی ہے؟ کہ صاحب! شریعت کی رو سے ذاتی ملکیت کو رد 478 **آلِ عمران** نہیں جا سکتا۔ بتاؤ یہ کیا ہے شریعت؟ کہاں سے معلوم کیا جائے؟ یعنی کسی شخص کا نام ہے' کسی کتاب کا نام ہے؟ کوئی متعین چیز اس کے لیے ہونی چاہیے۔ کہ نہیں صاحب! شریعت کی رو سے ایسا کہا گیا ہے۔ نہ آپ چیلنج کر سکیں' نہ آپ CONTEST کر سکیں' نہ حوالہ طلب کر سکیں۔ شریعت کی رو سے یہ ہے صاحب۔ پوچھا جائے کہ صاحب پھر شریعت کہاں سے ملے گی؟ کہ صاحب وہ جو شریعت کا علم جاننے والے ہیں۔ کہا جائے کہ کون صاحب ہیں؟ یہ ہیں جی خاکسار ان کو کہتے ہیں جی۔ یعنی سارا دین سمٹ سمٹا کے آپ کا اس شخص کے اوپر آ گیا۔ یہ ہے ہمیشہ مبہم بات ہوگی۔ اسلام کی رو سے یہ چیز نہیں ہے۔ پتہ لیجیے کہ کہاں ہے وہ؟ یہ کن صاحب کا نام ہے؟ شریعت کی رو سے یہ چیز ہوگی۔

زندگی کے ہر شعبہ میں قرآن ایک متعین بات کرتا ہے

یاد رکھیے! اسی لیے قرآن نے متعین طور پر یہ کہا تھا کہ اِتَّبِعُوْا مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَ لَا تَتَّبِعُوْا مِنْ دُوْنِهٖٓ اَوْلِيَآءَ ؕ (7:3) اتباع صرف اس کا ہے جو خدا نے نازل کر دیا ہے اس کے سوا کسی اور کا اتباع نہیں ہے۔ متعین بات کرتا ہے قرآن DEFINITE چیز کہتا ہے SPECIFIC چیز کہتا ہے تاکہ ابہام کہیں نہ رہے التباس کہیں نہ' ہو کسی کو گنجائش نہ ہو یہ کہنے کی کہ جو ہم کہیں گے وہ شریعت ہے۔ وہ تو پچھلی دفعہ ہم نے یہ دیکھ لیا۔ مَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّؤْتِيَهُ اللّٰهُ الْكِتٰبَ وَ الْحُكْمَ وَ النُّبُوَّةَ ثُمَّ يَقُوْلَ لِلنَّاسِ كُوْنُوْا عِبَادًا لِّيْ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ (3:79) کسی انسان کو اس کا حق حاصل نہیں ہے خواہ خدا نے اس کو کتاب اور حکومت اور نبوت بھی کیوں نہ دی ہو کہ وہ انسانوں سے یہ کہے کہ مجھ سے پوچھو' میں بتاؤں گا شریعت کیا ہے۔ عزیزانِ من! یہ ساری جتنی بھی اصطلاحات ہیں' ابہام پیدا کرنے کے لیے اور آخر میں سمٹ کر خود اتھارٹی بننے کے لیے کی گئی ہیں۔ دین یہ ہے کہ SPECIFICALLY بات کرو۔ ٹھیک ہے یہ سند۔ فلاں یہ کہتا ہے۔ اس میں کسی انسان کو حق کیا حاصل ہے کسی دوسرے انسان کی آزادی کو سلب کرے اس سے اپنا حکم منوائے؟ قرآن نے یہ جب یہ چیز کہہ دی لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰى تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ ((3:92 تو خود ہی اس کی تشریح بھی کر دی کہ انفاق کس حد تک ہوگا؟ قُلِ الْعَفْوَ (2:219) تمہاری ضرورت سے زائد جتنا بھی ہے۔ گنجائش ہی نہیں رہتی دوسری بات کرنے کی۔ لیکن جب کفر کی راہیں اختیار کرنی ہوں تو پھر عقلِ فریب کار ہزار راہیں تراشتی ہے۔ قرآن کی اتنی معین اس قدر واضح آیات کے بعد پہلے تو کوشش کی جاتی ہے کہ ان کی تفسیر دوسرے طریقے سے ہو' تاویل دوسرے طریقے سے ہو۔ اور جب کوئی راستہ نہیں نکلتا اس بساط کے اوپر اِدھر اُدھر ہٹنے کا تو پھر یہ عقیدہ

یہ ہے کہ قرآن کی آیتیں منسوخ ہوچکی ہوئی ہیں۔چل بھئی۔کہ یہ باقی تلاوت کے لیے ہیں صرف، تعمیل کے لیے منسوخ ہوچکی
ہیں۔اس کی جگہ کیا ہے؟ جو ہم کہیں۔آپ نے غور فرمایا کہاں آجاتی ہے یہ بات؟ اس کا نام ہوتا ہے اقامتِ دین، اسلام کا احیا۔

قرآنِ حکیم انسان کی ہر پہلو سے ہر سو راہنمائی کرتا ہے

عزیزانِ من! قرآن پہ آیئے یہ تو اس قدر جامع کتاب ہے کوئی اس قسم کا راستہ ہی نہیں چھوڑتا انسان کے فریب کھانے کا یا فریب دینے کا۔وَ مَا تُنْفِقُوْا مِنْ شَیْءٍ فَاِنَّ اللّٰهَ بِهٖ عَلِیْمٌ (3:92) آپ کو یاد ہوگا کہ بات چلی تھی پیچھے سے سلسلہ چلا آرہا تھا کہ اسلام کے سوا کوئی شخص جو کوئی اور نظام اختیار کرے گا، اس کو قبول نہیں کیا جائے گا (3:83)۔دلیل یہ تھی کہ کائنات کی ہر شے اسلام پر ہے، قوانینِ خداوندی کی اطاعت کیے چلے جارہی ہے۔آپ نے کہیں باہر کی اشیا کے متعلق بھی دیکھا ہے کہ وہ قانونِ خداوندی کی جگہ کسی انسان کی شریعت کا اتباع کرتی جارہی ہوں؟ خالص قوانینِ خداوندی کا اتباع کیے چلی جارہی ہیں۔یہی قوانینِ خداوندی قرآن کی شکل میں انسانوں کو ملے کہ ان کا اتباع کیے چلے جاؤ، یہ الاسلام ہے۔اس کے سوا جو بھی آپ دین کہیں گے وہ غیرِ اسلام ہوگا۔اَفَغَیْرَ دِیْنِ اللّٰهِ یَبْغُوْنَ وَ لَهٗۤ اَسْلَمَ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ (3:83) وَ مَنْ یَّبْتَغِ غَیْرَ الْاِسْلَامِ دِیْنًا فَلَنْ یُّقْبَلَ مِنْهُ (3:85) اور اب دین کے متعلق واضح طور پہ بتادیا کہ یہ ہوتا کیا ہے؟ اسی میں یہ چیز کہی تھی قرآنِ کریم نے اہلِ کتاب سے، کہا یہ تھا کہ تم سے یہ عہد لیا گیا تھا کہ جب دین اپنی اصلی شکل میں تمہارے پاس نہ رہے اس کے بعد پھر خدا کی طرف سے ایک رسول آئے وہ ان دعاوی کو جو تم کرتے ہو یا تمہاری پہلی کتابوں کے اندر موجود تھے، ان کو سچا کر دکھائے، خدا کا دین حقیقی شکل میں پھر تمہارے سامنے پیش کرے، تم اس پر ایمان لاؤ اس کی تائید کرو اس کی مدد کرو اس کا ساتھ دو۔یہ چیزیں کہی گئی تھیں۔نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم تشریف لائے اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے وہ دین پیش کیا جس کے متعلق دعویٰ یہ تھا کہ حضرتِ نوحؑ سے حضرتِ عیسٰیؑ تک تمام انبیائے کرامؑ کو یہی دین تھا اصولی طور پر جو خدا کی طرف سے ملا تھا۔میں وہی دین لایا ہوں اور میں عملاً متشکل کر کے تصدیق کر دوں گا اس چیز کی، اس کو سچا ثابت کر کے دکھا دوں گا۔

دینِ خداوندی کی سب سے زیادہ مخالفت مشرکین کی بجائے اہلِ کتاب کی طرف سے ہوئی

یہ عجیب چیز ہے کہ اس دین کو بھی نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم دین پہنچانے والے، خدا کا دین قرآن جیسی کتاب میں دیا گیا، وہ عرب

کے مشرکین جو تھے جنہوں نے اتنی سخت مخالفت کی' ڈٹ کے مخالفت کی' انہوں نے تو قبول کر لیا اہلِ کتاب میں سے کسی نے قبول 478 **آلِ عمران**
کیا بجز دو چار کے۔ تاریخ یہ بھی ہمیں بتاتی ہے کہ جو قوم دین کو چھوڑ کے مذہب پہ آ جائے وہ پھر دین کو بڑی مشکل سے قبول کیا کرتی
ہے۔ اس لیے کہ وہ مطمئن ہوتی ہے اس چیز پہ کہ جس راستے پہ ہم چل رہے ہیں' یہ صحیح راستہ ہے' یہ صحیح مذہب ہے۔ یہی چیز تھی جو
یہودیوں نے اعتراض کیا لیکن وہ اعتراض اہلِ کتاب اصلِ دین پہ نہیں کرتے' دین کے جو اصول ہیں ان پہ نہیں کرتے' وہ جو
جزئیات ہوتی ہیں' نا ان پہ کرتے ہیں۔ آپ دیکھیں گے جتنے آپ کے ہاں مذہبی فرقوں میں جتنے بحث اور مناظرے ہوں گے'
دین کی اصل کے متعلق نہیں ہوں گے' سارے مناظرے آمین بالظاہر اور بالخفی نماز میں آمین اونچی آواز سے کہنی یا نیچی آواز سے؟
التحیاۃ میں اشھد ان لا الہ کہتے وقت انگلی اٹھانی چاہیے یا نہیں اٹھانی چاہیے؟ غور فرمایا آپ نے اس سے اور آگے چلے عالمِ
افلاک کی باتیں کہ رسول اللہ ﷺ نور تھے یا بشر تھے؟ چلے ہوئے ہیں ان بحثوں کے اندر۔ فلاں چیز حرام ہے یا حلال ہے (
اپنی فہرستوں میں سے) ؟ قرآن نے تو جو چیزیں حرام کی ہیں' بین طور پہ نام لے لیا ان چیزوں کا۔ ان باتوں کے اوپر ان کے
مباحثے ہوں گے۔ اصلِ دین پہ کبھی نہیں آئیں گے۔ بعینہ یہی چیز تھی جو نبی اکرم ﷺ کے ساتھ اس زمانے کے اہلِ کتاب نے
کی۔ رسول اللہ ﷺ نے دین پیش کیا۔ اعتراض یہ ہوا یہودیوں کی طرف سے کہ صاحب! اگر یہ دین خدا کی طرف سے ہے تو
ہمارے ہاں تو اونٹ حرام ہیں' آپ اسے حلال کیوں قرار دیتے ہیں؟ آپ دیکھتے ہیں کوئی اصل الاصول جو ہے اس کے اوپر نہیں
آ رہے' ان چیزوں پہ اس لیے بھی آتے ہیں کہ عوام کو بڑی جلدی بھڑکایا جا سکتا ہے اس سے۔ یہ جو اصولی چیزیں ہیں وہ عوام کی سمجھ
میں نہیں آتیں' ان سے وہ بھڑکایا نہیں انہیں جا سکتا۔ فرعی چیزوں کے اوپر یعنی یہ شخص کہتا ہے رسول اللہ ﷺ بشر تھے' آپ
دیکھتے ہیں اس کے اوپر مرنے مارنے کے لیے وہ تیار ہو جائیں گے۔ انہوں نے بھی یہی کہا کہ اگر یہ دین خدا کی طرف سے ہے تو
ہمارے ہاں تو اونٹ حرام ہے' آپ کے ہاں اونٹ حلال کس طرح سے ہے؟ قرآن ہے **كُلُّ الطَّعَامِ كَانَ حِلًّا لِّبَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ**
اِلَّا مَا حَرَّمَ اِسْرَآءِیْلُ عَلٰی نَفْسِهٖ مِنْ قَبْلِ اَنْ تُنَزَّلَ التَّوْرٰىةُ ؕ قُلْ فَاْتُوْا بِالتَّوْرٰىةِ فَاتْلُوْهَآ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ (3:93) قرآن نے
کہا ہے کہ جن چیزوں کو آج ہم نے حلال قرار دیا ہے' جب دین اپنی اصلی شکل میں تمہارے پاس موجود تھا تو اس وقت یہ چیزیں
اس وقت بھی حلال تھیں۔ یہ جو چیز ہے کہ تمہارے ہاں اونٹ حرام ہے' یہ ایک تاریخی بات ہے اور وہ یہ کہ اسرائیل حضرتِ یعقوبؑ
کا لقب تھا' حضرتِ یعقوبؑ نے اپنے طور پر ہو سکتا ہے کہ کوئی مرض ہو بیماری ہو یا خود یہ چیز ناپسند ہو' اپنے طور پہ اونٹ کا گوشت
کھانا چھوڑ دیا۔ قوم نے یہ سمجھ لیا کہ صاحب یہ چیز حرام ہے' اس لیے یہ حرام قرار پا گئی۔ قرآن کہتا ہے کہ تم ذرا تورات لاؤ (اور پہلی

چیز یہ ہے کہ تورات تو حضرتِ ابراہیمؑ اور حضرتِ یعقوبؑ کے بعد کی چیز ہے اس کی تو ابتدا حضرتِ موسیٰؑ سے ہوتی ہے) تم دیکھو 478 **آلِ عمران**
گے کہ اس تورات میں اونٹ کو حرام نہیں قرار دیا گیا۔ بات یہ ہوئی تھی کہ انہوں نے اپنے لیے ایک شے کو چھوڑ دیا تھا' تم نے اسے اپنے اوپر حرام قرار دے لیا۔ اب تم اسے دین کی بنیاد قرار دے رہے ہو کہ انہوں نے اونٹ کو حلال قرار دیا ہے' اس لیے یہ دین دینِ خداوندی نہیں ہوسکتا۔ کہا سند تو اس کے اندر خدا کی کتاب ہوگی' وہ خدا کی کتاب لاؤ اور خدا کی کتاب میں تمہیں یہ بات تو ملے گی نہیں کہ حضرتِ یعقوبؑ نے یہ چیز کی تھی' یہ تو بعد کی چیز ہے۔ کہا' ہوا یہ تھا تمہارے ساتھ اور تم اس چیز کو اب نزاع کا بنیادی مسئلہ بنا کے لے آئے۔ اونٹ حرام کیوں ہے اور اونٹ حلال کیوں ہے۔

انسانیت کے لیے قرآنِ حکیم نے حلال و حرام کی حدود خود متعین کر دی ہیں

یہاں سے ایک بڑی چیز ہمارے سامنے آتی ہے۔ قرآنِ کریم چند چیزوں کو حرام قرار دیتا ہے' وہ تو حرام ہیں' انہیں تو نہیں کھایا جا سکتا' باقی چیزوں کو حلال قرار دیتا ہے یعنی تمہیں اس کی اجازت ہے۔ اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ ان میں سے ہر چیز ضرور کھائی جائے۔ اجازت ہے۔ اسی لیے حلال کے ساتھ قرآن نے طیب کا لفظ لگایا ہے کہ تمہارے لیے وہ خوشگوار ہو طبیعت کو پسند ہو' جی چاہتا ہو' مضر نہ پڑتی ہو ذاتی طور پر۔ انفرادی طور پہ بعض حلال چیزیں ایک شخص کو راس نہیں آتیں' طبیعت کے ساتھ مناسبت نہیں ہوتی' طبی نقطۂ نگاہ سے بھی اس کے لیے اچھی نہیں ہوتی' وہ چیزیں نہ کھائے' پابندی نہیں ہے اس کی۔ لیکن دیکھیے یہاں نبی کا مقام' نبی اگر ذاتی طور پر بھی کسی چیز کو یوں پرہیز کر لیتا ہے تو امت یہ سمجھ لیتی ہے کہ یہ چیز خدا ہی کی طرف سے ہوگی غالباً اس لیے وہ اس کو حرام قرار دیتی ہے۔ نبی کو یہ پابندی ہے کہ دیکھو تم نے یہ چیز تم تو ذاتی طور پہ کر سکتے ہو جیسے اور مسلمان کر سکتے ہیں۔ تمہارا اور دوسروں کا فرق ہے۔ اور یہ وجہ تھی کہ نبی اکرم ﷺ نے کسی ایک چیز کو چھوڑ دیا کھانا محض اس بنا پر کہ طبیعت کو ناپسند تھی' قرآن نے کہا يَـٰٓأَيُّهَا ٱلنَّبِيُّ لِمَ تُحَرِّمُ مَآ أَحَلَّ ٱللَّهُ (66:1) جس چیز کو خدا نے حلال قرار دیا ہے اسے تم اپنے اوپر حرام کیوں قرار دیتے ہو؟ تم نے تو ذاتی افتادِ طبیعت کی بنا پہ ایسا کیا' آنے والی قوم یہ سمجھ لے گی کہ خدا نے حرام قرار دیا تھا' اسے کھاؤ بابا۔ جن کے رتبے ہیں سوا ان کی سوا مشکل ہے۔ جس بات کی ہمیں آزادی حاصل ہے' پابندی نہیں' نبی کو تو اس کی بھی پابندی عائد ہوتی ہے۔ اس لیے کہ اس کا عمل آنے والوں کے' اسوہ بننا ہوتا ہے' نمونہ بننا ہوتا ہے۔ اور تاریخ میں یہ چیز چونکہ ہو چکی تھی اس لیے آپ دیکھتے ہیں قرآن کی کہاں تک نگاہ جاتی ہے کہ یہ بات اس سے پہلے ہوئی تھی۔ حضرتِ یعقوبؑ نے یہ چیز کی اور بنی اسرائیل نے یہ سمجھ لیا کہ یہ حرام ہے صاحب۔ اے رسول! بات یہ بڑی معمولی سی ہے کوئی بات ہی نہیں ایک خاص قسم کا شہد تھا' مرغوبِ خاطر نہیں ہے' نہ کھاؤ ہم

ہزاروں چیزیں ایسی ہیں جو مرغوبِ خاطر نہیں ہوتی، ہم نہیں کھاتے، ہم پہ کوئی باز پرس نہیں۔ نبی پہ تھدید آئی اور قرآن میں یہ کہا **لِمَ تُحَرِّمُ مَآ اَحَلَّ اللّٰهُ** (66:1)۔ دو باتیں آ گئیں اس کے ساتھ ایک تو یہ کہ حرام اور حلال کا اختیار نبی کو بھی نہیں ہے، یہ صرف خدا کو اختیار ہے۔ اور دوسرے یہ چیز کہ عام لوگوں کو جو روش کوئی اختیار کر لے یا اپنی پسند سے کوئی شے اختیار کر لے تو اس پہ پابندی نہیں، نبی کی ذات چونکہ ایک نمونہ بنی ہوتی ہے، اس کو ان چیزوں سے بھی محتاط رہنا پڑتا ہے۔

بزرگِ قوم کا طرزِ زندگی پوری قوم کو متاثر کرتا ہے

عزیزانِ من! یہی چیز ہے کہ جسے کسی قوم کے اندر بڑا بننا ہو، اسے چھوٹی چھوٹی باتوں کی بھی بڑی احتیاط کرنی پڑتی ہے۔ اس لیے کہ ایک عام انسان کا فعل اس کی ذات تک رہتا ہے۔ جتنا اونچا ہوتا چلا جائے گا، اس کا ایک عمل جو ہے، وہ متعدی ہو جاتا ہے۔ گھر میں بزرگِ خاندان کی جو روش ہے، سارے گھر کے اوپر اثر انداز ہوتی ہے۔ قوم میں جو بزرگِ قوم ہے اس کی روش ساری قوم پر اثر انداز ہوتی ہے۔ اور نبی جو امت کا سربراہ ہے اور اس کا بزرگِ خاندان ہوتا ہے اس کا کوئی ایک عمل بھی جو ہے امت ساری پہ اثر انداز ہوتا ہے، اسے بڑا محتاط رہنا پڑتا ہے۔ ان سے کہا کہ یہ بات ہوئی تھی اس لیے اس معاملے میں کیوں جھگڑے ہو؟ **فَمَنِ افْتَرٰی عَلَی اللّٰهِ الْكَذِبَ مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ** (3:94) بات ہم نے تمہیں بتا دی ہے اس کے بعد بھی اگر تم اسی کے اوپر مباحثے کرتے جاؤ گے، مناظرے کرتے چلے جاؤ گے، کرتے چلے جاؤ گے کہ صاحب ہمارے ہاں اونٹ حرام ہے، تمہارے ہاں حلال کیوں ہے؟ تو یہ تو کذب ہے، افترٰی ہے، یہ ظلم ہے۔ جو بات جہاں رہنی چاہیے، وہاں رکھو۔ اصلِ دین اصلِ دین ہے، فروعات جزئیات جو ہیں ان کو یہ اہمیت حاصل نہیں ہے کہ ان کے اختلاف کی بنا پہ اصلِ دین سے اختلاف کر جاؤ تم، یہ ظلم ہے۔ **قُلْ صَدَقَ اللّٰهُ فَاتَّبِعُوْا مِلَّةَ اِبْرٰهِيْمَ حَنِيْفًا** ط (3:95) ان سے کہو کہ وہ سچی بات تھی وہ خدا نے کہہ دی۔ تم بھی اپنے آپ کو کہتے ہو کہ ابراہیمؑ ہمارا بزرگِ خاندان تھا، ہم اس کی ملت کا اتباع کرتے ہیں، آؤ ہم بھی وہی کہتے ہیں کہ اس کی ملت کا اتباع کرو اور یہ بتا دو کہ ابراہیمؑ کے زمانے میں اونٹ حرام تھا یا حلال تھا؟ **وَ مَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ** (3:95) وہ سیدھی راہ پہ چلتا تھا، وہ مشرکین میں سے نہیں تھا۔

عالمگیر انسانیت کے لیے ملتِ ابراہیمیؑ کی اہمیت

اس کے بعد یہ بتایا کہ آؤ تمہیں بتائیں ملتِ ابراہیمیؑ کیا ہے؟ انسانوں کی گروہ بندیوں سے، تفرقہ انگیزیوں سے،

قوموں کے ان جغرافیائی حدود سے بلند ہو کر عالمگیر انسانیت کے لیے ایک دین دینا' ایک نظام دینا۔ اس کا بانی تھا ابراہیمؑ اس کا موسس تھا ابراہیمؑ اس کی ملت پہ چلو کیوں یہ گروہ بندیاں ان چیزوں پہ بنا لیتے ہو کہ اونٹ حرام ہے یا حلال ہے؟ غور فرمایا آپ نے کہ قرآن کیا کہہ گیا ہے کہ دین تو یہ چیزیں دیتا ہے اور تم ان تنگ ناؤوں کے اندر الجھ کے دین کی اصل اور اساس سے ہی منحرف ہوئے چلے جاتے ہو۔ یہی ہمارے ساتھ ہو رہا ہے نا' یہ جائز ہے وہ ناجائز ہے' یہ مباح ہے یہ مکروہ ہے۔ ان کے اندر قوم الجھی ہوئی ہے' الجھایا جا رہا ہے قوم کو اور اصلِ دین غائب ہے اس میں سے۔ ڈور کو سلجھا رہے ہیں اور سرا ملتا نہیں' کیفیت یہ ہوگئی۔ قرآن کہتا ہے آ وَ ابراہیمؑ کی ملت پہ۔ اِنَّ اَوَّلَ بَیۡتٍ وُّضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِیۡ بِبَکَّۃَ مُبٰرَکًا وَّ ھُدًی لِّلۡعٰلَمِیۡنَ ((3:96 حج کے متعلق اس سے پیشتر بہت سے درسوں میں سورۃ بقرۃ میں میں وضاحت سے عرض کر چکا ہوں' دہرا دوں اس کے بعد پھر۔ جہاں بھی کعبے کا ذکر آتا ہے' جہاں بھی کعبے میں اجتماعیت کا ذکر آتا ہے' قرآن میں ہر جگہ الناس کے لیے کہا گیا ہے وہ' پوری انسانیت کے لیے۔ یہ جو قوم ہے جسے مسلمان کہا جاتا ہے' یہ ملتِ محمدی ﷺ ہے جسے کہا جاتا ہے' یہ صرف CONVENER ہے اس اجتماع کی اس کے ذمے انتظام کرنا ہے اس کا وہ اجتماع پوری انسانیت کو دعوت دیتا ہے کا ہے کے لیے؟ لِّیَشۡھَدُوۡا مَنَافِعَ لَھُمۡ (22:28) کہا ہے کہ نوعِ انسانی کو اقوامِ عالم کو دعوت دو تا کہ وہ اپنی آنکھوں سے دیکھیں کہ تم ان کی منفعت کے کیا کام کر رہے ہو؟ کیا بات ہے صاحب !!! اسی لیے جہاں قرآن نے کعبہ کے حج کا ذکر کیا ہے' ہر جگہ الناس کہا ہے۔ کہا ہے کہ وہ ابراہیمؑ کہ جس نے سب سے پہلے ایک مرکزیت قائم کی انسانیت کے لیے' جسے مکہ کہا جاتا ہے مبٰرکًا (3:96) برکت کہتے ہیں' بروقت بارش سے جو بڑی گھنی فصل ہوتی ہے' اسے برکت کہتے ہیں۔ انسانیت کے لیے باعثِ برکت' انسانیت کی پوری نشوونما اور استحکام کے سامان اور ذرائع لیے ہوئے۔ مکہ یہ ہے۔

مکہ میں کعبہ کی اہمیت ایک سمبل کی ہے جہاں سے انسانیت کی نشوونما اور اس کے استحکام کا درس ملتا ہے

مکہ کسی شہر کا نام نہیں جیسا میں نے عرض کیا تھا وہ تو آپ کے نظام کے مرکز کا ایک سمبل ہے۔ دہرا دوں اس مثال کو جو میں کہا کرتا ہوں کہ جب ماسکو کہا جاتا ہے تو وہ کسی شہر کی طرف اشارہ نہیں ہوتا' ایک نظریۂ زندگی ہے' ایک آئیڈیالوجی ہے جس کا مرکزِ محسوس ہے وہ۔ واشنگٹن جب آپ کہتے ہیں تو آپ کا ذہن کسی شہر کی طرف نہیں جاتا۔ کہا کہ مکہ سب سے پہلے انسانیت کے لیے جو نظام دیا تھا' اس کا مرکزِ محسوس ہے اور اس کے لیے کہا وَ ھُدًی لِّلۡعٰلَمِیۡنَ ((3:96 (دیکھیے نا بات واضح کر دی) تمام اقوامِ عالم کو

کشاد اور کامرانیوں کا راستہ دکھانے کا مرکز جو ہے وہ ہے جسے مکہ کہا جاتا ہے وہاں فِیۡہِ اٰیٰتٌۢ بَیِّنٰتٌ (3:97) آپ سوچیے تو کہ مکے میں نہایت واضح دلائل کیا ہو سکتے ہیں کسی شہر میں؟ خود کعبے میں جو اینٹ اور پتھر کی ایک عمارت ہے کعبہ تو مکعب سے ہے وہ مکعب عمارت جو ہے اس میں اٰیٰتٌۢ بَیِّنٰتٌ (3:97) ہو کیا سکتی ہیں کسی عمارت کے اندر یا کسی شہر کے اندر؟ وہ جس نظام کا مرکز ہے اس نظام کی آیات بینات ہو سکتی ہیں واضح نشانات' واضح علامات' واضح قوانین وہاں دیکھو۔ کیا چیز وہاں تمہیں ملے گی؟ مَقَامُ اِبۡرٰهِيۡمَ (3:97) آپ کو پتہ ہے پھر دین مذہب یہ جب آ گیا تو پھر مقامِ ابراہیمؑ کیا ہو گیا؟ فصیلِ کعبہ میں کعبہ کے باہر جو میدان ہے (اس کے اندر یہ آپ مسجدوں میں دیکھتے ہیں نا اس کے اندر ایک ایک نمازی کے لیے وہ نشان دیا ہوا ہوتا ہے وہ جس طرح سے یہ مصلٰی ہوتا ہے ہمارے ہاں اس کے لیے) اس میں ایک مصلٰی ابراہیمیؑ کا نشان دیا ہوا ہے کہ حضرتِ ابراہیمؑ نے یہاں نماز پڑھی تھی' اسے کہتے تھے مقامِ ابراہیمیؑ۔ کعبے میں چل کے آؤ دور دراز سفر سے اتنی مشقت اٹھا کے' پوری انسانیت کو بلاؤ وہاں آپ کو بڑی بینات ملیں گی' بڑے واضح دلائل ملیں گے' بہت نشانیاں ملیں گی' ان کو بلا کے کیا دکھاؤ؟ ''آ حضرتِ ابراہیمؑ دا آ مصلٰی جے''۔ مَقَامُ اِبۡرٰهِيۡمَ (3:97) عزیزانِ من! ذرا ذہن سے اس کو نکال دیجیے اور صرف اس لفظ سے کہ مقامِ ابراہیمیؑ تمہیں نظر آئے گا دیکھیے بات کتنی صاف ہو جاتی ہے۔ مقامِ ابراہیمیؑ کیا تھا؟ یہاں کہا کہ انسانیت کے لیے اس نے ایک مرکز قائم کیا تھا۔ ابراہیمؑ نے جانکاہ مشقتوں سے گذرنے کے بعد اس نظام کو قائم کیا۔ قرآن کہتا ہے یہ بھی کیا' یہ بھی کیا' بہت سے پہلو بدلے اس کی تحریک نے۔ اس کے بعد جا کے اس نے جب یہ نظام قائم کیا اس وقت ہم نے اسے کہا کہ اِنِّىۡ جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ اِمَامًا (2:124) ہاں انسانیت کی لیڈر شپ تیرے نصیب ہو گئی' یہ ہے تیرا مقام۔ اسے کہا مقامِ ابراہیمیؑ نوعِ انسانی کی لیڈر شپ کو' اقوامِ عالم کی امامت مقامِ ابراہیمیؑ۔ کہا آؤ بلاؤ لوگوں کو اور کہو ان سے کہ یہ ہے وہ نظام ہمارا جس کا مرکزِ محسوس یہ ہے اور یہ وہ مقام ہے جو حقیقت میں مقامِ ابراہیمیؑ نوعِ انسانی کی امامت کا ایک سمبل ہے ہمارے پاس' یہ دکھاؤ لوگوں کو۔ بتا دیا ابراہیمؑ کا مقام اس کی پوزیشن یہ ہے اس کائنات میں کہ نوعِ انسانی کا امام تھا وہ' لیڈر شپ تمام انسانوں کی کسی ایک قوم کی نہیں گروہ کی نہیں' نسل کی انسانیت کی لیڈر شپ۔ کہا تمہاری ملت جو ہے ملتِ ابراہیمیؑ اس کا مقام اس کی پوزیشن یہ ہے۔ دنیا کے اندر کہ انسانیت کی امامت کی وہ حق دار ہے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلۡ مِنَّا ؕ اِنَّكَ اَنۡتَ السَّمِيۡعُ الۡعَلِيۡمُ (2:127)

❀...❀...❀

سولھواں باب: **سورۃ آل عمران** (آیات 98 تا 104)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

عزیزانِ من! آج جنوری 1970ء کی 11 تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز سورۂ آلِ عمران کی 98 آیت سے ہوتا ہے:((3:98۔

قرآنِ حکیم کے ہاں سابقہ اقوام کے تاریخی واقعات کو بیان کرنے کا مقصد' اہلِ کتاب کی نوعیت اور اپنی حالتِ زار کا ذکر

آپ کو یاد ہوگا کہ سلسلۂ کلام چلا آ رہا ہے اہلِ کتاب کی ذہنیت' نفسیاتی کیفیت' ان کے اعتراضات' اعتراضات کے جوابات ۔اس ضمن میں جیسا کہ میں اس سے پہلے بھی کئی دفعہ عرض کر چکا ہوں' اسے پھر دہرا دوں کہ قرآنِ کریم اہلِ کتاب کا بھی ذکر کرتا ہے تو اس سے مراد اس زمانے کے صرف یہودی اور نصاریٰ ہی نہیں' نہ ہی یہ محض تاریخی واقعات ہیں جنہیں قرآن دہرائے چلا جا رہا ہے۔ اہلِ کتاب درحقیقت ایک خاص ذہنیت کا نام ہے'وہ جہاں بھی پائی جائے' جس مقام پہ بھی ہو۔اور ہمارے لیے قرآن کے یہ مقامات محض تاریخی شواہد نہیں ہیں بلکہ یہ ہماری داستان ہے اور قرآن ہمیں ہی مخاطب کرتا ہے۔خدا کی طرف سے دین آتا ہے اور جب بعد میں اس دین کو مذہب کی سطح پر لے آتے ہیں تو اس مذہب کے جتنے پیرو ہوتے ہیں'انہیں اہلِ کتاب کہا جاتا ہے۔ وہ کسی دور کے کسی زمانے کے کیوں نہ ہوں۔ وہ دین کو چھوڑ دیتے ہیں ۔انسانوں کے خودساختہ عقائد' نظریات' تصورات' مسلک' موقف کو اختیار کر لیتے ہیں ۔اور اس میں تکنیک یہ ہوتی ہے کہ یہ سب چیزیں جتنی انسانوں کی خودساختہ ہوتی ہیں'انہیں خدا کی طرف منسوب کر دیتے ہیں۔ باتیں اپنی منواتے ہیں' کہتے یہ ہیں کہ یہ خدا کی طرف سے دیا ہوا دین' شریعت' اسلام یہ ہے۔ان اصطلاحات کو ہمیشہ مبہم رکھتے ہیں''شریعت کا یہ حکم ہے'' اب کچھ متعین نہیں ہے کہ شریعت کہاں ہے' کس سے جا کے پوچھیں' کون سی کتاب ہے جس میں سے ہم دیکھیں۔اسلام کی رو سے یہ چیز جائز نہیں ہے' اسلام اس کے حق میں نہیں ہے۔ اسلام کسی فرد کا نام نہیں' اس کے لیے کوئی سند نہیں پیش کی جائے گی' ہر شخص یہی کہے گا۔ یہ ذہنیت یہ مسلک اسے قرآن اہلِ کتاب کی طرف منسوب کرتا ہے۔ان کی کیفیت یہ بتاتا ہے کہ وہ التباسِ حق و باطل کرتے ہیں حق اور باطل کو اس طرح گڈمڈ کرتے ہیں'

اس طرح مخلوط کرتے ہیں کہ ایک سے دوسرا جدا ہی نہیں ہو سکے، پہچانا ہی نہ جا سکے، کتمانِ حقیقت کرتے ہیں، اصلِ حقیقت چھپاتے ہیں، تحریف کرتے ہیں۔ یَكْتُبُوْنَ الْكِتٰبَ بِاَيْدِيْهِمْ ۗ ثُمَّ يَقُوْلُوْنَ هٰذَا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ (2:79) اپنے ہاتھوں سے ایک بات لکھتے ہیں اور لوگوں میں کہتے یہ ہیں، خدا کا فرمان یہ ہے، شریعتِ حقہ یہ کہتی ہے، اسلام یہ کہتا ہے۔ یہ بَغْيًا بَيْنَهُمْ (2:213) کی بنا پر فرقوں میں پڑ جاتے ہیں تفریق کرتے ہیں، اختلاف کرتے ہیں۔ اور ڈھٹائی کا پھر یہ عالم ہے کہ پھر اختلاف امتی رحمة کہتے ہیں کہ یہ اختلاف جو ہے یہ رحمت ہے۔ پھر امت کو بہتر تہتر میں بانٹتے ہیں، دعویٰ یہ ہوتا ہے کہ ان میں سے ایک گروہ تو جنت والوں کا ہے، باقی سب جہنمی ہیں اور ہر گروہ اپنے آپ کو اہلِ جنت کہتا ہے اور یوں سر پھٹول یہ جاری رہتی ہے۔ یہ کسی خاص اہلِ کتاب کا ذکر نہیں ہے، دین جب بھی کسی مذہب کی سطح پہ آ جاتا ہے تو اس کے جتنے بھی پیرو جہاں کہیں بھی ہوں، نام ان کا کچھ بھی کیوں نہ ہو، وہ اہلِ کتاب ہو جاتے ہیں۔ ہم اپنے مروجہ اسلام کی رو سے ہم بھی ویسے ہی اہلِ کتاب ہیں جیسے کہ زمانۂ نبی اکرم ﷺ میں پہلے ادیان کی محرف شدہ شکل مذہب کے پیرو اہلِ کتاب کہلاتے تھے۔

دنیا بھر میں اہلِ مذاہب کے نزدیک سب سے بڑا جرم کتاب اللہ کی طرف دعوت دینا ہے

لہٰذا قرآن جب اہلِ کتاب کا ذکر کرتا ہے تو یہ ذہن میں نہ رکھیے کہ یہ تاریخی واقعات ہیں جو نبی اکرم ﷺ کے یہود و نصاریٰ کے متعلق یہ ذکر آ رہا ہے۔ ان کی کسی خاص خصوصیت کا ذکر آئے گا تو یہود و نصاریٰ کہہ کے آئے گا۔ لیکن جہاں اہلِ کتاب آئیں گے، وہاں ساری دنیا کی اس ذہنیت کے حامل آئیں گے اور آج یہ خطاب ہم سے ہو رہا ہے۔ لہٰذا اسے اس معنی میں لیجیے تو پھر آپ دیکھیں گے کہ یہ مرقع کتنا عبرت انگیز اور سبق آموز ہے ہمارے لیے۔ ورنہ یہ تاریخ کی داستانِ پارینہ نہیں ہیں، اساطیر الاولین نہیں ہیں۔ یہ کچھ کہتے ہوئے جو کچھ پچھلی آیات میں قرآن نے کہا تھا، ان سے کہا ہے قُلْ يٰۤاَهْلَ الْكِتٰبِ لِمَ تَكْفُرُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ (3:98) اے مذہب کے پیرو لوگو! تم خدا کے قوانین سے انکار کیوں کرتے ہو؟ آپ کو معلوم ہے کہ آج بھی ان اہلِ مذہب کے نزدیک سب سے بڑا جرم کیا ہے؟ قرآنِ خالص کی طرف دعوت دینا، آیات اللہ کی طرف دعوت دینا، انہیں یہ کہنا کہ جو کچھ تم کہتے ہو، اس کی سند میں خدا کی کتاب سے کوئی چیز پیش کرو۔ اور پھر یہی چیز نہیں کہ یہ اپنی طرف سے یوں کہیں، منسوب کرتے ہیں، سوچیے کہ کس کی طرف منسوب کر رہے ہیں؟ اس ذاتِ اقدس ﷺ کی طرف جو خالص دینِ خداوندی کے اتباع کے لیے آئے تھے۔ خود اتباع کرتے تھے، دوسروں سے اتباع کراتے تھے۔ جن کا اعلان یہ تھا کہ (یعنی یہ قرآن کا اعلان ہے) وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ (5:44) کافر اور مومن کی تمیز یہ ہے کہ مومن ما انزل اللہ کے مطابق فیصلے

کرتا ہے' کافر اس کے علاوہ دوسری چیزوں سے فیصلے کرتا ہے۔ اس قرآن کے لانے والے اس دین کے داعی کے متعلق یہ کہا جاتا ہے۔

وضعی روایات اپنے آئینہ میں

یہ ایک روایت بیان کی جاتی ہے کہ میرے بعد ایک بہت بڑا فتنہ کھڑا ہوگا' پوچھا گیا کہ وہ فتنہ کیا ہوگا؟ (سوچیے کہ کس قسم کی روایات پھر یہ لوگ وضع کرتے ہیں) آپ ﷺ نے فرمایا فتنہ یہ ہوگا کہ وہ شخص دعوت دے گا تمہیں کہ تم صرف خدا کی کتاب کا اتباع کرو' یہ ایک فتنہ ہوگا کھڑا' بچنا اس سے۔ قُلْ یٰۤاَهْلَ الْكِتٰبِ لِمَ تَكْفُرُوْنَ بِاٰیٰتِ اللّٰهِ (3:98) تمہیں کیا ہوا ہے یہ کہ آیات اللہ سے کفر کرتے ہو' انکار کرتے ہو۔ وَ اللّٰهُ شَهِیْدٌ عَلٰى مَا تَعْمَلُوْنَ (3:98) تم چھپاتے ہو بہت سی باتیں' عوام کو پتا نہیں چلنے دیتے انہیں' یہی کہتے ہو کہ یہی خدا کا ارشاد ہے لیکن خدا تو اس کے اوپر شاہد ہے جو کچھ تم کرتے ہو۔ خدا کی شہادت کے کیا معنی ہیں؟ ان اہلِ کتاب کے لیے تو یہ مشکل تھا جو انہیں کہا جاتا کہ تمہارے پاس خدا کی کتاب ہے اسے دیکھو' انہوں نے تو کتاب کو اپنی شکل میں رہنے دیا ہی نہیں تھا۔ لیکن آج یہ چیز وَ اللّٰهُ شَهِیْدٌ عَلٰى مَا تَعْمَلُوْنَ (3:98) کے معنی یہ ہیں کہ خدا کی کتاب اس کی شہادت دیتی ہے کہ تم کیا کرتے ہو۔ حق کیا ہے اور باطل کیا ہے۔ معیار یہ ہے اس چیز کے پرکھنے کا۔ کون آیات اللہ سے کفر برتتا ہے اور کون اس پر ایمان لاتا ہے وَ اللّٰهُ شَهِیْدٌ عَلٰى مَا تَعْمَلُوْنَ (3:98) خدا کی کتاب کی شہادت اس کا فیصلہ کرے گی۔ یہ معیار بنے گی اس چیز کا جسے یہ فتنہ قرار دیتے ہیں۔ الحاد ہے' بے دینی ہے' ارتداد ہے قرآنِ خالص کی طرف دعوت دینا۔

خدا کے راستے میں سنگِ گراں بن جانے والوں کی شورشوں کا ذکر اور لفظ عَوج اور عِوج کا مفہوم

پہلی چیز تو یہ ہے کہ خود انکار کرتے ہیں اور اگلی چیز ہے' کیا بات قرآن کہہ جاتا ہے؟ قُلْ یٰۤاَهْلَ الْكِتٰبِ (3:99) پہلی چیز تو یہ ہے کہ خود انکار کرتے ہو' خود نہیں مانتے لِمَ تَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِیْلِ اللّٰهِ مَنْ اٰمَنَ (3:99) جو اس پر ایمان لاتے ہیں اس کے مطابق زندگی بسر کرتے ہیں' ان کے راستے میں کیوں کھڑے ہو جاتے ہو؟ کم بختو! خود انکار کرتے ہو تو جاؤ جہنم میں' خود انکار کرتے ہو اور جو اس راستے کے اوپر جانا چاہتا ہے اس کے راستے میں سنگِ گراں بن کے حائل ہو جاتے ہو۔ آپ دیکھیں گے کہ دین کی

جتنی مخالفت ان اہلِ کتاب یا اہلِ مذہب یا مذہبی پیشوائیت کی طرف سے ہوتی ہے' یہ مسٹر بے چارے اتنی مخالفت نہیں کرتے تنگ آ کر زیادہ سے زیادہ INDIFFERENT ہو جاتے ہیں۔ لیکن یہ تمام غوغا' ہنگامہ آرائیاں' شورشیں جو برپا ہوتی ہیں یہ ساری اہلِ مذہب کی طرف سے ہوتی ہیں۔ کس چیز کے خلاف؟ قرآن کی طرف دعوت کیوں دی جاتی ہے۔ **لِمَ تَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ مَنْ اٰمَنَ** (3:99) خود کفر کرتے ہو اور جو اس پہ ایمان لا کر خدا کے راستے کی طرف جاتا ہے اس کے راستے میں سنگِ گراں بن کر حائل ہو جاتے ہو۔ آپ نے غور فرمایا کہ یہ کس کی داستاں بیان ہو رہی ہے؟ چودہ سو سال پہلے کے یہود و نصاریٰ کی نہیں' ہر اہلِ مذہب کی بیان ہو رہی ہے' ہماری داستان بیان ہو رہی ہے۔ اور اس کے بعد ہے **تَبْغُوْنَهَا عِوَجًا** (3:99) کرتے کیا ہو تم؟ عجیب چیز ہے صاحب! عوج کے معنی ہوتا ہے پیچ و خم' ٹیڑھا پن۔ وہ سیدھے راستے پہ جاتا ہے صراطِ مستقیم کے اوپر تم۔ اس میں ذرا سے پیچ پیدا کرتے' ہو خم پیدا کرتے ہو' ٹیڑھ پیدا کرتے ہو۔ یہ چیز کہ قرآن کے الفاظ کے انتخاب میں نے کہا تھا کہ بڑے غور طلب ہوتے ہیں۔ عربی زبان میں عَوج اور عِوج ویسے ایک ہی مادہ ہے۔ یہ عَوج کہتے ہیں اس قسم کے ٹیڑھے ہونے کو جو محسوس ہو جائے مثلاً کوئی لکڑی ٹیڑھی ہو جاتی ہے اسے عَوج کہیں گے اور عِوج کہیں گے وہ جو چیز غیر محسوس طور پر ٹیڑھی کی جائے' محسوس تو نہ وہ ہو لیکن درحقیقت اس کو ٹیڑھا کر دیا جائے۔

اہلِ کتاب یا اہلِ مذہب کی تکنیک

یہ معتقدات یہ تصورات آپ دیکھیے گا تکنیک کیا ہوتی ہے اہلِ کتاب کی' اہلِ مذہب کی؟ دین کے جتنے محسوس ارکان ہوتے ہیں' ان کو اسی طرح سے رکھ لیتے ہیں نماز' روزہ' زکوٰۃ' حج یہ ساری چیزیں آپ دیکھیں گے اسی طرح سے نظر آئے گی' کہیں ٹیڑھی نہیں نظر آتی۔ لیکن ان کے اندر جو اصلِ مقصد ہے ان کا' جو غایت ہے ان کی اس کو کہیں سے کہیں لے جاتے ہیں' یہ ہے جس کو قرآنِ کریم عِوَجًا (3:99) کہتا ہے۔ عِوَجًا (3:99) نہیں' یہاں کہا عَوجًا نہیں تم کرتے وہ تو فوراً پتہ چل جائے گا۔ انہیں تو اسی طرح سے رکھتے ہو لیکن ان کے تابع جو ان کے مقاصد تھے غایت تھی ان کی ان کو جہاں انہیں پہنچنا ہے' اصلی مقام پہ' اس سے ان کا رخ ادھر بدل دیتے ہو۔

ہمارا رخ تو قبلے کی طرف رہا لیکن دین کی غرض و غایت کو بڑا مفقود کر دیا

کتنا زور دیا جاتا ہے قبلے کی سمت کے صحیح طور پر متعین کرنے پہ' ذرا سا کسی کا رخ بدلا ہوا ہو تو پیچھے سے آ کے اس کو وہ پکڑ

کے وہ یوں سیدھا کر دیتے ہیں کہ بھئی! ٹھیک منہ طرف قبلے شریف کے ہونا چاہیے۔ آپ نے دیکھا کہ یہاں عِوَجًا (3:99) نہیں پیدا ہونے دیا انہوں نے' ذرا ٹیڑھ نہیں پیدا ہونے دی لیکن وہ جو قبلے سے مقصود تھا کہ تمہاری زندگی کا جہاں کہیں بھی تم ہو' ہر ایک کا مطمع نگاہ جو ہے وہ مرکز ہونا چاہیے جو تمہارے دین کے قائم رکھنے کا ذریعہ ہے۔ اپنا رخ اور توجہات اس کی طرف رکھو' اس کو بدل دیا انہوں نے۔ قبلے کے معنی اب صرف نماز میں ایک خاص سمت کی طرف منہ کرنا ہو گیا' اس کو تو نہیں بدلا لیکن قبلے سے جو غایت تھی دین کی اس کو بدل کے اہلِ کتاب کے درجے کے اوپر لے آئے۔ یہ ایک مثال ہے ورنہ آپ دیکھیں گے کہ دین کے جتنے بھی محسوس شواہد تھے' انہیں اسی طرح سے رکھا جاتا ہے لیکن ان کے اندر جو غیر محسوس نتائج اور اس کی غایت ہوتی ہے' مقصود اس کا جو کچھ ہے' اس کو بدل دیا جاتا ہے۔ تَبْغُوْنَهَا عِوَجًا وَّ اَنْتُمْ شُهَدَآءُ (3:99) جانتے ہو اس چیز کو۔ عوام جو ان کے یہ متبعین ہوتے ہیں' یہ تو جہلا ہوتے ہیں' انہیں نہیں پتا ہوتا۔ جاہل کے یہی معنی نہیں ہوتا کہ وہ کتابیں پڑھنا نہ جانتا ہو قرآن نے تو خود دوسری جگہ ان علما کے متعلق کہا ہے کہ ان کی کیفیت یہ ہے جو اتنی اتنی بڑی کتابیں اٹھائے بیٹھے ہیں جیسے ان کے اوپر کتابوں کا ڈھیر لاد دیا جائے (62:5)۔ یہ بھی جاہل ہوتے ہیں لیکن ان میں اس قسم کے کایاں ہوتے ہیں جنہیں معلوم ہوتا ہے کہ یہ چیز دین نہیں ہے لیکن اپنے مقاصد اور اغراض اور مفاد کی خاطر اس چیز کو دین کہہ کے پیش کرتے ہیں۔ وَ اَنْتُمْ شُهَدَآءُ (3:99) لیکن وَ مَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ (3:99) خدا کا قانونِ مکافاتِ عمل تو جانتا ہے۔

اہلِ ایمان کو اہلِ کتاب والوں کی طرف سے لاتعلق رہنے کی تلقین

وہ نتائج جو ان چیزوں نے مرتب کرنے تھے' وہ نتائج تو مرتب نہیں ہو رہے۔ دین کی ان چیزوں پہ جنہیں تم دین کہتے ہو اس شدت سے عمل درآمد لوگوں سے کراتے ہو لیکن دن بہ دن تمہاری اپنی حالت یہ ہے کہ پوری قوم انحطاط اور زوال کے جہنم میں گرتی چلی جا رہی ہے۔ وَ مَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ (3:99) خدا کا قانونِ مکافاتِ عمل' اسے تو تم دھوکا نہیں دے سکتے۔ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنْ تُطِيْعُوْا فَرِيْقًا مِّنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ يَرُدُّوْكُمْ بَعْدَ اِيْمَانِكُمْ كٰفِرِيْنَ (3:100) اے اہلِ ایمان! اگر ان اہلِ کتاب کے کسی ایک فریق کا بھی تم نے اتباع کر لیا تو وہ تمہیں تمہارے ایمان کے بعد کفر کی طرف لے جائے گا' پھر لوٹا دیں گے تمہیں کفر کی طرف۔ آپ دیکھیے یہاں کفر اور ایمان کا امتیاز کیا ہے؟ پورے کا پورا اہلِ مذہب کا اتباع نہیں' اہلِ مذہب کے کسی ایک فریق کا بھی اتباع اگر تم نے کر لیا تو جہنم میں گئے۔

آج ہر فرقہ اپنی اپنی مساجد میں اپنے اپنے فرقے کی تعلیم دینے میں مصروفِ کار ہے

478آلِ عمران

اب آپ دیکھیے یہ اہلِ مذہب آپ کے کتنے فرقوں کے اندر بٹے ہوئے ہیں۔ ہر فرقہ دعویٰ یہ کرتا ہے کہ میں سیدھے راستے کے اوپر ہوں دین کے' باقی سب جہنم میں جانے والے ہیں۔ کُلُّ حِزْبٍ م بِمَا لَدَیْهِمْ فَرِحُوْنَ (30:32) ہر گروہ اور ہر فرقہ مگن ہے اس میں کہ جس چیز کو وہ دین سمجھتا ہے' جس چیز کو وہ مذہب قرار دیتا ہے' اس میں وہ مگن ہے۔ کبھی اسے پرکھنے کی ضرورت نہیں سمجھتا۔ لہٰذا ہر ایک کی دعوت یہ ہے کہ ہمارے ساتھ آ کے ملو' ہمارے فرقے کا اتباع کرو تو پھر تم سیدھے راستے کے اوپر جاؤ گے۔ قرآن کہتا ہے کہ اِنْ تُطِیْعُوْا فَرِیْقًا مِّنَ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْکِتٰبَ (3:100) ان میں سے کسی ایک فرقے کے ساتھ بھی تم ہو جاؤ تو جہنم میں چلے جاؤ گے فَرِیْقًا مِّنَ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْکِتٰبَ (3:100)۔ فرقہ تو خود جہنم ہے' قرآن تو اسے شرک قرار دیتا ہے وَ لَا تَکُوْنُوْا مِنَ الْمُشْرِکِیْنَ (30:31) مِنَ الَّذِیْنَ فَرَّقُوْا دِیْنَهُمْ وَ کَانُوْا شِیَعًا (30:32) جب وہ دین میں نفسِ فرقہ کا ہی شرک قرار دیتا ہے تو اس میں اس فرقے اور اُس فرقے کے امتیاز کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ دین میں تو فرقے کے ساتھ نسبت جو ہے وہ آپ کو دین سے ہٹا کے' مذہب کی سطح پہ لے آتی ہے۔ پھر اس کی کیا اس میں تخصیص ہے کہ کون سا فرقہ اور کون سا فرقہ نہیں' باطل تو باطل ہی ہوتا ہے۔ جس طرح سے آج آپ یا قرآن نازل ہونے کے بعد قرآن کے علاوہ جتنے بھی اس سے پیشتر اہلِ کتاب تھے' سارے مدعی ہیں کہ ہمارے پاس صحیح خدا کا دین ہے جو کتابوں میں اپنی وہ کہتے ہیں کہ خدا کی طرف سے آئی ہوئی ہمارے پاس ہیں۔ لیکن اگر آپ ان میں سے کسی ایک کے بھی ساتھ ہو جائیں تو کیا آپ خدا کے دین پہ رہیں گے۔ ان کے متعلق تو یہ چیز آپ کی ہے ابھی تک لیکن اپنے ہاں جو کیفیت آپ کی پیدا ہوگئی اسی سطح کے اوپر سب کے سب آ چکے۔ ان میں سے ہر فرقہ دعوت دیتا ہے کہ ہمارے ساتھ آؤ تو جنت کی طرف تم چلے جاؤ گے۔

اُمتِ واحدہ کی خاطر ہر فرد کو دینِ خداوندی پر اسی طرح ایمان لانا ہوگا جس طرح قرآنِ حکیم نے تجویز کیا ہے

قرآن کہتا ہے کہ سوال ہی نہیں ہے۔ دین ملتِ واحدہ کا نام ہے' ایک نظام کا نام ہے' اس میں کسی گروہ کے ساتھ بھی کوئی ہو گیا تو دین سے ہٹ کے مذہب کی سطح کے اوپر آ گیا' یہ کفر ہے۔ یَرُدُّوْکُمْ بَعْدَ اِیْمَانِکُمْ کٰفِرِیْنَ (3:100) ایمان وحدت کا نام تھا۔ خدا کی توحید کے معنی ہی یہ تھے کہ اس کے ماننے والے' اس کے دین کے ماننے والے' ان میں وحدت رہے۔ جونہی یہ

وحدت آپ کی ٹوٹی اور انتشار پیدا ہوا' تفریق پیدا ہوئی' تقسیم پیدا ہوئی اب اس میں سے کسی ایک کے ساتھ بھی کسی کا جو ہو جاتا ہے' وہ کفر قرآن قرار دیتا ہے' اسے شرک قرار دیتا ہے۔ لہٰذا یہ سارے مناظرے اور مباحثے اور یہ دعاوی ہر ایک کے کہ آؤ لوگو کہ یہیں نورِ خدا پاؤ گے' سوال ہی نہیں ہے صاحب۔ نورِ خدا تو اس کی کتاب کے اندر ہے جو ہمارے پاس قیامت تک کے لیے محفوظ کر دی گئی۔ یہی معیار ہے حق و باطل کا' یہی دین کا عروۃ الوثقیٰ ہے۔ ابھی آگے آیت آتی ہے' یہ تو NEGATIVE ASPECT ہے نا کہ یہ نہ کرو۔ تو میں کہہ یہ رہا تھا کہ اِنۡ تُطِیۡعُوۡا فَرِیۡقًا مِّنَ الَّذِیۡنَ اُوۡتُوا الۡکِتٰبَ یَرُدُّوۡکُمۡ بَعۡدَ اِیۡمَانِکُمۡ کٰفِرِیۡنَ (3:100) لہٰذا دین پر چلنے کے آرزومند کے لیے یہ سوال ہی نہیں پیدا ہوتا کہ میں مذہب کی سطح کے اوپر جو فرقے ہیں' ان میں سے کس فرقے کے ساتھ شریک ہوں گا۔ جس طرح نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تمام اہلِ کتاب کو جو اس زمانے میں اہلِ کتاب یا مذہب کی سطح پر تھے' نئے سرے سے ایمان لانے کی دعوت دی تھی' نئے سرے سے خدا کی کتاب کو ماننے کی دعوت دی تھی۔ ان سے یہ کہا گیا تھا کہ اگر یہ اس طرح ایمان لائیں جس طرح سے تم ایمان لائے ہو تو پھر ان کو مومن سمجھا جائے گا (2:127)۔ عزیزانِ من! آج بھی فرقہ بندی کی ہر نسبت کو چھوڑ کر صرف مسلمان کی حیثیت سے خالص قرآن کے اوپر جو شخص آ جائے گا' وہ تو دین کے اوپر ہو گا ورنہ اس کے علاوہ سوال ہی پیدا نہیں ہو گا کہ کونسا فرقہ ہے جس کے ساتھ ہونے سے آپ حق پہ ہوں گے۔ قرآن کہتا ہے اِنۡ تُطِیۡعُوۡا فَرِیۡقًا مِّنَ الَّذِیۡنَ اُوۡتُوا الۡکِتٰبَ یَرُدُّوۡکُمۡ بَعۡدَ اِیۡمَانِکُمۡ کٰفِرِیۡنَ (3:100) کہا کہ تم ایمان کے بعد کفر کی طرف نہیں جاؤ گے بشرطیکہ یہ چیزیں تم میں قائم رہیں۔ اب POSITIVE چیز آئی بڑی اہم چیز ہے۔ وَ کَیۡفَ تَکۡفُرُوۡنَ (3:101) تم کس طرح سے کفر کی راہ اختیار کر سکتے ہو؟ وَ اَنۡتُمۡ تُتۡلٰی عَلَیۡکُمۡ اٰیٰتُ اللّٰہِ (3:101) قوانینِ خداوندی خالص خدا کی کتاب تمہارے سامنے ہے اور تمہارے سامنے اسے پیش کیا جاتا ہے۔

دین کے تصور کے برعکس مذہب میں ہر فرد انفرادی طور پر اپنی نجات کی فکر میں مبتلا ہوتا ہے

پہلی چیز تو یہ ہے تو کیا اتنی سی چیز کافی ہے پھر؟ اتنی سی کافی نہیں ہے۔ مذہب تو انفرادی چیز ہوتا ہے اپنے طور پر کسی نے جو کچھ سمجھ لیا' اس کے مطابق عمل کرتا چلا گیا' وہ کہتے ہیں اس کی نجات ہو جائے گی۔ آج بھی یہ کیفیت ہے' مذہب کی سطح پر اپنے اپنے طور پر جو کچھ تم کرتے رہو' نجات ہو جاتی ہے اس سے۔ ہر اہلِ کتاب یہی کرتا ہے۔ اہلِ کتاب کا ہر فرقہ یہی کرتا ہے۔ لیکن دین تو انفرادی چیز نہیں ہے وہ تو ایک اجتماعی نظام کا نام ہے اور اجتماعی نظام کے لیے ایک مرکز کی ضرورت ہے۔ اس مرکز کے فیصلے جو وہ

کتاب اللہ کی روشنی میں دے گا ان کا اتباع' دین کا اتباع کہلائے گا۔ لہٰذا کتاب کی ضرورت ہے اور کتاب کے ساتھ اہلِ زندہ 478آلعمران اتھارٹی کی ضرورت ہے جو کتاب اللہ کے مطابق پوری امت کو ایک راستے کے اوپر چلائے۔ دو شرطیں ہیں۔ میں نے پہلی چیز تو پڑھی وَ اَنۡتُمۡ تُتۡلٰی عَلَیۡکُمۡ اٰیٰتُ اللّٰہِ (3:10) قرآن پیش کیا جاتا ہے تمہارے سامنے وَ فِیۡکُمۡ رَسُوۡلُهٗ ط (3:101) اور تم میں اس کا رسول ہے۔ یہاں یہ ایک سوال پیدا ہوتا ہے فِیۡکُمۡ رَسُوۡلُهٗ (3:101) کہ تم کافر نہیں ہو سکتے۔ کتاب تمہارے پاس ہے' رسول تمہارے اندر ہے تو اس کے بعد یہ ہوتا ہے کہ صاحب جب رسول وفات پا گئے تو ان دو ستونوں میں سے ایک ستون تو خود بخود ڈھے گیا۔ جب دو چیزوں کی موجودگی ضروری قرار دی تھی دوسری چیز تو ختم ہو گئی تو پھر تو اسلام یا دین کا سوال ہی باقی نہ رہا۔ بڑا مغالطہ آفریں ہے یہ چیز اور غور طلب بھی ہے۔ نظر بظاہر واقعی یہ چیز نظر آتی ہے وَ فِیۡکُمۡ رَسُوۡلُهٗ (3:101) کہ تم میں اس کا رسول موجود ہے۔ تو پھر اس کے بعد کفر کی حالت میں لوٹ جاؤ گے تم؟ کیوں کہ ایک چیز تو باقی نہ رہی۔ یہی وہ حیثیت ہے رسول کی جس کو صحیح طور پہ نہ سمجھنے سے یہ تمام سوالات پیدا ہوتے ہیں اور مغالطے دیے جاتے ہیں۔

زندگی کے اجتماعی نظام میں رسول کی شخصیت کا مقام اور کردار

میں ابھی یہ بات عرض کروں کہ رسول کے معنی کیا ہیں قرآن کی رو سے؟ رسول کا منصب کیا ہوتا ہے؟ منصبِ نبوت تو یہ ہے کہ خدا کی طرف سے وحی کا پانا ان قوانین یا آیات اللہ کا خدا کی طرف سے ملنا اسے' صرف اتنا منصب نبوت کا ہے۔ اس وحی کو آگے پہنچانا اور اس کے مطابق ایک عملی نظام قائم کرنا' یہ منصبِ رسالت ہے۔ کہا تم میں رسول ہے وَ اَنۡتُمۡ تُتۡلٰی عَلَیۡکُمۡ اٰیٰتُ اللّٰہِ (3:101) وحی پالی نبی نے اور اس نے آگے پہنچا دی' یہ تو منصب یہاں ختم ہوا اور اس کے بعد تم میں یہ رسول موجود ہے۔ اور رسول کے متعلق یہ چیز بتائی کہ وہ اس نظام کو عملاً قائم کرے گا۔ اب سوال یہ رہا کہ کیا رسول کی طبعی زندگی جو ہے اس سے مقصود ہے وَ فِیۡکُمۡ رَسُوۡلُهٗ (3:101) جب رسول وفات پا جائے گا تو پھر کیا ہوگا؟ دور جانے کی ضرورت نہیں ہے اسی سورۃ آلِ عمران کی آیت 143۔ وَ مَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوۡلٌ ج (3:143) غور کیجیے گا یہی لفظِ رسول یہاں آ گیا کہ تم میں رسول موجود ہے۔ سوال یہ پیدا ہوا کہ اس کی طبعی موت کے بعد کیا ہوگا؟ وَ مَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوۡلٌ ج قَدۡ خَلَتۡ مِنۡ قَبۡلِهِ الرُّسُلُ ط (3:143) اس سے پہلے بھی رسول اپنے اپنے وقتوں میں آئے اور چلے گئے دنیا سے۔ طبعی زندگی خواہ کتنی لمبی ہو' اس کی تو ایک مدت ہوتی ہے۔ اَفَائِنۡ مَّاتَ اَوۡ قُتِلَ (3:143) اگر کل کو یہ رسول بھی مر جائے یا میدانِ جنگ میں شہید ہو جائے یا قتل کر دیا جائے اَوۡ قُتِلَ انۡقَلَبۡتُمۡ عَلٰٓی اَعۡقَابِکُمۡ

((3:143 تو کیا پھر تم یہ کہہ کے کہ صاحب! رسول اب ہم میں موجود نہیں رہا' تم حالتِ کفر کی طرف چلے جاؤ گے؟ وَمَنْ يَّنْقَلِبْ عَلٰى عَقِبَيْهِ فَلَنْ يَّضُرَّ اللّٰهَ شَيْـًٔا ((3:143 جو اس طرح سے حالتِ کفر کی طرف لوٹ جائے گا' خدا کا تو کچھ نہیں بگاڑے گا' اپنا ہی کچھ بگاڑے گا۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وفات کے فوراً بعد اسی وقت حضرت صدیق اکبرؓ کا ایک اہم خطاب

یہاں سے یہ معلوم ہو گیا کہ رسول کی طبعی موت سے' اس نظام یا اس دین کا کوئی نقصان نہیں ہوتا۔ اور اس کی عملی تفسیر ہمیں مل جاتی ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وفات کے بعد۔ امت کے ذہنوں میں ایک انتشار پیدا ہوا' ایک پریشانی پیدا ہوئی' حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات کی موجودگی جو تھی بہت بڑی چیز تھی۔ امت کے لیے ذہنوں میں یہ بات پیدا ہوئی کہ اس کے بعد؟ سب سے بہتر رسول کے پیغام کو سمجھنے والا وہ منبرِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اوپر آیا' وفات کے چند ثانیہ کے بعد جب کہرام مچا ہوا تھا امت میں' حضرتِ ابوبکر صدیقؓ نے آ کر یہ بات کہی کہ تمہیں کیا ہو گیا ہے' کیا کمی محسوس کر رہے ہو' کونسی چیز ہے جس کی وجہ سے تم گھبرا رہے ہو کہ اب دین اپنی اصلی شکل میں نہیں رہے گا۔ انہوںؓ نے کہا کہ تم نے قرآن کی یہ آیت نہیں پڑھی وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ (3:143) یاد رکھو! جو محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات کی محکومیت اختیار کیے ہوئے تھا' وہ تو سمجھ لے کہ اس کا معبود مر گیا ہے اور جو خدا کی محکومیت اختیار کیے ہوئے تھا' اس کا معبود زندہ ہے' حی و قیوم ہے' کچھ نہیں بگڑا' یاد رکھو۔ اس لیے کہ خدا کی کتاب موجود ہے۔ یہ نظام اسی صورت میں آگے چلے گا۔ اس نظام کا جو مرکز ہے پھر وہ یہاں قائم مقام ہو جائے گا منصبِ رسالت کا۔ جب ایک نظام آئینی طور پہ قائم ہو تو اس میں اس نظام کے سربراہ یا کسی اوراتھارٹی کی طبعی موت یا اس کا وہاں نہ رہنا' نظام کا کچھ نہیں بگڑتا اس کے SUCCESSOR جتنے ہیں' جانشین جتنے ہیں' بعد میں آنے والے جتنے ہیں' وہ وہی FUNCTION ادا کرتے ہیں جو پہلا کر رہا تھا۔ جتنی حکومتیں CONTINUOSLY آگے چلتی ہیں' مسلسل آگے چلتی ہیں' ان میں ہر پہلی حکومت کے فیصلے' اسی طرح سے نافذ العمل رہتے ہیں تاوقتیکہ بعد میں آنے والی کوئی حکومت اپنے زمانے کے تقاضے کے اعتبار سے ان کو بدل نہ دے۔ اس سے مراد درحقیقت وہ نظام ہوتا ہے وہ حکومت ہوتی ہے۔ جب وہ حکومت کا تختہ الٹ جائے اس کی جگہ کوئی دوسری حکومت آ جائے' دوسرا نظام آ جائے تو پھر پہلا نظام جو ہے وہ باطل ہوتا ہے یا منسوخ ہوتا ہے ورنہ وہ نظام اسی طرح چلتا ہے۔ ان میں اشخاص آئیں' اشخاص جائیں' اس سے کچھ فرق نہیں پڑتا۔ یہی وجہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد جو نظام قائم ہوا' اسے خلافت علٰی منہاجِ رسالت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم یا نبوت کہا جاتا ہے۔ خلافت کے معنی ہی SUCCESSION کے ہیں۔ یہ خلیفۃ الرسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تھے۔ چنانچہ

پہلا لقب جو تھا حضرت ابوبکر صدیقؓ کا وہ خلیفۃ الرسول ﷺ تھا۔ یہ جو اس کے بعد خلیفۃ المؤمنین یا امیر المؤمنین کا یہ لقب ہے وہ اس لیے آیا کہ بعد میں جب یہ صورت ہوئی تو پھر خلیفۃ الرسول ﷺ تو وہ پہلے ہوئے، حضرتِ عمرؓ کے زمانے میں کہا گیا خلیفۃ خلیفۃ الرسول ﷺ۔ تو آپؓ نے کہا کہ یہ بھئی! اگر یہ انداز رہا تو آگے جوں جوں چلتے جائیں گے یہ خلیفہ کا لفظ تو ایک لڑی بن جائے گا مسلسل، اس لیے لفظوں میں اس کے کہنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اس لیے ان کے معنی امیر المؤمنین تھا۔ یہ امیر کے معنی یہ نہ لے لیجیے کہ ''او مسلماناں توں سب توں وڈا امیر ہیگا سی'' اور امیر جو ہے اس کے معنی اس امارت کے بھی نہیں ہیں جسے ہم سمجھتے ہیں۔ آج تو جو امیر ہوتا ہے کسی جماعت کا وہ تو ڈکٹیٹر ہوتا ہے اس جماعت کا۔ عربی زبان میں امر کہتے تھے صحراؤں میں سڑکیں تو بنی ہوئی نہیں تھیں، شاہراہیں نہیں تھیں، نشانِ راہ کون سے تھے؟ وہ چھوٹے چھوٹے پتھر راستے میں یہاں وہاں رکھتے چلے جاتے تھے تاکہ وہ راستے کا نشان بتاتے چلے جائیں۔ یہ امیرِ راہ ہوتے تھے یہ پتھر جو نشان بتایا کرتے تھے۔ امیر المؤمنین جو مؤمنین کو خدا کے راستے کے نشان بتانے والا ہو۔ یہ حیثیت تھی۔ بہرحال میں یہ کہہ رہا تھا کہ یہ نظام جب تک یہ قائم رہے اس وقت تک وَفِيكُمْ رَسُولُهُ (3:101) کی کیفیت باقی رہتی ہے۔ یہ اس دن چیز بگڑی جب تمہارے ہاں وہ نظام نہیں رہا، نظام کا مرکز نہیں رہا۔ اس وقت پھر کیفیت یہ ہوگئی عِوَجًا کی۔ یہ ساری چیزیں جتنی محسوس تھیں وہ تو ویسی کی ویسی آپ نے رکھیں اور ان کی غرض و غایت، ان کی منزلِ مقصود، ان کے رخ بدل دیے تم نے عِوَجًا۔

مملکت اسلامیہ پاکستان میں اپنے اپنے فرقے کی رجسٹریشن کی کوشش

لہٰذا بات اس دن بگڑی ہے جب وَفِيكُمْ رَسُولُهُ (3:101) کی دوسری شرط جو تھی آپ کے ہاں مفقود ہوگئی۔ اسلام کے یا دین کے نظام کی جگہ آپ کے ہاں ملوکیت کا نظام آ گیا اور پھر دین مذہب کی سطح پہ آ گیا، جب مذہب میں مذہبی پیشوائیت پیدا ہوگئی۔ امت کے اندر پہلے یہ DUALISM یا ثنویت پیدا ہوئی اور زندگی کے دو حصے ہوگئے۔ آج بھی آپ اپنے ہاں یہ PERSONAL LAWS کا دیکھ رہے ہیں جو رٹ لگائی جا رہی ہے کہ مملکت کا نظام تو اسلام کا ہوگا لیکن ہر فرقہ اپنے شخصی قوانین کی تعبیر اپنی اپنی فقہ کی رو سے کرے گا۔ اللہ اکبر۔ یہ جو منشور شائع ہو رہے ہیں خیر سے اسلام کے یہ بڑے بڑے داعیوں کے، اس کے اندر نمایاں لکھا ہوا ہے کہ امت کے مسلمہ فرقوں کی آئینی حیثیت تسلیم کی جائے گی۔ اب تک تو وہ یوں ہی تھے اب آئینی حیثیت تسلیم کی جاتی ہے اور شخصی معاملات کی تعبیر ان کی اپنی اپنی فقہ کے مطابق ہوگی۔ حتیٰ کہ یہ بھی لکھا ہوا ہے کہ اس کے لیے قاضی بھی ان کے اپنے مقرر کیے جائیں گے۔ آپ نے دیکھا ہے کس سطح پہ دین آ جاتا ہے پھر؟

آلِ عمران478

دین باقی نہ رہے تو پھر ہر فرد کا مذہب الگ الگ ہو جاتا ہے

کیا کہا تھا قرآن نے؟ پہلے تو یہ پوری امت میں ثنویت یا DUALISM پیدا ہوگئی۔ اس کے بعد اب یہ کیفیت ہوگئی یہ شخصی قوانین کی اور یہاں پھر ہر اہلِ مذہب نے یعنی ہر مذہبی پیشوا نے اپنی اپنی INTERPRETATION دینی شروع کی اور پھر فرقہ اور در فرقہ چل سو چل' اس کی تو انتہا ہی نہیں ہوتی۔ حق تو ایک ہوتا ہے۔ نشانہ جسے کہتے ہیں وہ تو ایک پوائنٹ کا نام ہے۔ نشانہ مس کر جایئے تو سینکڑوں ہزاروں پوائنٹ آپ کے سامنے آ جاتے ہیں۔ سوال کا ٹھیک جواب تو ایک ہوتا ہے۔ غلط جواب کی تو انتہا ہی کوئی نہیں ہوتی۔ دین ایک ہوتا ہے۔ امت ایک ہوتی ہے۔ نظام ایک ہوتا ہے۔ جب یہ بدل جائے تو پھر اس کی تعداد کوئی نہیں ہوتی۔ یوں ہی آپ نے بہتر تہتر کہے ہیں۔ ذرا تاریخ پڑھ کے دیکھیے کتنے ہوتے ہیں؟ عزیزانِ من! پھر تو ہر فرد کا اپنا اپنا مذہب ہوتا ہے۔ وَ فِیۡکُمۡ رَسُوۡلُهٗ (3:101) غور فرمایا آپ نے۔ انہوں نے پھر اس کے بعد یہ کہا کہ صاحب! یہ کتاب اللہ تو آ گئی' رہا رسول تو ہم میں رہا نہیں' اب کیا کریں؟ بجائے اس کے کہ اس طرف آتے کہ وہی جو منصبِ رسالت ﷺ تھا' جو نظام تھا دین کا جس میں سربراہِ ملت REPRESENT کرتا تھا خدا اور رسول کو' وہ نظام قائم کیا جائے۔ انہوں نے کہا کہ نہیں صاحب! رسول ﷺ کو اپنے اندر زندہ رکھنے کی صورت یہ ہے کہ رسول ﷺ کی باتیں جتنی ہیں ان کو اکٹھی کر لیا جائے۔ تیسری صدی ہجری میں جا کے اس کی ضرورت پیش آئی اور انہوں نے روایات کو جمع کرنا شروع کیا۔ دو اڑھائی سو سال بعد رسول اللہ ﷺ کی وفات کے انفرادی طور پر مختلف لوگوں نے ان چیزوں کو اکٹھا کیا۔ اور اب یہ جو اس طرح سے چیزیں اکٹھی کیں انہوں نے روایات کی بنا پر سن سنا کے ان کے متعلق اب یہ دعویٰ ہے کہ یہ ہے وہ رسول۔ اچھا جی! یہ ہے رسول۔

وظیفوں کی بنیاد پر نبی اکرم ﷺ کے دیدار کی خواہش اور اس کا انجام (بزبانِ پرویزؒ)

ہمارے ہاں ایک وظیفہ دیا جاتا ہے جس میں خواب میں رسول اللہ ﷺ تشریف لایا کرتے ہیں ہم بھی یہ وظیفے دیتے رہے۔ خواب میں رسول اللہ ﷺ آتے تھے (اپنی سناتا ہوں میں آپ کو) وہ جس وقت خواب میں رسول اللہ ﷺ نظر آتے تھے۔ جو آ جاتا تھا اس سے ہم پوچھتے تھے تو وہ بتاتا تھا کہ حضور ﷺ ایسے تھے کچھ ایسے تھے۔ کسی دوسرے کو بتایا اس نے وظیفہ کیا' اس سے پوچھا تو اس نے آ کے جو بتایا تو وہ کچھ مختلف ہوتا تھا۔ تیسرے کو بتایا اس نے کچھ اور طرح کا بتایا۔ طبیعت اس زمانے

میں بھی کچھ نا قدانہ سی پائی تھی، جب ہی تو اس دلدل سے نکل گیا۔ ذہن میں یہ بات آئی کہ اگر اس وظیفے سے رسول اللہ ﷺ خواب میں آتے ہیں تو وہ تو ہر ایک کے خواب میں ایک جیسے ہی ہونے چاہئیں۔ اب یہ کیا ہے کہ اس کے خواب میں اس قسم کے رسول ﷺ آتے ہیں۔ اس کے خواب میں اس قسم کے آتے ہیں؟ یہ بات تو طے ہوگئی کہ پھر یہ اپنے ہی تصور کا رسول ﷺ ہوتا ہے جو خواب میں ان کے آتا ہے۔ اس سے تو کچھ نہ بگڑا یہ جو انہوں نے کہا ہے نا کہ ہم میں یہ رسول ﷺ موجود ہے یعنی حدیثوں کا مجموعہ، اہلِ حدیث کا رسول اور، حنفیوں کا اور، مالکیوں کا اور، شافعیوں کا اور، حنبلیوں کا اور، ظاہریوں کا اور۔ اور یہ رسول مستقل حیثیت رکھ رہے ہیں۔ اہلِ حدیث سے جا کے کہو وَ فِيۡكُمۡ رَسُوۡلُهٗ (3:101) تو وہ اپنے ہاں بخاری اور مسلم لے آتے ہیں۔ اہلِ فقہ میں سے حنفیوں سے جا کے پوچھیے تو ان کا رسول ترمذی میں ہوتا ہے۔ حنبلیوں کا رسول حنبل کے جو مسند ہیں اس میں ہوتا ہے۔ وَ فِيۡكُمۡ رَسُوۡلُهٗ (3:101) انہوں نے SUBSTITUTE اس کا مقرر کیا ان حدیث کی کتابوں کو۔ آپ کو معلوم ہے کہ اب قرآن کی اس آیت کے یہ معنی بتائے جاتے ہیں کہ ٹھیک ہے صاحب! رسول ﷺ جو ہیں وہ ہم میں موجود ہیں، کہاں موجود ہیں؟ حدیث کی کتابوں میں۔

عقیدہ یہ ہے کہ حدیث قرآنِ حکیم کی آیت کو منسوخ کر سکتی ہے

جیسا میں نے عرض کیا ہے کہ وہ خواب میں حضور ﷺ کی ہر ایک کے الگ الگ شبیہہ آتی تھی، یہاں ہر فرقے کے پاس اپنا اپنا رسول ہے۔ ارے کہا کہ بھئی چلو آیات اللہ تو ایک ہیں نا تمہارے ہاں، اس کو پہلے لے لیجیے۔ آپ کو پتا ہے عقیدہ کیا ہے؟ عقیدہ یہ ہے کہ قرآن اور حدیث کے اندر اختلاف ہوسکتا ہے، تضاد ہوسکتا ہے، ہے موجود۔ بھئی ہوسکتا ہے تو پہلے خدا کا نام آتا ہے، وہ خدا کے رسول ﷺ تھے اس کو پہلے اوپر رکھیے، اس کے مطابق اسے دیکھ لیجیے کہ ٹھیک ہے یا غلط۔ کہا کہ نہیں! پہلی چیز تو یہ ہے کہ قرآن کی آیت کی تاویل ایسے کی جائے کہ وہ حدیث کے مطابق ہو۔ کہا کہ صاحب! اگر یہ ایسے نہ ہوسکتی ہو؟ تو عقیدہ یہ ہے کہ حدیث قرآن کی آیت کو منسوخ کر سکتی ہے۔ وَ فِيۡكُمۡ رَسُوۡلُهٗ (3:101) کے یہ معنی ہوئے۔

حیات النبی ﷺ کے متعلق بریلوی حضرات کا عقیدہ

جب بات پھر افسانوں پہ آئی تو پھر تو آپ دیکھتے ہیں کہ اس کے اندر پھر زیبِ داستاں کے لیے کیا ہوتا ہے؟ اب جو ہمارے ہاں درود وسلام پڑھتے ہیں تو بریلوی حضرات جو ہیں ان کا تو حیات النبی ﷺ کے متعلق ایمان ہی یہ ہے کہ رسول

آلِ عمران 478 اللہ ﷺ ہیں ہی زندہ۔ چلیے صاحب! وفات کا سوال ہی نہیں پیدا ہوا۔ جب وہ کھڑے ہو کے درود وسلام پڑھتے ہیں وہ کہتے ہیں کہ وہاں رسول اللہ ﷺ موجود ہوتے ہیں' تشریف لاتے ہیں۔ حیات النبی ﷺ کا آپ کو پتہ ہے پھر اس کے بعد مسئلہ ہی جاری ہو گیا کہ حضور ﷺ وفات ہی نہیں پا گئے۔ بھئی! وہ کہاں ہیں؟ آنکھوں والوں کو نظر آتے ہیں ہماری طرف آؤ' دکھائیں گے تمہیں۔ اب وہ رسول ساری امت کے نہیں رہے۔ چوں نہ بینند حقیقت رہے افسانہ زنند۔ دین تو بڑا صاف' بیّن چیز تھی۔ آیات اللہ قیامت تک کے لیے محفوظ کر دیں' خدا نے حفاظت کا ذمہ لیا۔ رسالت کے معنی ہوئے دین کو قائم کرنے کا منصب۔ یہ اسی طرح سے جاری رہے' قیامت تک کے لیے تم میں رسول باقی رہتا ہے۔ یہ گم ہو جائے اس کے بعد رسول باقی نہیں رہتا خدا کی آیات کو چلانے والا نظام باقی نہیں رہتا' دین انفرادی ہو جاتا ہے' فرقے کی باگ ڈور مذہبی پیشوا کے ہاتھ آ جاتی ہے۔ یہ اہلِ کتاب بن جاتے ہیں۔ ان میں پھر نہ خدا رہتا ہے اور نہ رسول رہتا ہے۔ یہ اشخاص رہ جاتے ہیں' ان کے اتباع کا نام شریعت کا اتباع ہو جاتا ہے۔

اجتماعی طور پر دین کے مطابق نظامِ حکومت قائم کرنے کے مسئلہ کا حل

جب یہ کیفیت پیدا ہو جائے تو اس کے بعد دین کو قائم کرنے کی صورت کیا ہے؟ اس سے پہلے کے اہلِ کتاب تو نہیں کر سکتے تھے کہ کتاب ان میں نہیں رہی تھی۔ جن میں کتاب موجود ہو' ان کے کرنے کا کام تو صرف اتنا ہے کہ اس کتاب کے مطابق پھر سے اپنا نظام جو ہے زندگی کا' وہ متعین کر لیں۔ کتاب اور رسول دونوں آ گئے اس کے اندر۔ وَ مَنۡ یَّعۡتَصِمۡ بِاللّٰہِ (3:101) یہ بتا دی کہ آؤ اب تمہیں بتائیں کہ اس حالت سے نکلنے کی صورت کیا ہو گی؟ وَ مَنۡ یَّعۡتَصِمۡ بِاللّٰہِ فَقَدۡ ہُدِیَ اِلٰی صِرَاطٍ مُّسۡتَقِیۡمٍ (3:101) اعتصام' کسی چیز کو اپنی حفاظت کا ذریعہ بنا لینا۔ کہا کہ اس کے بعد ایک ہی شکل ہو گی تمہارے بچنے کی۔ اگر یہ کیفیت تمہارے ہاں انتشار کی پیدا ہو جائے' یہ چیز باقی نہ رہے تو اعتصام باللہ اپنی حفاظت کا ذریعہ جسے تھام کے کوئی لغزش سے بچ سکتا ہے' اسے کہتے ہیں اعتصام' اللہ کے ساتھ اعتصام۔ اور جیسا کہ آپ کو معلوم ہے کہ جہاں بھی اللہ کی اطاعت' اللہ کے ساتھ اعتصام آئے گا وہ بحبل اللہ ہو گا جیسے ابھی اگلی آیت میں آتا ہے۔ خدا کی یہ کتاب ہے کہا کہ سب چیزیں انسانوں کی بنائی ہوئی MAN MADE جو ہیں' ان کو چھوڑ دو پھر واپس آ جاؤ کتاب اللہ کی طرف اور اس کے مطابق اپنا نظام قائم کر لو پھر وہی حقیقت تمہارے سامنے آ جائے گی۔ یہ پاکستان کا خطہ اسی خواب کی اس حسین تعبیر کے لیے حاصل کیا گیا تھا کہ کوئی ایک خطۂ زمین تو ایسا ہو کہ جس میں پھر سے خدا اور اس کا رسول' اس عملی شکل کے اندر ہمارے سامنے آ جائیں۔ لیکن وہ جو قرآن نے یہاں کہا تھا کہ لِمَ تَصُدُّوۡنَ عَنۡ

سَبِيْلِ اللّٰهِ (3:99) خدا کے اس راستے کی طرف جانے میں یہ سارے بڑے بڑے سنگِ گراں جو ہیں حائل ہو کے رہ گئے ہیں۔ راستہ روکے ہوئے ہیں، قرآن کا نام لینا یہاں جرم قرار پا رہا ہے۔ اب آئی اس کی عملی شکل۔ عزیزانِ من! بڑی غور طلب حقیقتیں ہیں۔ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ حَقَّ تُقٰتِهٖ (3:102) کہا اس کی عملی شکل یہ ہوگی اے ایمان کے مدعیو! قوانینِ خداوندی کی نگہ داشت کرو جیسا کہ حق ہے اس کی نگہ داشت کرنے کا۔ یہ ''حق ہے'' کیا ہے اس کی نگہ داشت کرنے کا حق؟ حق وہی ہے کہ یہ انفرادی چیز نہیں ایک اجتماعی چیز ہے۔ ابھی سامنے آتی ہے میں نے عرض کیا ہے قرآن کے الفاظ کا ترجمہ کر رہا ہوں میں۔ اجتماعی طور پر اس کو بنیاد بناؤ اور یہ کوئی وقتی اور ہنگامی چیز نہیں ہے کہ زندگی کے ایک شعبے میں اتنے وقت کے لیے تو یہ کیا اور اس کے بعد نکل آئے تو اور کیا۔ نماز کے لیے تو آپ آئے دین کی طرف بعد میں کاروبار جو آپ نے کیا کاروبار کی حیثیت سے۔ یہ صورت نہیں۔ وَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَ اَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ (3:102) زندگی کے آخری سانس تک ان قوانین کی اطاعت کرتے چلے جانا، ان کے سامنے جھکتے رہنا۔ کیسے یہ ہوگا؟ میں نے عرض کیا ہے نا کہ یہ آئی اس کی عملی شکل۔ وَ اعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا (3:103) یہ دیکھیے یہ جَمِيْعًا کیا کہہ رہا ہے آپ کو؟ حبل اللہ خدا کی یہ رسی جس کو تھامنے سے پاؤں میں لغزش نہیں آتی۔ آپ کو پتہ ہے کہ تیزی سے اگر کہیں جنبش ہو رہی ہو تو اس کے تھامنے کا طریقہ یہ ہوتا ہے کہ ایک رسی لٹکا لی جاتی ہے ایک ہاتھ اس میں رکھا جاتا ہے۔ اسے تھامیے حبل اللہ، خدا کی اس کتاب کو اس کو مضبوطی سے تھامیے۔ جَمِيْعًا (3:103) کے معنی ہیں اجتماعی طور پر، یہ انفرادی چیز نہیں ہے۔ اجتماعی طور پر سب کے سب مل کے۔ اور اس کے بعد وارن کر دیا وَ لَا تَفَرَّقُوْا (3:103) ٹکڑوں میں نہ بٹ جاؤ۔

خدا تعالیٰ کا دین نہ تو مذہبی فرقوں کے وجود کو تسلیم کرتا ہے اور نہ ہی سیکولرازم کو

میں ابھی قرآنِ کریم کی چند آیات آپ کے سامنے پیش کرنا چاہتا ہوں یہ تفرقے کی صورت میں۔ لیکن میں پہلے یہ چیز واضح کر دوں کہ ہمارے ہاں ان چیزوں کو سامنے لایا جاتا ہے تو مذہبی فرقوں کے متعلق ہی کہا جاتا ہے۔ مذہبوں میں جو فرقے پیدا ہو گئے ہیں، یہ نہیں ہونے چاہیے۔ ٹھیک ہے لیکن دین تو صرف مذہبی فرقے یا مذہبی اجتماع کا نام نہیں ہے۔ مذہب کے اندر یہ فرقے نہ بھی رہیں سارے کے سارے بھی ایک ہی مذہب کے بھی ہو جائیں تو پھر بھی وہ دین نہیں رہتا۔ دین تو زندگی کو مذہب میں اور سیکولرازم میں تقسیم ہی نہیں کرتا۔ اس لیے قرآن نے اگر تفرقے سے، اختلاف سے منع کیا ہے، اس کو شرک اور کفر قرار دیا ہے تو وہ یہ نہیں ہے کہ مذہبی فرقہ بندی ہے، وہ تو شرک اور کفر ہے اور سیاسی پارٹی بازیاں جو ہیں یہ عینِ دین ہیں۔ تفرقہ تفرقہ ہے۔ اور یہ مذہبی فرقہ بندیاں جو ہیں ان میں تو سر پھٹول کا یا اس شدت کا دور ہی ختم ہو گیا ہے اب تو اس کی ساری جگہ آپ کے ہاں سیاسی تفرقے

نے اور سیاسی فرقہ بندیوں نے لے لی ہے۔ اور یہ جو دین کے نام کے اوپر آپ کو بلا رہے ہیں اس سیاست کی طرف 478آلِ عمران

قرآنِ حکیم تو اُمت کے کسی سیاسی اجتماع میں بھی اپوزیشن کی شکل کو برداشت نہیں کرتا

میں نے ابھی عرض کیا ہے کہ مذہبی فرقوں کے متعلق تو آپ کے ہاں یہ شق موجود ہے کہ یہاں ہر فرقے کو آئینی طور پر تسلیم کیا جائے گا۔ اور پارٹیاں تو ساری آپ کے سامنے بنی ہوئی ہیں حتیٰ کہ یہ جو منشور ان کا آیا ہے اس میں یہ چیز ہے کہ اسمبلی کے اندر بھی دوسروں کی پارٹی سے اپنی پارٹی الگ بنائی جائے گی۔ اور پھر جمہوری نظام میں تو آپ کو پتا ہے کہ اپوزیشن کے بغیر وہ کہتے ہیں کہ جمہوری نظام ہی نہیں چل سکتا یعنی امت کی ایک اجتماع بھی اگر لے لیں' اسمبلیوں میں پہنچ کے اس میں ایک حصہ جو ہے وہ تو اِدھر کا ہوگا اور ایک آدھا حصہ اس میں سے یا ایک جماعت' اس میں سے اپوزیشن کی ہونی ضروری ہے۔ کہتے ہیں اس کے بغیر جمہوریت چل نہیں سکتی۔ یعنی مستقل طور پر اس نظامِ جمہوری میں دو پارٹیاں تو وہ کم از کم ضرور رکھتے ہیں ناں یعنی اس امت میں اپوزیشن۔ عزیزانِ من! قرآن نے تو دو پارٹیاں کہی ہیں حزب اللہ اور حزب الشیطان۔ وہاں تو یہ ساری ایک پارٹی تھی حزب اللہ اور اس کے مقابلے میں دوسری اپوزیشن کی پارٹی اس کو ابوجہل لیڈ کرتا تھا۔ امت کے اندر ایک پارٹی اپوزیشن کی یعنی ایک پارٹی تو دین کے مطابق نظام بنانے کی داعی ہے اور اسی میں سے ایک پارٹی جو ہے وہ اس کی اپوزیشن کر رہی ہے۔ جمہوریت عینِ اسلام ہے۔ کیا بتائیں یہ کہاں لیے جا رہے ہیں اسلام کو؟ وَلَاتَفَرَّقُوْا (3:103) یہ تفرقہ مذہبی فرقہ بندیاں ہی نہیں ہیں یہ بھی ہیں' اس میں شامل' کسی قسم کا تفرقہ بھی جو ہے امت کے اندر قرآن کی رو سے اب دیکھیے کیا ہے وہ؟ (30:30-31) وہ آیہ جس کو میں اکثر دہرایا کرتا ہوں۔ مُنِيْبِيْنَ اِلَيْهِ وَاتَّقُوْهُ وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَلَا تَكُوْنُوْا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ (30:31) اپنی انابت الی اللہ' رخ اپنا اسی کی طرف رکھو۔ یہ چیز تو بڑی اور تشریح طلب ہے اَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ (30:31) کہ اس کا ذریعہ اقامتِ صلٰوۃ ہوگی۔

اقامتِ صلٰوۃ کا تو بنیادی مقصد ہی ہر قسم کی مذہبی اور سیاسی فرقہ بندی کو ختم کرنا تھا

وہ صلٰوۃ کہ جس کو قرآن نے یہ کہا تھا کہ شرک کا فتنہ یا تفرقہ یا فرقہ بندی مٹانے کے لیے اقامتِ صلٰوۃ ہے' آج فرقوں کی نشانی نماز ہے۔ انارکلی میں لوگ پھر رہے ہوں آپ کو کچھ نہیں پتا چلتا یہ حنفی ہے' یہ اہلِ حدیث ہے' یا بریلوی ہے' یا شیعہ ہے بالکل نہیں۔ جونہی اللہ اکبر کی اذان ہوئی اور جھٹ آپ نے پہچان لیا کہ اچھا یہ ادھر گیا ہے وہاں گیا ہے صاحب یہ' یہ اس طرح نماز پڑھتا ہے' اکیلے بھی کھڑا ہوگا تو آپ دیکھ لیں گے نماز پڑھنے سے کہ اچھا یہ حنفی واقع ہوئے ہیں۔ قرآن نے یہاں کہا تھا کہ فرقہ

بندی کے شرک سے بچنے کے لیے اقامتِ صلوٰۃ کرو۔ یہاں فرقہ بندی کی پہچان آپ کے ہاں صلوٰۃ ہوگئی ہے۔ وَ لَا تَكُوْنُوْا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ (30:31) مشرکین میں سے نہ ہوجانا۔ عزیزانِ من! سوچیے یہ چیز، ان سے کبھی پوچھیے جا کے کہ یہ کیا کہیں گے قرآن کی ان آیتوں کو۔ مشرکین میں سے نہ ہوجانا یعنی مِنَ الَّذِيْنَ فَرَّقُوْا دِيْنَهُمْ وَ كَانُوْا شِيَعًا (30:32) جنھوں نے دین میں تفرقے پیدا کرلیے، فرقے پیدا کرلیے، پارٹیاں بنالیں وَ كَانُوْا شِيَعًا (30:32) خود ایک پارٹی بن گئے۔ كُلُّ حِزْبٍۢ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُوْنَ (30:32) اور پھر ہر پارٹی کا سلوگن یہ ہے صاحب ہمیں ووٹ دیجیے، ہم حق کے اوپر ہیں۔ یہ باقی سب باطل کے اوپر ہیں كُلُّ حِزْبٍۢ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُوْنَ (30:32) ہر پارٹی یہ کہے گی اس کے بعد۔ قرآن نے تو پارٹی بنانے کو ہی شرک قرار دیا ہے۔ تو جو شرک کی دعوت دیتی ہے تو اس میں کوئی ایک بھی جو ہے وہ جنت کی طرف کیسے بلائے گی آپ کو؟ عزیزانِ من! غور کیجیے گا دین کی طرف دعوت دینے والوں کے اس مسلک کو۔ آپ نے غور فرمالیا کہ یہاں قرآنِ کریم نے اس کو شرک قرار دیا ہے امت میں تفرقے کو، خواہ وہ مذہبی لیول کے اوپر ہو یا سیاست کے اندر آپ کے ہاں ہو۔ نبی اکرم ﷺ سے فرمایا۔ عزیزانِ من! غور سے سنیے دعویٰ یہ ہے ہر فرقہ کہتا ہے کہ وہ جو تم تلاش کررہے ہو وَ فِيْكُمْ رَسُوْلُهٗ (3:103) ہمارے اندر ہے وہ رسول۔ کہا ہے کہ اِنَّ الَّذِيْنَ فَرَّقُوْا دِيْنَهُمْ وَ كَانُوْا شِيَعًا (6:160) وہ لوگ جو دین میں پارٹیاں بنالیں فرقے بنالیں وَ كَانُوْا شِيَعًا (6:160) اور خود بھی ایک پارٹی بن جائیں لَسْتَ مِنْهُمْ فِيْ شَيْءٍ (6:160) اے رسول ﷺ تمہارا ان سے کوئی واسطہ نہیں ہے۔ خدا سے واسطہ کٹ گیا کہ مشرک ہوگئے اس کے رسول ﷺ سے واسطہ کٹ گیا قرآن کی اس نصِ صریح کے مطابق۔ پھر ان سے یہ کہا اسی سورۃ آلِ عمران کی دو ہی آیتیں آگے خود اس جماعتِ مؤمنین سے کہا ہے وَ لَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ تَفَرَّقُوْا وَ اخْتَلَفُوْا (3:105) ان میں سے نہ ہوجانا کہ جو پارٹیوں میں بٹ جائیں جو فرقوں میں بٹ جائیں جو افتراق پیدا کرلیں۔ کیسے یہ ہوتا ہے؟ وَ اخْتَلَفُوْا (3:105) اختلاف پیدا کرلیں آپس میں۔

قرآنِ حکیم کی واضح، لاریب، نور، سہل اور آسان تعلیم میں اختلاف کی تو کوئی گنجائش ہی نہیں ہے

عزیزانِ من! تفرقہ تو ایک طرف یہاں تو اختلاف بھی نہیں پیدا ہوسکتا۔ کیوں؟ مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَهُمُ الْبَيِّنٰتُ (3:105) اتنی واضح تعلیم آنے کے بعد اختلاف کی گنجائش کہاں ہوتی ہے۔ ایسی واضح تعلیم آجانے کے بعد یاد رکھو! کہیں پارٹیاں نہ بنا

لینا' فرقے نہ بنالینا' اختلاف نہ پیدا کرنا۔ اس لیے کہ جو ایسا کرتے ہیں اُولٰٓئِکَ لَھُمْ عَذَابٌ عَظِیْمٌ ((3:105 بہت بڑی عذاب میں مبتلا ہوتی ہے قوم وہ جو ایسا کر لیتا ہے۔ عذابِ عظیم کی تفسیر کے لیے ہمیں کہیں اور تو نہیں جانا پڑے گا ان فرقوں کی وجہ سے پہلے جو ہوتا ہے' اب جو پارٹیوں کی وجہ سے ہوتا ہے' ساری قوم عذابِ عظیم میں مبتلا ہے یا نہیں؟ اتنے خطے میں دیکھ لو اور پورے عالمِ اسلامی میں آپ دیکھیے' سارا عالمِ اسلام آپ کا عذابِ عظیم کے اندر مبتلا ہے یا نہیں؟ وَ اخْتَلَفُوْا (3:105) اختلاف کو قرآن نے عذابِ عظیم کا موجب بتایا ہے۔ قرآن یہ رسول اللہ ﷺ سے کہتا ہے کہ تفرقہ پیدا کرنے والوں سے تیرا کوئی واسطہ نہیں ہے (6:160)۔ اور رسول اللہ ﷺ کی یہ حدیث بیان کرتے ہیں کہ ''اختلاف امتی رحمۃ'' یعنی باقیوں کا اختلاف جو تھا وہ تو ہے عذاب وغیرہ جو ہے میری قوم کے اندر سر پھٹول اور یہ فرقے اور اختلاف جو ہے' رحمت ہے خدا کی۔ مجھے یاد آ گیا یہاں کہ یہ احمدی حضرات سے مخالفت کرنے والوں نے ایک جگہ لکھا کہ اور تو اور تم نے ایک نیا فرقہ پیدا کر کے ایک نیا نبی لا کر امت میں اختلاف پیدا کر دیا۔ یہ الزام دیا کہ اور تو باتیں چھوڑیے تم نے امت میں اختلاف پیدا کر دیا۔ الفضل نے اس کے جواب میں یہ لکھا تھا کہ ہمارا شکریہ ادا کرو ہم نے تو رحمت کا ایک اور دروازہ کھول دیا ہے۔ یہ رسول اللہ ﷺ کی حدیث ہے۔ تم بتایا کرتے ہو۔

فرقہ بندی کے مرض کی وجہ' جواز ایک دوسرے سے بڑھ جانے کی ہوس ہے (42:14)

وَ اخْتَلَفُوْا مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَھُمُ الْبَیِّنٰتُ ((3:105 اختلاف ہوتا کیوں ہے یہ؟ یہ جتنی پارٹیاں آج کل جو کچھ یہ کر رہی ہیں آپ کو معلوم ہے ان کا مقصود کیا ہے؟ کہ اس ووٹنگ میں دوسروں سے بڑھ جائیں ہم' ان کو اگر پچاس ملیں' ہمیں ساٹھ ملیں یہ ہے نا اس کے اندر سمٹ سمٹا کے ساری بات یہاں آ جاتی ہے نا کہ ہم ان سے آگے بڑھ جائیں۔ ایک دوسرے سے بڑھ جانے کی یہ جو ہوس ہے' یہ ہے جس کی وجہ سے یہ ساری پارٹیاں یہ بنتی ہیں۔ قرآن کہتا ہے وَمَا تَفَرَّقُوْٓا اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَھُمُ الْعِلْمُ ((42:14 اتنا بڑا العلم آ جانے کے بعد جو آپس میں یہ پارٹی بازیاں ہوتی ہیں' یہ اس طرح سے تفرقے ہوتے ہیں یہ فرقے ہوتے ہیں' کیوں ہوتے ہیں؟ بَغْیًاۢ بَیْنَھُمْ ((42:14 ہر پارٹی چاہتی ہے دوسروں سے آگے بڑھ جائیں' ہم دوسروں کے اوپر چڑھ جائیں۔ وہ وہاں جو اقتدار جن کے ہاتھ میں آئے گا' حکومت جو بنائیں گے وہ ہے اسی لیے نا کہ اقتدار ہمارے ہاتھ میں ہو' دوسرے ہمارے محکوم ہو جائیں بَغْیًاۢ بَیْنَھُمْ (42:14) دوسروں کے اوپر چڑھ دوڑنے کا جذبہ' اس لیے یہ پارٹیاں بنتی ہیں قرآن کہتا ہے۔ وَ اعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰہِ جَمِیْعًا وَّ لَا تَفَرَّقُوْا) (3:103 فرقوں کے اندر نہ بٹ جانا۔

الصراط المستقیم جیسی عظیم نعمت کی نوعیت اور لفظ عدو اور پھر لفظ الفت کا لغوی مفہوم 478آلِ عمران

دیکھیے قرآنِ کریم کی ہر رکعت میں سورۃ الحمد کی تلاوت ہوتی ہے اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ O صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ (1:6-7) دعا مانگی جاتی ہے ہمیں سیدھا راستہ دکھا ان لوگوں کا راستہ کہ جن پر تیری نعمت ہوئی۔ سنیے کہ یہ نعمت کیا ہے؟ خدا خود یہ بتا تا ہے انہیں کہ وَ اذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ (3:103) خدا کی اس نعمت کو یاد کرو اپنے سامنے لاؤ۔ عزیزانِ من! سنیے نعمتِ خداوندی کیا گنائی گئی ہے' خود خدا کہنے والا ہے۔ یہ ہماری تشریح یا ہماری تفسیر نہیں ہے۔ خدا کی اس نعمت کو یاد کرو اِذْ كُنْتُمْ اَعْدَآءً (3:103) تم ایک دوسرے کے دشمن تھے۔ لفظی ترجمہ دشمن ہوتا ہے عدوۃً کہتے ہیں یہ ایک لکڑی ہوتی ہے اس کو اگر آپ نے دو ٹکڑے کرنا ہو تو شروع میں ذرا سا اس میں شگاف دے کے اس کے اندر ایک پھانا لگا دیتے ہیں WEDGE جسے کہتے ہیں۔ وہ WEDGE ہوتی اس لیے ہے کہ یہ دو چیزیں جو ہیں آپس میں مل نہ جائیں کہیں' خود ان کے اندر مل جانے کی صلاحیت ہوتی ہے' تڑپ بھی ہوتی ہے لیکن کوئی ایک چیز فوراً اس میں داخل کر دی جاتی ہے جو ان کو ملنے نہیں دیتی آپس میں۔ اس کو کہتے ہیں عدوۃ۔ کہتا ہے تمہاری کیفیت تو یہ تھی کہ تمہارے اندر انفرادی مفاد پرستیوں کی اس قسم کی ذہنیت کی یہ WEDGES تھیں' تمہیں ملنے نہیں دیتی تھیں۔ فَاَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِكُمْ (3:103) اس نے تمہارے دلوں کے اندر ایک دوسرے کی الفت ڈال دی۔

قرآنِ حکیم کی پیش کردہ آئیڈیالوجی کے بغیر کوئی معاشرہ بھی الفت کے ثمرات سے لطف اندوز ہو ہی نہیں سکتا

اب دیکھیے یہ جو اتحاد جسے آپ کہتے ہیں۔ ایک امت بنانا جسے کہتے ہیں۔ اس کی بنیاد قرآن نے کیا دی ہے؟ دلوں کے اندر باہمی الفت۔ اور یہ الفت کا لفظ قرآن نے بھی استعمال کیا ہے دوسری جگہ' عربی زبان میں بھی یہ ایک بادل کا ٹکڑا جس طرح دوسرے بادل میں آ کے مدغم ہو جاتا ہے مل جاتا ہے' تا اس کے لیے یہ لفظ بولتے ہیں۔ تا کس نہ گوید بعد ازیں من دیگرم تو دیگری۔ اس کے بعد وہ اپنی ہستی کو ایک دوسرے میں جذب کر دیتے ہیں' پہچانے ہی نہیں جاتے کہ ان میں سے پہلا بادل کون سا تھا اور دوسرا بادل کون سا ہے۔ قلوب کو اس طرح سے ملا دیتا ہے۔ یہ کیا چیز ملاتی ہے؟ آئیڈیالوجی کا اشتراک' ایمان کا اشتراک۔ قرآن نے کہا ہے کہ اجتماع کی ایک اور بھی شکل ہوا کرتی ہے اور وہ شکل بتائی ہے اہلِ کتاب کی کہ تَحْسَبُهُمْ جَمِيْعًا وَّ قُلُوْبُهُمْ

شَتّٰی ط((59:14 کہ دیکھنے میں تو نظر آئیں گے وہ کہ ایک جماعت ہے' ایک اجتماع ہے' ایک گروہ ہے' ایک اندوہ ہے'
وَّ قُلُوْبُھُمْ شَتّٰی ط(59:14) مل کے سب بیٹھے ہوئے ہیں' دل ایک دوسرے سے الگ الگ ہیں۔ کہا یہ اجتماع ہے ان لوگوں کا جو دین چھوڑ دیتے ہیں۔ یہ دوسرا اجتماع ہے فَاَلَّفَ بَیْنَ قُلُوْبِکُمْ (3:103)۔ نتیجہ اس کا کیا ہوا؟ فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِہٖٓ اِخْوَانًا ج((3:103 خدا کی اس نعمت کی وجہ سے تم پھر ایک دوسرے کے بھائی بن گئے۔

لفظ اخوان کا لغوی مفہوم اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا فرمان

یہ اخوان جو ہے ترجمہ تو اس کا بھائی ہوتا ہے۔ یہ جتنے بیل ایک رسی سے باندھ کے ان کو وہ جو ایک کھرلی ہوتی ہے' اس میں اکٹھا چارہ ڈال دیتے ہیں اور وہ آپ نے دیکھا ہوگا گاؤں میں۔ یہ مویشیوں کو باندھتے ہیں ایک رسی کے ساتھ اور وہ اس کے گرد ہوتے ہیں یہ سارے اکٹھا وہاں سے اپنا چارہ چرتے ہیں' یہ جو ہیں حلقہ ان کو اخوان کہتے ہیں ایک دوسرے کے۔ اشتراک ہوتا ہے ان کے ہاں متاعِ حیات کا اور یہی تھا وہ اخوان کی کیفیت جو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اس روایت میں ہمیں ملتی ہے کہ حضرت موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ نے یہ کہا کہ قبیلہَ اشعری ہمارے ہاں تھا جاہلیت کے اندر' ان کی کیفیت یہ تھی کہ جب بھی کبھی ضرورت پڑتی' خوراک کی کمی ہوجاتی تو وہ سب اپنے اپنے گھروں سے سارے خوراک لا کر ایک دسترخوان کے اوپر جمع کر دیتے اور سارے قبیلے والے وہاں سے حصہ لے لیتے' یہ ان کے ہاں کا معمول تھا۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ میں بھی اشعریوں میں سے ہوں اس لیے کہ میں امت میں اخوت پیدا کرنے کے لیے آیا ہوں۔ آپ نے سمجھ لیا' اخوان کے معنی کیا ہوتے ہیں۔ فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِہٖٓ اِخْوَانًا ج((3:103 اور یہی وجہ ہے کہ علامہ اقبال رحمہ اللہ نے یہاں اس آیت میں بِنِعْمَتِہٖٓ(3:103) کے معنی انہوں نے کہا ہی ہے معاشی نظام۔ اس کی بنیاد یہ ہے جو میں کہہ رہا ہوں۔ بہر حال کوئی بھی نظام ہو' خدا کی کتاب کی بنا پر جو ایک وحدت پیدا ہوتی ہے' اس سے دلوں میں باہمی الفت پیدا ہوجاتی ہے' اسے خدا نے نعمت قرار دیا ہے کہا ہے کہ اسے یاد کرو تم۔ وَ کُنْتُمْ عَلٰی شَفَا حُفْرَۃٍ مِّنَ النَّارِ ((3:103 کیا خوبصورت تشبیہ ہے؟

جہنم کے کنارے سے واپس جنتِ ارضی کی طرف لوٹ آنے کی نوید

کہا کہ تم جہنم کے کنارے تک پہنچ ہی چکے ہوئے تھے' بالکل گرنے والے تھے فَاَنْقَذَکُمْ مِّنْھَا ط((3:103 خدا وہاں سے تمہیں بچا کے پیچھے لے آیا۔ کس طرح سے لے آیا؟ تمہارے اختلاف کو اتفاق میں بدل دیا' تمہارے انتشار کو اتحاد میں بدل

دیا' تمہاری عداوتوں کو اخوتوں میں بدل دیا' تمہاری انفرادیت کو ایک اجتماعیت میں مدغم کر دیا اور اس طرح سے تم اس آگ کے کنارے پہ پہنچے ہوئے تھے گرنے والے تھے کہ وہاں سے بچا لیا خدا نے۔ وَاذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ (3:103) خدا کی اس نعمت کو یاد کرو۔ دعائیں مانگ رہے ہیں صاحب صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ (1:7)۔ نماز میں کھڑے ہیں قبلہ رو باوضو مسجد میں اور وہ جو ساتھ کھڑا ہے نا ذہن میں یہ ہے کہ اچھا ابھی اس کے بعد وہ مقدمے میں آواز پڑنے والی ہے وہاں جا کے ''سچ لاں گا تینوں جو کچھ توں کرن ڈیا ہیں''۔ دعائیں مانگ رہے ہیں اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ (1:7) کی۔ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اٰيٰتِهٖ (3:103) بات تو واضح ہوتی ہے مثالیں دے کے کہتا ہے قرآن کہ اس طرح سے ہم بات بالکل نکھار کر ابھار کر بیان کر دیتے ہیں لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ (3:103) تاکہ تم صحیح راستے پہ چلتے جاؤ۔ عزیزانِ من! ان آیات میں کہیں کوئی مطالب کا شبہ' کوئی التباس' کوئی ابہام کوئی چیز وضاحت طلب؟ کتنی واضح چیزیں ہیں۔ اس قرآن کی موجودگی میں آپ کے ہاں یہ اتنے مذہبی فرقے پہلے' اتنی سیاسی پارٹیاں آپ کے ہاں' ایک فرد دوسرے فرد کا دشمن یہ کیفیت۔ قرآن نے تو اس کا علاج ایک ہی بتایا تھا وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ (3:103) خدا کی کتاب کی طرف آ ؤ اور اپنا اجتماعی نظام اس کے مطابق قائم کر لو وہی کیفیت پھر پیدا ہو جائے گی۔

قرآنِ حکیم کے غلط تراجم نے کتاب اللہ کی پوری تعلیم کو ہی بدل کر رکھ دیا ہے

اگلی آیت پھر غور طلب ہے۔ شاید چند منٹ مجھے اوپر لینے پڑ جائیں بڑی اہم آیت اور سامنے ہمارے آتی ہے اس کی وجہ سے بھی بہت بڑا مغالطہ دیا جاتا ہے۔ کہا کہ وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ وَيَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ ؕ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ (3:104) عام ترجمہ کیا جاتا ہے کہ تم میں ایک گروہ ایسا ہونا چاہیے (یہ سن لیجیے گا اور یہ سب سے بڑا گمراہ کن ترجمہ بھی ہے' اسی پہ بنیاد ہے ان لوگوں کی) جو لوگوں کو بھلائی کی طرف بلاتا رہے' معروف کا حکم دے منکر سے روکے اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ (3:104) یہی لوگ ہیں جو نجات یافتہ کامیاب فائز المرام ہیں۔ اس ترجمے کے بعد یہ آپ کے مذہبی پیشوا' یہ مولوی حضرات یہ کہتے ہیں کہ قرآن میں لکھا ہوا ہے کہ تم میں ایک جماعت ایسی ہونی چاہیے کہ لوگوں کو بھلائی کی طرف بلائے' امر بالمعروف ونھی عن المنکر کرے' دیکھیے قرآن میں لکھا ہوا ہے' ساری قوم میں ایک گروہ ایسا ہونا چاہیے وہ گروہ تو ہم ہیں۔ آپ دیکھیے گا کہ کس طرح سے یہ التباس کیا جاتا ہے۔ ایک گروہ ایسا ہونا چاہیے۔

بھلائی کی طرف بلانے اور منکر سے روکنے

آیئے پہلے قرآن سے پوچھیں وہ کیا کہتا ہے؟ كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَ تَنْهَوْنَ عَنِ

الْمُنْكَرِ ((3:110 تم تمام مسلمان تمام مومنین سارے کے سارے تم تمام ایک امت ہو جو لوگوں کی بھلائی کے لیے پیدا کی 478 **آلِ عمران** ہے۔تمہارا کام امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ہے۔ كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ (3:110) یہ ساری امت کے لیے ہے یہ تو۔ یہ جو ہے امر بالمعروف و نہی عن المنکر پہلے تو اس کو سمجھ لیجیے۔امر کے معنی تو حکم دینا ہوتا ہے' نہی کے معنی روک دینا ہوتا ہے۔ یہ فریضہ ایسا ہے کہ حکم دیا جائے گا معروف کا' روکا جائے گا دوسرے کو ایسی چیز سے جو منکر ہے۔معروف کی اور منکر کی تشریح میں نہ جایئے' قرآن آجائے گا۔ یہ سمجھیے اس کا لفظی ترجمہ اور مفہوم یہ ہے ہر چیز جسے قرآن RECOGNIZE کرے صحیح' معروف کے معنی RECOGNIZE ہوتا ہے' جسے وہ صحیح تسلیم کرتا ہے۔ یہ امت اس لیے بنائی گئی ہے کہ یہ حکم دے گی اس کا اور جس چیز کو وہ صحیح تسلیم نہیں کرتا' اس سے یہ روکے گی دوسروں کو۔حکم دینے اور روکنے کے لیے تو آپ جانتے ہیں کہ آپ کے لیے مملکت کی قوت کی ضرورت ہوتی ہے' یہ قانون کے ذریعے ہوسکتا ہے۔

وعظ کرنے والا صرف وعظ تک ہی محدود ہوتا ہے' وہ حکم نہیں دے سکتا

جیسا میں نے پہلے بھی کہا تھا' وعظ کے ذریعے سے تو یہ چیز نہیں ہوسکتی۔وعظ کے ذریعے آپ کسی کو حکم دے ہی نہیں سکتے۔ میں نے کہا ہے نا ہر واعظ وعظ کے بعد'' للاں لین ڈیا ہونداا ے اوئے بندے پتر بنو اوئے سچ بولیا کرو' اوئے جھوٹ نہ بولیا کرو دیکھونئیں تے قبر وچ مار مار کے ہڈیاں تہاڈیاں توڑ دین گے فیر تہانوں حلوہ ساہنوں دینا پئے گا تا کہ لتریاں بنو تے تہاڈے سیک لگے اوتھے'' ہر واعظ یہ کرتا ہے وہ حکم نہیں دے سکتا' وہ روک نہیں سکتا کسی کو۔اور یہ چیز جو ہے کہ یہ حکم دینا جو ہے یہ وعظ نہیں ہے۔ بڑی غور طلب چیزیں ہیں۔سب سے پہلے نبی اکرم ﷺ کے متعلق قرآنِ کریم نے یہ کہا نبیٔ اُمی کے متعلق کہا وَ يُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْخَبٰٓئِثَ وَ يَضَعُ عَنْهُمْ اِصْرَهُمْ وَ الْاَغْلٰلَ الَّتِيْ كَانَتْ عَلَيْهِمْ ط((7:157 اور اس کے پہلے ہے يَاْمُرُهُمْ بِالْمَعْرُوْفِ وَ يَنْهٰهُمْ عَنِ الْمُنْكَرِ ((7:157 فریضہ پہلے رسول اللہ ﷺ کا فریضہ یہ معروف کا حکم دینے کے لیے آیا ہے' منکر سے روکنے کے لیے یہ آیا ہے۔اب یہ چیز ہوگی کیسے؟ امت سے کہا ہے نا کہ یہ امت پوری کی پوری اس مقصد کے لیے تیار کی گئی ہے' اٹھائی گئی ہے' بنائی گئی ہے کہ یہ معروف کا حکم دے گی' منکر سے روکے گی۔((22:42 بڑی اہم آیت ہے اس بات کو سمجھنے کے لیے کہ میں نے جو کہا ہے نا کہ یہ امر بالمعروف ہے' یہ نہی عن المنکر ہے' وہ قوت ہے وہ اقتدار ہے آپ کے پاس جس سے آپ ایک چیز قرآن کی حکماً منوائیں دوسرے سے۔اور جو خلافِ قرآن بات جاتی ہے حکماً اس کو منع کرسکیں۔قرآن کہتا ہے یہی یہ چیز ہے مومن کے لیے اس امت کے لیے کہا اَلَّذِيْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِي الْاَرْضِ ((22:41 یہ وہ جماعت امت ہے' جب انہیں مملکت ملے گی' جب انہیں تمکن حاصل ہوگا' جب یہ برسرِ اقتدار آئیں گے اس وقت کیا چیز کریں گے؟ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَ اٰتَوُا

الزَّکٰوۃَ ((22:41اس کو تو ابھی چھوڑ دیجیے۔

تمکن فی الارض کی اہمیت اور پوری ملت کا فریضہ

میں بات یہ کہہ رہا ہوں کہ جب انہیں تمکن عطا ہوگا اقتدار ملے گا' مملکت ملے گی اَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَ نَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ ط((22:42 یہ امر بالمعروف کریں گے' نہی عن المنکر کریں گے۔مشروط ہوگیا امر بالمعروف نہی عن المنکر تمکن فی الارض سے لہٰذا وعظ نہ رہا۔ اور یہ یہاں آپ دیکھیے کہ فریضہ جو ہے کسی ایک گروہ کا نہیں پوری امت ہے۔اَلَّذِيْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِي الْاَرْضِ (22:41) یہ امت یہ جماعتِ مؤمنین یہ وہ ہیں کہ جب انہیں تمکن حاصل عطا ہوگا یہ یہ کریں گے۔دو باتیں واضح ہوگئیں ایک تو یہ کہ مسلمانوں کی حکومت کسی ایک گروہ کی حکومت نہیں ہوگی' یہاں تمکن فی الارض کسی ایک فرد کو نہیں مل سکتا' کسی ایک گروہ کو نہیں مل سکتا' پوری امت کو ملے گا۔لہٰذا وہ نظام قرآنی ہوگا جس میں تمکن فی الارض کے اندر پوری امت شریک ہو۔دوسری چیز یہ ثابت ہوگئی یہاں سے کہ امر بالمعروف نہی عن المنکر وعظ کا نام نہیں ہے اس کے لیے تمکن فی الارض جو ہے یہ بنیادی شرط ہے۔تو جب یہ تمکن فی الارض بنیادی شرط ہے تو مذہبی پیشوائیت کا کہنا کہ یہ ہمارے ذمے یہ فریضہ ہے' باقی امت میں ہم یہ ادا کررہے ہیں وہ کیسے ادا کررہے ہیں؟ یعنی انہیں تمکن فی الارض عطا کہاں ہوتا ہے؟ ''اے تے اپنی روٹی توں وی محتاج ہوندے نیں دوسریاں دے''۔یہ دوسری چیز ہمارے سامنے آ گئی تمکن فی الارض۔وہاں امت تھا اور دیکھیے قرآن کیا کہتا ہے؟ اس فریضے میں میں نے عرض کیا ہے کہ ساری امت داخل ہے۔اس امت کے اندر مسلمان مومن مرد اور عورتیں دونوں شریک ہیں۔غور فرمایئے گا بڑی غور طلب آیت ہے۔وَ الْمُؤْمِنُوْنَ وَ الْمُؤْمِنٰتُ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ م((9:71 مومن مرد مومن عورتیں ایک دوسرے کی سپورٹ کا موجب ہوتی ہیں۔يَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَ يَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ (9:71) یہ معروف کا حکم دیتے ہیں منکر سے روکتے ہیں۔وہاں امت کہا تھا یہاں امت کے اندر تصریح کردی کہ امت کے اندر بھی ایک گروہ یا مذہبی پیشوائیت یا ایک حکمران پارٹی تو ایک طرف رہی' پوری امت کے اندر مرد اور عورت دونوں شریک ہیں اس میں۔یہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کریں گے۔اسی سورۃ توبہ میں صفات بتائی گئی ہیں مؤمنین کی کہ جس میں مرد اور عورت دونوں شامل ہیں۔اَلتَّآئِبُوْنَ الْعٰبِدُوْنَ الْحٰمِدُوْنَ السَّآئِحُوْنَ الرّٰكِعُوْنَ السّٰجِدُوْنَ (9:112) کیا بات ہے صاحب؟ کس طرح ایک آبِ رواں کی طرح تسلسل چلا آ رہا ہے اور بات یہ ہے الْاٰمِرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَ النَّاهُوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ (9:112) یہ ہیں جو امر بالمعروف نہی عن المنکر ہیں۔

قرآنِ حکیم خود کو کسی ایک مخصوص گروہ تک محدود نہیں رکھتا

میرے کہنے کا مطلب یہ تھا کہ آپ پوری آیات قرآن کی دیکھ لیں۔اس میں امر بالمعروف نہی عن المنکر کے لیے حکومت اقتدار اور مملکت بنیادی شرط ہے۔ یہ فریضہ پوری کی پوری امت کا ہے۔ یہ چیز قانون کی رو سے کی جائے گی' وعظ ونصیحت کی بات یہاں نہیں ہے۔ساری امت کے اشتراک سے ایک نظام قائم ہوگا حکومت کا جس میں مرد اور عورت شامل ہوں گے ان کا فریضہ یہ ہوگا کہ جس چیز کو قرآن صحیح قرار دیتا ہے' اسے نافذ کرے' جس کو وہ غلط کہتا ہے اس سے بذریعہ قانون روکے۔اب ان قرآن کی آیات کے بعد یہ کہنا کہ نہیں صاحب قرآن یہ چاہتا ہے اس امت میں ایک گروہ ایسا صرف ہونا چاہیے جس کا یہ فریضہ ہو کہ وہ امر بالمعروف نہی عن المنکر کرے اور اس کے معنی ہیں وہ وعظ ونصیحت کرے' تبلیغِ دین کرے۔ یہ مسلک جو ہے قرآن کی ساری تعلیم کے ہی خلاف ہے یا نہیں؟ اور پھر اس کے بعد قرآن تو یہ کہتا ہے وَاُولٰٓئِکَ ھُمُ الْمُفْلِحُوْنَ (3:104) بس یہی لوگ ہیں جو نجات یافتہ ہوں''یعنی باقی ساری امت جہنم اچ تری جائے گی''۔قرآن نے تو پہلے ہی سورۃ بقرہ میں یہ کہا ہے ساری امت کے لیے کہ جتنے لوگ بھی یہ ایمان لانے والے ہوں گے ان کے متعلق یہ کہا ہے اُولٰٓئِکَ عَلٰی ھُدًی مِّنْ رَّبِّھِمْ ق وَ اُولٰٓئِکَ ھُمُ الْمُفْلِحُوْنَ (2:5) یہ تو پوری امت کے متعلق بات ہو رہی ہے۔

قرآنِ حکیم میں لفظ منکم کے استعمال کی وضاحت

اب یہاں یہ بات ہوگی کہ صاحب! وَلْتَکُنْ مِّنْکُم) (3:104 جو ہے یہ ہے۔عربی جاننے والے احباب ذرا اس کو غور سے سنیں گے۔ یہاں سے وہ لیتے ہیں منکم تم میں سے اور یہیں وہ مغالطہ دیتے ہیں ان لوگوں کو جو عربی نہیں جانتے۔عربی زبان میں یہ ٹھیک ہے مِن کے معنی یہ بھی ہوتے ہیں یعنی تکنیک جو ہے گرامر کی یا TECHNICAL TERM جو ہے اس میں کہتے ہیں تبعیض یعنی منکم کے معنی ''ان میں سے'' جسے ہم کہتے ہیں ٹھیک ہے اور عربی زبان میں ہی مِن جو ہے وہ دوسرا لفظ اس کے لیے ہوتا ہے تبعیض' ایک بات پہ جب زور دینا ہو پوری کی پوری چیز مقصود ہو اور اس پہ زور دینا ہو' وہاں بھی عرب مِن استعمال کرتے ہیں۔اسے کہتے ہیں مِن تبیین کے لیے آتا ہے۔ یہ ان کے ہاں کا مسلمہ قاعدہ ہے اور قرآنِ کریم میں اس کی بے شمار مثالیں موجود ہیں۔ میں دو ایک چیزیں پیش کرتا ہوں اسے اچھی طرح سے سن رکھیے کیوں کہ اس آیت کی بنا پہ بڑا ہی مغالطہ دیا جاتا ہے۔مِن کے معنی میں سے نہیں' مِن کے معنی وہ پورے کا پورا۔لَقَدْ کَفَرَ الَّذِیْنَ قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰہَ ثَالِثُ ثَلٰثَۃٍ ((5:73 انہوں نے کفر کیا جو کہتے ہیں TRINITY والے کہ خدا تثلیث میں سے تین میں سے ایک ہے۔آگے ہے وَ مَا مِنْ اِلٰہٍ اِلَّآ اِلٰہٌ وَّاحِدٌ ((5:73 کرو

ترجمہ اس کا کہ الہ میں سے، الہ تو واحد ہے، صرف اللہ الہ ہے۔ بات ہی نہیں بنتی۔ مِن کا ترجمہ ہی نہیں یہاں ہوسکتا۔ یعنی الٰہوں میں سے اگر ہو تو چلو مِن کا کچھ ترجمہ تو ہوا۔ الہ میں سے کیا الہ کا ایک حصہ اللہ ہے؟ یہ عربی زبان کی خصوصیت ہے، زور دینا تھا کہ کوئی الہ نہیں ہے۔ آپ دیکھیے گا اس آیت کا ترجمہ آپ کو ہر ترجمے میں ملے گا کہ کوئی الہ نہیں ہے اللہ کے سوا۔ یہ مِن کے معنی یہ کیا جاتا ہے کہ جہاں یہ کہنا ہو نا کہ کوئی بھی نہیں ہے وہاں مِن آتا ہے۔ پورے کے پورے کو لینا ہوتا ہے اس میں زور دے کے یہ کہتے ہیں۔ یوں ہی ایک اور مثال لے لیجیے، میں نے عرض کیا ہے کہ یہ تو ایسا انداز ہے بیان کا قرآن میں یہاں سے وہاں تک یہ چیزیں آتی ہیں۔ قرآن کے متعلق ہے وَالَّذِیْٓ (35:31) اللہ وہ ہے اَوْحَیْنَآ اِلَیْکَ (35:31) جس نے اے نبی تیری طرف وحی کیا اَوْحَیْنَآ اِلَیْکَ مِنَ الْکِتٰبِ (35:31) تو اس کے یہ معنی ہوں گے کہ کتاب کا ایک حصہ تیری طرف وحی کیا؟ تو باقی حصہ قرآن کا جو ہے پھر یہ تیری طرف وحی نہیں ہوا (معاذ اللہ) اگر اس کو ہم یہ لیں کہ اس کا ایک حصہ، مِن کے معنی لیں، اس میں سے۔ کتاب میں سے الکتاب میں سے ایک حصہ تیری طرف وحی کیا یہ مِن کے معنی نہیں ہیں۔ آپ ان کا ترجمہ اٹھایے یہاں وہ سب یہ کریں گے کہ یہی کتاب پوری کی پوری تیری طرف ہم نے وحی کی۔ یہ ترجمہ ہوتا ہے مِن کا یہاں، یہ کتاب خصوصیت سے پوری کی پوری تیری طرف ہم نے وحی کی ہے۔

مذہب پرست گروہ کی طرف سے مغالطہ آمیزی کا پیدا کردہ اثر گروہ بندی کو پروان چڑھانے کے مترادف ہے

میں کہہ یہ رہا تھا کہ یہ جو مغالطہ دیا جاتا ہے نا کہ وَلْتَکُنْ مِّنْکُمْ اُمَّۃٌ (3:104) تم میں سے ایک پارٹی ایسی ہونی چاہیے کہ جو لوگوں کو خیر کی طرف دعوت دے، امر بالمعروف کرے نہی عن المنکر کرے۔ اس سے مذہب پرست گروہ نے تو یہ کہہ دیا کہ صاحب یہ مذہبی پیشوائیت مراد ہے۔ ہم دعوت دیتے ہیں، تبلیغ کرتے ہیں امر بالمعروف کی، تبلیغ کرتے ہیں نہی عن المنکر کی۔ میں نے کہا کہ قرآن کی تمام آیات کے خلاف یہ مفہوم ہے۔ ہمارے ہاں سیاست میں بھی یہ چیز آئی میں نے دیکھے ہیں اس قسم کے منشوران کے اوپر لکھا ہوا ہوتا تھا وَلْتَکُنْ مِّنْکُمْ اُمَّۃٌ یَّدْعُوْنَ (3:104) تم میں سے ایک پارٹی ایسی ہونی چاہیے کہ وہ جو یہ چیز کرے۔ پوری امت نہیں اس میں شامل ایک پارٹی ایسی ہونی چاہیے۔ یہ سارا تصور قرآن کے ان آیات کے خلاف جس میں اس نے پارٹی بازی، فرقہ بندی، تفریق، اختلاف کو خدا کا عذاب قرار دیا ہے، شرک قرار دیا ہے، کفر قرار دیا ہے۔ قرآن کی ان تمام آیات کے

خلاف جس میں اس نے امر بالمعروف نہی عن المنکر مملکت کا فریضہ قرار دیا ہے جس میں پوری امت شریک ہے۔ اس میں نہ مذہبی پیشوائیت کا سوال ہے نہ کسی ایک سیاسی پارٹی کا سوال ہے۔ وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ اِلَى (3:104) اور تم ہی وہ امت ہو کہ جو خیر کی طرف دعوت دیتی ہو، معروف کا حکم کرتی ہو، منکر سے روکتی ہو وَ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ (3:104) اور یہی وہ امت ہے کہ جو مفلحون کی ہے جن کی کھیتیاں پروان چڑھتی ہیں۔ یاد رکھیے! یہ ہے وہ نظام امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا کہ جس کے قائم رہنے سے مسلسل آگے چلنے سے ''فیکم رسولہ'' کی جو شرط قرآن نے قرار دی تھی کہ قرآن اور اس کے ساتھ اس کا سربراہِ ملت جو ہونا چاہیے، یہ شرط اس صورت میں پوری ہوگی، پوری امت پر مشتمل ایک نظامِ مملکت جو قرآنِ کریم کی بنیادوں کے اوپر قائم ہو اور قرآن کے معروف کو جاری کرے، اس کے منکر کو روکے، ساری امت اس میں شریک ہے۔ امت میں مذہبی فرقہ شرک، پارٹی بازیاں کفر، کسی ایک گروہ کا اجارہ دار بن جانا اس مقصد کے لیے قرآن کی تعلیم کی یکسر نکیر۔ عزیزانِ من! قرآن کا تصور ایک کتاب، ایک امت، ایک نظام، ایک دین میں حجت جسے قرآن یا کتاب اللہ کہا جاتا ہے۔ اس نظام کی موجودگی اس مرکز کی موجودگی امت کے صحیح راستے پر ہونے کی بنیادی شرط ہے۔ یہ چیز نہیں ہے تو پھر دین مذہب پہ آ جاتا ہے اور امت اہلِ کتاب کی ہو جاتی ہے جہاں ہم اس وقت کھڑے ہیں۔ ہم سورۃ الِ عمران کی آیت 104 تک آ گئے 105 سے آئندہ درس میں لیں گے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا ؕ اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ (2:127)

❀...❀...❀

سترھواں باب: **سورۃ آل عمران** (آیات 105 تا 115)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عزیزانِ من ! آج جنوری 1970ء کی 18 تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز سورۃ الِ عمران کی 105 آیت سے ہوتا ہے:((3:105۔

فرقہ بندی کو قائم دائم رکھتے ہوئے کوئی فرقہ بھی خود کو قرآنی تعلیم سے منطبق نہیں کرسکتا

تجدیدِ یادداشت کے لیے دہرادوں کہ پچھلے درس میں عمودی موضوع ان آیات کا یہ تھا کہ امت میں تفرقہ قرآنِ کریم کی رو سے شرک ہے(32-31:30)۔فرقہ بندی کے متعلق کہا تھا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے کہ اے رسول تیرا ان لوگوں سے کوئی تعلق نہیں جو دین میں تفرقہ پیدا کردیں(6:159)۔جہاں تک خدا کا تعلق ہے شرک' جہاں تک اس کے رسول کا تعلق ہے بالفاظِ صحیح کہ اے رسول تیرا ان سے کوئی واسطہ نہیں۔اور فرقہ بندی کی نفسیات یہ کہ کُلُّ حِزْبٍ م بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُوْنَ(30:32) ہر ایک اس شرک میں بھی مبتلا' خدا کے رسول سے قطع تعلق اور اپنے جی میں مگن کہ ہم جنت کے وارث ہیں۔یہ کُلُّ حِزْبٍ م بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُوْنَ (30:32) SELF DECEPTION ہے خود فریبی ہے کہ اس بات میں مگن ہو کے بیٹھ رہنا کہ ہم حق پر ہیں۔کُلُّ

حِزْبٍ (30:32) قرآن کہتا ہے۔ ہر فرقہ اس خودفریبی کے اندر مبتلا کہ ہم نہیں شرک کر رہے' یہ باقی کر رہے ہیں' قرآن کا یہ حکم ہم پہ منطبق نہیں ہوتا' اس کا اطلاق دوسروں پہ ہوتا ہے۔ پہلے سے یہ چلے آ رہے فرقے اور ہر مصلح جو اٹھتا ہے ایک نیا فرقہ بنا دیتا ہے' ان مشرکین میں ایک اور کا اضافہ کر دیتا ہے۔ اور پھر اس کی بھی یہی دعوت ہوتی ہے کہ یہ حق پہ ہے باقی سب باطل پہ ہیں۔ کیسے جاؤ اضافے اس طرح سے اس میں لیکن SELF DECEPTION سے حقیقت تو نہیں بدل جاتی۔ عزیزانِ من! پھر ان تفرقوں کے متعلق یہ جو ہمارے ہاں کے کچھ نئے دور کے لیڈر صاحبان آئے' انہوں نے مذہبی فرقہ بندی کو مطعون کرنا شروع کیا اور ان میں سے ہر ایک اپنی اپنی پارٹی بنا کے بیٹھ گیا۔ گویا پارٹی بنانا جو ہے یہ تو عینِ اسلام ہے' مذہبی فرقہ پیدا کرنا یہ ہے اصل میں شرک جسے کہا ہے' برائی یا خرابی اُس میں ہے۔ برائی یا خرابی اس میں نہیں ہے۔ حالانکہ قرآن میں تو مذہب کا تو لفظ ہی نہیں اس نے تو دین کہا ہے'' دین میں فرقہ بندی' دین ہیں پارٹیاں بنا دینا' تفرقہ پیدا کر دینا' اختلاف پیدا کر دینا''۔ ایک طرف دعویٰ یہ کہ ہمارے ہاں مذہب اور سیاست دو چیزیں نہیں ہیں' دوسری طرف کیفیت یہ کہ فرقہ بندی یہ تو شرک ہے' خرابی کا موجب ہے لیکن پارٹی نہایت ضروری ہے۔

مملکتِ اسلامیہ میں آئینی سطح پر مسلمہ مذہبی فرقوں کو تحفظ فراہم کرنا چہ معنی؟

اب جو نئے منشور شائع ہو رہے ہیں ان جماعتوں کی طرف سے بھی کہ جو علم بردار ہیں یہاں اجارہ دار ہیں یہاں مذہب کے' ان میں سے ایک کے منشور میں یہ لکھا ہے کہ یہ جتنے فرقے موجود ہیں ان کو تو وہ مسلمہ فرقے قرار دیتے ہیں اور ان کو آئینی تحفظ دیتے ہیں۔ یعنی پہلے اگر ان کے مٹانے کی کوئی فکر کرتا تھا تو خیر وہ اس کا قدم اصلاح کی طرف اٹھتا تھا اب یہ آئین کے خلاف ہوگا کسی فرقے کے متعلق یہ کہنا کہ یہ شرک ہے۔ اور منشور میں یہ ہے کہ پہلے جو مسلمہ فرقے چلے آ رہے ہیں ان کو تو آئینی تحفظ حاصل ہوگا لیکن اسکے بعد فرقہ نہیں بننے دیا جائے گا کیونکہ یہ شرک ہے۔ یہ ان کے منشوروں میں یہ چیز لکھی ہوئی ہے۔ اَللّٰہُ یَسْتَھْزِئُ بِھِمْ وَیَمُدُّھُمْ فِیْ طُغْیَانِھِمْ یَعْمَھُوْنَ (2:15) خدا کا قانون ان کا مذاق اڑاتا ہے' چھوڑتا ہے ان کو سراب کے اندر تاریکیوں کے اندر' ٹامک ٹوئیاں مارتے چلے جاؤ۔ خوش ہو رہے ہیں۔ پہلے جو ہیں ان کو آئینی تحفظ دیا جا رہا ہے' آئندہ کے لیے فرقہ بندی قانوناً ممنوع ہے کیونکہ یہ شرک ہے۔ اُدھر پارٹیاں بنانے والے' نام دین کا ہے جس میں مذہب اور سیاست میں کوئی فرق نہیں ہے۔ مذہبی اور سیاسی فرقہ ہزار خرابیوں کا موجب' ساری تاریخ ہماری دیکھیے جب وہ سٹیج پہ کھڑے ہو کے تقریر کرتے ہیں' پوری تاریخ آپ کی مذہبی فرقہ بندی کی خوں ریزیوں میں اور خانہ خرابیوں میں گذر گئی۔ اور اس کے بعد ہماری پارٹی کو جوائن کرو کیونکہ پارٹی کا

لفظ کہہ دیا اس واسطے یہ فرقہ بندی نہ رہی' ماڈرن ہو گیا یہ۔

فرعون کا سب سے بڑا جرم قوم کو پارٹیوں میں تقسیم کرنا تھا

فرعون کے خلاف کیا الزام تھا جو حضرتِ موسیٰؑ سے کہا تھا کہ جاؤ اس کی طرف اِنَّ فِرْعَوْنَ عَلَا فِي الْأَرْضِ (28:4) بڑی سرکشی اس نے اختیار کی۔ بہت بڑا جرمِ عظیم ہے ایک چھوڑ کر دو پیغمبر بھیجے جاتے ہیں انقلاب آفریں' عصائے موسویؑ کے ساتھ' ضربِ کلیمیؑ کے ساتھ کہ جاؤ اس نے ملک میں سرکشی اختیار کر رکھی ہے۔ کیا کرتا تھا؟ وَجَعَلَ اَهْلَهَا شِيَعًا (28:4) وہاں کے باشندوں کو پارٹیوں میں تقسیم کر رہا ہے۔ اللہ اکبر۔ پارٹیاں بنانا عینِ اسلام ہے اور جس جمہوریت کو تو پھر مغزِ اسلام کہا جاتا ہے' وہ کہتے ہیں وہ تو ممکن ہی نہیں اگر اس پارلیمان کے ہاؤس میں دو پارٹیاں کم از کم نہ ہوں حزبِ مخالف' حزبِ موافق۔ یعنی اگر یہ تفرقہ نہ ہو تو وہاں کوئی اسلام چل ہی نہیں سکتا کیونکہ اسلام اور جمہوریت تو ایک چیز ہے۔ جمہوریت کی بنیادی شرط یہ ہے کہ اس میں باہر جتنی پارٹیاں جتنی جی چاہے ہوں اندر جا کے کم از کم دو شقوں کے اندر تو مسلمان بٹا ہوا ہو''ایہہ اوی تے ہنیر نہ آ جائے کہ صاحب اک ہو جان دو تے رہن کم از کم۔ ہاں بھئی پورا اسلام نئیں آندا تے تھوڑا بہت تے رہ جائے نا او تھے جا کے'' پورا اسلام تو باہر ہوتا ہے موچی دروازے کے باہر۔ اندر جا کے چلو اتنا ہی سہی ایک حزبِ مخالف ایک حزبِ موافق۔ اسلامی مملکت میں حزبِ مخالف انہی میں۔ یعنی مخالفت کس بات کی اسلامی مملکت ہے' انہی میں سے حزبِ مخالف۔ آپ دیکھتے ہیں کہ پھر جب انسان اس سطح پہ آتا ہے تو کس طرح عقل و ہوش بھی گم ہو جاتی ہے۔ کسی سے بات کیجیے وہ مذاق اڑائے گا کہ یہ باتیں کیا کر رہے ہیں آپ۔ ہر ایک کرتا ہے' دین کے مدعی بھی کرتے ہیں۔ مسٹر بھی یہ کچھ کرتے ہیں اور ہر ایک ان میں سے یہ کہتا ہے کہ ہم یہاں اسلام کی حکومت قائم کرنا چاہتے ہیں۔ یہ چیزیں تھیں جو قرآن میں پچھلی آیات میں ہمارے سامنے یہ آ گئی تھیں۔ اس کے بعد پھر اسی چیز کو قرآن نے دہرایا ہے۔

اُمت میں باہمی اختلاف تو قرآنی تعلیم کے ہی خلاف ہے تو وہ پھر باعثِ رحمت کیسے ہو سکتا ہے

وَلَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ تَفَرَّقُوْا وَاخْتَلَفُوْا مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَهُمُ الْبَيِّنٰتُ ط (3:105) آپ کو یاد ہو گا قرآن نے کہا تھا کہ یہ کفر بعدِ ایمان ہے۔ ایمان لانے کے بعد کفر کی حالت کی طرف لوٹ جانا ہے اختلاف کرنا' آپس میں تفرقہ پیدا کرنا۔ یہاں کہا کہ دیکھنا مسلمانو! تم اس طرح اسلام لانے کے بعد پھر سے کفر کی حالت کی طرف نہ لوٹ جانا' ان لوگوں کی مانند نہ ہو جانا کہ

جنھوں نے تفرقہ پیدا کیا تفریق پیدا کی' پارٹیاں بنائیں' فرقے بنائے' احزاب بنائے' حزب بنے وَ اخْتَلَفُوْا (3:105) اختلاف کیا۔ آپ غور کیجیے اختلاف تک جو ہے امت کے اندر قرآن یہ کہتا ہے یہ غیر اسلامی شعار ہے۔ اور جیسا کہ میں نے عرض کیا تھا قرآن یہ کہتا ہے کہ دیکھنا کہیں اختلاف نہ کر لینا۔ اور ہم سے یہ کہا جا رہا ہے کہ جسے خدا نے کہا تھا کہ جو اختلاف پیدا کرے تیرا ان سے کوئی واسطہ نہیں۔ اس رسول کی طرف منسوب کیا جاتا ہے یہ عربی کا فقرہ کہ ''اختلاف امتی رحمت'' میری امت کا اختلاف رحمت ہے۔ یعنی اور باقی جو ہیں نا دنیا کے اختلافات وہ تو لعنت ہیں' ان کے لیے غضب ہے خدا کا' میری امت جو ہے اس کا اختلاف جو ہے یہ رحمت ہے خدا کی۔ بڑھاتے چلے جایے جتنا اختلاف بڑھے گا' اتنی ہی رحمت زیادہ ہوتی چلی جائے گی تا آنکہ رحمت کی گھٹا ٹوپ گھٹائیں چھا جائیں گی جس میں سیلاب آجایا کرتا ہے۔ نہ کہ رامنزلت باشد نہ مہ را' صاحب۔ اختلاف کی رو سے جو رحمت آتی ہے وہ تو اس طرح آیا کرتی ہے نا جو سیلاب آجاتا ہے پھر۔ اختلاف امتی رحمت۔ کوئی احساس نہیں کہ ہم کہہ کیا رہے ہیں اسے منسوب کس ذاتِ اقدس و اعظم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف کر رہے ہیں۔

امت میں گروہ بندی تو عذابِ عظیم کا موجب ہوتی ہے

قرآن روز پڑھتے ہیں' شبینے ختم کرتے ہیں اس میں یہ لکھا ہے کہ وَ لَا تَکُوْنُوْا کَالَّذِیْنَ تَفَرَّقُوْا وَ اخْتَلَفُوْا مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَهُمُ الْبَیِّنٰتُ ط (3:105) اتنی واضح تعلیم آجانے کے بعد اختلاف۔ ان میں سے نہ ہو جانا اس لیے کہ وَ اُولٰٓئِکَ لَهُمْ عَذَابٌ عَظِیْمٌ (3:105) یہ وہ ہیں کہ جن کے لیے عذابِ عظیم ہے۔ اختلاف عذابِ عظیم کا موجب' تفرقہ شرک کا باعث۔ ایسے نہ ہو جانا۔ عذابِ الیم' عذابِ عظیم۔ اور اس کے بعد پھر خود ہی دو گروہوں میں تقسیم کر کے بتا دیا انسانوں کو۔ ایک وہ کہ جن میں تفرقہ اور اختلاف نہیں ہے' ایک وہ جو اس عذابِ عظیم میں مبتلا ہیں۔ کیا الفاظ ہیں؟ یَّوْمَ تَبْیَضُّ وُجُوْهٌ وَّ تَسْوَدُّ وُجُوْهٌ ج (3:106) اس دن تم دیکھو گے جب دین اپنی حقیقی شکل میں آئے گا یوں کہو کہ جب تمہارے ان کرتوتوں کے نتائج سامنے آئیں گے۔ کچھ لوگ ہوں گے جن کے چہرے نورانی اور روشن ہوں گے اور دوسرے لوگ وہ ہوں گے جو روسیاہ ہوں گے' سیاہ مونہہ والے' کالے منہ والے۔ غور فرمایے اختلاف کرنے والوں کے متعلق کیا الفاظ آ رہے ہیں؟ فَاَمَّا الَّذِیْنَ اسْوَدَّتْ وُجُوْهُهُمْ قف (3:106) یہ روسیاہ کون ہیں؟ یہ کالے مونہہ والے کون ہیں؟ یہ وہ ہیں جن سے کہا جائے گا اَکَفَرْتُمْ بَعْدَ اِیْمَانِکُمْ (3:106) ایمان لانے کے بعد پھر سے کفر اختیار کر لیا تھا تم نے۔ پہلے وہ آچکا ہے کہ یہ ایمان کے بعد کفر کیا ہے؟ توحید اور وحدت کے بعد اختلاف اور تفرقہ ہے جسے قرآن نے یہ کہا ہے۔ یہاں یہ کہا ہے نا کہ اختلاف اور تفرقہ نہ پیدا کرنا یہی رو

سیاہ ہیں ان ہی کے متعلق کہا گیا ہے کہ تم نے پھر ایمان کے بعد کفر اختیار کر لیا۔

کرۂ ارض پر مراکو سے انڈونیشیا تک جغرافیائی اور تمدنی طور پر مرکزی پوزیشن کی حامل قوم آخر اس قدر عذاب میں کیوں مبتلا ہے

عزیزانِ من! اختلاف اور تفرقہ کو وہ شرک قرار دیتا ہے، کفر قرار دیتا ہے بعدِ ایمان۔ اَكَفَرْتُمْ بَعْدَ اِيْمَانِكُمْ ((3:106 نتیجہ اس کا؟ فَذُوْقُوا الْعَذَابَ بِمَا كُنْتُمْ تَكْفُرُوْنَ ((3:106 تمہارے اس کفر کا نتیجہ یہ ہے کہ جاؤ چکھو اس عذابِ عظیم کو، چکھو مزا اپنے اختلاف کا۔ ہماری مصیبت یہ ہے کہ ہم نے بلی کو دیکھ کے کبوتر کی طرح آنکھیں بند کر لیں، اپنے آپ کو بالکل محفوظ سمجھ لیا۔ آنکھیں بند کرنے کا ایک منتر تھا ان مذہبی پیشواؤں کے ساتھ کہ یہ ساری چیزیں انہوں نے قیامت پہ اٹھا رکھیں کہ وہاں یہ عذابِ عظیم ہیں، وہاں یہ عذابِ الیم ہیں، وہاں اس کا مزا چکھو۔ قرآن اس دنیا کی ذلت کو، خِزْيٌ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا کو عذابِ عظیم قرار دیتا ہے قرآنِ کریم کی رو سے اس دنیا میں ذلت اور خواری کی زندگی بدترین عذاب ہے۔ میں پوچھتا یہ ہوں کہ آج آپ کے ہاں جغرافیائی اعتبار سے، تمدنی اور سیاسی اعتبار سے جتنی اہمیت اس مسلمان کی قوم کو حاصل ہے، دنیا کی کسی قوم کو یہ اہمیت حاصل نہیں۔ مراکو سے لے کے انڈونیشیا تک ایک بحرِ مواج ہے جو منڈلاتا ہوا چلا آ رہا ہے۔ جغرافیائی اعتبار سے دنیا میں مرکزی پوزیشن حاصل ہے ان کو۔ مسلسل اس قسم کی آبادیاں چلی آ رہی ہیں۔ تمام اقوامِ عالم کو ان سے دہلنا چاہیے تھا، ان کی اتنی قوت ہونی چاہیے تھی۔ کیفیت یہ ہے کہ ساری دنیا میں ذلیل و خوار ہیں یہ قومیں پوری کی پوری۔ کس بنا پر؟ یہی اختلاف باہمی، یہی تفرقہ آپ کے ہاں کا۔ اس کا نتیجہ یہ ہے ہر شخص ہم میں سے آج کیفیت یہ ہوگئی ہے کہ جہاں دو مسلمان آپس میں ملتے ہیں، وہ اپنا مرثیہ پڑھتے ہیں اور اس کے باوجود اس کو خدا کا عذاب قرار نہیں دیتے۔ یہ اس کے محبوب کی امت ہے۔ یہ پوچھو کہ صاحب یہ ذلت و خواری، یہ محتاجی، یہ افلاک، یہ نکبت، زبوں حالی، کسمپرسی کا عالم، روٹی تک کے لیے دوسروں کے محتاج؟ اللہ اپنے محبوب بندوں کی آزمائش کیا کرتا ہے۔ اور وہ کہہ گیا تھا کہ

یہ ہے گر آزمانا تو ستانا کس کو کہتے ہیں؟

کیا خدائے رحیم انسان کو دنیا بھر کے عذابِ عظیم میں مبتلا کر کے آزمائش کرتا ہے؟

ذرا بتایئے تو سہی کہ پھر وہ فرق کیا ہوتا ہے؟ اگر یہ آزمائش ایک لفظ ابتلا کہ خدا کے محبوب بندوں کی ابتلا ہوتی ہے، آزماتا

رہتا ہے وہ بیٹھا ہوا۔ یہ عذابِ الیم پھر اور کیا ہے؟ ہر فرد ہر قوم تمہاری چلا رہی ہے' اس وقت کہ عذابِ الیم کے اندر ہم مبتلا ہیں وَ مَا هُمْ بِخٰرِجِیْنَ مِنَ النَّار (2:167) نکلنے کا راستہ کوئی نہیں نظر آ تا۔ موجودہ حالت تو یہ کہ کوئی امید بر نہیں آ تی مستقبل کی شکل یہ کہ کوئی صورت نظر نہیں آ تی۔ عزیزانِ من! انتہا ہے مایوسی کی جب یہ شکل پیدا ہو جائے کہ کوئی صورت نظر نہیں آ تی۔ وَ مَا هُمْ بِخٰرِجِیْنَ مِنَ النَّار (2:167)۔ اس لیے کہ جو قوم اپنے فرقوں کو اپنی پارٹیوں کو اس مذہبی تفریق کو خدا کی رحمت سمجھ لے' وہ اس جہنم سے نکل کس طرح سے سکتی ہے؟ او مریض اپنے آپ کو مریض تو سمجھے جب کہیں جا کے حکیم کے پاس جائے گا' دوائی لے گا' تشخیص کرائے گا' علاج کی طرف توجہ دے گا' کچھ ضرورت محسوس کرے گا۔ مریض اپنے آپ کو مریض تو سمجھے۔ اگر اس کی صورت یہ ہو کہ تپ دق کا مریض ہے اور اپنے ذہن میں سمجھے ہوئے ہے کہ ''میں تھے بھولو پہلوان آں جناب''۔ وَ مَا هُمْ بِخٰرِجِیْنَ مِنَ النَّار (2:167)۔ یہاں جتنی کسی کی آزمائش ہوتی ہے' اتنا ہی خدا کا وہ مقرب ہوتا ہے۔ اس دنیا کے اندر قوموں کے اندر افراد کے اندر' جوتے کھاتا کھاتا مر جاتا ہے۔ جوں ہی آنکھ بند کرتا ہے' خدا کے دائیں ہاتھ پہ جا کے بیٹھ جاتا ہے۔

عذابِ الیم میں مبتلا ہونے کو رحمت تصور کرنے والی قوم کا کیا علاج؟

یہاں کوئی معیار ہی نہیں تمہیں بتایا گیا کہ کوئی محسوس شکل میں تمہیں پتہ ہی چلے کہ ہم کس قسم کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔ اب جو عذاب کو رحمت سمجھ لے' اب اس کا کیا علاج صاحب۔ وہ ایک صاحب روز آ کے دوسروں کے پاس جوں ہی دستر خوان بچھا بیٹھ گئے کھانے کے لیے۔ وہ تنگ آ گئے کہ کیا کریں صاحب اس کا علاج؟ باتوں سے کہا نہ مانا' طنزاً کہا نہ مانا' اشارتاً کہا نہ مانا۔ تنگ آ گئے ایک دن ایک اٹھا اور اس نے جوتا لیا پکڑ اور بیٹھا تھا وہ کھانے کو' دے اوپر سے اور پانچ سات مارے' کہنے لگا سبحان اللہ اس طرح مار مار کے یا قبلہ ابا جان کھلایا کرتے تھے یا دوست کھلاتے ہیں۔ عزیزانِ من! جس قوم کی ڈھٹائی کا یہ عالم ہو جائے کہ وہ جوتے پڑ رہے ہیں اور وہ قبلہ ابا جان کی مہربانی اور شفقت یاد آ رہی ہے ان کو۔ عزیزانِ من! اس قوم کی جہنم سے نکلنے کی کوئی صورت نہیں ہوسکتی جو اس اختلاف اور تفرقے کو خدا کی رحمت سمجھ بیٹھے۔ سب سے بڑا فریب تھا جو آپ کو دیا گیا ان الفاظ کے اندر۔ مذہب کی تکنیک یہ ہوتی ہے۔ پتہ نہیں کون کون سی سازش کرنے والی قومیں ان کے پیچھے ہوتی ہیں۔ آ گے ان کے اس قسم کے مہرے وہ رکھ چھوڑتے ہیں اور وہ اس قسم کے بہلاوے اور فریب دے دے کے قوم کے جہنم کو بہشت بنا کے دکھا دیتے ہیں۔ کون نکلے گا پھر اس سٹیج سے؟ کہتا ہے فَذُوْقُوا الْعَذَابَ بِمَا كُنْتُمْ تَكْفُرُوْنَ (3:106) یہ روسیاہی اور یہ سفید چہرے یہ قیامت پہ ہی کیوں تم نے اٹھا رکھے ہوئے ہیں؟

ملتِ اسلامیہ کے غم میں علامہ پرویزؒ کی آہ وفغاں

کیا اختلاف اور تفرقہ والی قوم اس دنیا میں روسیاہ نہیں ہوتی؟ کیا ہم سے بڑی روسیاہی کسی اور قوم کے حصے میں بھی آئی ہوئی ہے۔ ایک گداگر کہیں آتا ہے روٹی مانگنے کے لیے تو ہماری سب کی نگاہوں میں وہ ذلیل ہوتا ہے۔ پوری قوم بھیک اگر مانگتی ہے دوسرے سے تو اس کو ہم خدا کا عذاب نہیں' خدا کی رحمت قرار دیتے ہیں۔ بڑی سازش یہ ہے کہ قوم کے سامنے سے اس کا موجودہ جہنم جو ہے اس کو جنت بنا دیا جائے۔

سخن ز نامہ و میزاں دراز تر گفتی

ہزار حیف نہ بینی قیامتِ موجود

وعظ کے اندر وہ حشر کا دیہاڑا اور اس کا وہ حساب اور کتاب اور میزان اور عمل بڑی لمبے لمبے وعظ کہتے ہو۔ اوکم بخت! وہ کہتا ہے اوئے آنکھ کھول اس قیامتِ موجود کو دیکھ جس کے اندر ہر سانس میں ایک میزان کھڑی کی گئی ہے۔ تل رہے ہیں اعمال قوموں کے' جنت اور جہنم کے اندر پہنچائی جارہی ہیں قومیں' اس کو بھی دیکھ اپنی آنکھ سے۔ روسیاہی قوموں کی' قرآن کہتا ہے اختلاف اور تفرقے کا نتیجہ ہے۔ اور ہماری یہ کیفیت کہ مذہبی فرقے بندیاں' اس کے بعد یہ سیاسی پارٹی بازیاں اور اب تو بات متشابہات سے محکمات تک پہنچ رہی ہے۔ ایک مملکت کا ٹکڑا آپ کو ملا تھا اس کو بھی بیسیوں ٹکڑوں میں تقسیم کرنے کے منصوبے آپ کے ہاں ہو رہے ہیں اور سب خوش ہیں کہ ہم اسلام کی خدمت کر رہے ہیں' ملت کے بہی خواہ ہیں۔ عذابِ عظیم کے اندر ملت کو جھونکا جا رہا ہے' روسیاہی کا باعث بنتے چلے جا رہے ہیں۔ سنیے یہ روشن چہرے والے کون سے ہیں؟ یہ اختلافِ امتی رحمت کہنے والوں کے متعلق ذرا سوچیے جو قرآن نے کہا ہے کہ بعض چہرے روشن نورانی ہوں گے' دوسرے چہرے روسیاہی والے ہوں گے۔ یہ روشن چہرے والے کون ہیں؟ وَ اَمَّا الَّذِیْنَ ابْیَضَّتْ وُجُوْهُهُمْ فَفِیْ رَحْمَةِ اللّٰهِ ؕ (3:107) یہ روشن چہرے والے وہ ہیں جو خدا کی رحمت میں ہیں۔ آپ کے اس سند کی رو سے جو اپنے فریب کے لیے آپ نے حضورِ سرورِ کائنات ﷺ کی طرف منسوب کر دیا کہ میری امت کا اختلاف رحمت ہے تو اس کے تو معنی ہو گئے وہ فی رحمۃ اللہ کہ اختلاف والے تفرقے والے جو ہیں یہ خدا کی رحمت میں ہیں یہ ان کے چہرے روشن ہیں اور روسیاہ وہ ہیں جن کے اندر اختلاف تفرقہ کچھ نہیں ہوتا۔ غور فرمایا آپ نے! کون سے ہیں یہ اللہ کی رحمت کے اندر؟ مجھ سے نہ سنیے قرآن سے پوچھیے۔ سنیے رحمت' فَفِیْ رَحْمَةِ اللّٰهِ (3:107) یہاں کہا ہے سفید روشن چہروں والے اللہ کی رحمت میں ہیں۔ کون ہیں یہ؟

478آلِ عمران

انسان کو صاحبِ اختیار وارادہ بنانے کی حکمت کا اظہار

وَ لَوْ شَآءَ رَبُّکَ لَجَعَلَ النَّاسَ اُمَّۃً وَّاحِدَۃً وَّ لَا یَزَالُوْنَ مُخْتَلِفِیْنَ ((11:118 وہ جو عام سوال ہوا کرتا ہے کہ صاحب! اگر خدا کو منظور ہوتا تو وہ ساری دنیا کو مسلمان کیوں نہ بنا دیتا۔ مسلمان ہمارے جیسے نہیں اس کے معنی یہ تھے کہ وہ اختلاف نہ کرتے ' تفرقہ نہ کرتے یوں کہیے۔ اور یہ چیز میں متعدد مقامات پہ عرض کر چکا ہوں کہ خدا نے کہا یہ ہے کہ اگر ہماری مشیت ہوتی تو ہم بھی انسانوں کو صاحبِ اختیار پیدا نہ کرتے۔ کائنات کی دوسری چیزوں کی طرح مجبور پیدا کرتے' ان میں اختلاف ہو ہی نہ سکتا۔ ہر نوع کا حیوان' ہر نوع کا جانور' ہر شے کائنات کی جس طریقے پہ اس کو پیدا کیا گیا ہے' اسی کے اوپر چل کے جاتی ہے۔ ان کے سامنے دو راستے آتے ہی نہیں کہ ان میں سے ایک راستے کا انتخاب خود کریں۔ یہ انسان ہے اور اسی میں اس کی عظمت اور شرف کا راز ہے کہ یہ صحیح راستہ خود اختیار کرتا ہے۔ اس لیے کہا کہ اگر ہمارے پروگرام میں ایسا ہوتا تو ہمارے لیے کچھ مشکل نہیں تھا' سارے انسانوں کو پتھر پیدا کر دیتے۔ پتھر نہ آپس میں لڑتے ہیں' نہ جھگڑتے ہیں' نہ تفرقہ پیدا کرتے ہیں۔ کبھی نہیں دیکھا ہوگا کہ ایک پتھر جو ہے وہ اللہ اکبر کہتے وقت کانوں تک ہاتھ اٹھائے' دوسرا اسی طرح سے رکوع میں چلا جائے۔ ان میں تفرقہ ہوتا ہی نہیں لیکن وہ تو ساری عمر پھر پتھر رہتا ہے۔ انسان کو صاحبِ اختیار بنایا کہا کہ اگر ایسا ہوتا کہ ہم نے مجبوراً ان کو ایک راستے پہ چلانا ہوتا تو ہم یہ کر سکتے تھے لیکن ہم نے ان کو صاحبِ اختیار وارادہ پیدا کیا' اس لیے یہ باہمی اختلاف ہے اور آگے سنیے وَ لَا یَزَالُوْنَ مُخْتَلِفِیْنَ ((11:118 یہ اختلاف کرتے رہیں گے اِلَّا مَنْ رَّحِمَ رَبُّکَ ((11:119 ہاں! مگر جس پر خدا کی رحمت ہوگی جس قوم پہ وہ اختلاف نہیں کرے گی۔ اب یہاں یہ تھا کہ وَ اَمَّا الَّذِیْنَ ابْیَضَّتْ وُجُوْھُھُمْ فَفِیْ رَحْمَۃِ اللّٰہِ ((3:107 روشن چہروں والے وہ ہوں گے کہ جو اللہ کی رحمت میں ہوں گے اور یہاں یہ بتا دیا کہ اللہ کی رحمت میں وہ لوگ ہیں جو اختلاف نہیں کرتے۔ یہ لوگ ہیں جو خدا کی رحمت میں ہوں گے۔ ھُمْ فِیْھَا خٰلِدُوْنَ ((3:107 جب تک اختلاف پیدا نہیں ہوگا تفرقہ پیدا نہیں ہوگا' وہ اس جنت کی زندگی کے اندر رہیں گے۔ جوں ہی اختلاف پیدا ہوگا' عذابِ عظیم کے اندر آ جائیں گے۔ اور اتنی وضاحت سے یہ کچھ کہنے کے بعد کہا تِلْکَ اٰیٰتُ اللّٰہِ نَتْلُوْھَا عَلَیْکَ بِالْحَقِّ ((3:108 یہ ہیں خدا کے قوانین جو تیرے سامنے پیش کیے جاتے ہیں

انسانی زندگی کی حقیقت کو سمجھنے کے لیے' کچھ تعمیری پہلوؤں کی وضاحت کے لیے وحی کی ضرورت

اب یہ سوچیے کہ اگر انسانوں کو آنکھیں دی جاتیں اور سورج نہ دیا جاتا' کتنا بڑا ظلم تھا۔ زندگی کا مدار ہوتا ہوا پہ اور ہوا پیدا نہ کی آلِ عمران 478
جاتی' کتنا بڑا ظلم تھا۔ انسانوں کو اختیار و ارادہ دیا جاتا۔ زندگی کے سفر میں دوراہے آتے قدم قدم پر اور دوراہوں کے اوپر یہ سائن پوسٹ نہ لکھے ہوئے ہوتے کہ یہ راستہ شہر کو جاتا ہے' یہ راستہ فیروز پور کو جاتا ہے اور مسافروں کو ایسے چھوڑ دیا جاتا' یہ ظلم تھا یا نہیں۔ کہا کہ یہ ہم کھلی کھلی آیات' کھلے کھلے ضوابط' قوانین' ہدایت' راستہ دکھانے والے یہ سائن پوسٹ ہم نے اس لیے لگا دیے ہیں کہ وَمَا اللّٰہُ یُرِیۡدُ ظُلۡمًا لِّلۡعٰلَمِیۡنَ (3:108) ہم ظلم نہیں کرنا چاہتے تھے۔ اور جو قوم ان سائن پوسٹوں کو اکھیڑ کے پھینک دے' سیدھی بات ہے کہ وہ تو خدا کی طرف سے ظلم میں پھر مبتلا ہو جائے گی۔ کہا کہ ہم ایسا نہیں کرتے۔ ضروری تھا کہ جب ہم نے TWO POSSIBILITIES دی تھیں تو اس کے لیے ہم پھر یہ بھی بتاتے کہ صحیح قانون کون سا ہے جس کے اوپر تم چلو۔ کسی کو اس کی صحیح منزل تک پہنچانے کے لیے صحیح قانون کا دینا نہایت ضروری ہوتا ہے۔ عزیزانِ من! قرآن ہے غور فرمایے کہاں بات آ رہی ہے؟ کہا کہ یہ چیز جو ہے اگر اس کا تم نے نظارہ کرنا ہو کہ کس طرح صحیح قانون ہم دیتے ہیں ان قوانین کے مطابق چلنے سے کس طرح سے صحیح نظم و نسق ہوتا ہے؟ تو کائنات پر غور کرو وَلِلّٰہِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الۡاَرۡضِ ((3:109 دیکھتے ہو خارجی کائنات میں ہم نے کس طرح سے قوانین دیے ہیں اور دیکھتے ہو کہ کس طرح سے ان میں سے ہر شے اس کے متعین منزل اور نصب العین کی طرف چلی جا رہی ہے۔ تو کیا یہ ظلم نہ ہوتا کہ خارجی کائنات میں تو ہم یہ قوانین اس طرح سے دیتے' انسانوں کو اس سے محروم کر دیتے اور انہیں ان کے حال پہ چھوڑ دیتے کہ خود ہی ٹامک ٹوئیاں مارتے رہا کرو۔ کبھی ادھر نکل گئے کبھی اُدھر نکل گئے' یہ ظلم ہوتا۔ ہم نے واضح قوانین دے دیے اس کے ساتھ کہ تم دیکھ کر چلو۔ پھر سنیے کہ کہا کہ دیکھیے خارجی کائنات کے اندر۔

قرآنی الفاظ کے سلسلہ میں وجد آفریں انتخاب کا ذکر اور ان کی اہمیت

لیکن عزیزانِ من! قرآن ایک لفظ استعمال کر جاتا ہے ذرا اس کی گہرائیوں میں جاؤ تو روح پر وجد طاری ہو جاتا ہے۔ خارجی کائنات اور انسانی دنیا کے اندر فرق ایک لفظ نہیں' لفظ کے ایک صیغے کے اندر ہے۔ کہا لِلّٰہِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الۡاَرۡضِ ((3:109 لیکن وہاں کیفیت یہ ہے وَاِلَی اللّٰہِ تُرۡجَعُ الۡاُمُوۡرُ ((3:109 یہ ترجع الامور PASSIVICE ہے ہر شے کو اس کی منزل کی طرف رجوع کرایا جاتا ہے وہاں' وہ خود نہیں کرتی تُرۡجَعُ الۡاُمُوۡرُ (3:109) یہ عالمِ مجبور ہے۔ ہر کام وہاں کے' ہر قدم ان کا اس نصب العین کی طرف لوٹایا جاتا ہے جو ان کے لیے متعین کیا گیا ہے' لوٹایا جاتا ہے وہ صاحبِ اختیار و ارادہ نہیں ہیں۔ انسان کی دنیا میں یہ انسان کو کہنا ہوگا کہ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّاۤ اِلَیۡہِ رٰجِعُوۡنَ (2:156) ہم اس کی طرف لوٹتے ہیں ہم اپنا قدم اس کی طرف

اٹھاتے ہیں انسان یہ کہے گا۔ کائنات کی اشیا کے متعلق وَاِلَى اللّٰهِ تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ تو جہاں ترجع الامور ہو یہ تو کوئی خوبی کی بات 478 **آلِ عمران** ہے نہیں نا' مجبور کی نیکی نہ نیکی ہے' نہ اس کی برائی برائی ہے۔

تواضع ز گردن فرازاں نکوست
گداگر تواضع کند خوئے اوست

یہ بکری کی نیکی نہیں ہے کہ اس نے ساری عمر کسی کو کاٹا نہیں ہے نہ ہی شیر کا یہ جرم ہے کہ وہ پھاڑ کھاتا ہے کسی کو۔ اس لیے کہ وہاں تو اِلَى اللّٰهِ تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ (3:109) جو پروگرام ان کے لیے متعین ہے' ان کی طرف لوٹائے جا رہے ہیں مجبوراً وہ وہاں اس کی طرف چلتے جا رہے ہیں۔ انسانوں کی زندگی کے اندر قوانین ہم نے دیے لیکن یہ اختیار ان کو دے دیا کہ جس کا جی چاہے اُدھر قدم اٹھائے' جس کا جی چاہے دوسری طرف قدم اٹھائے۔ اب یہ جو اختلاف اور تفرقہ ہے نہ یہ خدا کی طرف سے ہے' نہ یہ اس کی رحمت ہے۔ اس نے کہا کہ یہ عذاب ہے۔ اب انسانوں میں جس کا جی چاہے' یہ کیفیت اپنے ہاں اختیار کر کے روسیاہی کا موجب بن جائے۔ جس قوم کا جی چاہے ان تفرقوں کو ان اختلافات کو مٹا کر نورانی چہروں والے بن جائیں۔ جس کا جی چاہے جنت اپنے لئے CREATE کرلے جس کا جی چاہے جہنم اپنے ہاتھوں سے بنا لے۔ جنت اور جہنم تو پہلے سے بنائے ہوئے نہیں ہوتے ہیں

عمل سے زندگی بنتی ہے جنت بھی جہنم بھی
یہ خاکی اپنی فطرت میں نہ نوری ہے نہ ناری ہے

قرآنی راہنمائی کا انداز' اس کا ماحصل اور اس کے استعمال کا طریق

قوانین اس نے دے دیئے' راستہ اس نے دکھا دیا' آنکھیں دے دیں' روشنی دے دی' سائن پوسٹ لگا دیے اور پھر صاحبِ اختیار انسان کو کہہ دیا کہ جس کا جی چاہے جہنم کی طرف چلا جائے' جس کا جی چاہے جنت کی طرف چلا جائے۔ اور اس کے بعد کہا اس قوم کو جس نے اپنے ہاتھوں اپنے لیے جنت تیار کیا کہ كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ (3:110) تم بہترین قوم ہو جسے ہم نے پیدا کیا ہے۔ کاہے کے لیے پیدا کیا اس قوم کو؟ پہلی چیز تو یہ ہے کہ یہ خَيْرَ اُمَّةٍ (3:110) بہرحال بہترین قوم جو ہوگی' زندگی کی بہترین خوشگواریوں کی وہ حامل ہوگی لیکن یہ تو اپنی ہی ذات کے لیے ہوا۔ یہ تو خاصہ نیشنل ازم کا ہے' قومیت کا ہے' دنیا کی زندہ قومیں ہر کام میں اپنی قوم کی خوشگواری کی فکر کرتی ہے۔ اس کا ہر فرد اپنی قوم کے لیے ہوتا ہے' قوم بھی اپنی ذات کے لیے ہوتی ہے

۔زیادہ سے زیادہ PROSPERITY' خوشحالی' خوشگواری اپنی قوم کے لیے ہوتی ہے اور اسے PATRIOTISM کہا جا[8] آلِ عمران 478
ہے۔ بہت بڑا جوہر' اپنی قوم کے لیے۔ کیا یہ جو قوم پیدا کی گئی تھی یہ اسی لیے تھی کہ یہ خود اپنی PROSPERITY ' خوشحالی' مرفع الحالی' خوشگواری کے لیے ہی کام کاج کرے؟ یہی مقصد تھا؟ جیسا میں نے عرض کیا ہے یہ تو بہرحال دنیا کی ہر قوم (زندہ قوم جو ہے ہمارے جیسی قوم نہیں) ہر زندہ قوم اتنا کچھ تو وہ خود اپنے لیے تو ہر قوم کرتی ہے۔ کہا تم بہترین امت ہو اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تمام نوعِ انسانی کی بھلائی کے لیے ہم نے تمہیں پیدا کیا ہے۔ یہ 'ل' نفع مندی کے لیے ہے۔ پوری انسانیت کی بھلائی کے لیے تمہیں پیدا کیا ہے۔ عزیزانِ من! سوچیے جس امت کو پیدا کیا گیا تھا پوری انسانیت کی نفع بخشیوں کے لیے' ظاہر ہے کہ سب سے پہلے تو اس قوم کا خود اس حالت میں رہنا ضروری ہوگا تا کہ خود خوشگواریوں کی حامل ہوگی تو دوسرے کو دے گی۔ جس کے اپنے ہی پاس کچھ نہیں ہے' وہ دوسرے کو کیا دے گا۔ پہلے اپنی حالت کا بہتر ہونا تو ضروری ہے۔ وہ جو میں بتایا کرتا ہوں کہ اس نے فقیر نے آ کے باہر سوال کیا کہ بابا! خدا کے نام پہ کوئی روٹی کا ٹکڑا دے دو۔ انہوں نے کہا'' اوئے جا اوئے جا چلا جا' اتھے ہے نئیں روٹی رووٹی کوئی وی''۔ اس نے کہا کہ بھائی! کوئی کپڑا ہی دے دو اللہ کے نام پہ' سردی کا زمانہ ہے۔ انہوں نے کہا کہ جا تمہیں کہا جو ہے یہاں کپڑا وپڑا کچھ نہیں ہے۔ اس نے کہا کہ کوئی پیسے ہی چار دے دو مجھے۔ انہوں نے اور ڈانٹ کے کہا کہ'' تینوں اینی واری کہیا ہیگا پئی نئیں ہیگا اتھے پیسہ وی کوئی نئیں ہیگا' جا چلا جا۔ کہن لگا جے تہاڈے کول نہ روٹی ہے نہ کپڑا ہے نہ پیسہ ہے' تے تسی اندر کر دے کی او چلو باہر نکلو کٹھے رل کے منگیے فیر''۔

جو قوم خود روٹی کے چند ٹکڑوں تک کی محتاج ہو وہ کسی کے کیا کام آئے گی

عزیزانِ من! جس قوم کی اپنی حالت یہ ہو کہ وہ اپنی روٹی تک کے لیے دوسروں کی محتاج ہو اور دوسرے وہ جنہیں اٹھتے بیٹھتے یہ کافر ملعون' مردود کہتے رہیں اپنے ہاں' ان کی محتاج ہو وہ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ (3:110) کیا ہوگی؟ وہ نوعِ انسانی کی منفعت بخشی کے لیے وہ قوم کیا ہوگی؟ اس مقصد کے لیے تمہیں پیدا کیا تھا۔ اور پھر اس کی سیاسی پوزیشن یہ ہونی چاہیے تَأْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ (3:110) فریضہ تمہارا یہ ہے پوری انسانیت کے اندر تم جتنی چیزیں خدا کے قوانین کے مطابق RECOGNIZE کی گئی ہیں' اچھی چیزیں جو ہیں ان کا حکم دو تَأْمُرُوْنَ (3:110) حکم دو ان کا۔ جیسا میں نے عرض کیا تھا وعظ اور اپدیش جو ہیں یہ چیزیں جو ہیں' یہ تامرون کی بات نہیں ہے' حکم دینے کی بات ہے یہاں تو' ہاتھ جوڑ کے بخشیش کہنا جو ہے

یہ تو ذلیل ہونے کی چیز ہے۔ اور پھر یہ وعظ ہمارے ہاں کے کہ کفار کی اطاعت' فرماں پذیری' محکومیت کے اندر ساری زندگی بسر کرنا اور اپنے آپ کو کہنا بہترین قوم ہم پیدا ہو گئے ہیں۔ بہترین قوم جو نوعِ انسانی کی بھلائی کے لیے پیدا کی گئی ہے اس کو اتنی بڑی سیاسی قوت کا مالک ہونا چاہیے تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَ تَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ (3:110) ہر وہ بات جو خدا کے قانون کے خلاف ہے اس کو روکنے کی قوت اس کے اندر ہے جو اس کے مطابق ہے اس کو نافذ کرنے کی قوت اس کے اندر ہو۔ یہ ہوگی کس طرح سے؟ دوسروں پر یہ حکم نافذ کیسے کیا جائے گا؟ کیا بنیادی شرط ہے؟ وَ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ (3:110) اب آپ نے سوچا خدا پر ایمان کے معنی کیا ہیں۔ اتنی بات یہاں کہی ہے۔ عزیزانِ من! خدا پر ایمان کے یہ معنی ہیں ایک محکم امت' SOLID امت' تفرقہ نہیں' اختلاف نہیں' بنیانِ مرصوص کی طرح' سیسہ پلائی ہوئی دیوار کی طرح اپنے اندر ساری خوشگواریوں خوشحالیوں کی حامل اتنی بڑی سیاسی قوت کی مالک کہ پوری انسانیت کے لیے ان کی منفعت بخشیوں کے کام کرے۔ خدا کے احکام کو نافذ کرنے کی ان کے اندر قوت موجود ہو۔ یہ ہے اس چیز کا ثبوت کہ ہمارا ایمان خدا پر ہے۔ وَ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ (3:110) اللہ پر ایمان رکھنا۔

اہلِ کتاب کا طرزِ زندگی اور ہماری ذہنی کیفیت

اب رہے وہ جن کا ذکر اہلِ کتاب کا آ رہا تھا اور میں نے عرض کیا تھا آپ کو یاد ہوگا وہ پورا درس میں نے اس میں صرف کیا تھا کہ اہلِ کتاب کے معنی نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانے کے یہود و نصاریٰ ہی نہیں ہیں۔ وہ اہلِ کتاب کیوں کہلائے تھے اس زمانے میں؟ جس جس نبی کی وہ امت تھے اس نبی کا ذکر تو قرآن نے کیا اس کے متعلق کہا کہ خدا نے ان کو کتاب دی' دین دیا' وہی دین دیا جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو دیا گیا۔ وہ اپنی نسبت تو ان کی طرف کرتے تھے فرق کیا تھا؟ منسوب اپنے آپ کو ان کی طرف کرتے تھے اس کا بھی دعویٰ تھا کہ ہماری طرف خدا کی کتاب آئی ہوئی ہے لیکن ان کا عمل اس کے مطابق نہیں تھا' چھوڑ بیٹھے ہوئے تھے' دین کو چھوڑ کے انہوں نے مذہب اختیار کر لیا ہوا تھا۔ مذہب انسانوں کا خود ساختہ ہوتا ہے' دین خدا کی طرف سے دیا ہوا ہوتا ہے۔ اہلِ کتاب انہیں کہا جاتا ہے کہ جن کو خدا کی طرف سے کتاب ملی' ہو وہ کتاب کو چھوڑ کے انسانوں کے بنائے ہوئے مذاہب کے پیچھے چل نکلے خواہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانے کے یہود و نصاریٰ ہوں یا آج کے دور کا مسلمان ہو۔ ہم اسی مقام پہ کھڑے ہیں جس مقام کے اوپر حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانے کے اہلِ کتاب تھے۔ آپ قرآن میں دیکھیے گا جو جو باتیں اہلِ کتاب کہہ کے قرآن نے ان کے متعلق کہی تھیں' ایک ایک ان میں سے ہم پہ منطبق ہوتی ہے۔

478آلِ عمران

ہماری پس ماندگی کا شافی علاج خدا کی آخری کتاب میں محفوظ ہے

سوال یہ پیدا ہو گیا کہ جو قوم اس مقام پہ اتر آئے۔ خدا کے دیے ہوئے دین کو چھوڑ کے انسانوں کے بنائے ہوئے مذہب کے اوپر چلنے لگ جائے۔ کیا اس کے بعد ابدی مایوسی ہے؟ ان قوموں کے لیے تو یہ صورت تھی کہ ان کے پاس خدا کی کتاب اپنی اصلی شکل میں نہیں رہی تھی' ان کے لیے جہنم سے نکلنے کا ایک موقع دیا گیا جب وہی دین خدا نے عطا کیا حضور ﷺ کو۔ ان قوموں سے یہ کہا گیا کہ اسے تم ACCEPT کرو' اس پر ایمان لاؤ' یہ وہی ہے جو تمہارے پیغمبر کو ملا تھا۔ اس سے تم انسانوں کے بنائے ہوئے مذہب کو چھوڑ کے خدا کے دیے ہوئے دین پہ پھر سے آ جاؤ گے۔ ہماری پوزیشن اس اعتبار سے ان کے مقابل میں ADVANTAGEOUS ہے۔ ہمارے پاس خدا کی کتاب اپنی اصلی شکل میں موجود ہے اور یہی معنی ہیں ختمِ نبوت ﷺ کے۔ خدا کی کتاب اگر محفوظ رہے اس کے بعد پھر نبوت کی کوئی ضرورت نہیں رہتی۔ یہ سارے جھمیلے اور فریب دہی ہے تشریعی نبی غیر تشریعی نبی۔ نبی کی کوئی قسمیں ہی نہیں ہوتیں۔ خدا کی کتاب اصل میں ہوتی ہے جسے وہ لے کے آتا ہے۔ وہاں نبی کی ضرورت اس لیے پڑتی تھی کہ اس کی کتاب اپنی اصلی شکل میں نہیں رہتی تھی۔ نبی اکرم ﷺ کے بعد اس لیے ضرورت نہیں کہ کتاب مکمل ہو گئی وَتَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ صِدْقًا وَّعَدْلًا ط لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِهٖ ج (6:115) تبدیلی نہیں ہوگی' مکمل ہو گئی' خدا نے اس کی حفاظت کا ذمہ لے لیا' مقصدِ نبوت پورا ہو گیا۔ اس لیے اس قوم کو امتِ مسلمہ کے لیے یہ پوزیشن ADVANTAGEOUS تھی کہ اس کو کسی آنے والے کا انتظار نہیں کرنا پڑتا تھا اس کے پاس خدا کی کتاب محفوظ ہر وقت موجود تھی۔

مسلمان امت سے قرآنِ حکیم کا آج پھر مطالبہ ہے

کرنا اس کے لیے کیا تھا؟ جو ان سے کہا گیا تھا وَلَوْ اٰمَنَ اَهْلُ الْكِتٰبِ لَكَانَ خَيْرًا لَّهُمْ ط (3:110) اگر یہ اہلِ کتاب اس پر ایمان لے آئیں ان کے لیے بھی لَكَانَ خَيْرًا لَّهُمْ (3:110) کیا معنی؟ یہ وہی كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ (3:110) کے اندر داخل ہو جائیں گے ان کے لیے بہتر ہو جائے گا یہ' یہ بھی اس قوم کے جزو بن جائیں گے۔ وہی شرط ہے وَ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ (3:110) یہاں کہا تھا کہ تم خیرِ امت اس لیے بنے ہو کہ خدا پر ایمان ہے اب جو تم نے خدا پر ایمان اس شکل میں چھوڑ دیا' اپنے ہی ذہن کے فریب میں آ گئے اور کہنے لگ گئے کہ ہم ایمان والے ہیں' یہ سارے کافر ہیں تو تم بھی ان میں آ گئے کہ جنہیں پھر ایمان لانے کی ضرورت ہے اس قرآن پر۔ اور یہ چیز قرآن نے دوسرے مقام پہ واضح الفاظ میں کہی ہوئی ہے يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اٰمِنُوْا بِاللّٰهِ

(4:136) اس قوم کو مخاطب کر کے کہا ہے اے وہ جو اپنے آپ کو ایمان والے کہتے ہو' مدعی ہو اسلام کے مسلمان ہونے کے 478 آلِ عمران
نہیں رہے ہوئے' ایمان لاؤ تم خدا پر' ایمان لاؤ ومانزّل علی محمد ﷺ پر۔ جو محمد ﷺ پہ نازل کیا گیا ہے (47:2) اس پہ ایمان لاؤ۔ عزیزانِ من! ایمان تو ایک تعمیری عمل کا نام ہے' کوئی رسم نہیں ہے' کوئی فارم پر کر کے ممبر بن جانا نہیں ہے۔ خَیۡرَ اُمَّةٍ (3:110) بنتا ہے تُؤۡمِنُوۡنَ بِاللّٰهِ (3:110) سے۔ ایمان کے معنی ہی یہ ہیں کہ وہ خیر امت بنی ہوئی ہو۔ خیر امت نہیں رہی تو ایمان نہیں ہے اس کا۔ تو جو بھی اہلِ کتاب کی سطح پر آ گئی ہے قوم اس کے لیے پھر سے اس فردوسِ گم گشتہ کی بازیابی کی ایک ہی شکل ہے وَ لَوۡ اٰمَنَ اَهۡلُ الۡکِتٰبِ لَکَانَ خَیۡرًا لَّهُمۡ ؕ (3:110)۔ عزیزانِ من! تفرقے سے نکلنے کی' اختلافات کو چھوڑنے کی ایک ہی صورت قرآن نے بتائی تھی وَ اعۡتَصِمُوۡا بِحَبۡلِ اللّٰهِ جَمِیۡعًا (3:103) خدا کی اس رسی کو سارے اجتماعی حیثیت سے تھام لو وَ لَا تَفَرَّقُوۡا (3:103)۔ صرف حبل اللہ ہے صرف خدا کی کتاب ہے اس کو تھامنے سے قوم ایمان باللہ کی حامل ہو سکتی ہے' اس کی مدعی ہو سکتی ہے۔ وَ لَوۡ اٰمَنَ اَهۡلُ الۡکِتٰبِ لَکَانَ خَیۡرًا لَّهُمۡ (3:110) سوچیے تو سہی یہ اہلِ کتاب میں سے کوئی بھی ایسا نہیں تھا جو خدا کا منکر ہو' انہیں کیوں کہا جاتا ہے کہ خدا پہ ایمان لاؤ؟ وہ تو کہیں گے کہ ہم تو پہلے ہی خدا کو مانتے ہیں۔ خدا کے ماننے اور ماننے میں فرق کر کے بتا دیا کہ خدا کے ماننے کا عملی نتیجہ یہ ہے کہ خَیۡرَ اُمَّةٍ (3:110) ہونا چاہیے اس کو۔ اگر اہلِ کتاب بھی ایمان لاتے ان کے لیے یہ بہتر ہو جاتا لیکن ان کی کیفیت یہ ہے مِنۡهُمُ الۡمُؤۡمِنُوۡنَ وَ اَکۡثَرُهُمُ الۡفٰسِقُوۡنَ (3:110) ان میں سے بہت تھوڑے ہیں جو ایمان لاتے ہیں' اکثریت ان کی وہی ہے جو اپنے اپنے راستے پہ نکلے جا رہے ہیں۔ فاسق میں نے عرض کیا تھا جو اس پیٹرن کو چھوڑ کر جو خدا نے بنایا ہوا ہے' اپنے لیے دوسرا پیٹرن اختیار کر لیں۔ کہا یہ کہ اگر یہ لوگ ایسا نہیں کریں گے تمہارا اس میں کوئی نقصان نہیں ہوگا لَنۡ یَّضُرُّوۡکُمۡ اِلَّاۤ اَذًی ؕ (3:111) تمہیں کوئی مضرت نہیں پہنچائیں گے کچھ تھوڑی سی ہراسمنٹ ضرور ہوگی' تھوڑی سی پریشانی کا موجب یہ بن جائیں گے کچھ وقت کے لیے' بنیادی تباہی کا موجب تمہارے لیے نہیں بن سکتے۔ انتہا ان کی یہ ہوگی کہ میدانِ جنگ میں تمہارے سامنے آ جائیں گے۔

جنگِ بدر کے تین سو تیرہ السابقون الاولون کا عظمتِ کردار

وَ اِنۡ یُّقَاتِلُوۡکُمۡ یُوَلُّوۡکُمُ الۡاَدۡبَارَ قف ثُمَّ لَا یُنۡصَرُوۡنَ (3:111) مومن اور کافر کا یہاں بھی ایک فرق سامنے آتا ہے۔ یہ میدانِ جنگ میں سامنے تمہارے آئیں گے پیٹھ دکھا کر بھاگ جائیں گے جبکہ مومن میدانِ جنگ سے پیٹھ دکھا کر نہیں بھاگا کرتا۔ وہ تو آپ نے دیکھا ہے سورۃ الانفال میں بدر کے میدان کا ذکر جو ہے۔ وہ جو پوری انسانیت کا سارا نچوڑ تھے تین سو تیرہ جن کے

ایمان کو قرآن ہمارے لیے بطور شہادت پیش کرتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ سپہ سالار تھے‘ یہ فوج تھی صحابہؓ کی‘ انہیں‘ 8میدا 478 **آلِ عمران**
جنگ میں جب صف بستہ وہ کھڑے ہو گئے ہیں اور کیفیت یہ تھی کہ ''سینۂ شمشیر سے باہر ہے دم شمشیر کا'' عین اس وقت آخری آیت نازل ہوئی تھی ان کی‘ انہیں یہ کہا گیا تھا کہ یاد رکھو! آج تم میں سے جو شخص اس میدان سے پیٹھ دکھا کے بھاگ جائے گا بجز اس کے کہ وہ کوئی سٹریٹجی ہو فوجی تدبیر کے لیے ایسا کرنا پڑے یا اپنے گروہ کے ساتھ ملنے کے لیے ایسا کرنا پڑے جو دشمن کو پیٹھ دکھا کے بھاگ جائے گا۔عزیزانِ من! تین سو تیرہ ہیں السابقون الاولون ہیں جن سے یہ کہا گیا ہے کہا کہ جو تم میں سے آج تم میں سے پیٹھ دکھا کے بھاگ جائے گا‘ سیدھا جہنم میں چلا جائے گا۔اور ایک بھی جنگ وہ ایسی نہیں کہ جس میں ایک مومن بھی کبھی پیٹھ دکھا کے وہاں بھاگا ہو۔ وہ تو خدا سے مانگتے تھے اس قسم کی موت۔کہا یہیں پتہ چل جائے گا تم سامنے جاؤ گے تو دیکھو گے یہ کس طرح سے پیٹھ دکھا کے بھاگتے ہیں۔ثُمَّ لَا یُنۡصَرُوۡنَ (3:111) کوئی ان کی مدد پھر نہیں کرے گا۔جو خود میدانِ جنگ سے بھاگ جاتا ہے اس کی کوئی مدد نہیں کیا کرتا۔ بھاگیں گے تو اس کے بعد کیفیت کیا ہوگی پھر؟ عزیزانِ من! یہ کسی ایک میدانِ جنگ کا ذکر نہیں ہے یہ تو مصافِ زندگی کا ذکر ہے پوری زندگی کے میدان کے اندر کشمکش اور تصادم ہوتا ہے۔

گریز کشمکشِ زندگی سے مردوں کی
اگر شکست نہیں ہے تو اور کیا ہے شکست

ہم لوگ ٹھیک ہے اس میدان میں نہیں ہیں جہاں توپیں چلتی ہیں‘ بندوقیں چلتی ہیں لیکن زندگی کا تو ہر میدان میدانِ جنگ ہوتا ہے۔ ہر آن ہر سانس میں ایک تصادم ہوتا ہے‘ ایک لڑائی ہوتی ہے۔ جسے ہم اپنے لیے امن سمجھتے ہیں‘ یہ فرار ہے زندگی سے‘ کشمکشِ حیات سے یہ پیٹھ دکھا کے بھاگنے والی بات ہے۔

دل و دماغ کو جلا بخشنے والی مردِ مومن کی شخصیت تو ہر آن ایک نئی شان کی حامل ہوتی ہے

مومن میدانِ جنگ ہی سے پیٹھ نہیں دکھاتا وہ زندگی کے ہر مصاف اور ہر میدان میں سینہ سپر ہو کر مقابلہ کرتا ہے ہر قسم کی مخالفت کا۔مومن کی تو ساری زندگی جہاد میں گذرتی ہے۔ وہ جو نبی اکرم ﷺ کی ہیرے کی طرح چمکنے والی حدیث ہے۔فرمایا کہ مومن کی زندگی کیا ہے؟ ارشاد ﷺ ہوا کہ جب جہاد ہو رہا ہو تو اس جنگ کے میدان میں ہو‘ جب نہ ہو رہا ہو تو اس کی تیاری میں مصروف ہو۔ یہ جہاد کیا ہے؟ جدوجہدِ حیات کا نام ہے‘ زندگی میں عملِ پیہم کا نام ہے‘ تگ و تاز کا نام ہے‘ سعیِ مسلسل کا نام

ہے۔لہٰذا زندگی کے کسی مقابلے میں بھی پیٹھ دکھا جانا' یہ وہی ہے جو قرآن نے کہا ہے نتیجہ اس کا؟ ضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ اَيْنَ مَا آلِ عمران 478
ثُقِفُوْا ((3:112 ذلت اور مسکنت' افلاس' محتاجی' محکومی اس کی مار ماری جاتی ہے ان کے اوپر۔ اَيْنَ مَا ثُقِفُوْا (3:112)
جہاں کہیں بھی وہ یہ ان کے پیچھے ہوتی ہے ذلت اور خواری۔عزیزانِ من! کتنا بڑا عذاب ہے کشمکشِ حیات سے فرار کا جو نتیجہ ہوتا ہے۔سوچیے تو سہی ہمیں کیا سکھایا گیا کہ یہودیوں کے متعلق گفتگو ہو رہی ہے جی' ٹھیک ہے جی۔ یہ عیسائیوں کے متعلق ہے جی' یہ مشرکینِ مکہ کے متعلق ہے صاحب۔ یہ سارے جہنم' ساری تباہیاں' سارے عذاب یہ سارے ان کے لیے ہیں اور ہمارے لیے ؟ تم تو ان کے چہیتے نبی ﷺ کی چہیتی امت ہو صاحب! جنت تمہارے لیے ہے۔'بہشتِ فی سبیل اللہ ہم است' وہ جو کہتا ہے اقبالؒ ' بگو ہندی مسلماں را کہ خوش باش' کہ ایک جنت تو ملتی ہے تگ و تاز کے نتیجے میں' میدانِ جنگ کے نتیجے میں' مخالفتوں کے مقابلے میں نتیجے میں' جہاد کے نتیجے میں۔اس نے کہا کہ ہندی مسلمان سے کہو کہ مایوس نہ ہو' خوش باش مطمئن رہو' فریب دیئے رہو' بہشتے فی سبیل اللہ ہم است' ''اللہ واسطے وی ملدی ہوندی ہیگی اے''۔

بخشیش میں حاصل کردہ جنت کی کوئی معیاد ہی نہیں رہتی

ہمارے ہاں تو زبان میں محاورہ ہے زبان بڑی غماز ہوتی ہے'' یا اللہ بخش دے'' ''بخشیش منگدا رہندا اے ساری عمر'' منگتی ساری قوم۔سمجھ لیا نا۔سب سے بڑی دعا ہماری یہ ہوتی ہے'' بخشش دی دعا منگو اللہ کولوں'' بخشش وہ مانگتا ہے بخشیش مانگتا رہتا ہے گدا فقیر محتاج۔قرآن کہتا ہے کہ جب جنت دی جائے گی تم سے کہا جائے گا کہ اس جنت کا تمہیں وارث بنایا جاتا ہے بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ (32:14)۔قصۂ آدم کیا ہے؟ عمل کے بغیر ایک جنت ملی تھی نا بخشیش کی' ذرا سی ایک معصیت ہوئی' ایک لات لگائی وہ گیا۔معاف رکھیے یہ کوئی نبی نہیں ہیں جن کا میں کہہ رہا ہوں۔اور اس کے بعد کہا کہ اب بخشیش کی جنت نہ مانگنا' دیکھ لو یہ حالت ہوا کرتی ہے۔اب اپنے عمل کے نتیجے کے اندر جنت حاصل کرو بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ (32:14) جس کا نتیجہ ہوگا۔اس کے بعد خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا (4:122) اب تمہیں کوئی نہیں یہاں سے نکالے گا۔'' کم دے نتیجے اچ مول لئی ہوئی ہیگی اے'' اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰى مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اَنْفُسَهُمْ وَ اَمْوَالَهُمْ بِاَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ ط(9:111) ہم نے قیمت دے کے یہ خریدی ہوئی ہے اور تو اور خدا بھی اس میں سے نہیں نکالے گا'' بڑا سچا معاملے دا ہیگا اے''۔''بخشیش دی جنت تہاڈے پیؤ نے لئی سی نا او ہدے نتیجے اچ ہُن تیکر اسی جوتیاں کھان ڈئے ہیگے آں''۔عمل کا نتیجہ ہے جنت۔

آں بہشتے کہ خدا بہ تو بخشد ہمہ ہیچ

وہ جنت جو تمہیں خدا بخشش میں دیتا ہے بالکل ہیچ ہے

تا جزا عملِ تست٬ جناں چیزے ہست

''اوہو جنت وسن دے قابل ہیگی اے جنوں آپ خریدیں تے آپ لویں جا کے''۔

جچتے نہیں بخشے ہوئے فردوس نظر میں

قرآنِ حکیم کے مطابق جنت ہو یا جہنم وہ تو انسان کے اعمال کا ہی اجر ہوتی ہے

مومن کی نگاہ مانگے ہوئے جنت میں جاتی ہے؟ نہ عزیزانِ من! بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ (32:14) تمہارے اعمال کا فطری نتیجہ ہے وہ جنت جو ہے۔لہٰذا یہ جو فرار ہے زندگی کا' مصافِ حیات سے' نتیجہ اس کا ہوتا ہے ضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ اَيْنَ مَا ثُقِفُوْا ((3:112 جہاں کہیں جاؤ گے ذلت اور خواری تمہارے پیچھے سایے کی طرح یہ لگی رہے گی۔ میں نے کہا تھا کہ ہمیں فریب میں مبتلا کر رکھا ہے کہ یہودیوں کے متعلق کہا ہے جی یہ ہمارے متعلق نہیں ہے یہ جو کچھ کہا ہے۔اَيْنَ مَا ثُقِفُوْا (3:112) عزیزانِ من! کسی کے متعلق یہ کہا ہو لیکن آپ سوچیے تو سہی یہ کس کی حالت ہے آج یہ کہ جہاں بھی جاؤ یہ ذلت تمہارے پیچھے لگی رہے گی ۔تو بہ تو بہ۔ ہاں کبھی کبھی ایسا ہو جائے اِلَّا بِحَبْلٍ مِّنَ اللّٰهِ وَ حَبْلٍ مِّنَ النَّاسِ ((3:112 کبھی کچھ اس میں ذرا سی کس صورت میں بھی تمہیں رعایت مل جائے۔ بڑی عجیب چیز قرآن نے کہی ہے بِحَبْلٍ مِّنَ اللّٰهِ (3:112) اس بنا پر کہ بہر حال تم اپنے آپ کو خدا پرست کہتے ہو خدا پر ایمان لانے والے کہتے ہو' کوئی قوم جن کی مصلحت اس میں ہو کہ اس نام کے اوپر ہی تمہیں کسی طرح سے حفاظت کا سامان دے جائے' روٹی کا ٹکڑا ڈال دے' ایسا کسی وقت ہو جائے گا۔اس سے پہلے یہ بات کم سمجھ میں آتی تھی کہ یہ کس طرح سے یہ صورت ہوگی؟

مذہب اور روٹی کے چند ٹکڑوں کی آڑ میں کمیونزم کے خلاف سرمایہ دار سلطنتوں کا اجتماع

ہمارے اس دور میں تو یہ بات بڑی اچھی طرح سے سمجھ میں آئی۔ روس سے کمیونزم کا طوفان اٹھا۔مغرب کے جتنے سرمایہ دار سلطنتوں کے قصر تھے' ان میں تزلزل واقع ہوا' ان کو ضرورت پیش آئی کہ ان کے خلاف ایک محاذ قائم کیا جائے۔محض سیاست کی بنا پہ اگر دعوت دیتے تو ہر ملک یہ سوچتا کہ سیاسی اعتبار سے مجھے اس محاذ میں شامل ہونا چاہیے یا نہیں ہونا چاہیے۔ سیاسی تدبر بڑا گہرا

آلِ عمران 478 ہوتا ہے۔ سوچا انہوں نے یہ کہ مسلمانوں کا یہ بحرِ ذخار جو انڈونیشیا سے مراکش تک چلا جارہا ہے پورے کا پورا بیلٹ اور سب سے زیادہ بھوکی قوم یہ ہے۔ انہوں نے اگر یہ دیکھ لیا کہ وہاں کم از کم روٹی کے لیے کچھ انتظام ہورہا ہے تو یہ ہوسکتا ہے کہ یہ وہاں لپک جائیں۔ انہوں نے اس کے لیے ایک نعرہ ایجاد کیا۔ وہ کمیونزم خدا کا انکار تھا۔ اِنہوں نے کہا BELEIVERS IN GOD, UNITE TOGETHER آ ؤ اکٹھے ہوجائیں گے خدا پرستو آ ؤ اکٹھے ہوجائیں۔ آپ نے دیکھا یہ خدا پرستی کا ان کا دعویٰ ''اے کھوٹا پیسہ کم کتھے آیا ایناں دے''۔ اب وہاں سے ایڈ بھی مل رہی ہے، معاہدے بھی ہورہے ہیں، جتھہ بھی بن رہا ہے'' تہانوں کوئی بری نظر ناں دیکھ نئیں سکدا، ایسی دی تیسی او ہدی جیہڑا تہاڈے ول آکے ویکھے'' حمایت بھی ہورہی ہے سب کچھ ہو رہا ہے۔ کس بنا پہ ہورہا ہے؟ اوبھئی! تم BELEIVERS IN GOD ہو ہم بھی BELEIVERS IN GOD ہیں۔ اِلَّا بِحَبۡلٍ مِّنَ اللّٰهِ (3:112)۔

مستقل اقدار کی منزل کو نظر انداز کرنے کا نتیجہ ہمیشہ ذلت ومسکنت کے عذاب کے سوا کچھ اور نہیں ہوتا

کہا یوں کبھی صورت پیدا ہوسکتی ہے کہ محض تمہارا خدا پرست ہونا کسی کی سیاست اور مصلحت کوشیوں کے لیے مفید ہو تو یوں ذرا کچھ تھوڑا سا اس کے لیے تمہیں کہیں سے کچھ مدد مل جائے وَ حَبۡلٍ مِّنَ النَّاسِ (3:112) یا دوسری قوموں کے ساتھ معاہدے تم کرواس میں ممکنہ ہو۔ ورنہ وَ بَآءُوۡ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ (3:112) تمہارے لیے یہ عارضی طور پر کبھی کبھی اس قسم کی شکل پیدا ہوجائے گی لیکن خدا کا عذاب تو مستقل طور پر تمہارے پیچھے لگا رہے گا۔ وَ ضُرِبَتۡ عَلَيۡهِمُ الۡمَسۡكَنَةُ ؕ (3:112) ذلت اور ضعف اور کمزوری کا نام ہوتا ہے عزت کے مقابلے میں، عربی زبان میں عزت قوت کو کہتے ہیں غلبے کو کہتے ہیں۔ ذلت اس کے مقابلے میں ضعف ہوتا ہے، کمزوری کو کہتے ہیں، WEEKNESS کو کہتے ہیں اور مسکنت حرکت کے مقابلے میں ساکن ہوجانا ہے۔ کسی قوم کی حرکت ہوجائے ساکن، چل ہی نہ سکے آگے، جمود طاری ہو اس کے اوپر اور جتنا زیادہ جمود ہوا تنا ہی زیادہ وہ خدا کا مقرب اپنے آپ کو سمجھے۔ جس خدا کی کائنات میں ایک ثانیہ کے لیے بھی جمود نہیں ہے ''ثبات اِک تغیر کو ہے زمانے میں''۔ جہاں اس کی کائنات میں كُلَّ يَوۡمٍ هُوَ فِىۡ شَاۡنٍ (55:29) کی کیفیت ہے ہر آن میں ایک نئی شان ہوتی ہے۔ وہاں کسی قوم پہ جمود طاری ہوجائے سب سے بڑا خدا کا عذاب یہ ہے۔ جمود کے مقابلے میں حرکت ہے۔ وہ تو کہہ گیا ہے رومی

حرکتِ بے ہودہ بے از خفتگی

بے کار سی حرکت بھی جو ہے سو جانے سے وہ بھی بہتر ہوتی ہے، حرکت تو ہوتی ہے۔

وَ ضُرِبَتۡ عَلَیۡهِمُ الۡمَسۡکَنَةُ ؕ ذٰلِکَ بِاَنَّهُمۡ کَانُوۡا یَکۡفُرُوۡنَ بِاٰیٰتِ اللّٰهِ (3:112) وہی کفر' یہ اس لیے تھا کہ انہوں نے خدا کے ضوابط سے انکار کیا۔ اور کیفیت پھر یہ کہ جو کوئی خدا کے ضابطے کی طرف دعوت دینے والا آیا' اس کو اٹھ کے پھانسی پہ لٹکا دیا۔ یہاں تک پھر کیفیت اس سرکشی کی انحراف کی پہنچ جاتی ہے کہ جو ادھر کو دعوت دینے والے ہوں ان دعوت دینے والوں کو پکڑ کے کہتے ہیں' کھالیں کھنچوا دیجیے' قید و بند میں پہنچا دیجیے' حوالۂ دار و رسن کر دیا۔ وَ یَقۡتُلُوۡنَ الۡاَنۡۢبِیَآءَ بِغَیۡرِ حَقٍّ ؕ (3:112) انبیا کو قتل کیا انہوں نے بِغَیۡرِ حَقٍّ (3:112)۔ بِغَیۡرِ حَقٍّ (3:112) کے معنی یہ نہیں ہو سکتے کہ انبیا کو قتل کرنا حق پہ بھی ہو سکتا ہے' اس کے معنی یہ ہوتا ہے کہ یہ بات کبھی حق پہ ہو ہی نہیں سکتی۔ میں نے عرض کیا ہے کہ یہ تو پہلی بات تھی نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بعثت سے پہلے کی جب انبیا کا سلسلہ تھا۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد یہ قتلِ انبیا کیا ہے؟ وہ مشن جو انبیا کا تھا خدا کی کتاب کی طرف دعوت دینا' یہی مشن تھا انبیا کا۔

مختلف مذہبی فرقوں کی آبیاری کرنے والوں کے مقابلے میں خالص فکرِ قرآنی کو عام کرنے والوں کے ساتھ ہونے والا سلوک

کتاب لانا یہ ایک چیز تھی' کتاب لانا تو اب ضرورت نہیں' کتاب موجود ہے۔ اب یہ کہ خدا کی طرف دعوت دینا اگر آپ اپنی مسلمانوں کی تاریخ دیکھیں' ان کی پوری تاریخ میں سب سے زیادہ عذاب' سب سے زیادہ تکلیف' سب سے مخالفت جو ہوئی ہے' وہ ان کی ہوئی ہے جنہوں نے خدا کی کتاب کی طرف دعوت دی ہے۔ انسانوں کے بنائے ہوئے مذاہب کی طرف دعوت دینے والے سارے فرقے موجود ہیں قرآن کی طرف دعوت دینے والوں کے نام تاریخ میں ہمیں اس طرح ملتے ہیں کہ ان لوگوں نے کہیں ان کو گالی دی ہو تو پتہ چلتا ہے کہ اچھا یہ بھی ایک کوئی تھا۔ پہلی مستقل مخالفت وہ ایک جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف روایت منسوب کی جاتی ہے (سندیں دیکھیے نا کہاں سے یہ لاتے ہیں اب) کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ بچنا ایک فتنے سے وہ بہت بڑا فتنہ ہے آنے والا۔ فرمایا کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم وہ کونسا فتنہ ہے؟ کہنے لگے وہ فتنہ ہے وہ شخص جو تمہیں بیٹھ کے کہے گا کہ خدا کی کتاب کی طرف آؤ۔ اللہ اکبر! یہ حدیث ہے یعنی منسوب کی جاتی ہے اس ذاتِ اقدس و اعظم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف جو یہ کہنے کے لیے آئے

تھے کہ میں صرف اس کتاب کا اتباع کرتا ہوں۔ کہا یہ فتنہ ہے بچنا۔ ختمِ نبوت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد قتلِ نبوت اس شکل میں ہوگا کہ جو بھی خالص خدا کی طرف دعوت دینے والا ہوگا' یہ اس کے قتل کے در پے ہوجائیں گے۔ذٰلِکَ بِمَا عَصَوْا وَّ کَانُوْا یَعْتَدُوْنَ ((3:112 یہ نتیجہ ہوتا ہے کہ جب کوئی قوم حق سے سرکشی اختیار کرلیتی ہے معصیت اختیار کرلیتی ہے اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ خود چھوڑ دیتی ہے صحیح راستے کو' صحیح راستے کی طرف دعوت دینے والوں کو پکڑ کے حوالۂ دار ورسن کر دیتی ہے۔تو کیا اس قوم کی پھر حیاتِ نو کے لیے کوئی امکان ہوسکتا ہے؟ کوئی صورت نظر نہیں آتی۔ وَ مَا ھُمْ بِخٰرِجِیْنَ مِنَ النَّار (2:167) کوئی صورت نظر نہیں آتی۔لیکن عزیزانِ من! قرآن جب تک موجود ہے یہ بات نہیں ہے کہ کوئی صورت نظر نہیں آتی۔قرآن کا محفوظ رکھے جانا تھا ہی اس لیے کہ انسانیت کے اوپر ابدی مایوسی طاری نہ ہوجائے۔ یہ ہوسکتا ہے کوئی ایک گروہ اس کو ابداً چھوڑ دے' نہ آئے اس کی طرف۔

قانونِ مکافاتِ عمل کی لاٹھی ہر باطل تصور کو بتدریج ختم کردے گی

میں یہ سمجھتا ہوں کہ مذہب پرست گروہ جو ہیں وہ تو شاید اس کی طرف نہیں آئیں گے۔اندادًا من دون اللہ کی محبت اتنی زیادہ ان کے قلب کی گہرائیوں میں وَ اُشْرِبُوْا فِیْ قُلُوْبِھِمُ الْعِجْلَ (2:93) کہتا ہے قرآن' گئو سالے کی محبت ان کے دل کی گہرائیوں کے اندر پلا دی گئی تھی۔جیسے شراب حلول کرجاتی ہے خون کے اندر' ایک درجہ تو وہ ہوتا ہے کہ کوئی چیز آپ کے معدہ میں FOREIGN MATTER چلا جائے' قے کے ذریعے سے اگلوا دیا جاتا ہے۔شراب جیسی چیز تو پینے سے خون کے اندر حل ہوجاتی ہے۔تو جب غیر اللہ کی محبتیں یوں خون کا جزو بن گئی ہوں' ان سے کیا نکلنے کی امید ہے۔زمانے کے تقاضے اقوامِ عالم کو مار مار کر لارہے ہیں خدا کی اس کتاب کی طرف۔اس لیے انسانیت تو مایوس نہیں ہوسکتی۔مختلف گروہ ہیں ٹھیک ہے جو بھی ابلیس کے پیچھے چلے گا' وہ تو مایوسی میں آجائے گا۔ابلیس کے تو معنی ہی مایوس کرنے والا ہیں یا مایوس شدہ ہیں۔اسی لیے کہا کہ لَیْسُوْا سَوَآءً ط) (3:113 یہ نہ کہو کہ یہ سب برابر ہوجاتے ہیں امکان ہی کوئی نہیں رہتا ان کے اندر مِنْ اَھْلِ الْکِتٰبِ اُمَّۃٌ قَآئِمَۃٌ یَّتْلُوْنَ اٰیٰتِ اللّٰہِ اٰنَآءَ الَّیْلِ وَ ھُمْ یَسْجُدُوْنَ ((3:113 ان میں وہ لوگ ہیں اُمَّۃٌ قَآئِمَۃٌ (3:113) وہ گروہ جو حق کے اوپر قائم ہے۔چلیے صاحب! آپ نے دیکھا کہ یہ یُضِلُّ بِہٖ کَثِیْرًا الا وَّ یَھْدِیْ بِہٖ کَثِیْرًا (2:26) اسی قرآن سے کتنے گمراہ ہوجاتے ہیں' کتنے ہدایت پہ آجاتے ہیں۔قرآن نے یہ کہا کہ ان میں سے ایک گروہ ایسا بھی ہے۔اب ہمارے ہاں ہر فرقہ کہے گا کہ دیکھا نا صاحب! یہ ہمارے متعلق ہے۔نکل آئی بچت کی صورت' دے دیا فریب اپنے آپ کو لیکن خدا کے سامنے کون کسی کو فریب دے سکتا ہے'

وہ تو بات وہیں واضح کر دیتا ہے۔کون ہیں یہ اُمَّةٌ قَآئِمَةٌ یَّتْلُوْنَ اٰیٰتِ اللّٰهِ ((3:113 صرف خدا کے قوانین کو اپنے سامنے رکھنے 478آلِ عمران والے جو ہیں ان کی پیروی کرنے والے جو ہیں یَّتْلُوْنَ اٰیٰتِ اللّٰهِ (3:113) خالص قرآن کے اوپر آنے والا۔ اٰنَآءَ الَّیْلِ وَ هُمْ یَسْجُدُوْنَ ((3:113 دن میں مصروف رہتے ہیں مختلف کاموں کے اندر' راتوں کی تنہائیوں کے اندر بھی وہ اس کے اوپر غور و فکر کرتے رہتے ہیں قرآن کے اندر وَ هُمْ یَسْجُدُوْنَ (3:113) اور پھر وہ عملاً اطاعت کرتے ہیں۔ یہاں پھر آیات اللہ کہا ہے۔ اب یہاں سے اس سے پہلے بھی ایک گمراہی کی بات آ گئی کہا کہ صاحب! قرآن خود اس میں تسلیم کرتا ہے وہی اہلِ کتاب جن کو یہود و نصاریٰ کہتے ہیں کہ صاحب! قرآن کہتا ہے کہ ان میں ایسے لوگ موجود ہیں۔

ہندوستان میں مختلف قوموں کا حشر' مسلمانوں کی پوزیشن

تحریکِ طلوعِ اسلام کی تاریخ بتاتے ہوئے ایک نجی سے اجتماع میں میں نے پرسوں بتایا تھا کہ ہندوستان میں یہ خیال پھیلایا گیا' مہاتما گاندھی نے یہ چیز سوچی کہ یہ مسلمان بڑی سخت ہڈی ہے۔ یہ جو ہندوا کال الامم ہے (حالی نے کہا تھا) قوموں کو کھا جانے والا' تاریخ میں دیکھیے ہندوستان کی' پہلے دور سے اتنی قومیں وہاں سے یہاں آئیں۔ باختریں آئے سیتھین آئے' پارتھین آئے کسی کا نام نشان بھی وہاں نہیں ملتا وہ سارے کے سارے ہندو ہیں سب کو یہ جذب کرتے گئے اپنے آپ میں۔ یہ ایک سخت قوم آئی یہ اپنے تو نہیں ہو کے رہے لیکن یہ ان کے اندر بھی ضم نہیں ہوئے۔ اور یہ چیز جو تھی اس وقت تو محکوم قوم میں ضم ہونے کا سوال نہیں تھا جب سلطنت اپنی مٹی ہے اس وقت پھر یہ ایسا موقع آتا ہے کہ یہ محکوم دوسری قوم کے اندر ضم ہو جائے' مدغم ہو جائے۔ یہ وقت آیا تھا لیکن معلوم نہیں کیوں کچھ خدا کی ہمارے اوپر ایسی نوازش تھی جیسی اس نے کہا تھا کہ بنی اسرائیل کے لیے ہم نے ان پہ احسان کیا اور ان کو پھر وہاں نجات دی اس قومِ ظالم سے' کچھ اسی قسم کا پروگرام تھا'

ہندو کی دسترس سے مسلمان قوم کو بچانے کی خاطر سر سیدؒ کی جواں مردی اور بلند نگہی کام آ گئی

عین اس وقت جب ہماری سلطنت گئی اور ہندو نے وہی پرانا حربہ استعمال کرنا چاہا کہ ان کو بھی ضم کر لیں اپنے اندر' مدغم کر لیں' جذب کر لیں۔ ایسے زمانے میں ہمارے ہاں خدا کے بندے پیدا ہوئے سر سیدؒ اٹھا۔ سلطنت آپ کی 1857ء میں گئی

ہے۔اور اس شخص نے 1862ء میں یہ بات دفتر میں بیٹھے ہوئے اپنے انگریز افسر سے کہی۔اندازہ لگایے کہاں سے یہ لوگ پیدا 478 **آلِ عمران**
ہوجاتے ہیں۔کمشنر شیکسپیئر سے یہ بات کہی۔انہوں نے یہ کہا تھا کہ ہندوستان کی قوم کے لیے یہ کچھ کررہے ہیں۔انہوںؒ نے وہاں بیٹھے ہوئے کہا کہ قوم نہ کہیے یہاں دو قومیں ہیں۔اللہ اکبر۔میں کہتا ہوں نا کہ ان چیزوں سے ہمیں نظر آتا تھا کہ شاید یہ قوم جو ہے اس کو بچانا مقصود تھا۔اُس دور میں یہ شخص کہتا ہے اور کوئی باہر کا لیڈر نہیں ہے' باغی نہیں ہے' انقلابی نہیں ہے' دفتر میں ملازم اس کا۔کہا کیا کہہ رہے ہو؟ 1880ء میں جب کانگریس بنی بڑی گہری سازش تھی وہ۔سارے ہندوستان کے مل کے ایک جماعت۔ہر طرف سے لبیک کہا گیا اس کے اوپر' بڑا اچھا MOVE ہے ضرور بننی چاہیے۔یہ شخصؒ پھر اٹھا اس نے کہا مسلمانوں سے کہ اس دامِ ہم رنگِ زمین کے فریب میں نہ کہیں آجانا' کھا جائے گی یہ قوم تمہیں' بالکل اس کے اندر شامل نہ ہونا تم نے' اپنی الگ جماعت بناؤ کیونکہ تم الگ قوم ہو۔اور اس کے لیے اس نے یہ کہا کہ طریقہ یہ ہے کہ تمہاری تعلیم کا الگ انتظام ہونا چاہیے۔اور یہ اسی کا صدقہ تھا' اسی کے اس علی گڑھ کا صدقہ تھا کہ وہاں سے جو پھر یہ لوگ نکلے ہیں یا وہاں سے متاثر ہوئے ہیں باقی جگہ بھی پھر ہمارے ہاں تعلیم گاہیں بنیں سرسیدؒ کے نظریہ کے مطابق خالص مسلمانوں کی الگ تعلیم گاہیں۔

سرسیدؒ کے بعد حضرت علامہ اقبالؒ کی طرف سے 1908ء کا اعلانِ عظیم

یہ تعلیم گاہیں تھیں وہاں کا علی گڑھ یہاں کا حمایتِ اسلام کے ہمارے ہاں کے مدرسے جنہوں نے پھر اقبالؒ پیدا کیا جس نے اس دور میں 1908ء میں یہ کہہ دیا کہ

بنا ہمارے حصارِ ملت کی اتحادِ وطن نہیں ہے
ان تازہ خداؤں میں بڑا سب سے وطن ہے
جو پیرہن اس کا ہے وہ مذہب کا کفن ہے
اے مصطفوی ﷺ خاک میں اس بُت کو ملا
دے

ملتِ اسلامیہ کے ایک روشن چراغ قائدِ اعظمؒ کی رفاقت کا ثمر مملکتِ پاکستان کا حصول

اس کا صدقہ تھا۔ساری عمر پرچار کرتا چلا گیا' یہ کہتا ہوا چلا گیا۔جاتے جاتے پھر یہ شمع جو تھی ایک ایسے سپاہی کے ہاتھ میں دے گیا جس کے اخلاص کے اوپر' جس کی دیانت پہ اس کو پورا یقین تھا اور اس نے ثابت کردیا اپنے اخلاص اور دیانت سے۔امن

سے اس کارواں کو وہ منزلِ مقصود پہ قائدِ اعظمؒ لے کے گیا ہے۔

گاندھی کے دل میں مچلنے والی واردا کی تعلیمی سکیم اور ڈاکٹر ذاکر حسینؒ شیخ الجامعہ کے صدر اور مولانا آزاد امام الہند کی خدمات

یہ کچھ جو ہو رہا تھا تو گاندھی کے دل میں یہ چیز مچل رہی تھی' کھٹک رہا تھا یہ کانٹا کہ یہ قوم بچ گئی' یہ الگ ہو رہی ہے۔اس نے کہا اس کا طریقہ یہ ایک ہی ہے انہیں یہ سبق پڑھایا جا رہا ہے کہ اسلام دنیا میں سب سے بہتر مذہب ہے۔جب تک ان کے ذہن سے یہ بات نہیں نکالی جائے گی' یہ قوم ضم نہیں ہو سکے گی' سخت ہڈی ہے۔اس نے ایک سکیم تیار کی اس نے آئیڈیا دیا' پتہ ہے سکیم کس نے تیار کی؟ نگاہیں شرم سے جھک جاتی ہیں ہم میں سے ایک شخص نے' ڈاکٹر ذاکر حسین نے' جامع ملیہ کے اس زمانے میں یہ شیخ الجامعہ تھے' یہ جو صدر تھے پچھلے سال ان کی وفات ہوئی ہے۔انہوں نے رپورٹ ایک مرتب کی اس کو واردا کی تعلیمی سکیم کہتے ہیں کہ مدرسے یہاں قائم کیے جائیں جس کے اندر یہ پڑھایا جائے کہ کسی مذہب کو دوسرے مذہب پہ کوئی افضلیت نہیں ہے بلکہ سب میں سچائیاں موجود ہیں۔

مولانا آزاد امام الہند کی قرآنی تفسیر کے خلاف تحریک طلوعِ اسلام کے کردار کی اہمیت

اب گاندھی کا یہ آئیڈیا' ذاکر حسین بھی کوئی مذہبی عالم تو تھا نہیں' سند کہاں سے ملے؟ ہر قسم کی سندیں خریدی جا سکتی ہیں۔ مولانا ابوالکلام آزاد امام الہند صاحب اس زمانے کے' بہت بڑا نام علم کی دنیا کے اندر۔انہوں نے تفسیر لکھی قرآن کی' موجود ہے۔اور ساری تفسیر میں کہا یہ (ان کا فقرہ ہے) عالمگیر سچائیاں تمام مذاہب میں یکساں طور پر پائی جاتی ہیں' ہیں موجود۔اسلام کہتا ہے کہ اگر ہر مذہب کے پیرو اپنی اپنی صداقتوں کے اوپر کاربند ہو جائیں تو میرا کام ہو گیا۔چل بھئی۔کانگریس نے اس تفسیر کا ہندی میں ترجمہ کرایا' لاکھوں کی تعداد کے اندر اس کو ہندوستان میں تقسیم کرایا۔اور یہ سر سیدؒ کا کرشمہ تھا' اقبالؒ کے ہی نام لینے والے تھے۔ پھر میں نے عرض کیا ہے میں اس دن بھی یہ کہہ رہا تھا کہ اس میں' میں نہ سمجھے گا۔پورے ہندوستان میں کسی نے اس کی اتنی مخالفت نہیں کی۔ایک طلوعِ اسلام تھا اس دور کے اندر آج اس کے فائل موجود ہیں۔واردا کی تعلیمی اسکیم کے خلاف آپ دیکھیے کہ اس کے اندر کتنا بڑا اجہاد تھا یہ اس نے کیا۔اتنا مسلسل جہاد کیا جیسا میں نے اس دن کہا تھا کہ نہ صرف یہ کہ یہ سکیم ہی ختم ہوئی اس کے لیے جو نصاب کی کتابیں مرتب ہوئی ہوئی تھیں لاکھوں کی تعداد میں ان کو بمبئی کے ساحل سے سمندر میں غرق کرنی پڑیں۔اللہ کا شکر

ہے کہ اس طرح سے ہم بچ کے آ گئے ۔ میں کہہ یہ رہا تھا کہ ان لوگوں نے یہ کہا کہ صاحب ! یہ بھی اسی مذہب کے اوپر ہیں جو دین ہے ان کا جو مسلمانوں کا ہے ۔ یہ تھی یہ آیتیں جو پیش کی جاتی تھیں لَیۡسُوۡا سَوَآءً ؕ مِنۡ اَهۡلِ الۡکِتٰبِ اُمَّةٌ قَآئِمَةٌ یَّتۡلُوۡنَ اٰیٰتِ اللّٰہِ اٰنَآءَ الَّیۡلِ ((3:113 قرآن کہتا ہے کہ صاحب ان میں ایسے لوگ ہیں موجود کہ وہ جو خدا کے کلام کو اپنے سامنے رکھتے ہیں پڑھتے ہیں' راتوں کو جاگتے ہیں' سجدے کرتے ہیں' یہ بھی اپنی پرستش کرتے ہیں' طریقہ مختلف ہوا تو پھر کیا ہوگیا۔ یہ بھی یہ کچھ کہتے تھے۔

قرآنِ حکیم کے ہاں قرآن پر ایمان والوں کی تعریف اور نشاندہی

عزیزانِ من ! یہ 113 نمبر آیت سورۃ آلِ عمران کی ہے' قرآن تو زیادہ دور جانے کی ہمیں زحمت بھی نہیں دیتا 199 آیت اسی سورۃ کی وَ اِنَّ مِنۡ اَهۡلِ الۡکِتٰبِ ((3:199 دیکھیے وہ کون سے اہلِ کتاب میں ہیں جن کے متعلق کہا ہے کہ ان میں وہ لوگ ہیں یہ نہیں کہ وہ یہودی' یہودی رہتے ہوئے ایسا ہوگیا۔ نصرانی نصرانی رہتے ہوئے ایسا ہوگیا وَ اِنَّ مِنۡ اَهۡلِ الۡکِتٰبِ لَمَنۡ یُّؤۡمِنُ بِاللّٰہِ ((3:199 ان اہلِ کتاب میں سے وہ ہیں جو ایمان لے آئے ہیں خدا کے اوپر۔ یہاں تک تو یہ تھا کہ صاحب پہلے بھی ایمان تھا وَ مَاۤ اُنۡزِلَ اِلَیۡکُمۡ ((3:199 تمہاری طرف یہ جو قرآن نازل ہوا ہے اس پہ جو ایمان لے آئے ہیں یہ ان کا ذکر ہو رہا ہے۔ یہ ہے وَ مَاۤ اُنۡزِلَ اِلَیۡهِمۡ خٰشِعِیۡنَ لِلّٰہِ ۙ لَا یَشۡتَرُوۡنَ بِاٰیٰتِ اللّٰہِ ثَمَنًا قَلِیۡلًا ؕ اُولٰٓئِکَ لَهُمۡ اَجۡرُهُمۡ عِنۡدَ رَبِّهِمۡ ؕ ((3:199 یہ کہا کہ ان میں سے یہ گروہ جو اس قرآن پہ ایمان لے آیا ہے یہ ہے یہاں لَیۡسُوۡا سَوَآءً (3:113) ہاں نسلی بات نہیں ہے کہ اہلِ کتاب یا بنی اسرائیل جو ہیں اب وہ بنی اسرائیل کے گھر میں پیدا ہونے سے سارے کے سارے CONDEMN ہو گئے کہا نہیں ! یہ تو دروازہ کھلا ہے اسلام کا جو بھی اس میں آئے لیکن ما انزل الیھم کے اوپر ایمان لانا پڑے گا اسے۔ ان پہ ایمان لا کر اس خیر امت کا جزو بنیں گے تو پھر وہ اس کے اندر آئیں گے۔ کہا وہ ٹھیک ہے CONDEMN نہ کیجیے۔ یُؤۡمِنُوۡنَ بِاللّٰہِ وَ الۡیَوۡمِ الۡاٰخِرِ ((3:114 میں نے کہا تھا کہ یہ اس طرح سے اس قوم کا جزو بنتے ہیں اور آگے ہے وَ یَاۡمُرُوۡنَ بِالۡمَعۡرُوۡفِ وَ یَنۡهَوۡنَ عَنِ الۡمُنۡکَرِ ((3:114۔

مذہب قدم قدم پر فرقہ بندی کی آبیاری کرتا ہے جبکہ دین امتِ واحدہ کی ترغیب دیتا ہے

اب یہ وہی فریضہ ادا کر رہے ہیں جو امتِ مسلمہ کا فریضہ بتایا گیا ہے۔ اس امت کا جزو بن کے یہ کچھ ہوگا' یہ نہیں کہ اپنے طور

یہ جسے وہ معروف سمجھتے ہیں اس کا وہ امر کریں اور جس کو وہ نہی سمجھتے ہیں اس کو بتائیں اور ہم سمجھیں کہ ہاں صاحب ٹھیک ہے دین کا
کام ہو رہا ہے۔ عزیزانِ من! دین ایک ہی ہوتا ہے، مذاہب مختلف ہوتے ہیں۔ خدا کی طرف سے دی ہوئی کتاب ایک ہی ہوتی ہے، اس پہ ایمان لانے سے انسان اس امت کا فرد بنتا تھا اور یہ پھر امت تھی جو **یَأۡمُرُوۡنَ بِالۡمَعۡرُوۡفِ وَ یَنۡهَوۡنَ عَنِ الۡمُنۡكَرِ** (3:114) کا فریضہ ادا کرتی تھی۔ **وَ یُسَارِعُوۡنَ فِی الۡخَیۡرٰتِ ؕ وَ اُولٰٓئِكَ مِنَ الصّٰلِحِیۡنَ** (3:114) سوال یہ ہوا کہ خاص طور پہ یہ کہنے کی ضرورت کیا تھی؟ ضرورت یہ تھی کہ یہودیوں کے ہاں دین قومی اور نسلی ہو چکا ہوا تھا ان کے ہاں صرف وہ شخص دین پر سمجھا جاتا تھا جو بنی اسرائیل کے گھر میں پیدا ہوتا تھا نسلی پیدائشی، تبلیغی نہیں رہا تھا، یہ نہیں تھا کہ کوئی شخص جو اس دین کو ACCEPT کر لے تو وہ نجات یافتہ ہو جائے۔ ان کے ہاں نجات و سعادت جو تھی وہ صرف بنی اسرائیل کے گھر میں پیدا ہونے والے بچے کے لیے تھی۔

قرآنِ حکیم کی طرف سے پیش کردہ دین تو عالمگیر صفات کا حامل ہے

کہا کہ دین کے دروازے ہر انسان کے لیے کھلے ہوتے ہیں، ان اہلِ کتاب کے لیے بھی کھلے ہیں۔ یہ دین ان کے دین جیسا دین نہیں ہے کہ جو ان کے گھر میں پیدا ہوا، وہ تو نجات کا اور جنت کا مستحق ہو سکے گا۔ جو نسلی طور پہ ان سے باہر ہے، وہ ہو ہی نہیں سکے گا۔ کتنی بڑی مجبوری ہے یعنی کس کے گھر میں بچہ پیدا ہو گیا، اس بچے کے تو اختیار میں ہوتا ہی نہیں ہے۔ جو بنی اسرائیل کے گھر میں پیدا ہو گیا، جنت کا وارث۔ جو بنی اسرائیل میں سے نہیں ہے ساری دنیا اس کے بعد CONDEMN، کہا غلط ہے **وَ مَا یَفۡعَلُوۡا مِنۡ خَیۡرٍ فَلَنۡ یُّكۡفَرُوۡهُ ؕ** (3:115) یہ بات نہیں ہے، یہ نیکی کا کام یہ خیر جسے قرآن نے کہا ہے یہ امتِ مومنہ کا فریضہ جو بھی یہ کچھ کرے گا اس میں داخل ہو جائے، اس کے دروازے کھلے ہیں، اس کے اندر شامل ہو جائے، اس پروگرام کے اندر وہ تعاون کرے شرکت کرے۔ جو بھی کرے گا وہ اس کو اس کا بدلا ملے گا، اس میں ناسپاس گزاری نہیں ہے ہمارے ہاں۔ **وَ اللّٰهُ عَلِیۡمٌۢ بِالۡمُتَّقِیۡنَ** (3:115) یہی ہیں جن کو متقی کہا جائے گا ہم جانتے ہیں کہ یہ کون لوگ ہیں۔ دروازے اس کے کھلے ہیں جو انسان جس ملک میں ہو، جس قوم میں ہو، جس مذہب کا پابند ہو، ہر ایک کے لیے اس کے دروازے کھلے ہیں۔ وہ آئے ان کے ساتھ شامل ہو جائے انہی جیسا ہو جائے گا۔ عزیزانِ من! یہ ہے جو قرآنِ کریم نے کہا ہے اہلِ کتاب کے لیے۔ یہ جو چیز بھی امر بالمعروف اور نھی عن المنکر یہ تقاضا کرتی ہے اپنی آزاد مملکت کا۔ اس پاکستان کا تصور دیا ہی اس لیے گیا تھا کہ دین اپنی اصلی شکل میں یا اسلام کی حقیقی زندگی اس میں ہے۔ ایک خطۂ زمین آزاد مملکت اس میں خدا کی کتاب کے مطابق پھر سے ایک نظامِ مملکت کی تشکیل تاکہ یہ

آلِ عمران 478 امت پھر امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ ادا کر سکنے کے قابل ہو سکے۔ یہ تھا مقصد اسے نظریۂ پاکستان کہتے ہیں' اس لیے یہ بنا تھا۔ ایک مملکت ایک امت اس کے اندر کوئی تفریق نہیں' اس میں پٹھان پنجابی سندھی بلوچی بنگالی غیر بنگالی کی تفریق سب عہدِ جاہلیہ کی تفریق ہے' ساری کفر کی تقسیم ہے۔ کوئی تفریق نہیں ہے یہ صوبوں کی تفریق بھی کوئی تفریق نہیں' انگریز نے لکیریں کھینچی تھیں اپنی انتظامی مصلحت کے لیے۔ ایک پوری مملکت' دنیا ہمارے اس دعوے کے اوپر ہنستی تھی کہ کیا کہہ رہے ہیں۔ ایمان کے اشتراک کے اوپر ان تمام اختلافات کے باوجود ایک قوم؟ دنیا یہ ساری کہہ رہی تھی ان کے ہاں تو قومیت کا مدار وطن کے اوپر آ گیا ہوا تھا' نسلوں پہ تھا۔ یہ ایک انوکھا اور نرالا سا تصور تھا انوکھا اور نرالا آج کے دور کے انسان کے لیے' ہمارے لیے تو چودہ سو سال پہلے تھا' جی نہیں صاحب! حضرتِ موسیٰؑ کے زمانے سے چلا آ رہا تھا یہ' جس نوحؑ سے خدا نے کہا تھا کہ تیرا بیٹا بھی تیری قوم میں سے نہیں' تم میں سے نہیں ہے۔ یہ ہم نے دعویٰ کیا تھا دنیا بڑی تعجب کی نگاہوں سے دیکھ رہی تھی۔

ابوالکلام آزاد کی زندگی کے آخری الفاظ کہ ''دین ایک چلا ہوا کارتوس ہے''

عزیزانِ من! غیر نہیں اپنوں کی کیفیت یہ تھی یہی ابوالکلام آزاد اس کی خودنوشت سوانح حیات جو اس کی موت کے بعد شائع ہوئی ہے "INDIA WINS FREEDOM" اس کی کتاب ہے اس کتاب کے آخری CHAPTER میں وہ شخص یہ لکھ کے گیا ہے اس نے لکھا یہ ہے کہ اسلام نے اس امر کی کوشش کی تھی کہ یہ امتیازات نسلی لسانی جغرافیائی مٹا کر محض ایمان کی بنیادوں کے اوپر ایک امت کی تشکیل کرے اور ایک مملکت بنائے لیکن تاریخ نے بتا دیا کہ وہ تجربہ ناکام تھا' آج اس ناکام تجربے کو دہرانا' وہ کہتا ہے فراڈ ہے یہ (یہ لفظ ہے اس کا)۔ غیر تو ایک طرف رہے یہ آپ کے ہاں کے یہ امام الہند یہ شخص لکھا ہوا اس کا موجود ہے۔ اس نے کہا کہ یہ جناحؒ کر کے دیکھ لے۔ اسؒ نے کیا مملکت حاصل کی۔ عزیزانِ من! جلدی سے مجھے جست لگا کے یہاں آ جانا چاہیے تھا کہ دنیا جو کچھ کہتی تھی کہ ہم دیکھیں گے کیسے کر کے دکھاتے ہیں ہم نے بتا دیا کہ واقعی ناکام تجربہ تھا۔ افوہو ۔اَرَءَيْتَ الَّذِىْ يُكَذِّبُ بِالدِّيْنِ (107:1) خدا کہہ رہا ہے او دیکھو! اس قوم کی طرف جو دین کی تکذیب کر رہی ہے۔ دنیا کہتی تھی کہ یہ چلا ہوا کارتوس ہے' اب نہیں چل سکتا۔ ابوالکلام کہتا تھا کہ کر لینے دو جناحؒ کو کیا کرتا ہے۔ تاریخ بتا چکی ہے ناکامی رہی۔ اس خدا کا یہ دین تھا جس نے کہا تھا کہ قیامت تک کے لیے ابدی دین ہے۔ ہم نے اپنے عمل سے اس کو جھٹلا دیا' جھٹلا رہے ہیں۔ عزیزانِ من! غور کیجیے ہم کہاں ہیں کس مقام کے اوپر ہیں۔ یہ تھا جو دین نے دیا تھا۔ عزیزانِ من! تفرقہ اختلاف خواہ وہ مذہب کے اندر آئے' کوئی نام بھی کسی کا کیوں نہ ہو' کوئی استثنا نہیں اس کے اندر' میں کہے دیتا ہوں۔ قرآن جب سامنے ہوتا ہے

لگی لپٹی کا سوال پیدا نہیں ہوتا' کوئی استثنا قرآن نے نہیں کی تھی۔ کوئی ایک فرقہ بھی جنت میں نہیں جا سکتا اگر اختلاف ہے 478**آلِ عمران** کے اندر تو۔ یہ سب روسیاہ ہوتے ہیں' روشن چہرے والا کوئی ان میں نہیں ہوتا۔ اگر ان کے اندر بھی یہ نسلی اختلافات جغرافیائی حدود کے اختلافات یہ صوبوں کے اختلافات آپس میں اس طرح گروہوں میں بٹ جانا خواہ مذہب ہوں یا پارٹیاں ہوں' اس پوری مملکت کا ٹکڑوں کے اندر بٹ جانا' کوئی اسلام نہیں اس کے اندر برادرانِ عزیز! کتنے ہی مدعی کیوں نہ آپ کے پاس اٹھ کے آئیں۔ اسلام صرف اسلام اس کا ہوگا جو صرف پوری قوم کو یہیں بسنے والے نہیں پوری دنیا میں بسنے والے جو خدا کی کتاب کو ماننے والے ہیں ایک قوم کے افراد' کم از کم ساری دنیا کی مسلمانوں کی مملکتیں تو ہمیں ابھی نہیں ملیں نہ اکٹھی ہوسکیں' تجربہ گاہ تھی یہ کہ ایک مملکت ایسی جو جغرافیائی بُعد کے باوجود ہم میں اور بنگال میں اتنا بُعد ہے اتنی مختلف نسلوں کے باوجود' مختلف زبانوں کے باوجود' ایک ملت اسلامیہ' ایک مملکت بننے کی صورت۔ جو یہ دعویٰ کرے گا وہ اسلام کی دعوت دے گا اور اس کی بنیاد ہوگی ایک آئین کے اوپر۔ وہ آئین جو صرف خدا کی کتاب کے اوپر مبنی ہوگا۔ بالکل کسی کے دھوکے میں نہ آیئے' نہ کسی فرقے کے نہ پارٹی کے نہ کسی منشور کے نہ کسی کی دعوت کے۔ یہ ہے خدا کی کتاب کا اعلان۔ جو اس طرف دعوت دے گا وہ اسلام کی دعوت دے گا۔ جو کہیں بھی اختلاف وتفرقے کو روا رکھے گا' وہ جاہلیتِ قبل از اسلام کی دعوت آپ کو دے گا' اسلام کی دعوت نہیں دے گا۔ عزیزانِ من! ہم سورۃ آلِ عمران کی آیت 115 تک آ گئے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا ؕ اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ (2:127)

❀...❀...❀

اٹھارھواں باب: **سورۃ آلِ عمران** (آیات 116 تا 120)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عزیزانِ من! آج جنوری 1970ء کی 25 تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز سورۂ آلِ عمران کی آیت 116 سے ہوتا ہے:((3:116۔

مذہب کے تصورات اور دین کی طرف سے مستقل اقدار میں بنیادی فرق ہے

سلسلۂ کلام چلا آ رہا تھا اس تصادم کا' اس ٹکراؤ کا جو حق و باطل میں ہوتا چلا آ رہا ہے اور اس میں ان مقامات میں مدِ مقابل تھے اہلِ کتاب۔ اور میں نے عرض کیا تھا کہ یہ لوگ وہ ہیں جو خدا پر وحی پر رسول پر کتاب پر آخرت پر ایمان رکھنے کے مدعی ہوتے ہیں اس کے باوجود ان سے کہا جاتا ہے کہ تم ان چیزوں پر ایمان لاؤ۔ تو اس کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ اپنے اپنے تصور کے مطابق کسی چیز کو مان لینا' ایمان نہیں کہلاتا۔ مذہب دین ہی کی مسخ شدہ صورت کا نام ہوتا ہے۔ دین میں یہ بنیادی تصورات (BASIC CONCEPTS) اپنی اصلی شکل میں ہوتے ہیں' مذہب میں نام تو ان کا باقی رہ جاتا ہے لیکن حقیقت ان کی مسخ ہو جاتی ہے۔ لیکن مذہب پرست طبقہ اپنے آپ کو یہ فریب دے لیتا ہے' اس اطمینان میں رہتا ہے کہ ہم حقیقت پر یقین رکھتے ہیں' ہم خدا کے دیے ہوئے سچے دین پر ہیں۔ اور یہی وجہ ہے کہ ایک دہریے کو ان حقائق سے قریب لے آنا آسان ہوتا ہے بمقابلہ مذہب پرست طبقے کے۔ کہ مذہب پرست طبقہ جیسا میں نے عرض کیا ہے SELF DECEPTION میں خود فریبی میں مبتلا ہوتا ہے۔ اور اس کی تو ایک بین دلیل یہ ہے کہ مذہب میں جتنے فرقے ہوتے ہیں' ان میں سے ہر فرقہ اپنے آپ کو حق پر سمجھتا ہے اور دوسرے کو باطل پہ سمجھتا ہے ورنہ حقیقت تو ایک ہوتی ہے INDIVISIBLE ہوتی ہے' ناقابلِ تقسیم ہوتی ہے۔ یہ ہو ہی نہیں سکتا کہ دو متضاد چیزیں ایک حقیقت بن جائیں دو اور دو کے الگ الگ جواب ہو ہی نہیں سکتے۔ اور اگر اس جواب میں اختلاف

ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ حقیقت نہیں رہی۔

غور وفکر اور تحقیق کے بغیر کسی چیز کو تسلیم کر لینا اندھی تقلید تو کہلا سکتا ہے' ایمان نہیں

تو یہ وجہ ہے کہ قرآن اہلِ کتاب کو بھی اسی طرح دعوت دیتا ہے ان بنیادی تصورات پر ایمان لانے کی جس طرح وہ ان لوگوں کو دعوت دیتا ہے کہ جو سرے سے ان چیزوں کو مانتے ہی نہیں ہیں۔ فَاِنْ اٰمَنُوْا بِمِثْلِ مَآ اٰمَنْتُمْ بِهٖ فَقَدِ اهْتَدَوْا (2:137) وہ کہتا ہے اگر یہ لوگ اسی طرح ایمان لائیں جیسے کہ تم اس قرآن پر ایمان لائے ہو تو پھر سمجھا جائے گا کہ یہ راہِ راست پر ہیں۔ اس لیے کسی شخص کا یہ سمجھ لینا مثلاً آج ہم بھی' میں نے عرض کیا تھا' اسی سطح پہ ہیں جس سطح پر ظہورِ اسلام کے وقت اہلِ کتاب تھے۔ وہ مدعی تھے اپنے پاس ایک کتاب رکھنے کے' ایک رسول پر ایمان لانے کے لیکن قرآن انہیں پھر دعوت دیتا ہے ایمان لانے کی۔ آج ہماری بھی یہ کیفیت ہے کہ ہم میں سے کتنے ہیں کہ جنہوں نے از خود اس چیز کی تحقیق کر کے' اس چیز کا علم رکھ کر کہ خدا کی طرف سے دیا ہوا دین کیا ہے' اسے قبول کیا ہو۔ یا تو وہ پیدائشی اعتبار سے جو کچھ کسی بچے نے اپنے گھر میں سنا' وہی اس کا دین بن جاتا ہے' وہی اس کا مذہب ہو جاتا ہے۔ پھر جو کچھ متوارث چلا آ رہا ہے وہ جوں جوں آگے بڑھتا چلا جاتا ہے اور زیادہ مقدس ہوتا چلا جاتا ہے یا وہ دین بن جاتا ہے۔

مذہب کے نام پر بے تحاشا خرچ لیکن نتیجہ صفر لہٰذا ہر سُو تباہی ہر سُو موت

یہ دونوں جماعتیں تھیں جن کے ٹکراؤ کا ذکر چلا آ رہا تھا۔ مذہب پرست طبقے اپنے خود تراشیدہ مذہب' مسلک' مؤقف' اعتقادات کی نشر و اشاعت کے لیے ان کی حفاظت کے لیے بڑا روپیہ خرچ کرتے ہیں۔ آپ ذرا غور کر کے دیکھیے کہ آپ کے ہاں بھی کتنا روپیہ ہے' کتنی دولت ہے ملک کی جو مذہب کی حفاظت کے نام میں صرف ہو رہی ہے۔ نہ صرف ضائع ہو رہی ہے' دین کو نقصان پہنچا رہی ہے۔ بظاہر یہ نظر آتا ہے کہ بڑا کارِ خیر ہو رہا ہے' اسلام کی خدمت ہو رہی ہے درحقیقت باطل کو تو جتنا فروغ آپ دیتے چلے جائیں گے وہ حق کی مخالفت میں بڑھتا چلا جائے گا۔ تو بظاہر تو ایسا نظر آتا ہے لیکن اس کے نتائج کبھی وہ نہیں برآمد ہو سکتے جو دین کے نتائج ہیں۔ اسی لیے یہاں ایک مثال سے یہ کہا کہ اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَنْ تُغْنِيَ عَنْهُمْ اَمْوَالُهُمْ وَ لَآ اَوْلَادُهُمْ مِّنَ اللّٰهِ شَيْئًا ؕ وَ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ (3:116) یہ جتنا بھی کوئی صرف کریں' آخر الامر غلط کاموں کا جو تباہ کن انجام ہوتا ہے' اس سے یہ بچ نہیں سکتے۔ یہ چیزیں ان کو بچا نہیں سکتیں۔ آخر الامر ان کی ان محنتوں کی کھیتیاں تباہ ہو کر رہیں گی

۔ مَثَلُ مَا يُنْفِقُوْنَ فِيْ هٰذِهِ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا كَمَثَلِ رِيْحٍ فِيْهَا صِرٌّ اَصَابَتْ حَرْثَ قَوْمٍ ظَلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ فَاَهْلَكَتْهُ (3:117) 478 **آلِ عمران**
کی مثال یوں سمجھیے جیسے کسی شخص نے کھیتی تو کی ہو' بیج بھی بویا ہو' کچھ وہ اگ بھی آئی ہو لیکن اس کے بعد سردیوں کی ایک یخ بستہ ہوا اس قسم کی چلے کہ وہ اس کو بالکل جھلسا کر رکھ دے۔ محنت بھی کی ہے' زمین کو کاشت کے قابل بھی بنایا ہے' تخم ریزی بھی کی ہے' اس میں سے کچھ پیدا بھی ہوا ہے' بظاہر نظر آتا ہے کہ اب یہ پھولے گی پھلے گی' اس میں اناج آئیں گے غلہ آئے گا۔ لیکن اس کے بعد ایک جھٹکا آتا ہے کہ وہ ساری کی ساری کھیتی کو تباہ کر کے رکھ دیتا ہے۔ اس لیے کہ یہ وہ درخت نہیں ہے جس کے متعلق کہا تھا كَشَجَرَةٍ طَيِّبَةٍ اَصْلُهَا ثَابِتٌ وَّ فَرْعُهَا فِي السَّمَآءِ (14:24) اس پھل لانے والے تناور درخت کی طرح کہ جس کی جڑیں پاتال میں ہوں اور جس کی شاخیں آسمان کو چھو رہی ہوں۔ اسی جگہ ہے کہ شَجَرَةٍ خَبِيْثَةٍ (14:26) تو وہ ہوتا ہے کہ اوپر ہی اوپر اس کی جڑیں ہوں ذرا تیز ہوا چلے تو جڑ سے اکھڑ جائے (14:26)۔ یا اس طرح سے کہ وہ ایسی سرد ہوا چلے یخ بستہ ہوا چلے کہ وہ اس کو جھلسا کر رکھ دے' وہ کھیتی کبھی نہیں پکے گی۔ حَرْثَ قَوْمٍ ظَلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ فَاَهْلَكَتْهُ ط (3:117)

زندہ قومیں فطرت کی طرف سے رونما ہونے والے حوادث کی فکر کو بھی پیشِ نظر رکھتی ہیں

یہاں آگے بڑی ایک لطیف چیز آئی وَ مَا ظَلَمَهُمُ اللّٰهُ وَ لٰكِنْ اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ (3:117) یہاں جبر اور اختیار کے مسئلے کو دو لفظوں کے اندر قرآن نے سلجھا کے رکھ دیا۔ بات تو مثال دینے کی تھی لیکن فلسفیانہ نگاہ سے خیال بہت دور تک چلا جاتا تھا۔ وہ یہ کہ اس نے تو محنت کی' کھیتی بوئی لیکن اس کے بعد یہ ہوا تو خدا کی طرف سے تیز ہوا چلی' اس پہ تو اسے کوئی اختیار نہیں تھا تو پھر انسان تو مجبور ہے وہ کیا کرے۔ اس کا کام تو کھیتی بونا تھا اس نے بو دی' تخم بھی اچھا اس نے ڈال دیا ہوگا۔ پھر اس کے بعد یہ چیز تو اس کی طرف سے ہوگئی' یہ ہے جو آپ کے ہاں جبر کا عقیدہ یا مسلک چلا آ رہا ہے کہ یہ چیزیں خدا کی طرف سے ہوتی ہیں۔ اس نے فوراً یہ کہہ دیا وَ مَا ظَلَمَهُمُ اللّٰهُ (3:117) یہ ذہن میں بات نہ تمہارے آجائے کہ خدا نے اس کے اوپر زیادتی کی ہے' اس نے اس پہ ظلم کیا ہے۔ وَ لٰكِنْ اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ (3:117) انہوں نے خود اپنے اوپر یہ زیادتی کی ہے۔ بات تو وہ ٹھیک ہے جہاں تک اصل مسئلہ کا تعلق تھا کہ غلط فارمولا لے کر اس پہ جتنی جی چاہے کوئی محنت کرے' اس کی محنت اکارت جاتی ہے تو وہ اپنے آپ پہ زیادتی کر رہا ہے۔ لیکن اس مثال میں بھی آپ دیکھیے' یہ ہوائیں جو چلتی ہیں فطرت کی طرف سے جو حوادث آتے ہیں' وہ تو کوئی OVERALL پروگرام ہے فطرت کا جس کے مطابق یہ سب کچھ ہوتا رہتا ہے۔ اب انسانوں کو اس کا اختیار دیا گیا ہے کہ وہ ان حوادث سے بچنے کے لیے خود تدابیر اختیار کریں۔ جو مناسب تدبیر اختیار کر لیتا ہے اسے یا اس قوم کو وہ حوادث کچھ نہیں کہتے

۔ جو حفاظتِ خود اختیاری اختیار نہ کرتا ہے' ان حوادث سے اس کو نقصان پہنچتا ہے ۔ لہٰذا یہ جو پہلو ہے کہ انہوں نے حفاظت تدبیر اختیار نہیں کی تھی' یہ سامان نہیں بہم پہنچایا تھا' اس کے متعلق سوچا نہیں تھا ۔ یہ ہے جس طرح سے کہ انسان خود اپنے اوپر زیادتی کرتا ہے ۔ وہ کہتا ہے کہ یہ کہہ دینا کہ اس نے ہوا چلا دی تھی' میں کیا کرتا ؟ اس ہوا سے بچنے کے لیے سامان بھی تو کیا جا سکتا تھا ۔ لہٰذا وہ قومیں جو فطرت کے حوادث سے بچنے کے لیے تدابیر اختیار کر لیتی ہیں' یہ حادثات انہیں کچھ نہیں کہتے ۔ یہ بھی انہیں ہی نقصان پہنچاتے ہیں کہ جو اپنی حفاظت کا سامان خود نہیں کرتے ۔

قدرت کسی پر ظلم نہیں کرتی

وَ مَا ظَلَمَهُمُ اللّٰهُ وَ لٰكِنْ اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ ((3:117 خدا کسی پر زیادتی نہیں کرتا' یہ زیادتی اپنے اوپر خود انسان اپنے ہاتھوں سے مصیبت لاتا ہے ۔ دوسرے مقام پہ ہے یہ بلکہ وہاں تو یہ واضح کیا ہے کہ حسنات جو کچھ پہنچتی ہیں وہ خدا کے قانون کے مطابق عمل کرنے سے پہنچتی ہیں اور جتنی مصیبتیں آتی ہیں وہ انسان کے اپنے ہاتھوں کی لائی ہوئی ہوتی ہیں ۔ یعنی یہاں وہ اپنی طرف سے کوئی چیز کرتا ہے جو خدا کے قانون سے ہم آہنگ نہیں ہوتی اس کا نتیجہ تو اس کے لیے مصیبت ہوتا ہے اور اگر وہ خدا کے قانون سے ہم آہنگی برتتا چلا جائے تو اس کا نتیجہ ہمیشہ حسنات ہوتا ہے' اس کا نتیجہ تخریب اور تباہی ہوتا ہی نہیں ہے ۔ جہاں کسی مرض کا ذکر کیجیے ڈاکٹر صاحب سے جا کے وہ یہ کہے گا کہ تم نے بے احتیاطی کی تھی ۔ یہ بے احتیاطی کیا معنی ہوتے ہیں؟ حفظانِ صحت کے لیے جو قوانین بنے ہوئے ہیں ان کی خلاف ورزی کہیں ہوئی ہے' اس لیے تمہیں یہ نقصان پہنچا ہے ۔ اس کے مطابق عمل کرنے سے تو از خود یہ نقصان نہیں پہنچتا ۔ تو یہاں ایک طرف کہا کہ اس قسم کی یخ بستہ ہوا چلی کہ جس سے وہ اس کی کھیتی جھلس کر رہ گئی اور ساتھ ہی یہ کہہ دیا کہ وَ مَا ظَلَمَهُمُ اللّٰهُ وَ لٰكِنْ اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ (3:117) ۔

عقلِ خود بیں کی جگہ قرآنِ حکیم کی تعلیم تو پوری انسانیت کو ایک عالمگیر برادری کا تصور پیش کرتی ہے

اس کے بعد ایک آیت ہمارے سامنے آتی ہے وہ بڑی بنیادی حقیقت رکھتی ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ اگر آج کے پورے درس میں بھی بات ختم ہو جائے تو ہم غنیمت سمجھیں گے ۔ قرآنِ کریم کا تصور یہ ہے' یوں کہیے منتہا یہ ہے کہ پوری انسانیت ایک عالمگیر برادری میں منسلک ہو جائے ۔ اس نے کہا یہ ہے کہ ابتداً انسان ایک برادری کی حیثیت سے جیتے تھے فَاخْتَلَفُوْا پھر

انہوں نے باہمی اختلاف کیا۔ اختلاف مبنی تھا مختلف مفادات کے ٹکراؤ پر' انفرادی مفادات میں ٹکراؤ ہوا' اس سے اختلاف پیدا ہوا۔ انسان کی اپنی عقل تو پھر اس ٹکراؤ کا حل تجویز کر نہیں سکتی تھی کہ ہر فرد اور ہر گروہ اور ہر قوم کا مفاد اس کا تحفظ تو اس کی عقل ہی کرتی ہے تو یہ اس کا حل کیسے بتا دیتی۔ اس کے لیے خدا نے اپنی طرف سے ہدایت بھیجی 'انبیا کو مبعوث کیا' ان کے ساتھ کتابیں نازل کیں اور انہوں نے آ کے بتایا کہ یہ باہمی عداوت دشمنی ٹکراؤ تصادم رفع کیسے ہوسکتا ہے۔ اس نے کہا کہ ہمارا منتہا یہ ہے کہ پھر سے ایک ایسا نظام قائم کیا جائے اور یہ نظام خود اپنے اختیار و ارادے سے اپنی سعی و کاوش سے ایسا نظام متشکل کریں کہ باہمی اختلافات اور افتراق مٹ جائیں اور پوری انسانیت عالمگیر برادری بن جائے۔ اس کی ابتدا وہ کرتا ہے اس نظام سے جسے اسلامی مملکت کہا جاتا ہے۔

قرآنِ حکیم انسانوں کے لاتعداد گروہوں کو صرف دو حصوں میں تقسیم کرتا ہے

یہ وعظ و نصیحت کی بات نہیں ہے۔ وہ تجربہ گاہ بناتا ہے کسی ایک خطے کو کہ کسی ایک قوم کو بطور خمیر کے تیار کرتا ہے اور پھر یہ قوم یہ نظام آگے بڑھتا چلا جاتا ہے تو پھر پوری دنیا پر چھا جاتا ہے۔ منتہا اس کا یہ ہے کہ آخر الامر یہ ایسا کرے۔ جب یہ اس کی ابتدا کرتا ہے تو انسانوں کے دو گروہ سامنے آتے ہیں۔ آپ یہ دیکھیے کہ موجودہ شکل میں تو انسانوں کے ہزاروں لاکھوں گروہ آپ کو نظر آئیں گے۔ قوموں کی تفریق پہلے دیکھیے جغرافیائی حدود کے مطابق' نسلوں کی تفریق' رنگ کی تفریق' زبان کی رو سے اختلاف' مذہب کی دنیا میں آیئے تو مذاہب کی تفریق' ایک مذہب کے اندر فرقہ بندیاں' پھر جو مذہب نہیں ہے تو سیاست کی رو سے پارٹی بازیاں' پھر چھوٹے چھوٹے حلقوں کے مفاد' ان حلقوں کے اندر ہر فرد کا اپنا اپنا فائدہ۔ کیفیت تو کچھ ایسی نظر آتی ہے کہ دو انسان بھی یہاں مشترک اور متفق نہیں ہیں۔ بظاہر اتنا افتراق نظر آتا ہے لیکن قرآن کہتا ہے کہ جب کوئی جماعت خدا کے قوانین کے مطابق معاشرہ متشکل کرنے کے لیے اٹھے گی تو ساری دنیا کے انسان دو گروہوں میں بٹ جائیں گے۔ وہ دو ہی گروہ بتاتا ہے هُوَ الَّذِىۡ خَلَقَكُمۡ فَمِنۡكُمۡ كَافِرٌ وَّمِنۡكُمۡ مُّؤۡمِنٌ (64:2) خدا نے تمام انسانوں کو پیدا کیا اور اس کے بعد اصولی طور پر یہ دو گروہوں میں بٹ گئے ایک گروہ ان انسانوں پر مشتمل ہے کہ جو خدا کے ان قوانین کی صداقت پر یقین رکھتے ہیں' اس کے مطابق معاشرے کو متشکل کرنا چاہتے ہیں اور دوسرا گروہ وہ ہے کہ جو ان سے انکار کرتا ہے۔ یہ جو گروہ ان پر یقین رکھتا ہے' ان کے اپنے اندر تو کوئی اختلاف افتراق تشطت انتشار خلفشار قطعاً نہیں ہوسکتا نہ ہونا چاہیے یہ تو ایک گروہ ہوتا ہے۔ لیکن یہ جو دوسرا گروہ نہ ماننے والوں کا ہے ان کے اندر بیسیوں سینکڑوں ہزاروں لاکھوں افتراق ہوسکتے ہیں۔

انسانی دنیا میں آئیڈیالوجی کی بنیاد پر ایک قوم کی تشکیل کا نظریہ قرآنِ حکیم کا ہی عطا کردہ ہے [478] آلِ عمران

جیسا کہ میں مثال کے طور پہ کہا کرتا ہوں کہ صحیح نشانہ تو ایک ہوتا ہے' غلط نشانے کی تو تعداد ہی نہیں ہوتی' وہ تو لاکھوں ہزاروں میں ہوسکتا ہے۔ صحیح جواب ایک ہوتا ہے غلط جواب کی تو انتہا ہی نہیں۔ اس لیے کفر کے اندر تو اختلاف ہوتا ہے اس میں تو تفرقہ ہوتا ہے' اس میں تو فرقے ہوسکتے ہیں۔ دین کے اندر اختلاف اور تفرقے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اگر جواب صحیح ہے تو ہر ایک کا جواب وہ آنا چاہیے۔ کلاس میں کوئی سوال آپ دے دیجیے بچوں کو' جتنے بچوں کا جواب صحیح ہوگا ان میں کوئی اختلاف نہیں ہوگا۔ یہ غلط جواب ہے کہ جو ایک کا جواب دوسرے کے ساتھ ملتا نہیں ہے۔ اس لیے اس نے کہا کہ اصولی طور پر پھر انسان دو گروہوں میں تقسیم ہوجاتے ہیں۔ فَمِنْكُمْ كَافِرٌ وَّ مِنْكُمْ مُّؤْمِنٌ (64:2) تو پہلی تفریق یہ لے لیجیے انسانوں کے اندر۔ اب یہ ایک جماعت بنتی ہے جو ان انسانوں پر مشتمل ہوتی ہے جو خدا کے قوانین پر ایمان رکھتے ہیں ان میں نسل رنگ زبان اور جغرافیائی تقسیم جسے وطنیت کہتے ہیں' اس کا اختلاف کچھ معنی نہیں رکھتا۔ ایک شخص افریقہ کے صحراؤں میں اس چیز کو مانتا ہے دوسرا اگر قطبین کے برف زدہ علاقوں میں بستا ہوا اسے مانتا ہے' وہ ہر قسم کے بُعد اور اختلاف کے باوجود ایک گروہ کے افراد قرار پاتے ہیں۔ اسے کہتے ہیں آئیڈیالوجی کی بنا پر ایک قوم کی تشکیل۔ یہ قومیت کا نظریہ' قومیت کے معنی ہیں ایک گروہ ہوجانا۔ یہ قومیت کا نظریہ جو ہے یہ دین نے دیا ہے اور آپ دیکھتے ہیں کہ کس قدر یہ معقولیت پر مبنی سائنٹفک نظریہ ہے کہ صحیح جواب جن بچوں کا ہے' کلاس کے اندر وہ کہیں بیٹھے ہوئے کیوں نہ ہوں' ایک جگہ نہیں سارے ملک کے اندر ایک آپ QUESTION PAPER دے دیجیے' جن جن بچوں کا جن جن طالب علموں کا جواب صحیح ہوگا' وہ ایک گروپ کے افراد ہوجائیں گے۔ ان کے اندر کسی قسم کا اختلاف نہیں ہوگا جواب میں۔ یہ تو غلط جواب والے ہیں تو دو بچے پاس پاس بیٹھے ہوئے بھی ایک دوسرے سے متضاد ہوں گے وہ' وہ ایک دوسرے کے ساتھی نہیں ہوسکتے۔ یہ جو نظریہ ہے قومیت کا' یہ ہے جو قرآن نے دیا تھا۔ اور اس کی تائید میں اس نے تاریخ ہمیں بتائی ہے انبیائے کرامؑ کی اقوامِ سابقہ کی۔ بات شروع کی ہے سب سے پہلے حضرتِ نوحؑ کی جہاں سے قرآن سلسلۂ رشد و ہدایت کی ابتدا کرتا ہے۔ اور یہاں تک وہ لے گیا ہے کہ حضرتِ نوحؑ کا حقیقی بیٹا جو ہے وہ جب ان حقائق پر ایمان نہیں رکھتا تو اس کے متعلق کہہ دیا کہ یہ تیرے اہل میں سے نہیں ہے۔ آپ دیکھتے ہیں کہ یہ اسلام کی قومیت کا نظریہ کتنا واضح طور پہ ہمارے سامنے آجاتا ہے۔ حضرتِ ابراہیمؑ کے باپ کے متعلق ابراہیمؑ نے خود ان سے کہہ دیا کہ تیرا میرے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہے تاوقتیکہ تم ان چیزوں کے اوپر ایمان نہ لاؤ۔ قوم سے کہہ دیا بادشاہ سے جا کے ٹکر لے لی۔ جب یہ دیکھا کہ وہ ہاتھ ڈالنے والے ہیں تو پھر وطن کو چھوڑ دیا اِنِّیْ

مُهَاجِرٌ اِلٰی رَبِّی (29:26) اِنِّی ذَاهِبٌ اِلٰی رَبِّی (37:99) میں جا رہا ہوں اپنے اللہ کی طرف۔ اللہ تو یہاں بھی موجود تھا وہاں آلِ عمران 478 جا رہا ہوں جہاں میں خدا کے اصولوں کے مطابق ایک نظام متشکل کر سکوں گا۔ قوم کو چھوڑا' ماں باپ کو چھوڑا' بھائی بہنوں کو چھوڑا' وطن کو چھوڑا وہاں چلے گئے جہاں اس نظریۂ زندگی کے بسنے والے ایک جگہ اکٹھے ہو جائیں۔ حضرتِ لوطؑ نے بیوی کو چھوڑا یعنی یہ تاریخ جو ہے یہ محض داستان نہیں ہے یہ تو قومیت کی تشکیل کا ایک بنیادی نظریہ قرآن نے دیا تھا۔ یہ جو لوگ خدا کے قانون کو ماننے والے تھے وہ اس طرح سے اس پر عمل کرتے ہوئے چلے آئے تا آنکہ پھر یہ آخر میں تکمیل کو پہنچا عہدِ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اندر کہ جہاں یہ نظام یہ نظریہ کسی ایک خطۂ زمین کے اندر محدود نہیں رہنا تھا۔ خود حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زندگی کے اندر یہ صورت تھی کہ حبشہ کا بلالؓ بھی' بازنطینی حکومت کا صہیبؓ بھی' ایران کا سلمانؓ بھی' عرب کا عمرؓ بھی' یہ سارے کے سارے ایک قوم کے افراد بن چکے تھے۔

ایک اسلامی مملکت میں غیر مسلم افراد کی قانونی حیثیت کا تعین

یہ تھا جو نظریہ قرآن نے دیا تھا۔ اب یہ مملکت متشکل ہو جاتی ہے۔ اب یہ تو ضروری نہیں کہ جس خطۂ زمین میں متشکل ہو وہاں سارے کے سارے افراد اسی کو ماننے والے ہوں۔ جسے آپ غیر مسلم اب کہہ لیجیے آج کی اصطلاح میں' وہ بھی تو وہاں بسیں گے۔ ان کی پوزیشن کیا ہوگی؟ یہ بڑا اہم سوال آ گیا۔ مغرب کا نظریہ جو ہے وطنیت کا قومیت کا وہ تو یہ ہے کہ ایک TERRITORY ایک علاقے علاقے کے اندر بسنے والے جہاں ایک سٹیٹ یا مملکت کی تشکیل ہو جائے' وہاں کے بسنے والے تمام باشندے ایک قوم کے فرد بن جاتے ہیں۔ وہاں نظریے کا سوال نہیں ہوتا مختلف خیالات رکھنے والے' مختلف اعتقادات' مختلف مذاہب' مختلف زبانیں' مختلف رنگ رکھنے والے لوگ محض اس خطے کے اندر بسنے کی جہت سے ایک قوم کے افراد بن جاتے ہیں۔ لیکن قرآن کا تو نظریہ دوسرا ہے۔ وہاں تو میں نے کہا ہے ایک گھر کے اندر بسنے والے باپ بیٹا جو ہے وہ ایک قوم کے فرد نہیں بنتے چہ جائیکہ ایک ملک میں بسنے والے متضاد مذاہب خیالات نظریات رکھنے والے' ایک قوم کے افراد بن جائیں۔ قرآن کی رو سے یہ بالکل غلط ہے۔ لیکن اس مملکت کی حدود میں تو یہ بھی بسیں گے' اصطلاح میں تو ان کو ذمی کہا جاتا تھا لیکن یہ فقہی اصطلاح ہے۔ اگرچہ فقہی اصطلاح ہے لیکن اس میں بھی بات بڑی پتے کی ہے۔ اہل الذمہ ان کو کہا جاتا تھا وہ لوگ کہ جن کے جان مال عزت آبرو ہر چیز کی حفاظت کا ذمہ یہ مملکت لے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ان کے ساتھ تعلقات کس قسم کے ہوں گے؟ ظاہر ہے کہ جو مملکت ان بنیادوں پر قائم ہو جو قومیت اس اصول کے مطابق وجود میں آئے کہ ایک نظریۂ زندگی ہے جس پہ BELIEVE کرنے والے

جس پہ ایمان رکھنے والے یہ قوم بنے ہیں' یہ مملکت بنائی ہے۔ مملکت اس نظریہ زندگی کے فروغ کے لیے وجود میں آتی ہے۔تو #78آلِعمران لوگ اس نظریے میں BELIEVE نہیں کرتے' اس کو نہیں مانتے' وہ اس مملکت کے ارکان بن کیسے سکیں گے۔ یہ ہے وہ بنیادی تصور' اسلام نے یہ دیا تھا۔ لیکن جیسا کہ میں نے عرض کیا ہے آج تو خود مسلمانوں کے ممالک کے اندر بھی مغرب کا نظریہ جو ہے اسی کے اوپر عمل ہو رہا ہے۔ پہلے تو TERRITORY علاقوں کے بنیادوں کے اوپر انہوں نے مملکتیں اپنی بنائی تھیں اب اور آگے بڑھے ہیں تو جاہلیت کی ریشل نسلی تفریق جو ہے اس کی بنیادوں کے اوپر اپنے ہاں مملکتیں بنا رہے ہیں۔ اس لیے آج جب تک قرآن کی یہ بنیادی تعلیم سامنے نہ ہو' یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ ایک مملکت کی حدود کے اندر بسنے والے جو ہیں آپ ان کو دو قوموں کے اندر تقسیم کر دیتے ہیں۔ ہم نہیں تقسیم کر دیتے !!! ۔ یا تو یہ کہنا چھوڑ دیجیے کہ ہم نے اسلام کی بنیادوں پر ایک مملکت قائم کرنی تھی' سیدھی سی بات ہے جس طرح دنیا مملکتیں قائم کرتی ہے' آپ بھی قائم کیجیے۔ دعویٰ تو آپ کا یہ ہے لیکن بنیادی طور پہ آپ اس دعوے کی تردید کرتے ہیں یہ کہہ کے مسلم اور غیر مسلم ایک قوم کے افراد بنتے ہیں اور ان کی مشترکہ مملکت ہوتی ہے۔ جب کہا جائے کہ صاحب یہاں یہ دوسری قوم یہ الگ قوم ہے یہ فٹ نہیں بیٹھتا یہ تصور۔ کس چیز میں فٹ نہیں بیٹھتا؟ اسلام کے نظریے میں تو بالکل فٹ بیٹھتا ہے وہ تو کہتا ہے کہ دو گروہ ہوتے ہیں' باپ بیٹا دو گروہ ہوتے ہیں۔ قوم کے اندر بسنے والے دو کیوں نہیں ہوتے ؟ فٹ نہیں بیٹھتا مغرب کے تصورِ قومیت کی رو سے کہ صاحب ایک مملکت کے اندر دو قومیں کیسے بس سکتی ہیں۔ ٹھیک ہے بھئی تمہارے تصور کی رو سے نہیں بس سکتیں۔ تو جیسا میں نے عرض کیا ہے یا تو اس کو IDEOLOGICAL نظری مملکت یا قومیت کہنا چھوڑ دیجیے یا اسلام میں BELIEVE کیجیے۔

یا سراپا نالہ بن جا یا نوا پیدا نہ کر

ہمارے ہاں تمام تر ذہنی انتشار کی بنیادی وجہ اور اس کا علاج

ہماری تمام ذہنی مشکلات اور انتشار کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ تصورات تو ہم لیتے ہیں غیر اسلامی غیرِ قرآنی' نام ہم لیتے ہیں اسلامی نظریہ اسلامی نظام کا۔ کچھ تھوڑے سے پیوند لگانا چاہتے ہیں۔ عزیزانِ من! پیوند تو لگ ہی نہیں سکتا حق اور باطل کا۔

باطل دوئی پسند ہے حق لا شریک ہے

شرکت میانۂ حق و باطل نہ کر قبول

عزیزانِ من! کبھی گاڑی چل ہی نہیں سکتی۔ پھر جب یہ اس طرح سے پیوند سازی سے کام نہیں چلتا تو اس کے بعد یہ ہوتا ہے

کہ صاحب! اسلام اس دور میں اب چلنے کے قابل رہا ہی نہیں ہے۔ ارے! وہ کیسے رہے موٹر میں ایک پہیہ تم گڈے کا لگا دو 478 **آلِ عمران** اس کے بعد کہو کہ نہیں صاحب یہ اب موٹر اس دور میں نہیں چل سکتی۔ کیوں نہیں چل سکتی؟ دیکھ لو نہیں چل رہی۔ ارے چاروں پہیے اس کے لگاؤ پھر دیکھو چلتی ہے یا نہیں یہ۔ یہ ہے ذہنی خلفشار جو پیدا ہو رہا ہے ہمارے ہاں۔ جن ملکوں نے دھڑلے سے یہ کچھ کہہ دیا خواہ وہ مسلمان نام رکھنے والی قومیں کیوں نہ ہوں کہ ٹھیک ہے صاحب ہم سیکولر سٹیٹ اپنے ہاں قائم کریں گے تو ٹھیک ہے اس کے مطابق وہ کچھ کر رہے ہیں۔ لیکن یہاں ایک مشکل پیدا ہو گئی ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ یہ صدرِ اول کے بعد پہلی دفعہ یہ چیز ہوئی تھی کہ کسی قوم نے ایک صحیح نظریہ دیا ہوا اسلامی قومیت کا اور اس کے بعد دو قومی نظریہ کی بنیادوں پر ایک خطۂ زمین حاصل کیا ہو مملکت بنانے کے لیے۔ اس کے متعلق دعویٰ یہ کیا ہو کہ یہ مملکت اسلام کے نظریہ کی حامل ہو گی اور اس دعوے کے بعد تصور سارے سیاسی وہ لیے ہوئے جو مغرب نے لیے ہیں، وہ فٹ ان نہیں ہو رہے۔

ابوالکلام آزاد جیسا قلم کا بادشاہ لیکن متضاد خیالی میں الجھی ہوئی حامل شخصیت

یہ دقت یہاں ہمارے ہاں کی پیش آمدہ نہیں ہے یا انہی کے سامنے نہیں آتی جنہیں ہم مغرب زدہ کہتے ہیں، جن کے متعلق ہم کہتے ہیں کہ یہ دین کا علم نہیں رکھتے۔ دیکھیے یہ کن کے پیش آ رہی تھی؟ ابوالکلام آزاد کا نام کس نے نہیں سنا امام الہند ان کا لقب تھا۔ علمی اعتبار سے بھی یہ دنیا جانتی ہے کہ اتنا بڑا عالم شاید کہیں پیدا ہوا ہو۔ یہ ٹھیک ہے کہ جب وہ البلاغ نکالتے تھے تو اس زمانے میں ان کا نظریہ یہی تھا قومیت کا نظریہ۔ آپ دیکھیے ان کے ان مضامین کو وہ سیلاب کی طرح امڈے چلے آتے ہیں۔ قلم اور زبان کا تو بادشاہ تھا وہ شخص۔ اور یہ ثابت کرنے کے لیے اسلام نے نظریہ قومیت کا جو ہے وہ تو ساری دنیا سے الگ دیا ہے۔ وہی شخص اس کے بعد جب کانگریس میں جاتا ہے تو وہاں یہ کہتا ہے کہ صاحب یہ عہدِ جاہلیت کی باتیں ہیں کہ ایک TERRITORY میں بسنے والے افراد ایک قوم نہیں بنتے۔ چلیے صاحب تمہارا ذاتی خیال ہو گا وہاں تک بھی کوئی چیز قابلِ اعتراض نہیں ہو گی۔ آپ کو معلوم ہے کہ اس شخص نے انڈیا ونز فریڈم نامی کتاب لکھی اور جو اس کے مرنے کے بعد شائع ہوئی اس کتاب کے آخری CHAPTER میں جسے ہم کہتے ہیں مرتے وقت کیا کلمہ کسی کی زبان پہ ہوتا ہے، یہ عام طور پہ کہا جاتا ہے نا، کہ اس کی زبان پہ یہ کلمہ ہے۔ اس کے اندر یہ لکھا ہے (وہ تنقید کر رہا ہے جناح کے یا مسلم لیگ کے یا پاکستان بنانے والی تحریک کے خلاف، ان پہ تنقید کر رہا ہے کہ یہ کیا بات لے کے اٹھے تھے۔ تو اس نے لکھا یہ ہے کہ اسلام نے کوشش کی تھی کہ ایمان کی بنیادوں پر ایک قوم متشکل کرے اور اس طرح ایک مملکت وجود میں آئے، یہ تجربہ ناکام رہا۔ اب اس کو دہرانا حماقت ہے اور لوگوں کو اس پہ دعوت دینا فراڈ ہے (یہ اس کے لفظ

آلِ عمران 478 تھے)۔لیکن عزیزانِ من! ان الفاظ پہ تو ہم نے یہ کہہ دیا کہ معاذ اللہ۔عملاً آپ کے ہاں کیا ہو رہا ہے؟ یہ ہے تصور آپ کے ہاں بھی۔اس مملکت کے اندر جتنی تفریق آپ کے ہاں' اس قوم کے اندر آئی ہوئی ہے' کیا اس کو کچھ بھی تعلق ہے اس نظریے کے ساتھ کہ جس کی بنیادوں پہ آپ نے یہ دعویٰ کیا تھا اور یہ مملکت متشکل کی تھی۔

انگریز کی کھینچی ہوئی لکیریں علاقائی زبان پر مختلف قوموں کا روپ اختیار کر گئیں

ذرا غور کیجیے کہ اس دعوے کی بنیادوں پہ قوم بنانے کے بعد آپ بنگالی نام بنگالی' سندھی نام سندھی' بلوچی نام بلوچی' پنجابی نام پنجابی' پٹھان نام پٹھان کے اندر تفریق کر رہے ہیں۔ابوالکلام کی میں نے عبارت دی تو میرے کانوں میں آواز اب بھی آئی ہے معاذ اللہ کی لیکن اس پہ کوئی معاذ اللہ یہاں نہیں کہتا۔ ہیں آپ ایک قوم؟ آپ تو مغرب کے نظریے کے مطابق بھی ایک قوم نہیں بن سکے۔یعنی صرف مومن اپنے آپ کو یا مسلم کہنا تو ایک طرف رہا آپ کو وہ بھی نہیں ملے گا جو کہے کہ میں پاکستانی ہوں۔ یہ تفریق ان لکیروں کی بنیادوں کے اوپر جو انگریز نے یہاں کھینچ دی تھیں نقشے کی۔ یہ تفریق ان نسلوں کی بنیاد کے اوپر جس پہ آپ بلوچی سندھی پنجابی افغانی پٹھان کہتے ہیں اپنے آپ کو۔اسی تفریق کی بنیادوں پہ اب یہ آگے بات بڑھی ہے' مملکت کے ٹکڑے ہو رہے ہیں۔ معاف رکھیے تو کیا ہم دنیا کو یہ نہیں بتا رہے عملاً کہ واقعی یہ ایک تجربہ تھا؟ ابوالکلام کے الفاظ نہیں دہرا رہے ہم ''ایک تجربہ تھا جو ناکام کیا گیا اور اب اس چلے ہوئے کارتوس کو پھر چلانا حماقت ہے''؟ معاذ اللہ۔سوال یہ پیدا ہوا کہ صحیح معنوں میں جب یہ مملکت وجود میں آئے گی اس نظریے کے مطابق۔ اس مملکت کی حدود میں بسنے والے غیر مسلموں کی حیثیت کیا ہوگی؟ نظریہ پر ایمان رکھنے والا ان سطحی چیزوں سے اس کو ندامت نہیں ہوتی۔ وہ سر نہیں جھکاتا وہ دھڑلے سے کہتا ہے بات ٹھیک ہے۔

کسی غیر مسلم کو اپنے رازوں میں راز دان بنانا' دوقومی نظریہ کی نفی ہے

جو لوگ بنیادی طور پر کسی مملکت کے نظریے میں BELIEVE نہیں کرتے وہ اس مملکت کے امور کے رازوں کے اندر شریک نہیں ہو سکتے۔عزیزانِ من! آپ سوچیے کہ آپ کی مملکت مثلاً یہ فیصلہ کرتی ہے ڈسکشن کرتی ہے کہ ہم نے مثلاً انڈیا کے ساتھ جنگ کرنی ہے وہ لوگ جو جنگ میں BELIEVE نہیں کرتے ہیں وہ کہتے ہیں کہ ہم جنگ کے اوپر ایمان نہیں رکھتے ہیں' دنیا میں جنگ ہونی نہیں چاہیے۔ کیا آپ ان مشوروں میں انہیں بھی شریک کر لیں گے؟ یا جن پہ آپ ٹرسٹ نہیں کرتے کہ وہ واقعی پاکستانی ہو چکے ہیں دل کے اندر سے' انہیں آپ ان رازوں میں شریک کر لیں گے؟ قرآن نے یہ کہہ دیا کہ یہ جو تفریق ہم

نے نظریہ کی بنا پہ کی ہے' جو شخص بھی اس نظریہ میں تمہارے ساتھ ہم آہنگ نہیں ہے متفق نہیں ہے' وہ تمہارے رازوں کے شریک نہیں ہوسکتا۔ وہ تو قرآن ہے' وہ تو خدا ہے بات کہنے والا وہ لگی لپٹی کیوں کہے گا۔ **یٰاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوْا بِطَانَةً مِّنْ دُوْنِكُمْ** (3:118) اے جماعتِ مؤمنین! اس نظریہ میں BELIEVE کرنے والو! اپنوں کے سوا کسی کو اپنے راز کے اندر شریک نہ کرو۔ **لَا یَاْلُوْنَكُمْ خَبَالًا** ط (3:118) وہ تمہاری تخریب میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھیں گے۔ جو اپنے نظریے کو حق سمجھتا ہے' تمہارے نظریے کو باطل سمجھتا ہے' وہ ہر شخص اپنے نظریے کو غالب کرنے کے لیے سب کچھ کرے گا۔ اور وہ غالب اسی صورت میں آ سکتا ہے کہ دوسرے کا متضاد نظریہ مغلوب ہوجائے۔ وہ تمہارے نظریے کو مغلوب کرنے کے لیے سب کچھ کرے گا۔ **لَا یَاْلُوْنَكُمْ خَبَالًا** ط **وَدُّوْا مَا عَنِتُّمْ** ج (3:118) جس مشکل یا مصیبت کا نتیجہ تمہاری کمزوری ہوتا ہے' اس سے ان کو بڑی خوشی ہوتی ہے۔ وہ دل سے چاہتے ہیں کہ ایسی صورت پیدا ہوجائے کہ تم کمزور ہوجاؤ' تمہاری تخریب ہو۔ **قَدْ بَدَتِ الْبَغْضَآءُ مِنْ اَفْوَاهِهِمْ وَ مَا تُخْفِیْ صُدُوْرُهُمْ اَكْبَرُ** ط (3:118) کبھی کبھی ایسا ہوتا ہے کہ وہ جوش میں آ کے کچھ چیزیں ایسی بک دیتے ہیں' زبان پہ کچھ باتیں آ جاتی ہیں جن سے تمہیں پتہ چلتا ہے کہ یہ تو کوئی دشمن ہے لیکن جو کچھ ان کے سینے میں چھپا ہوا ہوتا ہے' وہ اس سے کہیں زیادہ ہوتا ہے۔ **قَدْ بَیَّنَّا لَكُمُ الْاٰیٰتِ اِنْ كُنْتُمْ تَعْقِلُوْنَ** (3:118) ہم تو بات واضح طور پہ بیان کرتے ہیں' چھپی ہوئی نہیں رکھتے' لگی لپٹی نہیں رکھتے۔ بات ہم نے کی' کہا: تم عقل وفکر سے سوچ کے دیکھو کہ بات ٹھیک کہی گئی ہے یا نہیں۔ کتنی صحیح بات ہے کہ جو تمہاری اس مملکت کی بنیادوں میں ہی BELIEVE نہیں کرتے وہ اس مملکت کے خیر خواہ ہو کیسے سکتے ہیں۔

قرآنِ حکیم کی آیت (3:119) کے صحیح مفہوم کے لیے جنگِ بدر کے میدان کو پیشِ نظر رکھنا ہوگا

هٰۤاَنْتُمْ اُولَآءِ تُحِبُّوْنَهُمْ وَ لَا یُحِبُّوْنَكُمْ (3:119) عام ترجمہ یہ کیا جاتا ہے کہ تم وہ ہو جو ان سے محبت کرتے ہو اور وہ محبت نہیں کرتے ہیں۔ یہ تو جماعتِ مؤمنین کے متعلق صدرِ اول کی جو ہے' یہ بات تو نہیں۔ اس جماعت کے افراد تو وہ تھے کہ جنہوں نے وطن ہی نہیں چھوڑا اپنا' بیوی بچوں تک کو چھوڑ کے وہ چلے آئے تھے۔ بدر کے میدان کے اندر جب یہ **منکم مؤمنون و منکم کافرون** کی تمیز عملی طور پہ سامنے آئی ہے تو اس وقت باپ ایک طرف تھا' بیٹا دوسری طرف تھا۔ ابوبکرؓ تھا بیٹا دوسری طرف سامنے ان کے کھڑا تھا۔ ماموں ایک طرف تھا بھانجا' دوسری طرف تھا۔ بھائی ایک طرف تھا دوسرا بھائی دوسری طرف تھا۔ رسول اللہ ﷺ ایک طرف تھے' حقیقی چچا وہاں دوسری طرف تھا آپ ﷺ ادھر تھے حقیقی داماد دوسری طرف تھا۔ بیٹی کا سہاگ اپنے ہاتھوں سے لٹا رہے تھے۔ تو یہ ان کے متعلق نہیں ہے کہ تم ان سے محبت کرو۔ یہ انداز کہنے کا ہے کہ سوچو تو سہی تم ان کے ساتھ اگر یہ

تعلقات پیدا کروتو وہ تمہارے ساتھ کبھی یہ تعلقات پیدا کرنے والے نہیں ہیں۔ تمہاری تو کیفیت یہ ہے کہ **وَ تُؤْمِنُوْنَ بِالْكِتٰبِ كُلِّهٖ** (3:119) تمہاری تو حالت یہ ہے کہ ان کی کتابوں پر بھی تم ایمان رکھتے ہو؛ اپنے قرآن پر ایمان رکھنے سے پہلے ان کی کتابوں پر بھی ایمان رکھتے ہو۔ اور ان کی کیفیت یہ ہے کہ **وَ اِذَا لَقُوْكُمْ قَالُوْۤا اٰمَنَّا ۖۚ وَ اِذَا خَلَوْا عَضُّوْا عَلَیْكُمُ الْاَنَامِلَ مِنَ الْغَیْظِ ؕ** (3:119) تم سے ملتے ہیں تو وہ گلے لگا کے ملتے ہیں کہتے ہیں کہ بالکل صاحب! ہم تم میں سے ہیں یہ مملکت ہماری اس کے مفاد ہمارے مشترک مفاد، تم میں سے ہی ہم ہیں ہم، ایمان لاتے ہیں اس کے اوپر جو کچھ تم کہتے ہو۔ اور جب تنہائی میں جاتے ہیں تو تمہارے غیظ وغضب میں انگلیاں کاٹتے ہیں اپنی۔ **قُلْ مُوْتُوْا بِغَیْظِكُمْ ؕ** (3:119) ان سے کہو جاؤ اپنے غصے کی آگ میں خود ہی بھسم ہو کر جل مرو، ہمارا تم کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔ **اِنَّ اللّٰهَ عَلِیْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ** (3:119) زبان سے جو تم آ کے محبت اور مودّت کی باتیں کرتے ہو، یہ سارے زبانی دعوے ہیں۔ ہمارا خدا جانتا ہے کہ تمہارے سینوں کے اندر کیا ہے۔ کہا ان کی کیفیت یہ ہے کہ **اِنْ تَمْسَسْكُمْ حَسَنَةٌ تَسُؤْهُمْ ؗ** (3:120) اگر تمہیں کبھی کوئی چیز خوشگواری کی پہنچ جاتی ہے، مملکت تمہاری PROSPER ہونے لگ جاتی ہے، میدان میں کہیں تمہیں فتح حاصل ہو جاتی ہے، کوئی چیز بھی خوشگواری کی جو تمہیں پہنچتی ہے، ان کے گھروں میں صفِ ماتم بچھ جاتی ہے۔ **وَ اِنْ تُصِبْكُمْ سَیِّئَةٌ یَّفْرَحُوْا بِهَا ؕ** (3:120) جہاں تمہیں کبھی کوئی تکلیف پہنچتی ہے، بہت خوش ہوتے ہیں۔ کہا یہ ہے ان کی کیفیت۔ آیت کے اگلے ٹکڑے میں یہ بتایا گیا ہے کہ تمہیں کرنا کیا چاہیے۔ لیکن میں اس سلسلے میں کچھ اور آیات پیش کرنا چاہتا ہوں۔ یہ (3:118-120) ہے اسی سورۂ آلِ عمران کی آیت 28 ہمارے سامنے آ چکی ہے اسے پھر دہرادوں۔

قرآنِ حکیم کے بیان کردہ نظریۂ زندگی کو تسلیم کرنے والوں کا اندازِ زیست

عزیزانِ من! آج کے CONTEXT میں جو حالات ہیں بڑی اہم آیات ہیں جس میں یہ بتایا گیا ہے کہ جو لوگ قرآن کے نظریے پہ ایمان رکھتے ہیں، ان کی مملکت ان کی قومیت کا انداز کیا ہوگا؟ **لَا یَتَّخِذِ الْمُؤْمِنُوْنَ الْكٰفِرِیْنَ اَوْلِیَآءَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِیْنَ** (3:28) کوئی مومن جو ہے وہ کبھی بھی ان لوگوں کے ساتھ دوست داری کے ساتھ تعلقات نہیں رکھ سکتا جو ان نظریات میں BELIEVE نہیں کرتے۔ میں آگے چل کے عرض کروں گا انسانیت کے تعلقات تو ہر ایک سے رکھے جائیں گے۔ بلا تمیز کفر اور ایمان کے صرف انسان ہونے کی حیثیت سے سارے حقوقِ انسانیت ان کو دیے جائیں گے، ان سے حسنِ سلوک کیا جائے گا، ان سے عدل کیا جائے گا لیکن راز داری کے تعلقات نہیں رکھے جا سکتے۔ **وَ مَنْ یَّفْعَلْ ذٰلِكَ فَلَیْسَ مِنَ اللّٰهِ فِیْ**

شَیۡءٍ (3:28) جو ایسا کرے گا تم میں سے پھر اللہ کے ساتھ تو اس کا کوئی تعلق نہیں رہ سکتا۔ آپ دیکھتے ہیں کتنی بڑی چیز ہے۔ 478-آلِ عمران چیز تو وہی جسے آپ کہتے ہیں مملکت کے غدار ہو گئے وہ۔ اور اسلامی نظام کی رو سے مملکت کے غدار کا تو اللہ کے ساتھ تعلق ہی کوئی نہیں رہ سکتا۔ خدا کے ساتھ تو ہمارا تعلق اس نظام کی رو سے وابستہ ہوتا ہے' انفرادی نہیں ہوتا۔ یہ نظام اس کے قوانین کو نافذ کرتا ہے' ہم اس کی اطاعت کرتے ہیں' یوں ہمارا خدا کے ساتھ تعلق قائم ہوتا ہے۔ لہٰذا جو مملکت کا غدار ہے وہ کبھی بھی اس کا تعلق خدا کے ساتھ نہیں ہو سکتا۔ یہ معنی ہیں کہ مومن کبھی بھی کسی غیر مومن کو اپنا راز دار اور دوست نہیں بنا سکتا۔ عربی زبان میں ولی یا اولیا' کے معنی صرف دوست کے ہی نہیں ہوتے' آگے بھی بڑھ جاتی ہے بات' کسی کو اپنا سر پرست تسلیم کر لینا۔ وہ برابری کا جو تعلق ہے دوست داری کا اس کی بھی اجازت نہیں دیتا چہ جائیکہ کسی ایسی قوم کو سر پرست تسلیم کر لیا جائے کہ جو ان نظریاتِ حیات پر یقین نہیں رکھتی۔ اسلامی مملکت تو ایسا کر نہیں سکتی۔

دوستی کا معاملہ ہو یا الفت کا یا احترام کا اِن تمام کا انحصار نظریاتی ہم آہنگی سے وابستہ ہے

قرآن کا کہنا ہے کہ یہ جو ان لوگوں کے ساتھ دوست داری کے تعلقات قائم رکھنے کی آرزو دل میں لیے بیٹھے ہیں یا ایسا تصور کرتے ہیں الَّذِیۡنَ یَتَّخِذُوۡنَ الۡکٰفِرِیۡنَ اَوۡلِیَآءَ مِنۡ دُوۡنِ الۡمُؤۡمِنِیۡنَ ؕ اَیَبۡتَغُوۡنَ عِنۡدَهُمُ الۡعِزَّةَ (4:139) کیا وہاں یہ اپنی عزت ڈھونڈنے جاتے ہیں ان کے ساتھ مل کے کہ ہماری بڑی عزت ہو گی وہاں' ان کے ہاں POPULAR ہونا چاہتے ہیں' عزت حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ فَاِنَّ الۡعِزَّةَ لِلّٰهِ جَمِیۡعًا (4:139) یاد رکھو! عزت تو ساری خدا کے ساتھ وابستگی میں شامل ہے۔ عزت کے معنی عزت بھی ہیں جسے ہم اپنے ہاں RESPECT یا احترام کہتے ہیں۔ عربی زبان میں اس کے معنی قوت اور غلبے کے بھی ہوتے ہیں۔ تو اس کے یہ معنی ہوئے کہ صرف اس لیے نہیں ہے کہ ہم ان کے ہاں ذرا عزیز ہوں' اپنے لیے تقویت کا موجب بنانا چاہتے ہیں ان لوگوں کے ساتھ ان تعلقات کو وابستہ کر کے جو تمہارے نظریات کے مخالف ہیں۔ کیا وہ تمہارے غلبے اور تقویت کا موجب بن سکیں گے؟ جو بنیادی طور پہ مخالف ہے تمہارے نظریۂ حیات کا وہ اس نظریۂ حیات کے غالب لانے کے لیے تمہاری مدد کس طرح سے کرے گا؟ قرآن تو انسان کو پوری خود اعتمادی (SELF CONFIDENCE) سکھاتا ہے۔

حضرت ابراہیمؑ کے علاوہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی زندگی کو قرآنِ حکیم نے انسانیت کے لیے اسوۂ حسنہ قرار دیا ہے

قرآنِ کریم نے دو ہی ہستیاں ہیں جن کے متعلق بہ نصِ صریح کہا ہے کہ جن کی زندگی تمہارے لیے اسوۂ حسنہ ہے بہترین نمونہ ہے ان کی زندگی میں۔ ایک تو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی۔ اور وہ اس مقام پر آیا ہے یہ ٹھیک ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ساری زندگی جو ہے، وہ ہمارے لیے اسوہ ہے کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا عمل قرآن پہ تھا۔ لیکن جس مقام پہ وہ آیا ہے اہم مقام ہے وہ مقام وہ ہے کہ جب احد کے میدان میں فوج کے ایک دستے کی غلط نگہی کے باعث شکست ہو رہی تھی، بھاگڑ مچ رہی تھی، افراتفری پیدا ہو گئی تھی۔ یہ لوگ میدان کو چھوڑ کے بھاگے جا رہے تھے تو عین اس وقت اس تشطت کے عالم میں، اس بھگدڑ کے عالم میں ایک ہستی ایسی تھی جو روشنی کے مینار کی طرح اپنے مقام پر کھڑی تھی اور ان کو آوازیں دے رہی تھی کہ تم حق کو چھوڑ کے کہاں بھاگے چلے جا رہے ہو، مومن میدانِ جنگ سے پیٹھ دکھا کے بھاگا نہیں کرتا۔ دیکھو! میں اپنے مقام پہ کھڑا ہوں اور یہ میری صداقت کی دلیل ہے کہ اس قدر مصائب کے ہجوم میں بھی پاؤں میں میرے کبھی لغزش نہیں آئی، تمہیں بھی یہ کچھ ہونا چاہیے۔ یہ ہستی تھی خود ذاتِ رسالت م آب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی۔ اور اس مقام پہ قرآن نے کہا ہے اے جماعتِ مؤمنین! تمہارے لیے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زندگی میں اسوہ ہے۔ اسی قسم کا ایک اسوہ جو ہے وہ حضرتِ ابراہیمؑ کی ذات میں قرآن نے یہ بیان کیا ہے۔ حضرتِ ابراہیمؑ کی زندگی بھی قرآن نے ان کے بہت سے نقوشِ قدم ہمارے لیے رکھے ہیں، چھوڑے ہیں۔ عجیب زندگی ان کی نظر آتی ہے، قدم قدم پہ۔ اور ان کی زندگی میں یہ پہلو بڑا نمایاں ہے کہ اپنے اور غیر کے اندر وہ تفریق کرتے چلے جاتے ہیں ایک ایک قدم پہ۔ میں نے ابھی عرض کیا ہے گھر میں باپ سے یہ کہہ رہے ہیں۔ باپ ہی کی حیثیت نہیں تھی اس زمانے میں یہ جو پروہت ہوتا تھا، اس کی حیثیت بادشاہ سے بھی بڑی ہوتی تھی، بادشاہ کو بھی اس سے پوچھ کے، عمل کرنا پڑتا تھا، فیصلہ دینا پڑتا تھا۔ بڑا منصب بلند ہوتا تھا یہ، ان کی تو اپنی فوج ہوتی تھی۔ ان کا باپ تو چیف پریسٹ تھا مملکت کا۔ اتنا بڑا منصب بھی تھا پھر باپ کی حیثیت بھی تھی۔ تو میں نے جیسا عرض کیا ہے کہ سب سے پہلے تو آپؑ نے باپ سے یہ کہا تھا کہ تف ہے اس مسلک پہ اور تف ہے ان مورتیوں پہ کہ اپنے ہاتھوں سے تراش کے ان کے سامنے سر جھکاتے ہو، انسانیت کی تذلیل ہے اس کے اندر۔ انہوں نے کہا تھا کہ دیکھو میں تمہیں جسے کہتے ہیں عاق کر دوں گا۔ انہوںؑ نے کہا میں اس سے پہلے یہاں سے چلا جاؤں گا، تم میرا کیا کر سکو گے۔ قوم کے خلاف یہ کچھ، بادشاہ کے خلاف یہ کچھ، وطن کو چھوڑنے والے یہ ہے حضرتِ ابراہیمؑ کی زندگی۔ اور آپ دیکھیے کہ اسوۂ حسنہ کہاں کہا ہے؟ قَدۡ کَانَتۡ لَکُمۡ اُسۡوَۃٌ حَسَنَۃٌ فِیۡۤ اِبۡرٰهِیۡمَ وَ الَّذِیۡنَ مَعَهٗ ج (60:4) اے جماعتِ مؤمنین تمہارے لیے ابراہیمؑ اور ان کے ساتھیوں کی زندگی میں ایک نہایت عمدہ نمونہ ہے بہترین اسوہ ہے ان کی زندگی میں۔ کس مقام پہ یہ کہا ہے؟ اِذۡ قَالُوۡا لِقَوۡمِهِم (60:4) وہ لوگ کہ جب انہوں نے اپنی

قوم سے پہلے یہ کہا۔

قرآنِ حکیم اپنے ہاں آئیڈیالوجی کے اس قدر فرق کے باوجود کسی انسان کے احترام میں امتیاز پیدا نہیں کرتا

غور فرمایئے کہ مسلم اور غیر مسلم کے اشتراک سے ایک قوم بنانے کا نظریہ پیش کر رہے ہیں۔ اپنے وطن میں اپنی قوم سے کہا اِنَّا بُرَءٰٓؤُا مِنْكُمْ وَمِمَّا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ذ (60:4) تم وہ غیر اللہ کی محکومیت اختیار کیے ہوئے ہو تو تمہارے ان حاکموں سے اور خود تم سے ہم نفرت کا اظہار کرتے ہیں كَفَرْنَا بِكُمْ (60:4) ہم انکار کرتے ہیں تمہارے اس سارے مسلک سے' کہ یہ غلط ہے' یہ باطل ہے۔ اور پھر یہ نہیں ہے کہ دل میں کچھ اور رکھتے ہیں زبان پہ کچھ اور لاتے ہیں۔ وَبَدَا بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمُ الْعَدَاوَةُ وَالْبَغْضَآءُ اَبَدًا (60:4) تم میں اور ہم میں دشمنی کے بغض کے تعلقات قائم ہو گئے۔ یہ ہیں تمہارے اور ہمارے درمیان تعلقات' یہ ہمیشہ ابداً رہے گا۔لیکن ہمیشہ کہنے والے کی زبان سے اگلے الفاظ پھر سامنے آ گئے۔ ہم تمہیں انسان ہونے کی حیثیت سے تم سے کوئی نفرت نہیں کر رہے بلکہ تمہارے اس مسلک کی بنا پر ہم سے تمہارے یہ تعلقات منقطع ہو گئے ہیں۔ صرف منقطع ہو جانا تو INDIFFERENCE ہو جانے والی بات ہو جاتی ہے۔نہیں! دشمنی کے تعلقات ہیں۔حق اور باطل کے درمیان یہی نہیں ہوتا کہ حق INDIFFERENT ہو جاتا ہے باطل سے۔ وہ تو باطل کا سر توڑنے کے لیے ہر وقت تیار رہتا ہے۔ کہا ہے کہ تمہارے اور ہمارے درمیان تعلقات یہ ہیں۔لیکن یہ ابدی چیز حَتّٰى تُؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ وَحْدَهٗ (60:4) ہاں! تم بھی اگر اسی طرح سے خدائے واحد کے قوانین کو مان لو پھر تمہارے ہمارے تعلقات وابستہ ہو جائیں گے۔ یہاں سے آپ نے غور فرمایا کتنی اہم چیز نکلتی ہے۔قرآن کسی انسان سے نفرت نہیں سکھاتا' انسان کا جو جرم ہے اس جرم سے نفرت سکھاتا ہے۔ مجرم سے وہ نفرت نہیں کرتا مجرم کے جرم سے نفرت کرتا ہے۔جس وقت وہ اسے چھوڑ دیتا ہے' اسی وقت اسے گلے لگا لیتا ہے۔ ورنہ اگر انٹری کلی ویزی کلی وہ قابلِ نفرت ہو جائیں تو وہ تو جب تک جیتا ہے پھر اس وقت تک یہ کچھ رہے گا۔ غلط ہے۔ اس وقت بھی اس کے انسان ہونے کی حیثیت جو ہے وہ باقی رہتی ہے۔ حَتّٰى تُؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ وَحْدَهٗ (60:4)۔ لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْهِمْ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ لِّمَنْ كَانَ يَرْجُوا اللّٰهَ وَالْيَوْمَ الْاٰخِرَ ط (60:6) جو بھی اللہ اور آخرت پہ ایمان لانے والے ہیں ہمیشہ کے لیے ان کے لیے اس جماعت کا اسوہ یہ ہے' یہ ہے اسوۂ حسنہ' نمونہ' یہ ہونا چاہیے مومن کا شعار۔غور فرمایا آپ نے کہاں کہا ہے کہ یہ اسوۂ حسنہ ہے تمہارے لیے۔ اس قرآن کو

ماننے والا پھر مسلمان دنیا کے اندر۔ایک TERRITORY میں بسنے والے جسے آپ مسلم اور غیر مسلم کہتے ہیں' ان کے ساتھ ایک قوم بنا رہا ہے' ان کے ساتھ مودّت اور دوستی کے تعلقات وابستہ کر رہا ہے' ان کے ساتھ سر پرستیوں کے تعلقات وابستہ کر رہا ہے ۔عزیزانِ من ! قرآن یہ کہتا ہے اس ابراہیمؑ کا اسوہ کہ جس نے خود اپنی اولاد سے یہ کہہ دیا کہ فَمَنْ تَبِعَنِیْ فَاِنَّهٗ مِنِّیْ (14:36) تم پوچھتے ہو کہ میرا کون ہے؟ میرا وہ ہے جو اس مسلک کے اوپر چلتا ہو وہ میرے پیچھے چلا آئے' میرا وہ ہے۔

قرآنِ حکیم پر مبنی نظریات رکھنے والوں کی اندرونی چپقلش کی کیفیت

قرآن نے کہا اور یہ عجیب بات ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ اس نے پھر ہم لوگوں سے تخاطب کیا ہے کہ تمہاری تو یہ کیفیت ہے کہ تم اس مسئلے کو اہمیت نہیں دیتے وَ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ (8:73) یہ جتنے بھی دوسرے نظریات زندگی رکھنے والے تمہارے خلاف ہیں' ان میں آپس میں بڑا اختلاف افتراق ہے لیکن جب تمہارے مقابل میں آتے ہیں تو سب ایک دوسرے کے دوست ہوتے ہیں ۔ وہ کہتا ہے سوچو کہ کفر کے نظریات رکھنے والے تو اس مسلک میں متحد ہو جاتے ہیں اور تم ایک نظریے کے رکھنے کے مدعی جو ہو ان کی کیفیت یہ ہے کہ تمہارے درمیان سر پھٹول ہو رہا ہے ۔آپ دیکھ رہے ہیں یہ' یعنی ایک تو یہ تھا نا کہ ہم رسمی طور پہ مسلمان کہلاتے چلے آ رہے تھے' ٹھیک ہے جی ان میں آپس میں سر پھٹول تھی تفرقہ تھا' افتراق تھا' فرقے بندیاں تھیں' گروہ سازیاں تھیں ۔ یہ انتہائی تعجب ہے اس پاکستان کے مسلمان پہ کہ جس نے پہلے دن سے یہ کہا کہ ہمارا نظریۂ قومیت یہ ہے آئیڈیالوجی کی وحدت اور اشتراک' ہم مملکت اس نظریے پہ بناتے ہیں صحیح اسلامی تصور ۔ اور اس کے اندر اس آئیڈیالوجی کی BASIS پہ ایک قوم بننے کے مدعیوں کی کیفیت جو آج ہو رہی ہے' وہ آپ دیکھیے ۔ وہ کہتا ہے او دیکھو یہ تمہارے خلاف کفر پہ BELIEVE کرنے والے تو متحد ہو جاتے ہیں تمہارے خلاف دشمنی پہ اور تم ایمان لانے والے ایک نظریے کے حاملین میں اتحاد نہیں ہو رہا ۔ وَ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ ؕ اِلَّا تَفْعَلُوْهُ تَكُنْ فِتْنَةٌ فِی الْاَرْضِ وَ فَسَادٌ كَبِیْرٌ (8:73) اگر تم نے یہ روش اختیار نہ کی یعنی نظریے کی اشتراک کی بنیاد پہ ایک بنیانِ مرصوص نہ بنے' سیسہ پلائی ہوئی دیوار نہ بنے (تو پھر قرآن نے یہ کہا تھا) تو یاد رکھو! کہ اس اپنے ہی ملک کے اندر ان آزمائشوں میں ڈالے جاؤ گے ان بھٹیوں میں ڈالے جاؤ گے جو تمہیں راکھ بنا کے رکھ دے گی اور تمہارے ملک کے اندر فَسَادٌ كَبِیْرٌ (8:73) برپا ہو جائے گا ۔ اس نظریہ پر عمل نہ کرنے کی بنا پر تمہاری اپنی مملکت کے اندر قدم قدم پر یہ آگ کی بھٹیاں ہوں گی جن میں جھلس جاؤ گے ۔ فسادِ کبیر کہا ہے اس کو ۔ عزیزانِ من ! انتہا ہے ایک نظریے میں BELIEVE کرنے کی مدعی قوم اور اس کی کیفیت یہ کہ یوں بٹی ہوئی' یہ فسادِ کبیر نہیں تو اور فسادِ کبیر کیا

ہو۔ اور اس میں یہی نہیں کہ یہ جو وہاں کے مشرک تھے یا جسے ہم کافر کہتے ہیں انہی کی کیفیت یہ بتائی ہے قرآن تو یہ کہتا ہے کہ یاد رکھو! یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوا الْیَهُوْدَ وَ النَّصٰرٰٓی اَوْلِیَآءَ ((5:51 اے ایمان والو! تمہیں ہم بتا دیں یہ یہودی اور نصاریٰ یہ کھلے ہوئے کفار، مشرکین کے مقابلے میں تمہارے کچھ قریب نظر آتے ہیں۔ یہ بھی اس چیز کے مدعی ہیں کہ ہم خدا پر بھی ایمان رکھتے ہیں۔ چلیے تمہارے رسول تک نہ سہی، تمہارے رسول سے IMMEDIATELY BEFORE پہلے تک کے رسول جو ہیں ان پر بھی یہ کہتے ہیں ایمان رکھتے ہیں۔ ان کتابوں پہ ایمان رکھتے ہیں۔ ان کا ایمان ہے کہ ہم آخرت پر بھی ایمان رکھتے ہیں تو بظاہر نظر آتا ہے کہ یہ تو بہت قریب ہوں گے۔

مسلم قوم کی نسبت کی بنا پر یہود اور نصاریٰ کی مخالفت کی سازشیں اور پھر صلیبی جنگوں کا کردار

لیکن جیسا میں نے عرض کیا ہے کہ ایمان رکھنے کے تو یہ معنی ہیں نہیں، اس کے تو معنی یہ ہیں کہ اس آئیڈیالوجی کی بنیادوں پہ ایک قوم بنے اور ایک مملکت تشکیل لائی جائے۔ وہ تو مذہب ہے۔ کہا یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوا الْیَهُوْدَ وَ النَّصٰرٰٓی اَوْلِیَآءَ ((5:51 انہیں بھی تم اپنی دوست داری میں نہیں لے سکتے۔ اور آپ کی تیرہ سو سال کی تاریخ اس کی شہادت دیتی ہے کہ اگرچہ آپ صحیح معنوں میں اس دین کے اوپر نہیں رہے تھے۔ ہماری قوم وہاں سے الگ ہوگئی تھی اس کے باوجود محض اس طرف نسبت کرنے کی بنا پر ساری تاریخ ہماری یہ ہے کہ یہود اور نصاریٰ نے جتنی مخالفت ہماری کی ہے، دوسری قوموں نے کم مخالفت ایسی کی ہوگی۔ اس سے پیشتر تو بہرحال ''عصمتِ بی بی از بے چارگی'' تھی۔ یہ آپ WANDRING JEWS پھر رہے تھے، ان کے کھل کے سامنے آنے والی بات تو نہیں تھی۔ ان کی سازشیں ہوتی تھیں ہمارے خلاف۔ اور جب دنیا میں ان کو اتنے سے ٹکڑے کے اندر بھی حکومت مل گئی ہے، اپنی مملکت قائم ہوئی ہے تو آپ دیکھ رہے ہیں کہ مسلمانوں کی دشمنی میں کس حد تک آگے چلا گیا ہے۔ یہ نصاریٰ ان میں کبھی آپس میں اتحاد نہیں ہوا تھا۔ جتنے فرقے ہم میں ہیں، ان سے کہیں زیادہ فرقے ان کے اندر ہیں اور ہمیشہ سر پھٹول ان کا ہوا ہے۔ ساری تاریخ میں ان کا جو اتحاد ہوا ہے ایک مقام پہ اتحاد ہوا ہے جب یہ مسلمانوں کے خلاف صلیبی جنگ میں آئے ہیں، پوری یورپ کی مملکتیں ساری متحد ہوگئی ہوئی تھیں۔ اور یہ جو پھر ان کو چڑ کے لگے ہیں صلیبی جنگ میں شکست کے وہ زخم ان کے آج تک مندمل نہیں ہونے پائے۔ وہ انتقام آپ سے یہ لے رہے ہیں۔ آج تک لیے چلے جا رہے ہیں۔ یاد رکھیے! کوئی عیسائی مملکت کبھی کسی مسلمان کی دوست دار نہیں ہوسکتی۔ خود انتقام لے رہے ہیں ان یہودیوں کو آلۂ کار بنایا ہوا ہے انتقام کا۔ اور جیسا کہ میں نے عرض کیا ہے ابھی صرف ہمارا نام مسلمان ہے۔ لَا

تَتَّخِذُوا الْيَهُوْدَ وَالنَّصٰرٰٓى اَوْلِيَآءَ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ ط ((5:51۔

یہودیوں کی طرف سے حضرت عیسیٰؑ کو صلیب پہ چڑھانے کا دعویٰ

بنیادی طور پر جتنی دشمنی یہود اور نصاریٰ میں ہوسکتی تھی یا تھی' اتنی مسلمانوں میں اور ان میں ہو ہی نہیں سکتی تھی ۔ یہودیوں کا دعویٰ یہ تھا دھڑلے سے چھاتی پہ ہاتھ مار کے یہ کہتے تھے کہ ہم نے عیسیٰؑ کو صلیب پہ چڑھایا ہے۔آپ سوچیے کسی قوم کے نبی کو نہیں بلکہ جنہیں وہ خدا مانتی' ہوا بن اللہ مانتی ہوُ اس کے متعلق دوسری قوم دھڑلے سے کہہ رہی ہے کہ ہم نے صلیب دیا اسے۔اور صلیب دینے کے معنی خود انجیل میں یہ تھے کہ وہ لعنتی کی موت مرتا ہے۔ یہود کا دعویٰ یہ تھا کہ ہم نے (معاذ اللہ معاذ اللہ) مسیحؑ کو ہم نے ملعون ثابت کر دیا۔اب سوچیے کہ ان دونوں قوموں میں آپس کے تعلقات کیا ہوں گے۔لیکن آپ کے مقابلے میں جب یہ قومیں آئی ہیں تو یہ اس حد تک قرآن نے جو کہا ہے بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ ط (5:51) تمہارے مقابلے میں یہ ایک دوسرے کے دوست ہو جائیں گے۔دوستی کی انتہا ان کی یہ ہوئی ہے کہ یہ HISTORICAL FACT ان کے ہاں کا' یہ ان کے ہاں کی تاریخی حقیقت جس میں یہودی اتنے دعوے سے کہتے تھے کہ ہم نے انہیں صلیب پہ چڑھایا۔

فلم Ben Hur کی نمائش میں پیش کیے جانے والے مناظر

دو ہزار سال سے عیسائیوں کی تاریخیں آپ دیکھیے تو انبار لگے ہوئے ہیں ان تاریخوں کے جس پہ انہوں نے کہا ہے کہ یہودیوں نے ہمارے پیغمبر ہمارے خدا کے ساتھ یہ کچھ کیا۔آج ان کی کیفیت یہ ہے انہوں نے اپنی تاریخ بدل دی ہے' انہوں نے اپنا مذہب بدل دیا ہے۔پوپ نے یہ اعلان کر دیا ہے کہ یہ غلط ہے کہ یہودیوں نے حضرتِ مسیحؑ کو صلیب پہ چڑھایا تھا' وہ رومن تھے جنہوں نے چڑھایا تھا' ان کے ہاتھ بالکل پاک ہیں اس سے۔اور آپ کو معلوم ہوگا کہ وہ جو فلم اس کے بعد آئی ہے BEN HUR کی جس فلم کو عیسائی سلطنتوں کے مشترکہ فنڈ سے ساری دنیا میں مفت چلایا گیا تھا اس میں صرف یہ دکھایا گیا تھا کہ حضرتِ مسیحؑ کو صلیب پہ دینے والے یہودی نہیں تھے' رومن تھے۔انہوں نے اپنی انجیل کے نئے ایڈیشن میں یہ تحریف کر دی ہے' ترمیم کر دی ہے' تاریخ اپنی بدل دی ہے' آپس میں اتحاد کرنے کے لیے۔کاہے کے لیے؟ عربوں کی مملکت' مسلمانوں کی مملکت کے خلاف جو یہود کا رویہ ہے' اس میں تقویت پہنچانے کے لیے یہاں تک یہ لوگ چلے گئے ہیں۔کیا کہہ رہا ہے قرآن؟ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ ط (5:51)۔

ہمارے ہاں دوقومی نظریہ کو پامال کرنے کے مختلف حربے اور جناحؒ اور علامہ اقبالؒ کو فراموش کرنے کا نتیجہ

478آلِ عمران

عزیزانِ من! یہ ان کی کیفیت ہے کہ جو نظری طور پر نہ ایک قوم بنے ہیں نہ ان کی ایک مملکت نظریے کے اوپر مبنی ہے۔او خدا کے لیے سوچو تو سہی یہ قوم تو تم نے اس نظریے کی بنیاد پر بنائی تھی یہاں' یہ دعویٰ کر کے ایک مملکت حاصل کی تھی۔اور میں کہوں گا کہ اس کے بعد اگر یہ کیفیت تمہاری ہے کہ یہاں کا مسلم' غیر مسلم مل کے ایک قوم بنتا ہے' دنیا کی عدالت آپ کو یہ پوچھے گی کہ تم نے دعویٰ کیا تھا الگ مملکت بنانے کا کہ ہمارا ایمان یہ ہے کہ مسلم اور غیر مسلم مل کر ایک قوم نہیں بن سکتے تم اپنے ہاں دونوں کو ملا کے ایک قوم بنا رہے ہو۔غیر مسلموں کو پورے حقوق آپ کے ہاں انتخابات میں دیے جا رہے ہیں' پارلیمنٹ کے ممبر بن رہے ہیں۔ان کی جو آبادی ہے مشرقی پاکستان میں وہ ایک کروڑ غیر مسلموں کی آبادی کی بنیادوں پہ وہ کہتے ہیں کہ ہم تعداد میں زیادہ ہیں ان کے مقابلے میں۔اللہ اکبر۔یہ دنیا کی عدالت آپ سے پوچھے گی نہیں؟ کہ مسخرہ کیا کر رہے ہو تم؟ تم تو اس دعوے کی بنیاد پہ الگ قوم بنے تھے' تم نے مملکت لی اس دعوے کی بنیاد پر تھی۔چنانچہ انہوں نے تو بعد میں کہنا ہوگا ہمارے ہی اندر جو اس طرح سے اختلاف اور افتراق پیدا کرنے والے عناصر ہیں' ان سے جب کہیے کہ صاحب وہاں تو یہ بنیاد تھی؟ وہ کہتے ہیں کہ وہ جناحؒ نے ایک وکیلانہ حربہ استعمال کیا تھا۔اللہ اکبر۔زباں بگڑی تو بگڑی تھی خبر لیجئے' دہن بگڑا۔تم تو بگڑے تھے

فرمانِ قائدِ اعظمؒ: ''پاکستان کی پہلی اینٹ تو اس روز رکھ دی گئی تھی جس روز ایک غیر مسلم نے مسلمان ہونے کا اعلان کیا تھا''

اس مردِ مخلص کے متعلق آج تم یہ طعن دیتے ہو کہ اس نے منافقت برتی تھی۔معاذ اللہ معاذ اللہ۔اس کو تمہارے ساتھ مل کے لینا کیا تھا؟ اس قوم کے اندر تو اس کی پوجا ہوتی تھی۔آج بھی ہندوستان کے اندر گاندھی میموریل ہال کوئی نہیں ہے' کانگریس کا بنایا ہوا بمبئی میں جناحؒ میموریل ہال کھڑا ہے۔اس نے تم سے کیا لینا تھا۔قرآن کی بصیرت تھی جو اس کے سامنے آ گئی وہ شخص کہ جس نے یہ اعلان کیا تھا' ہمیشہ تک یہ اعلان چمکتے ہوئے ذروں کی شکل میں باقی رہے گا۔اس سے پوچھا گیا کہ یہ جتنے مسلمان یہاں ہیں ؟ گاندھی نے کہا یہ تو ہندوؤں کی اولاد ہیں' CONVERT ہو گئے تھے' یہ مسلمان ہو گئے۔الگ قوم کیسے بنتی ہے اور ان کی بنیاد کے اوپر الگ مملکت پاکستان کیسے وجود میں آ سکتا ہے؟ اس نے کہا تھا تم آج کہتے ہو!! پاکستان کی اینٹ اس ملک کے اندر اس

دن رکھی گئی تھی جب پہلا غیر مسلم مسلمان ہوا تھا۔ اس نے کہا تھا دو قومیں اس دن وجود میں آ گئی تھیں۔ قوم ایک فرد سے بھی وجود آلِ عمران 478 میں آ جایا کرتی ہے۔ آج تو خدا کا فضل ہے کہ ہم اتنے کروڑ واقع ہوئے ہیں۔ آج اس کے متعلق کہا جا رہا ہے کہ اس نے وکیلانہ حربہ استعمال کیا تھا۔ انہیں کیا پتہ ہے وہ کون لوگ تھے؟ ہم سے پوچھیے جن کو ان کے جوتے سیدھے کرنے کی سعادت ملی تھی۔ قرآن یہ کہہ رہا ہے۔ کہتا ہے ٹھیک ہے تم ان کے ساتھ دوست داری کے تعلقات رکھتے ہو۔ سنیئے عزیزانِ من! جو تم میں سے ان کے ساتھ دوست داری کے تعلقات رکھتا ہے فَاِنَّهٗ مِنۡهُمۡ ط((5:51 جاؤ تم بھی ان میں سے ہو۔ چل بھئی۔ سنتے ہیں آپ' یہ فیصلہ سن لیا ہے آپ نے؟ فَاِنَّهٗ مِنۡهُمۡ ط (5:51) تمہارا شمار ان میں نہیں' مسلمانوں میں نہیں رہے گا تم بھی ان میں سے ہو جاؤ گے۔ اور اس کے بعد اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهۡدِى الۡقَوۡمَ الظّٰلِمِيۡنَ((5:51 اس قسم کی قوم جو ہوتی ہے' خدا ان کے سامنے کشاد کے راستے نہیں کھولا کرتا۔ ذلت ومسکنت کی زندگی بسر کرو گے یاد رکھو! تم بھی ان میں سے ہو جاؤ گے۔

ہمارے ہاں ایک دوسرے کو کافر کہے جانے کا معیار

یہاں جھگڑا کیا جاتا ہے کہ صاحب وہ جو رسول اللہ ﷺ کو نور نہیں مانتا' بشر مانتا ہے' وہ مرتد ہو جاتا ہے' دائرۂ اسلام سے خارج ہو جاتا ہے۔ یہ ان چیزوں کے اوپر تو دائرۂ اسلام سے خارج کرنے والے جو ہیں بڑے فتوے دیتے ہیں۔ جو قرآن کہتا ہے کہ جو ان کے ساتھ اس قسم کے تعلقات وابستہ رکھتا ہے ان کے ساتھ مخلوط ہوتا ہے' اختلاط کی بنا پہ ایک قوم سمجھتا ہے فَاِنَّهٗ مِنۡهُمۡ ط(5:51) وہ مسلمانوں میں سے نہیں رہتا' ان میں سے ہو جاتا ہے' اس کے خلاف کوئی فتویٰ نہیں دیتا۔ نہ اس زمانے میں حسین احمد مدنی نے دیا نہ ابوالکلام آزاد نے نہ آج کے دور میں آپ کے ہاں کے وہ جو لوگ اس کے خلاف فتویٰ دے رہے ہیں یہ دیکھ رہے ہیں کہ ان کو ملا کے آپ ایک قوم بنا رہے ہیں۔ تفرقہ' فرقہ بندی پارٹی بازی جسے قرآن نے شرک کہا تھا' اس بنا پہ کوئی فتویٰ نہیں دے رہا ہے۔ زبانیں بند ہیں' تالے پڑے ہوئے ہیں' کیسے فتویٰ دے دیں۔ ان میں سے کوئی بھی پھر اس کے بعد اسلام پہ نہیں رہتا۔ فَاِنَّهٗ مِنۡهُمۡ ط اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهۡدِى الۡقَوۡمَ الظّٰلِمِيۡنَ((5:51 عزیزانِ من! یہ تو پھر بھی دوسرے نظریۂ زندگی کو BELIEVE کرنے والے لوگ تھے قرآن تو کہتا ہے کہ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا لَا تَتَّخِذُوا الَّذِيۡنَ اتَّخَذُوۡا دِيۡنَكُمۡ هُزُوًا وَّ لَعِبًا مِّنَ الَّذِيۡنَ اُوۡتُوا الۡكِتٰبَ مِنۡ قَبۡلِكُمۡ وَ الۡكُفَّارَ) (5:57 جو لوگ تمہارے دین کا مذاق نہیں بلکہ SERIOUSLY نہ لیں اس چیز کو' LIGHTLY لیں اس چیز کو' ان کے ساتھ بھی کوئی تعلق قائم نہ رکھو۔ انہیں پتہ ہی نہیں کہ نظریے کی بنا پر قوم بننے والے اپنے نظریات میں کس قدر محکم ہوتے ہیں' متشدد ہوتے ہیں۔

حسین احمد مدنی کے فتویٰ کے خلاف علامہ اقبالؒ کی پکار اور دینِ خداوندی کی تعلیم

یہ تھا وہ اصول جس کی بنا پر علامہ اقبالؒ نے حسین احمد مدنی سے جواب میں یہ کہا تھا کہ یاد رکھو! اسلام اپنے اصولوں میں کسی قسم کی لچک نہیں رکھتا ہے۔ لچک سے تو مداہنت پیدا ہوتی ہے' ایمان میں لچک کے کیا معنی۔ کہتا ہے کہ جو لوگ تمہارے دین کو مذاق سمجھیں، ہنسی اڑائیں یا LIGHTLY لیں SERIOUSLY نہ لیں ان چیزوں کو' ان کے ساتھ تمہارا کوئی تعلق نہیں ہوسکتا' وہ تمہارے دوست نہیں ہوسکتے۔ اور یہ معاملہ صرف ایک ملک میں عام بسنے والے لوگوں تک ہی نہیں رہتا۔ عزیزانِ من! جیسا کہ میں نے عرض کیا تھا ابتدا تو اس کی ہوئی حضرت نوحؑ اور ان کے بیٹے سے' باپ بیٹے سے ہوئی تھی' آگے چلے تھے تو بیٹے اور باپ میں ہوئی تھی حضرتِ ابراہیمؑ میں' آگے چلے تھے تو بیوی اور خاوند میں ہوئی تھی حضرتِ لوطؑ میں۔ آگے چلے تھے تو نبی اکرم ﷺ کے زمانے کے اندر تو پھر پورے رشتے دار یہ قریش مکے کے رہنے والے جو تھے' یہ قوم نہیں جیسے ایک خاندان ہوتا ہے' یہ ایک خاندان کے افراد تھے۔ سنیے قرآن کیا کہتا ہے؟ كَتَبَ اللّٰهُ لَاَغْلِبَنَّ اَنَا وَ رُسُلِىْ (58:21) ہم نے یہ لکھ دیا ہے کہ خدا اور اس کے نظام کے پیغامبر جو ہیں' وہ ہمیشہ غالب رہیں گے۔ بہت بڑی چیز ہے یہ كَتَبَ اللّٰهُ (58:21) لکھ دیا ہے ہم نے۔ خدا یہ کہہ رہا ہے' طے کر دیا ہے ہم نے یہ معاملہ جو ہے۔ لیکن یہ کون ہیں وہ لوگ کہ جن کے ہاتھوں سے یہ غلبہ جو ہے خدا کے اس نظام کا قائم ہوتا ہے؟ سنیے ان کی خصوصیات کیا ہیں؟ لَا تَجِدُ قَوْمًا يُّؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَ الْيَوْمِ الْاٰخِرِ (58:22) یہ وہ قوم ہے خدا پہ اور آخرت پہ ایمان رکھتی ہے اور اس کی نشانی یہ ہے کہ تم اس قوم کو کبھی ایسا نہیں پاؤ گے کہ يُوَآدُّوْنَ مَنْ حَآدَّ اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ (58:22) کہ جو خدا اور رسول کے اس نظام کے مخالف ہیں یہ ان کے ساتھ کسی قسم کے دوستانہ تعلقات رکھیں' تم نہیں اس قوم کو پاؤ گے۔ یہ قوم ہے جو حزب اللہ ہے جس کے ہاتھوں یہ کتب اللہ والی بات پوری ہوتی ہے۔ کبھی تم نہیں پاؤ گے کہ وہ ان کے ساتھ کسی قسم کے دوستانہ تعلقات رکھیں۔ عزیزانِ من! سنیے وَلَوْ كَانُوْٓا اٰبَآءَهُمْ (58:22) خواہ وہ ان کے ماں باپ ہی کیوں نہ ہوں اَوْ اَبْنَآءَهُمْ (58:22) خواہ ان کی اولاد کیوں نہ ہو اَوْ اِخْوَانَهُمْ (58:22) بھائی کیوں نہ ہوں اَوْ عَشِيْرَتَهُمْ ط (58:22) ان کے اہلِ خاندان کیوں نہ ہوں۔ اُولٰٓئِكَ كَتَبَ فِىْ قُلُوْبِهِمُ الْاِيْمَانَ (58:22) یہ مومن وہ ہیں ایمان ان کے دل کی گہرائیوں میں پیوست ہو چکا ہے اس لیے اس کے بعد ماں باپ بھائی بہن یہ رشتے حیثیت کیا رکھتے ہیں۔ BIOLOGICAL RELATION تو کوئی RELATION ہی نہیں ہوتا۔

نظریاتی زندگی کے بغیر گھریلو زندگی بھی حیوانی زندگی بن کر رہ جاتی ہے

یہ کیا تعلق ہے کہ ایک بچہ فلاں باپ کے گھر میں پیدا ہوگیا۔ اس بچے نے نہ انتخاب کیا' نہ چوائس کوئی دی' نہ اس نے اپنی مرضی سے اس کو باپ تسلیم کیا' سوال ہی نہیں ہے۔ بھائی اور بھائی جو ہوتا ہے تعلق کیا ہوتا ہے؟ محض ایک تمدنی زندگی کے لیے یہ ہے کہ اکٹھے مل جل کے رہنا ہے' اس واسطے ٹھیک ہے گھر کا نظام چلتا رہے۔ لیکن اسلام کی رو سے تو گھر بھی وہ گھر ہے جس کے رہنے والے نظریے میں ہم آہنگ ہوں۔ BIOLOGICAL RELATION کوئی معنی نہیں رکھتا اور اس کی حقیقت ہی کچھ نہیں ہوتی۔ BIOLOGICAL RELATIONS حیوانی سطح زندگی ہے صرف۔ انسان کے اندر بھی باپ بیٹا BIOLOGICALLY وہی تعلق رکھتا ہے جیسا کہ بیل اور اس کا ایک بچہ جو ہوتا ہے وہ تعلق رکھتا ہے۔ ایک ہی جنسی اختلاط کا نتیجہ ہوتا ہے۔ تمدنی زندگی جتنے وقت تک اس بچے کو یا چڑیا کے بوٹ کو ضرورت ہوتی ہے پرورش کی' وہ ایک گھر ہوتا ہے' وہ مل کے پرورش کرتے ہیں اس کی۔ جب اسے اس کی ضرورت نہیں رہتی پھُر سے اڑ جاتے ہیں اس کے بعد ان کو یاد بھی نہیں ہوتا کہ یہ بیٹا ہے نہ ان کو پتہ ہوتا ہے کہ یہ باپ ہے۔

اگر گھریلو زندگی میں میاں بیوی کی نظریاتی رفاقت نہ ہو تو وہ گھر نہیں ہوتا' جہنم ہوتا ہے

تمدنی زندگی میں آپس میں ایک دوسرے کی ضرورتیں ہوتی ہیں تو گھر بنا لیتے ہیں۔ لیکن اسلام کی رو سے تو گھر اور ہی قسم کا بنتا ہے یہاں تو گھر ان کا بنتا ہے جو اس بنیادی اصول میں ہم آہنگ اور متفق ہوتے ہیں۔ اسی لیے اس نے کسی ایسی عورت سے مرد کا اور مرد کا عورت سے نکاح حرام قرار دیا ہے جو نظریات میں ہم آہنگ نہ ہوں۔ قرآن کہتا ہے اس قسم کا نکاح' گھر نہیں ہوگا تمہارے لیے جہنم ہوگا۔ یہ اس لیے کہا اُولٰٓئِکَ کَتَبَ فِیۡ قُلُوۡبِهِمُ الۡاِیۡمَانَ ((58:22 مومن تو وہ ہیں جن کے دل کی گہرائیوں میں ایمان چلا گیا ہے۔ وَ اَیَّدَهُمۡ بِرُوۡحٍ مِّنۡهُ ؕ((58:22 اور یہی ہیں جن کو خدا اپنی توانائی سے مدد دیتا ہے۔ وَ یُدۡخِلُهُمۡ جَنّٰتٍ تَجۡرِیۡ مِنۡ تَحۡتِهَا الۡاَنۡهٰرُ خٰلِدِیۡنَ فِیۡهَا ؕ رَضِیَ اللّٰهُ عَنۡهُمۡ وَ رَضُوۡا عَنۡهُ ؕ((58:22 یہ وہ ہیں کہ جن کی زندگیاں اس دنیا میں بھی جنتی زندگی ہوتی ہے' آخرت بھی جا کے جنتی۔ اللہ ان سے جیسے (عام ترجمہ) راضی ہوگیا' یہ اپنے اللہ سے راضی ہو گئے۔

خدا کے لشکر کی بنیادی خصوصیات اور ان کی ترجیحات

اُولٰٓئِکَ حِزۡبُ اللّٰهِ ؕ((58:22 یہ ہے خدا کا لشکر۔ آ ہاہا! یہ ہے خدا کا لشکر۔ اور سن رکھو دنیا والو! اَلَاۤ اِنَّ حِزۡبَ اللّٰهِ هُمُ

اَلْمُفْلِحُوْنَ ((58:22 خدا کا لشکر یہ کامیاب ہوا کرتا ہے۔ سنتے ہیں خدا کے لشکر کی خصوصیات کیا ہیں۔((58:22 اور **آلِ عمران** 478 تائید ہے((9:23-24 عظیم آیات ہیں۔ یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوْٓا اٰبَآءَکُمْ وَ اِخْوَانَکُمْ اَوْلِیَآءَ ((9:23 اے جماعتِ مؤمنین! ماں باپ ہوں بھائی بند ہوں' کسے باشد اگر وہ خلافِ اسلام نظریۂ زندگی کو زیادہ محبوب رکھتے ہیں تو تم ان کو کبھی اپنا دوست نہ بناؤ۔ ترجیح دیتے ہیں بلکہ علی الایمان' اس پہ ترجیح اگر اس کو دیتے ہیں یعنی بالکل کفر برتنے کی بات یہاں نہیں کہی ایمان تو رکھتے ہیں اس کے اوپر بھی لیکن اگر کہیں ترجیح دے دیتے ہیں اس کو' ان کے ساتھ بھی کوئی تعلق نہیں۔ وَ مَنْ یَّتَوَلَّھُمْ مِّنْکُمْ فَاُولٰٓئِکَ ھُمُ الظّٰلِمُوْنَ ((9:23 جو ایسے لوگوں کی دوست داری اختیار کرے گا یہی ظالم ہیں۔ عظیم آیت ہے قُلْ اِنْ کَانَ اٰبَآؤُکُمْ وَ اَبْنَآؤُکُمْ وَ اِخْوَانُکُمْ وَ اَزْوَاجُکُمْ وَ عَشِیْرَتُکُمْ وَ اَمْوَالُ نِ اقْتَرَفْتُمُوْھَا وَ تِجَارَۃٌ تَخْشَوْنَ کَسَادَھَا وَ مَسٰکِنُ تَرْضَوْنَھَآ اَحَبَّ اِلَیْکُمْ مِّنَ اللّٰہِ وَ رَسُوْلِہٖ ((9:24 اے جماعتِ مؤمنین! اگر تمہارے ماں باپ تمہاری اولاد تمہارے بھائی تمہاری بیویاں تمہارے خاندان والے تمہارا مال کہ جس کو تم کماتے ہو جمع کرتے ہو وَ تِجَارَۃٌ تَخْشَوْنَ کَسَادَھَا (9:24) وہ تمہاری تجارت وہ تمہارا کاروبار کہ جس کے مندا پڑنے سے تم بہت پریشان ہوجاتے ہو' تمہارے یہ محلات رہنے سہنے کے مکانات اگر ان میں سے کوئی ایک چیز بھی (آپ نے دیکھا کس کس چیز کو گنا دیا ہے قرآن نے اور میں کہتا ہوں کہ جن کو اضافی نسبتیں کہتے ہیں' میری میری جن کو کہتے ہیں کوئی ایک چیز بھی ان میں باقی رہ گئی ہے؟) کہا ان میں سے اگر کوئی چیز بھی اَحَبَّ اِلَیْکُمْ مِّنَ اللّٰہِ وَ رَسُوْلِہٖ وَ جِھَادٍ فِیْ سَبِیْلِہٖ ط) (9:24 اگر ان میں سے کوئی ایک چیز بھی نظامِ خداوندی اور اس کے راستے میں جہاد کرنے سے زیادہ عزیز ہوگئی تمہارے نزدیک تو پھر کیا ہوگا؟ سنیے عزیزانِ من! فَتَرَبَّصُوْا ((9:24 تھوڑا سا انتظار کرو حَتّٰی یَاْتِیَ اللّٰہُ بِاَمْرِہٖ ((9:24 تآنکہ خدا اپنا فیصلہ لے کے آجائے پھر۔ توبہ توبہ توبہ۔ وَ اللّٰہُ لَا یَھْدِی الْقَوْمَ الْفٰسِقِیْنَ (9:24) اس قسم کی فاسق قوم پہ کشادکی راہیں خدا نہیں کھولا کرتا۔

مملکتِ اسلامیہ کی تشکیل کے سلسلہ میں حضرت عمرؓ کے عہد کی ایک مثال

عزیزانِ من! دیکھ لیا اسلام کی رو سے قومیت کا مدار کیا ہے؟ اسلامی مملکت کس طرح سے متشکل ہوتی ہے؟ مومن کنہیں کہا جاتا ہے؟ ان کے تعلقات آپس میں کیا ہوتے ہیں؟ ان کے تعلقات باہر والوں کے ساتھ کیا ہوتے ہیں؟ دعویٰ کر لینا تو بڑا

آسان تھا کہ ہم نے ایک نظری مملکت بنائی' نظریے کی بنیادوں کے اوپر قومیت کی تشکیل کی۔ان دعویٰ کرنے والوں کے متعلق ٹھیک کہہ گیا تھا کہ

یہ شہادت گہِ الفت میں قدم رکھنا ہے
لوگ آسان سمجھتے ہیں مسلماں ہونا

میں نے عرض کیا تھا کہ غیر مسلموں کے متعلق قرآن نے یہ کہا ہے کہ ان کے ساتھ تمہارے دوست داری کے تعلقات نہیں ہو سکتے' ان کو تم رموزِ مملکت میں شریک نہیں کر سکتے۔یوں ہی تاریخ کی ایک بات یاد آ گئی۔حضرتِ عمرؓ کے دور میں مملکت جب وسیع ہوئی ہے تو نظامِ مملکت میں انہوںؓ نے سیکریٹیریٹ قائم کیا تھا۔عربوں کے ہاں پہلے کوئی مملکت ہی نہیں ہوتی تھی تو سیکریٹیریٹ کا سوال ہی نہیں تھا۔یہ پہلی بار تھا جو اس ملک میں یہ چیز ہوئی تو اس کے لیے SPECIALIST چاہئیں تھے۔ان کے ہاں تو نہیں ملتے تھے' مختلف جگہ سے ان کو لینے تھے۔اکاؤنٹس برانچ کے اندر ایک ایکسپرٹ کی ضرورت تھی' وہ نہیں مل رہا تھا۔حضرتِ عمرؓ کا ایک آزاد کردہ غلام جوان کے ہاں ہی نوکر تھا یہ سمجھ لیجیے جیسے بعد میں ملازم ہو جاتا ہے' کام کاج کرنے والا۔یہ ایک عیسائی غلام تھا مسیح اس کا نام تھا' وہ موجود تھا کوئی اور کام کاج کیا کرتا ہوگا' اکاونٹ میں وہ ایکسپرٹ تھا۔بڑی دقت پیش آئی۔صحابہؓ نے کہا کہ اس میں دقت کی بات نہیں ہے' گھر میں آدمی موجود ہے اسے آپؓ رکھ لیجیے اس کام پہ۔آپؓ نے کہا کہ وہ مسلمان نہیں ہے۔انہوں نے کہا کہ یہ تو حساب کتاب کی بات ہے دو اور دو چار کی بات ہے' کوئی بات نہیں اس میں۔انہوںؓ نے کہا کہ قرآن نے کہا ہے کہ یہ تم بطانت میں نہیں لے سکتے' راز داری میں نہیں لے سکتے اور فنانس سے بڑا راز مملکت کا اور کیا ہوا کرتا ہے۔ان سے کہا کہ پھر اسے مسلمان کر لیجیے کہنےؓ لگے کہ لا اکراہ فی الدین' دین کے معاملے میں زبردستی نہیں ہے۔مسیح سے کہا کہ تم ساری عمر یہیں رہے ہو تم نے یہیں رہنا ہے اس کے بعد بھی تم مسلمان کیوں نہیں ہو جاتے؟ کہا کہ عمرؓ کہے گا تو پھر ہو جاؤں گا۔نہ عمرؓ نے کہا نہ وہ مسلمان ہوا' اکاونٹ برانچ میں کوئی آدمی نہیں ملا' خالی رکھ دی اسامی' اسے نہیں مقرر کیا گیا۔تو خدا کا حکم ہے کہ مملکت کے رازوں میں انہیں شریک نہیں کیا جا سکتا۔TRAIN کرنے کے لیے اپنے آدمی بازنطین میں بھیجے تھے' اس کے بعد وہاں کاروبار چلا تھا۔یہ کیفیت تھی ان لوگوں کی جنہوں نے یہ مملکتیں قائم کی تھیں۔لیکن میں نے کہا ہے کہ اس کے باوجود ایک غیر مسلم پہلے وہ غلام سمجھیے پھر اس کے بعد بھی آزاد کیا تو وہ گھروں کے اندر ملازم کی حیثیت ہوتی تھی' غیر مسلم ہے۔اور حضرتِ عمرؓ کے متعلق تو کوئی تصور ایسا ہوا ہوا ہے کہ ہنٹر ہاتھ میں انہوں نے پکڑا ہوا ہے' چلے جا رہے ہیں۔اس کی کھال ادھیڑی جا رہی ہے' اُس کی پگڑی اچھالی جا رہی ہے'

مار مار کے سور بنا رہے ہیں۔ یوں کوئی تصور دیا ہوا ہے۔ اس قسم کا وہ عمرؓ ' ساری عمر یہ غیر مسلم وہاں رہتا ہے اور اس کے ساتھ سلوک کی کیفیت یہ ہے کہ آزاد کرنے کے بعد بھی وہ اس گھر کو نہیں چھوڑ رہا۔ اب تو وہ آزاد تھا' جا سکتا تھا جہاں جی چاہے۔ مسلمان بھی نہیں ہوا' عیسائی کی حیثیت ہے۔ عزیزانِ من! اپنے ملازم سے ایک دن ذرا سلوک ہمارا اچھا نہ رہے' دوسرے دن وہ جاتا ہے۔ وہ شخص ساری عمر وہیں رہتا ہے۔ یہ تھا جو قرآن نے کہا تھا کہ اس اختلاف کی بنیادوں کے اوپر جو انسانیت کے ساتھ سلوک ہوتا ہے' اس میں فرق نہ آجائے۔

غیر مسلموں کے ساتھ باہمی روابط قائم رکھنے کے لیے قرآنی راہنمائی اور میکیاولی سیاست کا فرق

عزیزانِ من! یہ دین کتنا یہ تلوار سے تیز اور بال سے باریک ہے۔ یہ بھی اس لیے کہ قرآن کا یہ حکم ہے۔ لَا يَنْهٰكُمُ اللّٰهُ عَنِ الَّذِيْنَ لَمْ يُقَاتِلُوْكُمْ فِى الدِّيْنِ وَلَمْ يُخْرِجُوْكُمْ مِّنْ دِيَارِكُمْ اَنْ تَبَرُّوْهُمْ وَتُقْسِطُوْٓا اِلَيْهِمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِيْنَ (60:8) یاد رکھو! یہ جو اختلاف ہم نے کہا ہے نظریے کا اس کی بنیادوں پہ بجز اس کے کہ جو اعلانِ جنگ کر کے تمہارے خلاف آجائیں ان کے ساتھ تو معاملے اور اصولوں کے اوپر طے ہوں گے' اگر یہ نہیں ہے تو اس کے سوا یاد رکھو خدا تمہیں اس سے نہیں روکتا کہ ان سے تم حسنِ سلوک اور کشادہ سے پیش نہ آؤ ان کے ساتھ انصاف نہ کرو۔ اور انصاف کے متعلق تو خدا نے یہ کہا ہے کہ لَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰٓى اَلَّا تَعْدِلُوْا ؕ (5:8) کسی قوم کی دشمنی بھی تمہیں اس پر آمادہ نہ کر دے یعنی اس کی طرف سے دشمنی آرہی ہے' اس کا دشمن ہونا بھی تمہیں اس پہ آمادہ نہ کر دے کہ تم اس کے ساتھ عدل نہ کرو۔ عدل بھی کرو حسنِ سلوک بھی ان کے ساتھ کرو۔ مملکت کے امور میں راز دار نہیں بنا سکتے۔ ایک قوم نہیں اس سے یہ بن سکتی۔ دوسری قوموں کے ساتھ معاہدے کرو۔ اور معاہدے کے متعلق بھی جو قرآن نے اصول دیے ہیں آج کی میکیاولی سیاست کیا جانے؟ یہاں تو معاہدہ جو ہے اس کے متعلق تو مشہور ہی یہ ہے کہ معاہدہ مکڑی کا جالا ہوتا ہے' اپنے سے کمزور کو پھانس لیتا ہے' اپنے سے طاقتور آتا ہے تو اس کے پرِ کاہ جتنی بھی حیثیت نہیں ہوتی۔ یہ قرآن تھا جس نے کہا تھا کہ معاہدہ کرو۔ معاہدہ توڑنے کی ضرورت پیش آجائے اگر ان لوگوں کی طرف سے تو خاموشی سے معاہدہ نہیں توڑو' پہلے ان کو یہ اعلان کرو' ان سے کہو کہ تم نے یہ خلاف ورزی کی ہے اس کے بعد تمہارا معاہدہ یہ نہیں رہ جاتا عَلٰى سَوَآءٍ کہا ہے دونوں کو ایک سطح کے اوپر لے آؤ اور پھر یہ معاہدہ توڑو اگر تم نے توڑنا ہے (8:58)۔ اور معاہدہ وہ ہے جس کے متعلق کہا تھا کہ اس کے لیے تم اس قوم کے سامنے جوابدہ نہیں ہو گے خدا کے سامنے جوابدہ ہو گے۔ غیر قوم غیر مسلم کے ساتھ معاہدہ ہو رہا ہے اور اس معاہدے کے لیے ACCOUNTABLE ہے امتِ مسلمہ خدا کے

سامنے۔ لیکن یہ اور وہ مل کے ایک قوم نہیں بن سکتے۔ یہ 120 سورۃ آلِ عمران کی آیت تھی۔

غیروں کی سازشوں سے محفوظ رہنے کا طریق

جسے میں نے کہا تھا کہ اصولی بات آ رہی ہے پورا درس اس میں لگ جائے گا ٹھیک پورا درس لگ گیا قرآن کی ساری آیتیں تو پھر بھی نہیں آئیں۔ کہا کہ ان کے ساتھ ان کو کبھی اپنی راز داری میں نہ لو۔ پھر یہ چیز کہ صاحب! ان سے محفوظ کس طرح سے ہم رہیں حفاظت سے اپنے آپ کو کس طرح سے رکھیں؟ کہا کچھ بات مشکل نہیں ہے وَاِنْ تَصْبِرُوْا وَتَتَّقُوْا (3:120) اگر تم قوانینِ خداوندی کی نگہداشت کرتے جاؤ گے اور پھر استقامت دکھاؤ گے اس کے اوپر۔ لَا يَضُرُّكُمْ كَيْدُهُمْ شَيْئًا (3:120) ان کی خفیہ سازشیں تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکیں گی۔ اِنَّ اللّٰهَ بِمَا يَعْمَلُوْنَ مُحِيْطٌ ((3:120 خدا کا قانون احاطہ کیے ہوئے ہے ان کے تمام اعمال کا' اس لیے بالکل تم ان سے گھبراؤ نہیں تم اپنی روش کے اوپر پختہ رہو تمہیں یہ کوئی نقصان نہیں پہنچا سکیں گے۔ اور اس کے بعد پھر نقصان نہیں پہنچا سکیں گے آگے جو بات آئی ہے جنگِ احد کی بات چھڑ گئی دوسری آیت کے اندر۔ یوں نہیں نقصان پہنچا سکیں تمہیں۔ یہ ہم آئندہ لیں گے۔ سورۃ آلِ عمران کی آیت 116 سے 120 تک برادرانِ عزیز! ہم لے کے آئے' 121 سے آئندہ اتوار میں ہم لیں گے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا ؕ اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ)(2:127

❀...❀...❀

مجھے اپنے فہمِ قرآن کے متعلق کبھی یہ دعویٰ نہیں
ہوسکتا کہ وہ سہو وخطا سے منزہ ہے۔ یہ قرآن
فہمی کی ایک انسانی کوشش ہے اور ہر انسانی
کوشش کی طرح اس میں غلطیوں کا امکان
ہے۔ لہٰذا! میری تحریر میں جو کچھ آپ کو صحیح
نظر آئے' وہ نورِ قرآنی کا تصدق ہے اور
جہاں کہیں سہو وخطا دکھائی دے' وہ میرے
ذہن کی نارسائی۔ (پرویز۔ معراجِ انسانیت)